خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ
سسپنس ڈائجسٹ
ستمبر ۱۹۸۴ء
سپنس ڈائجسٹ ستمبر 1984ء
Scanned By:
ATA-UL-MUSTAFA
0333-4585215

سسپنس ڈائجسٹ ستمبر 1984ء




پبلشر: [illegible] ◎ پرنٹر: ابن حسن ◎ مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی ◎ یکے از مطبوعات۔ جاسوسی ڈائجسٹ پبلیکیشنز، سعید منشن، [illegible] اسٹریٹ آئی آئی چندریگر روڈ کراچی۔

| | |
|---|---|
| مدیر اعلیٰ: معراج رسول | منتظم اعلیٰ: غلام کبریا |
| مدیر: ... ایم اے | مصور: اقبال مہدی |
| معاون: وصی بدایونی | قلمکار: یوسف طاہر |

## سسپنس ڈائجسٹ ستمبر 1984ء



جلد ۱۴ ◉ شمارہ ۹ ◉ ستمبر ۱۹۸۴ء ◉ قیمت فی پرچہ ۱۲ روپے ◉ زر سالانہ ۱۵۰ روپے ◉ مقام اشاعت: ... کراچی ◉ خط و کتابت کا پتہ: پوسٹ بکس ۲۱۵ کراچی

اردو زبان کے خوابوں کی تعبیر
ماہنامہ
عالمگیر
کراچی
خان آصف کی زیرِ ادارت
آہنگ بھی، تصویر بھی
آنچل بھی، شمشیر بھی
وہ ڈائجسٹ جس کی کمی آج تک محسوس کی جاتی رہی
لفظ لفظ ایک طلسم، حرف حرف ایک زنجیر
ہمہ صفت، ہمہ جہت، ہمہ رنگ، ہمہ گیر
عالمگیر، عالمگیر، عالمگیر
نئے فسانے غمِ عشق کے شروع ہوئے
جہاں غروب ہوئے لوگ ہم طلوع ہوئے
مقامِ رابطہ: ۳۲- سعید مینشن، بلیموریا اسٹریٹ نزد آئی آئی چندریگر روڈ کراچی

**معزز قارئین** السلام وعلیکم۔ اس ماہ یہ کوشش کی گئی ہے کہ زیادہ سے زیادہ خطوط شاملِ اشاعت کرلیے جائیں۔ کچھ خطوط بلاتبصرہ اور بلاجواب بھی حاضر ہیں۔ گزشتہ ماہ "آپ کے خط" سات صفحات پر مشتمل تھے۔ اس کے باوجود قارئین کی شکایات موجود تھیں۔ اس بار بھی کوشش یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ خطوط کو ان صفحات میں سمو دیا جائے۔

ملکی سرحدوں کے پاسبانوں میں سے ایک **محمد یاسین بہار** نے جنڈ ضلع اٹک سے لکھا ہے۔ "ہم فوجیوں کے پاس اتنا وقت بھی نہیں ہوتا کہ ہر ماہ لمبے چوڑے خطوط لکھنے بیٹھ جائیں۔ سال بعد دو ماہ کی چھٹی ملتی ہے، تب ہی سکون سے آپ سے باتیں ہوسکتی ہیں اور اب گھر میں سوائے سسپنس پڑھنے کے کوئی اور کام ہی نہیں۔ تاریخی کہانی خانماں برباد دلچسپ رہا۔ الیاس سیتاپوری صاحب کو کہیں کہ اسے آگے ضرور چلائیں اور کہانی مکمل کریں۔ دیوتا اس بار ایک ہی جگہ پر گھومتی رہی، کوئی خاص تاثر نہ چھوڑ سکی۔ لگتا ہے عنقریب ختم ہوجائے گی۔ بھائی جان! میرے پاس کچھ پرانے شمارے ہیں، اگر ابھی کم ہوتے ہوں تو اطلاع کردیں تاکہ بھیج دوں تب بھائی محمد یاسین بہار! آپ کا کام اتنا اہم ۔۔۔ اور اتنا مشکل ہے کہ اس میں فضول باتوں کا وقت واقعی نہیں مل سکتا۔ سسپنس آپ کو پسند ہے شکریہ۔ خانماں برباد ایک غیر معمولی شخص کی غیر معمولی کہانی ہے اور یہ آگے ضرور چلے گی۔ سسپنس کے پرانے شمارے مل چکے ہیں۔ آپ کی پیشکش کا بہت شکریہ۔

کچھ غصے اور چند تجاویز کے ساتھ **سعیدہ نورین مشتاق** مظفرآباد آزاد کشمیر سے تشریف لاتی ہیں۔ لکھتی ہیں۔ "ہزاروں دعاؤں کے بعد واضح ہو کہ شدتِ انتظار کے بعد سسپنس ڈائجسٹ اپنی تمام تر رعنائیوں سمیت ملا تو مظفرآباد کی خوب صورت فضا مزید خوب صورت ہوگئی۔ جلدی جلدی ورق پلٹے اور حسبِ معمول خط اور شعر غائب۔ بس دل چاہا کہ سسپنس کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے سامنے دریائے جہلم میں بہا دوں مگر پھر یہ سوچ کر دل کو سمجھایا کہ اس میں سراسر نقصان میرا ہی ہے۔ معراج بھیا کا کیا جائے گا۔ ان کا تو رسالہ بک گیا۔ ٹائٹل پر خصوصی توجہ دیجیے کیوں کہ ٹائٹل یکسانیت اختیار کرتا جارہا ہے۔ وہی ایک حسینہ اور حسینہ کے کھڑے ہونے کا، سوچنے کا، دیکھنے کا ایک ہی انداز۔ ڈاکر صاحب کے لیے ٹائٹل کے لیے چند تجاویز ہیں۔ چار یا پانچ سرورق کے آئیڈیاز لکھ کر لکھتی ہیں۔ "فی الحال اتنی پر ہی گزارا کیجیے۔ اگر عمل ہوا تو آئندہ بھی بلامعاوضہ تجاویز بھیجوں گی۔ یہ خط ڈاکر صاحب کو ضرور پڑھوائیے۔ ڈاکر صاحب! فوراً دفتر پہنچیے اور یہ خط حاصل کرکے اس پر غور و خوض اور تلاش بسیار شروع کردیجیے۔ سعیدہ نورین صاحبہ! آپ کو اتنی خوب صورت جگہ خوب صورت سرورق ملی، مبارک باد قبول کیجیے، آپ کی دعوت کا بہت شکریہ۔ سنا ہے کہ مظفرآباد سے حیدرآباد بہت پہلے پڑتا ہے۔ وہاں جانے کی بھی فرصت نہیں ملتی۔

**سید محسن رضا** گاؤں و ڈاکخانہ بھڑیوٹھ تحصیل و ضلع سیالکوٹ سے لکھتے ہیں۔ "میں میڈیکل کالج میں فاضل ایئر کا طالب علم ہوں۔ آپ کا خوب صورت ڈائجسٹ میں ہر ماہ نہیں پڑھتا مگر جب میں گھر پر اپنی چھٹیاں گزار رہا ہوتا ہوں تو ضرور خریدتا ہوں۔ ویسے اردو ادب کا مجھے بہت شوق ہے اور میں نے اسے اپنی بساط کے مطابق پڑھا بھی ہے۔ یہاں تک کہ ایف ایس سی میں اردو کے پرچے میں اچھے نمبر آنے کی وجہ سے میں میڈیکل کالج میں گیا اور ان شاء اللہ ایک سال بعد ڈاکٹر بن جاؤں گا۔ دیوتا اور درخشاں مجھے بالکل پسند نہیں ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہر سلسلے وار کہانی میں کچھ سچائی اور زیادہ مرچ مسالا ہوتا ہے مگر ان دونوں کہانیوں میں افسانیت بہت زیادہ ہے یعنی مرچ مسالا ہی نظر آتا ہے۔ سچائی بالکل نظر نہیں آتی۔ ایسے لگتا ہے جیسے بچوں کے لیے تحریر کی جارہی ہوں۔ بہرحال ہر انسان کا اپنا سوچنے کا انداز ہوتا ہے تب سید محسن رضا صاحب! ماشاء اللہ ایک سال بعد آپ ڈاکٹر بن جائیں گے۔ یقین ہے کہ اگر آپ کی سوچ اتنی ہی حقیقت سے قریب رہی تو آپ زندگی میں بہت کامیاب رہیں گے۔ ویسے درخشاں تو ختم ہوگئی اور دیوتا میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔

ڈسکہ سے **الیاس صہیب بٹ** نے لکھا ہے۔ "اس دفعہ غیر متوقع طور پر خاص شمارہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی لیکن آپ نے ہماری خوش بختی نظر نہ رکھی۔ اس کی قیمت پورے بارہ روپے لکھ دی۔ حالانکہ ہم نے حساب کیا تو تئیس صفحات کی قیمت صرف اسی پیسے بنی پھر اس بلاجواز زیادتی کی وجہ بتائیں؟ آپ نے جو دو روپے کا جنگی ٹیکس لگایا ہے، وہ کوئی اتنا برا بھی نہیں بلکہ قیامت جیسی ہی جذبۂ ایمانی سے سرشار مجاہدوں کی داستانوں کی بھی ضرورت ہے۔ محترم! آپ نے حساب لگانے میں غلطی کی ہے۔ ذرا جمع تفریق دوبارہ کیجیے اور جواب سے ہمیں مطلع کیجیے۔ ویسے آپ کی اطلاع کے لیے یہ جنگی ٹیکس نہیں کاغذ کا ٹیکس ہے۔

پی آئی گوندل نحاس ضلع سرگودھا سے لکھتے ہیں۔ "اس مرتبہ الیاس سیتاپوری نے بہت ہی اچھی کہانی لکھی ہے۔ واقعی انسان میں اگر قوتِ ارادی ہو تو وہ سب کچھ کرسکتا ہے اور یہی اس کہانی کا مقصد ہے۔ بہرحال الیاس سیتاپوری صاحب کی اس کاوش کو سراہنا بڑی زیادتی ہوگی۔ احمد اقبال صاحب کی نامۂ اعمال نے بہت متاثر کیا ہے۔ بہت ہی اچھی مزاحیہ کہانی تھی۔ امید ہے کہ اقبال صاحب سے آپ ملاقات کرواتے رہیں گے۔ بھائی نحاس! احمد اقبال صاحب پھر حاضر ہیں اور آئندہ بھی حاضر ہوتے رہیں گے۔ الیاس صاحب کی خانماں برباد واقعی ایسی کہانی ہے جو قلب و نظر کو گرما دیتی ہے۔

جان جی محلہ غریب آباد پی او پیلاں ضلع میانوالی سے تحریر کرتے ہیں۔ "سلسلے وار کہانی دیوتا لاکھوں دلوں کی دھڑکن ہے۔ ان میں مجھ ناچیز کا دل بھی شامل ہے۔ بہرحال اتنا ضرور عرض کروں گا کہ ہر اچھی کمال کی ایک انتہا ہوتی ہے پھر نقطۂ عروج ہوتا ہے اور پھر دلوں پر انمٹ نشان چھوڑنے والا اختتام۔ دیوتا اصولاً تمام مراحل طے کرچکی ہے۔ اب نواب صاحب اسے لوٹا کہانی بنانے پر تلے ہوئے ہیں تو ہم کیا کرسکتے ہیں۔ آخر میں آپ سے

ایک سوال کہ کیا آپ مجھ جیسے گمنام قارئین کی طرف سے وصول شدہ کہانیاں، تراجم وغیرہ پڑھتے ہیں؟ کیوں کہ میں انگریزی ادب سے ترجمہ کی گئی چند کہانیاں بھیجنا چاہتا ہوں خصوصاً موپاساں کی ایک یادگار کہانی۔ بھائی حارث جی! کیا آپ کا یہ مکمل نام ہے۔ لگتا ہے کہ آگے پیچھے بھی کچھ ہوگا جو آپ لکھنا بھول گئے۔ دیوتا اتنی طویل کہانی ہے اور اس میں کردار اتنے زیادہ ہیں کہ ان کو سمیٹنے میں ابھی کئی سال لگیں گے۔ ویسے بھی دیوتا اُردو فکشن کی تاریخ کی سب سے طویل داستان ثابت ہو چکی ہے۔ تراجم بھیجیں ہم کوشش کر رہے ہیں کہ سسپنس میں کم از کم شائع ہوا کریں۔

سکھر سے **محمد رشید سیال** فرماتے ہیں: ”سب سے پہلے اشرف طارق صاحب کی قیامت پڑھی، پڑھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے لیکن ہم کیا کریں۔ ہم پاکستانی اپنے بھائیوں (فلسطینیوں) کے لیے صرف دل ہی دل میں کڑھ سکتے ہیں۔ ان کی مدد کے لیے اسرائیلی کتوں سے لڑ نہیں سکتے۔ صرف زبانی اور تقریروں وغیرہ سے اپنی بھڑاس نکالتے ہیں۔ حالانکہ اگر ہم سب مسلمانوں میں آپس میں اتحاد اور محبت ہو تو ہم اپنے دشمنوں کو اس جہاں سے مٹا سکتے ہیں جب کہ پوری دنیا میں مسلمانوں کی تعداد بہت ہے۔ اب تو ان کافروں کو مسلمانوں کی زیادہ تعداد سے بھی ڈر نہیں لگتا۔ خیر خداوند قدوس ہمارے ان بھائیوں کی نصرت کرے۔“ محمد رشید سیال صاحب! جو آپ کے جذبات ہیں، وہی پاکستان کے سارے مسلمانوں کے ہیں لیکن جن کا مسئلہ ہے وہ زیادہ سنجیدہ نہیں لگتے۔ دیکھیے تنظیم آزادیٔ فلسطین کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ عراق ایران جنگ ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ لبنان پر عیسائیوں کا قبضہ ہو گیا۔ افغانستان کا کیا حال ہے۔ غرض مسلمان جہاں بھی ہیں پریشان ہی ہیں۔ شاید یہ ہمارے اعمالوں کا نتیجہ ہے۔

**محمد نواز** نے مین بازار منڈی رائے ونڈ ضلع لاہور سے تحریر کیا ہے: ”اس دفعہ دیوتا نے کچھ خاص مزہ نہیں دیا۔ ورخشاں بہت اچھی رہی۔ باقی قیامت کا کیا کہنا، پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ اشرف طارق صاحب کیا خوب لکھتے ہیں۔ انہیں تو ان کے لکھنے کا انداز بہت ہی پسند آیا۔ ہماری طرف سے اشرف طارق صاحب کو مبارک باد پہنچا دیں اور پوچھ کر بتائیں کہ من اور مانی والا سلسلہ ختم ہو گیا۔ باقی ان کے علاوہ بلندی، چشم دید، شاطر، مصلحت کوش اور خاص کر جرم وفا تو بہت ہی پسند آئیں۔ آخر میں ہم پھر آپ سے گزارش کرتے ہیں کہ اس دفعہ آپ ہمیں اپنی محفل میں شامل فرما کر شکریے کا موقع دیں۔“ محمد نواز صاحب! آپ محفل میں شامل ہو گئے۔ اشرف طارق صاحب نے قیامت واقعی بہت تاثر انگیز لکھی ہے اور جی ہاں۔ جن کرداروں کا آپ نے تذکرہ کیا ہے۔ ان کا ذکر اب ختم ہو گیا ہے۔

یہ خط ہے **شگفتہ احتشام** کا ملیر کراچی سے لکھتی ہیں: ”اگست ۸۳ء کا شمارہ پڑھا اور کہانیوں پر بے اختیار تبصرہ کرنے کو جی چاہا (حالانکہ تین چار خط ردی کی ٹوکری کی نذر ہو چکے ہیں) سلسلے وار کہانیاں قیامت اور دیوتا خوب جا رہی ہیں۔ دیوتا میں اگر فرہاد کی پریشانیوں کو کم کر دیں تو نوازش ہوگی بے چاروں کو کبھی سکون کا سانس بھی لینے دیا کریں۔ نواب جی کی کہانی جرم وفا کا دوسرا حصہ بھی خوب تھا لیکن اب کے انھوں نے بہت طول دے دیا ہے۔“ شگفتہ احتشام صاحبہ! حیرت ہے کہ آپ کو جرم وفا کا دوسرا حصہ طویل لگا۔ قارئین سسپنس کا تو اصرار ہے کہ جرم وفا کے بھی ہر ماہ کم از کم ۵۰ صفحات شائع کیے جائیں۔

**ماسٹر غلام حسین** شہزادہ شہید کالونی گوجرانوالہ سے رقم طراز ہیں: ”واللہ آپ بہت ایمان دار ہیں محترم معراج رسول صاحب! بندہ احقر یا تقصیر کوئی تمہید نہیں باندھنا چاہتا۔ اس لیے اوپر لکھ دیا ہے کہ آپ بہت ایمان دار ہیں۔ ایمان داری کی بات ہے کہ ہم نے جتنی بار خط لکھنے کی جسارت کی آپ نے درگزر فرماتے ہوئے نہایت ایمان داری کے ساتھ ردی کی ٹوکری کا پیٹ بھر دیا۔ چلو نہ رہا بانس نہ بجی بانسری لیکن ہم بھی ہارنے والے نہیں ہیں۔ ایک بار پھر نئی بانسری کے ساتھ خطوط کی بھیڑ چیر کر میدان میں آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ خدا جانے آپ کو گوارا ہو کہ نہ ہو۔

کسی وجہ سے جولائی اور اگست ایک ساتھ پڑھ سکا ہوں۔ خصوصاً جرم وفا ایک ساتھ پڑھی ہے۔ پڑھ کر دل اتنا بار ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ آپ شاید یقین نہ کریں کہ جب وطن عزیز کے دو ٹکڑے ہونے کی خبر سنی تو دل کو اس قدر صدمہ پہنچا کہ تین دن تک کچھ کھایا اور نہ پیا بلکہ گھر میں صف ماتم بچھ گئی اور نیندیں تو عرصے تک ہم سے روٹھی رہی تھیں اور گریہ وزاری کے وہ دن اور راتیں نہ جانے کیسے گزارتے رہے۔ نواب صاحب نے اس سلسلے میں قلم اٹھا کر قابل صد ستائش کام کیا ہے۔ اس کام پر ہم انھیں سلام پیش کرتے ہیں۔ الیاس سیتاپوری صاحب سے گزارش ہے کہ آپ نے محمود غزنوی کے دادا جوق کی داستان لکھی ہے اس کو آگے بڑھا کر فتح سومنات تک لے جائیں۔“ ماسٹر صاحب! آپ کا ہے کے ماسٹر ہیں۔ آپ نے بانسری کا تذکرہ جس انداز میں کیا ہے، اس نے تو ہمارے سر پہ طبلہ بجا دیا۔ الیاس صاحب اور نواب صاحب تک آپ کی مبارک باد پہنچ گئی ہے۔ امید ہے کہ خانماں بربادوں کی یہ داستان سومنات تک پہنچ جائے گی۔

محلہ ابڑا، ضلع سکھر سے **ملک جاوید احمد آرزو** فرماتے ہیں: ”جب ہماری نظر خصوصی شمارے پر پڑی تو جلدی سے دو روپے فالتو ادا کیے اور دکان سے نیچے اُترتے ہوئے پڑھنا شروع کر دیا اور جلدی جلدی آپ کے خطوط کے سب صفحے پڑھ ڈالے لیکن ہم کو اپنا خط نظر نہ آیا تو ہماری حالت ایسی تھی جیسے منہ میں سے کسی نے نوالہ نکال لیا ہو۔ خیر پھر خیال آیا، میرا خیال تھا سوچا شاید اس میں میرا شعر چھپا ہو لیکن ادھر سے بھی مایوسی ہوئی۔ الیاس صاحب کی کہانی خانماں برباد پڑھی تو ایسے لگا جیسے اس خانماں برباد قافلے میں ہم بھی شامل تھے۔ یہ تو الیاس صاحب کی جادوئی قلم کا اعجاز ہے۔“ ملک جاوید صاحب! اُمید ہے کہ نہ صرف آپ کی آرزو پوری ہو گئی ہوگی بلکہ نوالہ بھی منہ میں واپس آ گیا ہوگا۔ کوشش کی جاتی ہے کہ ہر ماہ زیادہ سے زیادہ خطوط ان صفحات میں شامل کر لیے جائیں لیکن صفحات بڑھانے کے ساتھ ساتھ خطوط کی تعداد بھی بڑھتی جا رہی ہے۔

**کنول تالپور** نے میرپور خاص سے لکھا ہے: ”میں چھ سال سے سسپنس پڑھ رہی ہوں۔ اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے لیکن مجھے تو تعریف کرنا ہی نہیں آتی۔ ۲۳ تاریخ کو جولائی کا سسپنس آیا اور آتے ہی بھیا کے پاس چلا گیا۔ میں دو دن تک سرورق ہی دیکھتی رہی۔ ہر ماہ پیسے خرچ کر کے ڈائجسٹ میں خریدتی ہوں اور پڑھتے پہلے بھیا ہیں جو بہت کنجوس ہیں۔ انکل بلوٹ کہاں غائب ہو گیا ہے۔ پلیز نکالیں اسے۔ یا اس کا پتا بتا دیں تو میں آپ کی ردی کی ٹوکری پھڑوا لوں تو پھر تو آپ میرے خط کا جواب دیں گے۔ ناہید سلطانہ اختر کی کوئی کہانی شائع کریں تو آپ کی مہربانی ہوگی۔“ کنول صاحبہ! انکل بلوٹ اس ماہ موجود ہے۔ ناہید سلطانہ اختر صاحبہ متوجہ ہوں، قارئین سسپنس کو ان کی بہت تلاش ہے۔

ٹنڈو آدم سے **محمد صادق خان قائم خانی راجپوت** لکھتے ہیں: "دیوتا میں نواب صاحب جس قدر تیزی سے کرداروں کو مزید پھیلا رہے ہیں اس سے کہانی میں دلچسپی کم ہوتی جارہی ہے۔ دیوتا شروع ہونے کے بعد تقریباً درمیان میں چند قسطیں نہایت پھیکی سی رہی تھیں اور نواب صاحب چند کرداروں کو واضح طور پر حسبِ منشا نبھا بھی نہ سکے تھے لیکن اب دیوتا کا شمار کسی دوسرے سلسلے سے کسی طرح بھی کمتر نہیں ہے۔ اس کی بے پناہ مقبولیت اس کا واضح ثبوت ہے۔ سسپنس ڈائجسٹ میں میری نظر میں اگر آج کوئی ذرا سی کمی ہے تو وہ یہ کہ آپ انگریزی ناول کا ترجمہ نہیں دے رہے اور نہ ہی انگریزی ادب سے کوئی طویل کہانی شائع کررہے ہیں۔"

پنڈی بھٹیاں ضلع گوجرانوالہ سے **بابر منیر امجد** فرماتے ہیں: "انکل کہنے پر بُرا نہ منایئے گا۔ ہوسکتا ہے آپ انکل کی عمر سے چھوٹے اور بھائی جان کہنے کی عمر سے بڑے ہوں۔ اس لیے تلافی کے طور پر بھائی جان کہہ لیتے ہیں۔ ہوسکتا ہے آپ عورتوں کی طرح عمر کے معاملے میں حساس واقع ہوئے ہوں اور انکل کہنے سے ناراض ہوجانے کا خدشہ ہو۔ رشتہ انکل کا ہو یا بھائی کا، آپ گھبرایئے گا مت اور یہ سوچ کر خوش ہوجایئے کہ ملک کے طول و عرض میں آپ کے بھتیجوں اور بھائیوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہورہا ہے اور یہ اضافہ ملک کی سالانہ ترقی کی شرح سے زیادہ ہے اور آپ جانتے ہیں کہ اس اضافے میں آپ کا کم اور ڈائجسٹ کا زیادہ قصور ہے۔ فقط آپ کے نالائق بھتیجا۔"

**نواز خان خٹک** نے ضلع کرک سے لکھا ہے: "جرم وفا شمارے کی جان ہے۔ ایک بات یہ ہے کہ ہمارے ملک میں اولیائے کرام بہت ہیں۔ اگر ان صوفیا و اولیائے کرام سے واقفیت ہوجائے تو بہت اچھا ہے۔ کہانی کے ساتھ معمولی سا مصنف کا تعارف ہونا چاہیے۔ دو تین ماہ سے نک ویلوٹ کا پتا نہیں لگتا۔ کہیں وہ کالے دروازوں میں بند تو نہیں ہوگیا ہے۔ ویسے کہانی 'جرم وفا' نے سسپنس کو اور بھی قابلِ تعریف بنا دیا ہے۔ ٹائٹل بہت اچھا تھا۔ اگر کراچی جانا ہوا تو ملاقات کروں گا۔"

کیناں پارک گلبرگ لاہور سے **اظہر خان** لکھتے ہیں: "خوشی اس بات کی ہے کہ آپ نے اکتوبر ۱۹۸۲ء کے ڈائجسٹ کے جواب میں مجھے ماہِ رواں کا سسپنس ارسال فرمایا۔ سسپنس ڈائجسٹ کے مارکیٹ میں آتے ہی میں اسے خرید لیتا ہوں۔ آپ اس سے اندازہ لگایئے کہ مجھے ۲۹ تاریخ کو آپ کا ارسال کردہ ڈائجسٹ موصول ہوا لیکن اس وقت تک میں خرید کر اسے مکمل پڑھ چکا تھا۔ کیا آپ کو یہ خوشی نہیں ہے کہ میں اس کا مسلسل خریدار ہوں۔ میری جانب سے یومِ آزادی پر مبارک باد قبول فرمایئے۔"

**آفتاب علی** ابڑو نے کمبر سے لکھا ہے: "میں ایک ایک سال بعد خط لکھتا ہوں مگر جب سے خط لکھنے شروع کیے ہیں صرف ایک بار ہی میرا نام آیا ہے۔ وہ بھی کنجوسی سے۔ خیر اگر ایک ایک سال بعد بھی میرا نام آئے گا تو میرا سر فخر سے ہمیشہ اونچا رہے گا اور میں سمجھوں گا کہ میں سسپنس کا گمنام قاری نہیں ہوں۔ انکل، انکل، انکل میں صرف یہ لکھوں گا کہ میں سندھی ہوں اور مجھے ابھی اُردو کی لکھائی نہیں آتی جو آپ کا دل موہ سکے۔ محی الدین نواب کی کہانی جرم وفا بہت اچھی ہے اور اس کو جتنا ہوسکے طویل کریں۔ اگر نواب صاحب سامنے ہوتے تو ان کے ہاتھ چوم لیتا۔ بہرحال آپ ان سے میرا سلام کہیے گا۔ مجھے پتا بھی ہے کہ جواب نہیں ملے گا پھر خط لکھ رہا ہوں۔ بھُول نا پاگل!"

ملتان سے **ہما جاوید انصاری** لکھتی ہیں: "انوار مجتبیٰ صدیقی صاحب سے کہیں کہ درخشاں کو مزید بہتر بنائیں اور ذرا جمال کے متعلق وضاحت کریں۔ کبھی رفیقی کہتا ہے اور کبھی اور یگا کہ وہ دُرست راستے پر نہیں جارہا۔ یہ پڑھ کر تو ہماری طبیعت میں انتشار پیدا ہوجاتا ہے۔ جرم وفا تو ایسی کہانی ہے کہ جسے پڑھ کر آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔ علامہ اقبال کا خواب تعبیر بن کر بکھر گیا۔ قائدِ اعظم کی محنت ٹکڑوں میں بٹ گئی مسلمانوں کی اخوت اور قربانیاں کس طرح پامال ہوئیں۔ کتنی حیرت کی بات ہے۔ ہمیں اپنے ہی مسلمان بھائیوں پر رونا آتا ہے اور اب بھی ہم کو چین نہیں آتا۔"

**ناصرہ ملک** نے کھیوڑہ سے کچھ اس طرح تبصرہ کیا ہے: "آخر آپ دیوتا کو ختم کیوں نہیں کردیتے۔ کیا اتنی ہی اچھی لگتی ہے کہ اس کو ختم کرنا نہیں چاہتے۔ یہ تو مکمل ہوگیا ہے یعنی ہم تو چھوڑتے ہیں، مکمل نہیں چھوڑتا۔ پلیز اس سے جان چھڑائیں۔ اب لوگ مروّت کے مارے اس کی تعریف تو کریں گے نا، مجبور ہیں بے چارے۔ باقی رسالے کو ابھی نہیں پڑھا کیوں کہ ایک تو یہاں رسالہ دیر سے پہنچتا ہے۔ دوسرا اگر پورا پڑھ کے آپ کو خط لکھتی تو یہ خط ردّی کی ٹوکری کی نذر ہوجانا تھا اس لیے باقی تبصرہ محفوظ۔"

رشید آباد کراچی کی **یاسمین گل** نے تحریر کیا ہے: "اس شمارے کی تمام کہانیاں بے حد خوب صورت تھیں مگر انکل ہمیں دیوتا کی یہ قسط کچھ مزے کی نہیں لگی اور ویسے بھی فرہاد انکل اپنی داستان خواہ مخواہ ہی طویل کرتے جارہے ہیں۔ فرہاد انکل کی داستان کے اختتام کے انتظار میں میرے نانا اس دُنیا سے کوچ فرما گئے اور میرے انکل بوڑھے ہوگئے۔ اب اپنے پوپلے منہ سے کہتے ہیں: بٹگل بیٹا! ہم بوڑھے ہوگئے اور فرہاد ابھی تک جوان ہی ہے۔ اب آپ ہی بتائیں ہم انھیں بھلا کیا جواب دیں جب کہ ہم تو خود حیران و پریشان ہیں کہ فرہاد انکل کی داستان کا اختتام ہے بھی یا . . . ۔ ہمیں بھی اس کے اختتام کے انتظار میں اپنے انکل کی طرح بوڑھے اور نانا جان کی طرح . . . سمجھ گئیں نا آپ ہماری بات سو ساحل پہ رہ کے ہم کو فقط ریت ہی ملی ہو ہم ڈوبتے تو گوہرِ نایاب ڈھونڈتے۔ اُمید تو یہی ہے کہ میرا یہ خط بھی گول ہوکر میری آنٹی کے منہ سے ہوتا ہوا اس کے پیٹ میں پہنچ جائے گا۔ آنٹی سے مراد وہ نامراد ردّی کی ٹوکری ہے۔"

**مشتاق احمد شاد** نانگ منڈی ضلع شیخوپورہ سے لکھتے ہیں: "آپ نے پہلے کی طرح اس خط کو بھی شائع نہ کیا تو میں سسپنس پڑھنا ہی چھوڑ دوں گا۔ اس ماہ سسپنس کا سرورق بہت پسند آیا۔ سب سے پہلے دیکھا کہ چاندنی اس ماہ بھی شائع ہوئی یا نہیں۔ جب دیکھا تو کہانیوں کی فہرست میں چاندنی شائع ہوئی تھی۔ اس ماہ سسپنس کی قیمت بارہ روپے دینے پڑے اور پوچھا تو پتا چلا اس دفعہ جو دو روپے زیادہ دینے پڑے وہ چاندنی کی وجہ سے یعنی کہ چاندنی کی ہر قسط دو روپے کی پڑھنے کو ملے گی۔ کوئی پروا نہیں اُوئے!"

جھبران ضلع شیخوپورہ سے **ملک محمد بوٹا انجم** یوں گویا ہوتے ہیں: "دیوتا کے متعلق کچھ کہنا فضول ہے کیوں کہ جواب تو ملے گا ہی نہیں۔ الیاس صاحب کی کہانی خانماں برباد بہت اچھی تھی۔ میں اسی سلسلے کا منتظر تھا۔ اُمید ہے وہ اس کو آگے بڑھائیں گے اور تفصیل سے بیان کریں گے۔

الیاس صاحب سے عرض ہے کہ وہ محمد بن قاسم پر ایک مکمل اور جامع کہانی لکھیں۔ اس دفعہ سسپنس میں نامۂ اعمال (احمد اقبال) مرنے کا پروگرام (مرزا امجد بیگ) بلندی بہت ہی اچھی تھیں۔ میری طرف سے ان مصنفین حضرات کو مبارک باد پہنچا دیں۔ میری دیرینہ خواہش تھی کہ میں سقوطِ مشرقی پاکستان کے بارے میں (پس پردہ اور بیرونی حالات) پڑھ سکوں مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مجھے ایسی کوئی کتاب نہیں مل سکی۔ بہرحال آپ نے اس سلسلے کو شروع کر کے میری دلی اور دیرینہ خواہش پوری کر دی ہے۔ اس کے لیے میں آپ کا، ادارے کا اور نواب صاحب کا بہت ممنون ہوں کہ آپ نے اس کو عوام تک پہنچانے کا ارادہ کیا ہے۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہم اس سانحے کو تقریباً بھول چکے ہیں اور ایسا نظر انداز کیا ہے کہ جیسے ہمارا اس کے ساتھ دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ میں ایف اے کا طالب علم ہوں اور میں نے ابھی تک اس سانحے کو تفصیل سے نہیں پڑھا بلکہ میں تو اس کی ابجد سے بھی ناواقف ہوں کہ یہ سانحہ کیونکر پیش آیا؟ اس کے محرکات کیا تھے؟ ہم الزام تو دوسروں کو دیتے ہیں مگر اپنے اندر نہیں دیکھتے۔ میں اس سلسلے پر بہت خوش ہوں اور اب تک اس کی دو قسطیں پڑھ چکا ہوں۔ امید ہے آپ اسے بہت بہتر انداز اور سچے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔ یقیناً یہ ایک اشک بار کہانی ہے۔ نواب صاحب سے عرض ہے کہ وہ مقبول جٹ کے متعلق مزید تحریر کریں۔"

آصف اقبال قاضی نے شیاری سے لکھا ہے: "سسپنس میں جو سلسلے وار کہانی دیوتا چھپتی ہے وہ بڑوں کے علاوہ بچے بھی پڑھتے ہیں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ وہ جناب محی الدین نواب کے ذہن کی تخلیق ہے اور قارئین کی دلچسپی کے لیے فرہاد علی تیمور کا نام دیا گیا ہے۔ ویسے مجھے اب بھی امید نہیں کہ آپ مجھے جواب سے نوازیں گے۔ گزشتہ ماہ کے سسپنس میں جرم وفا کی دوسری قسط پڑھی۔ اچھی تھی۔"

کھیوڑہ کی یاسمین گل نے کچھ اس انداز سے خط شروع کیا ہے: "اے ظالم، سنگدل، بے رحم، بے مروت مگر پیارے بھیا! آخری سلام۔ آخر صبر کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ ایک دفعہ خط کا جواب کیا دیا، ہم پہ احسان کر دیا۔ چھ ماہ ہونے کو آئے آپ کے خط سے پول نکالے گئے ہیں جیسے دودھ سے مکھی۔ کاش کراچی کچھ نزدیک ہوتا۔ بہرحال سسپنس سے ہماری عقیدت، محبت اور وابستگی ہمیشہ قائم رہے گی۔ سرورق اس دفعہ بھی دیدہ زیب اور پرکشش تھا۔ شاید مصور صاحب ان دنوں بیگم صاحبہ سے چھپ کر ٹائیٹل تیار کرتے ہیں۔ کہانیاں سبھی اچھی تھیں۔"

کیڈٹ سید عامر شاہ نے کیڈٹ کالج رزمک شمالی وزیرستان ایجنسی سے لکھا ہے: "خط لکھنے کی پہلی مرتبہ جسارت کر رہا ہوں۔ اس بات سے بے نیاز کہ آپ لفٹ دیں گے بھی یا نہیں۔ اس کی وجہ اس دفعہ کے خصوصی شمارے میں احمد اقبال صاحب کی بے مثال مزاحیہ کہانی نامۂ اعمال اور دیوتا اور درخشاں کی بے نظیر قسطیں ہیں۔ مصنفین کو میری دلی مبارک باد پہنچا دیجیے گا۔ آپ بھی تھوڑی سی جیب میں رکھ لیں۔ انگریزی ادب کی کہانیوں کو چھوڑ کر باقی تمام کہانیاں میری آراء کے مطابق دوسرے نمبر پر ہیں۔ انگریزی کہانیوں کے ترجموں میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ شروع شروع میں ان میں بہت بور قسم کی منظر کشی کی گئی ہوتی ہے۔ آخر میں یہ دلچسپ ہو جاتی ہیں۔ اس دفعہ لطیفوں اور چٹکلوں کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ ویسے میں بھی دو لطیفے بھیج رہا ہوں۔ آپ کے معیار پر پورا اترے تو ورنہ بڑی بی کو چائے کے ساتھ کھلا دیں۔ سرورق معمول سے کچھ زیادہ اچھا لگ رہا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کامنی سی عورت کسی اور کی طرف دیکھنے کے بجائے ہمیں دیکھ رہی تھیں۔ آئندہ بھی خیال رکھیں۔"

فدا حسین بلوچ آف مکھن بیلہ ضلع مظفر گڑھ سے لکھتے ہیں: "کافی عرصہ ہو گیا تھا آپ کے خط پڑھتے ہوئے سوچا کہ اب ایک خط لکھ ہی ڈالوں۔ درخشاں کے جمال صاحب کو اب تجزیے سے واپس آ جانا چاہیے۔ کافی عرصہ گزر چکا ہے۔ شاطر اچھی نہیں تھی۔ ایسی کہانیاں پہلے بھی کئی مرتبہ پڑھ چکے ہیں۔"

داؤد خیل اسکندر آباد کی رخسانہ تبسم لکھتی ہیں: "میرا پسندیدہ رسالہ سسپنس ڈائجسٹ بہت صحت مند ہو گیا ہے اور کافی دیدہ زیب بھی۔ صحت مند اس دفعہ خصوصی شمارہ تھا اور دیدہ زیب اس لیے کہ سرورق بہت خوب صورت ہونے لگا ہے۔ مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ کی کمی بُری طرح محسوس ہوتی رہی ہے۔ ان کو پکڑنے کے لیے آپ کو ذرا تیز بھاگنا ہو گا۔ محی الدین نواب کو خدا لمبی عمر دے تاکہ وہ ہمارے لیے ایسی ہی یعنی جرمِ وفا جیسی جاندار تحریریں لکھتے رہیں۔ اس دفعہ احمد اقبال بھی خوب مزاحیہ تحریر لے کر سامنے آئے۔ مجموعی طور پر خصوصی شمارہ واقعی خصوصی شمارہ تھا۔ مختصر خط لکھ رہی ہوں کہ شاید جگہ مل جائے۔"

کراچی سے شعیب آفاق نے لکھا ہے: "اس ماہ ٹائیٹل پر جو دوشیزہ تھی وہ شاید بلکہ یقیناً آج سے دو ڈھائی سال پہلے بھی اپنا دیدار کرا چکی ہے۔ صرف شاخ کا فرق ہے یعنی پہلے بغیر شاخ کے آئی تھی اور اب شاخ کے ساتھ۔ ذاکر صاحب سے کہیں برائے مہربانی اس طرف توجہ دیں۔ سسپنس کھولنے کے بعد حسب معمول دیوتا کا دیدار کیا۔ شکر ہے، فرہاد صاحب ہرما سے باہر تو نکلے اور کہانی آگے بڑھی۔ اب دیکھیں آگے کیا گل کھلاتے ہیں۔"

ایس ایم اختر شاد نے عمر کوٹ سے تحریر کیا ہے: "اس ماہ محی الدین نواب صاحب کی جرمِ وفا کی دوسری قسط پڑھی، بہت پسند آئی۔ نواب صاحب اپنے لفظوں کے نشتروں سے مُردہ ضمیروں پر کاری ضرب لگاتے ہیں۔ اس کے علاوہ نامۂ اعمال اور قیامت نے متاثر کیا۔ میرا خیال ہے کہ ایک صفحے کی کمی قطعی پسند نہیں آئی۔ یہی چار صفحے اور دیوتا ہی تو سسپنس کی جان ہیں۔"

ملک وال ضلع گجرات سے ملک اعجاز الحق مدنی چشتی سیالوی کچھ اس طرح گویا ہوئے ہیں: "سب سے پہلے تو میں آپ کے نام کو سلام عقیدت پیش کرتا ہوں اور اس کو بھی جس نے آپ کا اتنا پیارا نام رکھا ہے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ نے دنیا میں آپ کو جو عروج عطا فرمایا، اس مقدس نام کی وجہ سے ہے۔ کاروباری ہونے کے ساتھ ساتھ مذہب کے ساتھ بھی گہرا لگاؤ ہے لیکن کوئی بھی ڈائجسٹ یا رسالہ پڑھنے کا وقت نہیں ملتا۔ ہوا یوں کہ رمضان شریف میں میرے ماموں جان ملک خدا بخش صاحب اتنے بیمار ہو گئے کہ صرف چوبیس گھنٹوں میں پانچ چھ چمچے دودھ پیتے تھے۔ ان پر کمزوری کا بہت سخت غلبہ ہو گیا۔ یہاں یہ عرض کرتا چلوں کہ سسپنس باقاعدگی سے پڑھتے تھے۔ میرے یہ ماموں جان ملک خدا بخش صاحب ملک وال پرائمری اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ حکم فرمانے لگے کہ مجھے سسپنس لا دو۔ میں پڑھ تو سکتا نہیں، مجھے دیوتا کی کہانی ہی پڑھ کر سنا دو۔ میں حیران رہ گیا۔ ایک طرف ماموں جان کی جان پہ بنی ہوئی ہے، دوسری طرف ایسی کیا مجبوری ہے کہ کہانی سننے پر اصرار فرما رہے ہیں۔ میں نے

عرض کیا۔ دو چار دن کے بعد آپ کی طبیعت سنبھل جائے گی۔ آپ کو سُنا دیں گے۔ لیکن وہ نہیں مانے، بہرحال انھیں وہ پڑھ کر سُنائی۔ واقعی پڑھ کر مجھے محسوس ہوا کہ یہ کہانی کسی انسان کی لکھی ہوئی معلوم نہیں ہوتی بلکہ آپ کو یہ خزانہ کہیں زیرِ زمین ملا ہے جو صدیوں پُرانا ہے۔ کیوں کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان واقعات کے ساتھ انسان خود گھوم رہا ہے۔ ہاں تو عرض کر رہا تھا، ماموں جان نے فرمایا۔ پتا نہیں میری زندگی میں وہ ختم ہوگی یا نہیں۔ واہ ری قسمت، ماموں جان ۱۳ جولائی کو اس دُنیا فانی سے رُخصت ہو گئے۔ ماموں جان خود تو ہم سے پردہ فرما گئے لیکن جاتے جاتے اپنی لگن مجھے سسپنس کا شیدائی بنا گئے۔ اور اس کے بعد کچھ خطوں کے جواب، کچھ خط اور کچھ نام۔

سمندر پار مقیم سسپنس کے ایک قاری **صغیر احمد راجا** دہران سعودی عرب سے لکھتے ہیں: "محترم معراج رسول صاحب، سمندر پار جن جن مشکلات کا ہم کو سامنا کرنا پڑتا ہے، یہ آپ کبھی نہیں سمجھ سکیں گے مگر اس کے باوجود بھی ہم سسپنس کو ایک پل اپنے سے جدا نہیں کرتے۔ پہلے میں الریاض سے آپ کو خط لکھتا رہا اب دمام سے لکھ رہا ہوں۔ کافی عرصہ بے کاری کے بعد ایک کمپنی میں کام مل گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ اس دفعہ قیامت دیکھ کر خوشی ہوئی مگر مرزا امجد بیگ اور مسٹر نک ویلوٹ سے اب تک آپ نے ہم لوگوں کو محروم رکھا ہوا ہے جو کہ بُری بات ہے۔ اُمید ہے کہ ماہ ستمبر کے شمارے میں یہ لوگ موجود ہوں گے۔ باقی ہر تین ماہ کے بعد یورپ کی طرف آپ بھاگ نکلتے ہیں، کبھی سال بعد حج مبارک پر آجاؤ۔"

**محمد بشیر احسن** نے ریاض سعودی عرب سے اور **معظم حسین پیرزادہ** نے مدینہ منورہ سے خط بھیجے ہیں اور سسپنس کی تعریف وتوصیف کے علاوہ سالانہ خریداری سے متعلق استفسار کیا ہے۔ سعودی عرب میں رہنے والے سسپنس کے قارئین اگر سالانہ خریدار بننا چاہیں تو ڈرافٹ پر جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز اکاؤنٹ نمبر ۹۴۴ حبیب بینک لمیٹڈ کراچی لکھوا دیں۔

**شبیر احمد سومرو** نے سیتا روڈ ضلع دادو سے لکھا ہے کہ مریدق کے لیے ذاکر صاحب کام چور ہوتے جا رہے ہیں، ایک ہی موضوع پر مشتمل مائیٹل ہوتا ہے۔ بوریت ہونے لگتی ہے، کچھ تبدیلی ضروری ہے۔ انفرادیت بھی تو کوئی چیز ہے۔

**منیزہ جلیسی** صاحبہ نے کراچی سے لکھا ہے کہ آپ کبھی کبھی لکھتے ہیں کہ خط میں صرف تعریف تھی اس لیے جواب نہیں دیا تو آپ ہمیں بتائیں کہ ہم اس رسالے میں خامی کہاں سے نکالیں۔ اب تو عرصے سے اِملا اور کاپی جوڑنے کی غلطی بھی نظر نہیں آتی ___ منیزہ صاحبہ، خدا کے لیے نظر نہ لگائیں۔ دور خزاں کے سلسلے میں آپ کا قیاس غلط ثابت ہوا۔ آپ کی تعریف کا شکریہ۔

**محمد صالح ایمن** نے چنیسر گوٹھ کراچی سے لکھا ہے۔ ہر شخص پورا نہیں تو آدھا مطلبی ضرور ہوتا ہے۔ مثلاً میں سسپنس ڈائجسٹ لینے کے بعد سب سے پہلے آپ کے خط پڑھتا ہوں۔ گو کہ پرائے خطوط پڑھنا ایک اخلاقی جرم ہے مگر مجبوری یہ ہے کہ میرے مطلب کی چیز ہوتی ہی اس میں ہے۔ اس بار پہلا پیراگراف پڑھ کر ایک پُرانا لطیفہ یاد آ گیا۔ وہ کچھ یوں ہے کہ ایک عورت نے ایک نجومی کو ہاتھ دکھاتے ہوئے پوچھا "میری شادی ہونے والی ہے۔ ذرا بتا تاکہ میری ازدواجی زندگی کیسے گزرے گی؟" نجومی نے کہا "پہلے پہل چھ ماہ انتہائی مشکل حالات میں گزریں گے۔" عورت نے کچھ سوچا پھر پُر اُمید ہو کر بولی "اور اس کے بعد؟" نجومی نے جواب دیا "اس کے بعد تم ان حالات کی عادی ہو جاؤ گی۔" مطلب کچھ یوں نکلتا ہے کہ جب تک قیامت آ رہی ہے اس وقت تک سسپنس بارہ روپے کا رہے گا اور اس کے بعد قارئین عادی ہو جائیں گے حتیٰ کہ "قیامت" سچ مچ آ جائے گی۔

**شاہ عالم زمرد صاحب** جنرل میڈیکل اسٹور راولپنڈی۔ بھائی! ایک اچانک اندوہناک حادثے میں آپ کے بڑے بھائی صاحب کے انتقال کی خبر بہت افسوسناک تھی۔ بہرحال مشیت ایزدی میں کس کو چارہ ہے۔ افسوس کہ زبانی ہمدردی کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتے۔

**عبدالغفور** ۱۴/۱-۲۔ بھئی بڑا عجیب بتا ہے آپ کا۔ مہلت نامی کہانی پہلے واقعی شائع ہو چکی تھی۔ اس زمانے میں مدیر نہیں تھا۔ ناول کی تلخیص ہم شائع کرنا چاہتے ہیں لیکن آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ سسپنس کے صفحات میں کوئی بھرتی کی چیز نہیں ہوتی۔ چند چھوٹی کہانیاں ہوتی ہیں۔ جو کہانیوں کی فہرست میں اور رسالے کے مزاج میں توازن پیدا کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ خیر کوشش کی جائے گی کہ عنقریب کوئی اچھا سا ناول شائع کیا جائے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ صفحات مزید بڑھائے جائیں۔

**محمد فاروق عاصی** کھیوڑہ جہلم۔ بھتیا! آپ کو تو اکثر جواب ملتا رہتا ہے۔ اس بار پھر حاضر ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ سسپنس گشت کے لطائف پر ہمام کے ایک ہی صاحب کا قبضہ ہے۔ لگتا ہے آپ کا حساب کتاب کچھ کمزور ہے۔ موصوف کے بھیجے ہوئے لطیفے اور اقتباسات ۵ فی صد سے زیادہ نہیں اور پھر سسپنس میں کوئی سسٹم بھی نہیں ہے۔ یہاں اہلیت اپنی جگہ بناتی ہے اور اپنی بات منواتی ہے۔ اخراجات واقعی حد سے بڑھ گئے ہیں مگر ہمارے نہیں۔ کاغذ کے۔ پھر بھی ۳۲ صفحات بڑھا کر قیمت بڑھائی ہے۔ آپ یہ ضرور بتائیں کہ ۱۲ روپے میں آپ نے جو کچھ پڑھا، وہ پڑھ کر قیمت وصول ہوئی یا نہیں۔ کہیں آپ کو یہ احساس تو نہیں ہوا کہ آپ کے پیسے ضائع ہو گئے۔

**عاصم احسان** کالا گوجراں جہلم۔ بھائی! جو سوال آپ کے دماغ میں پیدا ہوتا ہے، اس کا جواب آپ اپنے دماغ سے ہی طلب کریں۔ ہم سے اس سلسلے میں جواب کی توقع نہ رکھیں کیوں کہ یہ کاروباری راز ہے۔

**حافظ منظور احمد** سرگودھا۔ آپ نے جس اہم غلطی کی طرف توجہ دلائی ہے۔ وہ مصنف کی نہیں بلکہ کاتب اور پھر پروف ریڈر کی ہے۔ بہرحال معذرت۔ تاریخی کہانی، قیامت، اور حریم وفا وغیرہ کا خلاصہ اس لیے نہیں دیا جاتا کہ یہ کہانیاں بہت طویل نہیں ہوتیں یعنی چند ماہ میں ہی ختم ہو جاتی ہیں۔ قارئین ذہنی کہانی پڑھتے وقت اگر پچھلی کہانی کو ایک نظر دیکھ لیں تو پوری کہانی تازہ ہو جائے گی۔

**عبدالقادر رند** ڈھاڈر کچھی۔ آپ نے مراسلہ تو اچھا بھیجا ہے لیکن حوالہ دینا بھول گئے۔ تاریخی، سیاسی، مذہبی، ادبی اقتباسات کے لیے حوالہ بھیجنا ضروری ہے۔ اُمید ہے کہ آئندہ نہ صرف آپ بلکہ سسپنس فیملی کے سارے ہی ممبر اس بات کا خیال رکھیں گے۔ اگر آپ اس مراسلے کو چھپوانا چاہتے ہیں تو ایک علیحدہ کاغذ پر مراسلہ صاف صاف لکھیں اور کتاب اور مصنف کا حوالہ اور صفحہ نمبر ضرور لکھیں۔

**محمد اصغر البجال** سبی بلوچستان سے لکھتے ہیں: "آج سے تقریباً سات ماہ پہلے خط لکھا تھا لیکن صرف نام شائع کر کے ٹرخا دیا گیا تھا۔ اس لیے امید ہے کہ اس مرتبہ خط کا نصیب ردّی کی ٹوکری نہیں ہوگی۔ الیاس سیتاپوری صاحب کی خاناں برباد بہت ہی پسند آئی۔ براہِ کرم اُن تک ہماری مبارک باد پہنچا دیں۔" محمد اصغر البجال صاحب! ہمارے یہاں آنے والے ہر خط کا نصیب ردّی کی ٹوکری ہی ہوتا ہے۔ البتہ تمام خطوط پڑھ کر ردّی کی ٹوکری میں ڈالے جاتے ہیں۔ ان سطور کے ذریعے آپ کی مبارک باد یقیناً الیاس سیتاپوری تک پہنچ گئی ہوگی۔

**محمد غفور** دالا اغرا چکیسر سوات۔ بھائی! آپ کا نام لکھنے میں اور ادا کرنے میں بہت دشواری ہوئی۔ اب اگر ہم سے یا کاتب سے یا پروف ریڈر کی غلطی سے کچھ غلط چھپ جائے تو ہمیں اور ہماری آنے والی نسلوں کو معاف کر دیجیے گا۔ آپ کو قیامت اور دیوتا بہت پسند ہیں۔ آپ اشرف طارق صاحب کو خط ہماری معرفت بھیج دیں۔ یقین رکھیں دیانت، امانت، صداقت اب ہمارا نعرہ ہے۔ پہلے پوسٹ آفس والوں کا ہوتا تھا۔

**غلام شبیر و مہر ریاض حسین ساغر** اسلام گنج کھیوڑہ نے لکھا ہے: "آپ نے قیامت کا آغاز دوبارہ کر دیا ہے جس کے لیے ہم شکر گزار ہیں۔ اس سے ہم جیسے بے بہرہ لوگ بھی فلسطین کے مسلمانوں پر ہونے والے مظالم سے روشناس ہوتے رہیں گے۔ ہم لوگ تو صرف اُن کے لیے دعا ہی کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلسطینی مسلمانوں کو یہودیوں کے جبر و تشدد سے محفوظ رکھے۔" غلام شبیر و مہر ریاض حسین ساغر صاحبان! جب علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا کہ الٰہی یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں — تو مقصود شاید ہم ہی لوگ تھے۔ ہم لوگ تو واقعی اسرائیلیوں کو ہر نماز جمعہ کے بعد بددعائیں دیتے رہیں گے اور وہ اپنا کام کرتے رہیں گے۔ خیر خدا ہم سب کو عقل بھی دے۔ اور اخوت اور محبت بھی کہ اتفاق میں بڑی برکت ہے۔

**حاجی دل محمد خان خٹک** راس تنورہ سعودی عرب۔ عزیز بھائی! سعودی عرب میں سسپنس کے جو شمارے جاتے تھے، ان میں سے تصوف کا مضمون نکال دیا جاتا تھا۔ پرچہ لیٹ جاتا تھا اور یوں کبھی کبھی تصوف سے پہلا اور آخری مضمون بھی ضائع ہو جاتا تھا۔ اس لیے اب سعودی عرب میں جو سسپنس جاتا ہے اور جس کی تعداد کئی ہزار ہے، اس میں سے تصوف کا مضمون نکال کر اس کی جگہ پر کوئی مکمل کہانی شائع کر دی جاتی ہے۔ فہرست میں سے تصوف کا نام نکالنا تقریباً ناممکن ہے۔ اس کی وجوہات تکنیکی ہیں اور اس تبدیلی سے پرچے کی اشاعت میں تاخیر کا امکان ہوتا ہے۔

**محمد کامران** کریم پورہ لالہ موسیٰ سے لکھتے ہیں: "ترجمہ کی ہوئی کہانیاں اگر ایک سے زائد بار چھپ جائیں تو وہ نہ سرقہ کہلائے گا اور نہ توارد۔ لیکن مرزا حید رعباس کی بڑا ادیب کی سسپنس میں اشاعت پر مجھے بڑی حیرانگی ہوئی کیوں کہ اسی قسم کی کہانی میں پہلے کئی بار بچوں کے ہی رسالوں میں ہم بنے ادیب اور ٹلفلِ مکتب جیسے ناموں سے پڑھ چکا ہوں۔ اُمید ہے کہ ایسی سنگین غلطیاں دوبارہ نہیں ہوں گی۔" محمد کامران صاحب! مرزا حید رعباس اب تو خاصے بڑے لگتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ بچپن میں وہ بچوں کے رسالوں میں چھپتے چھپاتے رہے ہوں، خیر اس سلسلے میں یہ آپ کا پہلا خط ہے۔ یقین ہے کہ اس سلسلے میں کچھ غلط فہمی وغیرہ ہو گئی ہوگی۔ بہتر ہوتا کہ آپ کوئی ثبوت بھی ساتھ ہی بھیج دیتے۔

**محمد احسن** آئی سی آئی کھیوڑہ ضلع جہلم۔ آپ کو ترجم وفا کے جو صفحات سیاہ ملے ہیں، اگر آپ ان کو اسی سیاہ شکل میں پھاڑ کر عام ڈاک سے واپس بھجوا دیں تو آپ کو ایک تازہ بتازہ (ڈبل روٹی کی طرح) رسالہ بھجوا دیا جائے گا۔

**چوھدری عمر حیات بسرا** کالی صوبہ خان۔ امید ہے کہ اس بار آپ کے نام میں اور شہر کے نام میں کوئی غلطی نہیں رہی ہوگی۔ آپ کے والد محترم کے انتقال کا صدمہ واقعی آپ کے لیے بہت بڑا ہے۔ چوہدری عمر حیات بسرا نے درخواست کی ہے کہ سسپنس فیملی کے ممبران اُن کے والد کے لیے دعائے مغفرت کریں۔

کراچی کے **رمضان پاشا**۔ بچپن میں کلر والی ٹیکنی کلر فلمیں دیکھا کرتے تھے۔ لیکن یہ خیال نہیں تھا کہ رنگوں کی اتنی قسمیں ہوتی ہیں کہ ہر سطر ایک نئے رنگ سے لکھی جا سکتی ہے۔ خیر تمہارے رنگین خط کا سب سے نمایاں لفظ "خبیث ٹوکری" تھا۔ اور بالآخر تمہارا خط اُسی کے جثے میں پہنچ گیا۔

**مقبول الرحمان** پوسٹ بکس نمبر ۸۰۹۳ دوحہ۔ اور **عبدالہادی** گڑھی کپورہ ضلع مردان۔ آپ دونوں کو خط کا جواب براہِ راست دیا جا رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی ان قارئین کے نام نامی اور اسم گرامی جن کے خطوط کے جواب تفصیلی طور پر نہ دیے جا سکے — اور اس کے ساتھ ہی خدا حافظ۔

عرفان شوکت، چکوال۔ طاہر سفیر، دوحہ قطر۔ میاں خالد امین شاہد، گوجرانوالہ۔ سیما خان، جیکب آباد۔ شیخ منظور احمد، لاہور۔ عبدالعلیم گاکھڑ، لاہور۔ محمد یونس، فیصل آباد۔ عبدالرحمان چغتائی، ڈھلی آزاد کشمیر۔ ملک ارشد محمود، ڈنڈوت۔ ریاض احمد سالک، ٹنڈو منڈی۔ جاوید رسول، لاہور۔ اکبر علی محمد زئی، چارسدہ۔ نصراللہ بگٹی، کروڑ لعل عیسن۔ اسلم حفیظ، ڈیرہ اسمٰعیل خان۔ نور جہاں انجم، سرگودھا۔ شکیلہ ہاشم تبسم، جھنگ۔ عبدالسلام عادل، الماس کریم، حیدر آباد۔ راجا گل حسن بدر، خوشاب۔ جی ایم اسماعیل مرد شہوازی، دمام۔ محمد حید، سعودی عرب۔ شازیہ رزاق، اوکاڑہ۔ خالد نیازی ٹکالی، سرگودھا۔ شاہد رشید، کوہاٹ کینٹ۔ محمد ریاض گجر، فیصل آباد۔ علاؤالدین ساگر، گلگت۔ حاجی بابر خان، ملکوال۔ ثمینہ اشرف خان، ارنگ پورہ۔ خورشید عالم، گوجرانوالہ۔ ایم آئی خان اظہر، چارسدہ۔ رانا حاکم علی شہزاد، کوئٹہ کینٹ۔ نبی بخش مغل، بہیڑ عاقل۔ قمر عباس بخاری، لانڈھی کراچی۔ محمد الیاس کاشف، پلانچھ آزاد کشمیر۔ عادل یزدانی، چنیوٹ۔ محمد عباس ہاشمی، رائے ونڈ۔ عبدالرؤف خان، میرپور خاص۔ سید محمد علی شاہ، دبئی۔ ایم اسلم پردیسی، مقام نامعلوم۔ سعیدہ، چکوال۔ محبوب عالم شاہین، فخراللہ ہارون آباد۔ سید محمد نواز شاہ خاکسار، نصیر آباد۔ امتیاز احمد، مریدوالا۔ جی ایچ قریشی، گوجرانوالہ۔ یاسمین زمان، لاہور۔ شوکت اقبال، فیصل آباد۔ ایم آئی بٹ، بہاری کالونی گوجرانوالہ۔ شبانہ انصاری، قطب پور تحصیل لودھراں۔ رعنا نقوی، صبا نقوی، ساہی وال۔ محمد اقبال احمد انصاری، اورنگی ٹاؤن کراچی۔ شہزاد ندیم، اٹیہ۔ ڈاکٹر راجہ سعید احمد، راجہ کلینک نئی آبادی ڈھوک جمعہ جہلم۔ زر ولی شاہ خٹک، گماؤں کندھا سراج خیل کرک۔

# Die Frau des Orients
## zwischen Gestern und Heute

Zeichnungen
von Egbal Mehdi

**Ausstellung**
**im Künstlerhaus am Lenbachplatz / München**
geöffnet am 3. und 4. August 1984 jeweils von 11 - 20 Uhr – Eintritt frei

پاکستان کے نامور مصور اقبال مہدی کی سسپنس میں شائع شدہ تصویروں کی ایک نمائش مغربی جرمنی کے شہر میونخ کی سب سے بڑی آرٹ گیلری کونسلا ھاؤس میں ہوئی۔ اس نمائش کا عنوان تھا۔

## خواتینِ مشرق ——— کل اور آج

اس نمائش کو آرٹ کے ہزاروں پرستاروں نے دیکھا اور سراہا۔

سسپنس ڈائجسٹ

# پاش پاش

الیاس سیتاپوری

تاریخ کا ایک غیر معمولی کردار، جس کے آباؤ اجداد سے حکومت چھن گئی تھی مگر اس نے جلاوطنی اور غریب الدیاری میں خود کو اُٹھانے کی کوشش کی اور نہایت ہوشیاری اور چالاکی سے اچانک ایک ایسا کارنامہ انجام دیا کہ اس کی ہم عصر بڑی طاقتیں بھی حیرت زدہ رہ گئیں۔ اس کی زندگی مسلسل جدوجہد تھی۔ اس کی فکر تڑپ تھی، اس کا عمل خلق کن تھا جو اس نے کسی کو اس کرنے کا جو دیا تھا۔ ایک کمزور نوجوان سے زورآور بننے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ لیکن تقدیر — تقدیر پر کسی کو اختیار نہیں! اس کی ہنگامہ پرور جدوجہد میں تقدیر اس پر ہنس رہی تھی۔ تقدیر نے اچانک اس کو جس جگہ پہنچا دیا تھا وہ وہی تھی جہاں سے وہ چلا تھا۔ بےبس، دل شکستہ اور قابلِ رحم انسان تقدیر کی ہنسی کا شکار ہو گیا۔ لیکن اس کو یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ المیہ اور ناکامی جس نے اس کو اندر سے پاش پاش کر دیا تھا، اس کے بامِ عروج تک پہنچنے کی پہلی سیڑھی تھے۔

ایک ایسے شخص کی کہانی جس کا تاریخوں میں بدلے نام ذکر کیا گیا ہے لیکن اس کی اولاد ایک حکمران خاندان کی بانی قرار پائی

سسپنس ڈائجسٹ ستمبر 1984ء

جوق نے جس خطرناک ماحول میں پرورش پائی تھی، اس نے اسے سنگدل اور سفاک بنا دیا تھا۔ ایران کے آخری آتش پرست فرماں روا یزدگرد کی اولاد بھول چکی تھی۔ اب یہ لوگ خود کو ایرانی کے بجائے ترک کہلانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ خاندان کی وہ بڑی بوڑھیاں، جو کئی نسلوں کے بعد بھی زرتشت اور اس کی تعلیمات پر یقین اور اعتقاد رکھتی تھیں۔ اب بھی اپنی اولاد کو یہی بتاتی رہتی تھیں کہ ایک نہ ایک دن شر کے خدا اہرمن کو شکست ہوگی — اور خیر کا خدا اہورامزدا اہرمن پر فیصلہ کن فتح حاصل کرے گا، وہ اب بھی جنوب سے آنے والی ہواؤں میں اپنے آبائی وطن کی خوشبو محسوس کرتی تھیں اور انھیں یقین تھا کہ وہ دن جلد آنے والا ہے جب ان کے ملک کو عربوں سے آزاد کرا لیا جائے گا اور سرزمین ایران میں ایک بار پھر زرتشت اور اس کی تعلیمات کا بول بالا ہوگا۔

لیکن ان بڑی بوڑھیوں کے برعکس ان کی جس نسل نے ترک قبائل میں آنکھ کھولی تھی اور جس نے بے شعوری سے شعور کی دور تک اپنے آس پاس ہر طرف بس طاقت ہی کی کارفرمائیاں دیکھی تھیں، اس کو کسی بھی مذہب سے کوئی تعلق نہ تھا۔ نہ اخلاقیات اور مذہبیات کے بارے میں وہ کچھ جاننا بھی نہیں چاہتے تھے۔ ان کے لیے بس یہی کافی تھا کہ ان کے قبائلی افراد میں بہت زیادہ اضافہ ہوتا جائے۔ ان کے مویشیوں کی تعداد بڑھتی رہے اور ان مویشیوں کے لیے انھیں نئی چراگاہیں ملتی رہیں۔ ان کے پاس مروّجہ ہتھیاروں کی فراوانی ہو اور ان کے جوان اور بوڑھے ان ہتھیاروں کے ماہرانہ استعمال پر حاوی ہوں۔ ان کو ہمیشہ ایسی سوجھ بوجھ اور عقل درکار رہتی تھی جو ہر معاملے میں بروقت اور صحیح فیصلہ کر سکتی ہو۔ وہ تیز ذہن اور چالاک افراد کو اپنا قیمتی سرمایہ سمجھتے تھے۔ رحم اور مروّت ان کے نزدیک انسان کی سب سے بڑی کمزوری تھے۔ ان حالات اور ماحول میں جوق نے پرورش پائی تھی۔ قبیلے کا جو فرد اپنی خوراک خود اپنی کوشش اور جدوجہد سے نہیں حاصل کر سکتا تھا وہ قبیلے کی نظروں میں زیادہ اہم نہیں تھا اور ایسا شخص قبیلے میں رہ تو سکتا تھا مگر قبیلے میں کوئی خاص مقام یا منصب نہیں حاصل کر سکتا تھا۔

جوق نے بچپن ہی سے اپنے بازوؤں کی قوت اور غیر معمولی فراست پر زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی عادت ڈالی تھی۔ وہ اپنی بڑی بوڑھیوں کے اس فخر پر کبھی بھی نازاں نہ ہوا کہ وہ ایرانی فرماں روا یزدگرد کی نسل سے تعلق رکھتا ہے، بلکہ وہ یہ چاہتا تھا کہ آئندہ اس کا خاندان خود اس کے اور اس کے کارناموں سے پہچانا جائے۔

جوق نے اکثر خجند کی شکارگاہ سے پہاڑی بکرے، سفید ہرن، بارہ سنگھے اور پرندوں کا شکار کیا اور اس نے شکار سے اپنا ہی پیٹ بھرا اور اپنے دوستوں کو بھی آسودہ کیا۔ وہ اپنے باپ کا چھوٹا بیٹا تھا۔ اس لیے اس کا نام جوق رکھا گیا تھا کیوں کہ ترکی زبان میں جوق کا مطلب ہے چھوٹا۔ اس چھوٹے نے ہمیشہ کام بڑے بڑے سر انجام دیے۔ جوق نے جوانی میں قدم رکھا تو ایسا صحت مند نکلا کہ حد اور بس، جو دیکھتا دیکھتا ہی رہ جاتا۔ جب دوستوں میں کھڑا ہوتا تو سب سے الگ اور اونچا نظر آتا۔ اونچائی میں فربہی بھی شامل تھی۔ فربہی بھی کون سی؟ چربی والی نہیں، صحت مندی والی۔ کلائی کی قوت کا یہ کمال تھا کہ ایک ہی ضرب میں چوپائے اور گیج کا ستون کاٹ کے رکھ دیتا تھا۔ جوق کی جوانی کے ساتھ ساتھ اس کے باپ ارسلان کا بڑھاپا بھی تیزی سے بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ اپنی قوم کا سردار ارسلان اپنے قویٰ میں نہایت سرعت سے آتے ہوئے اضمحلال اور زوال کو دیکھ بھی رہا تھا اور محسوس بھی کر رہا تھا۔ اب اس میں قائدانہ صلاحیتیں روبہ زوال تھیں، اس کے اعضا اور قویٰ مائل بہ انحطاط تھے۔ اس کا حافظہ بھی جواب دے رہا تھا اور نسیان نے یہاں تک غلبہ پا لیا تھا۔ گزشتہ صورتوں کو پہچان تو لیتا تھا مگر ان کے نام بھول جاتا تھا۔ سارے دن جو واقعات پیش آتے، شام تک چند یاد رہ جاتے باقی نسیان کی نذر ہو جاتے۔ صبح کا کھایا ہوا شام کو یاد نہ رہتا اور شام کا کھایا ہوا صبح تک حافظے سے محو ہو جاتا۔ یہ جب اپنے قبیلے کی قیادت کرتا تو حملے یا یلغار کے وقت اس کے ذہن کی تیزی دھوکا دے جاتی اور وہ اُلٹے سیدھے حکم دے کر خود کو نقصان پہنچا لیتا۔ اس کے اپنے لوگ اب ارسلان میں نہیں، اس کے ہونہار، ذہین اور طاقتور بیٹے جوق میں دلچسپی لینے لگے تھے۔

جوق کی ماں لیشہ بھی اپنے شوہر ارسلان کے ہوش و حواس کی بکھرتی ہوئی دیوارِ حیات کو اضطراب اور بے چینی سے دیکھ رہی تھی۔ لیکن کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ لیشہ کو اس بات کا اندیشہ تھا کہ کہیں ارسلان کی آنکھوں کے بند ہوتے ہی قبیلے کے لوگ جوق کے بجائے کسی اور کا انتخاب نہ کر لیں۔ اس لیے وہ اپنے جوق کو ارسلان کی زندگی اور موجودگی ہی میں سردار دیکھنا چاہتی تھی — اس نے کئی بار اپنے شوہر ارسلان کو کہا: "دیکھ سردار! زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔ ہمارا آخری وقت ہے۔ میں بھی مر سکتی ہوں اور تو بھی۔ اس لیے ان حالات میں، میں اپنے شوہر اور قوم کے سردار سے ایک درخواست کروں گی۔"

ارسلان نے اجازت دے دی۔ "ہاں تو بول، تو ہم سے کیا چاہتی ہے؟"

لیشہ نے جواب دیا۔ "سردار! اپنی زندگی ہی میں اپنے

ہوشیار اور لائق بیٹے جوق کو سردار بنا دو ورنہ بعد میں ہنگامے اُٹھ کھڑے ہوں گے اور قوم انتشار اور نا اتفاقی کا شکار ہو جائے گی۔"

ارسلان کو اپنی بیوی کی بات اچھی نہیں لگی، بولا۔ "ابھی تو میں زندہ ہوں اور برسوں زندہ رہوں گا اور جوق کے مقابلہ میں زیادہ تجربے کار اور سرد و گرم چشیدہ ہوں۔ میرے ہوتے ہوئے تیرا یہ موٹا بچھڑا بیکار اور فضول ہے۔"

لیکن پشہ کہاں باز آنے والی تھی، اپنے شوہر کا مذاق اُڑانے لگی۔ "سردار آ گیا کہنے تمھاری سرداری کے۔ قوت اور توانائی کا یہ حال ہے کہ گھوڑے کی لگام رعشہ زدہ ہاتھ سے چھوٹ چھوٹ جاتی ہے۔ گھوڑے پر چڑھنے کے دوران پاؤں رکاب سے نکل جاتے ہیں اور حافظے کا یہ حال ہے کہ تمھیں اپنی بیوی بچوں کے نام تک یاد نہیں رہتے۔ کیا تم نے قوم کے نوجوانوں کو اپنی بھول چوک اور سہو اور فروگزاشت پر طنزاً مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا؟ سردار! اب تمھاری سرداری رسمی سی چیز رہ گئی ہے اور وہ دن زیادہ دور نہیں ہیں جب تمھاری قوم کے سمجھ دار لوگ تمھاری سرداری کے جوئے کو اپنی گردنوں سے جبراً اتار پھینکیں۔"

ارسلان کو جیسے ہوش آ گیا۔ حیرت سے پوچھا۔ "کیا واقعی میری قوم کے نوجوان مجھ پر طنزاً مسکراتے ہیں؟"

بیوی نے جواب دیا۔ "میں جھوٹ کیوں بولوں گی سردار۔ میں نے جو دیکھا بیان کر دیا۔"

ارسلان سوچ میں پڑ گیا۔ فکروں نے اسے گھیر لیا تھا۔ پوچھا۔ "پھر اب مجھ کو کیا کرنا چاہیے؟"

بیوی نے پھر وہی مشورہ دیا۔ "سردار! تم تو کرو آرام اور اپنے بیٹے جوق کو قبیلے کا سردار بنا لو۔"

ارسلان بدستور ہچکچا رہا تھا، اس نے جواب دیا۔ "پشہ! اگر تم کہتی ہو تو میں تمھاری خواہش پوری کر دوں گا ورنہ میں ابھی اپنی سرداری سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہوں۔" اس کے بعد ارسلان نے اپنے بیٹے جوق کو طلب کیا اور پوچھا۔ "جوق! تیری ماں بضد ہے کہ میں اپنی سرداری سے دستبردار ہو جاؤں اور تجھ کو قبیلے کا سردار بنا دوں۔ میں نے تیری ماں کی بات نہیں مانی اور اب میں وہی کرنے جا رہا ہوں جس پر تیری ماں زور دیا کرتی تھی۔" اس کے بعد جوق سے کہا۔ "تجھ پر فرض کیا گیا کہ تو خود ایک ماہ تک اپنے قبیلے کے لیے کھانے کا انتظام کرے گا۔ اس میں کوئی دوسرا تیری مدد نہیں کرے گا اور نہ ہی میں تیری مدد کروں گا۔" جوق نے جواب دیا۔ "مجھے یہ شرط منظور ہے۔"

ارسلان نے جوق کو گھورتے ہوئے دیکھا۔ "تو گویا تو خود بھی سرداری کا خواہاں ہے؟"

جوق نے جواب دیا۔ "ہاں میں خود بھی سرداری کا خواہاں ہوں۔ کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ میرا بوڑھا باپ اب آرام کرے۔"

ارسلان تھک سا گیا، بولا۔ "ہاں اب میں واقعی خود کو تھکا تھکا سا محسوس کر رہا ہوں۔"

پشہ بہت خوش تھی، قبیلے والے بھی خوش ہوئے کیونکہ اب وہ بھی اپنے بوڑھے اور کمزور سردار سے اکتا گئے تھے۔ ارسلان نے اپنے قبیلے والوں کو یکجا کیا اور انھیں صاف صاف بتا دیا کہ اب وہ آرام کرنا چاہتا ہے اور اپنی سرداری کے فرائض جوق کے حوالے کرتا ہے۔ جب وہ یہ اعلان کر رہا تھا تو اندرونی کرب و اذیت سے اُس کا گلا رندھ گیا تھا جس سے اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

کسی عمر رسیدہ شخص نے پوچھا۔ "یہ سرداری چھوڑنے کا اچانک خیال کیوں آ گیا؟"

ارسلان نے جواب دیا۔ "جب میں نے اپنی بیوی سے یہ سُنا کہ قبیلے کے نوجوان میرے رعشہ زدہ اعضا پر طنزاً مسکراتے ہیں تو میں شرمندہ ہو گیا اور خود کو سرداری کے لائق نہ سمجھنے پر مجبور ہو گیا۔"

ارسلان کے اس اعتراف نے لوگوں کو ہنسنے پر مجبور کر دیا اور ارسلان نے جب یہ منظر خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تو اس کو اپنی کمزوریوں پر یقین بھی آ گیا اور صبر بھی۔

اس عمر رسیدہ شخص نے پوچھا۔ "کیا تیرا بیٹا جوق سرداری کا اہل ہے؟ اور یہ ہمیں دوسری قوموں کے سامنے شرمندہ تو نہیں کرے گا؟"

ارسلان نے جواب دیا۔ "شاید نہیں، شاید ایسا نہ ہو۔ جوق عقلمند بھی ہے اور بہادر بھی۔ اس کا جسم تو دیکھو، بالکل بیل کی طرح قوی ہیکل قرا بجکم یعنی سیاہ نر گاؤ۔ بیل کی یہ قسم بدخشاں اور واخان کے کہساروں میں پائی جاتی ہے۔ اس قوی ہیکل اور تنومند بیل کی یہ خصوصیت ہے کہ پہاڑوں پر چڑھ کے اپنی غذا خود تلاش کر لیتا ہے اس کی خوراک کے لیے کسی اور کو فکر نہیں کرنا پڑتی۔ میرا بیٹا جوق سیاہ بیل کی طرح ہے۔"

قبیلے کے نوجوان جوق کو پسند کرتے تھے انھوں نے جوشِ مسرت سے نعرے لگائے اور اسے اپنے کاندھوں پر اٹھا لیا۔ جوق بھی بہت خوش تھا۔ اس کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں نوجوانوں نے اس کو کاندھے پر لیے لیے قبیلے والوں میں گھمانا پھرانا شروع کر دیا۔ ان کے ساتھ ساتھ بچوں کی ٹولیاں بھی تھیں اور یہ سب خوشی سے رقص کر رہے تھے۔ عورتیں اور بچے اس سیاہ بیل کو پُر شوق نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

اس ہنگامے میں بوڑھے ارسلان کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "اب یہ جوق کی ذمے داری ہے کہ وہ اپنے شکار سے قبیلے والوں کی دعوت کرے۔"

اس رات بڑا ہنگامہ رہا۔ اس رات مشعلوں کی روشنی میں ارسلان کی سرداری اندھیروں میں چلی گئی اور جوق کی سرداری کا آفتاب طلوع ہوگیا۔ ان لوگوں نے رات بھر شرابیں پیں اور جشن مناتے رہے۔

جوق کا تیز ذہن اب کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ اب وہ سرداری کے انداز میں سوچ رہا تھا۔ اس نے اپنے قبیلے والوں کو ایک عجیب گر کی بات بتائی۔ اس نے اعلان کیا۔ "آج سے میرا پورا قبیلہ قبائلی لوٹ مار میں مروجہ طریقوں سے حصّہ نہیں لے گا۔ ہم لوٹ مار کریں گے لیکن اس لوٹ مار میں ہم اپنے پورے قبیلے کو ملوث نہیں کریں گے۔"

قبیلے والے اس اعلان سے پریشان ہوگئے کیونکہ انھیں اپنے ذاتی تجربوں سے یہ بات معلوم ہوچکی تھی کہ ترکستان کا ہر قبیلہ معاشی اور اقتصادی طور پر اس لیے زندہ اور آسودہ ہے کہ وہ لوٹ مار کرتا ہے، قزاقی اور رہزنی کا ماہر ہے۔ ان کی معاشیات اور اقتصادیات میں چوری اور ڈکیتی کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ چوری، شہ زوری، قزاقی اور رہزنی ان کی معیشت کے بنیادی ستون تھے۔ اس سوچ کے زیرِ اثر جب انھیں یہ بتایا گیا کہ اب جوق لوٹ مار اور قتل و غارت گری میں پورے قبیلے کو نہیں شامل کیا کرے گا تو وہ یہ سوچنے لگے کہ پھر پورے قبیلے کی معیشت کا کیا ہوگا؟

کسی بوڑھے نے جوق سے پوچھا۔ "اگر ہم ایسا کریں گے یعنی ہماری معیشت میں ہمارے جملہ آدمی ملوث نہیں ہوں گے تو پھر اس کا بنے گا کیا؟"

جوق نے جواب دیا۔ "کچھ لوگ دوسرے قبائل کو اپنی پیشہ ورانہ خدمت پیش کرکے لوٹ کے مال میں مساوی حصّہ بجز اکر لیا کریں گے اور ہمیں یقین ہے کہ ہم اس طرح بہت زیادہ حاصل کرلیا کریں گے۔ اس طرح ہم دوسرے قبائل کی دشمنی سے بھی محفوظ رہیں گے۔ دشمنی وہ قبیلہ مول لے گا جس کے سارے مرد لوٹ مار کریں گے اور فائدہ ہم اٹھائیں گے۔"

جوق کی یہ تجویز سب کی سمجھ میں نہ آسکی، جو سمجھے تھے وہ بھی اس کو پوری طرح نہیں سمجھے۔ ارسلان بھی یہی سمجھا کہ اس کا جوان بیٹا شاید کچھ زیادہ ہی عقل مندی اور خود اعتمادی کا شکار ہوگیا ہے۔ اس نے اپنے بیٹے کو سمجھایا۔ "جوق! اب تو سردار ہے اور ہم سب تیری ہی قیادت میں آگے بڑھیں گے اور پیچھے ہٹیں گے تو جو چاہے کرے مگر اس کا خاص خیال رہے کہ ہر قدم خوب سوچ سمجھ کے اٹھایا جائے گا تو شاید ناکامی کا منہ کم دیکھنا پڑے اور اگر یہی قدم ناتجربے کاری اور عجلت میں اٹھائے گئے تو ہمیں شرمندگیوں سے دوچار ہونا پڑے گا۔"

جوق نے اپنے باپ ارسلان کی باتوں پر کوئی توجہ ہی نہ دی اور اعلان کر دیا۔ "کل میں اپنے شکار سے قبیلے والوں کی دعوت کر رہا ہوں۔ دوستو! خوب پیٹ بھر کے کھانا اور بعد میں یہ نہ کہنا کہ ہم تو وہاں سے بھوکے اٹھ آئے۔"

اُس رات بڑا جشن رہا اور خوب خوب ناچ اور گانے پیش کیے گئے۔ وہ بڑی بوڑھیاں جو اب بھی زرتشت کے دین پر یقین رکھتی تھیں اور جو اس امید میں زندہ تھیں کہ ایک نہ ایک دن یہ دین (زرتشتی مذہب) پھر عروج حاصل کرے گا وہ جوق کی سرداری میں اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھ اور محسوس کررہی تھیں۔

دوسرے دن علی الصباح، جوق قبیلے کے کئی سو جوانوں کے ساتھ شکارگاہوں میں چلا گیا۔ یہ ہتھیاروں سے آراستہ جوان خالص وحشی ترکوں کے انداز میں پہاڑی بکروں، ہرنوں، بارہ سنگوں اور خرگوشوں کا شکار کرنے لگے۔ انھوں نے جہاں کہیں ان جانوروں کی ڈار دیکھی، وہیں نیم دائرے میں پھیل کر انھیں اپنے حصار میں لے لیا اور انھیں اتنی مہارت اور مشاقی سے مار گرایا کہ چند گھنٹوں میں شکار کا ڈھیر لگا دیا۔ شکار کا یہ طریقہ وہیں کامیاب رہتا تھا جہاں شکار کھیلنے والے ہزاروں میں ہوتے۔ لیکن جوق کا کمال یہ تھا کہ اس نے یہ شکار سیکڑوں جوانوں کے ساتھ کھیلا تھا اور حیرت انگیز کامیابی حاصل کی تھی۔

سہ پہر تک وہ شکار سے فارغ ہوچکے تھے۔ خجند کے سبزہ زاروں میں آباد جوق کے قبیلے والوں نے جب یہ حیرت انگیز منظر دیکھا کہ سیکڑوں جوان جوق کے ہمراہ اپنی اپنی قبراک میں شکار کیے ہوئے جانوروں کو باندھے لیے چلے آرہے ہیں تو وہ حیرت زدہ بھی ہوئے اور بے انتہا خوش بھی۔ ایسا پُرلطف اور روح افزا منظر انھوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

شکار کیے ہوئے جانوروں کو میدان میں ڈال دیا گیا اور قبیلے کو دعوت دی گئی کہ وہ انھیں قریب کھڑے ہو کر دیکھیں۔ دوسری طرف پتھروں کے عارضی چولھوں کو روشن کرکے ان پہ دیگیں چڑھا دی گئیں۔

جوق نے شکار کیے ہوئے جانوروں کے پاس کھڑے ہو کے اعلان کیا۔ "آج میری سرداری کا پہلا دن ہے اور میں ان جانوروں کی موجودگی میں فخریہ یہ اعلان کر سکتا ہوں کہ میں اپنے قبیلے کا پیٹ بھر سکتا ہوں۔ میں اپنے قبیلے کو بھوکا

نہیں رکھوں گا اور میں اپنے قبیلے کو ایک نہ ایک دن انتہائی خوش حال اور آسودہ حال کر دوں گا۔"

قبیلے کا ہر شخص بہت خوش تھا اور جوق جو کچھ بھی کہہ رہا تھا۔ قبیلہ اس پر یقین کر رہا تھا۔

اس رات پورے قبیلے نے اتنا کھایا کہ ان کے ہاضمے بگڑ گئے ——— وہ ساری رات بھنا ہوا گوشت کھاتے اور شراب پیتے رہے ——— ارسلان رشک میں مبتلا تھا اور اُس کی بیوی نیشہ خوشی اور فخر محسوس کر رہی تھی، جوق بھی گوشت کھا رہا تھا اور شراب پی رہا تھا۔ مگر وہ اس وقت بھی بہت فکرمند تھا، وہ اس وقت بھی کچھ سوچ رہا تھا۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ نیشہ نے اپنے فکرمند بیٹے سے پوچھا۔ "اب تو کیا سوچ رہا ہے؟ تُو نے تو اپنے قبیلے کا اتنا زیادہ پیٹ بھر دیا ہے کہ تجھے اب کچھ اور سوچنے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔"

جوق اپنی ماں کے پاس بیٹھ گیا، اور اسے اپنی اذیت اور کرب سے آگاہ کیا۔ "ماں! یہ تو ایک دن اور ایک رات کی خوشی کا سامان ہے۔ اب میں یہ سوچ رہا ہوں کہ انھیں اب کیا دوں گا۔ انھیں کل کیا دیا جائے گا کہ ان کی خوشیوں کا تسلسل قائم رہے اور خوشیوں کا تواتر نہ ٹوٹے۔"

ماں نے جواب دیا۔ "یہ سب پھر سوچ لینا۔ کل، پرسوں، اترسوں، کسی بھی دن سوچ لینا۔ اب جلدی بھی کیا ہے۔"

جوق نے کہا۔ "نہیں ماں! مجھے کل کیا کرنا ہے، یہ آج ہی سوچنا ہے، کل کی سوچ پرسوں سے متعلق ہوگی اور پرسوں کی سوچ اترسوں سے۔"

اب اسے میر بزرگ یاد آرہا تھا، وہ بوڑھا ترک سردار، جو سالوں پہلے، جب وہ دس گیارہ سال کا تھا، اس کا شفیق بزرگ ثابت ہوا تھا اور جس کے تعاون سے اس نے اپنی ماں کو حاصل کیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ پتا نہیں میر بزرگ زندہ بھی ہے یا مر گیا۔ اور اگر وہ زندہ بھی ہے تو کیا وہ اب بھی اپنے قبیلے کا سردار ہے؟ یا پھر یہ کہ کسی اور نے اس کی جگہ لے لی۔ اس کو غیاث بیگ ——— بھی یاد آیا جو میر بزرگ کی جگہ حاصل کرنے کے لیے سازشیں کرتا تھا اور میر بزرگ سے معاندانہ پرخاش رکھتا تھا اور غیاث بیگ کے ساتھ ہی بابا ساغرچی بھی یاد آ گئے۔ میر بزرگ نے اپنی عدم موجودگی میں بابا ساغرچی کو قبیلے کا سردار مقرر کر دیا تھا۔ جوق کو نوجوان طغائی بھی بہت یاد آیا اور اس کے ساتھ آق بوغا بھی۔ وہ اُجڈ اور کم عقل پہلوان، جو بہت کم عقل کی باتیں کرتا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ پتا نہیں یہ سب کہاں ہوں گے؟ اور وہ انھیں کہاں تلاش کرے؟

جوق نے فی الحال یہ فیصلہ کیا کہ اپنے قبیلے کو خجند سے نکال کے کاشغر لے گیا اور شاہراہ ریشم سے ایک فرسخ دور ——— اپنے خیمے نصب کرا دیے۔ قبیلے والے اس کی اس حکمتِ عملی کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ یہ شاہراہِ ریشم تجارتی قافلوں کی مشہور ترین گزرگاہ تھی۔ چین سے ترکستان، ایران، افغانستان اور عراق و عرب اور مصر تک اسی شاہراہ سے گزر کے قافلے اپنی منزلِ مقصود کو پہنچا کرتے تھے۔ یہیں سے برصغیر میں داخل ہو جاتے تھے۔ جوق نے انتہائی غور و فکر کے بعد اپنے قبیلے کے لیے اس جگہ کو پسند کیا تھا کیونکہ وہ خوب جانتا تھا کہ انسانی شکار کے لیے یہ معقول ترین شکارگاہ تھی اور تجارتی قافلوں کی لوٹ مار سے انھیں جو کچھ مل سکتا تھا، اس سے وہ بخوبی واقف تھا اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ تاجر لوگ جنگجو نہیں ہوتے اور وہ جوق کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

جب وہ یہاں آباد ہوا تو قبیلے کے اکثر بوڑھوں کو یہ جگہ پسند نہیں آئی۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ یہاں خجند، کاشان اور سمرقند جیسے نہ تو باغات ہیں اور نہ اناج کی فصلیں۔ آخر یہاں سے ان کو کیا ملے گا؟ لیکن جوق کا کہنا یہ تھا کہ انھیں یہیں سے سب کچھ ملے گا۔ قیمتی سامان، غلہ، اناج، غلام اور پھل، کیونکہ اسی راستے سے تجارتی قافلے اپنی قیمتی اشیاء کے ساتھ گزرتے تھے چنانچہ یہاں آباد ہونے کے پانچویں دن ہی اس نے ایک قافلے پر کامیاب چھاپہ مارا، یہ قافلہ چین سے قیمتی سامان لے کر آیا تھا۔ ریشمی تھان، مشک، چاندی کے ظروف، زیورات، تیروں کے پھل، بخیئے کا سامان اور بہت سارا اناج۔ جوق نے یہ سارا سامان لوٹ لیا تھا اور جو مرد قتل ہونے سے بچ گئے تھے انھیں غلام بنا لیا گیا۔

جوق کا قبیلہ مالا مال ہو گیا۔ یہ جوق کی دوسری بڑی کامیابی تھی، اس نے اپنے قبیلے کو آسودہ حال کر دیا تھا۔ قبیلے کی معزز عورتوں کو قیمتی زیورات پہنا دیے گئے۔ جوق کی ماں نیشہ بھی قیمتی زیورات پہن کے اترانے لگی تھی۔ جوق نے اپنی رائے اور فیصلے سے اختلاف رکھنے والے بوڑھوں سے پوچھا۔ "تم لوگ اب بتاؤ کہ یہ جگہ خجند، کاشان اور سمرقند سے اچھی ہے یا نہیں؟"

بڑے بوڑھے بھی اب بہت خوش تھے۔ ان کے منہ میں دانت نہیں تھے۔ اس لیے وہ جب بھی کوئی بات کرتے پھسپھسے پوپلے منہ سے ہوا خارج ہونے لگتی اور وہ دوسروں کی نظر میں تماشا بن جاتے۔ ایسے میں ایک بڑے بوڑھے نے جوق کو جواب دیا۔ "جوق! تو بہت بڑا آدمی ہے ہم تجھے مان گئے۔"

جوق نے جواب دیا۔ "آپ کیوں مان گئے۔ مجھے بڑا آدمی۔ بڑے تو آپ لوگ ہیں، جن کی مدد اور تعاون سے میں بڑا

آدمی بن گیا۔"

ارسلان نے بھی اپنے بیٹے کی بڑی تعریفیں کیں اور کہا۔ "بیٹے! میں نے بھی سرداری کی ہے لیکن آج میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے اپنی قوم کو یہ سب نہیں دیا تھا۔"

جوق نے جواب دیا۔ "باواجان! میں اپنی قوم کو جو کچھ دے رہا ہوں۔ ان کو یہ بتانے اور یہ جتانے کے لیے کہ میں ان کے سابق سردار ارسلان کا بیٹا ہوں اور انھوں نے مجھے تم پر سردار بنا کے کوئی غلطی نہیں کی۔"

پشنہ حکومت کے خواب دیکھ رہی تھی۔ بولی۔ "جوق! کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ آس پاس کی کسی کمزور سلطنت پر دھاوا بول کے اس کو فتح کرے اور تو اس کا حکمران ہوجائے۔"

جوق نے جواب دیا۔ "ہاں یہ ممکن ہے، ایسا بھی ہوسکتا ہے لیکن اس کے لیے میرے پاس سپاہی ہونا چاہئیں، فوج ہونا چاہیے۔ پھر میں بادشاہ بن کے بھی دکھا دوں گا۔"

خاندان کی کسی بڑی بوڑھی نے ان باتوں سے اپنے مُردہ ماضی میں جان پڑتے دیکھ لی۔ اس نے اعلان کیا۔ "میں اب بھی اس پر یقین رکھتی ہوں کہ زرتشت کا یہ دین ایک نہ ایک دن ایران اور اس کے گردونواح کو اپنے زیرِ سایہ لے لے گا۔ جوق کے دل میں بادشاہت کا خیال آنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ یزدگرد کا خون رنگ لا رہا ہے اور وہ جوق کی شکل میں ایک بار پھر پورے ایران اور آس پاس کے ملکوں میں درفشِ کاویانی لہرا دے گا۔"

جوق کو اس بوڑھی پر ہنسی آ رہی تھی کیونکہ اس کی دُوربیں نظریں جو کچھ دیکھ رہی تھیں، وہ بڑی بی کے خیالات سے بالکل مختلف تھا۔ اس نے اسلام اور مسلمانوں کو حیرت انگیز طور پر مائل بہ عروج دیکھا تھا۔ وہ آس پاس کی اقوام کے گرد اپنا گھیرا تنگ کرتے جا رہے تھے۔ وہ خود بھی مسلمانوں سے متاثر تھا اور انھیں اپنا سب سے طاقتور دشمن سمجھتا تھا۔

پشنہ اور ارسلان وہاں سے ہٹ گئے اور آپس میں جوق کے شاندار مستقبل پر باتیں کرنے لگے۔ جند کے شمال مغرب میں ترکوں کی چھوٹی سی حکومت قائم تھی۔ ان دونوں کا خیال تھا کہ اگر جوق چاہے اور کوشش کرے تو اپنی شجاعت اور حسنِ تدبیر سے وہاں کا بادشاہ بن سکتا ہے۔ ان دونوں نے اس موضوع پر بڑی باتیں کیں اور پھر یہیں جوق کو بھی بلا لیا۔ پشنہ نے کہا۔ "جوق! کیا تو جانتا ہے کہ ہم نے تجھے کیوں بلایا ہے؟"

جوق نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ کہا۔ "میں کیا کہہ سکتا ہوں کہ مجھے یہاں کیوں بلایا گیا ہے۔"

ارسلان نے کہا۔ "بیٹے! جو میں نہیں کر سکا، اس کی تجھ سے امید کر رہا ہوں۔ تیری ماں پشنہ کا خیال ہے کہ تو بادشاہ بن سکتا ہے۔"

جوق نے جواب دیا۔ "پدرِ بزرگوار! میں وہیں تک سوچتا ہوں، جہاں تک میری عملی عقل میرا ساتھ دیتی ہے۔ میں بادشاہ کس طرح بن سکتا ہوں اور کہاں کا بادشاہ؟"

پشنہ نے کہا۔ "یہ میں بتاؤں گی کہ تو کہاں کا بادشاہ بن سکتا ہے۔ دریائے سیحون کے کنارے جند کے شمال مغرب میں الحدیثہ پر ترکان غز حکومت کرتے ہیں اگر تو چاہے تو اس پر بآسانی قابض ہوسکتا ہے۔"

جوق نے دوٹوک جواب دیا۔ "لیکن میں ابھی یہ سب نہیں سوچنا چاہتا۔ میں اپنے قبیلے کو آسودہ حال دیکھنا چاہتا ہوں اور اس کے جوانوں اور مردوں کو جست و استاخیز میں ماہر دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں فوج بناؤں گا اور اس کی مدد سے چھوٹی بڑی طاقتوں پر حملہ و یلغار کی مشق کروں گا اور جن کو میں شکست دوں گا ان کے مال و زر کو لوٹ کر ان کو چالاک، عیار اور دلیر بنانا چاہتا ہوں۔ اس حملہ و یلغار سے جو غلام ہاتھ آئیں گے میں ان سے ایک فوج تیار کروں گا اور جب میں یہ دیکھوں گا کہ اب میں کوئی فیصلہ کن قدم اٹھا سکتا ہوں تو کسی تامل اور تاخیر کے بغیر یہ قدم اٹھاؤں گا اور میں نہیں سمجھتا کہ میں ناکام رہوں گا۔"

پشنہ مایوس ہوگئی۔ بولی۔ "تو اس کے لیے تو بڑی لمبی عمر چاہیے پتا نہیں اس وقت تک میں زندہ بھی رہوں گی یا نہیں۔"

ارسلان بھی بہت مایوس ہوا۔ اس نے اپنی بیوی کی ہاں میں ہاں ملائی۔ "پشنہ بھی سچ کہتی ہے۔ پشنہ تو زندہ بھی رہ سکتی ہے لیکن میں نہیں بچوں گا۔ میں شاخ کے پکے ہوئے پھل کی طرح کسی وقت بھی ٹپک سکتا ہوں۔"

لیکن ان باتوں کا جوق پر کوئی اثر نہ ہوا، وہ وہی کرنا چاہتا تھا، جو اس کی عقل اسے مشورہ دیتی تھی۔ اس نے لوٹ مار کے مشغلے میں شدت پیدا کر دی، وہ جن شاہراہوں پر قافلے لوٹتا رہتا تھا اپنی بستی وہاں سے دُور رکھتا تھا۔ اس کی قوم کے خیمے اب بہت شاندار ہوگئے تھے۔ خیموں کی چھتیں روئی سے تیار کی گئی تھیں اور اندر زمین پر قیمتی قالین اور غالیچے بچھ گئے تھے۔ قبیلے کی عورتوں اور لڑکیوں نے ریشمی لباس پہننا شروع کر دیے تھے۔

جوق کو اس کے مخبروں نے خبر دی تھی کہ چین کا ایک قافلہ کاشغر کے جنوب سے بچتا بچاتا ایران جا رہا ہے۔ اس قافلے میں مخبر کے محتاط اندازے کے مطابق سونا، جواہرات

ریشمی تھان، قیمتی زیورات اور قیمتی پتھروں کی بڑی مقدار قافلے والوں کے ساتھ تھی۔ اُس کو یہ بھی بتایا گیا تھا کہ قافلے والوں نے قافلے میں اپنے ساتھ جنگجو غلام بھی رکھ چھوڑے ہیں اور قافلے میں ان کا یہ کام تھا کہ حملہ آور لٹیروں کو مار بھگائیں۔ جوق کو یہ ساری باتیں معلوم ہو چکی تھیں۔ اس دوران غُز ترکوں کا ہزاروں افراد پر مشتمل ایک اور قبیلہ بھی اس کے پڑوس میں خیمہ زن ہو گیا۔ یہ ترک بھی اس قافلے کے چکر میں یہاں آئے تھے۔ ایک ہی قافلے پر بیک وقت ترکوں کے دو قبیلے حملہ آور ہوں، یہ ذرا پریشان کن مسئلہ تھا۔ جوق نے سوچا کہ اگر ایسا ہوا تو دونوں لٹیرے قبائل کو آپس میں لڑ جانا پڑے گا اور تاجروں کا قافلہ فائدے میں رہے گا۔

وہ دیر تک اس پیچیدہ مسئلے پر غور کرتا رہا اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچا کہ اس قافلے کے آنے سے پہلے ہی اس کو غُز ترکوں کے سردار سے بات کر لینی چاہیے۔

جوق نے اپنے پُراعتماد اور سمجھدار پانچ ساتھیوں کو اپنے ساتھ لیا اور غُز ترکوں کے سردار سے بات کرنے پہنچ گیا۔ یہ ترک زمین کے بہت بڑے حصے پر اپنے خیمے نصب کیے پڑے تھے۔ ان خیموں کے بیچ میں چولھے جل رہے تھے اور ان کا دھواں بلند ہو کے ہر طرف پھیل گیا تھا۔ ترک اِدھر اُدھر آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ ان ترکوں نے اپنے ہی جیسے چند آدمیوں کو اپنے خیموں کے سامنے کھڑے دیکھا تو ان کے پاس آکے پوچھا۔

”کس سے ملنا ہے؟“

جوق نے جواب دیا۔ ”تمہارے سردار سے ملاقات کرنی ہے۔“

ترک نے پوچھا ”کوئی خاص کام؟“

جوق کی نظریں ترکوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ان لوگوں نے جوق کے قبیلے کے بارے میں کیا تاثر لیا ہے۔ اس نے جواب دیا۔ ”میں تمہارے سردار سے بہت اہم باتیں کرنے آیا ہوں۔“

لیکن ان لوگوں نے جوق اور ان کے ساتھیوں کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی۔ کہا۔ ”ہمیں معلوم ہے تم کون سی اہم باتیں کرنے آئے ہو۔ بہرحال جب آئے ہو تو مل لو اور باتیں بھی کر لو۔ ورنہ یہ سمجھ لو کہ تمہیں ان باتوں سے حاصل کچھ بھی نہ ہوگا۔ ہم یہاں جس مقصد سے آئے ہیں اس کو حاصل کیے بغیر واپس نہیں جائیں گے۔“

جوق بہت مایوس ہوا کیونکہ ایک عام ترک سے اس کو اپنی ان کہی باتوں کا جو جواب ملا تھا، اس سے یہ اندازہ لگانا بالکل آسان تھا کہ ان غُز ترکوں نے اس سلسلے میں آپس میں کچھ فیصلے پہلے ہی سے کر رکھے ہیں۔ جوق نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہارے سردار سے جس قسم کی باتیں کرنے آیا ہوں، اُس کا تمہیں کیا پتا؟“

ترکوں نے جوق اور اس کے ساتھیوں کو اپنے سردار کے خیمے تک پہنچا دیا۔ یہ قیمتی سمور کا خیمہ دوسرے تمام خیموں سے بالکل مختلف اور بہت قیمتی تھا۔ سیاہ اور بھوری سمور کی پیوندکاریاں نہایت ہنرمندی اور مشاقی سے کی گئی تھیں۔ سردار کے خیمے پر دو مسلح ترک باتوں میں مشغول تھے۔ لیکن جوق اور اس کے ساتھیوں پر جیسے ہی نظر پڑی ان کی باتوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

ترک سردار کو خبر کی گئی کہ ایک دوسرے قبیلے کا سردار اس سے ملنا چاہتا ہے اور اس کے بعد ہی جوق اور اس کے ساتھیوں کو اندر پہنچا دیا گیا۔

خیمے کے درمیان میں ایک تخت بچھا ہوا تھا۔ اس تخت کے سرہانے دو شیر بنے ہوئے تھے۔ ترک سردار آمنے سامنے بیٹھے ہوئے چوبی شیروں میں ایک کے منہ سے ٹیک لگائے نہایت مطمئن بیٹھا تھا اور اس کے ایک ہاتھ میں خنجر تھا اور خنجر کی نوک سے وہ اپنے دانت کرید رہا تھا۔

تخت کے سامنے خوبصورت بینچیں بچھی تھیں۔ ترک سردار نے انھیں اشارہ کیا کہ بینچ پر بیٹھ جائیں۔

جوق نے بیٹھنے سے گریز کیا۔ بولا ”غُز سردار! ہم یہاں بیٹھنے اور گپ شپ کرنے نہیں آئے ہیں۔ بس چند ضروری باتیں۔ ایک معاہدہ اور اس کے بعد واپسی۔ اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ کیونکہ فضول باتوں کے لیے نہ تو تمہارے پاس وقت ہوگا اور نہ ہمارے پاس وقت ہے۔“

ترک سردار کے آس پاس دوسرے ترک آکے کھڑے ہو گئے۔ ترک سردار نے ان کی طرف دیکھ کر جوق کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”کیا ہماری باتیں تخلیہ میں ہوں گی؟ اِن سب کو باہر بھیج دیا جائے؟“

جوق نے جواب دیا۔ ”نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ہمارا خیال ہے کہ ہم یہاں جو باتیں کرنے آئے ہیں، وہ یہاں پہلے سے ہو چکی ہیں اور معاملات یک طرفہ طے پا چکے ہیں لیکن میں چونکہ بنا تہ رجائی واقع ہوا ہوں اس لیے مایوس واپس جانے کے بجائے باتیں کرنے آ گیا۔“

ترک سردار کی پیشانی پر ناگواری کی سلوٹیں پڑ گئیں۔ بولو ”سردار! تم ابھی جوان ہو۔ تمہارے خون کی حدت تمہیں پریشان کر رہی ہوگی۔ بہرحال مجھے بتاؤ کہ تم مجھ سے کس قسم کی باتیں کرنا چاہتے ہو؟“

جوق نے جواب دیا۔ "قصہ مختصر یہ کہ ہم دونوں ہی چین سے آنے والے ایک شاندار تجارتی قافلے پر حملہ آور ہونے والے ہیں۔ مجھ کو میرے مخبر نے یہ خبر بہت پہلے دے دی تھی اور میں اس کے فوراً بعد ہی یہاں چلا آیا۔ کئی دن بعد جب میں نے تم لوگوں کی بابت یہ سنا کہ تم لوگ بھی یہاں اسی مقصد سے آئے ہو تو میری پریشانی بجا تھی۔"

ترک سردار نے کہا۔ "میں تمھاری ساری باتیں سن کر کیا کروں گا، تم کہنا کیا چاہتے ہو مجھے تو یہ بتاؤ۔"

جوق نے جواب دیا۔ "میں یہ بتانے آیا ہوں کہ یہ شکار ہمارا ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ ہم یہاں تم سے پہلے آئے ہیں۔"

ترک سردار نے کہا۔ "میں تمھاری یہ دلیل اس لیے نہیں مانوں گا کہ میرے مخبر یہ خبر تمھارے مخبر سے پہلے میرے پاس لائے تھے اس لیے یہ شکار میرا ہے۔"

جوق نے مفاہمانہ روش اختیار کی۔ بولا۔ "تب پھر آؤ، ہم دونوں مل بیٹھ کے کوئی ایسا طریقہ کار وضع کریں جس سے ہم دونوں اس شکار میں حصہ دار بن جائیں اور اس تباہی اور بربادی سے بچ جائیں جو باہمی اختلافات اور چپقلش سے ہم دونوں کے متصادم ہونے سے برپا ہو سکتی ہے۔"

ترک سردار نے انتہائی رعونت کا مظاہرہ کیا، بولا۔ "عزّو قبائل حصے بخرے کے قائل نہیں ہوتے۔ ہم شیر کے مانند کسی گیدڑ کو اپنا حصے دار نہیں بناتے۔"

جوق کو ترک سردار کی باتوں نے برافروختہ کر دیا مگر وہ غصّہ کھو پی گیا، بولا۔ "عزّ سردار! ہمیں معلوم ہے کہ تم ترکوں میں بادشاہی بھی ہوتی ہے کیونکہ الحدیثہ کا بادشاہ بھی عزّو ہی ہے۔ تمھاری تعداد بھی بہت زیادہ ہے لیکن ایک بات میری بھی سن لو، تم ایک دوسرے ہمسر اور ہم عصر سردار کو ذلیل کر رہے ہو، حالانکہ تمھیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ہم بھی گیدڑ نہیں ہیں ہم بھی شیر ہی ہیں کیونکہ ایران کا آخری غیر مسلم بادشاہ یزدگرد ہمارا دادا تھا۔ غرور مت کرو کیونکہ غرور کسی کو بھی راس نہیں آیا۔"

لیکن ترک سردار جوق کی باتوں سے ذرا بھی نہیں پسیجا، بولا۔ "تو تم ترک بھی نہیں ہو، مگر ہم نے تو یہ سُنا ہے کہ تم لوگ بھی اپنے آپ کو ترک ہی کہتے ہو۔"

جوق نے جواب دیا۔ "ہاں ہم لوگ اپنے آپ کو اب ترک ہی کہنے لگے ہیں۔ کیونکہ ہم نے ترکوں میں شادیاں کر کے اور ترکوں ہی میں رہ بس کے اپنی شناخت ختم کر دی ہے اور جس سرزمین میں پرورش پائی ہے جس کی آب و ہوا اور مٹی ہمارے خمیر کے بنیادی اجزا ہیں، اب ہم اس کو اپنا سب کچھ سمجھتے ہیں۔"

ترک سردار مسکرایا، اور طنزیہ پوچھا۔ "ہمارا جواب تو تم نے سُن لیا، اب یہ بتاؤ کہ تم اس کے علاوہ کیا چاہتے ہو؟"

جوق نے جواب دیا۔ "عزّ سردار! تب پھر تم ہمارا فیصلہ بھی سُن لو، ہم نے بھی یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ کچھ بھی ہو ہم اپنے اس شکار سے دستبردار نہیں ہوں گے۔"

ترک سردار نے قہقہہ لگایا، پوچھا۔ "تو گویا تم نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ ہم سے جنگ کرو گے؟"

جوق نے نرمی سے جواب دیا۔ "نہیں، ہم نے یہ تو نہیں کہا کہ تم سے جنگ کریں گے۔ ہم تو یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم اپنے اس شکار سے دستبردار نہیں ہوں گے۔"

ترک سردار غصے میں تلملایا ہوا تخت سے نیچے آ گیا، بولا "جب تم یہ کہتے ہو کہ تم اپنے اس شکار سے دستبردار نہیں ہو گے تو اس کا صریحاً یہ مطلب ہوتا ہے کہ تم میری مخالفت مول لو گے میرے شکار پہ ہاتھ ڈالنے کا یہ مطلب ہے کہ تم عزّ قبائل کے خلاف اعلانِ جنگ کر رہے ہو۔ مجھے تمھارا یہ اعلان منظور ہے، قبول ہے۔ جب چاہو ہمارے مقابلے پر آ جاؤ، ہم تمھارے وجود اور تمھاری نسل کی بنیادیں تک ڈھا دیں گے۔ تمھارے بعد تمھارا کوئی نام لیوا بھی بعد تلاش و جستجو نہیں ملے گا۔ ہم یا تو دوستی کر لیتے ہیں یا پھر اپنے دشمن کا وجود تک مٹا دیتے ہیں۔"

جوق نے جواب دیا۔ "عزّ سردار! اب ہم واپس جا رہے ہیں اور اس یقین و دانی کے ساتھ کہ ہم تمھیں اپنا دشمن نہیں سمجھتے اور ہم ہمیشہ یہی کوشش کریں گے کہ ہم عزّوں سے جنگ نہ کریں۔"

ترک سردار عزّوں کی تعریفیں سُن سُن کے خوش ہو رہا تھا اور جوق کو کمزور اور احساسِ کمتری میں مبتلا سردار سمجھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "تب پھر تم یہاں سے بھاگ جاؤ اور آئندہ ہمارے پاس مت آنا۔"

جوق نے بے نیازی سے جواب دیا۔ "میں تمھاری دونوں باتوں میں سے صرف ایک بات مان لوں گا۔ میں تمھارے پاس اب کبھی بھی نہیں آؤں گا مگر بھاگوں گا ہرگز نہیں کیونکہ بھاگنے کا میں قائل ہی نہیں۔"

ترک سردار نے کہا۔ "چلو اچھا یوں ہی سہی، مت بھاگو مگر میرے شکار کی طرف آنکھ اٹھا کے دیکھنا بھی نہیں۔"

جوق اپنے قبیلے میں واپس آ گیا۔ اس کے پانچوں ساتھی دونوں سرداروں کی گفتگو میں بالکل خاموش رہے تھے لیکن عزّوں کی بستی سے نکلتے ہی ان کی زبانیں کھل گئیں۔ انھوں نے اپنے سردار جوق کو متفقہ طور پر آگاہ کیا۔ "سردار! عزّوں کا سردار تو بہت مغرور ہے اس کو اس کے غرور کی سزا ملنی چاہیے؟"

جوق نے جواب دیا۔ "دوستو! مت پریشان ہو۔ میں غزوں کے سردار کے غرور کو جب تک خاک میں نہیں ملا دوں گا، میں سے نہیں بیٹھوں گا۔"

اس نے اپنے خیمے کا در اندر سے بند کرلیا اور اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "اندر میں کچھ سوچوں گا۔ وہاں کوئی نہیں آئے گا۔ میں غزوں کے سردار کے غرور کو اس طرح مٹی کے..."

وہ بات پوری نہیں کرسکا۔ پورے قبیلے میں یہ خبر گرم تھی کہ غزوں کے سردار نے جوق کو بہت ذلیل کیا ہے اب قبیلے والے اس کے پیچھے پڑے ہوئے تھے کہ غزوں میں چلو اور ان کی اینٹ سے اینٹ بجا کر واپس آجاؤ۔

لیکن جوق جذباتی نہیں تھا۔ اس نے جواب دیا۔ "مت گھبراؤ میرے دوستو! مت پریشان ہو۔ میں نے اس کا علاج سوچ لیا ہے۔"

کسی نے پوچھا۔ "کیا ہم اپنے شکار پر جھپٹیں گے؟"

جوق نے جواب دیا۔ "بالکل، بالکل۔ میں پیچھے ہٹنے کا تو تصور بھی نہیں کرسکتا۔ پیچھے ہٹنے کا عزم سردار! اس کی قوم اس کا قبیلہ۔"

اس کے بعد جوق نے قبیلے کے چنیدہ اور چیدہ چیدہ افراد کو یکجا کیا اور اپنے باپ ارسلان کو اپنے پاس بٹھالیا۔ قبیلے والے پریشان ہوئے تھے کہ دیکھیے جوق کیا فیصلہ کرتا ہے۔ جوق کے اس فیصلے پر اس کے قبیلے والوں کا ردعمل کوئی خاص نہیں تھا۔ انہیں اپنے سردار پر بہت زیادہ اعتماد تھا۔

جوق نے حاضرین سے کہا۔ "بزرگو، اور دوستو! افسوس کہ میں چند دنوں کے لیے آپ سے جدا ہو جاؤں گا اور میری عدم موجودگی میں میرا باپ ارسلان قبیلے کا سردار رہے گا۔ دیکھو! پھر باپ کا حکم بے چون و چرا مان لینا۔"

لوگ گھبرا گئے، ایک جوان کھڑا ہوگیا اور پوچھا۔ "معزز سردار! آپ کہاں جارہے ہیں اور کیوں؟"

جوق نے جواب دیا۔ "مجھ سے یہ سوال مت کرو۔ کیونکہ میں اس کا جواب نہیں دے سکوں گا۔ لیکن جب میں واپس آؤں گا تو سرخروئی اور کامرانی میرے ساتھ ساتھ چل رہی ہوگی۔ میرے قبیلے کا سر اونچا ہوچکا ہوگا۔ اور غز ذلیل و خوار ہوچکے ہوں گے۔"

ارسلان ایک بار پھر اپنے قبیلے کا سردار ہوگیا۔ جوق نے اپنے لیے دس جوان الگ کیے اور قبیلے والوں کو سمجھایا۔ "بزرگو اور دوستو! جب تک میں واپس نہ آجاؤں، تم غز ترکوں سے مفاہمت رکھنا۔ ان سے الجھنا مت۔"

جوق اپنے دس جوانوں کے ساتھ شاہراہ ریشم پر چین کی طرف روانہ ہوگیا۔ اب اسے تاجروں کے اس قافلے کی تلاش تھی، جو غز اور جوق کا شکار بننے والے تھے۔ جوق انہیں کاشغر سے دور پکڑ لینا چاہتا تھا۔ تین روز شب و روز سفر کرنے کے بعد تھیان شیان کے قریب اس نے اس قافلے کو دیکھ لیا۔ یہاں تھیان شیان کے دامن میں خیموں کا ایک جنگل پھیلا ہوا تھا۔ جوق اس قافلے میں میر قافلہ کو تلاش کرتا ہوا اس کے خیمے تک پہنچ گیا۔

یہ ایک ادھیڑ عمر چینی تھا اور ذہانت اور پختہ کاری اس کے چہرے سے ہویدا تھی۔ جب اس چینی میر قافلہ کو یہ بتایا گیا کہ ترکوں کا ایک گیارہ رکنی وفد اس سے ملنا چاہتا ہے تو اس نے اسی وقت انہیں طلب کرلیا۔ جوق نہایت مؤدبانہ انداز میں چینی میر قافلہ کے سامنے بیٹھ گیا۔

چینی میر قافلہ نے پوچھا۔ "تم لوگ کہاں سے اور کیوں آئے ہو میرے پاس؟"

جوق نے جواب دیا۔ "میں ایک ترک قبیلے کا سردار ہوں۔ خجند ہمارا مسکن ہے اور وہاں کے باغات اور کھیتوں کی پیداوار پر اپنی گزر بسر ہوتی ہے۔"

چینی میر قافلہ نے پوچھا۔ "پھر میرے پاس کیا لینے آئے ہو؟"

جوق خیمے کے ساز و سامان کا جائزہ لے رہا تھا۔ یہ شاندار اور قیمتی ساز و سامان سے آراستہ خیمہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ جوق کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس نے سوچا اگر یہ ساز و سامان ایک خیمے میں موجود ہے تو پورے قافلے کے پاس کیا کچھ نہیں ہوگا۔ جوق چینی میر قافلہ کے سوال کا جواب نہیں دے سکا۔ اس نے دوبارہ وہی سوال کیا۔ "میں پوچھتا ہوں کہ تم میرے پاس کیا لینے آئے ہو؟"

جوق نے جواب دیا۔ "کاشغر اور اس کے آس پاس کا نظم و نسق جن کے ہاتھ میں ہے، میرا قبیلہ ان کا حلیف ہے اور ادھر چند ماہ سے ہماری ذمے داریوں میں یہ اضافہ ہوگیا ہے کہ آنے جانے والے قافلوں کی دیکھ بھال اور ان کی حفاظت کریں۔"

چینی میر قافلہ نے ایک بار پھر اپنا سوال دہرایا۔ "لیکن میں تو یہ پوچھ رہا ہوں کہ اس وقت تم میرے پاس کیوں آئے ہو؟"

جوق نے جواب دیا۔ "ابھی تین دن پہلے میں نے کاشغر کے کنارے غز ترکوں کے ایک بڑے قبیلے کو خیمہ زن ہوتے دیکھا ہے اور ان کے بارے میں ہمارے مخبروں نے یہ بتایا ہے کہ انہیں تم لوگوں کی آمد کی خبر ہوچکی ہے اور وہ آپ لوگوں کے کاشغر میں داخل ہوتے ہی لوٹ مار شروع کردیں گے۔"

چینی میر قافلہ زور زور سے ہنسنے لگا اور بولا۔ "اے ترک جوان! کیا تو میرا سوال نہیں سن رہا۔ میں تجھ سے بار بار یہ پوچھ رہا ہوں کہ تو یہاں کیوں اور کیا لینے آیا ہے مگر تو اپنی کہے

جاتا ہے اور میری بات کا جواب تک نہیں دیتا۔"
جوق کو چینی میرِ قافلہ کا طرزِ تخاطب بالکل پسند نہیں آرہا تھا، مگر حالات اور وقت کا تقاضہ یہی تھا کہ وہ صبر و تحمل سے کام لے چنانچہ وہ سب کچھ برداشت کر رہا تھا۔ چینی میرِ قافلہ کو جواب دیا۔ "ہم غز ترکوں سے نہیں لڑ سکتے۔ کیونکہ یہ قبیلہ المحدثیہ اور اس کے قرب وجوار کے شہروں پر حکومت کر رہا ہے اور چونکہ میں غز ترکوں سے تم لوگوں کو نہیں بچا سکتا اس لیے آپ کے پاس یہ مشورہ لے کر آگیا کہ آپ فی الحال اس سفر کو ملتوی کر دیں اور اگر کسی وجہ سے اس کو ملتوی نہیں کر سکتے تو اپنے لیے اتنے جنگجو مہیا کر لیں جو غز ترکوں سے جنگ کر سکیں۔"
چینی میرِ قافلہ مسکرایا، طمانیت اور بے فکری سے اُٹھ کر خیمے میں ٹہلنے لگا۔ کوئی جواب نہیں دیا۔ جوق اور اس کے ساتھی بھی کھڑے ہو گئے۔
کچھ دیر بعد چینی میرِ قافلہ رُک گیا اور جوق کی طرف مڑ کے کہنے لگا۔ "ترک جوان! کیا تم لوگ لڑنا بھڑنا جانتے ہو؟"
جوق نے جواب دیا۔ "بس واجبی واجبی سا۔ کام چلانے بھر کا ورنہ ہم لوگ بنیادی طور پر کاشت کار اور باغبان ہیں۔"
چینی میرِ قافلہ کہنے لگا۔ "ہم کوئی معمولی تاجر نہیں ہیں، ہماری تجارت بادشاہوں سے ہوتی ہے۔ ہم اپنے ساتھ ہزار غلاموں کا ایک چھوٹا سا لشکر بھی لائے ہیں۔ یہ ہزار جنگجو اس اُمید پر ہمارے ساتھ سفر کر رہے ہیں کہ ہم انھیں مسلمان خلیفہ کی فوج میں ملازم رکھوا دیں گے۔ لیکن ہم جب تک اپنی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچیں گے یہ ہزار جنگجو ہماری مدد کریں گے یہ ہمارے محافظ ہیں، غز ترکوں کا کوئی قبیلہ اگر ہمیں لوٹنے کی کوشش کرے گا تو ہم اسے کاٹ کر رکھ دیں گے۔"
جوق مسکرانے لگا۔ "اگر یہ بات ہے تو ہمیں بڑی خوشی ہوئی اب ہم بھی آپ کا ساتھ دے سکیں گے۔"
چینی میرِ قافلہ جوق اور اس کے دس ساتھیوں کو ہزار جنگجوؤں کے خیموں کی طرف لے گیا۔ ان خیموں کے پاس ایک بہت بڑے خیمہ میں گھوڑوں کا اصطبل تھا۔ یہاں ان مذکورہ ہزار سپاہیوں کے گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ اور خیموں کے باہر جگہ جگہ شمشیر زنی اور کشتی کے مقابلے ہو رہے تھے۔ چینی میرِ قافلہ نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ہیں ہمارے سرفروش۔ بقیہ اپنے خیموں میں ہوں گے۔"
جوق نے بناوٹی خوشی کا اظہار کیا، بولا۔ "آپ کی سوچ اور انتظام نے ہمیں بے حد خوش اور مطمئن کر دیا ہے اب ہم یہاں سے مطمئن اور بے فکر ہو کر واپس جائیں گے۔"
چینی میرِ قافلہ جوق اور اس کے ساتھیوں کے خلوص سے بہت متاثر تھا، بولا۔ "بہرحال میں تم لوگوں کا بھی بے حد شکر گزار ہوں جو محض مجھے خبردار کرنے کے لیے اتنا لمبا سفر کر کے میرے پاس آئے۔ میں تمھارے اس احسان کی قیمت ادا کروں گا۔"
جوق نے جواب دیا۔ "معزز سردار! آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ احسان کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ ہم نے جو کچھ کیا، انسانی فرض سمجھ کے کیا ہے، آپ نے ہمارے جذبے کی قدر کی اور سراہا اپنے لیے یہی بہت کافی ہے۔"
چینی میرِ قافلہ نے ایک تجویز پیش کی، بولا۔ "جوان! تم چاہو تو ہم سے ایک معاملہ کر سکتے ہو۔"
جوق نے سادہ لوحی کا تاثر دیتے ہوئے معصومیت سے پوچھا۔ "وہ کیا؟ کیا معاملہ؟"
میرِ قافلہ نے جواب دیا۔ "کیا تمھارا قبیلہ ہماری مدد کر سکتا ہے؟"
جوق نے پوچھا۔ "کس قسم کی مدد؟"
میرِ قافلہ نے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ جب ہمارے ہزار جنگجو مقابلہ کر رہے ہوں تو تمھارا قبیلہ ہماری حفاظت کرے، کیونکہ ہمارے جنگجو بیک وقت دو محاذوں پر نہیں لڑ سکتے۔"
جوق نے کسی قدر تامل اور پس و پیش سے پوچھا۔ "کیا اس کے علاوہ کوئی اور خدمت ہمارے لائق نہیں ہو سکتی؟"
چینی نے جوق کے پاس جا کے اس کے دونوں شانوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے اور جوق کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "اور کیا؟"
جوق نے جواب دیا۔ "جنابِ والا! اگر آپ لوگ ہمارا تعاون چاہتے ہی ہیں تو ہمیں بھی کوئی اعتراض نہیں، ہم بھی آپ کی مدد کریں گے مگر اسی وقت جبکہ ہم یہ سمجھ لیں گے کہ آپ کے جنگجو غز ترکوں کا قلع قمع کر دیں گے۔ یہ لوگ ہمارے لیے دردِ سر بن گئے ہیں۔"
چینی میرِ قافلہ جوق اور اس کے ساتھیوں کو حقارت سے دیکھ رہا تھا، بولا۔ "جب ہمارے جنگجو غز ترکوں سے جنگ کریں گے اس وقت تم لوگ اپنے قبیلے کے ساتھ ہمارے آس پاس موجود رہنا، اگر تم لوگ اس کو احسان نہ کہو اور میں بھی اس کو تمھارا احسان نہ سمجھوں تو میں اس کو تمھاری خدمت سمجھ کے اس کا معاوضہ ادا کروں گا اور وہ معاوضہ نہایت معقول ہو گا۔"
جوق قدوسی بنا جا رہا تھا، کہنے لگا۔ "ہم چوبیس گھنٹے آپ کے مہمان رہیں گے، پھر واپس چلے جائیں گے اور۔ اور۔"
وہ کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔ چینی میرِ قافلہ نے اس دن قافلے کے سرداروں کی طرف سے جوق اور اس کے دس ساتھیوں

کی دعوت کردی۔

اس دعوت میں جوق اور اس کے ساتھیوں کا شاندار تعارف کرایا گیا اور یہ بتایا گیا کہ اگر یہ گیارہ مخلص انسان ہمیں پیشگی اطلاع نہ فراہم کر دیتے تو غفلت میں ہمارا پتا نہیں کیا حشر ہوتا۔"

قافلے کے دوسرے سرداروں نے بھی جوق سے گرم جوشی کا سلوک کیا وہ سب جوق کے بے حد شکر گزار تھے۔

واپسی پر جوق اور چینی میر قافلہ میں ایک معاہدہ ہوگیا' غز ترکوں سے جنگ کے دوران جوق اور اس کے قبیلے کے لوگ تاجروں اور ان کے مال و اسباب کی حفاظت کریں گے۔

اور جوق کے لیے اتنا ہی بہت کچھ تھا' وہ خوش خوش واپس ہوا' وہ اپنے قبیلے میں بعجلت واپس جارہا تھا' اس نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا بتانا تو سہی' معاملہ کیسا رہا؟"

ایک ساتھی نے جوق کی بہت زیادہ تعریف کی اور کہا کہ "لوگو! میری یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ خدا نے جوق کو ہمارا سردار بنا کے ہم پر بڑا احسان کیا ہے' جوق نہیں کہاں تک لے جائے گا کون جانے؟ لیکن ہمارا روشن مستقبل ہمارے سامنے ہے۔"

جوق اپنے قبیلے میں واپس پہنچ گیا۔ قبیلے کے لوگ اس کے پُراسرار سفر اور واپسی سے سوچ میں پڑ گئے تھے۔ جوق کے باپ ارسلان نے اس کی سرداری واپس کردی اور کہا "جوق! تیری عدم موجودگی میں غز ترکوں نے ہمارا بہت مذاق اڑایا۔ ان کے آدمی ہر روز آ کے یہی پوچھتے ہیں کہ تم لوگ ابھی تک یہیں موجود ہو' واپس کیوں نہیں گئے؟"

جوق نے دبے لفظوں میں کہا "وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں انھیں کہنے دو' جو کچھ ہو رہا ہے ہونے دو۔ مستقبل ہمارا ہے اور ہم نے اس کو حاصل کرنے کا انتظام کرلیا ہے۔"

جوق نے اپنے قبیلے میں اعلان کردیا کہ فی الحال وہ خود کو جنگجو اور سپاہی نہیں کہیں گے وہ آج کل محض کاشتکار اور باغبان ہیں' لوٹ مار اور قتل و غارت گری غز ترکوں کا پیشہ ہے اور ہم ان کے اس پیشے میں ان کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔"

اس اعلان نے قبیلے والوں کو شرمندہ و خجل کردیا' ایک نے پوچھا "جوق! یہ کیا بات ہوئی اب ہم اتنے گئے گزرے ہوگئے کہ خود کو جنگجو اور سپاہی بھی نہیں کہہ سکتے۔ اب ہم کاشتکار اور باغبان کہلائیں گے۔"

جوق نے درشت لہجے میں کہا "ہاں اب ہم کاشتکار اور باغبان کہلائیں گے۔ کیونکہ اس میں ہمارا فائدہ ہے' میں سردار ہوں اور تم سب کا یہ فرض ہے کہ میرا حکم مانو' میرا کہنا مانو۔"

ارسلان نے اپنی قوم کو سمجھانے کی کوشش کی "جوق جو کچھ کہہ رہا ہے' اس میں ہمارا فائدہ ہی ہوگا' ہم نے جوق کو سردار بنایا ہے تو ہمیں اس کا حکم بھی ماننا ہوگا۔"

جوق کے دس ساتھی بھی قبیلے والوں کو سمجھا رہے تھے کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے اس میں ہماری جیت ہے۔ ہم کاشتکار اور باغبان بن کے ایک بہترین فصل کاٹنے کے لائق ہو جائیں گے اور ہماری قوم باغبان بن کے پھلوں کی وافر مقدار حاصل کرسکے گی۔

جوق نے اپنے آدمیوں میں گھوم پھر کر ان کی دل جوئی کی۔ وہ اپنے ہتھیاروں ______ اور گھوڑوں کا جائزہ لیتا رہا اور گھوڑوں پر خاص توجہ دیتا رہا' اس کے بارے میں کئی دن سے یہ افواہ گشت کر رہی تھی کہ وہ غز ترکوں سے خوفزدہ ہوچکا ہے۔

ایک دن صبح پو پھٹنے کے بعد غز ترکوں کا سردار جوق کے پاس آگیا' اس وقت جوق سویا ہوا تھا' غز سردار نے جوق کے آدمیوں سے پوچھا "یہ جوق مجھ سے خوفزدہ ہو کے کہاں منہ چھپائے پڑا رہتا ہے؟"

جوق کے دربان نے جواب دیا "وہ منہ چھپائے نہیں آرام کی خاطر پڑے رہتے ہیں ابھی کچھ دنوں سے انھوں نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ جنگ و جدل اور لوٹ مار سے توبہ کرکے کھیتی باڑی اور باغبانی میں مشغول ہوجائیں' اس لیے اب آرام ہی آرام ہے۔ اطمینان ہی اطمینان ہے۔ کھانا پینا' سونا اور سیر سپاٹے کرنا بس یہی مصروفیات ہیں ان کی۔"

غز سردار نے حکم دیا "جوق کو جگا دو اور اس سے کہو کہ غزوں کا سردار تجھ سے ملنے آیا ہے۔"

دربان اندر گیا اور جوق کو جگا دیا۔ کہا "غزوں کا سردار آپ کا انتظار کر رہا ہے۔"

جوق نے فوراً بستر چھوڑ دیا اور غز سردار سے ملنے باہر چلا گیا۔ غز سردار مسکرا رہا تھا' اس نے جوق کو تحقیر آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "جوق! میں نے سنا ہے کہ تو نے کھیتی باڑی اور باغبانی کا پیشہ اختیار کرلیا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ یہ کیوں؟ کس لیے؟"

جوق نے جواب دیا "ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں' جو کام آپ کرتے ہیں' وہی ہم لوگ کرتے ہیں۔ اس لیے میں نے یہ سوچا کہ اب ہمیں لوٹ مار اور قتل و غارت گری سے توبہ کرلینی چاہیے۔"

غز سردار خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا' بولا "تو نے بہت اچھا اور صحیح فیصلہ کیا۔ اگر تو یہ فیصلہ نہ کرتا اور میرے مقابلے پر آتا تو تیری اور تیرے قبیلے کی تباہی یقینی تھی۔"

جوق نے پوچھا۔ "آپ یہاں کیا لینے آئے ہیں؟"

عز سردار نے جواب دیا۔ "یہ معلوم کرنے کہ اب تیرے کیا ارادے ہیں؟"

جوق نے افسردگی سے کہا۔ "تو اب آپ کو میرے ارادوں کا علم ہو چکا ہے' اب آپ جائیں یہاں سے۔"

عز سردار نے جواب دیا۔ "ہاں اب میں تیرے قبیلے سے چلا جاؤں گا اور تم لوگ بھی یہاں سے چلے جاؤ اور خجند میں جا کے کھیتی باڑی اور باغبانی کرو' یہ بہت ہے تمہارے حق میں۔ ورنہ جب تک تم لوگ یہاں موجود ہو میرا دل تمہاری طرف سے صاف نہیں ہو سکتا۔"

جوق نے نہایت ملتجیانہ لہجہ اختیار کیا' بولا۔ "عز سردار! اب جبکہ ہم نے اپنی زندگی کا پورا ڈھچر ہی بدل دیا ہے تو آپ کو اس پر مشکر نہیں ہونا چاہیے کہ ہم فی الفور یہاں سے چلے جائیں' میرا قبیلہ میرے فیصلے سے متفق نہیں ہے لیکن میں اس کو راضی کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

عز سردار نے رعونت سے جواب دیا۔ "اگر تیرا قبیلہ راضی نہیں ہوتا تو میں اسے ایسا جواب دے سکتا ہوں کہ اس کے بعد سیدھا ہو جائے گا۔"

جوق مسکرایا' کہنے لگا۔ "اگر ان حالات میں کہ ایک قیمتی قافلہ دو چار دن میں یہاں پہنچنے والا ہے آپ میرے قبیلے سے الجھ گئے تو آپ اپنا بڑا نقصان کر لیں گے کیونکہ تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق ہم بھی سر دھڑ کی بازی لگا دیں گے' اس کے بعد جو ہو سو ہو۔"

عز سردار کی سمجھ میں جوق کی بات آ گئی' نرمی سے بولا۔ "تب پھر تو اپنے قبیلے کو راضی کرنے کی کوشش کر۔ میں اپنے قبیلے میں واپس جاتا ہوں۔" جاتے جاتے پلٹ پڑا اور کہا۔ "اور ہاں یہ یاد رہے کہ چینی تاجروں کا قافلہ میرا شکار ہے اس سے تیرا کوئی تعلق نہیں۔"

جوق نے اس کو ایک بار پھر یقین دلایا۔ "معزز سردار! میں نے ایک بار کہہ جو دیا کہ میرا اس قافلے سے کوئی تعلق نہیں۔"

عز سردار جوق اور اس کے قبیلے سے مطمئن ہو کر چلا گیا اور اس کے جاتے ہی جوق اپنی تیاریوں میں مشغول ہو گیا۔ اس کو چینی قافلے کے ہزار جنگ جوؤں کے علاوہ عز ترکوں کا بھی مقابلہ کرنا تھا اور خاص طور پر عز سردار کے غرور کو ہر قیمت خاک میں ملانا تھا۔

جوق کے مخبروں نے خبر دی کہ تاجروں کا قافلہ کل تک کاشغر میں داخل ہو جائے گا۔ جوق نے اپنے جوانوں اور فن سپاہ گری کے ماہروں کو یکجا کیا اور انھیں حکم دیا کہ وہ جوق کے پیچھے پیچھے چلیں اور پھر جیسے ہی نقارے پر چوٹ پڑے وہ لوٹ مار کا کام شروع کر دیں۔ اور جو لوگ خیموں میں رہ جاتے تھے انھیں حکم دیا کہ وہ خیموں کو اکھاڑ کر جند کی راہ لیں۔ وہیں سب دوبارہ مل جائیں گے۔ اس دوسرے بقیہ قبیلے میں اس کا باپ ارسلان بھی شامل تھا۔

جوق اپنے جنگ جو ساتھیوں کو لے کر چینی قافلے میں پہنچ گیا۔ چینی میر قافلہ جوق کو دیکھ کر بہت خوش ہوا' اور اس نے پوچھا۔ "عز ترک کہاں ہیں اور ان کے کیا ارادے ہیں؟"

جوق نے جواب دیا۔ "کل عز سردار ہمارے پاس آیا تھا اور کہہ رہا تھا کہ تم لوگ یہاں سے دفع ہو جاؤ ورنہ ہم تم سب کو تہ تیغ کر دیں گے۔"

چینی میر قافلہ نے پوچھا۔ "پھر تو نے کیا کیا؟"

جوق نے جواب دیا۔ "میں اپنے جوانوں کو تو یہاں لے آیا اور بوڑھوں' عورتوں اور بچوں کو حکم دیا ہے کہ وہ خیموں کو اکھاڑ کر جند چلے جائیں' اپنی زمینوں پر' اپنے باغات میں۔"

چینی میر قافلہ ایک کائیاں تھا' اس نے جوق اور اس کے ساتھیوں کو اپنے خالی خیموں میں ٹھہرا لیا' ان خیموں کا انتظام پہلے ہی سے کر لیا گیا تھا۔ اب جوق اور اس کے ساتھ چینی میر قافلہ کے ہزار جنگ جوؤں میں گھر گئے تھے کیونکہ ان کے خیموں کے چاروں طرف ہزار جنگ جو آباد تھے۔

جوق کے ایک ساتھی نے سرگوشی میں اپنی فکرمند آواز میں کہا۔ "سردار! اب کیا ہوگا؟ اب تو ہم سب ان کی حراست میں ہیں۔"

جوق نے اس کو آنکھ دکھائی اور سرگوشی میں کہا۔ "خاموش رہ' جس بات کا تجھ کو علم نہیں ہے اس کو زبان پر مت لا۔"

اس کے بعد جوق باہر نکل گیا' اس نے دیکھا تقریباً پانچ چھ سو جنگ جو اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار کہیں جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ ان لوگوں نے بھی جوق کو دیکھا مگر بولا کوئی بھی نہیں۔ جوق نے ایک شخص سے پوچھا۔ "یہ کہاں جا رہے ہیں؟"

اس نے جواب دیا۔ "تیرے سوال کا صحیح جواب میر قافلہ دے گا۔"

جوق نے دیکھا' میر قافلہ اس کی طرف آ رہا ہے' جب وہ قریب آ گیا تو جوق نے پوچھا۔ "یہ سوار کہاں جا رہے ہیں؟"

میر قافلہ نے جواب دیا۔ "یہ ہمارے آگے رہیں گے یہ ہمارا ہراول دستہ ہے' پانچ سو سواروں کا یہ دستہ عز ترکوں کو ہماری طرف آنے سے روک دے گا' ان کا قلع قمع کرے گا اور

اگر وہ ...."

جوق نے میر قافلہ کی بات کاٹ دی۔ کہنے لگا۔ "لیکن غز ترکوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ آپ کے پانچ سو سوار انھیں نہیں روک سکیں گے۔"

میر قافلہ مسکرا رہا تھا۔ بولا "مت فکر کرو۔ پانچ سو غز ترکوں سے لڑیں گے اور پانچ سو ہماری حفاظت کریں گے اور اگر ضرورت پیش آئی تو یہ پانچ سو بھی غز ترکوں سے لڑنے چلے جائیں گے۔"

جوق نے بناوٹی خوشی کا اظہار کیا، بولا۔ "خوب، یہ تو بڑی اچھی بات ہے اب ہماری ضرورت تو نہیں رہی یہاں، اب ہم لوگ واپس جا سکتے ہیں؟"

میر قافلہ بے غرض بنا ہوا تھا۔ اسے نہ تو کسی کا خوف تھا نہ اندیشہ۔ اور باتوں سے یہ ظاہر کر رہا تھا کہ اس کو جوق یا کسی اور کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ بے پروائی سے جواب دیا۔ "جانا چاہو تو چلے جاؤ، ویسے ہم تمھارے بے حد شکر گزار ہیں۔ تم نے ہمیں غز ترکوں کے ارادوں کی خبر دے کر جو احسان کیا ہے وہ ایک گراں قدر احسان ہے۔ میں اس احسان کو زندگی بھر یاد رکھوں گا اور جب بھی کوئی موقع ملا، میں تمھارے اس احسان کے عوض کوئی احسان ضرور کروں گا۔"

جوق نے جواب دیا۔ "نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ میرا جو فرض تھا، وہ پورا کر دیا اور اب میرا ضمیر پوری طرح مطمئن ہے۔"

میر قافلہ اصرار کرتے لگا، بولا۔ "نہیں میں تجھ کو یوں نہیں جانے دوں گا، تم لوگ دو ایک دن میرے مہمان رہو، اس کے بعد چلے جانا۔"

جوق کا تیز اور حاضر دماغ ذہن میر قافلہ کا مقصد سمجھ گیا، میر قافلہ بے غرض بن کے جوق اور اس کے جوانوں سے کام نکالنا چاہتا تھا۔ میر قافلہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کے پانچ سو یا ہزار سوار غز ترکوں کے مقابلے میں بھاری پڑتے ہیں، یا کمزور۔ اگر وہ بھاری پڑتے ہیں تو میر قافلہ کو جوق کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اور وہ کمزور پڑیں گے تو جوق اپنے ساتھیوں کی مدد سے میر قافلہ اور قافلے کے قیمتی سامان کی حفاظت تو کر ہی لے گا، میر قافلہ اپنے احساسات کو دبائے ہوئے تھا۔

جوق نے ایک بار پھر اصرار کیا، بولا۔ "یوں تو آپ کو ہماری ضرورت نہیں رہی ہو گی؟"

میر قافلہ نے جواب دیا۔ "مگر ضرورت پیش بھی آ سکتی ہے، کل تک رک جانے میں کیا ہرج ہے؟"

جوق نے بے دلی سے کہا۔ "اگر آپ اصرار کرتے ہیں تو ٹھیک ہے کل تک ہم سب رک جائیں گے۔"

میر قافلہ جوق کو روک کر چلا گیا۔ جوق کے ساتھی پریشان تھے کہ ان حالات میں وہ اپنا کام کس طرح انجام دیں گے۔ وہ سب جوق سے طرح طرح کے سوال کرنا چاہتے تھے مگر یہاں کے پُر خطر ماحول میں انھیں یہ آزادی حاصل نہیں تھی۔ پھر بھی ایک نے آہستہ سے پوچھ ہی لیا۔ "سردار! اب کیا ہو گا؟"

جوق نے جواب دیا۔ "یہ سوال مجھ سے مت کرو۔ ہو گا وہی جو میں چاہوں گا، میرے ترکش میں متبادل تیر ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔"

کوئی دوسرا جو شاید زیادہ دل برداشتہ ہو رہا تھا، بولا۔ "میر قافلہ بہت زیادہ چالاک ہے۔"

جوق نے جھنجلا کر کہا۔ "میں اس کی چالاکی کا جواب چالاکی سے دے رہا ہوں اور آخری فیصلہ ہماری تلواریں کر دیں گی۔"

دوسرے دن ان لوگوں نے بھی سفر شروع کر دیا۔ لیکن یہ سفر انتہائی محتاط تھا۔ میر قافلہ نے اپنے پانچ سو سواروں کو قافلے سے آگے رکھا تھا، اور جوق اور اس کے ساتھیوں کو قافلے کے پیچھے، بیچ میں قافلے کے ساتھ خود چل رہا تھا۔

ابھی ان لوگوں نے دو فرسخ کا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ انھیں اپنے سامنے سے گرد و غبار اٹھتا دکھائی دیا۔ تیس چالیس سوار بھاگے چلے آ رہے تھے۔ انھوں نے آتے ہی چیخ چیخ کر اعلان کیا۔ "ہمیں کمک چاہیے۔ ہمیں مدد درکار ہے، غز ترک زیادہ ہیں اور اگر انھیں روکا نہ گیا تو وہ سب کو مار کے قافلے کو لوٹ لیں گے۔"

قافلے والے گھبرا گئے۔ میر قافلہ نے گھبراہٹ میں بقیہ پانچ سو سواروں کو بھی آگے جانے کا حکم دے دیا اور ان کے جاتے ہی جوق سے درخواست کی۔ "معزز ترک سردار! میں نے اسی لیے تمھیں روکا تھا، اب براہ کرم اپنے آدمیوں کو حکم دو کہ کچھ قافلے کے آگے رہیں اور کچھ پیچھے چلیں۔"

جوق نے اس حکم کی تعمیل کر دی اور اس قافلے کو گھیرے میں لے لیا، اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "میں نے کہا تھا کہ میرے ترکش میں ہمیشہ متبادل تیر موجود رہتے ہیں۔"

دوپہر سے ذرا پہلے، جب جوق کو یہ یقین ہو گیا کہ میر قافلہ کے ہزار جنگ جو غز ترکوں سے الجھ چکے ہیں تو اس نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔ "آخری کارروائی کے لیے تیار رہو، میں قافلے کے پیچھے جا رہا ہوں تاکہ انھیں بھی اس کارروائی کا حکم دے دوں۔"

وہ گھوڑا دوڑاتا ہوا قافلے کے پیچھے پہنچ گیا اور انھیں حکم دیا۔ "جیسے ہی نقارے پر چوٹ پڑے، تم لوگ لوٹ مار میں مشغول ہو جانا، جو سامنے آئے ہلاک کر دینا قافلے کا سامان جتنا جلدی ممکن ہو اپنے قابو میں کر کے فرار ہو جانا اور خوبصورت

عورتوں اور لڑکیوں کو کسی قسم کا نقصان پہنچائے بغیر اپنے قابو میں لے لینا۔ ان کے بھی بہت اچھے دام مل جائیں گے۔"

میر قافلہ نے جوق کو گھوڑا دوڑاتے دیکھا تو وہ پریشان ہوگیا، پوچھا۔ "ترک سردار! کیا بات ہے؟ تو اتنا بدحواس کیوں ہو رہا ہے؟"

جوق نے جواب دیا۔ "آپ میرے پاس آئیں، میرے ساتھ، میں یہاں بھی گڑبڑ محسوس کر رہا ہوں۔"

میر قافلہ اور زیادہ پریشان ہوگیا، پوچھا۔ "میں کہاں آؤں تیرے ساتھ؟ تو کہاں بات کرے گا مجھ سے؟"

جوق نے اپنے دو ساتھیوں کی مدد سے میر قافلہ کو گھیرے میں لے لیا اور ذرا درشت لہجے میں کہا۔ "میر قافلہ! پانسہ پلٹ چکا، میں تجھ کو حکم دے رہا ہوں کہ تو میرے ساتھ چل۔ اس وقت تو میرا قیدی ہے اور قیدی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ قید کرنے والوں سے سوال جواب کرے۔"

میر قافلہ اور زیادہ سہم گیا، پوچھا۔ "مگر تم ہو کون؟"

جوق نے غصے میں میر قافلہ کی گدی پکڑ لی اور اس کو کھینچ کے گھوڑے سے نیچے گرا دیا۔ کہا۔ "پھر وہی سوال۔ میں کہتا ہوں اپنی بکواس بند کر اور ہمیں اپنا کام کرنے دے، کیونکہ ہمارے پاس کام زیادہ ہے اور وقت کم۔"

جوق نے حکم دیا۔ "نقارے پر چوٹ لگائی جائے۔"

لمحوں میں اس حکم پر عمل کیا گیا۔ نقارے پر چوٹ پڑی اور قافلے کے آگے پیچھے سے "مارو، لوٹو" جیسے نعروں نے قافلے والوں کو لرزہ براندام کر دیا۔ جوق کے آدمیوں نے قافلے کے مردوں کو نہایت بے رحمی اور سفاکی سے قتل کرنا شروع کر دیا۔ انھیں اس کام میں زیادہ دیر نہیں لگی، جوق نے اس مار کاٹ کے ساتھ ہی قافلے کے سامان کو لوٹنا اور وہاں سے تیزی کے ساتھ منتقلی کا عمل شروع کر دیا۔ کچھ لوگ مار کاٹ میں مشغول تھے اور کچھ لوگ قافلے کے سامان کو گھوڑوں اور گدھوں پر لاد کے منتقلی میں مشغول تھے۔

میر قافلہ کے دونوں ہاتھ پشت پر باندھ دیے گئے۔ اس کو اسی طرح ایک گھوڑے پر ڈال دیا گیا۔ دو ڈھائی گھنٹے میں لوٹ مار کا کام انجام پا چکا تھا۔ جوق نے مقتولوں کو وہیں چھوڑا اور لوٹ کا سامان لے کر وہاں سے عزارہ ہوگیا۔ واپسی میں اس نے جس راستے کا انتخاب کیا تھا وہ عام اور معروف شاہراہ سے الگ تھا۔ جوق یہاں سے جلد از جلد نکل جانا چاہتا تھا

کہیں رُکے بغیر وہ خجند روانہ ہوگیا اور خجند میں پہنچنے کے بعد اس نے اپنے قبیلے کو غزوں کے کسی ممکنہ حملے سے بچانے کے لیے تیار کرنے لگا۔ اس نے لوٹ کے سامان کو اِدھر اُدھر پہاڑی غاروں میں چھپا دیا۔ میر قافلہ جوق کے قبضے میں تھا۔ جوق اس کو کسی وجہ سے رہا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جوق کو لوٹ میں جو کچھ ملا تھا اس میں کنیزیں بھی تھیں، میر قافلہ انھیں بغداد لیے جا رہا تھا کیونکہ کنیزوں کے صحیح قدر دان بغداد ہی میں تھے۔ چونکہ جوق نے اس سے پہلے یہ کام کبھی بھی نہیں کیا تھا اس لیے وہ میر قافلہ کے سارے سامان کا کاروبار میر قافلہ ہی کے مشورے سے کرنا چاہتا تھا۔

دوسری طرف عز ترک سردار قافلے کے ہزار شہسواروں میں الجھا رہا۔ دونوں طرف سے گھمسان کی جنگ ہوئی اور جب کئی ہزار عز ترکوں نے قافلے کے ہزار سپاہیوں کو شکست دے دی تو ترکوں نے قافلے کا رُخ کیا۔ لیکن اس وقت تک قافلہ لٹ چکا تھا، وہاں عز سردار کو بہت ساری لاشیں، خالی خیمے اور خیموں میں موجود فضول قسم کا سامان ملا۔ اس کو حیرت تھی کہ قافلے کا قیمتی سامان کون لے گیا؟ اس نے خیموں میں اور خیموں کے باہر پڑی ہوئی لاشوں میں نیم مُردہ یا زخمی لوگوں کو تلاش کیا۔ ان میں تین ایسے مل گئے جو مرے تو نہیں تھے لیکن زخمی ہونے کے بعد بے ہوش ہوگئے تھے اور اب ہوش میں تھے۔ انھوں نے عز سردار کو بتا دیا کہ یہ سب کچھ جوق نامی ترک سردار نے کیا ہے۔ عز سردار کو ایسا لگا گویا اس کی روح پر کاری زخم لگا دیا گیا ہے۔ اس نے ایک بار پھر تصدیق چاہی۔ "کیا نام بتایا تھا تو نے؟ جوق یا کوئی اور؟"

زخمی نے جواب دیا۔ "جوق نام مجھے اس لیے بھی یاد ہے کہ یہ شخص یہاں ہم سے دوسری بار ملا تھا اور ہمارے میر قافلہ نے اس پر خاصا اعتماد کر لیا تھا، اور یہی وہ شخص ہے جس نے ہمیں یہ خبر دی تھی کہ عز ترکوں کے لوگ ہماری گھات میں ہیں اور جوق نے اپنے بارے میں یہ بتایا تھا کہ اس کی قوم کھیتی باڑی اور باغبانی کرتی ہے اور یہ بھی کہا تھا کہ وہ آنے جانے والے تجارتی قافلوں کی نگہداشت بھی کرتا ہے اور یہ خدمت وفاداری اس نے خلافت اسلامیہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اختیار کی ہے۔"

عز سردار کے اندر باہر آگ سی لگی ہوئی تھی۔ وہ دانت پیسنے لگا، بولا۔ "جوق! میں تجھ کو معاف نہیں کروں گا۔ میں تجھ کو اور تیری قوم کو تباہ و برباد کر دوں گا۔"

تینوں زخمی زار و قطار رو رہے تھے، انھوں نے عز سردار کی خوشامد کی۔ "ہمیں بچا لو ترک سردار! ورنہ ہم مر جائیں گے۔"

عز سردار نے پوچھا۔ "تمھارا میر قافلہ کہاں ہے؟"

ایک زخمی نے پوچھا۔ "کیا لاشوں میں میر قافلہ نہیں ملا؟"

عز سردار نے جواب دیا۔ "میں تمھارے میر قافلہ کو پہچانتا نہیں ہوں۔"

ادارۂ فکرِ صحت
کا مقصد انسانیت کی
بے لوث خدمت
سستے آسان اور
مؤثر علاج
سے کرنا ہے
آپ کا خط
ہمارے لئے خاص پرائیویٹ سے کم نہیں!

زخمی نے میر قافلہ کا حلیہ بتایا۔ "چھوٹی چھوٹی آنکھیں چوڑی پیشانی، داہنی پیشانی پر ابرو کے اوپر بڑا سا مسّا، داڑھی میں چند بال، وہ بھی صرف ٹھوڑی پر، گلے میں سونے کی زنجیر، لباس گلاب کے پھولوں والا، میر قافلہ کو گلاب کے پھول بہت پسند ہیں اور وہ زیادہ تر وہی لباس پہنتا ہے جن پر گلاب کے پھول بنے ہوں۔"

عز سردار اپنے ساتھیوں کی مدد سے دیر تک لاشوں میں چینی میر قافلہ کو تلاش کرتا رہا مگر ناکام رہا۔ آخر واپس جا کے زخمیوں کو بتایا کہ اُن میں چینی میر قافلہ کی لاش نہیں ہے۔

ایک زخمی نے کراہتے ہوئے کہا۔ "اچھا! اگر وہ لاشوں میں نہیں ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ جوق کی قید میں چلا گیا ہوگا۔"

عز سردار کو تینوں زخمیوں پر رحم آ گیا۔ اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "ان تینوں کو اپنے ساتھ لے چلو ہم ان کا علاج کرائیں گے، ان سے کام لیں گے۔"

تینوں زخمیوں کو عز سردار کے آدمی اپنے قبیلے میں لے گئے اور انھیں اسی وقت جراحوں کے سپرد کر دیا گیا، جراحوں نے ان کے زخموں کو اچھی طرح دیکھا بھالا اور اعلان کر دیا کہ تینوں اچھے ہو جائیں گے۔

اب عز سردار جوق کی طرف متوجہ ہو گیا، اس نے اپنے چند خاص ذمے دار آدمیوں کو طلب کیا اور انھیں حکم دیا کہ وہ خجند چلے جائیں۔ اور وہاں جوق اور اس کے ہم قوموں کا پتا لگائیں اور معلوم کر کے ہمیں یہ بتائیں گے کہ آجکل کیا کر رہے ہیں اور انھوں نے لوٹ کا مال کہاں چھپا دیا ہے؟

یہ ذمے دار چار تھے اور چاروں اسی وقت خجند کے لیے روانہ ہو گئے۔ یہ بہت خوش تھے کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ اگر انھوں نے عز سردار کو یہ خبر صحیح صحیح پہنچا دی تو اس سے انھیں بہت فائدہ پہنچے گا۔

چاروں ترک خجند روانہ ہو گئے۔ جب یہ خجند میں داخل ہوئے تو انھیں پہلی جو خبر ملی وہ یہ تھی کہ جوق — آس پاس کے قبائل کی خوب خوب دعوتیں کر رہا ہے اور اس نے ہزاروں ترکوں کے دل جیت لیے ہیں۔

ان چاروں نے خود کو غریب الوطن ترک ظاہر کیا، اور یہ بتایا کہ انھیں سالوں پہلے غلام بنا کے بیچ دیا گیا تھا اور اب وہ فرار ہو کے خجند آ گئے ہیں، یہ چاروں رو رو کر خجند والوں کو اپنی داستانیں سناتے تھے۔ ان چاروں نے کہا۔ "ہم پریشان حال کسی ترک سردار کی ملازمت میں چلے جانا چاہتے ہیں۔"

کسی نے انھیں مشورہ دیا کہ اس وقت جوق سے اچھا اور مہربان کوئی اور ترک سردار نہیں ملے گا۔ جوق جوان ہے ذہین ہے اپنے ساتھیوں پر مہربان اور ان کا سچا ہمدرد ہے وہ ایسے جوان ترکوں کی تلاش میں ہے جو اس کے جھنڈے تلے جمع ہو کر اس کے معاون و مددگار بن جائیں۔ اس کا ستارۂ اقبال عروج پر ہے۔

چاروں ترکوں نے خجند میں ہر طرف جوق ہی کا چرچا دیکھا۔ اور انھیں بھی اشتیاق ہوا کہ جوق سے ضرور ملنا چاہیے کہ یہ ہے کون؟

یہ جوق کو تلاش کرتے ہوئے سیب کے باغ میں پہنچ گئے۔ یہاں معلوم ہوا کہ جوق نے اس باغ کو خرید لیا ہے اور اس کی نگہداشت پہ ان بوڑھے ترکوں کو متعین کر دیا ہے جو کوئی اور کام نہیں کر سکتے۔ یہاں یہ بارہ تیرہ بوڑھے ایک ساتھ رہتے تھے اور باغ کی دیکھ بھال میں بڑی دلچسپی لیتے تھے۔ اس وقت جوق باغ کے ایک گوشے میں ترکوں کے کئی قبائلی نمائندوں سے باتیں کر رہا تھا، یہ قبائلی نمائندے اپنے اپنے قبیلے کی طرف سے یہ پیش کش لے کر آئے تھے کہ اگر ان کے قبیلے بھی جوق کے جھنڈے تلے آ جائیں تو انھیں اس سے کیا فائدہ پہنچے گا؟

جوق نے جواب دیا۔ "میں اس سے زیادہ کوئی وعدہ نہیں کروں گا کہ میں جو کچھ کھاؤں گا وہی اپنے ساتھیوں کو کھلاؤں گا۔ میں جو پہنوں گا وہی اپنے ساتھیوں کو پہناؤں گا۔ مجھے فتوحات اور حملہ و یلغار سے جو کچھ بھی ملے گا اس میں اتنا ہی میرا بھی ہوگا جتنا میرے ساتھیوں کا۔ میں تنہا یا اکیلا کچھ بھی نہیں، میں زندہ رہوں گا تو اپنے ساتھیوں کے لیے اور مروں گا تو اپنے ساتھیوں کی خاطر۔"

اس کے بعد جوق نے اپنے کسی ساتھی کو اشارہ کیا۔ وہ اٹھ کر شامیانے کے پیچھے چلا گیا۔ اور جب واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں ایک خوان تھا، جس پر ایک خوبصورت ریشمی رومال پڑا ہوا تھا، یہ خوان جوق کے سامنے رکھ دیا گیا۔

جوق نے قبائلی نمائندوں کو اپنے پاس بلایا اور خوان پر سے رومال ہٹا کے اس میں رکھے ہوئے قیمتی ہاروں کو ان نمائندوں میں تقسیم کر دیا، بولا۔ "آج سے تم لوگ میری پناہ میں آ گئے میں نے تمھاری ذمہ داری قبول کی۔"

نمائندوں نے ہار قبول کر لیے اور جوق کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔

عز سرداروں کے چاروں مخبر بھی جوق سے خاصے متاثر ہوئے، وہ اس موٹے بیل جیسی قامت رکھنے والے جوان جوق سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ اتفاق سے —— جوق نے بھی انھیں دیکھ لیا اور ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

پوچھا: "یہ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟"

کسی مقامی ترک نے ان چاروں کا تعارف کرایا: "یہ چاروں پریشان حال کسی ترک سردار کی پناہ گاہ ڈھونڈ رہے تھے، میں انھیں یہاں لے آیا کیوں کہ اس وقت اس سے اچھی کوئی اور پناہ گاہ نہیں ہے۔"

جوق نے ان چاروں کو اپنے پاس بلایا، کہا: "بیشک میری چھت سے اچھی پناہ گاہ انھیں نہیں مل سکتی۔"

ان چاروں کو جوق کے پاس پہنچادیا گیا، جوق نے انھیں اپنے سامنے اپنے پاس بٹھالیا۔ اور کہا: "میں تم چاروں سے بعد میں باتیں کروں گا، پہلے میں اپنے مہمانوں سے باتیں کرلوں۔" اس کے بعد وہ پھر قبائلی نمائندگان سے باتیں کرنے لگا: "اتحاد ہماری سب سے بڑی ضرورت ہے، اپنے اپنے سرداروں کو میرے پاس لاؤ، میں انھیں قائل کرلوں گا۔ تم اپنے سرداروں سے یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ اگر ان کی سرداری ان کا یہاں تک آنے میں مانع آئے تو میں ان کے پاس آسکتا ہوں، میں ان کے دشمنوں سے جنگ کرنے کو تیار ہوں، میں ان کے جھنڈے تلے لڑنے کو تیار ہوں۔"

جوق کی باتوں میں بڑا اثر تھا۔ اس کی داد و دہش اور فراخ دلی نے ہر ایک کو موہ لیا تھا۔

قبائلی نمائندگان جوق سے گلے ملے اور گردن کے دونوں طرف بوسے دیے اور رخصت ہوگئے۔ ان کے جانے کے بعد جوق نے ان چاروں کو اپنے پاس بلالیا اور پوچھا: "کیا بات ہے؟ ہاں اب بتاؤ کہ تم لوگ کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟"

ان چاروں نے یکساں داستان سنائی: "ہمیں بچپن ہی میں اغوا کر کے بیچ دیا گیا تھا۔ اب جوان ہونے کے بعد جب ہمیں فرار کا موقع ملا تو ہم یہاں آگئے۔"

جوق نے پوچھا: "فنِ سپاہ گری سے واقف ہو؟"

انھوں نے جواب دیا: "خوب اچھی طرح۔ جب چاہو امتحان لے لو۔"

جوق کی نظریں ان کے چہروں پر جمی اور پھسلتی رہیں، وہ ان کے چہروں میں معلوم نہیں کیا دیکھ رہا تھا اور کیا تلاش کر رہا تھا، وہ چاروں سہم گئے اور سر جھکا کے سوچ میں پڑ گئے۔

جوق نے معنی خیز تنبیہ کی: "کیا تمھیں یقین ہے کہ تم نے جو کچھ کہا وہ درست ہے؟"

چاروں کے چہرے فق ہوگئے۔ پورے تیقن اور اعتماد سے انکار نہیں کرسکے۔ سب کی طرف سے ایک نے جواب دیا۔ "ہم جھوٹے نہیں ہیں، جو کچھ کہا بالکل صحیح ہے۔"

جوق نے اٹھتے ہوئے کہا: "اچھا ذرا میرے ساتھ آؤ۔ میں کچھ دیر بعد تم سے باتیں کروں گا۔"

جوق وہاں سے اٹھ کے باغ سے باہر آگیا، بیس پچیس ترک جوان جوق کے دائیں بائیں چلنے لگے۔ عز سردار کے مخبر چاروں ترک، جوق کے محافظوں کے گھیرے میں چل رہے تھے۔ باغ کے باہر جوق اور اس کے محافظوں کے گھوڑے ہری ہری گھاس کھانے میں مصروف تھے۔ ان کی نگرانی چند دوسرے ترک کر رہے تھے۔ اشارہ پاتے ہی وہ گھوڑوں کو جوق اور اس کے محافظوں کے پاس لے آئے۔ جوق نے چاروں سے پوچھا: "تمھارے گھوڑے کہاں ہیں؟"

ان چاروں کے گھوڑے بھی وہیں چر رہے تھے انھوں نے اپنے گھوڑوں کو سبزہ زار سے ہٹا کر سواری میں لے لیا۔

جوق نے کہا: "تم لوگ میرے پیچھے پیچھے آؤ۔"

چنانچہ وہ سب جوق کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔

خجند کے شمال میں، جہاں کھیتوں کا طویل سلسلہ سیکڑوں میل تک پھیلا ہوا تھا، جوق انھی کھیتوں کے بیچ سے گزر کے خیموں کی ایک بستی میں داخل ہوگیا۔ انھی خیموں میں جوق کا قبیلہ آباد تھا اور اب اس بستی میں دو ہزار نئے خیمے بھی شامل ہوگئے تھے اور یہ وہ لوگ تھے جو اطراف میں آباد تھے اور اب وہ خوش بخت اور اقبال مند جوان جوق کی سرپرستی اور نگرانی میں اپنے دشمنوں سے جنگ کرنا چاہتے تھے۔

یہاں ایک شاندار خیمے میں جوق رہائش پذیر تھا۔ جوق اس خیمے کے سامنے رک گیا، بولا: "یہ میرا خیمہ ہے لیکن یہ اتنا شاندار نہیں ہے جتنا شاندار عز ترکوں کے سردار کا خیمہ تھا۔"

اس آخری اور خطرناک اشارے نے چاروں کو بالکل ہی بدحواس کردیا۔ ایک نے کہا: "سردار! ہم بہت تھکے ہوئے ہیں۔ براہِ کرم ہمیں بتایا جائے کہ ہم کہاں ٹھہریں گے؟"

جوق مسکرایا، کہنے لگا: "ابھی تو مجھے تم سے بہت ساری باتیں کرنا ہیں۔ تم سے کچھ پوچھنا ہے، کچھ معلوم کرنا ہے۔ تمھیں کس نے خریدا تھا، تمھارے آقاؤں کے نام کیا تھے اور تم ان کے پاس کیا کرتے تھے۔ پھر تم چاروں ایک ساتھ بھاگے کس طرح؟ تمھاری داستان تو بڑی دلچسپ اور معنی خیز ہے۔ میں اس کو تمھاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔"

ان کی پریشانیاں عروج کو پہنچ گئیں، ایک نے کہا: "سردار! اگر آپ حکم دیں گے تو ہم چاروں ساری رات اور سارا دن جاگ کے سوالوں کے جواب دیں گے لیکن اس وقت ہم بہت زیادہ تھکے ہوئے ہیں اس لیے اگر آرام کرنے کی

اجازت دے دی جائے تو بڑا کرم ہوگا۔"

جوق کو ان پر ہنسی آرہی تھی' بولا۔ "تم چاروں میری پناہ میں آئے ہو' اب تم بالکل محفوظ ہو لیکن میں محسوس کر رہا ہوں کہ اس وقت تم چاروں زیادہ پریشان ہو حالانکہ اس وقت تمہیں زیادہ مطمئن اور زیادہ خوش ہونا چاہیے تھا۔"

ایک نے تو سونے کی اداکاری شروع کر دی' وہ اونگھنے لگا۔ بولا۔ "میں بہت تھکا ہوا ہوں سردار! مجھے آرام کرنے دو۔"

جوق نے انھیں آرام کے لیے چھوڑ دیا لیکن اب انھیں حراست میں لیا جا چکا تھا۔ ان کے خیمے کے چاروں طرف جوق کے آدمی پہرہ دینے لگے۔

جب ان چاروں کو یہ یقین ہو گیا کہ جوق چلا گیا تو وہ آپس میں باتیں کرنے لگے۔ ایک نے کہا۔ "یہ جوق!! ہم بلاوجہ یہاں آگئے۔ یہ تو شیطان سے بھی آگے کی کوئی چیز ہے۔"

دوسرے نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا' بولا۔ "ایسی بات نہ کر۔ جوق اچھا آدمی ہے۔ کیا تو نے دیکھا نہیں کہ وہ اپنے ساتھیوں اور حلیفوں سے کتنی محبت اور خندہ پیشانی سے پیش آتا ہے۔"

پہلا تینوں سے زیادہ خوفزدہ اور پریشان تھا' بولا۔ "میں تو جوق کو شیطان ہی کہوں گا کیونکہ ذرا غور تو کرو' اس نے ہمیں پہچان لیا ہے۔ کس طرح پہچانا مجھے پتا نہیں۔ لیکن میں یہ دعوے سے کہوں گا کہ ہم چاروں پہچانے جا چکے ہیں۔ جوق ضرور کسی بری روح کا مسخر ہے۔"

اب تیسرا بھی بولنے پر مجبور ہو گیا۔ "تم لوگ میری مانو تو میں ایک مشورہ دوں؟ اگر تم میرا یہ مشورہ مان لوگے تو بچ جاؤ گے اور اس کا بھی امکان ہے کہ ہمارا مستقبل سنور جائے اور اگر نہیں مانو گے تو جان سے مارے جاؤ گے۔"

چوتھے نے پوچھا۔ "یعنی وہ کیا؟"

تیسرا بولا۔ "اب ہمیں یہی کام کرنا چاہیے کہ جوق کو ساری باتیں سچ سچ بتا دیں۔ میرا خیال ہے وہ ہمارے سچ سے خوش ہوگا اور ہمیں اپنے سچ کا معاوضہ بھی ملے گا اور اگر نہیں بتائیں گے تو جوق کسی نہ کسی طرح ہماری حقیقت سے باخبر ہو جائے گا اور جب وہ ہمیں پہچان لے گا تو پھر وہ ہم پر رحم بھی نہیں کرے گا اور پھر یہ کہ وہ رحم ہم پر کرے ہی کیوں؟ ہم نے جوق کو دھوکا دینے کی کوشش کی' اس دھوکہ دہی کی ہمیں جو سزا بھی ملے گی ہم اس کے مستحق ہوں گے۔"

پہلا مفاہمت اور اقرار پر تیار نہیں تھا' بولا۔ "میں مر جانا پسند کروں گا مگر اپنے سردار سے غداری نہیں کروں گا۔"

لیکن تینوں تو آپس میں ہم خیال ہو چکے تھے۔ ان تینوں نے آپس میں یہ طے کر لیا تھا کہ کل پہلا کام یہی کرنا ہے کہ جوق کو سب کچھ بتا دیں۔

جوق کو چینی قافلے سے ملنے والی لڑکیوں اور عورتوں میں سے ایک لڑکی پسند آگئی تھی۔ یہ لڑکی نہ صرف یہ کہ بہت خوبصورت تھی بلکہ ذہین اور حاضر جواب بھی تھی۔ جوق نے چینی میر قافلہ کے ساتھ ان عورتوں اور لڑکیوں کی قطاروں کے سامنے سے گزرتے ہوئے ان کا مشاہدہ کیا اور مشاہدہ بھی کیسا؟ نہایت توجہ اور تجسس سے۔

چینی میر قافلہ جوق کا غلام سا بن چکا تھا' جوق نے اس سے کہا۔ "کیا تو جانتا ہے کہ میں نے تجھ کو ہلاک کیوں نہیں کیا؟"

چینی میر قافلہ نے جواب دیا۔ "مجھے پتا نہیں۔ معلوم نہیں کیوں حالانکہ تو آدمی شریف اور وفادار نہیں ہے۔"

جوق اس طرح تلملایا گویا اسے چابک رسید کر دیا گیا تھا۔ پوچھا۔ "کیا کہا تو نے؟ ذرا دوبارہ تو کہنا۔"

چینی میر قافلہ کی پیشانی پر نفرت کی سلوٹیں موجود تھیں۔ "دیکھ ترک سردار! میں موت سے نہیں ڈرتا۔ اور میں یوں بھی اسی دن مر گیا تھا' جس دن تو نے دھوکا دے کر ہمیں لوٹ لیا تھا اور میرے آدمیوں کو ہلاک کر کے مجھے قید کر لیا تھا۔"

جوق نے اس کا گلا اپنے دونوں ہاتھوں سے دبانا شروع کیا' غصے میں کہا۔ "میں تجھ کو جان سے مار دوں گا۔ اس وقت تو ترکوں میں نہیں' ہم میں ہے' کیا تجھ کو نہیں معلوم کہ میں ایران کے آخری آتش پرست تاجدار یزدگرد کا پوتا ہوں۔ میں انتہائی سفاک اور بے رحم انسان ہوں۔"

چینی میر قافلہ ذرا بھی نہیں پسیجا' بولا۔ "ہوگا' ہمیں کیا۔ میں تجھ کو جلاد سمجھتا ہوں یا پھر وہ فرشتہ جو جانداروں کی جانیں قبض کر لیتا ہے۔ میں جب بھی تجھ کو دیکھتا ہوں یہی گمان گزرتا ہے کہ شاید تو انسان نہیں کسی بد انسان کی روح ہے۔"

جوق عورتوں اور لڑکیوں کے سامنے تماشا بن چکا تھا۔ وہ مسکرا مسکرا کر کبھی چینی میر قافلہ کو دیکھتیں اور کبھی جوق کو۔ جوق کو زبردست ندامت اٹھانا پڑ رہی تھی اور خاص کر وہ لڑکی جو جوق کو پسند آگئی تھی' وہ ان دونوں کی تحقیر آمیز نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

جوق نے چینی میر قافلہ کا گریبان پکڑ لیا' بولا۔ "ذلیل انسان! میں تجھ کو کب کا ہلاک کر چکا ہوتا' لیکن جب بھی میں نے تیرے خلاف کچھ سوچنا چاہا' میری نظروں کے سامنے وہ چینی میر قافلہ آگیا' جس نے مجھے مہمان بنا لیا تھا اور کئی دن تک پیٹ بھر کے کھانا کھلاتا رہا۔"

چینی میر قافلہ نے حیرت سے کہا۔ "اچھا تو تو احسان سے

بھی واقف ہے۔ تو جانتا ہے کہ احسان کیا ہوتا ہے اور محسن کس کو کہتے ہیں؟"

جوق نے اس کا گریبان پکڑ کے اتنی زور سے جھٹکا دیا کہ وہ قدموں میں گر گیا۔ اس کے بعد اس کو اٹھا کر اس لڑکی کے سامنے کھڑا کر دیا جو جوق کو پسند آ گئی تھی، جوق نے کہا۔ "میں اس لڑکی کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں، یہ کون ہے؟ کس ملک سے تعلق رکھتی ہے اور اس کا نام کیا ہے؟"

چینی میر قافلہ نے لڑکی کو غور سے دیکھا۔ اس کے بعد حافظے پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اس لڑکی کا ہندسہ کیا ہے؟"

جوق نے اس کی پشت پر دیکھا، چینی زبان میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ اس نے لڑکی کی پشت چینی میر قافلہ کی طرف کر دی، بولا "تو ہی پڑھ کے بتا کہ یہ کون سا ہندسہ لکھا ہے؟"

چینی میر قافلہ نے کچھ زیر لب پڑھا مگر بتایا نہیں، بولا "تیری لوٹ میں ایک قلمی کتاب بھی تھی۔ اس کو میرے پاس لاؤ وہ ان عورتوں اور لڑکیوں کی فہرست ہے مجھے اس کتاب میں یہ دیکھنا ہوگا کہ اس ہندسے کی لڑکی کون ہے، اس کا نام کیا ہے اور اس کو کہاں سے لایا گیا تھا؟"

جوق نے چینی میر قافلہ پر طنز کیا۔ "میں جانتا ہوں کہ تو یہ پُرپیچ باتیں کیوں کر رہا ہے؟ شاید تو اس طرح اپنی اہمیت اور قدر و قیمت جتانا چاہتا ہے اور تو مجھ کو یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ تیرے بغیر میرے بہت سے کام رُک جائیں گے۔ اگر تیرے دل میں ایسی کوئی بات ہے تو سُن لے کہ میں اپنی ان کمزوریوں کی پروا کیے بغیر بھی تجھ کو قتل کر سکتا ہوں، میں اپنی راہ کی ہر رکاوٹ دور کر سکتا ہوں اور میں یہ جانے بغیر بھی اس لڑکی کو اپنا سکتا ہوں کہ یہ کون ہے، اس کا کیا نام ہے اور یہ کس ملک سے تعلق رکھتی ہے۔"

چینی میر قافلہ ان عورتوں اور لڑکیوں کے پاس سے ہٹ کے دور کھڑا ہو گیا، بولا۔ "اگر یہ بات ہے تو میں مرنے کے لیے تیار ہوں۔ مجھ کو اسی وقت قتل کر دے کیونکہ میرا ایک بار مر جانا، بار بار کے مرنے سے کہیں بہتر ہے۔"

جوق اس عجیب و غریب چینی کو غور سے دیکھتا رہا۔ اس کو ایسا انسان شاید کبھی بھی نہیں ملا تھا۔ نڈر اور مزے دار باتیں کرنے والا۔ جوق کے ہونٹوں پر ہنسی آ گئی، وہ آہستہ آہستہ چل کے چینی میر قافلہ کے پاس گیا اور اس کی صورت دیکھنے لگا۔ اب بڑھوں کی ہنسی غائب ہو چکی تھی۔ قطاروں میں کھڑی عورتیں اور لڑکیاں اس غیر یقینی منظر کو حیرت اور تجسس آمیز نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ چینی میر قافلہ بھی جوق کے چہرے پر نظریں جمائے اکڑا ہوا تھا، وہ جوق سے ذرا بھی خوفزدہ نہیں تھا۔

جوق نے اچانک سوال کیا۔ "تیرا نام کیا ہے؟"

چینی میر قافلہ نے کہا۔ "میرا نام جان کے کیا کرے گا تو؟"

جوق نے جھنجلا کر کہا۔ بات کو الجھانے کی کوشش نہ کر۔ "میں تجھ سے تیرا نام پوچھ رہا ہوں۔"

چینی میر قافلہ نے جواب دیا۔ "لیو شاؤ۔ میں لیو شاؤ ہوں، چین کے جنوبی حصے کا لیو شاؤ۔"

جوق نے کہا۔ "لیو شاؤ! تو بلاشبہ نڈر اور بہادر انسان ہے۔ کیا ہم دونوں ایک دوسرے کے دوست نہیں بن سکتے؟"

لیو شاؤ نے جواب دیا۔ "مشکل ہے، تو نے ہمیں دھوکا دیا اور ہمیں تباہ و برباد کر دیا۔ میرے پاس جو کچھ تھا سب تیرے قبضے میں چلا گیا۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں رہا۔ ان زخموں اور گھاؤں کے بعد ہم دونوں میں دوستی کس طرح ہو سکتی ہے؟"

جوق نے کہا۔ "دیکھ لیو شاؤ! انسان کو بڑا بننے کے لیے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے، بہت خود غرض ——— بہت زیادہ چالاک اور بہت زیادہ سفاک تک بن جانا پڑتا ہے اور یہ بڑے انسان چونکہ سب کچھ تنہا اور محض اپنی عقل کے بل بوتے پر بڑے انسان نہیں بن سکتے، اس لیے انھیں اپنے اردگرد بہادروں، عقل مندوں اور جاں نثاروں اور وفاداروں کے جتھے جمع کرنا پڑتے ہیں۔ میں بھی بڑا انسان بننا چاہتا ہوں اور مجھے بھی اپنے اردگرد مذکورہ صفات کے انسان جمع کرنے ہیں۔"

لیو شاؤ نے جوق کا مطلب سمجھ لیا تھا مگر تجاہل عارفانہ سے کام لیا، پوچھا۔ "میں تیرا مطلب نہیں سمجھا، تو کہنا کیا چاہتا ہے؟"

جوق نے جواب دیا۔ "لیو شاؤ! تیری باتیں اور تیرا رویہ دونوں بتاتے ہیں کہ تو بہت بہادر، نڈر اور عقل مند انسان ہے۔ تو اگر پسند کرے تو میں تجھ کو اپنا وزیر یا مشیر بنا سکتا ہوں۔"

لیو شاؤ کو بھی ہنسی آ گئی، پوچھا۔ "مشیر کی حد تک تو بات سمجھ میں آتی ہے لیکن یہ وزیر کا کیا مطلب ہے؟ کیا تو کسی ملک کا بادشاہ بھی ہے؟"

جوق نے جواب دیا۔ "میں کسی ملک کا بادشاہ تو نہیں ہوں لیکن بادشاہ بننے کا ارادہ ضرور کر چکا ہوں، تو میری مدد کر، میں بادشاہ بننے کے بعد تجھ کو اپنا وزیر بنا لوں گا، فی الحال تو میرا مشیر ضرور رہے گا۔"

لیو شاؤ چالاکی اور عیاری میں جوق سے شکست اٹھا چکا تھا اس لیے وہ جوق کی صلاحیتوں کا منکر نہیں تھا۔ مگر جوق کی کوہ پیکر شخصیت نے دل ہی دل میں لیو شاؤ کو اپنا مداح بنا لیا تھا۔ بولا۔ "لیکن میں بنیادی طور پر تاجر ہوں، تجھے کیا مشورہ دوں گا؟"

جوق نے فرط محبت سے لیو شاؤ کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے

اور انھیں دبا دبا کے کہنے لگے۔" لیوشاؤ! میں جانتا ہوں کہ تو بنیادی طور پر تاجر ہے۔ اس لیے مجھے تو ملکی اور معاشرتی معاملات میں کیا مشورے دے گا۔ مگر میں جانتا ہوں کہ مجھ کو تیری کتنی ضرورت ہے اور تو میرے لیے کتنا مفید انسان ثابت ہو گا۔"

لیوشاؤ سوچنے لگا۔ کچھ دیر بعد بولا۔" جوق! تیری طرف سے میرا دل صاف نہیں ہے اس لیے مجھے کچھ نہیں معلوم کہ میں تجھے مخلصانہ مشورے دے بھی سکوں گا یا نہیں' اس لیے بہتر یہی ہے کہ تو مجھے کسی آزمائش ہی میں نہ ڈال۔"

جوق نے لیوشاؤ کو سمجھانے کی بھرپور کوشش کی۔" لیوشاؤ! تو بہت عقل مند ہے' مگر تھوڑی سی عقل مجھ کو بھی ملی ہے۔ یہ تھوڑی سی عقل مجھے جو کچھ بتا رہی ہے ذرا اس کو بھی سُن لے اور اس پر غور کر کے بتا کہ میں غلط کہہ رہا ہوں یا صحیح؟"

لیوشاؤ جوق کی صورت دیکھ رہا تھا۔

جوق کہنے لگا۔" لیوشاؤ! تو بنیادی طور پر تاجر ہے' تو تجارت کرتے کرتے مر جائے گا یا مار دیا جائے گا اور مرتے ہی گمنامی میں غائب ہو جائے گا لیکن میں خود ایسا کوئی کام پسند نہیں کرتا' جو موت کے بعد مجھے قعر گمنامی میں پہنچا دے۔ میں مرنے کے بعد بھی زندہ رہنا چاہتا ہوں' میں فاتح بننا چاہتا ہوں' میں بادشاہ بننا چاہتا ہوں اور بادشاہ کے بعد شہنشاہ بننا چاہتا ہوں۔ اور میں جو کچھ بھی بننا چاہتا ہوں اس میں تجھ کو اور تیرے نام کو شامل رکھنا چاہتا ہوں۔"

لیوشاؤ نے جواب دیا۔" لیکن ایسا بہت کم ہوا ہے کہ انسان نے جو کچھ سوچا اور چاہا ہو' اُسے حاصل بھی کر لیا ہو۔"

جوق نے کہا۔" میں اس سے انکار نہیں کرتا مگر سوچے اور چاہے بغیر کچھ ملتا بھی تو نہیں۔"

لیوشاؤ نے ایک بار پھر اس کی کاٹ دی' بولا۔" انسان کو اپنی صلاحیتوں کی حد تک ہی سوچنا چاہیے۔ اپنے دامن کو دیکھ کر۔ دونوں ہتھیلیوں کی گہرائی جتنا' اس سے زیادہ مانگے گا اور اگر حاصل بھی کرے گا تو دامن یا ہتھیلی سے نکل کر خاک میں مل جائے گا۔"

جوق کو غصہ آ رہا تھا مگر غصے کو پی رہا تھا' بولا۔" میرے دامن اور ہتھیلی کی وسعتوں کا علم مجھے ہے' صرف مجھے' کسی اور کو نہیں۔ اس لیے میں جو کچھ چاہوں گا اور جو کچھ حاصل کرنے کی کوشش کروں گا وہ میرے دامن اور ہتھیلی کی وسعتوں سے زیادہ نہیں ہو گا۔"

لیوشاؤ نے کہا۔" اچھا پھر مجھے سوچنے کا وقت دے۔ میں کام یا کوئی فیصلہ سوچے سمجھے بغیر نہیں کرتا۔"

جوق نے جواب دیا۔" یہ مجھے منظور ہے۔ اب میں تیری کتاب تلاش کروں گا وہ کتاب' جس میں عورتوں اور لڑکیوں کے نام اور ان کے کوائف درج ہیں۔" پھر لیوشاؤ کے کان کے پاس منہ لے جا کر پوچھا۔" اب تو اس لڑکی کا ہندسہ بتا دے۔"

لیوشاؤ ہنس دیا' بولا۔" انتالیس' ایک کم چالیس۔ سو میں پورے اکسٹھ کم۔"

جوق نے اس لڑکی کو ہاتھ پکڑ کے گھسیٹ لیا' بولا۔" تیرا یہاں کیا کام؟ تو میرے ساتھ چل۔ کیونکہ تجھ کو میری بیوی اور آگے چل کے ایک فاتح' ایک بادشاہ ایک شہنشاہ کی ملکہ کہلانا ہے۔"

لیوشاؤ نے لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے۔" جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اس کا نام الوس آغا ہے اور یہ ترکوں ہی کے کسی قبیلے سے تعلق رکھتی ہے۔" اس کے بعد لیوشاؤ نے لڑکی سے پوچھا۔" تیرا کیا نام ہے لڑکی؟"

لڑکی نے جواب دیا۔" الوس آغا۔"

وہ جلدی جلدی پلکیں جھپکاتی رہی' بڑی بڑی تیر کی طرح کھڑی ہوئی پلکیں ایسی لگتی تھیں جیسے کسی بیضوی چشمۂ حیواں کے چاروں طرف اس کی حفاظت کے لیے سنانیں کھڑی کر دی گئی تھیں۔

جوق نے کہا۔" مجھ کو اس کی پیشانی پر بخت آوری اور اقبال مندی کی چمک دکھائی دے رہی ہے۔"

لیوشاؤ نے جواب دیا۔ "یہ محض حسنِ ظن اور پسند اور چاہت کی خوشی نمایاں ہیں۔"

جوق اُلوس آغا کو اپنے ساتھ لے گیا۔ لیوشاؤ بھی اس کے ساتھ گیا۔ لوٹے ہوئے سامان میں جو کچھ بچ گیا تھا، اس میں مذکورہ قلمی کتاب بھی موجود تھی۔ لیوشاؤ نے اس میں اناالیس چند سے کی بات پڑھ کے جوق کو سمجھایا۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں، لڑکی کا نام الوس آغا ہے، اس کو پانچ سال کی عمر میں کاسان سے اغوا کیا گیا اور چین کے ایک بردہ فروش کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا۔ اس بردہ فروش نے گیارہ سال کی عمر میں اس کو میرے ہاتھ بیچ دیا اور اب سولہ سال کی عمر میں میں اس کو لے کر بغداد لے جا رہا تھا، وہاں میں اس کو بہت اچھی قیمت پر فروخت کر دیتا۔"

جوق نے کہا۔ "اس کی اچھی قیمت تو مجھ سے بھی مل رہی ہے۔ میں نے تجھ کو اپنا مشیر بنا لیا ہے پھر جب میں بادشاہ اور بادشاہ سے شہنشاہ بن جاؤں گا تو تجھ کو اپنا وزیر بنا لوں گا۔"

جوق ان معلومات اور انکشافات سے اس لیے خوش ہوا کہ اس نے جس لڑکی کو اپنی بیوی کی حیثیت سے پسند کیا تھا، وہ ترک تھی۔

اس کے باپ ارسلان کو بھی الوس آغا بہت پسند آئی۔ اور الوس آغا نے اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر جوق نے مجھے بیوی نہ بنایا تو میں خودکشی کر لوں گی۔ میں مر جاؤں گی۔

ارسلان نے اس کو تسلی دی کہ تو اس کی بیوی ہی بن کے رہے گی۔ میں جوق کا باپ ہوں اور جوق کی طرف سے تجھ سے وعدہ کرتا ہوں۔"

جوق نے جب یہ بات سنی تو الوس آغا سے کہا۔

"الوس آغا! میں نے تجھ کو پسند کیا ہے تو بیوی بھی ضرور بناؤں گا تو میری بیوی نہ بنے یہ کیسے ممکن ہے کم از کم میری اپنی حد تک تو ایسا ناممکن ہے۔ ویسے انسان کا کوئی بھروسہ بھی نہیں۔"

الوس آغا کو جوق کی خاندانی عورتوں میں پہنچا دیا گیا۔ خاندانی عورتوں میں سے کچھ نے خوشی کا اظہار کیا۔ اور کچھ نے بیزاری سے اس کو قبول کر لیا۔

✻

اب جوق کے آس پاس ترکوں کے دس بارہ قبیلے جمع ہو چکے تھے، اب اس کی ایک حیثیت تھی۔ اس کی آواز میں قوت تھی اور اس کی رائے کی ایک اہمیت تھی۔ ان حالات میں عز سردار کے چاروں آدمی بری طرح پھنس گئے تھے۔ جوق کے طرزِ عمل سے انھیں ایسا محسوس ہوا گویا جوق انھیں بھول چکا ہے۔ انھوں نے کئی بار نکل بھاگنے کا منصوبہ بنایا لیکن ناکام رہے کیونکہ انھیں جوق کے سپاہیوں نے گھیرے میں لے رکھا تھا۔

جوق کے پاس ہر ایک کے لیے وقت تھا مگر ان چاروں کے لیے نہیں تھا۔ جوق نے انھیں بڑی ذہنی الجھنوں میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ چاروں بھی شروع شروع میں یہی چاہتے تھے کہ ان کا جوق سے سامنا نہ ہو۔ شاید خدا نے ان کی یہ دعا قبول بھی کر لی تھی کیونکہ اس دعا کے بعد ان کا جوق سے کوئی سامنا نہ ہوا۔ لیکن اب جبکہ وہ محض قیدی بن کر رہ گئے تھے انھیں جوق بھی یاد آنے لگا تھا، وہ جوق سے باتیں کر کے دل کے بوجھ کو ہلکا کرنا چاہتے تھے۔

آخرکار ان چاروں نے جوق کو درخواست دی کہ انھیں باریابی کا شرف بخشا جائے۔

جوق نے انھیں اپنے دربار میں حاضری کا حکم دیا۔ یہ چھوٹا سا دربار تھا جس میں جوق ایک آبنوسی مرصع اور منقش تخت پر اس طرح براجمان تھا کہ اس کے سامنے دائیں بائیں حلیف ترکوں کے قبائلی سردار بیٹھے تھے اور جوق کے تخت سے متصل اور ملحق دوسرے دو تختوں میں سے دائیں طرف کے تخت پر جوق کا باپ ارسلان اور بائیں جانب کے تخت پر لیوشاؤ بیٹھا تھا۔ اس ماحول میں عز سردار کے چاروں جاسوس بھی پہنچا دیے گئے۔ ان چاروں نے جوق کو اس شان اور آن بان سے دربار لگائے بیٹھے دیکھا تو انھیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔

جوق نے ان چاروں کو بالکل اپنے سامنے پاس بلا لیا اور پوچھا۔ "ہاں تو اب تو تمھارے دلوں سے خوف نکل چکا ہوگا؟"

ایک نے ہکلا ہکلا کے جواب دیا۔ "حضورِ والا! میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں، مجھے بولنے اور بات کرنے کا موقع دیا جائے۔"

جوق نے کہا۔ "تو کیا کہنا چاہتا ہے میں جانتا ہوں اس لیے اپنی زبان بند رکھ اور سردست یہ بتا کہ تو نے عز سردار کو کس قسم کی خبریں بھیجی ہیں اور کس طرح بھیجی ہیں۔"

اس سوال نے چاروں کو بدحواس اور بوکھلا کر دیا۔ ایک نے پوچھا۔ "آپ کیا جانتے ہیں؟ آپ کیا جاننا چاہتے ہیں؟"

جوق نے ایک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس کو یہاں میرے پاس میرے قریب لاؤ۔ میں اس سے اچھی طرح واقف ہوں۔"

جب اس جوان کو جوق کے قریب لایا جانے لگا تو وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "مجھ سے غلطی ہو گئی۔ مجھے معاف کیا جائے۔ میں اپنی خوشی سے یہاں نہیں آیا۔"

جوق نے کہا "احمقو! ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے۔ میں نے اس کو غز سردار کے پاس دیکھا تھا، اپنے سردار سے کہنا کہ کسی بھی کام کے لیے بہترین منصوبہ بندی اور لائق آدمیوں کا انتخاب بہت ضروری ہوتا ہے تیرا سردار نالائق اور نا اہل ہے اس سے کہہ دینا کہ پہلے سرداری کے لائق بنو اس کے بعد سرداری کا منصب سنبھالو۔"

چاروں میں سے ایک غز سردار کا اب بھی بے حد وفادار تھا، اس نے کہا "جوق! تم نے لوٹ کے مال سے جو عزت بنائی ہے اس پر زیادہ ناز نہ کرو، ہمارا سردار خاندانی اور پیدائشی سردار ہے۔ نامور خاندان کا نامور سردار۔ یاد رکھو غز خاندان الحدیثہ اور اس کے آس پاس کے علاقوں پر حکومت کرتا ہے اور ہمارا غز سردار اسی شاہی خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔"

جوق نے اس صاف گو ترک کو ترچھی نظروں دیکھا، پوچھا۔ "تو اپنے نالائق سردار پر خواہ مخواہ ناز کرتا ہے کیا تجھ کو اپنی زندگی پیاری نہیں۔" اس کے بعد بقیہ تینوں سے کہا "تم تینوں اگر پسند کرو تو میں میرے پاس رہ جاؤ، یہاں تمھیں عزت ملے گی، شہرت ملے گی اور دولت ملے گی۔ اپنے فضول سردار کے لیے خود کو مت ضائع کرو۔"

تینوں نے جوق کی پیشکش قبول کر لی اور جواب دیا "ہمیں منظور ہے ہم واپس نہیں جائیں گے۔"

لیکن غز سردار کا وفادار ترک اب بھی واپس جانا چاہتا تھا، جوق نے اس سے پوچھا "اور تیرا کیا ارادہ ہے؟"

اس نے جواب دیا "میں واپس جاؤں گا کیونکہ میں اپنے سردار سے غداری نہیں کر سکتا۔"

جوق نے کہا "اور میں تجھ کو چلا جانے دوں گا تاکہ تو اپنے اچھے بُرے کا صحیح اندازہ کر سکے۔ میں اپنے دوستوں اور ہمدردوں کو ہر وقت قبول کرنے کو تیار ہوں چاہے وہ مجھ پر فوراً بھروسا کریں یا انتہائی غور و فکر کے بعد اعتبار کریں۔ میں تیرا بھی انتظار کروں گا۔"

تینوں دوستوں نے اپنے ساتھی کو علیحدہ لے جا کے سمجھانے کی کوشش کی "دیکھ اب واپس نہ جا، یہ بڑا اچھا موقع ملا ہے ہم چاروں کو۔ وہاں تجھ کو کیا ملے گا؟ غز سردار تجھ کو کیا دے گا؟"

لیکن اس چوتھے کی وفاداری غیر متزلزل رہی۔ اس نے جواب دیا "نہیں، میں نے جو کہہ دیا، کہہ دیا۔ میں واپس جاؤں گا۔"

ایک نے کہا "اور واپس بھی اس لیے جائے گا کہ جوق نے تجھ کو واپس جانے کی اجازت دے دی ہے ورنہ یہاں جوق کی جگہ کوئی ظالم اور بے لچک سردار ہوتا تو میں تجھ سے پوچھتا کہ اب کیا ارادے ہیں تو؟"

جوق دور کھڑا ان کی باتیں سن رہا تھا، جب اس کو یہ یقین ہو گیا کہ یہ چوتھا یہاں نہیں رُکے گا اور جا کے رہے گا تو اسی نے غز سردار کے لیے ایک پیغام دیا۔ جوق نے کہا "اپنے سردار سے کہہ دینا کہ اب وہ ہم پر حملہ آور ہونے کی غلطی نہ کرے کیونکہ اب میں وہ نہیں ہوں، جو کبھی ہوا کرتا تھا۔ اب مجھ پر حملہ کرنے کا یہ مطلب ہو گا کہ میں حملہ آور کو تباہ و برباد کر کے رکھ دوں۔"

چوتھا ترک خاموش رہا۔ پھر وہ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس نے اپنے تینوں ساتھیوں سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "تم تینوں کے رُک جانے کا مجھے افسوس ہے، لیکن مجھے یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن تم تینوں بھی واپس آؤ گے کیونکہ اپنوں میں تو ہر کسی کی نبھ جاتی ہے۔"

ان تینوں نے بھیگی آنکھوں سے اپنے چوتھے ساتھی کو رخصت کیا اور دیر تک اس طرف نظریں جمائے دیکھتے رہے جدھر وہ گیا تھا ——— گرد و غبار کے بگولے، فضا کو گندہ کر رہے تھے۔ جوق نے ان تینوں سے پوچھا "کیا تمھیں اس کے چلے جانے کا واقعی افسوس ہے؟"

ایک نے جواب دیا "ہاں ہمیں اس بات کا افسوس ہے کہ اس کی بدبختی اس کو یہاں سے واپس لے گئی ہے ہمارا سردار اس کی تنہا واپسی پر اس کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ وہ اس پر شک کرے گا اور یہ سمجھے گا کہ شاید یہ آپ کے لیے جاسوسی کرنے واپس آ گیا ہے۔ اس کی سمجھ میں یہ بات بالکل نہیں آئے گی کہ اس نے اپنے سردار اور اپنی قوم سے وفاداری کی ہے اور اس کے جذبۂ وفاداری نے اس کو واپس آنے پر مجبور کر دیا ہے۔"

جوق نے کہا "میں اس کی وفاداری سے خوش ہوا کیونکہ یہ شرافت اور نیکی کا جوہر ہے میں تم تینوں سے بھی خوش ہوں کہ تم تینوں کسی بھی معاملے میں بروقت اور فوری فیصلہ کر سکتے ہو۔ تم نے یہاں یہ دیکھا کہ آدمیوں کی قدر کی جاتی ہے اور اس کو اس کی صلاحیت اور لیاقت کے مطابق مختانہ ملتا ہے، تم نے فیصلہ کر لیا کہ تمھیں غز سردار کے بجائے جوق کے پاس ہونا چاہیے چنانچہ تم نے اپنے بارے میں فوراً جو فیصلہ کیا تھا اس پر عمل درآمد بھی ہونے لگا، تم لوگوں کی یہ خوبی قابلِ اعتماد اور لائقِ صد تحسین ہے! میں تمھیں شاباش دیتا ہوں۔"

جوق نے ان تینوں کو تیر اندازوں کے حوالے کر دیا اور کہا۔ "انھیں تیر اندازی سکھائی جائے کیونکہ اس کے بغیر سپاہی سپاہی

نہیں رہتا۔"

ان تینوں نے کہا: "ہمیں تیراندازی آتی ہے۔"

جوق نے جواب دیا: "اگر آتی بھی ہے تو کیا ہوا، اور مہ آجائے گی۔"

جوق ان تینوں کو تیراندازوں کے حوالے کر کے دوسرے کاموں میں مشغول ہوگیا۔ اب وہ ان لوگوں میں مشغول ہوگیا جو اِدھر اُدھر سے آکے جوق کے پرچم تلے اکٹھے ہوگئے تھے۔ ان قبائلیوں کو اپنے دشمنوں سے انتقام لینا تھا اور اس کے لیے انھیں جوق سے رجوع ہونا پڑا تھا۔

جوق نے ان کے ساتھ مل کے ان کے دشمنوں پر یلغار کر دی اور آناً فاناً ان کا صفایا کر کے واپس بھی آگیا۔ اس معرکے سے اس کو بہت کچھ ملا، لیکن اس نے اس میں سے کچھ بھی نہیں لیا، سب کچھ سپاہیوں میں تقسیم کر دیا۔ اس تقسیم نے سپاہیوں کے دلوں کو جوق کے قدموں میں ڈال دیا اور وہ سب اس کے اور زیادہ والا و شیدا ہوگئے۔

جوق کے دل میں ایک پھانس سی چبھی ہوئی تھی، ایک شبہ ایک اندیشہ اور ایک خدشہ اس کو ہر وقت فکرمند اور پریشان رکھتا۔ وہ غز سردار کی طرف سے مطمئن نہیں تھا اور اس کو جیسے اس بات کا یقین تھا کہ غز سردار ایک بار اس پر حملہ آور ضرور ہوگا۔ اس نے غز سردار کے چوری چھپے حملے سے بچنے اور مقابلہ کرنے کے لیے گڈریوں کو ملا لیا تھا، ان گڈریوں کو انعام و اکرام سے نواز دیا تھا۔ اور انھیں حکم دیا تھا کہ وہ جیسے ہی کسی قافلے یا لشکر کو خجند کی طرف آتے دیکھیں، اس کو مطلع کر دیں۔ گڈریوں میں ایک قسم کا مقابلہ شروع ہوچکا تھا۔ چاروں سمتوں کے گڈریے اپنی اپنی سمت کی بڑی ہوشیاری اور باخبری سے چوکسی کر رہے تھے۔۔۔ ان میں سے ہر ایک یہی دعا مانگ رہا تھا ۔۔۔۔۔۔ وہ یہ کہ خدا کرے کوئی لشکر اسی کی طرف سے گزرے تاکہ وہ اس کی خبر جوق کو پہنچا کے انعام و اکرام حاصل کرے۔

جوق کا باپ ارسلان جس آسودہ حالی میں زندگی بسر کر رہا تھا اس میں اس کو بس ایک ہی خواہش تنگ کر رہی تھی، وہ یہ کہ جوق کی شادی کر دی جائے۔ خود جوق بھی الوس آغا پر مرمٹا تھا اور شادی کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔ اس نے اس سلسلے میں اپنے چینی مشیر لیوشاؤ سے مشورہ لیا۔ کیونکہ اس کو یقین تھا کہ لیوشاؤ اس کو جو مشورہ دے گا نہایت مفید اور سودمند ہوگا۔

اس وقت لیوشاؤ وحشی ترکوں کو بتا رہا تھا کہ یہ خیموں میں رہنا اور گھوڑوں کی پشت سے ہتھیاروں کے بل بوتے پر آزوقۂ حیات تلاش کرنا بڑا وحشیانہ طریقہ ہے۔ کیونکہ جانور اور جنگلی درندے بھی اپنی روزی اسی طرح حاصل کرتے ہیں۔

ترکوں کو لیوشاؤ کی یہ باتیں اچھی نہیں لگیں، انھوں نے اس چینی مدبر کو ٹوک دیا، کہا: "لیوشاؤ! کیا تو ہمیں کاشتکار بنانے آیا ہے؟ کیا تو یہ چاہتا ہے کہ ہم دکانیں کھول کے سودا بیچنے لگیں؟ ہم ہتھیاروں کے دھنی ایسے معمولی کام کس طرح کر سکتے ہیں؟"

لیوشاؤ نے جواب دیا: "میں تمھیں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ انسانی تمدن اور تہذیب جنگ و جدل اور خون خرابے سے وجود میں نہیں آئی، بلکہ یہ امن و صلح اور مواخات و آشتی سے پیدا ہوئی ہے۔ تم لوگ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ اگر کاشتکار غلہ نہ اگائیں تو تم سب فاقوں سے مر جاؤ، اگر لوہار اور دوسرے ہنرمند اپنے کام بند کر دیں تو تمھیں ہتھیار کہاں سے ملیں؟"

جوق چھپ کے ان کی باتیں سنتا رہا پھر سامنے آگیا۔ بولا: "لیوشاؤ! تُو تو میرا مشیر ہے یہ انھیں کیسے مشورے دے رہا ہے؟"

لیوشاؤ کہنے لگا: "میں انھیں بتا رہا تھا کہ تہذیب اور تمدن کے بغیر انسان اور جانور میں کوئی فرق نہیں رہتا دونوں برابر ہیں، لیکن یہ لوگ میری بات مانتے ہی نہیں، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں انھیں کس طرح سمجھاؤں؟"

جوق، لیوشاؤ کا ہاتھ پکڑ کے اپنے خیمے میں لے گیا اور اس کو نیچے میں بچھے ہوئے قالین پر بٹھا دیا اور کہا: "دیکھو لیوشاؤ! تم کو ہمارے سپاہیوں میں ایسی باتیں نہیں کرنا چاہئیں۔ میں نے انھی آدمیوں کے بل بوتے پر کچھ اہم منصوبے بنائے ہیں۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں ناکام ہو جاؤں؟"

لیوشاؤ نے جواب دیا: "میرا یہ مقصد ہرگز نہیں میں تو انھیں یہ بتا رہا تھا کہ اس دنیا میں پیشے کی وجہ سے آدمی ذلیل نہیں ہوتا۔"

جوق نے کہا: "یہ کون کہتا ہے کہ انسان اپنے پیشے کی نسبت سے ذلیل یا عزت دار ہوتا ہے؟"

لیوشاؤ نے جواب دیا: "تیرے آدمی، تیری قوم کے لوگ تہذیب اور تمدن سے چڑتے ہیں۔"

جوق کو لیوشاؤ کی باتیں کھل رہی تھیں، بولا: "اچھا اب تہذیب اور تمدن کو تو الاؤ میں ڈالو، اور مجھ کو یہ بتاؤ کہ میں شادی کروں یا نہ کروں؟"

لیوشاؤ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: "اگر میں تیرے بقول تہذیب اور تمدن کو الاؤ میں ڈال کے جلا کے خاک کر دوں گا تو تُو شادی کس طرح کرے گا؟ کیونکہ جس پہلے انسان نے پہلی بار کسی عورت سے شادی کرنے کا خیال کیا تھا اس نے اسی دن حقیقتاً تہذیب اور تمدن کی بنیاد رکھ دی تھی۔ شادی، بچوں کے

پیدائش، ان کی تربیت اور خاندان کا وجود میں آنا، دراصل یہی بنیادی اینٹیں ہیں جن پر تہذیب و تمدن کی عمارت کھڑی ہوئی اور پھر اونچی ہوتی چلی گئی۔"

جوق دل سے تو لیوشاؤ کی باتوں میں سچائی کے وجود کا قائل ہوگیا۔ مگر وہ یہ سمجھتا تھا کہ ان باتوں کے لیے یہ وقت مناسب نہیں تھا۔ اس نے پھر وہی بات کی۔ بولا "لیکن میں تہذیب اور تمدن پر پھر کبھی بات کروں گا، اس وقت تو میں تجھ سے یہ پوچھنے آیا ہوں کہ میں شادی کروں یا نہ کروں؟ ویسے میرا باپ ارسلان یہی کہتا ہے کہ میں شادی کرلوں۔"

لیوشاؤ نے جواب دیا "جوق! اگر تو فاتح، بادشاہ اور شہنشاہ بننا چاہتا ہے تو تجھ کو ابھی شادی نہیں کرنا چاہیے۔"

جوق نے ضدی لہجے میں کہا "لیکن میں شادی کرنا چاہتا ہوں، الوس آغا کو میں اپنی دلہن بنانے کے لیے نکال لایا تھا۔"

لیوشاؤ ہنسنے لگا "جب تو نے یہ ارادہ ہی کرلیا ہے کہ تو الوس آغا سے شادی کرکے رہے گا تو پھر تو مجھ سے مشورہ کیوں مانگ رہا ہے، کرلے شادی الوس آغا سے۔"

جوق نے جواب دیا "ہاں میں اس سے شادی کرکے رہوں گا اور تجھ کو اور پوری دنیا کو یہ دکھا دوں گا کہ دیکھو ایک مستقل مزاج بلکہ ضدی انسان شادی کے بعد بھی بڑا آدمی بن سکتا ہے۔"

لیوشاؤ برابر مسکرائے جا رہا تھا، بولا "خدا کرے کہ تو یہ ثابت کردے، حالانکہ اس کی امید نہیں کی جاسکتی۔"

جوق نے بچوں کی طرح باتیں شروع کردیں، بولا "پہلے گاؤں فتح کرو، پھر تحصیل کو، پھر جند کو۔ بس اسی طرح فتح کرتے ہوئے دنیا کے آخری سرے تک پہنچ جاؤ۔ وہاں تمھیں ایسی عورتیں ضرور مل جائیں گی جو بہادروں کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتیں۔"

لیوشاؤ نے جواب دیا "تو ایسی عورتوں کی تلاش میں دیوانہ کیوں بنتا ہے۔ اس آبادی میں بھی ایسی عورتیں مل جائیں گی جو تیری فتوحات کی راہ رکاوٹ نہیں بنیں گی۔"

جوق نے پھر وہی بات کی "تب پھر میں الوس آغا سے شادی کرلوں، تیری اجازت ہے؟"

لیوشاؤ نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا "جب ایک بات اندر ہی اندر طے پا چکی ہے تو پھر مجھ سے مشورہ کس بات کا؟"

جوق نے پھر وہی بات دہرائی "تب پھر اب میں کسی مشورے کے بغیر بھی شادی کرسکتا ہوں۔"

لیوشاؤ عاجز آچکا تھا، بولا "ہاں تو کسی مشورے کے بغیر بھی شادی کرسکتا ہے۔"

جوق اسی وقت وہاں سے بھاگتا ہوا اپنے خاندان کی عورتوں میں پہنچ گیا اور وہاں اعلان کیا "سنو، میری بات سنو! میں الوس آغا نامی لڑکی سے شادی کررہا ہوں، اس سلسلے میں میں نے جیسے ہی لیوشاؤ سے پوچھا کہ کیا میں شادی کرسکتا ہوں تو اس نے فوراً ہی مجھے اجازت دے دی کہ میں الوس آغا سے شادی کرسکتا ہوں۔"

خاندان کی کوئی بھی عورت اس کی شادی کی مخالفت نہیں کرسکتی تھی کیونکہ انھیں یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ جوق دراصل ایک ایسا کوہستانی بیل ہے — جو ہر کام اپنی مرضی سے کرتا ہے، اور پہاڑوں پر چڑھ کے اپنا رزق حاصل کرتا ہے، خود سر اپنی مرضی کا مالک۔

ارسلان نے خاندانی رسم و رواج کے مطابق اس شادی کا اہتمام کیا اور پھر سیدھے سادے طریقے سے ان دونوں کی شادی ہوگئی۔ شادی کی رسم دوپہر کے بعد ادا کی گئی تھی — جوق اپنی دلہن الوس آغا کو ایک خیمے سے نکال کر دوسرے خیمے میں لے گیا۔ باہر اس کا باپ ارسلان ہزاروں ترکوں کو کھانا کھلا رہا تھا۔ یہ لوگ ادھ کچا گوشت نوچ نوچ کے کھا رہے تھے۔ گوشت کی بڑی بڑی بوٹیاں جب دانتوں تلے دبا کے ہاتھ سے کھینچی جاتیں تو یہ ہاتھ سے چھوٹ جاتیں اور گال پر ایک طمانچہ سا لگ جاتا۔ شراب کے بڑے بڑے مٹکے جابجا رکھ دیے گئے تھے۔ ترک اسے پیالوں میں بھر بھر کے غٹاغٹ پی رہے تھے۔ ان کی طبیعتیں جولانیوں پر تھیں اور وہ ہنس ہنس کے ایک دوسرے سے مذاق کررہے تھے۔

اسی عالم میں جنوب مغرب سے ایک گڈریہ بھاگتا ہوا آیا اور چیخ چیخ کے انھیں مطلع کرنے لگا کہ ترکو! میں نے کاشغر کی طرف سے ایک لشکر کو آتے دیکھا ہے، یہ لوگ اپنے گھوڑوں کی لگامیں کھینچے ہوئے تیزی سے بھاگے چلے آرہے ہیں۔"

گڈریے کی باتوں پر کسی نے توجہ ہی نہ دی، وہ چیختا چلاتا مرغیوں کی طرح کھانے میں جٹے ہوئے ترکوں کے درمیان میں کھڑا ہوگیا، بولا "تمھارا سردار جوق کہاں چلا گیا؟"

کسی ترک نے نشے میں جواب دیا "اپنی دلہن الوس آغا کے پاس۔ کیا بلواؤں؟"

اور کئی ترک زور زور سے ہنسنے لگے۔

گڈریے نے کہا "مجھ کو اپنے سردار کے پاس لے چلو۔ دشمن تمھارے سر پر پہنچنے ہی والا ہے۔"

کسی نے نشے میں ڈوبی ہوئی ادھ کھلی آنکھوں سے گڈریے

کی طرف دیکھا اور پھر اپنے ساتھیوں سے پوچھا "یہ کیا کہہ رہا ہے؟"

کسی دوسرے نے جواب دیا "اسی سے پوچھو۔"

تیسرے نے شرارتاً گڈریے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "تو ہاں بھائی! بتا تو کیا کہتا ہے؟"

گڈریے نے جواب دیا "غنیم تمھارے سر پر آنے ہی والا ہے، اپنے سردار جوق کو مطلع کر دو۔"

اس تیسرے ترک نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا، بولا "میرے سر پر؟ لیکن میرے سر پر تو کوئی بھی نہیں، کچھ بھی نہیں۔"

گڈریے نے کہا "خدارا مجھ کو اپنے سردار جوق کے پاس پہنچا دو، ورنہ بڑا غضب ہو جائے گا۔"

لیکن غریب گڈریے کی باتوں پر کسی نے بھی توجہ نہ کی۔ آخر گڈریے نے چیخنا چلانا شروع کر دیا "لوگو! ہوشیار ہو جاؤ، دشمن کا لشکر تمھارے قریب پہنچ چکا ہے اگر تم یوں ہی مدہوش رہے تو سب قتل کر دیے جاؤ گے۔"

گڈریا بھاگتا جاتا اور یہ اعلان کرتا جاتا، یہ آواز جوق کے کانوں میں بھی پہنچ گئی، اس کے کان کھڑے ہوئے اور وہ اپنی دلہن الوس آغا کو چھوڑ کر باہر آ گیا اور گڈریے کو تلاش کر کے روک لیا، پوچھا "کیا بات ہے؟"

گڈریا جوق کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اور اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں صاف صاف بتا دیا کہ ایک لشکر کاشغر کی طرف سے اس طرف آ رہا ہے جوق کے تیز ذہن نے سب کچھ فوراً سمجھ لیا، وہ سمجھ چکا تھا کہ یہ غز سردار کا لشکر ہو گا۔ اس نے اسی وقت اپنے جسم پر ہتھیار سجائے اور نقارے پر چوٹ لگا کے سپاہیوں کو ہنگامی حالات سے آگاہ کر دیا۔ سپاہیوں نے بھی جلدی جلدی اپنے جسموں پر ہتھیار سجائے اور جوق کے حکم کا انتظار کرنے لگے۔ یہ تقریباً پانچ سو سپاہی تھے۔ جوق نے گھبراہٹ یا بوکھلاہٹ کو اپنے اوپر مسلط نہیں ہونے دیا۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو دیکھا اور بھانپ گیا کہ ان میں سے اکثر نشے میں ہیں۔ جو ہوش میں تھے انھیں حکم دیا کہ جو نشے میں ہیں ان کے سروں اور چہروں پر پانی ڈالا جائے۔ کچھ کو ترش چیزیں کھلائی گئیں۔ پھر انھیں ادھر بھیج دیا گیا، جدھر سے غز سردار کا لشکر آ سکتا تھا، ان سواروں کو حکم دیا کہ غز سردار اور اس کے لشکر کو پوری قوت سے روکنے کی کوشش کی جائے۔

انھیں حکم دے کر جوق اپنے حلیفوں میں پہنچ گیا۔ حلیفوں کے دو ہزار سپاہی آرام کر رہے تھے۔ انھیں جوق کی ایک آواز پر لڑنے مرنے کے لیے تیار کر لیا گیا، حلیف ترک سردار بہت خوش تھے کہ انھیں جوق کی سپہ سالاری میں لڑنے کا موقع ملا تھا۔ جوق ان دو ہزار سپاہیوں کو لے کر خجند کے آگے، دریائے سیحون کے کنارے کنارے شمال کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ حلیفوں کو حیرت تھی کہ غنیم جو آنے والا ہے وہ تو جنوب مشرق سے آ رہا ہے اور جوق شمال میں بڑھ رہا تھا۔ ان میں سے کئی اس بدگمانی کا شکار ہو گئے کہ کہیں جوق ان آنے والوں سے خوفزدہ ہو کے راہِ فرار تو نہیں اختیار کر رہا۔

جوق بعجلت شمال میں چلتے چلتے اچانک دریا کے جنوبی ساحل کی طرف مڑ گیا اور یہیں سے اس نے دریا عبور کر لیا، اس وقت تک غز سردار اور اس کے لشکر کا کوئی پتا نہ تھا۔ جوق اپنے آدمیوں کے ساتھ آہستہ آہستہ سفر کر رہا تھا۔ وہ دریائے سیحون کے دوسرے کنارے پر دریا کے ساتھ ساتھ دور تک بڑھتے چلے گئے۔ اس نے اپنے چند آدمی اپنے آگے کر لیے تھے۔ ان چند آدمیوں کو اس نے دریا کے ساتھ ساتھ سفر کرنے کا حکم دیا اور ان سے کہا کہ وہ جیسے ہی کسی لشکر کو دیکھیں فوراً نقارہ بجا کے ہمیں مطلع کر دیں۔

لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ غز سردار کا لشکر جوق کے پانچ سو سواروں کے سامنے پہنچ چکا تھا۔ اور انھیں خجند کے دروازے ہی پر روک لیا گیا تھا۔

جوق کو اس مقابلے اور مزاحمت کی جیسے ہی خبر ملی وہ چکر لگا کے غز سردار کے عقب میں پہنچ گیا اور اس پر بھرپور حملہ کر کے چشم زدن میں کاٹ کے رکھ دیا۔ غز سردار بدحواس ہو گیا اور اس نے راہِ فرار اختیار کرنے کی کوشش کی مگر گرفتار کر لیا گیا۔ اس کارنامے کی انجام دہی میں چند گھنٹے لگے جوق کچھ دیر کے لیے اپنی دلہن الوس آغا کو بھول چکا تھا۔ غز سردار کی شکست اور اس کی گرفتاری کو وہ اپنی غیر معمولی کامیابی سمجھتا تھا۔ اس نے اس وقت اپنے زریں شامیانے میں دربار لگایا، اس دربار میں حلیف ترک سرداروں کو بھی بلوا لیا گیا، اور لیو شاذ حسبِ معمول اس کے بائیں طرف بیٹھ گیا۔ یہاں ان سب کی موجودگی میں غز سردار کو پابجولاں جوق کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔ غز سردار کا سر جھکا ہوا تھا۔ جوق نے یہیں اپنی دلہن الوس آغا کو بھی بلوا لیا۔ وہ عروسی لباس میں جوق کے داہنی طرف بیٹھ گئی۔

جوق نے حاضرین سے کہا "میرے معزز دوستو! میں نے بہت کوشش کی کہ غز سردار سے جنگ نہ کروں لیکن خود غز سردار نہیں مانتا اور "آ بیل مجھے مار" کے مصداق میرے مقابلے پر آ گیا۔ میں بھی مقابلہ کرنے پر مجبور ہو گیا اور پھر جو کچھ ہوا، اس سے آپ سب واقف ہیں، غز سردار کو شکست ہوئی، میرے بہادروں نے اس کی

بج کو کاٹ کے رکھ دیا۔ جو زندہ بچے غز سردار ہی کی طرح گرفتار کر لیے گئے۔ اب آپ لوگ مجھے مشورہ دیں کہ میں ان لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کروں؟"

حاضرین میں وہ تینوں ترک بھی شامل ہو گئے جنھیں غز سردار نے جاسوس بنا کے بھیجا تھا مگر تینوں جوق کے وفادار ہو گئے تھے۔

ایک حلیف سردار نے مشورہ دیا۔ "جوق! ہمیں تیری صلاحیتوں پر یقین ہے۔ غز سردار نے تجھ سے جنگ کر کے اچھا نہیں کیا۔ لیکن اب اپنی گرفتاری کے بعد یہ رہائی کا مستحق ہے اور میں پُرزور سفارش کروں گا کہ اس کو رہا کر دیا جائے۔"

دوسرے حلیف سردار نے کہا۔ "جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ غز سردار نے اگر جوق کو شکست دے دی ہوتی اور جوق گرفتار کر لیا گیا ہوتا تو کیا یہ غز سردار جوق کو معاف کر دیتا؟ شاید نہیں، ہمیں وہی روش اختیار کرنی چاہیے جو غز سردار اپنی کامرانی اور کامیابی کے نشے میں اختیار کرتا۔"

لیکن لیوشاؤ نے حلیف سردار کی اس تجویز سے اختلاف کیا۔ اس نے کہا۔ "جوق! اگر تو بھی وہی کرے گا جو جاہل کرتے ہیں تو تجھ میں اور ان میں فرق ہی کیا رہ جائے گا۔ اس لیے یہ مسئلہ میں خود نمٹاؤں گا اور خوشی و مسرت کی نئی دنیائیں آباد کروں گا۔" اس کے بعد اس نے غز سردار سے پوچھا۔ "اچھا میرے ایک سوال کا جواب تو دے۔"

غز سردار نے سر اٹھائے بغیر ہی آہستہ سے جواب دیا۔ "میں ہرگز معاف نہ کرتا کیونکہ میں نے صلح جوئی اور بھائی چارگی کی نیت اور ارادے سے اس پر حملہ نہیں کیا تھا۔"

جوق نے پوچھا۔ "میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں؟"

غز سردار نے جواب دیا۔ "جو جی میں آئے میں ہر سزا بھگتنے کو تیار ہوں۔"

وہ حلیف سردار، جس نے مشورہ دیا تھا کہ غز سردار کو چھوڑ دیا جائے، اس نے دوبارہ کہا۔ "جیسا کہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ غز سردار کو چھوڑ دیا جائے اور اس نے جو کچھ کیا ہے اس کو بھلا دیا جائے۔" حلیف سردار اتنا کہہ کے حاضرین کو دیکھنے لگا، اس کے دوستوں نے خوشی کا اظہار کیا اور تالیاں بجانے لگے۔

لیوشاؤ نے جوق کے کان میں کہا۔ "یہ ترک سردار، جانتے ہو کہ اس وقت یہ مشورے کیوں دیے جا رہے ہیں؟"

جوق نے بھی سرگوشی میں کہا۔ "نہیں، میں نہیں جانتا کہ یہ لوگ اتنے محتاط۔۔۔۔"

لیوشاؤ کان میں پھر سمجھانے لگا۔ "غز سردار شاہی نسل سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر اس کو ہم سے کوئی تکلیف پہنچ گئی یا ہم نے اسے کوئی سزا دے دی تو یاد رکھنا کہ ہم ترک بادشاہ کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیں گے۔ اس لیے ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔"

یہ سیدھی سادی بات جوق کی سمجھ میں آسانی سے آگئی۔ جوق نے اعلان کر دیا۔ "میں غز سردار کو رہا کرتا ہوں، صرف اس لیے کہ میں نہیں چاہتا کہ ترکوں سے جنگ کروں۔ میں اپنی قوم کے خلاف جنگ نہیں لڑ سکتا۔ خدا میری قوم کو قیامت تک سلامت رکھے۔"

اس اعلان اور رعایت نے سبھی کو خوش کر دیا۔ ایک ترک نے ذرا آگے بڑھ کے غز سردار کو آزاد کر دیا، بولا۔ "اب تو اپنے گھر جا سکتا ہے، کچھ سمجھا یا نہیں؟"

غز سردار اب بھی شرمندہ تھا اور کسی سے بھی نظریں نہیں ملا رہا تھا۔ جوق نے آگے بڑھ کے غز سردار کو اپنے گلے لگا لیا، بولا۔ "غز سردار! میں نے سب کچھ بُھلا دیا۔ اب تو بھی بھول جا۔ اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب میں تجھ سے کبھی بھی نہیں الجھوں گا۔"

غز سردار نے جواب دیا۔ "جوق! مجھے افسوس یہ نہیں ہے کہ میں تجھ سے ہار گیا اور گرفتار ہو کر تیرے رحم و کرم پر رہ گیا اور اب تیری مہربانی سے رہائی حاصل کر رہا ہوں بلکہ شرمندگی اس بات کی ہے کہ میں نے تجھ کو سمجھنے میں حیرت انگیز غلطی کی ہے۔ اور اب میں یہ سوچ رہا ہوں کہ میں تیرے اس احسان کا بدلہ کس طرح اتاروں گا؟"

غز سردار کی باتیں اس کے چہرے کے مطابق نہیں تھیں، زبان کچھ کہہ رہی تھی اور چہرہ اور آنکھیں کچھ۔ جوق نے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ ترک آپس میں نہ لڑیں۔ بس یہی مجھ پر اور ترک اقوام پر احسان ہوگا۔"

لیوشاؤ نے غز سردار کی مزید سفارش کی۔ "اور جوق سردار! اب ان ترکوں کو بھی رہا کر دیا جائے جو غز سردار کی شکست کے بعد قید کر لیے گئے ہیں۔"

جوق نے اپنی دلہن الوس آغا کی طرف دیکھتے ہوئے شوخ و شریر لہجے میں کہا۔ "اپنی اس دلہن کے طفیل میں ان ترکوں کو بھی آزاد کرتا ہوں حالانکہ ان لوگوں نے میرا مزہ کرکرا کر دیا ہے۔"

جوق کو اچانک اس ترک کا خیال آگیا جو اپنے تین ساتھیوں سمیت جوق کی سراغرسی کے لیے آیا تھا اور بعد میں پہچانے جانے کے بعد اس نے اپنے تینوں ساتھیوں کو یہیں

چھوڑ دیا تھا۔ اور خود غز سردار کی وفاداری کے جذبے سے سرشار واپس چلا گیا تھا، جوق نے غز سردار سے کہا ”اس ترک کو ذرا بلوا، جس کو میں نے ازراہِ عفو و ترحم تیرے پاس واپس بھیج دیا تھا۔“

غز سردار نے جواب دیا ”اب پتا نہیں کہ وہ زندہ بھی ہے یا جدال و قتال میں مارا گیا۔“

لیکن کچھ دیر بعد اس کو جوق کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ جوق کا خیال تھا کہ اب اپنے سردار کی شکست اور قید کے بعد وہ شرمندہ ہوگا لیکن وہ بالکل پشیمان نہ تھا، جوق نے اس سے پوچھا ”اب کیا حال ہے تیرا؟“

اس نے جواب دیا ”بہت خوش ہوں شکر ہے۔“

جوق نے حیرت سے پوچھا ”کس بات پر خوش ہے تو؟ اور شکر کس بات کا ہے؟“

اس نے جواب دیا ”خوش اس پر ہوں کہ میں اپنی شکست اور قید میں اپنے سردار کے ساتھ ہوں اور شکر اس بات کا کہ میں نے غداری نہیں کی۔ میں اپنے آقا کا ابھی تک وفادار ہوں۔“

جوق اس کے اس جواب سے خاصا متاثر ہوا، لیکن غز سردار کو یہاں کی کئی باتیں نہایت ناگوار اور گراں گزریں۔ اس نے جوق سے کہا ”تو نے ہمارے ساتھ جو کچھ کیا، اس کا شکریہ لیکن جب میں یہاں سے جاؤں گا تو تجھ سے میں مصلحت اور موقع پرستی کا خیال کیے بغیر چند باتیں صاف صاف کروں گا۔“

جوق نے پوچھا ”اگر وہ باتیں ابھی اور اسی وقت کر لو تو کیا حرج ہے؟“

غز سردار نے جواب دیا ”ابھی اس بات کا وقت نہیں ہے۔“

جوق اپنی دلہن الوس آغا کو لے کر چلا گیا، غز سردار کو اس کے شایانِ شان ایک خیمہ دے دیا گیا، دوسرے ترکوں کو بھی خیمے مل گئے۔ لیو شاڈ نے غز سردار کے کرب اور بوجھ کرب کو کسی حد تک سمجھ لیا تھا، وہ جوق سے اس وقت اس سلسلے میں بات کرنا چاہتا تھا مگر نہیں کر سکا کیونکہ جوق کے دل و دماغ پر الوس آغا مسلط تھی۔ جوق الوس آغا سے خلوت میں اپنے شاندار مستقبل کی باتیں کر رہا تھا، جوق اپنے خیالوں میں اونچا اڑتا چلا جا رہا تھا۔ وہ اپنی دانست میں اتنا اونچا اٹھ چکا تھا کہ اگر ہاتھ بڑھا کے آسمان چھونا چاہتا تو چھو لیتا۔ الحدیثہ کے غز ترکوں کی بادشاہی اب اس کی زد میں تھی، اب وہ اتنا طاقتور تھا کہ وہ جو چاہتا کر سکتا تھا۔ اس نے الوس آغا سے وعدہ کیا۔

”میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ تجھ کو ملکہ بنا کے رہوں گا۔“

الوس آغا سوگوار تھی، وہ جوق کی باتوں سے خوش نہیں تھی۔ جوق نے اس کا اداس اور سوگوار چہرہ اپنے سامنے کر لیا اور پوچھا ”کیا بات ہے تو اداس کیوں ہے؟ یہ خوشی کے لمحات اور یہ اداسی اور سوگواری۔ بات کیا ہے؟“

الوس آغا نے جواب دیا ”جوق سردار!...“

جوق نے بات کاٹ دی، بولا ”الوس! میں جوق سردار دوسروں کے لیے ہوں، تیرے لیے نہیں، تیرے لیے تو میں صرف جوق ہوں۔“

الوس آغا نے کہا ”جوق! تم سردار ہو اور ایسا نظر آتا ہے کہ تم بہت جلد فاتح بن جاؤ گے فاتح کے بعد بادشاہ اور بادشاہ سے شہنشاہ، زمینوں اور ملکوں کی وسعتیں اور اقتدار کا پھیلاؤ تمہیں شرابی اور بدمست بنا دے گا، تم بہک جاؤ گے اور تم آج جیسے جوق نہیں رہو گے۔ تمہارا خیمہ کہیں غائب ہو چکا ہوگا اور تم کسی... عظیم الشان محل میں منتقل ہو جاؤ گے۔ اس محل میں بارہ دریاں ہوں گی، اور ان بارہ دریوں میں کئی ملکوں اور کئی قوموں کی منتخب حسین و جمیل کنیزیں خدمت کے لیے ہوں گی، شاید میں اس وقت تک بوڑھی ہو جاؤں گی۔“

جوق زور زور سے ہنسنے لگا، بولا ”الوس! تو اتنا سوچ لیتی ہے، تو سوچتے سوچتے اتنی دور نکل جاتی ہے، میں تو یہ سوچ بھی نہیں سکتا۔ مگر یہ تو بتا کہ اس وقت سے تو خوفزدہ کیوں ہے؟ تو میری ملکہ ہوگی۔ میں عہد کرتا ہوں کہ اس وقت بھی تیری حیثیت سب سے نمایاں اور مقدم ہوگی، تیرا مرتبہ اس وقت بھی سب سے بڑا اور نمایاں ہوگا۔“

الوس نے اپنے آنسوؤں کو انگلیوں پر لے کر جھٹک دیا، بولی ”تم مجھ سے عہد کرو کہ میری ہی اولاد تمہارے تاج و تخت کی وارث ہوگی۔“

جوق نے جواب دیا ”میں عہد کرتا ہوں کہ تیری ہی اولاد میری جانشین اور وارثِ تخت و تاج ہوگی۔“

الوس آغا اس کو آگ کے سامنے لے گئی، آتش دان جیسا دیوار کا کھانچا مصنوعی دیوار میں بنا لیا گیا تھا، یہ کس نے اور کس کے حکم پر بنایا گیا تھا، اس کا جوق کو بھی کوئی علم نہ تھا۔ خیمے میں پتھر کی دیوار، پتھر کے ٹکڑے رکھ کے بنائی گئی تھی اور اس دیوار میں آتشدان بنا ہوا تھا، اور آتش دان میں لکڑیاں جل رہی تھیں۔ جوق نے حیرت سے پوچھا ”یہ کیا ہے الوس؟“

الوس نے جواب دیا ”آتش کدہ۔ کیونکہ مجھے بتایا گیا ہے کہ تمہارے آباؤ اجداد آتش پرست تھے۔ میں اس آگ کے سامنے

تمھیں کھڑا کرکے یہ عہد لوں گی کہ تم میری اولاد کو اپنے تخت و تاج کا وارث بناؤ گے۔"

جوق نے پریشان کن انداز میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔"لیکن الوس! میرے آباو اجداد آتش پرست رہے ہوں گے میں خود تو اس پر یقین نہیں رکھتا۔ میں تو آتش پرست نہیں ہوں۔ میں اس آگ کے سامنے اگر عہد کر بھی لوں گا تو اس کی حیثیت اس کی اہمیت کیا ہوگی؟"

الوس بہت بے چین اور بے قرار تھی، بولی۔"میں کچھ نہیں جانتی۔ میں نہیں جانتی کہ تمھارا کیا مذہب ہے۔ میں تمھارے آباو اجداد کے دین سے واقف ہوں اور انھی کو بیچ میں ڈال کر تم سے عہد لوں گی۔"

جوق، دل نہ چاہنے کے باوجود الوس کو خوش اور مطمئن کرنے کے لیے آگ کے سامنے دوزانو بیٹھ گیا اور پوچھا۔"ہاں تو بتاؤ، میں کیا کہوں؟"

الوس نے جواب دیا۔"تم کہو کہ میں اس مقدس آگ اور اپنے آباو اجداد کی پاک ارواح کو بیچ میں ڈال کے عہد کرتا ہوں کہ میں کتنی ہی شادیاں کیوں نہ کروں اور کتنی ہی عورتوں کو اپنے محل میں رکھوں مگر میرے تاج و تخت کی وارث الوس ہی کی اولاد ہوگی۔"

الوس جو کچھ کہتی رہی جوق اسے دہراتا رہا۔ سب کچھ ہو چکنے کے بعد بھی الوس مطمئن نہیں نظر آرہی تھی۔ جوق نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔"اب کیا ہوا؟ تو اب بھی خوش نہیں ہے، کیا بات ہے؟"

الوس نے جواب دیا۔"جوق! آج نہیں، کل صبح، جب سورج طلوع ہو رہا ہوگا تو تم کو میرے ساتھ قریب کے ایک غار میں چلنا ہوگا۔"

جوق نے پوچھا۔"وہ کیوں؟ غار میں کیا ہوگا؟ کیا وہاں بھی کوئی آتش کدہ ہے؟"

الوس نے جواب دیا۔"نہیں، وہاں کوئی آتش کدہ نہیں لیکن شاید تم کو معلوم ہو کہ عہد و پیماں کا محافظ دیوتا میتھرا صبح کے وقت ہم دونوں کے سامنے ہوگا اور میں یہی عہد میتھرا کے سامنے اس کی موجودگی میں لوں گی۔"

جوق عاجز آیا ہوا تھا جھنجلا کے بولا۔"کیا مصیبت ہے الوس! جب میں نے ایک عہد تم سے کرلیا ہے تو بس یہ کافی ہے، یہ میتھرا اور آتش کدے، اگر میں چاہوں تو مجھے معاہدہ شکنی سے نہیں روک سکتے۔"

الوس نے جواب دیا۔"مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔ اگر تم بعد میں معاہدہ شکنی کروگے تو تم جانو گے اور تمھارے دیوتا جانیں گے، اہورا مزدا اور میتھرا، یہ سب ہمارے گواہ ہوں گے اور ان گواہوں کی موجودگی میں میں مطمئن اور پُریقین رہوں گی۔"

جوق کو ایسا لگا جیسے الوس کا دماغی توازن درست نہیں ہے۔ سادہ، صاف، الجھاووں سے پاک اور چھل چھال سے عاری باتیں جوق کو بہت اچھی لگ رہی تھیں اور دل میں اترتی چلی جارہی تھیں۔ وہ لمحات، وہ ساعتیں اور وہ پہر جوق کو اپنی زندگی کے یادگار اور حاصلِ زیست اجزا محسوس ہو رہے تھے۔

※

طلوعِ آفتاب سے کافی پہلے الوس باہر جانے کے لیے تیار ہوگئی۔ مجبوراً جوق کو بھی تیار ہو جانا پڑا۔ جب یہ دونوں باہر نکلے اور دونوں اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہوئے تو چند محافظوں نے آگے بڑھ کے پوچھا۔"ہمارے لیے کوئی حکم؟"

جوق نے جواب دیا۔"ہم دونوں کچھ دیر بعد واپس آجائیں گے مگر کسی کو یہ نہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہم دونوں کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔"

محافظ پیچھے ہٹ گئے اور آہستہ سے کہا۔"حضور کے ساتھ ہمارا رہنا بہت ضروری ہے۔"

جوق نے اجازت دے دی، بولا۔"اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ ایسا ہونا بہت ضروری ہے تو میں تمھیں منع بھی نہیں کرسکتا لیکن تم ہم دونوں سے کافی دور دور رہو گے۔"

یہ دونوں اپنے اپنے گھوڑوں کو تیزی سے بھگاتے ہوئے ایک غار میں داخل ہوگئے۔ غار میں گہرا اندھیرا تھا، یہاں ہاتھ کو ہاتھ نہیں سجھائی دے رہا تھا۔

جوق نے پوچھا۔"الوس! اس جگہ تو لے تو آئی ہے مگر یہ تو سچ سچ بتا دے مجھے، کہ یہاں لانے میں کوئی بدارادہ تو شاملِ نیت نہیں ہے؟"

الوس نے یہاں ایک مشعل روشن کردی، بولی۔"بس جوق! اس سے آگے اور اس سے زیادہ کوئی بات نہ کرنا۔ ورنہ میں......!"

جوق نے پوچھا۔"اچھا اب یہ بتا کہ تیرا وہ میتھرا کہاں

ہے؟ جس کی موجودگی میں مجھے دوبارہ عہد کرتا ہے ؟"
الوس اس غار میں مشعل کی مدد سے کوئی ایسا جھروکا تلاش کر رہی تھی، جہاں سے طلوع ہوتے ہوئے سورج کا نظارہ کیا جا سکے۔ کچھ دیر بعد اس نے وہ روشن دان یا جھروکا تلاش کر لیا دور مشرق میں، جہاں زمین اور آسمان گلے مل رہے تھے۔ سورج اس افق سے طلوع ہونے والا تھا۔ الوس نے اس منظر سے بڑی خوشی کا اظہار کیا۔ بولی "بس اس طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ یہ جائے میتھرا ہے۔ یہیں سے عہد و پیماں کا محافظ میتھرا طلوع ہوگا۔ بس اس کی موجودگی میں اس کے روبرو تم اپنے عہد کے الفاظ دہرا دینا۔"
جوق اپنے دل میں اسے پورا نہیں تو نصف پاگل تو سمجھ ہی رہا تھا۔ الوس غار کے جھروکے سے مشرقی افق پر نظریں لگائے ہوئے تھی۔ پھر جیسے ہی سورج نے منہ نکالا، الوس نے جوق سے کہا "جوق! تم میتھرا کو حاضر و ناظر جان کے اس کے روبرو مجھ سے یہ عہد کرو کہ جوق کی کتنی ہی اولادیں کیوں نہ ہوں لیکن اس کا وارث تخت و تاج میرا ہی بیٹا ہوگا۔"
جوق نے رٹو طوطے کی طرح فر فر وہ سب کہہ دیا جو الوس اس سے کہلانا چاہتی تھی۔
غار کے باہر گھوڑوں کے دوڑنے بھاگنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جوق نے پوچھا "اچھا اب تو یہ بتا الوس! کہ تجھ سے کس نے کہہ دیا کہ میں میتھرا یا آگ پر یقین رکھتا ہوں۔"
الوس نے جواب دیا "مجھے کسی نے یہ بتایا تھا کہ تم ایران کے آتش پرست حکمرانوں کی اولاد ہو، میرے لیے اتنا جان جانا ہی کافی ہے۔"
جوق نے کہا "میں نے تجھ سے جو عہد کیا ہے اس پر قائم رہوں گا مگر اس لیے نہیں کہ میں نے یہ عہد آگ یا میتھرا کے روبرو کیا ہے، اب میں ایرانی نہیں ہوں، اب میں ترک ہوں۔"
الوس اس کے قریب آ کر مسکراتے ہوئے بولی "میرا اطمینان اسی سے ہوتا۔ اب میں مطمئن ہوں۔"
جوق کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا، وہ کچھ دیر تو وہاں رہا، اس کے بعد باہر نکلا اور الوس کے ساتھ اپنے خیمے میں چلا آیا، اب روشنی ہو چکی تھی، جب لوگوں نے دن کی روشنی میں ان دونوں کو کہیں سے آتے ہوئے دیکھا اور ان کے پیچھے محافظوں کو بھی آتے ہوئے دیکھ لیا تو ان کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا کہ یہ دونوں اگر کہیں گئے تھے تو کہاں گئے تھے اور کیوں گئے تھے ؟
کچھ دیر بعد جوق کا باپ ارسلان آ گیا اور اس نے جوق کو بتایا کہ غز سردار اپنے آدمیوں کے ساتھ جانا چاہتا ہے۔
جوق نے کہا "اس کو روکو، وہ میری مرضی اور اجازت کے بغیر نہیں جا سکتے۔"
ارسلان نے کہا "بیٹے! جب ان پر کئی شاندار احسان کیے ہیں تو اب کج خلقی سے انھیں مایوس نہ کرو۔"
جوق نے پوچھا "آپ کو یہ کس نے بتایا کہ غز سردار اسی وقت چلا جانا چاہتا ہے ؟"
ارسلان نے جواب دیا "غز سردار نے خود۔ وہ صبح ہی صبح یہاں آیا تھا، یہاں سے میری مراد ہے میرے پاس۔"
جوق نے الوس کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "کیا اجازت ہے ؟ میں غز سردار کے پاس جا سکتا ہوں ؟"
الوس نے جواب دیا "ضرور، مگر جلدی ہی واپس آ جانا۔"
ارسلان کو ان دونوں کی باتیں بہت بری لگیں۔ اس نے راستے میں جوق کو سمجھانے کی کوشش کی "جوق بیٹے! یہ میں نے کیا دیکھا ہے ؟"
جوق نے پوچھا "کیا دیکھا آپ نے ؟"
ارسلان نے جواب دیا "مردوں کو عورتوں سے اس طرح بات نہیں کرنا چاہیے مرد پھر مرد ہے اور عورت عورت۔ الوس اتنی حسین نہیں ہے کہ تو اس پر یوں مر مٹے۔ ابھی کیا ہے اس سے بھی حسین لڑکیاں مل جائیں گی تجھ کو۔"
جوق نے آہستہ سے کہا "لیکن بابا جان! میرے لیے یہی کافی ہے اور میں نے اس سے عہد کر لیا ہے کہ میرے بعد الوس ہی کی اولاد وارث تخت و تاج ہوگی۔"
"ایسا عہد تو نے کیوں کیا ؟"
ابھی جوق جواب بھی نہیں دے سکا تھا کہ سامنے سے غز سردار آ گیا۔ اس نے آتے ہی کہا "آج میں نکل جانا چاہتا ہوں۔"
جوق نے پوچھا "اتنی جلدی۔ میں تو تم لوگوں کی دعوتیں کرنے والا ہوں۔"
غز سردار نے جواب دیا "میں یہاں اس آزادی کے باوجود خود کو گرفتار محسوس کرتا ہوں۔"
ارسلان نے ان دونوں کی باتوں میں دخل دیا، کہا "یہ ہوتا ہے آزادی کا احساس۔"
جوق نے کہا "بہر حال دو چار دن تو رہو گے تم ؟"
غز سردار نے جو طے کر لیا تھا وہ اپنی جگہ اٹل تھا۔ جوق نے پوچھا "پھر کس وقت تک نکل جانے کا ارادہ ہے تمھارا ؟"
غز سردار نے جواب دیا "میں تو اسی وقت نکل جانا چاہتا ہوں لیکن افسوس کہ ابھی میرے ساتھی تیار نہیں ہیں، امید ہے کہ دوپہر تک چلا جاؤں گا۔"

جوق نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "غز سردار! تم نے وعدہ کیا تھا کہ چلتے وقت مجھ سے کوئی ضروری بات کرو گے۔ اب تو تم چلے ہی جاؤ گے بتاؤ، وہ بات کیا ہے؟"

غز سردار اچانک اداس ہو گیا، کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "جوق! تم نے اچھا کیا جو وہ بات یاد دلا دی۔ ہم ترک لوگ ایسی باتیں اپنے دل میں نہیں رکھتے برملا کہہ دینا بہتر سمجھتے ہیں۔ ہم نے تم سے شکست اٹھائی اور قید کر لیے گئے۔ اس کے بعد تم نے ہمیں معاف کر دیا اور رہائی کا اعلان کر دیا یہاں تک تو بات بہت اچھی تھی لیکن جب تم نے اپنی دلہن الوس آغا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے یہ کہا کہ ہم اس کے طفیل رہا کیے جا رہے ہیں تو ہمیں ایسا لگا گویا تم نے ہمیں بدترین گالی دی ہے۔ ہم سب اپنی ہی نظروں میں ذلیل ہو کر رہ گئے۔"

وہ یہ کہتے کہتے اداس اور غمگین ہو گیا، جوق نے بے مروّتی سے جواب دیا۔ "ہاں وہ سچی بات تھی۔ میں نے تم سب کو اپنی دلہن الوس کے طفیل ہی معاف اور رہا کیا تھا، اس وقت تو الوس یہاں نہیں ہے مگر میں وہ بات دوبارہ کہہ رہا ہوں کہ میں نے تم لوگوں کو جاں بخشی اور رہائی اپنی دلہن الوس کے طفیل عطا کی ہے۔"

غز سردار نے درشت لب و لہجے میں کہا۔ "تو جوق! تم میری بات بھی سن لو تم نے اس طرح ہماری روح کو جو گھاؤ لگایا ہے ہم کبھی نہ کبھی اس کا جواب ضرور دیں گے۔ جواب کیا ہو گا یا کس طرح دیا جائے گا، کچھ پتا نہیں لیکن ایسا ہو گا ضرور۔"

جوق نے کہا۔ "تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں نے تمھیں معاف اور رہا کر کے غلطی کی ہے؟"

غز سردار نے جلدی جلدی کہا۔ "ابھی تو ہم تمھارے قبضے میں ہیں تم ہمیں مت معاف کرو، مت رہا کرو۔ ہم خود بھی یہی چاہتے ہیں کہ ہمیں الوس کے طفیل نہ تو معاف کیا جائے اور نہ رہا۔"

جوق نے جواب دیا۔ "نہیں، جو ہو چکا سو ہو چکا۔ میں نے تم سب کو معاف اور رہا کر دیا، اب میں اپنے اس حکم کو واپس نہیں لے سکتا اور تمھیں اس کی بھی اجازت ہے کہ تم جب چاہو میرے مقابلے پر آ جاؤ۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

غز سردار بہت مایوس اور اداس تھا، اس کو اپنی رہائی اور جاں بخشی کی کوئی خوشی نہ تھی۔

یہ لوگ دوپہر تک وہاں سے رخصت ہو گئے۔ رخصت ہوتے وقت غز سردار اور اس کے ساتھی غمزدہ اور افسردہ تھے۔ انھوں نے کسی قسم کی بھی گرم جوشی کا اظہار نہیں کیا۔ ان کے چلے جانے کے بعد لیوشاڈ نے جوق کو متنبہ کیا۔ "جوق سردار! جانے والے قابلِ اعتبار نہیں ہیں، یہ دغا کریں گے۔"

جوق نے جواب دیا۔ "مجھے اس کی پروا نہیں، وہ دغا کریں یا وفا میں ان سے کسی بات کا شکوہ نہیں کروں گا۔"

لیوشاڈ نے مشورہ دیا۔ "سردار! غز سردار شاہی خاندان کا ایک فرد ہے ہو سکتا ہے کہ اس سلسلے میں شاہی خاندان بھی تمھارے مقابلے پر آ جائے اس لیے ان ممکنہ حالات میں ہمیں ہر قسم کی تیاریاں کر لینی چاہئیں۔"

جوق نے جواب دیا۔ "ہر وقت تیار ہوں۔ میں پیدائشی جنگجو اور مہم جو واقع ہوا ہوں۔"

ان باتوں کے دوران اس کو اچانک وہ گڈریا یاد آ گیا جس نے اس کو غز سردار کی آمد کی اطلاع دی تھی۔ جوق نے اس کو فوراً طلب کر لیا ـــــ یہ پریشان حال اور مفلس و نادار جوان جوق کے روبرو کر دیا گیا۔ جوق نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا۔ "اگر اس دن تو نے ہمیں بروقت مطلع نہ کر دیا ہوتا تو آج ہم اس نالائق کے ہاتھوں شاید اس لائق ہی نہ رہ جاتے۔"

گڈریے نے شرماتے ہوئے جواب دیا۔ "میرا کام آپ کے معیار پر پورا اتر گیا ہے میرے لیے یہی بہت ہے۔"

جوق اس کو اشرفیوں کی تھیلی دے رہا تھا اور گڈریا لینے سے انکار کر رہا تھا مگر جوق نہیں مانا اور اشرفیوں کی تھیلی اس کو زبردستی تھما دی۔ گڈریے نے اشرفیاں لینے کے بعد جوق کے سپاہیوں کی مذمت کی، بولا۔ "سردار! اب آخر میں میں آپ کے سپاہیوں کی مذمت کروں گا اس دن یہ لوگ مجھے دیر تک پریشان کرتے رہے۔ یہ لوگ نشے میں بہک رہے تھے اور میرا مذاق اڑا رہے تھے آخر تنگ آ کے میں نے زور زور سے چلا کے آپ کو حقیقتِ حال سے آگاہ کیا تھا۔"

جوق نے جواب دیا۔ "اس دن میری شادی کی خوشی میں ان لوگوں نے خاصی پی لی تھی۔ اور میں نے سنا ہے کہ بہک رہے تھے۔"

جب گڈریا چلا گیا تو جوق نے یہ فیصلہ کیا کہ اس کو آئندہ جو کچھ بھی نمٹنا ہے اس کی وہ از سرِ نو منصوبہ بندی کرے گا۔ چند ہفتے اپنی نئی نویلی دلہن کے پاس گزار کے اس نے لیوشاڈ کی مدد سے منصوبہ بندی کی۔ اس موقع پر اسے اپنے لڑکپن کا میرنگ بہت یاد آیا، اس کو کچھ پتا نہ تھا کہ اب وہ کہاں ہو گا اور اب اس قبیلے کا سردار کون ہو گا۔ چند قبیلے جو اس کے زیرِ سایہ آ چکے تھے انھوں نے اپنے آپ کو بالکل جوق کے حوالے کر دیا تھا، اب اس کو اسی قسم کے دوسرے قبیلے درکار تھے۔ جوق کی تیز نظریں یہ دیکھنے میں کامیاب ہو چکی تھیں کہ غز

کا حلقۂ اثر اور وسعت تعلق بہت زیادہ ہے اور دوسرے ترک قبیلے ان سے خوفزدہ رہتے ہیں۔ یہ قبائل صحرا کے جنوب میں آباد تھے۔

جوق نے ان قبائل کو خطوط لکھے، بہت سادہ مگر پُراثر اور معنی خیز خطوط۔ ان خطوں میں ایک بات سبھی کو لکھی گئی تھی۔

”غز جو تعداد اور علاقائی وسعت میں سب سے زیادہ ہیں وہ ہم پر، ہماری مرضی، ہمارے ارادوں اور افعال پر اثر انداز ہوتے رہے ہیں ترکوں کا کوئی ایک قبیلہ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا اس لیے سالوں اس موضوع پر سوچنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہم میں ایکا اور اتحاد ہونا چاہیے۔ ہمارے چھوٹے چھوٹے قبائل مل جل کر ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ میں نے یہ منصوبہ بنایا ہے کہ ترکوں میں اتحاد اور ایکا قائم کر کے غزوں کا مقابلہ کروں۔ میرے پاس آؤ اور اپنی بقا اور حفاظت کی خاطر وہ کچھ کرو جس کی اس وقت ضرورت ہے۔ چنانچہ اب ہم مل جل کر اور وسیع تر اتحاد سے اپنے دشمنوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ آؤ اپنی اوّلین فرصت میں یہاں آؤ اور اگر تم ہمارے ارادوں اور منصوبوں سے متفق ہو جاؤ تو ہم سے ایکا کر لینا اور ہمارے حکم پر چلنا۔“

یہ خطوط تمام ترک قبائل کو بھیج دیے گئے۔ غز قوم کو چھوڑ کے۔

ان خطوط نے اپنا رنگ دکھایا اور چھوٹے چھوٹے قبائل نے جوق کے پاس آنا شروع کر دیا۔ جوق نے ان کی مدد سے آس پاس حملے شروع کر دیے۔ ان حملوں سے انھیں مال و زر ملنے لگا اور اس مال و زر کو چھوٹے چھوٹے قبیلوں میں تقسیم کر کے اس نے اپنا اثر و رسوخ بڑھانا شروع کر دیا۔ اور آخر کار اس نے یہ صورت اختیار کر لی کہ جو قبیلے اس کے پاس آئے تھیں تھے اور ان کے دوسرے قبائل سے جھگڑے چل رہے تھے، جوق مدد چاہنے والوں کی مدد کرتا اور کامیاب ہونے کے بعد اپنے حلیف سے اچھا خاصا معاوضہ وصول کر لیتا۔ اب ہر طرف جوق ہی کا نام تھا۔ ہر طرف اس کا چرچا تھا۔

الوس آغا نے جوق کو ایک خوبصورت بیٹا دیا۔ جوق کو اپنا یہ بیٹا بہت اچھا لگا۔ وہ اس سے بے حد محبت کرنے لگا۔ جب وہ گھر سے دور جنگلوں میں الجھا ہوتا تو میدانِ جنگ میں بھی اس کو اپنا یہ بیٹا بہت یاد آتا۔ اور جیسے ہی جنگ کا فیصلہ ہوتا وہ اپنے حلیف سے اپنا حصہ حاصل کر کے گھر کی راہ لیتا اور گھر میں داخل ہوتے ہی وہ اپنے سینے سے لگا کر اس کو دیر تک پیار کرتا رہتا۔ اس کے مختلف اعضا کو دیر تک بوسے دیتا رہتا۔

سالوں بعد جب اس کا بیٹا آٹھ سال کا ہو گیا تو اس کی بیوی الوس آغا نے اس سے عجیب سا سوال کر دیا۔ ”جوق! کیا میں تم سے کچھ ضروری باتیں کر سکتی ہوں؟“

جوق نے جواب دیا۔ ”کیوں نہیں؟“

الوس آغا نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا بات ہے جوق! تم کچھ بجھ سے گئے ہو! پہلے جیسی کوئی بات نہیں رہی تم میں۔ آخر کیوں؟ آخر یہ کیوں؟“

جوق نے اس سے انکار کیا وہ الوس کی یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔ پوچھا۔ ”یہ اتنی غیر ذمہ دارانہ بات کس طرح کہہ دی تو نے؟“

الوس آغا نے جواب دیا۔ ”میں نے جو بات کہی ہے اسے ثابت بھی کر سکتی ہوں۔“

جوق نے ذرا سختی سے کہا۔ ”پھر ثابت کر۔ ورنہ میں تجھ کو جبراً مجبور کر دوں گا کہ اپنے قول کی صداقت ثابت کر۔“

الوس آغا نے کہا۔ ”جب تم نے مجھ سے شادی کی تھی تو تم نے اپنے عزائم کا کچھ اس طرح اظہار کیا تھا کہ پہلے تم فاتح بعد میں بادشاہ اور آخر میں شہنشاہ کہلاؤ گے۔ تمہارے پاس ایک محل ہوگا، محل میں بارہ دریاں ہوں گی۔“ اس کے بعد وہ سرد آہ بھر کے خاموش ہو گئی۔

جوق کو اپنے یہ بلند بانگ دعوے اور اپنی یہ شاندار باتیں اچھی طرح یاد تھیں لیکن شب و روز کی جد و جہد اور دیگا مار محنت کے بعد اس کو یہ حقیقت معلوم ہو گئی تھی کہ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے جتنا اس نے سمجھ رکھا ہے۔ اس کے چاروں طرف طاقتور سلطنتیں سر اٹھائے کھڑی تھیں، ترکی میں غزوں کی حکومت تھی اور یہ غز ہزاروں میلوں میں آباد تھے۔ ماوراء النہر کے اُس پار جنوب میں اور شرقاً غرباً مسلمانوں کا تسلط تھا اور مشرق میں چینیوں کی حکومت تھی۔ ان عظیم الشان حکومتوں سے ٹکرانے کا مطلب یہ تھا کہ وہ خود کو پاش پاش کر لے۔

الوس آغا نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے، خاموش کیوں ہو؟ کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں؟“

جوق نے جواب دیا۔ ”نہیں، تو جھوٹ نہیں بول رہی! مجھے ساری باتیں یاد ہیں، میں نے شہنشاہی تک پہنچنے کے لیے جتنی بھی کوششیں کیں ناکام رہا، میں فاتح تو بن چکا ہوں، ترکوں کا جو قبیلہ میرے تعاون سے جنگ لڑتا ہے جیت جاتا ہے۔ میں نے جس قبیلے یا جس حکومت کا بھی ساتھ دیا — کامیابی نے اس کے قدم چومے، میں جو کچھ بننا چاہتا ہوں، ابھی تک نہیں بن سکا لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں

کبھی بھی نہیں بن سکوں گا ابھی پوری زندگی پڑی ہے اور میرا بیٹا، جو آٹھ نو سال کا ہے چند سالوں میں میرا دست راست بن جائے گا اور پھر ہم دونوں ایک شاندار حکومت قائم کریں گے۔ الوس! تو مایوس کیوں ہوتی ہے، میں تو مایوس نہیں ہوا۔"

الوس نے افسردگی سے جواب دیا۔"لیکن زندگی کا تو کوئی بھروسا نہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ جو کچھ بھی ہو وہ میری زندگی میں ہو جائے، تم بادشاہ بنو یا شہنشاہ، میں ہر حال میں ملکہ کہلائی جانے کی خواہشمند ہوں، جوق! میں ملکہ بننا چاہتی ہوں۔"

جوق نے اسے تسلی دی، بولا۔"تو ملکہ ضرور کہلائے گی۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ تو ملکہ بن جائے۔"

الوس آغا نے ٹھنڈی سانس بھری۔"لیکن زندگی ہی میں۔ اپنی زندگی میں۔"

جوق کو الوس کی باتوں میں مایوسی کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ اس کو اچانک یوں محسوس ہوا، گویا الوس نے جو کچھ بھی کہا ہے بستر مرگ اور حالتِ نزع میں کہا ہے۔ وہ گھبرا گیا، بے چین ہو گیا، بدحواس باہر گیا اور لیوشاؤ کے گھر پہنچ گیا۔ لیوشاؤ بھی اس زندگی سے عاجز آیا ہوا تھا۔ وہ جوق کے ساتھ جبراً رہ رہا تھا۔ لیوشاؤ نے دیکھا، جوق کچھ زیادہ پریشان ہے۔ پوچھا۔"جوق سردار! خیریت تو ہے اس وقت کی آمد کا مقصد؟"

جوق نے الوس سے ہونے والی باتوں کا ذکر کر دیا اور کہا۔"اور جب وہ یہ کہہ رہی تھی کہ میں ملکہ کہلانے کی خواہشمند ہوں، میں ملکہ بننا چاہتی ہوں، تو مجھ کو ایسا لگا گویا الوس اپنی اس خواہش کا اظہار اپنے بسترِ مرگ پر اور حالتِ نزع میں کر رہی ہے۔ خدا کے لیے مجھ کو یہ بتاؤ کہ یہ میرا وہم ہے یا کوئی پیش آنے والی شدنی ہے؟"

لیوشاؤ نے نہایت سنجیدگی اور بے پروائی سے جواب دیا۔ "یہ آپ کا وہم ہے جوق سردار! آپ مت پریشان ہوں۔"

جوق نے کہا۔"اور جناب لیوشاؤ جی! اگر ایسا ہو گیا تو؟"

لیوشاؤ نے جواب دیا۔"اگر ایسا ہو گیا تو کیا، ہونے والے حادثات اور واقعات پر کسی کا کیا اختیار، جو ہونا ہے وہ تو ہو کر رہے گا۔"

جوق نے نرمی اور خوشامدانہ انداز میں کہا۔"لیوشاؤ! میرے دانا مشیر! کچھ تو بتا کہ ان حالات میں میں کیا کروں؟"

لیوشاؤ نے جواب دیا۔"صبر اور قناعت۔ کیونکہ صبر اور قناعت میں محرومی اور مایوسی دکھ نہیں پہنچاتی۔"

جوق گرم ہو گیا، بولا۔"میں تجھ سے یہ معلوم کرنے آیا تھا کہ ہم وہ کیا طریقہ اختیار کریں کہ میں بادشاہ بن جاؤں اور الوس آغا ملکہ۔"

لیوشاؤ نے جواب دیا۔"اس کے لیے بڑی فوج چاہیے، لاکھوں جاں نثاروں پر مشتمل ایک جاں نثار فوج۔"

جوق نے کہا۔"وہ تو میرے پاس نہیں ہے۔"

لیوشاؤ نے جواب دیا۔"اگر فی الحال نہیں ہے تو کوئی بات نہیں، کوشش کیجیے کہ ہو جائے۔"

جوق نے کہا۔"میں کوشش کروں گا، لیکن اگر لاکھوں افراد پر مشتمل فوج میں مہیا نہ کر سکا، تو؟"

لیوشاؤ نے جواب دیا۔"تب پھر صبر کر لیجیے گا، قناعت۔ صبر اور قناعت بادشاہ اور ملکہ بننے سے بہتر ہیں۔"

جوق لیوشاؤ کی عجیب و غریب باتوں سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوا کیونکہ اس کی سمجھ میں یہ باتیں بالکل نہیں آ رہی تھیں۔ جوق نے بےزاری سے کہا۔"یہ آج تجھ کو ہو کیا گیا ہے؟ میں تجھ سے پوچھتا کچھ ہوں اور تو ان کے جواب کچھ دیتا ہے۔"

لیوشاؤ نے جواب دیا۔"جوق بہادر! میں مذہباً بدھ ہوں۔ گو تم بدھ کو ماننے والا۔ اگر ہمیں کچھ میسر نہ ہو تو ہم صبر اور قناعت سے کام لیتے ہیں۔"

جوق نے لیوشاؤ کو اس کا ماضی یاد دلایا۔"مگر میں نے تجھ کو ایک بہت بڑے تاجر کے روپ میں دیکھا تھا اور تو باتیں صبر اور قناعت کی کرتا ہے۔"

لیوشاؤ نے جواب دیا۔"جب میں بہت بڑا تاجر تھا تو میں اس وقت بھی بہت خوش تھا اور جبکہ اب میرے پاس کچھ بھی نہیں اور تم لوگوں کے رحم و کرم پر جی رہا ہوں تب بھی بہت خوش ہوں۔ اس کی وجہ وہی صبر اور قناعت ہیں۔"

لیوشاؤ کے مشورے اور باتوں نے جوق کی پریشانیوں میں کچھ اور اضافہ کر دیا۔ وہ لیوشاؤ کے پاس سے اٹھا اور باہر جانے لگا لیکن لیوشاؤ نے آگے بڑھ کے جوق کا راستہ روک لیا۔ کہنے لگا۔"جوق بہادر! اب مجھے اپنے وطن کی یاد ستانے لگی ہے اگر اجازت دیں تو چلا جاؤں؟"

جوق نے جواب دیا۔"ابھی نہیں، ابھی مجھ کو تیری ضرورت ہے۔ ابھی تو نہیں جا سکتا۔"

لیوشاؤ نے اصرار کیا۔"جوق بہادر! یہاں رہتے رہتے میرا دل دنیا سے بیزار ہو گیا ہے۔ ویسے اگر آپ کے زیرِ تصرف کوئی مملکت ہوتی تو میرا دل بھی لگ جاتا۔"

جوق نے پیشانی پر ناگواری سے شکنیں ڈال لیں اور کہا۔
"میں نے تجھے کوئی تکلیف تو نہیں دی اور میرا دل دنیا سے ذرا بھی نہیں اکتایا، میں تجھ کو نہیں جانے دوں گا۔"

جوق اپنا فیصلہ سنا کے چل دیا۔ اور لیو شاؤ اس کو دیکھتا رہ گیا۔

جوق کئی دن تک بہت پریشان رہا۔ اسی دوران اس کے باپ ارسلان کی حالت خراب ہوگئی۔ جوق کا زیادہ وقت اپنے باپ کے پاس گزرنے لگا۔ جوق کا آٹھ نو سالہ بیٹا بھی اپنے دادا کے پاس موجود رہتا۔ قبیلے کے لوگ اپنے سابق سردار کی عیادت کو پابندی سے حاضریاں دے رہے تھے۔ حلیف قبیلوں کے لوگ بھی برابر آجا رہے تھے۔ جوق کو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس کا باپ اس سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ لیو شاؤ نے بھی حاضری دی اور ارسلان سے درخواست کی "بزرگوار! آپ تو جانتے ہی ہیں کہ میں ایک مدت سے آپ لوگوں کی خدمت کر رہا ہوں، اب میں اپنے وطن چین واپس جانا چاہتا ہوں، لیکن آپ کا بیٹا مجھے اجازت نہیں دے رہا، کچھ آپ ہی کریں میرے لیے۔ اب میں یہاں نہیں رہنا چاہتا۔"

ارسلان نے کمزور آواز میں پوچھا "اچھا تو یہ معاملات ہیں بہرحال میں اس کا کوئی حل ضرور نکالوں گا۔"

اس کے بعد ارسلان نے جوق سے پوچھا "کیا بات ہے تو اس کو اس کے وطن کیوں نہیں جانے دیتا ہے؟"

جوق نے جواب دیا "یہ میرا مسئلہ ہے اور جب میں یہ محسوس کروں گا کہ اب لیو شاؤ کی ضرورت نہیں رہی۔ اس کو رخصت کر دوں گا۔"

ارسلان نے ایک سرد آہ بھری اور اپنا منہ دوسری طرف کرلیا۔ کہنے لگا "جب جوق کو سرداری تفویض کی گئی تھی تو یہ بہت تیز طرار اور فعال تھا، کہربائی تیزی۔ اُن حالات میں جب جوق نے یہ کہا تھا کہ وہ فاتح بنے گا اور بادشاہ بنے گا اور شہنشاہ کہلانے گا تو مجھ کو بھی اپنے قبیلے کے ساتھ یہ خوش فہمی ہوگئی تھی کہ اب وہ دن دور نہیں کہ میرا بیٹا ایک نئی عظیم الشان سلطنت کا بانی کہلائے گا۔ ہم لوگ خیموں سے محلات میں پہنچ جائیں گے اور مال و زر کی حد درجہ فراوانی ہوگی۔ حریر و کمخواب ہمارے جسموں پر ہوں گے، پھر ہم اپنے چاروں طرف یلغار کرتے پھریں گے اور دنیا ہمارے نام سے لرزہ براندام ہوجایا کرے گی۔"

شاید اس کی آنکھیں بھیگ چکی تھیں کیونکہ اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

جوق کو ارسلان کی باتیں ذرا بھی اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔ اس نے ناگواری سے کہا "بزرگوار! کوئی اور بات کریں۔"

لیکن ارسلان نہیں باز آیا۔ وہ بولتا رہا "اور سالوں پہلے جب میں نے یہ سنا کہ الوس آغا کی یہ خواہش ہے کہ وہ ملکہ کہلائے تو میں خوفزدہ ہوگیا کیونکہ میں نے الوس کے چہرے اور پیشانی پر نکبت و ادبار کے آثار پہلے دن ہی دیکھ لیے تھے۔ اگر جوق الوس کے بجائے کسی اور لڑکی سے شادی کرتا تو یقیناً بادشاہ اور شہنشاہ بن جاتا لیکن الوس کی وجہ سے جوق کچھ بھی نہ بن سکا۔"

جوق الوس سے محبت کرتا تھا۔ اس نے اپنے باپ کو منع کیا "پدر بزرگوار! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ الوس تو بڑی خوش قسمت اور اقبال مند ہے، میرے سامنے اس کی برائی نہ کیجیے۔"

ارسلان نے جواب دیا "برخوردار! میں انسانوں کی شناخت میں تجھ سے زیادہ ماہر ہوں۔"

جب جوق نے محسوس کیا کہ اس کے باپ ارسلان نے یہ طے کرلیا ہے کہ وہ اپنے بیٹے جوق کی ہاں میں ہاں نہیں ملائے گا تو وہ بھی وہاں سے دل برداشتہ ہوگیا۔ وہ کسی سے کچھ کہے سنے بغیر ہی وہاں سے چلا گیا۔ اب وہ پہلے سے کہیں زیادہ اداس اور افسردہ تھا، اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟

وہ اپنے خیمے میں بھی نہیں گیا، آبادی کے باہر، نہر کے پاس، جہاں بڑے بڑے پتھر پڑے ہوئے تھے، وہ انہی میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ وہ جو کچھ بننا چاہتا تھا، اس کے منصوبے بنانے لگا۔ وہ انتہائی کوشش کے بعد آٹھ دس ہزار شہسوار اکٹھے کر سکتا تھا اور ان آٹھ دس ہزار شہسواروں کی مدد سے وہ کوئی بڑا کارنامہ نہیں انجام دے سکتا تھا۔

اس سوچ کے دوران پچاس سواروں کا ایک دستہ اس کے پاس آکے رک گیا، یہ غز سردار کے آدمی تھے غز سردار سب سے آگے تھا، اس نے دور ہی سے جوق کو پہچان لیا تھا، غز سردار نے جوق کو افسردہ دیکھا تو پوچھا "کیا بات ہے جوق! تم اداس کیوں ہو؟"

جوق نے اصل وجہ نہیں بتائی، بولا "غز سردار! میرا باپ بیمار ہے شاید اب وہ نہیں بچے گا۔"

غز سردار گھوڑے سے اتر پڑا، پوچھا "مگر اس کو ہوا کیا؟ وہ کیا بیمار ہے؟"

جوق نے جواب دیا۔" اس کی بیماری ہے بڑھاپا۔ بس اس کے علاوہ کوئی بیماری نہیں ہے۔"

غزسردار نے پوچھا۔" میں اس کو دیکھنا چاہتا ہوں۔"

جوق نے جواب دیا۔" ضرور دیکھو۔ آؤ میرے ساتھ چلو۔"

جوق غزسردار کو لیے ہوئے دوبارہ اپنے باپ کے پاس پہنچ گیا اور باپ سے کہا۔" پدرِ بزرگوار! غزسردار آپ کو دیکھنے آئے ہیں۔"

ارسلان نے غزسردار کی طرف دیکھا اور پوچھا۔" غزسردار! کہاں ہے؟"

غزسردار، ارسلان کے پاس اس کی آنکھوں کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ ارسلان نے اس کو دیکھ لیا اور غزسردار کی آمد کو اپنے لیے فخر کی بات سمجھنے لگا۔

وہ کچھ دیر ارسلان سے باتیں کرتا رہا، اس کے بعد جب وہ باہر نکلا تو جوق کو باتیں کرتے ہوئے ایک طرف لے گیا اور کہا۔" کیا تم جانتے ہو کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں؟"

جوق نے جواب دیا۔" میں نہیں جانتا کہ تم یہاں کیوں آئے ہو۔"

اتنے میں جوق کا بیٹا روتا ہوا یہاں پہنچا اور عرض کیا۔ ہمارا دادا چلا گیا، ہم سے روٹھ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔"

جوق ایک بار پھر ارسلان کے خیمے کی طرف بھاگا، اس کے پیچھے پیچھے غزسردار تھا۔

اس وقت تک قبیلے کے بہت سارے لوگ مردہ سردار کے آس پاس جمع ہوچکے تھے۔

جوق اپنے باپ کے سرھانے کھڑا ہوگیا، وہ آہستہ آہستہ رونے لگا۔ اس کے پاس ہی اس کا آٹھ نو سالہ بیٹا بھی خاموش کھڑا تھا۔

غزسردار نے اس کو پہلی بار دیکھا تھا، اس نے اس لڑکے میں جوق کی شباہت جو دیکھی تو پوچھا۔" جوق سردار! کیا یہ تمہارا بیٹا ہے؟"

جوق نے جواب دیا۔" ہاں یہ میرا بیٹا ہے، کیوں؟"

غزسردار نے کہا۔" ہاں، اس میں تمہاری شباہت جو موجود ہے۔"

غزسردار اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ جوق نے اس ہنسی اور غزسردار کی آنکھوں میں شرارت سی محسوس کی۔

وہاں ہجوم میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ غزسردار نے جوق کو اشارے سے اپنے پاس بلایا اور کہا۔" میں تمہارے باپ کی آخری رسوم میں شرکت نہیں کرسکوں گا، دوسرے یہ کہ میں یہاں جس مقصد سے آیا ہوں، وہ تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں۔"

جوق نے جواب دیا۔" میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔"

غزسردار اپنے گھوڑے پر سوار اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا۔" کیا خیال ہے کیا میں جوق کو بتا دوں کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں؟"

کئی شہسواروں نے ایک ہی جواب دیا۔" ضرور بتا دیجیے۔"

جوق نے حیرت سے پوچھا۔" آخر بات کیا ہے؟"

غزسردار نے جوق سے کہا۔" جوق! تمہیں زحمت تو ہوگی لیکن تمہیں کچھ دور ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔"

جوق اپنے گھوڑے پر سوار ہوکے غزسردار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ غزسردار کے پچاس سوار اس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور جوق ان کے ساتھ تنہا تھا۔ کئی فرلانگ جانے کے بعد غزسردار نے کہا۔" جوق بہادر! سالوں پہلے تم نے مجھے جنگ میں شکست دے کر قید کرلیا تھا اور پھر ازراہِ ترحم میری جاں بخشی اور رہائی عطا فرمائی تھی۔"

جوق نے جواب دیا۔" یہ تو بہت پرانی بات ہوگئی اب اس کا کیا ذکر ہے۔"

غزسردار ایک دم جذباتی ہوگیا۔ بولا۔" بات پرانی ہوگئی لیکن اس دن میرے دل اور میری روح پر جو گھاؤ لگا تھا۔ وہ آج تک مندمل نہیں ہوا وہ آج بھی ہرا ہے۔"

جوق نے بڑی بے نیازی اختیار کر رکھی تھی، بولا۔" لیکن میں نے اس کو بھلا دیا۔"

غزسردار نے اچانک اعلان کردیا۔" لیکن میں اس کو اس وقت تک نہیں بھلاؤں گا جب تک کہ میں خود بھی تجھ کو جنگ میں شکست دے کر جاں بخشی اور رہائی کا حکم صادر نہ کروں۔"

جوق کے کان کھڑے ہوئے، پوچھا۔" یعنی، کیا مطلب؟"

غزسردار کے لہجے میں درشتی اور رعونت آچکی

تھی۔ بولا ”مطلب یہ کہ میں یہاں جنگ کی نیت سے آیا ہوں۔ میں تم سے جنگ کرنا چاہتا ہوں۔“

جوق نے پوچھا ”ابھی۔ آج ہی؟“

غز سردار نے اپنے ساتھیوں کو کوئی اشارہ کیا اور جواب دیا ”نہیں جوق بہادر! میں موجودہ حالات میں جنگ نہیں کر سکتا، کیونکہ مقابلے میں مزہ اسی وقت آتا ہے جب ایک فریق دوسرے فریق کو کسی قسم کی رعایت دیے بغیر زیر کر لے۔“

جوق نے جواب دیا ”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ پھر پوچھا ”اور یہ مقابلہ کب اور کہاں ہوگا یہ باتیں مجھے ضرور معلوم ہونا چاہیے ہیں۔“

غز سردار نے جواب دیا ”آج کے چوتھے دن۔ اس وقت تک تم تیاری بھی کر لو گے۔“

جوق نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی، بولا ”زندگی کا بھروسا نہیں، یہ سب سے زیادہ ناقابلِ اعتبار شے ہے۔“

غز سردار نے جواب دیا ”اسی لیے تو میں قرض اتارنے آیا ہوں کیا تم جنگ سے بچنا چاہتے ہو؟“

جوق نے جواب دیا ”ہرگز نہیں، میں چوتھے دن تم سے جنگ کرنے کو تیار ہوں۔“

غز سردار نے کہا ”اب تم جا سکتے ہو۔ میں اپنے لشکر میں واپس جا رہا ہوں۔“

جوق سوچنے لگا۔ تو غز سردار لشکر لے کر آیا ہے۔ اور وہ مجھ سے ایک فیصلہ کن جنگ لڑنا چاہتا ہے؟ وہ یہ سب سوچتا ہوا اپنے خیموں میں واپس گیا، وہاں ارسلان کی موت نے ہر طرف اداسی ہی اداسی پھیلا رکھی تھی، قبیلے کے لوگ بین کر رہے تھے اور رو رہے تھے۔

*

ارسلان کی آخری رسوم کی ادائیگی کے فوراً بعد جوق نے اپنے قبیلے کے جوانوں اور مردوں کو بتا دیا کہ غز سردار ایک فیصلہ کن جنگ لڑنے کے لیے اپنے لشکر کے ساتھ خجند کے میدان میں ہمارا انتظار کر رہا ہے۔

اس اعلان نے پورے قبیلے میں ہلچل مچا دی، جوق کے لشکر میں کئی حلیف قبیلے بھی شامل ہو گئے۔ الوس آغا نے پوچھا ”یہ کیسی جنگ ہے اور اگر اس جنگ میں تم جیت گئے تو اس سے ہمیں کیا ملے گا؟“

جوق نے جواب دیا ”اس جیت سے ہمیں بہت کچھ مل جائے گا۔ اگر میں نے اس بار غز سردار اور اس کے لشکر کو شکست دے دی تو میرا اگلا معرکہ الحدیثہ کے غز بادشاہ سے ہوگا اور اس وقت شاید میں فتح حاصل کرنے کے بعد خود کو بادشاہ اور تجھ کو ملکہ کہلاؤں، یہ ایک جواب، ادھر یا اُدھر، تخت یا تختہ۔“

الوس آغا کو اپنی منزل اپنے سامنے نظر آ رہی تھی۔

جوق اپنا لشکر لے کر غز سردار کے سامنے پہنچ گیا، ہزاروں گھوڑے پاؤں پٹک پٹک کے اور ہنہنا ہنہنا کے اپنی بے چینی کا اظہار کر رہے تھے۔ جوق کا بیٹا بھی میدانِ جنگ میں موجود تھا۔ اس نے میدان میں آثار ہی کچھ اور دیکھے۔ اور اپنے باپ سے پوچھا ”بزرگوار! کیا ہم یہ جنگ جیت لیں گے؟“

جوق نے جھنجلا کر جواب دیا ”یہ تو کیسی باتیں کر رہا ہے۔ میں یہ جنگ جیت لوں گا اور اس بار اگر غز سردار گرفتار ہو کر میرے سامنے لایا گیا تو میں اس کو معاف نہیں کروں گا اور میری دوسری منزل الحدیثہ ہوگی اور غز بادشاہ کی حکومت میرے قدموں تلے۔“

وہ ابھی یہ باتیں کر ہی رہا تھا کہ غز بادشاہ نے نقاروں پر چوٹ لگوا دی، اعلانِ جنگ ہو چکا تھا دونوں فوجیں مست سیاہ ہاتھیوں کی طرح ایک دوسرے پر جھپٹیں اور شور و غل نے دل و دماغ کو ہلا کے رکھ دیا۔

اس بار جوق کا اندازہ غلط ہو چکا تھا، غز سردار کی فوج نہایت حوصلے اور جنگی مہارت سے لڑ رہی تھی۔ جوق کی فوج میں معلوم نہیں کیوں بے دلی پائی جاتی تھی۔ جوق تیروں کی سنسناہٹ اور تلواروں کی شپاشپ میں اپنے گھوڑے کو ادھر اُدھر بھگائے پھر رہا تھا، وہ کسی طرح غز سردار کے سر پر پہنچ کے اس کا کام تمام کر دینا چاہتا تھا کیونکہ اس جنگ کا خاتمہ اس طرح باآسانی ہو سکتا تھا۔ لیکن غز سردار بھی چھلاوہ بنا ہوا تھا۔ وہ کبھی میمنہ پر نظر آتا اور کبھی میسرہ پر اچھلتا ہوا قلب میں دکھائی دیتا۔

چند گھنٹوں کے اندر ہی جوق کے لشکر میں شکست کے آثار دکھائی دینے لگے۔ اس پریشانی اور بدحواسی میں غز سردار نے نئی جنگی چال چلی اور عین اس وقت جب جوق کے سپاہی پیچھے ہٹ رہے تھے، انھیں اپنے عقب میں غز سردار کی تازہ دم فوج ان کی طرف بڑھتی ہوئی نظر آئی تلواریں اور سنا بلند تھیں اور حملہ آور ہونے والوں میں بلا کا جوش پایا جاتا تھا۔

اب میدان ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ جوق تیزی سے مڑا اور غز ترکوں کو دھوکا دے کر الوس کے پاس پہنچا، اس نے الوس سے جلدی جلدی کہا ”الوس! جلدی کر ہم یہاں سے فرار ہو جائیں گے اگر ہم نے دیر کی تو غز سردار ہمیں گرفتار کر لے گا۔“

الوس نے یہ بدخبر جو سنی تو اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ اپنی جگہ سے ہل تک نہیں۔

جوق نے چیخ کر کہا ”الوس! او ذلیل عورت! کیوں دیر کر رہی ہے جلدی کر۔“

الوس نے پوچھا ”میرا بیٹا کہاں ہے؟ کیا اس کو یہیں چھوڑ جاؤ گے؟“

اب میدان ہاتھ سے نکل چکا تھا، بیٹے کا کہیں پتا نہ تھا، جوق کے جی میں آئی کہ وہ الوس اور بیٹے کو چھوڑ کے خود کہیں فرار ہو جائے مگر اسی وقت عزسردار نے کمند پھینک کے اسے قید کر لیا، اب وہ رسیوں سے جکڑا جا چکا تھا۔ جوق کی آنکھوں تلے اندھیرا پھیلتا چلا گیا۔ اس کو کچھ بھی نظر نہ آرہا تھا، ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اندر بھی اور باہر بھی۔ اس نے بے ہوش ہونے سے پہلے عزسردار کو اپنے پاس کھڑے ہوئے مسکراتے دیکھا تھا۔

ان کے خیموں کو لوٹ لیا گیا اور انھیں انتہائی بے دردی سے آگ لگا دی گئی۔ جوانوں اور ادھیڑ عمر مردوں کی اکثریت قتل کر دی گئی اور جو بچ گئے تھے انھیں قید کر لیا گیا۔

اس میدان میں عزسردار کے خیمے نصب کر دیے گئے۔ غزوں کا دربار دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔

اس دربار میں جوق اور الوس آغا کو ایک ساتھ پیش کیا گیا۔ جوق کی نظریں نہیں اٹھ رہی تھیں۔ عزسردار نے مسکراتے ہوئے کہا ”کیا بات ہے جوق! یہ تجھ کو شرم کیوں آرہی ہے۔“

جوق نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شاید اس کی آنکھ نہیں دل رو رہا تھا۔

عزسردار نے پوچھا ”جوق! ایک دن میں بھی اسی کیفیت سے گزر چکا ہوں، وہ میری زندگی کے بدترین دن تھے لیکن میں انھیں اس امید پر جھیل گیا کہ میں کبھی نہ کبھی تو سُرخرو ہو سکوں گا۔ آج میں جو کچھ اپنے سامنے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں اس سے میرے دل اور میری روح کے گھائل حصے مندمل ہو جائیں گے۔“

عزسردار نے جوق سے پوچھا ”بول تیرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟“

جوق نے بلا تامل جواب دیا ”ہمیں قتل کر دیا جائے۔“

عزسردار نے نفی میں سر ہلایا، بولا ”نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ میں تمھیں معاف کرتا ہوں، تم کو بھی اور تمھاری بیوی کو بھی۔ میں احسان کو احسان سے اُتار رہا ہوں، آج میں بہت خوش ہوں، آج میں نے وہ سب پا لیا، جس کی میں تمنا کیا کرتا تھا۔“

جوق کو آزاد کر دیا گیا، اس کے ساتھ ہی الوس بھی رہا ہو گئی۔

باہر دو گھوڑے تیار کھڑے تھے، یہ جوق اور اس کی بیوی الوس کے لیے لائے گئے تھے۔ جب یہ دونوں باہر جا رہے تھے تو ان کے ساتھ ساتھ عزسردار بھی چلنے لگا۔

عزسردار کے خیمے کے باہر لیوشاؤ کھڑا ہوا تھا، جوق نے اس کو دیکھا تو ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا، پوچھا ”تم یہاں کہاں؟“

لیوشاؤ نے جواب دیا ”میں تو آپ کو تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔“

جوق نے آہستہ سے کہا ”میرا مذاق نہ اڑاؤ لیوشاؤ!“

کچھ دیر بعد جوق اور اس کی بیوی الوس اپنے اپنے گھوڑے کی پشت پر بیٹھ گئے۔

جوق نے اپنی بیوی سے کہا ”تو ملکہ بننا چاہتی تھی، اب شاید تیری یہ خواہش پوری نہ ہو سکے۔“ پھر لیوشاؤ سے کہا ”تو وطن جانے کے لیے بہت بے چین اور بے قرار تھا، اب میں تجھ کو اجازت دیتا ہوں کہ تو اپنے وطن واپس چلا جا۔“

الوس رو رہی تھی سسکیوں سے۔ اس نے آنسوؤں سے بھرا چہرہ جوق کی طرف اٹھا دیا اور کہنے لگی ”لیکن میرا بیٹا؟ اس کا کیا ہوگا؟“

جوق نے جواب دیا ”اس کو بھی کہیں تلاش کریں گے۔“

اس کے بعد سرد آہ بھر کے بولا ”بیٹا، اگر نہ ملا تو میں کیا کروں گا؟ صبر اور قناعت کیونکہ چینی دانش ور لیوشاؤ کہتا تھا کہ صبر اور قناعت کی موجودگی میں مایوسی اور محرومی کا دکھ چلا جاتا ہے۔ آج میں بھی صبر اور قناعت کے ذائقے سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہوں۔“

جوق اور الوس اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ایک ایسی منزل کی طرف چل پڑے، جس کا نہ تو کوئی نام تھا اور نہ نشان۔

عزسردار اپنے خیمے کے در پر کھڑے ہوئے ان دونوں کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ دونوں اپنی اُڑائی ہوئی گرد و غبار میں معدوم ہو گئے۔ عزسردار نے مسکراتے ہوئے لیوشاؤ کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا ”اب تو کہاں جائے گا میرے ساتھ رہ۔ میں تیری قدر کروں گا۔ جوق سے بھی زیادہ، اس سے کہیں زیادہ۔“

لیوشاؤ نے کوئی جواب نہیں دیا اور وہ عزسردار کے ساتھ اس کے خیمے میں چلا گیا۔

# میرا خیال

## سرورق کا شعر

بہاریں تیرے دھانی پیرہن سے رنگ لیتی ہیں
مہک پھولوں کو ملتی ہے تیرے گیسو کی خوشبو سے
ایم حنیف شاکر، سانگھڑ

### پہلا انعام

اک نئی آس سی میری روح میں بیدار ہوئی
جب خزاں دیدہ شجر سے کوئی کونپل پھوٹی
تنزیل فاخرہ، بھکر

### دوسرا انعام

یہ تو شجر ہے تُو کسی پتھر کو بھی چھو لے
اس سے بھی پھوٹ آئے شگوفہ بہار کا
نغمانہ امداد جعفری، بھکر

### تیسرا انعام

یاد کیا کیا ہمیں دلا نہ گیا
پھوٹنا شاخ شاخ کونپل کا
عارفہ قریشی، کراچی

دیکھ لے سوکھی ٹہنیوں کی طرف
پوچھ مت انتظار کیا شے ہے
اختر علی، راولپنڈی۔ سہیل نذیر بھٹہ، خانیوال۔ نوزیہ بانو، نواب شاہ۔ اسماء حبیب، کراچی۔ بابو نصیر احمد مغل، سچالیہ۔ سعیدہ، چکوال۔ شیراز علی، دادو۔ جمیل، کراچی۔ نجف علی شاہ بخاری، بھکر۔ نعیم حیدر بخاری، ملتان۔ ایم نواز صفدر بخاری، رحیم یار خان۔ چندا، لاہور

یادوں کی جڑیں پھوٹ ہی پڑتی ہیں کہیں سے
دل سوکھ بھی جاتا ہے تو بنجر نہیں ہوتا
مبارک شاہین، کھیوڑہ۔ چوہدری اصغر علی جیدی، بشیر پور

درد کے موسم میں بھی رکھا بہاروں کا بھرم
زخم تازہ ہو گئے ہیں دل میں کونپل کی طرح
شکیل اصغر، فیصل آباد

زرد آتا ہے نظر خوفِ خزاں سے وہ بھی
ایک پتہ جو سرِ شاخِ شجر باقی ہے
زرقا بخاری، روہڑی

اس کی نازک انگلیوں کو دیکھ کر اکثر عدم
ایک ہلکی سی صدائے ساز آتی ہے مجھے
سید صابر شاہد، تلہ گنگ

چمن میں یوں گزاری ہے حیات مختصر میں نے
وہیں بجلی گری جس شاخ پر ڈالی نظر میں نے
ہانی صدیقی، حیدرآباد

حسرتوں کی چاندنی غم کی شفق یادوں کی لَو
ایک ہی تصویر میں وہ کتنے رنگ بھر گئے
عاصم احسان، کالا گوجراں جہلم

میں نے برسوں تیری یادوں کا سہارا لے کر
تجھ کو پوجا ہے خیالوں کے صنم خانے میں
محمد سہیل، ڈیرہ اسمٰعیل خان

خزاں رسیدہ شجر کا تو بس تکلف ہے
خیالِ یار ہی کافی ہے سائباں کے لیے
ذوالفقار، روہڑی

کیا خبر تھی کہ خزاں ہوگی مقدر اپنا
میں نے ماحول بنایا تھا بہاروں کے لیے
عظمیٰ مسعود، لاہور

تم راہ دیکھنا میری مانند شاخِ گل
میں پھول بن کے آؤں گا اب کے بہار میں
سید عرفان حیدر بخاری، فیصل آباد

اب بھی اسی طرح ہیں میرے گھر کی رونقیں
پُرہول خامشی میں ہے سبزہ اُگا ہوا
نذیر حسین سجاد۔ منیر حسین زبیری، پیر محل

اک یاد ہے کہ دامنِ دل چھوڑتی نہیں
اک بیل ہے کہ لپٹی ہوئی ہے شجر کے ساتھ
نزہت بانو، گجرات

کچھ اور بھی ہیں کام ہمیں اے غمِ جاناں
کب تک کوئی الجھی ہوئی زلفوں کو سنوارے
مقبول حسین شاہ نقوی، پیر محل

آنکھیں رہیں گی شام و سحر منتظر تیری
آنکھوں کو سونپ دیں گے تیرا انتظار ہم
عمران احمد بھٹی، خوشاب

دل محوِ انتظار ہے آنکھیں ہیں فرشِ راہ
آؤ کبھی تو چاہنے والوں کے شہر میں
سید ایم شیراز کی، ملتان

اے حسن پشیماں میری آہوں سے نہ گھبرا
ہر آہ ترے حق میں دعا ہو کے رہے گی
پرنس کاشف قریشی، مظفر گڑھ

دل شکستہ ہے اگر غم سے تو حیرت کیسی
کھوکھلے پیڑ کو جھونکے بھی گرا دیتے ہیں
نجمہ جعفری، کراچی

اس درجہ مطمئن ہیں وہ زلفیں سنوار کے
جیسے سدا رہیں گے زمانے بہار کے
عثمان علی خان، لاہور

اللہ رے چشمِ یار کی نازک خرامیاں
ہر اک کو یہ گماں کہ مخاطب ہمی سے ہیں
راحیل شریف، لاہور۔ رضوان احمد، بنوں

ہوا چلے گی تو خوشبو بھی میری پھیلے گی
میں چھوڑ آئی ہوں پیڑوں پہ اپنے ہاتھ کے رنگ
میر خالد گنجاہی، لاہور

مغموم ہے بانِ چمن شجر و برگ غمزدہ
کھلتے نہیں کہیں بھی کلی ترے بغیر
احسان الحق راجہ، مدینہ منورہ

بہار کون سی سوغات لے کے آئی ہے
ہمارے زخمِ تمنا تُو آ کے دیکھ ذرا
طاہرہ احسان، مدینہ منورہ

کیا خبر تھی کہ خزاں ہوگی مقدر اپنا
ہم نے ماحول بنایا تھا بہاروں کے لیے
سید حسن حیدر، کراچی

خزاں رسیدہ شجر کا تو بس تکلف ہے
خیالِ یار ہی کافی ہے سائباں کے لیے
شگفتہ احتشام علی، کراچی۔ شعیب آفاقی، کراچی

اپنا آپ اٹھا کر یوں ہم تیری راہ میں بیٹھے ہیں
جیسے کوئی پت جھڑ میں بھی دیکھے خواب بہاروں کا
محمد الیاس صہیب بٹ، ڈسکہ۔ ایم الطاف، کراچی

کس کونپل کی آس میں اب تک ویسے ہی سرسبز ہو تم
اب تو دھوپ کا موسم ہے برسات گزر گئی جاناں
نسیم خالد اعوان، مراکسیال۔ غلام ربانی، راولپنڈی
محمد سلیم شہزاد، امر آباد پیر محل

میرے لیے نہ رہی اس جہاں میں رعنائی
عجیب طریقے سے اس مرتبہ بہار آئی
اے علی اعظم

آہٹ پہ کان ، در پہ نظر ، دل میں اشتیاق
یہ کیسی بے خودی ہے ترے انتظار کی
خالد قمر ، مردان

کہیں وہ آ کے مٹادیں نہ انتظار کا لطف
کہیں قبول نہ ہو جائے التجا میری
ساجد مقبول ، کھیوڑہ

پھر ہوا آباد یادوں سے یہ ویرانۂ دل
پھر نکل آئی ہیں سوکھی ڈالیوں پر کونپلیں
گوہر نواب گوہر ، دوحہ قطر

ملول کر گئی ویران ساعتوں کی صدا
چمن میں جی نہ لگا جنگلوں کے باسی کا
طاہر امان راٹھور ، گوجرانوالہ

تمام عمر تیرا انتظار کرلیں گے
مگر یہ رنج رہے گا کہ زندگی کم ہے
سید ندیم حیدر ، کراچی

وعدہ وہ کر گئے ہیں قمر مجھ سے شام کا
کیسے کٹیں گے چار پہر انتظار کے
سید مستجاب حیدر ، کراچی

ڈوبا ہوا ہے دل میرا یادوں کی جھیل میں
آنکھوں میں خواہشوں کی تھکن کا خمار ہے
نعیم احمد شیخ ، ملتان

رنگ و بُو کے پجاری نجانے کیوں کوستے ہیں خزاں کو
زرد پتوں کا شاخوں سے گرنا ہی بہاروں کا حاصل نہیں ہے
زیڈ۔ ایس زیدی ، ملکوال

ہے کس کا انتظار کہ خوابِ عدم سے ہم
ہر بار چونک پڑتے ہیں آوازِ پا کے ساتھ
تبسم مرزا ، دینہ جہلم

اب کے یہ فصلِ بہاراں کا اثر تو دیکھو
میرے زخموں پہ ہے پھولوں کی نظر تو دیکھو
محمد افضل انجم ، جدہ

کسی سرنگوں سی ڈالی پہ رکھے تھے چار تنکے
نہ بلند شاخ ہو گی نہ جلے گا آشیانہ
نجمہ عندلیب کرن ، بہاولنگر

کٹی رُتوں سے مرے نیم وا دریچوں میں
ٹھہر گیا ہے ترے انتظار کا موسم
شگفتہ جبین ، کوئٹہ۔ محمد طارق شہزاد ، صادق آباد
سید شکیل حیدر بخاری ، فیصل آباد۔ فہمیدہ اسلم ، جوڑا

ہمارا خون بھی شامل ہے تزئینِ گلستاں میں
ہمیں بھی یاد کر لینا چمن میں جب بہار آئے
ریحانہ کنول ، ربوہ

آنے کا وعدہ کر کے وہ آئے نہیں ابھی
قسمت میں انتظار ہے سو کر رہے ہیں ہم
طاہر حسین ، ربوہ

تیرے بغیر بھی جی تو رہے ہیں ہم لیکن
یہ روز و شب ہمیں کتنے گراں گزرتے ہیں
خالد اقبال مغل ، میرپورخاص

خوں بہا آگئی بہاروں کا ترے سر تو نہیں؟
خشک ٹہنی پہ نیا پھول کھلانے والے
عادل یزدانی ، چنیوٹ

گھنی زلفوں کے سائے میں چمکتا چاند سا چہرہ
تجھے دیکھوں تو کچھ راتیں سہانی یاد آتی ہیں
مسرت سحر ، جہلم

وہ تو اس شوخ کا اندازِ نظر تھا ورنہ
دامنِ فصلِ بہاراں میں کوئی پھول نہ تھا
محمد مظہر صدیقی ، بھکر

خیال ہی نہیں آتا تیرے نہ آنے کا
کچھ اس خلوص سے ہم محوِ انتظار رہے
طارق خورشید لودھی ، ریاض آباد

ان کی آمد کا تصور رُوح پرور ہے مگر
دیکھیے کب ٹوٹتا ہے یہ طلسمِ انتظار
تنویر احمد خان ، پاک پتن

لوگوں کو یہ گماں ہے کہ میں سنگِ میل ہوں
پتھر بنا دیا ہے تیرے انتظار نے
محمد حسین ، لاہور

سایہ طلب گئے جدھر بول اُٹھے وہیں شجر
اب آئے ہو مسافر جب ہمیں دھوپ کھا گئی
طارق علی صدیقی ، کراچی

وہ میرے قافلے کو تک رہی ہیں چشمِ حیرت سے
خدا محفوظ رکھے راہگزاروں کو محبت سے
مس شگفتہ ناز ، بھکر

بال کھولے ہوئے یوں سیر سرِ بام نہ کر
تیری زلفوں کی سیاہی نہ اڑا لے کوئی
رفعت ناہید ، دھریالہ جالپ

نہ اتنی تیز چلے سر پھری ہوا سے کہو
شجر پہ ایک ہی پتہ دکھائی دیتا ہے
ایس ایم اختر شاد ، عمرکوٹ۔ ارم مہک ، نوابشاہ
خلیل احمد لودھی ، راولپنڈی۔ ہما ناز گجر ، فیصل آباد

وہ مجھ سے روٹھ گیا ہے کبھی نہ آئے گا
یہ جانتی ہوں مگر پھر بھی انتظار میں ہوں
شاہد محمود شاہد ، لاہور

چمن پرست ہوں میں ، اہلِ چمن سے کہہ دو
خونِ جگر سے ہم نے پھولوں کے رُخ نکھارے
ملک طارق محمود ، لیتہ

پوچھا جو اُن سے چاند نکلتا ہے کس طرح
زلفوں کو رُخ پہ ڈال کے جھٹکا دیا کہ یوں
منظور احمد نادم ، رحیم یار خان

آنکھوں میں تیری دید کی حسرت لیے ہوئے
کب سے کھڑا ہے کوئی تیرے انتظار میں
دلاور حسین انجم ، سیالکوٹ

شاخوں نے پھول پہنے تھے کچھ دیر قبل ہی
کیا ہو گیا قبائے شجر کیوں اُتر گئی
اشفاق احمد ، مظفر گڑھ

اداسیاں ہیں لگا ہوں میں پھر بھی زندہ ہوں
یہ انتظار تمہارا میری حیات ہوا
عابد حسن عابد ، راولپنڈی

شاخِ گل یوں آئی میرے دریچے کے قریب
زندگی جیسے قسمت چمکانے آئی ہو
ظفر اقبال احمد پوسیال

عجب نہیں کہ ہوا اپنا رُخ بدل ڈالے
جو ہو سکے تو ابھی بادباں کھلے رکھنا
طارق شہزاد مشعو ، گوترہ گجرات

پلکوں پہ رُک گیا ہے سمندر خمار کا
کتنا عجب نشہ ہے تیرے انتظار کا
دلاور حسین انجم ، سیالکوٹ

ہم نے تو کانٹوں کو بھی نرمی سے چھوا ہے اکثر
لوگ بے درد ہیں پھولوں کو مسل دیتے ہیں
محمد زاہد ، جہلم

ہم وہ بلبل ہیں جنھیں مطلوب ہے دیدارِ گل
چھوڑ کر اس کو کسی جانب بھی ہم تکتے نہیں
سید لال حسین بخاری ، کھیوڑہ

تری خامشی کو دیکھا تو چٹک گئے شگوفے
ترے گیسوؤں کو دیکھا تو ٹھٹک گئیں گھٹائیں
محمد رفیق ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ ملک محمد بوٹا انجم ، شیخوپورہ
خالق کنول ، کوٹ ادو

شگفتِ غنچہ نے چونکا دیا مجھے ہر بار
کسی کے آنے کا ہوتا رہا گماں کیا کیا
نصرت طاہرہ ، رحیم یار خان

تیرا بہار کا وعدہ دُرست ہے لیکن
مجھے بہار کے رنگوں پہ اعتبار نہیں
معظم خلیل، لاہور

درج ہے تاریخِ وصل و ہجر ہر اک شاخ پر
بات جو ہم تم نہ کہہ پائے شجر کہنے لگے
شاہین نثار، کنری پاک

یہ اپنا حسنِ جنوں تھا کہ ہم جہاں پہنچے
خزاں کو موسمِ گل میں بدل کے آئے ہیں
مسز شکیلہ اختر، چشمہ کالونی

یارب نہیں ہے اب تو مجھے تابِ انتظار
مل جائے کاش اب تو مرا چارہ گر مجھے
ثاقب رضوی، کراچی

بہار میں جو نکالا ہمیں تو کیسا پایا
خزاں میں حالِ چمن تو نے باغبان دیکھا
سعید احمد باسل، لیہ

وہ نہ آئے گا ہمیں معلوم تھا اُس شام بھی
انتظار اس کا مگر کچھ سوچ کر کرتے رہے
امجد اسلام امجد، جھنگ

نہ آیا ہے نہ آئے گا کبھی وہ اپنے وعدے پر
نہ جانے کس توقع پر ہیں محوِ انتظار آنکھیں
محمد رمضان خاکی، خوشاب

کس سوچ میں ہو غرق کہ آنچل ڈھلک گیا
کیا محویت ہے زلفِ پریشاں سنوار لیجے
ایم مسعود اعوان، لاڑکانہ

تیرتے ہیں تیری آنکھوں میں اشارے کیا کیا
دیدنی ہے تیرے جلووں کی نمائش لیکن!
کنول سلیم، سیالکوٹ

یوں تخیل میں تیرے ہاتھ کی دستک گونجی
کسی کونپل کے چٹخنے کی صدا ہو جیسے
مہوش اسد، بھکر

ہم تغافل پہ تیرے ہونٹ نہ کھولیں گے کبھی
دل کا افسانہ سنا دیں گی ہماری آنکھیں
محمد طارق اقبال، جتوئی

کلی کلی ہمیں حیرانیوں سے تکتی ہے
کہ پت جھڑوں میں صدائے بہار دی ہم نے
جاوید اقبال، غازی گھاٹ

کیا گل کھلے گا دیکھیے ہے فصلِ گل تو دُور
اور سوئے دشت بھاگتے ہیں کچھ ابھی سے ہم
عبدالحمید ساجد، لیہ

خلوتیں کی ہے نجانے یہ کون سی منزل
نہ اجنبی ہے یہاں پر نہ کوئی اپنا ہے
عبدالوحید، فیصل آباد

صحرا کا اک درخت ہوں تنہائیوں میں گم
ایسے نہ اپنی ذات میں کھویا کرے کوئی
ساجدہ، ڈیرہ غازی خان

ضروری تو نہیں کہہ دوں لبوں سے داستاں اپنی
زباں اک اور بھی ہوتی ہے اظہارِ تمنا کی
منظور حسین جاوید، لاہور

اک بار جسے چاٹ گئی دھوپ کی خواہش
اس شاخ کو پھر پھولتے پھلتے نہیں دیکھا
محمد خلیق خان پسروری، کراچی

اب مست ہوا کے جھونکوں نے گلشن سے گزرنا چھوڑ دیا
جب بادِ صبا ہی روٹھ گئی تو جشنِ بہاراں کیا ہوگا
این۔ ایس۔ اے، کراچی

مسکراتے ہوئے چہروں سے تبسم کی ضیاء
لُوٹ لیتے ہیں یہ دستور ہے انسانوں کا
عبدالرشید فاروقی، جھنگ

میں تیرے انتظار میں بے قرار ہوں
تو نہ جانے کب پہنچے اس مقام پہ
اسد قذافی، ملک وال

پوچھتے کیا ہو رستوں کا ابہام یہی کچھ ہوتا ہے
دیکھی چھاؤں جہاں گھنیری پاؤں وہیں پسار دیے
صباحت گل صبا، ملتان

میں برگ برگ اس کو نمو بخشتی رہی
وہ شاخ شاخ میری جڑیں کاٹتا رہا
سعید بن عزیز، کراچی

بے ثمر پیڑوں کو چومیں گے صبا کے سبز لب
دیکھ لینا یہ خزاں بے دست و پا رہ جائے گی
راؤ ماہتاب علی، جہانیاں منڈی

پھر ڈسنے لگا ماضی پھر تلخ ہوئے لمحے
یادوں کی حسیں ناگن پھر دل میں اُتر آئی
عبدالعزیز راہی، شمی تیطانی

سفر کی دھوپ میں جل کر کسے پکاروں میں
کہ راستے میں انا کا شجر بھی آتا ہے
فاخرہ عروج بٹ، لاہور

شاخِ امید پہ کھلتے ہیں طلب کے غنچے
یا کسی شوخ کے ہاتھوں میں حنا لگتی ہے
منور اشرف جنجوعہ، ابدال

اے دل نا عاقبت اندیش ضبطِ شوق کر
کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست
شاہدہ زیدی، کراچی

یہ دن تو فصلِ بہاراں کا پیش خیمہ ہے
خزاں کی قید سے آج اپنا گلستاں نکلا
ارم رعنا، تلہ گنگ

تیرے آنے کی امید لگی ہے عادل
اب تو آ جا کہ درختوں پہ بہار آئی ہے
عبدالسلام عادل الماس کرن، حیدرآباد

ساون آیا، پھول کھلے، اِک الھڑ دل کا بول تھا
جس میں دل کھل جاتے ہوں وہ برکھا رت کب آتی ہے
حسنات حسین شاہ نہار، کراچی

شام بھی ہو گئی، دھندلا گئیں آنکھیں میری
بھولنے والے، میں کب تک ترا رستہ دیکھوں
مظفر قریشی، ڈیرہ غازی خان

رچ بس گیا ہے ذہن میں تاعمر کسی کا روپ
اب کیا کریں گے ہم کوئی شاہکار دیکھ کر
ندیم احمد، ملتان

یہ کہہ کر ستم گر نے زلفوں کو جھٹکا
بہت دن سے دنیا پریشاں نہیں ہے
محمد افضل فاروقی، مظفر آباد

ادائے حُسن کی معصومیت کو کم کر دے
گناہ گار نظر کو حجاب آتا ہے
شاہد محمد بشریٰ نورین، میرپور آزاد کشمیر

تو اسے شورِ بہاراں نہ سمجھ
چھپ کے پتوں میں خزاں روتی ہے
شیخ اختر علی و لیاقت علی، راولپنڈی

پھر نہ کیجیے میری گستاخ نگاہی کا گلہ
دیکھیے آپ نے پھر پیار سے دیکھا مجھ کو
محمد خلیل راشد، ڈیرہ غازی خان

تیرا اندازِ تبسم تیرا عنوانِ بہار
جب کوئی پھول کھلا میں نے تجھے یاد کیا
محمد اسلم طاہر، ملکوال

مری سمت سے اُسے اے صبا یہ پیام آخرِ غم سنا
ابھی دیکھنا ہو تو دیکھ جا کہ خزاں ہے اپنی بہار پر
رانا عمران احمد، بھکر

خزاں رکھے گی درختوں کو بے ثمر کب تک
گزر ہی جائے گی یہ رُت بھی حوصلہ رکھنا
پرنس عبد رحیم گل، مظفر گڑھ — لبنیٰ حبیب، کراچی

# 6 ستمبر

ابوضیا اقبال

سسپنس ڈائجسٹ ستمبر 1984ء

6
ستمبر
ابوضیا اقبال کے
افسانوں کا مجموعہ ہے۔
یہ کتاب تقریباً ۱۹ سال پہلے شائع
ہوئی تھی جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ان افسانوں کا
پس منظر وہ تاریخی دن ہے جب پاکستانی قوم میں
جذبۂ جہاد یوں بیدار ہوا کہ خیبر سے چاٹگام تک
پوری قوم ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر سیسہ پلائی
ہوئی دیوار کی طرح کھڑی ہو گئی تھی۔ جب اس
ملک میں کوئی راشی، کوئی چور،
کوئی ذخیرہ اندوز اور کوئی
کام چور باقی نہ
رہا تھا۔
یہ جذبہ اور یہ
جوش افسوس کہ قوم میں صرف ایک
بار ہی دیکھنے میں آیا ہے ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی۔

**منشی** جی نے ٹوٹی ہوئی عینک آنکھوں پر رکھی، دھاگہ کانوں کے گرد لپیٹا اور اخبار پڑھنے لگے۔ باورچی خانے سے گرم پراٹھوں کی سوندھی خوشبو آرہی تھی۔ ڈربے کی بارہ گھنٹے کی قید سے رہائی پا کر مرغیاں صحن میں پھیلی مٹی کرید رہی تھیں۔ کبھی کبھار ان میں سے کوئی سر اٹھا کر متجسس نظروں سے منشی جی کی طرف دیکھتی گویا پوچھ رہی ہو ہے کوئی تازہ خبر؟ پھر کوئی جواب نہ پا کر مٹی پر چونچ سے ٹھونگیں مارنے لگتی۔ ڈاک خانے کی کلرکی سے ریٹائر ہو کر ان کا یہی معمول ہو گیا تھا۔ صبح کی نماز سے فارغ ہو کر تلاوت قرآن پاک کرتے اس کے بعد اخبار چاٹ ڈالتے۔ باقاعدہ اخبار پڑھنے سے انہیں ملکی اور غیر ملکی حالات سے خاصی شُد بُد ہو گئی تھی۔ اور اپنے حلقے میں سیاسی آدمی سمجھے جاتے تھے۔

اسی لیے وہ ملکی اور عالمی سیاست پر پورے اعتماد سے تبصرہ کرتے اور ایسے چنے تلے الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کرتے کہ سننے والا ان کی معاملہ فہمی، دور بینی اور سیاسی تدبر کا قائل ہو جاتا۔ دھوپ میں بال سفید نہیں کیے ان کا تکیہ کلام تھا۔ اور لوگوں کو تسلیم کرنا پڑتا کہ واقعی ان کے بال دھوپ میں سفید نہیں ہوئے ہیں۔

منشی جی کی کل کائنات ہیں ان کی پنشن، دو کمرے اور کچے صحن کا ایک گھر تھا۔ جس کی چھت برسات میں ٹپکتی اور گرمی میں تپتی تھی۔ ایک عدد کبڑی بیوی اور لے پالک لڑکی امینہ تھی۔ پنشن گزارے کے لیے کافی نہیں تھی، اس لیے امینہ محلے والوں کے کپڑے سی کر دو چار روپے روز پیدا کر لیتی تھی۔ کپڑے تو بیوی بھی سی لیا کرتی تھی لیکن جب سے اس کی آنکھیں سوئی میں دھاگا پرونے سے رہ گئی تھیں اور ان سے پانی بہنے لگا تھا، اس نے سینا پرونا چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ صرف کھانا پکایا کرتی، نماز پڑھتی یا زیادہ سے زیادہ گھر کی صفائی کرتی۔ منشی جی کو اچھے کھانوں کا شوق تھا۔ بڑھاپے کے عارضے میں بھی وہ پراٹھے کھائے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ مرغیاں پال رکھی تھیں۔ ان سے انڈے مل جاتے تھے۔ جب ان میں سے کوئی کڑک ہو جاتی یا دانہ چگنے کے بجائے کسی کونے میں بیٹھی اونگھتی نظر آتی تو منشی جی کی دوربین نظریں بھانپ لیتیں کہ وہ داغِ مفارقت دینے والی ہے، چنانچہ اس سے پہلے کہ وہ اپنے اس ارادے میں کامیاب ہو، منشی جی چھری تیز کرتے اور شام ہونے سے پہلے اسے ہڑپ کر لیا جاتا۔

اخبار بینی اور سیاسیاتِ حاضرہ پر اپنے زریں خیالات کے علاوہ ان کا مشغلہ اور بھی تھا۔ وہ محلے کے دو چار غریب بچوں کو مفت پڑھاتے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ اخبار بینی سے فارغ ہو کر ڈٹ کر ناشتہ کرتے پھر صحن میں لارڈ کرزن کے زمانے کی کرسی پر بیٹھ جاتے۔ رمضان تانگے والے کا لڑکا نیاز، ڈاکیہ خیر دین کا لڑکا عمر دین اور مالی نندو والی کا نواسہ فتح محمد آ جاتے۔ منشی جی ان کو تین گھنٹے پڑھاتے پھر سیر سپاٹے کے لیے نکل جاتے۔ اس دوران میں وہ خواہ شاد سائیکل ورکس اور عبدالرحمٰن ڈپو والے کی دکان پر ضرور جاتے۔ در اصل ان کا میدانِ سیاست یہی تھا۔ دکانیں بھرے بازار میں تھیں۔ آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔ اخبار ان کی بغل میں ہوتا اور خبریں زبان پر۔ خبر سنا کر اس پر اپنی رائے کا اظہار روزمرہ پروگرام کا جزو تھا۔ ڈپو پر تو خیر جانے پہچانے محلے کے لوگ اور گنے بندھے گاہک ہی آتے تھے لیکن سائیکل کی دکان پر سائیکل میں پنکچر لگوانے یا ہوا بھروانے کے لیے کوئی نہ کوئی اجنبی دس پندرہ منٹ کے لیے رک جاتا اور منشی جی کو اپنی سیاست چھیڑنے کا موقع ملتا۔ دوپہر ہوتی تو کھانا کھانے کے لیے گھر آتے، سہ پہر تک چارپائی

توڑتے پھر "تعمیرِ نو" کے تحت قائم شدہ پبلک لائبریری میں جا کر رسالے پڑھتے۔ بتیاں جلنے پر گھر آتے اور کھانا کھا کر جلد ہی سو جاتے۔ کئی سال سے اس معمول میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

امینہ ناشتہ لے کر آئی تو منشی جی نے اخبار تہہ کر کے چارپائی پر رکھا اور مسند پر بیٹھے۔ ابھی انھوں نے دو ہی لقمے کھائے تھے کہ عمر دین بھاگا بھاگا آیا اور ہانپتے ہوئے بولا۔

"منشی جی! منشی جی! انڈیا نے حملہ کر دیا۔ سب لوگ واہگہ کی طرف بھاگے جا رہے تھے۔ بڑی گڑبڑ مچ گئی ہے۔"

"کیا بک رہا ہے عمرے!" منشی جی نے ایک بڑا سا نوالہ دانتوں تلے دبا کر اطمینان سے کہا۔

"سچ کہہ رہا ہوں منشی جی! سب لوگ بھاگ کر ادھر جا رہے ہیں۔" عمر دین قسم کھانے کو تھا۔ لیکن منشی جی کی چپت کے ڈر سے رہ گیا۔ منشی جی نے بڑی مشکل سے اس کی بات بات پر قسم کھانے کی عادت چھڑائی تھی۔ وہ دوسرا نوالہ دانتوں کی چکی میں دینے کو ہی تھے کہ خیر دین آ گیا۔ اسے یہ دیکھ کر بڑا تاؤ آیا کہ بیٹا خبر رساں ایجنسی بن کر پہلے ہی آ دھمکا تھا۔ اس نے عمر دین کے سر پر ایک دھول جمائی اور بولا۔

"دوڑ جا گھر۔" عمر دین بھاگ گیا تو وہ منشی جی کے پراٹھے پر نظریں گاڑ کر کہنے لگا۔

"منشی جی! غضب ہو گیا۔ انڈیا نے واہگہ کی سرحد پر حملہ کر دیا ہے۔ اور فوجیوں سے بھرے ٹرک جا رہے ہیں۔ لوگ بسوں اور اسکوٹروں پر دیکھنے جا رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ باٹا پور، جلو پر انڈیا کا قبضہ ہو گیا ہے اور۔۔۔"

"بھئی اخبار میں تو نہیں ہے۔" منشی جی سادگی سے بولے۔

"اجی اخبار تو رات کو چھپ جاتا ہے۔ حملہ صبح منہ اندھیرے ہوا ہے۔"

خیر دین آخر ڈاکیہ تھا۔ اسے منشی جی کی کم عقلی پر سخت افسوس ہوا اور واقعی منشی جی کم عقلی پر تھے۔ انھوں نے ایک اور نوالہ منہ میں رکھا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ انھیں باہر جاتا دیکھ کر کبڑی نے اندر سے کہا۔

"کہاں چلے، روٹی تو کھا لو۔"

"ابھی آتا ہوں۔" منشی جی اتنی بڑی خبر کو کیسے نظر انداز کر جاتے۔ آگے آگے خیر دین اور پیچھے پیچھے منشی جی ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

"نجانے کہاں لے گیا سویرے سویرے۔" بیوی بڑبڑائی اور بچے ہوئے پراٹھے کو کوؤں سے بچا کر اندر لے گئی۔

منشی جی باہر نکلے تو واقعی ایک بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ انھیں

یقین آ گیا کہ خبر جھوٹی نہیں ہے۔ وہ لپک کر بازار میں پہنچے۔ دکانیں کھلی تھیں۔ لوگ اپنے اپنے کام دھندے پر جا رہے تھے۔ بچے بستے لیے اسکول جاتے نظر آ رہے تھے۔ روزمرّہ کے معمول میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آ رہی تھی۔ تاہم دکانوں کے سامنے بھیڑ لگی تھی۔ منشی جی اور خیر دین لمبے ڈگ بھرتے نیو اسٹار سائیکل ورکس پہنچے تو مستری غلام محمد لوگوں میں گھرا زور زور سے باتیں کرتا دکھائی دیا۔ اس کی نظر منشی جی پر پڑی تو چلا کر بولا۔

"منشی جی! ارگالی دے کرے! انڈیا نے چوروں کی طرح اندھیرے میں سرحد پار کر لی ہے۔ خوب زور کی لڑائی ہو رہی ہے۔ باٹا پور پر حملہ ہو گیا۔ بہت سے لوگ مارے گئے اور زخمیوں سے بھرے ٹرک آ رہے ہیں…"

"مارے کیوں گئے، شہید کہو۔" مجمع میں سے کسی نے کہا۔

"ہاں ہاں شہید ہو گئے۔" بہت سی آوازیں آئیں۔ منشی جی جہاں تھے وہیں کھڑے رہ گئے۔ ان کے ہونٹ لٹک گئے۔ بدن ڈھیلا پڑ گیا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس خبر پر کس قسم کی رائے کا اظہار کریں۔ یہ کوئی ویت نام کی جنگ نہیں تھی۔ الجزائر کا مسئلہ نہیں تھا۔ کشمیریوں کی بغاوت نہیں تھی۔ رن کچھ کی لڑائی بھی نہیں تھی۔ یہ تو لاہور پر حملہ تھا۔ لاہور سے کچھ دور گاؤں تباہ ہونے کی خبر تھی۔ منشی جی کی ساری سیاسی سوجھ بوجھ غائب ہو چکی تھی۔ زبان پر تالا لگ گیا تھا۔ اسی وقت عبدالرحمٰن ڈبو والا اسکوٹر پر آ پہنچا۔

"میں چلو جا رہا ہوں۔" اس نے اسکوٹر پر بیٹھے بیٹھے کہا۔ "کوئی چلے گا؟"

"میں چلتا ہوں۔" مستری غلام محمد نے فوراً کہا اور جھٹ دکان بند کرنے لگا۔ جانا تو دوسرے بھی چاہتے تھے لیکن مستری غلام محمد کی پھرتی سے مات کھا گئے۔ چشم زدن میں اسکوٹر ہوا سے باتیں کرتا نظروں سے غائب ہو گیا۔

"میں چلوں ڈیوٹی پر۔" خیر دین نے کہا اور چل دیا۔ بھیڑ چھٹ گئی۔ لوگ دوسری جگہ جا کھڑے ہوئے اور منشی جی آہستہ آہستہ اسٹیشن کی طرف چل پڑے۔

راستے میں خلافِ معمول بھیڑ زیادہ تھی۔ لوگ جوش میں بھرے گروہوں میں اسٹیشن کی سمت جا رہے تھے۔ ان کے چہروں پر عزم اور اضطراب کی رمق تھی۔ آنکھوں میں اندرونی کیفیت سے تھرمامیٹر میں پارے کی طرح ہیجان رقصاں تھا۔ ہونٹوں پر غیظ و غضب میں بھرے کلمات تھے۔ وہ جوق در جوق واہگہ کی طرف جا رہے تھے۔ ادھر سے آنے والوں کی بھی کمی نہ تھی۔ لیکن وہ ان لوگوں سے مختلف تھے جو ادھر جا رہے تھے۔ ان کے چہروں پر خستہ دلی کی مہرِ سکوت تھی۔ سروں پر صندوق یا گھریلو سامان اور کپڑوں کی گٹھڑیاں تھیں۔ بہت سے ننگے پاؤں تھے۔ ان میں ننگ دھڑنگ بچے بھی تھے جو اپنی ماؤں کے کرتے تھامے گھسٹتے آ رہے تھے۔ خمیدہ کمر بوڑھے تھے جو زمین پر ماضی کے گم گشتہ نقوش ڈھونڈتے آ رہے تھے۔ جوان مرد کم تھے، جو تھے اس اچانک حادثے نے انہیں وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا۔

مائیں شیر خوار بچوں کو سینے سے چمٹائے اسجانی ان دیکھی منزل کو متوحش نظروں سے ڈھونڈ رہی تھیں۔ مختلف چھوٹے بڑے ٹکڑوں میں بٹا ہوا بے سرو سامانی کا یہ قافلہ اجڑے دیہاتوں سے بکھرے پڑے شہر تک پناہ کی تلاش میں آیا تھا۔

ریلوے اسٹیشن کے آس پاس سڑک کے کنارے گھاس کے تختوں پر پناہ گزینوں کے خاندان کبھی آنے جانے والوں کو حسرت سے تکتے، کبھی آسمان کو فریاد بھری نظروں سے دیکھتے۔ واہگہ کی سمت سے آنے والی بسیں اور پرائیویٹ لاریاں، ٹرک بے سرو سامانی کی حالت میں بھرے گھر چھوڑ کر آنے والوں اور سامان سے لدے آ رہے تھے۔ خالی بسیں، لاریاں اور ٹرک مزید لوگوں کو لانے کے لیے دوڑ رہے تھے۔ سرکاری اور نجی امدادی پارٹیاں پوری شد و مد سے تگ و دو کر رہی تھیں۔ بھارتی حملے سے متاثرہ افراد کو روک کر ان کی بپتا کی تفصیل پوچھتے۔ بعض خدا ترس اور نیک دل ان کے سامنے اپنی جیبیں خالی کر دیتے۔ اور جن کی جیبیں پہلے ہی خالی تھیں وہ ان کی المناک داستانیں اور دل خراش بپتا سن کر آنسوؤں کے نذرانے نذر کر دیتے۔

منشی جی نے تین افراد کے ایک مختصر خاندان کو روک کر پوچھا۔

"بھائی حملہ کتنے بجے کیا گیا، کتنا نقصان ہوا، اب بھارتی فوجیں کہاں ہیں؟"

مرد نے منشی جی کو لحظہ بھر دیکھا اور بولا۔

"بابا جی یہ تو ہمیں بھی پتا نہیں چلا کہ حملہ کتنے بجے کیا گیا۔ وہ تو رات کی تاریکی میں چوروں کی طرح گھس آئے۔ ہماری نیند تو توپوں کے گولوں اور فائرنگ کی آواز سے کھلی۔ جب ہم جاگے تو ہندوستانی ہمارے سروں پر تھے۔ گولے سروں پر آ کر پھٹ رہے تھے۔ سیکڑوں آدمی گولیوں سے چھلنی ہو گئے تھے۔ گھروں کی دیواریں گر چکی تھیں۔ سارا گاؤں تباہ ہو چکا تھا۔ ہمیں تو جوتیاں پہننے تک کی مہلت نہیں ملی۔ باڈر پولیس کے سپاہی اگر ان کے سامنے ڈٹ نہ جاتے تو ہم میں سے ایک آدمی بھی بچ کر یہاں نہ پہنچتا۔" اس نے اپنی بیوی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"میں نے اس کا ہاتھ پکڑا، بچے کو اٹھایا اور اللہ کا نام لے کر چل

پڑا۔ ہمارے بہت سے جوان مقابلہ کرنے کے لیے وہیں رہ گئے۔"
اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ "ہم تو ان ہی بدن کے کپڑوں میں نکل آئے ہیں۔ ہماری نظروں کے سامنے ہمارا گھر جل رہا تھا۔ ہم کچھ بھی تو نہ بچا سکے۔"

منشی جی کا دل بھر آیا۔ انھوں نے عورت کی طرف دیکھا۔ وہ پلّو سے آنسو پونچھ رہی تھی۔ پھر ان کی نظر سال بھر کے بچے پر پڑی وہ ماں کی گود میں ہمک رہا تھا۔ انھوں نے سوچا ان بے گناہ دیہاتیوں کا کیا قصور تھا۔ اس معصوم بچے نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔ انھیں کس جرم کی پاداش میں بربریت کا نشانہ بنایا گیا اور ہنستے اور پُرامن دیہاتیوں کے گھر اجاڑ دیے گئے۔ یہ جنگ کا کیا طریقہ تھا، جس سے سوتے ہوئے غیر فوجیوں پر شب خون مار کر انھیں گولیوں سے بھون دیا گیا۔ خاندان برباد کر دیا گیا۔ ان کی پرامن زندگی میں آگ لگا دی گئی۔ سالہا سال کے آباد خاندانوں کو در بدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر دیا گیا۔ بچوں کو دوسروں کے سہارے پر پلنے کے لیے یتیم کر دیا گیا، عورتوں ــــ کا سہاگ لوٹ لیا گیا۔ چلنے پھرنے سے معذور بوڑھوں کو ٹھوکریں کھانے کے لیے گھروں سے نکال دیا گیا۔ ان کے جنازے کن کندھوں پر اٹھیں گے؟ انھیں کون کفن دے گا؟ بچوں سے ان کی بے نام و نشان قبروں پر فاتحہ پڑھنے کا حق کیوں چھین لیا گیا؟ یہ خانماں برباد عورتیں روٹی کپڑے کے لیے کس کس کا منہ تکا کریں گی؟ ان بچوں کے سروں پر محبت اور شفقت سے کون ہاتھ پھیرے گا؟ یہ کسے باپ کہہ کر پکاریں گے؟ ان کا مستقبل کیا ہو گا؟ کیا حملہ آوروں میں باپ، شوہر اور بھائی کوئی نہ تھا؟ کیا وہ کسی کے بیٹے نہ تھے؟ کیا وہ ننھے منے بچوں کی معصوم مسکراہٹ کی لذت سے نا آشنا تھے؟ ان کے گھروں میں لاٹھیوں کا سہارا لے کر چلنے والے باپ نہیں تھے؟ ان کے شانوں پر سر رکھ کر آخری ہچکی لینے کی خواہش رکھنے والی مائیں نہیں تھیں؟ ان کے ہاتھوں ڈولی چڑھنے کے ارمان رکھنے والی بہنیں نہیں تھیں؟ ان پر زندگی کا دارومدار رکھنے والی بیویاں نہیں تھیں؟ کیا وہ انسان نہیں تھے؟

"بابا! وہ انسان نہیں تھے!" خانماں برباد مرد کہہ رہا تھا۔ "اگر وہ انسان ہوتے تو دوسرے انسانوں سے ایسا وحشیانہ سلوک نہ کرتے۔"

"تم سچ کہتے ہو۔" منشی جی نے ہتھیلیوں کی پشت سے اپنی آنکھیں پونچھیں۔ "وہ تو وحشی درندے تھے۔" پھر وہ چونکے۔ "تم نے تو کچھ کھایا بھی نہیں ہو گا۔ آؤ میرے ساتھ۔"

منشی جی آگے جانے کے بجائے گھر کی طرف مڑے۔ انھوں نے یہیں بہت کچھ سن لیا، بہت کچھ دیکھ لیا تھا۔ مزید سننے کی تاب نہیں تھی، دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔ انھوں نے دوسری جنگِ عظیم بھی دیکھی تھی۔ لیکن ہیکلر فرسفاکی اور بربریت کے مناظر اس میں بھی نظر نہیں آئے تھے۔ اگر جرمنوں اور جاپانیوں نے ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے تھے تو اتحادیوں نے بھی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ انھیں سکندر کے جہاں گداز اور جہاں کُش مناظر یاد آئے لیکن ان میں بھی وحشیوں اور درندوں کا یہی طبقہ محرک تھا جو انسانیت کی تمام سرحدوں کو پیچھے چھوڑ گیا تھا۔ جو آج بھی انسانیت کے زمرے سے باہر تھا۔ ہاں یہی لوگ تھے جو ہلاکو اور چنگیز کو پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ اور آج بھی انھیں مات دینے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں کوشاں تھے۔ کیا یہ ہمیشہ درندگی اور بربریت کے پجاری رہیں گے؟ کبھی انسان نہیں بنیں گے؟

منشی جی کا تعاں تعاں غم و اندوہ کی آگ میں جھلس رہا تھا۔ ان کے دل پر درد اور کرب کی چھریاں چل رہی تھیں۔ ان کا جی چاہتا تھا کہ عالمی امن کے علمبرداروں کے گریبانوں پر ہاتھ ڈال کر پوچھیں کہ ان کی وہ امن کی فاختائیں کہاں ہیں؟ کرۂ ارض کو تباہ کرنے والے شاطروں سے پوچھیں کہ انھوں نے پاکستان کی سرحد پر شطرنج کیوں بچھائی ہے؟ اپنے خونخوار مہروں کا رُخ بے گناہ اور معصوم امن پرستوں کی طرف کیوں موڑ دیا ہے؟

سالہا سال کی اخبار بینی نے منشی جی کے شعور کو صیقل کر دیا تھا۔ ان کی آنکھیں بصیرت کی روشنی سے چمک رہی تھیں۔ ان کے ذہن میں کوئی الجھن نہیں تھی۔ گھر پہنچ کر انھوں نے باہر ہی سے بیوی کو آواز دی۔

"نیک بخت! جلدی سے آٹا گوندھ۔" پھر وہ برتن لے کر دودھ لینے کے لیے چلے گئے۔ دودھ کی دکان پر بڑی گرما گرم بحث ہو رہی تھی۔

"خبردار اگر کوئی لاہور سے باہر گیا۔ مردوں کی طرح جمے رہو۔" دودھ والا پہلوان کہہ رہا تھا۔ "ہندوستانی فوجی ہماری لاشوں پر سے گزر کر آگے بڑھیں گے۔"

"موت آنی ہے تو سات سمندر پار بھی آ کر رہے گی۔" حاجی صاحب بولے۔ "مسلمان موت سے نہیں ڈرتا۔ وہ مرتا ہے تو شہید کہلاتا ہے اور زندہ رہتا ہے تو غازی بن کر۔"

"کون شہر چھوڑنے کو کہہ رہا ہے؟" منشی جی نے پوچھا۔
"کہا تو کسی نے نہیں۔" ایک آواز آئی۔ "لیکن گلبرگ خالی ہو رہا ہے۔ راوی کے پل پر کاریں ہی کاریں جاتی نظر آ رہی ہیں۔"
"گلبرگ والوں کی بات مت کرو۔" منشی جی چمک کر بولے۔ "انھوں نے تو آبِ حیات پی لیا ہے ہمیشہ زندہ رہنے کا پروانہ لے آئے ہیں۔ لیکن اگر وہ یہاں رہیں بھی تو انھیں لڑنا نہیں ہے

وہ بیچارے کیا لڑیں گے؟"

"ٹھیک ہے۔" نظام دین رنگ ساز نے کہا۔ "مسجدوں میں جاتے ہیں تو غریب، دشمن کے سامنے دیوار بن جائیں گے تو غریب۔"

"اور بھئی یہ توپوں اور راکٹوں کی جنگ ہے۔" غفور بٹ نے کہا۔ "تلواروں، نیزوں کی تو ہے نہیں کہ میدان چھوڑ کر بھاگ گئے تو جان بچ جائے گی۔ اگر خدا نخواستہ لاہور پر دشمن کا قبضہ ہوگیا تو پاکستان میں بچا کیا؟" یہ بات سب کو بھا گئی۔ انھوں نے غفور بٹ کو تحسین کی نظروں سے دیکھا اور اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

"لاہور اس تمام گراؤنڈ بنے گا۔" انور شہری دفاع کے رضاکار کی وردی میں ملبوس سائیکل سے اترا۔

"حاجی جی، زندہ دلانِ لاہور دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ اگر ہم نے ہتھیار ڈال دیے تو تاریخ ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔ ہم شہیدانِ وطن کو کیا منہ دکھائیں گے؟" پھر اس نے جوش سے کہا۔

"ہمارا بچہ بچہ بزدل دشمن کے سامنے چٹان بن جائے گا۔ ہم اپنے سینوں پہ گولیاں کھا کر بت پرستوں کو آگے بڑھنے سے روکیں گے۔"

"انشاء اللہ!" حاجی جی نے اسی پُرجوش لہجے میں کہا۔

"نعرۂ تکبیر!" مجمع سے آواز آئی۔

"اللہ اکبر!" محلہ گونج اٹھا۔

"پاکستان!" انور نے نعرہ بلند کیا۔

"پائندہ باد!" جواب ملا۔

"سب لوگ سن لیں۔" انور کو جیسے اپنا فرض یاد آگیا ہو۔ "ہمارے جانباز سپاہیوں نے دشمن کے ناپاک قدم سرحد پر روک دیے ہیں۔ شہر کی حفاظت ہمیں کرنی ہے۔ بندوق، ریوالور، لاٹھی اور کلہاڑی جس کے پاس جو کچھ بھی ہے تیار رکھے۔ ہم گلی کوچوں میں ہندوستانی گیدڑوں کا مقابلہ کریں گے۔ سب لوگ شہری دفاع کے مرکز پہنچ جائیں۔ اپنی حفاظت کے لیے جلد از جلد شہری دفاع کی تربیت حاصل کریں۔ جوان، بچے، بوڑھے سب سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائیں۔ خدا ہمارا حامی و ناصر ہے۔" انور سائیکل پر سوار ہو کر تیزی سے چلا گیا۔

لوگ تتر بتر ہو گئے تو منشی جی نے دودھ لیا اور گھر کی طرف چل پڑے۔

گھر پہنچ کر انھوں نے دیکھا کہ مہمان عورت کمرے میں بیوی اور لڑکی کے پاس بیٹھی انھیں اپنے گاؤں والوں کی دکھ بھری داستان سنا رہی تھی۔ خود بھی رو رہی تھی اور انھیں بھی رُلا رہی تھی۔ اس کا خاوند صحن میں بیٹھا کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ منشی جی نے دودھ کا برتن امینہ کو تھمایا اور بولے۔

"پک گئی روٹی؟"

"ابھی پکا دیتی ہوں۔" امینہ نے کہا۔ "ماں بیٹی تو مہمانوں کی باتوں میں کھو گئی تھیں۔"

"بیٹی جلدی کرو نا۔ بھوک لگ رہی ہوگی بے چاروں کو۔" منشی جی نے کہا اور پھر جیسے انھیں کچھ یاد آگیا۔

"امینہ!" انھوں نے آواز دی۔ اور جب وہ قریب آئی تو آہستہ سے بولے۔

"دو چار جوڑے دے دے بے چاری کو اور میرے بکس سے کرتہ اور تہ بند بھی نکال لا۔" پھر کچھ سوچتے ہوئے بولے۔ "بچے کے کپڑوں کا کیا کریں؟ ٹھہر میں کپڑا لا دیتا ہوں، دو تین کرتے سی دے۔" انھوں نے مہمان کو صحن میں اسی طرح بیٹھا چھوڑ کر باہر کا رخ کیا۔

کچھ دیر بعد وہ پھر بازار میں تھے۔ چہل پہل بدستور تھی۔ دکانیں بھی کھلی تھیں۔ لوگوں میں جوش و خروش اور اضطراب بھی نمایاں تھا۔ لیکن یوں لگتا تھا جیسے شہر کی سرحد پر جنگ نہیں ہو رہی ہے، کوئی نمائش لگی ہے۔ انھوں نے ایک کان سے کپڑا خریدا اور تیز تیز قدموں سے گھر آئے۔ وہ چاہتے تھے

کر جنگ کے ان کی دہلیز تک آنے سے پہلے بچے کے کپڑے سل جائیں۔ سجانے کب کیا ہو جائے۔ بیوی کو روٹی پکانے کی پھر تاکید کر کے انھوں نے کپڑا امینہ کو دے دیا۔ وہ جھٹ مشین لے بیٹھی۔ اور بیوی نے چولھا سنبھالا۔ منشی جی صحن میں آبیٹھے۔

"ہاں بھئی! کیا نام ہے تمھارا؟" انھوں نے تعارف میں میزبان کی حیثیت سے پہل کی۔

"محمد دین۔" جواب ملا۔

"کیا کرتے تھے؟" منشی جی نے پوچھا۔

"زمین تھی جی اپنی۔" محمد دین نے اُداس لہجے میں کہا۔

"ہوں۔" منشی جی جانتے تھے کہ ایک کسان کی متاعِ حیات اس کی زمین ہی ہوتی ہے، وہ چھن گئی تو دُنیا گئی۔ انھیں یہ بھی علم تھا کہ اس صنعتی دَور میں کاشت کار تیزی سے مزدور بنتے جا رہے تھے تاہم یہ ترقی کی کوئی بھی علامت نہیں تھی۔ ذریعۂ معاش اگر فطرت سے ہم آہنگ نہ ہو تو پیٹ تو جوں توں کر کے بھر جاتا ہے لیکن ذہنی آسودگی نہیں ملتی۔ کسان کھلی فضا چھوڑ کر کارخانوں کا دھواں نگلنے لگتا ہے تو کاغذ کا کھوکھلا پتلا بن جاتا ہے۔ لیکن مشینی نظام میں اس سے مفر بھی تو نہیں۔ انھوں نے سر کو جھٹکا دے کر خیالات کا تانا بانا توڑا اور محمد دین کے مستقبل کے متعلق سوچنے لگے۔

روٹی پک گئی تو مہمانوں کے سامنے رکھی گئی۔ محمد دین کی بیوی نے سجانے کیا کھایا لیکن وہ ایک روٹی سے زیادہ نہ کھا سکا۔ کسان زادے کی اتنی کم خوراک دیکھ کر منشی جی سے رہا نہ گیا۔

"پیٹ بھر کر کھاؤ نا محمد دین!" انھوں نے کہا۔

"دل نہیں چاہتا جی۔" محمد دین نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا اور منشی جی چپ ہو رہے۔ انھیں معلوم تھا کہ اس کی بھوک مر جانے کی وجہ کیا تھی؟

"بچے کو جگا کر دودھ پلاؤ۔" انھوں نے پریشان خیالی سے گھبرا کر آواز دی۔

"وہ سال کا دودھ پیتا ہے دوسرا نہیں پیے گا۔" محمد دین نے یاس سے کہا۔

"اگر بچہ نہیں پیتا تو چلئے بنالو۔" انھوں نے پھر آواز دی۔

اسی اثنا میں خیر دین آ گیا۔

"ایک ضروری اعلان ہونے والا ہے ریڈیو پر۔" اس نے علیک سلیک کے بغیر کہا۔

"ہاں اعلان تو ہونا ہی ہے۔" منشی جی کی اخبار بینی کام آئی۔ "سننا چاہیے۔" پھر ان کی نظر محمد دین پر پڑی۔

"یہ بے چارا اُجڑ کر آیا ہے۔" انھوں نے خیر دین کو بتایا "دیکھو کیسی تباہی مچ گئی ہے دیکھتے ہی دیکھتے۔"

"ایک دنیا تباہ ہو گئی ہے منشی جی!" خیر دین نے محمد دین کی طرف ہمدردی سے دیکھ کر کہا۔ "تمام سڑکوں پر گھروں سے اجڑے لوگ بیٹھے ہیں۔" پھر اسے جیسے یاد آیا "گورنمنٹ نے امدادی کیمپ کھولے ہیں۔ سب لوگوں کو وہیں لے جایا جا رہا ہے۔"

"ہاں گورنمنٹ کچھ تو کرے گی ہی۔ انھیں سڑکوں پر چھوڑ تھوڑے ہی دے گی۔" منشی جی نے کہا۔ "کس طرف ہے کیمپ؟"

محمد دین کی آنکھوں میں اُمید کی روشنی جھلکی۔

"پتا چل ہی جائے گا، تم کچھ عرصے یہیں رہو۔" منشی جی اس کے دل کی بات پڑھ کر جلدی سے بولے۔ "آخر ہجرت کے وقت مدینہ منورہ کے انصار نے بھی تو حق ادا کیا تھا۔"

"کہیں تو ٹھکانہ کرنا ہی ہوگا۔" محمد دین اپنے انصاری پر بوجھ بننا نہیں چاہتا تھا۔

"میں پتا کروں گا۔" منشی جی نے کہا۔ "چلو ریڈیو سنیں۔"

تینوں باہر نکلے تو دکانوں پر اعلان سننے والوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے تھے۔ اعلان میں ابھی دیر تھی اور لوگ باتوں میں مصروف تھے۔

"سلامت پورہ اور نئی بستی خالی کرائی جا رہی ہے۔" کوئی کہہ رہا تھا۔

"ہندوستانی فوج جلّو موڑ تک آ گئی۔ گولے شہر میں گر کر پھٹ رہے ہیں۔" کسی نے کہا۔

"ہندوستان نے ہوائی حملہ بھی تو کر دیا ہے۔" ایک آدمی بولا۔

"ہاں لیکن نقصان نہیں ہوا۔ ان کے جہاز بھگا دیے گئے۔ اب تو ہمارے جہاز دشمن پر تابڑ توڑ حملے کر رہے ہیں۔"

اسی وقت ریڈیو پر ہنگامی حالات کا اعلان کیا گیا۔ مجمع پر سکوت طاری ہو گیا۔ اعلان ختم ہوا تو محمد دین نے چپکے سے کسی سے امدادی کیمپ کا پتا پوچھ لیا۔ منشی جی اسے لیے گھر آئے تو وہ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

"تمھیں یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی، محمد دین۔" منشی جی نے سکوت توڑا۔ "جب تک کوئی انتظام نہیں ہوتا، اسے اپنا گھر سمجھو۔"

محمد دین نے بے چارگی سے ان کی طرف دیکھا۔

"آپ کا بڑا احسان ہے جی، خدا آپ کو اس کا اجر دے گا۔" اس نے کہا اور بیوی کو آواز دی۔ امینہ نے اس عرصے میں جلدی جلدی دو کرتے سی لیے تھے۔ وہ اس نے مہمان عورت کو دے دیے۔ منشی جی صندوق میں سے دس روپے کا ایک

نوٹ نکال لائے۔ اور اسے محمد دین کو دیتے ہوئے بولے۔

"اس وقت تو یہی حاضر ہے بھائی! لیکن ضرورت ہو تو آجانا۔ دل میں کچھ خیال نہ کرنا۔"

انھوں نے دیکھا کہ نوٹ لیتے ہوئے محمد دین کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

اس کی بیوی نے بچے کو شانے سے لگا رکھا تھا۔ باہر نکلتے ہوئے بولی۔ "خدا آپ کو خوش رکھے۔ بہت مدد کی ہے دکھیاؤں کی۔"

اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے دیکھ کر منشی جی نے کہا۔ "بہن! دکھ تو اس بات کا ہے کہ میں اپنے بھائی کی مدد کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ میں اپنا فرض پوری طرح ادا نہیں کر سکا۔"

بے چارے گاؤں کے سیدھے سادے لوگ الفاظ کے جادو جگانا کیا جانیں۔ وہ زبان سے کچھ نہ کہہ سکے۔ مگر آنکھیں بہت کچھ کہہ گئیں۔ آگے آگے محمد دین اور اس کے پیچھے اس کی بیوی بچہ اٹھائے، سر پر گٹھری رکھے انسانیت کا ماتم کرتے اپنے پیچھے اس کے علمبرداروں کا نوحہ چھوڑتے آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ منشی جی پلٹے تو ان کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ انھوں نے بیوی اور بیٹی کی طرف دیکھا۔ وہ زار و قطار رو رہی تھیں۔ وہ منشی جی کی طرح غم کے دھاروں کو روک نہ سکی تھیں۔ عورتیں جو ہوئیں۔

"دیکھو نیک بخت،" انھوں نے بیوی کو مخاطب کیا۔ "یہ وقت رونے دھونے کا نہیں ہے۔ یہ جنگ ہے کھیل تماشہ نہیں۔ وہ بھی ایسے دشمن سے جو درندہ صفت ہونے کے علاوہ بزدل اور مکار بھی ہے۔ وہ ہمارے دلیر جوانوں سے میدان میں مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ لیکن دھوکے سے چھپ کر حملہ کرنے میں اس کا جواب نہیں ہے۔ اگر خدانخواستہ ایسی ویسی کوئی بات ہو جائے تو گھبرانا نہیں۔ خدا پر بھروسہ رکھو۔"

بیوی اور لڑکی کو دلاسا دے کر منشی جی پھر باہر نکلے۔ انوری کی بات ان کے دل پر نقش ہو گئی تھی۔ انھوں نے آج تک شہری دفاع کی اہمیت کو محسوس نہیں کیا تھا ——— محکمے کی طرف سے کی جانے والی پبلسٹی پر کبھی دھیان نہیں دیا تھا۔ بلکہ ان سب باتوں کو وہ فضول سمجھتے تھے۔ لیکن آج جب جنگ ان کا دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی تو انھیں خدا پر مکمل بھروسے کے ساتھ اپنے ہاتھ پاؤں کا بھی خیال آیا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ خدا بھی ہاتھ پاؤں ہلانے والوں ہی کی مدد کرتا ہے انھوں نے دو ایک جگہ شہری دفاع کے مرکز کا پتا پوچھا اور پیدل ہی چل پڑے۔

بہاول پور ہاؤس میں محکمے کے مرکز پر جم غفیر تھا۔ سارا صحن کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ زیادہ تر نوجوان تھے جن کے چہرے جوش و خروش سے تمتما رہے تھے۔ آنکھوں میں عقاب جھپٹنے کے لیے پر تول رہے تھے۔ وہ کچھ کر گزرنے کے لیے مچل رہے تھے۔ انھیں اپنی حرکات و سکنات پر اختیار نہ رہا تھا۔ ان کے دلوں میں بپھرے سمندر کی لہریں موجزن نظر آ رہی تھیں۔ صدائے شر وقت کی آواز پر لبیک کہنے کے لیے اُمڈ آیا تھا۔ ان کے لبوں پر ایک ہی عزم کے شرارے رقصاں تھے ... کہ دشمن کو کچل دو۔ میدان میں ہر سو عزم و استقلال کی کھلی کتابیں بکھری نظر آ رہی تھیں، جن کے درمیان منشی جی کا وجود ایک بوسیدہ کتاب کے ملگجے ورق کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن کون کہہ سکتا تھا کہ اس لاغر جسم میں ایک فولاد کی طرح مضبوط دل گڑا ہوا نہیں تھا۔ ان کمزور آنکھوں سے کفر و الحاد کے خرمن کو خاکستر کر دینے والی چنگاریاں نہیں نکل رہی تھیں۔ وہ کپکپاتے ہوئے ہاتھ لادینیت کے قلعے پر کمند پھینکنے کے لیے کتنے بے تاب نہیں تھے۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدم مکر و فریب کی چٹان کو ریزہ ریزہ کرنے کے لیے بار بار اٹھ نہیں رہے تھے۔ ان کے دھنسے ہوئے سینے میں کتنے طوفان موجزن نہیں تھے۔

شہری دفاع کے مقامی حکام قوم کے شاہینوں کے جذبات سے پوری طرح آگاہ تھے۔ انھیں وقت کی نزاکت کا بھی بخوبی علم تھا۔ وہ اس سیل رواں کو زیادہ عرصے انتظار نہیں کرا رہے تھے۔ انھیں جلدی جلدی موٹی موٹی ہدایات دے کر رخصت کیا گیا۔ منشی جی نے ہدایات ذہن نشین کیں اور اپنے محاذ پر روانہ ہو گئے۔

واپسی میں انھیں سماجی بہبود کے مرکز کا خیال آیا۔ وہ گھر

جانے کے بجائے وہاں پہنچ گئے۔ رضاکاروں کی لمبی قطار دور تک چلی گئی تھیں۔ وہ ایک قطار میں کھڑے ہو گئے۔ اس میں وہ بوڑھے بھی تھے جن کے بال برف کے گالوں کی طرح سفید تھے۔ جو بیدِ مجنوں کی طرح کانپ رہے تھے۔ لیکن وہ عمرِ رفتہ کو آواز دیتے ہوئے شاہ بلوط کے درختوں کی طرح سینہ تانے کھڑے تھے۔ وہ بھی عطیۂ خون کی پیش کش کرنے والے رضاکاروں کی صف میں شامل تھے۔ انھیں اس کی قطعاً پروا نہیں تھی کہ ان کے کمزور اور ناتواں جسموں سے نچوڑا ہوا خون پھر کبھی پیدا نہیں ہوگا۔ لیکن انھیں توان جیالوں کو زندہ رکھنے کی خواہش تھی جو محاذِ جنگ پر دشمن کی گولیاں ٹھنڈی کرنے کے لیے اپنا گرم اور تازہ خون بہا چکے تھے

اس قطار میں وہ شوخ و شنگ بانکے سجیلے نوجوان بھی تھے جو کبھی فرائض اور حقوق سے بے پروا رخشِ عمر پر سوار ہوا سے باتیں کرتے تھے جنھوں نے اس سے پہلے مقصدِ حیات پر کبھی سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی جو آفتابِ آزادی طلوع ہونے کے بعد پیدا ہوئے۔ فرط و انبساط کی کرنوں پر جھولتے رہے اور مہتابِ نشاط کی خواب آور ٹھنڈک میں کیف و سُرور کے جام لنڈھاتے رہے وہ ایثار و قربانی کے تصور سے بھی ناآشنا تھے۔ ان کے ذہن تیشہ اور کوہ کنی کے رمز سمجھنے سے قاصر تھے۔ جن کے دلوں کو مغربی تہذیب کی صد سالہ غلامی کی دیمک چاٹ گئی تھی۔ جن کی روحوں کو طلسمِ فرنگی نے گھن لگا دیا تھا۔ جن کے ولولوں اور امنگوں کی تیغوں کو تہذیبِ نو کی ساحری نے زنگ آلود کر دیا تھا۔ طالع آزمائی اور موقع پرستی کے نشے میں چُور آج وہی نوجوان اپنی تہذیب و ثقافت کے ورثے کو اغیار کے پنجے سے نجات دلانے کے لیے دیوانہ وار میدان میں نکل آئے تھے

اس قطار میں مغرب کی وہ نقّال لڑکیاں بھی تھیں جو کبھی بدن پر جالی دار پوستین چڑھائے، چہروں پر بے حیائی کے ملمع کی تہہ لیے کوچہ و بازار میں اپنے بزرگوں کی عزت و ناموس کی دھجیاں بکھیرتی پھرتی تھیں۔ جو نت نئی اداؤں اور دلربائیوں کی گھڑ دوڑ میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے ہر وقت آمادہ رہتی تھیں۔ جن کے بطن سے پیدا ہونے والے بچے مارلن برانڈو اور برجی باردوت تو بن سکتے تھے لیکن طارق بن زیاد اور ابوالجبری بننے کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ آج وہی کافر ادا دوشیزائیں اور موم کی ماہ پارائیں آگ اور خون کے دریا میں کودنے کے لیے گھروں سے باہر نکل آئی تھی۔

منشی جی قوم کے نونہالوں کی اس کج روی پر دل ہی دل میں کُڑھا کرتے تھے۔ راستے میں ٹیڈی لڑکوں اور لڑکیوں کو بے غیرتی اور بے حیائی کے اشتہار تقسیم کرتے دیکھ کر ان کا بوڑھا سرد خون کھولنے لگتا تھا۔ انہیں اشتہاروں کو پھاڑنے نذرِ آتش کرنے کی قدرت نہ تھی۔ اختیار تو صرف اپنی آنکھوں پر تھا۔ وہ انھیں بند کر لیتے۔ لیکن وہ آج اپنی آنکھیں پھاڑے ان قطاروں کو دیکھ رہے تھے۔ ان کا دل مادرِ وطن پر نچھاور ہونے کے لیے بے تاب قطاریں دیکھ کر بلیوں اچھل رہا تھا۔ ان کی دم بہ دم بنیائی سے محروم ہونے والی آنکھیں فرطِ مسرت سے چمک رہی تھیں۔ دل چاہتا تھا کہ ایک ایک لڑکے کو اپنے سینے سے چمٹا لیں۔ ایک ایک لڑکی کی پیشانی پر بوسہ دیں۔ جوش و خروش میں بھرے وطن کے ان سپوتوں بیٹیوں کی راہ میں اپنی آنکھیں بچھا دیں۔ اپنے جسم کی بوٹیوں سے ہار پرو کر ان کی گردنوں میں پہنائیں بلکہ اس بدترین دشمن کو مبارکباد دیں جس نے ان خفتہ روحوں کو جھنجوڑ کر بیدار کر دیا تھا۔

اپنی باری آنے پر انھوں نے رجسٹر میں اپنا نام اور پتا درج کرایا اور ہر قسم کی خدمت کی پیش کش کی۔ نام درج کرانے والے کلرک نے ان کے جھریوں بھرے چہرے پر ایک نظر ڈالی اور ان کی پیش کش کا شکریہ ادا کر کے انھیں گھر جانے کا مشورہ دیا۔ وہ اس بوڑھے مجاہد کا دل توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن وہ مجبور تھا۔ خون دینے اور رضاکار بننے اور امدادی کیمپوں میں کام کرنے کے لیے مضبوط تندرست اور توانا جسم کی ضرورت تھی۔ منشی جی ان مدارج سے گزر چکے تھے۔ لیکن وہ اندرونی محاذ پر لڑنے کی لگن لے کر آئے تھے۔ وہ خون دینا چاہتے تھے اور رضاکار بننا بھی۔ وہ اس سے اُلجھ پڑے۔ ناچار اس نے انھیں طبی امداد کے لیے منتخب کیا اور خون دینے کے لیے ریڈکراس سوسائٹی کے مرکز میں جانے کا مشورہ دیا۔ منشی جی شاداں و فرحاں وہاں سے لوٹے تو ان کے پاؤں زمین پر ٹکتے نہ تھے۔ انھیں اپنی پینسٹھ سالہ ناکارہ زندگی آج کار آمد معلوم ہوئی۔ وہ تھک چکے تھے تاہم ریڈکراس سوسائٹی کے مرکز میں جانا ناگزیر تھا۔ وہاں وہ پہنچے تو پھاٹک سے باہر ہی اتنا ہجوم تھا کہ انھیں راستہ ملنا ناممکن نظر آتا تھا لیکن وہ تو ٹھان کر آئے تھے کہ ناکام نہیں لوٹیں گے۔

بھیڑ کو چیرتے، دھکے کھاتے، ڈگمگاتے اس کمرے تک پہنچے جس کے باہر خون دینے والوں کی قطار لگی تھی۔ اندر ڈاکٹر، میڈیکل کالج کے طلبا و طالبات اور رضاکار لڑکے لڑکیاں تیزی سے کام میں مصروف تھیں۔ وہ کئی سالوں بعد آج

حضرت عمرؓ نے لوگوں کو عورتوں کے ساتھ گھومنے پھرنے کی ممانعت کر دی تھی۔ ایک شخص کو عورتوں کے ساتھ نماز پڑھتے دیکھا تو اس کو دُرّے سے لگائے۔ اس نے کہا "خدا کی قسم! اگر میں نے اچھا کام کیا، تو تم نے مجھ پر ظلم کیا اور اگر میں نے بُرا کام کیا تو تم نے مجھے اس کی اطلاع نہ دی تھی۔ آپ نے فرمایا "کیا تو میری ہدایت کے وقت موجود نہ تھا؟" اس نے کہا "نہیں" آپ نے دُرّہ اس کے سامنے ڈال دیا اور کہا "مجھ سے بدلہ لے لو۔" اس نے کہا "آج نہیں لیتا۔" آپ نے فرمایا "اچھا تو معاف کر دے۔" وہ بولا "معاف بھی نہیں کرتا۔" اس کے بعد دونوں جُدا ہو گئے۔ اگلے دن وہ شخص ملا تو حضرت عمرؓ کا رنگ اُڑا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ "امیرالمومنین! شاید آپ پر میری بات کا اثر ہوا ہے؟" آپ نے کہا "ہاں۔"... اس نے کہا "میں خدا کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نے آپ کو معاف کر دیا۔"

ماخوذ از بنیادی حقوق۔ صلاح الدین۔ ۲۸۹

پیدل چلے تھے۔ زیادہ سے زیادہ بازار ہو آتے یا مہینے میں ایک مرتبہ پنشن کی رقم لینے بڑے ڈاکخانے تک چلے جاتے۔ بہت ہوا تو محلے کی کسی میت کو کاندھا دینے چلے گئے۔ لیکن آج میلوں کی مسافت طے کر چکے تھے۔ ان کی آرزو تھی کہ دشمن کی صف کے سامنے تنہا ہی فصیل بن کر کھڑے ہو جائیں۔ کاش وہ محاذ پر جانے کے لیے چند سے جوان رہتے۔

وہ قطار میں کھڑے کھڑے تھک گئے۔ شام تک باری آنے کی کوئی امید نہ تھی۔ آج وہ خلافِ معمول اس وقت تک بھوکے تھے لیکن بھوک تو روٹھے ہوئے محبوب کے فراق میں نیند کی طرح کوسوں دور تھی۔ تاہم وہ جلد گھر پہنچنا چاہتے تھے۔ انھیں اپنے علاقے کے وارڈن سے آج ہی ڈیوٹی متعین کرانی تھی۔ اس کے علاوہ بیوی اور لڑکی کو بھی کسی نہ کسی محاذ کے لیے تیار کرنا تھا۔ انھوں نے پاس سے گزرتے ہوئے ریڈ کراس کے ایک رضا کار کو روکا اور کہنے لگے۔

"بیٹا! بہت دُور جانا ہے۔ جلدی سے میرا خون لے لو۔"

رضا کار نے ٹھٹک کر ایک نظر اس سوکھے ہوئے ٹنڈ منڈ درخت کو دیکھا اور بولا۔

"بابا جی! خون دینے کے لیے ہمارے نوجوان کافی ہیں۔ آپ گھر جا کر آرام کریں۔"

منشی جی کا دل بجھ گیا۔ انھوں نے عاجزی سے کہا۔

"نہ بیٹا مجھے مایوس نہ کرو۔ بڑی اُمید لے کر آیا ہوں۔ مجھے اس سعادت سے محروم نہ کرو۔"

رضا کار کشمکش و پیچ میں پڑ گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس جذبے کو کیا نام دے؟

"کس سوچ میں پڑ گئے بیٹا؟" منشی جی کی نحیف آواز نے اسے چونکا دیا۔ جیسے کوئی گداگر بھیک مانگ رہا ہو۔ "بہت نہیں تو تھوڑا سا لے لو۔"

"اچھا میرے ساتھ آیئے۔" وہ کچھ سوچ کر بولا۔

منشی جی اس کے پیچھے پیچھے ہو لیے۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے ڈاکٹر سے کہا۔ "اس بوڑھے کو کسی طرح ٹالیں؟ خون دینے پر اصرار کر رہا ہے۔"

ڈاکٹر نے منشی جی کی طرف دیکھا۔ اس خشک زرد پتے میں کیا رکھا تھا؟ تاہم وہ ایثار و قربانی کے اس آبگینے کو ٹھیس پہنچانا نہ چاہتا تھا۔ مسکرا کر بولا۔

"آستین چڑھایئے۔ آپ تو نوجوانوں سے بھی زیادہ کس بل رکھتے ہیں۔"

منشی جی کا سینہ فخر سے تن گیا۔ انھوں نے جھٹ آستین چڑھائی اور ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

ڈاکٹر نے رضا کار کو آنکھ ماری اور سوئی ان کے بازو میں چبھو دی۔

منشی جی کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی لیکن انھوں نے ہونٹ بھینچ کر اسے دبا لیا۔ ڈاکٹر ان سے مختلف سوالات پوچھنے لگا۔ منشی جی مگن تھے کہ ان کا خون لیا جا رہا ہے اور ڈاکٹر مطمئن تھا کہ ان کا دل رکھ لیا ہے۔ بلڈ بینک میں ان کے خون کا ایک قطرہ بھی نہیں گیا۔ لیکن وہ بازو پھیلائے اس زخمی فوجی کا تصور باندھے کھڑے تھے جو دشمن کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے ان کے خون سے تازہ دم ہو رہا تھا۔

یہ ڈراما ختم ہوا اور منشی جی مسرت سے جھومتے ہوئے کمرے سے باہر نکلے۔ ڈاکٹر کی پُرعقیدت نظریں ان کا پیچھا کر رہی تھیں۔ باہر نکل کر انھوں نے ابتدائی طبی امداد کی تربیت دینے کی جگہ دریافت کی لیکن انھیں بتایا گیا کہ وہ اگلے

روز صبح آئیں۔ وہ پیدل ہی گھر کی طرف چل پڑے۔ گھر سے نکلتے ہوئے پیسے لانا بھول گئے بس کا کرایہ کہاں سے دیتے؟

جب وہ لڑکھڑاتے قدموں سے نڈھال گھر پہنچے تو ماں بیٹی ان کے اچانک غائب ہوجانے سے پریشان ہو رہی تھیں۔ بیوی نے تو کچھ نہ کہا لیکن بیٹی پیچھے پڑ گئی۔

"ڈر کے مارے ہمارا کلیجہ کانپ رہا ہے، آپ کہاں غائب ہوگئے تھے۔" امینہ روٹھی سی ہوگئی۔

منشی جی نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اور بولے۔ "بیٹی! میں کسی کام ہی سے گیا تھا۔ لا کچھ کھانے کو دے۔ بھوک لگ رہی ہے۔"

"پریشان کر ڈالا آپ نے! معلوم ہے کہ قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ آپ کو پروا ہی نہیں۔ دل میں طرح طرح کے خیالات آرہے ہیں۔ اماں کا تو بُرا حال ہوگیا ہے۔"

امینہ بڑبڑاتی ہوئی باورچی خانے میں چلی گئی۔ اس نے سالن گرم کیا اور روٹی منشی جی کے سامنے لا رکھی۔ انھوں نے دو چار لقمے کھا کر ہاتھ کھینچ لیا۔ بقول امینہ کے قیامت ٹوٹ پڑی تھی تو کھایا کس سے جاتا؟

وہ رات انھوں نے سخت کرب میں کاٹی۔ دن بھر کی تھکان کے باوجود بوڑھی ہڈیوں کو قرار ایک پل نہ آتا تھا۔ جیتی جاگتی تھیں۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ جوڑ جوڑ میں درد سے ساری رات کراہتے رہتے۔ امینہ کی شامت آجاتی، بدن دباتے دباتے اس کے ہاتھ تھک جاتے لیکن کرب و بلا کی اس رات میں وہ اپنی تکلیف بھول گئے تھے۔ ان کے دل میں ولولوں کی موجیں ٹھاٹھیں مار رہی تھیں۔ وہ صبح کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ غمِ دل اور غمِ روزگار پر غمِ دوراں کی چادر یوں تن گئی تھی جیسے ساری کائنات میں وہی ایک سب کچھ تھی۔ ان کا اپنا وجود اور وطن کی سمت بڑھتے ہوئے انسان کے بحرِ بے کراں میں ڈوب کر روپوش ہوگیا تھا۔ ان کی انفرادیت دکھ درد کے مارے ہمدردی اور مدد کے طالب انسانوں کے ہجوم میں کھو گئی تھی۔

۶ ستمبر ۶۵ء کی صبح کو منشی جی ایک فرد نہیں رہے تھے۔ وہ ملت کی ناقابلِ شکست فصیل کی ایک اینٹ بن چکے تھے جسے نہ دشمن کا شب خون ہلا سکا نہ اس کی یلغار متزلزل کر سکی تھی۔ راتوں رات ایمان و آگہی کی ایک فلک بوس دیوار کھڑی ہوگئی تھی۔ آفتاب کی پہلی کرن نے ارضِ پاک کو بوسہ دیا تو بکھرے بکھرے، پارہ پارہ، تتر بتر افراد ایک قوم کی صورت بیدار ہو گئے تھے۔

علی الصبح اذان کی آواز بلند ہوئی تو منشی جی بستر سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ سارے دن کا پروگرام ان کے سامنے تھا۔ دن چڑھا اور امنگوں کی روشنی چار دانگ پھیل گئی۔ ساری رات کوئی بھی سو نہ سکا تھا۔ اندھی سنسان گلیاں ساری رات جاگتی رہی تھیں۔ بچے جوان بوڑھے ساری رات گلیوں میں پہرہ دیتے رہے۔ حکومت کی طرف سے انھیں خبردار کر دیا گیا تھا۔ مکار اور چالباز دشمن کی طرف سے چوکنا رہنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ کسی وقت بھی اسٹالن گراڈ بننے کا دھڑکا تھا۔ لاٹھی، کلہاڑی، چاقو، ریوالور اور رائفل جس کے پاس جو بھی تھا لیے ارضِ پاک کی حفاظت کے لیے ساری رات گلیوں کوچوں میں پھرتا رہا تھا۔ سائرن کی آواز آتی تو دھڑکنیں تیز ہوجاتیں۔ مدافعت کا جذبہ بیدار ہوجاتا۔ کسی لمحہ بھی ہوائی حملے کے خطرے کے باوجود خوف و ہراس کا شائبہ تک نہ تھا۔ اس کی جگہ جوش و خروش کا طوفان موجزن تھا۔ بچہ بچہ جامِ شہادت پینے کے لیے بے چین تھا۔ بوڑھے فتح و نصرت کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ عورتوں کی زبان پر کلمے جاری تھے۔

منشی جی نے بیوی کو پراٹھے بنانے سے منع کر دیا۔ جب لاکھوں افراد کے منہ سے یک لخت روٹی چھین لی گئی تھی تو وہ گھی میں تر تراتے پراٹھے کیوں کر کھاتے؟ انھوں نے محض چائے کی ایک پیالی پی۔ آج بچوں کو پڑھانے کو جی نہ چاہتا تھا۔ راتوں رات دنیا بدل گئی تھی۔ روشنی کی حفاظت منتہائے حیات بن گئی تھی۔ بچے بھی پڑھنے نہیں آئے۔ انھوں نے کپڑے تبدیل کیے اور بازار میں آگئے۔

مستری غلام محمد ہاٹلی پور کا آنکھوں دیکھا حال سنا رہا تھا۔ منشی جی کچھ دیر اس کے پاس کھڑے رہے پھر وارڈن پوسٹ چلے گئے۔ محلے کے کئی آدمی جمع تھے۔ اور وارڈن انھیں شہری دفاع کا پروگرام بتا رہا تھا۔ ایک دن میں سو کے لگ بھگ رضاکار بھرتی کیے جاچکے تھے۔ امدادی فنڈ قائم کر دیا گیا تھا عطیات جمع کرنے کا پروگرام بنایا جارہا تھا۔ شہری دفاع کے مرکز سے لوگوں کو تربیت دینے کے لیے انسٹرکٹروں کی خدمات حاصل کرلی گئی تھیں۔ طبی امداد کا سامان خرید لیا گیا تھا۔

منشی جی حیران تھے کہ ایک ہی دن میں یہ سب کیسے ہو گیا تھا۔ ان کی ایک دن کی غیر حاضری میں سارا محلہ مدافعت کے لیے کیل کانٹوں سے لیس ہوگیا تھا۔ انھوں نے بھی وارڈن کو اپنی خدمات پیش کردیں۔ ان کا نام عطیات جمع کرنے والوں کی فہرست میں شامل کیا گیا۔ اس کام کے لیے قابلِ اعتماد اور بزرگ افراد درکار تھے جن کا محلے میں اثر و رسوخ تھا۔ منشی جی بھی قابلِ احترام ہستیوں میں سے تھے۔ وہ اس اعزاز میں پھولے نہ سماتے۔ اب

انھیں کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ انھیں اپنا محاذ مل گیا تھا۔ وہ بے مصرف نہیں سمجھے گئے تھے۔ وہیں انھیں معلوم ہوا کہ اپوا نے بھی امدادی اور سماجی بہبود کے کاموں کا ایک مرکز کھولا ہے۔ اس میں مجاہدین اور فوجیوں کے لیے سامانِ ضروریات اور تحائف جمع کرنے کا کام بھی ہوگا۔ اور بے گھر افراد کو کپڑے وغیرہ مہیا کرنے کا پروگرام بھی۔ منشی جی وارڈن پوسٹ سے جلدی سے نکلے اور گھر کی طرف روانہ ہوئے۔

"امینہ!" گھر میں داخل ہوتے ہی انھوں نے آواز دی۔

امینہ نلکے پر بیٹھی کپڑے دھو رہی تھی۔

"بیٹی تیار ہو جاؤ۔" انھوں نے پھولی ہوئی سانس سے کہا۔ "تمھیں بھی اب کام کرنا ہے۔"

امینہ کے ہاتھ رُک گئے۔ وہ سر گھما کر انھیں دیکھنے لگی۔ کیسا کام؟ وہ سوچ رہی تھی۔ کام تو وہ کرتی رہتی تھی۔ بے کار کب رہتی تھی۔

"مہاجرین کے لیے کپڑے سینے ہیں۔ دوسرا بھی بہت کام ہے۔ میرے ساتھ چلو۔" منشی جی نے کہا۔

"کہاں لے چلے؟" بیوی نے پاس آکر پوچھا۔

"میں نہیں چاہتا کہ امینہ اس نیکی سے محروم رہ جائے۔ میں اسے اپوا کے مرکز میں لے جا رہا ہوں۔"

"وہ کہاں ہے؟" بیوی کو کیا معلوم اپوا کیا بلا ہے۔

"جیل روڈ پر ہے۔ امینہ دن بھر وہاں رہے گی۔ شام کو آجائے گی۔ امینہ بیٹی! روٹی لے لو۔"

"اے ہے، کنواری لڑکی کو کہاں چھوڑنے جا رہے ہو؟ وہ تو گھر سے باہر اکیلی کبھی گئی نہیں۔" بیوی نے احتجاجاً ناک پر انگلی رکھی۔

"تو تم بھی ساتھ چلو۔ تمھارے لیے بھی کوئی نہ کوئی کام نکل آئے گا۔" منشی جی نے برجستہ کہا۔ پھر بیوی کو کشمکش و پیچ میں دیکھ کر بولے۔ "کس سوچ میں پڑ گئیں نیک بخت؟"

"گھر میں آٹا بالکل ختم ہو گیا ہے۔" بیوی نے آہستہ سے کہا۔ "صبح پڑوس سے مانگا تھا۔ آپ کل کچھ دے کر بھی نہیں گئے۔ پکایا بھی نہیں تھا۔"

منشی جی کو یوں لگا جیسے شاہی مسجد کے مینار سے انھیں نیچے کھینچ لیا گیا ہو۔ بیوی کی ذہنی پستی نے ان کے دل کو کچل کر رکھ دیا۔ لیکن وہ خاموش رہے۔ عورت ذات ہے۔ اسے موقع کی نزاکت کا علم ہے نہ جنگ اور تباہی و بربادی کا اندازہ۔

"اچھا آٹا لا دیتا ہوں روٹی پکا لو۔" وہ کمرے میں گئے اور صندوق کھولنے کو تھے کہ خیال آیا کہ اس میں تو کچھ بھی نہیں۔ آخری دس روپے کا نوٹ تو وہ محمد دین کو دے چکے تھے۔ پنشن کی رقم ملنے میں ابھی تین دن باقی تھے۔ قرض انھوں نے آج تک نہیں لیا تھا۔ ان کے حساب سے دس روپے تین دن کے لیے کافی تھے۔ ان کے ہاتھ رُک گئے۔ صندوق بند کیا اور پلٹنے لگے تو انھیں جیبی گھڑی کا خیال آیا۔ یہ کلرکی کے زمانے کی یادگار تھی۔ پچیس سال سے دل کی دھڑکن کی طرح جیب میں ٹک ٹک کر رہی تھی۔ اتنی تو امینہ کی عمر بھی نہ تھی۔ لیکن اسے جدا کرنے کے سوا چارہ نظر نہ آتا تھا۔ کھوکھلی زندگی کا پلستر اُتر چکا تھا لیکن قلعی باقی تھی۔ گرتی ہوئی چار دیواری کو باہر سے سفید رکھنا ضروری تھا۔ سفید پوشی زندگی اور موت کا سوال بن چکی تھی۔ انھوں نے گھڑی لی اور چپکے سے باہر چلے گئے۔

سڑک پر آکر انھوں نے سوچا کہاں جائیں؟ محلے میں کسی کے ہاتھ فروخت کرنے سے ڈوب مرنا بہتر تھا۔ انھوں نے دوسرے بازار کا رُخ کیا۔ راستے میں سوچنے لگے کہ اگر بیوی نے پوچھا تو کیا کہیں گے؟ کہہ دیں گے گم ہو گئی ہے۔ انھوں نے فیصلہ کیا۔ اس گئے گزرے زمانے میں بھی ان کے اندازے کے مطابق گھڑی کی قیمت پچاس روپے سے کم نہیں تھی۔ ایسی گھڑی اب ملتی کہاں ہے؟ پچیس سال میں ایک دن بھی خراب نہیں ہوئی۔ ایک منٹ بھی آگے پیچھے نہیں رہی۔ ان کا دل سالہا سال کے اس ساتھی کو جدا کرتے ہوئے بھر آیا۔ یوں لگتا تھا جیسے بیوی کو کندھا دے رہے ہوں۔ لیکن مجبوری آڑے تھی۔ پھر اچانک جیسے کسی نے ان کے زخم پر پھاہا رکھ دیا۔ رات ہی رات میں ہزاروں افراد سے بھرا بھرا گھر اور گھر کی ہر چیز چھوٹ گئی تھی۔ زمینیں گئیں بال بچے چھوٹ گئے۔ دربدر کی خاک چھاننے پر مجبور ہو گئے۔ بہت سے ہاتھ پاؤں سے بھی گئے، عمر بھر کے لیے ناکارہ ہو گئے۔ آخر وہ بھی تو انسان تھے۔ ان میں بھی کئی منشی جی تھے۔ ان کے دل میں اُمڈتا ہوا لاوا اچانک رُک گیا۔ انھیں سکون مل گیا۔

گھڑی کے تیس روپے ملے۔ روپے جیب میں ڈال کر سیدھے ڈپو پہنچے، دس سیر آٹا لیا۔ باقی پیسے جیب میں رکھے ہی تھے کہ انور آ پہنچا۔ کہنے لگا۔

"اچھا ہوا منشی جی! آپ بھی یہیں مل گئے۔ ہم لوگوں نے مہاجرین کو روٹی کھلانے کا پروگرام بنایا ہے۔ کارپوریشن کے اسکول میں جو لوگ ہیں نا، انھیں روزانہ ایک دیگ چاول اور آٹا وغیرہ دے رہے ہیں۔ یہ حاجی جی کی نگرانی میں ہو رہا ہے۔ اس کے لیے چندے کی ضرورت ہے۔ آپ بھی اس کارِ خیر میں

حصہ لیں۔"

منشی جی نے اس سے آگے کچھ نہ سنا۔ ان کا ہاتھ جیب میں گیا۔ ان کی نظروں کے سامنے محمد دین کا اجڑا ہوا گھر گھوم گیا۔ جیب میں بیس روپے باقی تھے وہ انھوں نے انور کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

"جزاک اللہ منشی جی!" انور نے مسرت سے کہا۔ "ہاں بھئی عبدالرحمن! تمھارا کیا ارادہ ہے؟"

"میں روزانہ ایک بوری آٹا دوں گا۔" عبدالرحمن ڈپو والے نے کہا۔ "چاول کا اسٹاک کم ہے ورنہ..."

"مرحبا!" انور کے منہ سے نکلا۔ "ہاں تو منشی جی! آپ کام شروع کر دیں۔ آج شام ہی ایک دیگ بھیجنی ہے۔"

"بہت اچھا کر رہے ہو بیٹا!" منشی جی نے کہا۔ "خدا تمھیں اجر دے گا۔" انور کا سر فخر سے اونچا ہو گیا۔

منشی جی آٹے کی پوٹلی لیے گھر چل دیے۔ تین دن اگر روٹی روکھی کھا لیں گے تو مر نہیں جائیں گے۔ انھوں نے خود سے کہا۔

گھر پہنچ کر پوٹلی باورچی خانے میں رکھی تو بیوی نے کہا۔ "اور گھی؟ وہ بھی تو ختم ہو گیا ہے۔"

"لکڑیاں بھی آج ہی کی رہ گئی ہیں ابا!" پاس سے امینہ بولی۔

"اللہ مالک ہے۔" منشی جی نے اعتماد سے کہا۔ "تم اب جلدی سے تیار ہو جاؤ۔"

وہ صحن میں نکل آئے اِدھر اُدھر نظر ڈالی۔ مرغیوں کا پرانا ڈربہ ایک کونے میں نہ جانے کب سے پڑا تھا۔ اچھا ہی ہوا جو نیا ڈربہ بنوانے کے بعد اسے پھینک نہیں دیا۔ انھوں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا اور ہتھوڑا لے کر ڈربہ توڑنے بیٹھ گئے۔ دو چار دن تو ایندھن کا کام دے جائے گا۔ پھر پیسے مل جائیں گے۔

روٹی پک گئی تو ماں بیٹیاں تیار ہونے لگیں۔ منشی جی نے اچار سے روٹی کھائی۔ گھر پر تالا لگایا اور نکل پڑے۔ گلی کے موڑ پر پہنچے ہی تھے کہ مائی تندور والی نے آواز دی۔

"لاہور سے جا رہی ہو کیا امینہ کی ماں؟"

منشی جی ٹھٹک کر بولے۔ "نہیں مائی جانا کہاں ہے کچھ کام ہے۔"

"میں سمجھی تم لوگ بھی بھاگ رہے ہو۔" مائی ہنستے ہوئے بولی اور منشی جی کا قافلہ آگے بڑھ گیا۔ گلی سے نکلے تو مستری غلام محمد کی نظر ان پر پڑ گئی۔ وہیں سے چلایا۔

"کدھر منشی جی! سارا کام اٹکا پڑا ہے۔"

"ابھی لوٹ آؤں گا بھائی!" اپنی اہمیت دیکھ کر انھیں بڑی مسرت ہوئی۔ "ذرا لڑکی کو اپوا کے دفتر چھوڑ آؤں۔"

مستری غلام محمد کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ لڑکی کو اپوا کے دفتر میں کیوں چھوڑنے جا رہے ہیں۔ وہ ہنسنے لگا۔ شاید منشی جی گھر والوں کو کسی محفوظ مقام پر پہنچانے جا رہے ہیں! اس نے سوچا اور طنز سے سر ہلا کر اپنے کام میں لگ گیا۔ جیل روڈ دور تھا اور منشی جی کی جیب خالی تھی۔ وہ بیوی اور لڑکی کو پیدل لے جانے پر مجبور تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ اپوا کا دفتر کتنی دور ہے تاہم وہ برقعوں میں لپٹی ان کے پیچھے چلی جا رہی تھیں۔ کسی انجانی منزل کی طرف ان کہی داستانیں سننے، ان دیکھی وارداتیں دیکھنے۔ منشی جی انھیں جس مشن پر لیے جا رہے تھے وہ ان کے فہم و ادراک کے دائرے سے باہر تھا۔ وہ زیادہ پیدل چلنے کی عادی نہیں تھیں لیکن جا رہی تھیں۔

اپوا کے مرکز کے قریب پہنچ کر منشی جی رُک گئے اور امینہ سے کہنے لگے۔ "بیٹی! ماں کو لے کر اندر چلی جاؤ۔ وہاں بہت سی عورتیں ہوں گی، کہنا کہ میں مہاجرین کے لیے کپڑے سینے آئی ہوں۔" پھر وہ بیوی سے مخاطب ہوئے۔

"تم بھی کوئی نہ کوئی کام لے لینا۔ بہت کچھ ہے کرنے کے لیے۔ میں شام کو تمھیں لینے آؤں گا۔" وہ انھیں مرکز میں داخل ہوتے دیکھتے رہے۔ جب نظروں سے اوجھل ہو گئیں تو پلٹے۔

گھر میں داخل ہوئے تو در و دیوار سائیں سائیں کر رہے تھے۔ اداسی کونے کونے سے جھانک رہی تھی۔ صحن میں مرغیاں ویران نظروں سے گھر والوں کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ منشی جی اس فضا سے مانوس نہیں تھے۔ وہ مدت سے گھریلو زندگی گزارنے کے عادی تھے۔ معاً انھیں خالی جیب کا خیال آیا۔ کچھ نہ کچھ بندوبست تو کرنا ہی تھا۔ بیوی اور لڑکی کو واپس لانے کے لیے بس کا کرایہ بھی نہ تھا۔ دن بھر کی تھکی ہاری ہوں گی، اتنی دور پیدل کیسے آئیں گی؟ انھوں نے اِدھر اُدھر دیکھا، نظریں صحن پر جم گئیں۔ لپک کر باہر نکلے اور سیدھے تندور پر پہنچے۔

"مائی! فتح محمد کہاں ہے؟" انھوں نے پوچھا۔

"کہیں کھیل رہا ہو گا۔" اس نے تندور سے روٹی نکالتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔" منشی جی فتح محمد کی تلاش میں نکلے۔ وہ واقعی دوسری گلی میں کھیل رہا تھا۔

"فتح محمد میرے ساتھ آؤ۔" فتح محمد انھیں دیکھ کر سہم گیا۔ بڑی مشکل سے پڑھائی سے جان چھوٹی تھی۔ کہیں منشی جی پڑھانے نہ بیٹھ جائیں۔

گھر پہنچ کر انھوں نے ڈربے میں ہاتھ ڈالا اور دو مرغی

تازی مرغیاں نکال لیں۔ کچھ دیر انھیں دیکھتے رہے۔ وہ انھیں کس چاؤ سے پال رہے تھے۔ ان کی موت کے خواہاں اسی وقت ہوتے جب اس کے سوا چارہ نہ رہتا۔ ورنہ ان کا بس چلتا تو وہ کبھی کوئی مرغی ذبح نہ کرتے۔

"فتح محمد!" انھوں نے دکھی لہجے میں کہا۔ "انھیں جاکر بیچ آ۔ خبردار اپنے محلّے میں کسی کو نہ دینا۔ دوسرے محلے میں لے جا اور دیکھ دونوں کے سات آٹھ روپے سے کم نہ لانا۔" ان کے شاگردوں میں فتح محمد سب سے زیادہ تیز طرار تھا۔ اسی لیے انھوں نے اس کام کے لیے اسے منتخب کیا تھا۔

فتح محمد مرغیاں بغل میں دابے چلا گیا تو وہ ٹکٹکی باندھے ڈربے کو دیکھتے رہے۔ پھر اُٹھ کر چارپائی پر دراز ہو گئے۔ کچھ دیر بعد فتح محمد آ گیا۔ اور وہ اُٹھ بیٹھے۔

"منشی جی! پانچ روپے ملے ہیں۔" اس نے ڈرتے ڈرتے بتایا۔ "کوئی لیتا ہی نہیں تھا۔ سب مجھے مرغی چور سمجھتے تھے۔ بڑی مشکل سے ہوٹل والے خان کو دے کر آیا ہوں۔"

"لا پانچ ہی دے۔" انھوں نے فتح محمد سے روپے لیے۔ "پر دیکھ کسی کو بتانا نہیں۔ ٹھہر کر چھٹی لے جانا۔"

فتح محمد چھٹی لینے کے نشے میں بھاگتا ہوا چلا گیا۔ انھوں نے دروازہ بند کر لیا اور لیٹ گئے۔

دوپہر چڑھی، ڈھلی اور سہ پہر ہو گئی۔ منشی جی اٹھے۔ انھوں نے آج ہی ظہر کی نماز نہیں پڑھی تھی۔ مسجد میں جاکر عصر کے ساتھ قضا پڑھی اور بس اسٹاپ پر پہنچ گئے۔ بس میں شہری مسافروں سے کہیں زیادہ وہ دیہاتی تھے جو حملے سے متاثر ہوئے تھے۔ ہر شخص دشمنوں کے غیر انسانی ظلم و ستم کی ایک نئی داستان سنا رہا تھا۔ ہر زبان پر بارڈر پولیس اور رینجرز کے حیرت انگیز کارناموں کی کہانیاں تھیں۔ ہر شخص پاکستانی فوج کے جیالوں کی اولوالعزمی اور فقیدالمثال جرأت کا سفیر تھا۔ ان دیہاتیوں کے دل اپنے دکھوں اور بپتاؤں کی آگ میں سلگ رہے تھے لیکن آنکھیں وطن کے پاسبانوں کے تذکرے سے چمک رہی تھیں۔ ان کے سرفرازیوں کے کارناموں پر فخر سے تن جاتے تھے اور شہیدوں کے احترام میں عقیدت سے جھک جاتے تھے۔ ان کے چہرے وہ آئینے تھے جن میں ہر شخص اپنے جذبات کا رنگ بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ وہ آنسوؤں اور مسکراہٹوں کا حسین امتزاج نظر آتے تھے۔ ان کی خستہ دلی کا کہیں نشان نظر نہ آتا تھا۔ وہ اپنی اپنی المناک داستانیں سنا رہے تھے۔ لیکن ان میں احساسِ محرومی کا پرتو کہیں جھلکتا دکھائی نہ دیتا تھا۔ کہیں ناامیدی کی سیاہی نظر نہ آتی تھی۔ ان کی باتیں سن کر منشی جی کو اپنے رگ و پے میں بجلیاں سی دوڑتی محسوس ہوتی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے سینے میں سیماب بھر دیا گیا ہے۔ ان کی جھریاں تن گئیں۔ وہ سالہا سال سے اخبار چاٹ رہے تھے۔ لیکن ان کی نظروں سے وہ الجزائر کہاں چھپا ہوا تھا، جو آج وطن کے گلی کوچوں میں نظر آ رہا تھا۔ وہ ویت نام کے محیرالعقل کارناموں پر سر دھنتے رہے تھے۔ لیکن آج ویت نام افق کے پار جا چھپا تھا اور شعور کی شفق میں سنہری ارضِ مقدس جگمگا رہی تھی۔

سب کچھ تیزی سے گزر گیا۔ منشی جی کی منزل آ گئی اور وہ بس سے اتر گئے۔ اپوا کے دفتر میں انھیں بیوی اور لڑکی کو تلاش کرنے میں دیر نہ لگی۔ وہ ان کی منتظر ہی تھیں۔ امینہ کا چہرہ کسی اندرونی مسرت سے تمتما رہا تھا۔ وہ اس احساس سے پھولی نہ سما رہی تھی کہ گھر میں بیٹھنے والی ایک بے مصرف عورت کی زندگی بھی بڑی حد تک کارآمد ثابت ہوئی تھی۔ وہ بھی دوسرے انسانوں کے کام آئی ہے۔ وہ سڑک پر آکر بس کا انتظار کرنے لگے تو امینہ کہنے لگی۔

"ابا! آپ ہمیں کچھ دے کر بھی نہیں گئے۔ فنڈ جمع ہو رہا تھا بڑی شرم آ رہی تھی۔ دوسری عورتوں نے نوٹوں کے ڈھیر لگا دیے۔ دن بھر عورتیں کپڑوں کی گٹھریاں اور زیورات کی پوٹلیاں لے کر آتی رہیں۔ کئی عورتوں نے وہیں کھڑے کھڑے اپنے تمام زیورات اتار کر جمع کرا دیے۔ بہت سی بوڑھی عورتیں حج کے لیے جمع کی ہوئی رقم لے آئی تھیں۔ کئی عورتوں نے اپنی لڑکیوں کا سارا جہیز فنڈ میں دے دیا۔ چھوٹی چھوٹی بچیوں کو اپنے کانوں کی بالیاں اتار کر دیتے دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔ مجھے رونا آ رہا تھا۔ میرے پاس ہاتھوں کی دو چوڑیوں کے سوا کیا تھا۔" وہ خاموش ہو گئی۔ منشی جی خلا میں گھورتے رہے۔ کلرکی کے زمانے میں انھوں نے بیوی کا تھوڑا بہت زیور بنوایا تھا۔ لیکن وہ چوری ہو گیا۔ اس کے بعد پھر ہمت نہ ہوئی۔ پنشن سے خاک زیور بنتا۔ بیوی کے اصرار پر امینہ کے لیے دو سونے کی چوڑیاں بن گئی تھیں۔ یہی اس کی کائنات تھی۔ وہ انھیں سنبھال سنبھال کر رکھتی۔ کہیں جانا پڑتا تو پہن لیتی پھر صندوق میں مقفل کر دیتی۔ اسے معلوم تھا کہ ان دو چوڑیوں کے سوا اس کی قسمت میں اور کچھ نہ تھا۔

اچانک منشی جی چونک پڑے۔

"بیٹی!" انھوں نے ہولے سے کہا۔ "تمھارے پاس چوڑیاں تو تھیں وہی دے دیتیں۔ اللہ اور دے دیتا۔"

امینہ نے برقعے میں سے اپنی دونوں خالی کلائیوں کو سامنے کر دیا۔

فرہاد علی تیمور

چھیڑ خوباں، فسانۂ دلبراں

ایک انوکھے طلسم خانے کا احوال

شورہ پشتوں کی سرگزشت

ٹیلی پیتھی کے ساحر فرہاد علی تیمور کی خود نوشت۔

میں نے ٹیلی پیتھی کا علم کیا حاصل کیا طوفانوں کو گلے لگالیا۔ زلزلے ہمسفر ہو گئے۔ بے شمار ہاتھ میرے لیے دعاؤں میں مصروف ہو گئے اور ان گنت شکاریوں نے میری گھات میں پھندے لگا دیے۔ بڑے بڑے ناموں سے زور آزمائی ہونے لگی۔ دو بین الاقوامی تنظیمیں بھی میرے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے لگیں۔ سونیا، رومانہ اور رسونتی جیسی بے مثل عورتوں نے میرے گرد حصار قائم کر دیا۔ میں ٹیلی پیتھی کا سحر پھونک رہا تھا اور ستارے میرا ساتھ دے رہے تھے۔ رومانہ مجھ سے بچھڑ گئی تو میں پاکستان آگیا۔ یہاں چند ملک دشمنوں سے پنجہ لڑانے کے دوران ایک فولاد صفت لڑکی مرجانہ جو لڑائی کے تمام جدید فنون سے آراستہ تھی میری دوست بن گئی۔ میں نے اس کی ماں کے دشمنوں کے خلاف اس کی مدد کی تو جلال بیگ نامی ایک ننگِ قوم مجھ سے ٹکرا گیا۔ وہ اسرائیلیوں کا ایجنٹ تھا۔ اسے خاک میں ملایا تو یہودیوں سے ٹھن گئی۔ انھوں نے میری بیوی رسونتی کو میرے خلاف بھڑکا دیا اور میرے بیٹے پارس کو چھین لینے کے درپے ہو گئے۔ اپنی بہن شاہینہ کے شدید اصرار پر میں نے سونیا سے شادی کا پروگرام بنایا مگر یہودیوں نے ہمیں اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہونے دیا۔ وہ اس طرح رسونتی کو اپنا دوست بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ یورپ کے ایک پہاڑی علاقے میں نئی

نسل کو روحانی طور پر لانے کی جنگ و دو میں مصروف بابا واسطی مجھ پر مہربان ہو گئے۔ انھوں نے اپنی ایک شاگرد اعلیٰ بی بی کو میری حفاظت پر مقرر کر دیا۔ اعلیٰ بی بی دراصل میری بچھڑی ہوئی محبوبہ سائی تھی۔ اس نے میرا بڑا ساتھ دیا۔ یہودی جب کسی طرح مجھے اپنا آلۂ کار نہ بنا سکے تو انھوں نے میرے قتل کا حکم صادر کر دیا۔ یوں دنیا کے بہترین جنگجو مجھے قتل کرنے کے لیے میرے پیچھے لگ گئے۔ رنگون میں میرا ان سے زبردست مقابلہ ہوا۔ ان میں سے کئی ناکام واپس وطنوں میں لوٹ گئے۔ وہیں ایک قاتل سے زور آزمائی کے دوران روحانہ کی ہم شکل کم سن یوئی میری گرویدہ ہو گئی اور وہیں میری ملاقات مرجانہ کے استاد واشورو کی سے ہوئی۔ میں نے یوئی کو اس کی شاگردی میں دے دیا۔ اعلیٰ بی بی کی ایک ساتھی منجالی زہریلی لڑکی تھی۔ اس نے رسونتی کو اپنا تھوک کھلا کر مفلوج کر دیا۔ دنیا بھر کے ڈاکٹر رسونتی کی یادداشت واپس نہ لا سکے۔ سونیا بابا فرید واسطی کی تربیت گاہ میں زیرِ تربیت تھی۔ ایک رات میرا اور اعلیٰ بی بی کا دشمن سے سخت معرکہ ہوا۔ ہم گھنے اور ویران جنگل میں بھٹک گئے۔ وہاں سے میں نے سونیا کے دماغ میں جھانکا تو اس انکشاف نے مجھے لرزا دیا کہ دشمنوں نے کسی طرح بابا صاحب کو اغوا کر کے ان کی جگہ ایک بہروپیے کو بٹھا دیا تھا۔ وہ سونیا کو بھی ایک سرنگ کے ذریعے اغوا کر کے لے جاتے لیکن میں نے بروقت بابا صاحب کے طلبا کے ذریعے یہ منصوبہ ناکام بنا دیا۔ میری مداخلت سے بابا صاحب کو بھی دشمن کی قید سے نجات مل گئی مگر جب وہ اپنی اقامت گاہ لائے گئے تو ان کی حالت بہت خراب تھی۔ انھوں نے اعلیٰ بی بی کو فوراً طلب کیا تھا۔ رسونتی اب کچھ کچھ میری طرف مائل ہونے لگی تھی۔ واشورو کی نے میرے دشمن شیو کا نیپالی کو بڑی عبرت ناک موت سے دوچار کر دیا۔ میں نے یوئی کی تربیت اس کے ذمے کر دی۔ اعلیٰ بی بی کو ائیرپورٹ پر رخصت کرنے پہنچا تو اس کی روانگی کے بعد وہیں ایک ریستوران میں اس اندھے قاتل سے ٹکراؤ ہو گیا جسے یہودیوں نے شیو کا کے بعد میرے قتل کا کام سونپا تھا۔ میں نے اس شہر کے یہودی ایجنٹوں کے دماغوں تک رسائی حاصل کر کے انھی کی ایک ساتھی فلورا کے ذریعے اندھے کو قتل کرانا چاہا لیکن وہ اندھا بیناؤں سے زیادہ بینا تھا۔ اس نے فلورا کا کام تمام کر دیا۔ وہ جان گیا تھا کہ فلورا کو میں ہی اس تک لایا تھا۔ انھوں نے مجھ پر زمین تنگ کر دی۔ میں رسونتی کے ساتھ اپنی پناہ گاہ سے نکل آیا۔ میرے چاروں طرف پہرے بٹھا دیے گئے۔ وہاں کی پولیس بھی انھی کی ہمنوا تھی۔ میں بے بس تماشائی بن کے رہ گیا تھا۔ بابا فرید واسطی کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ انھوں نے آخری وقت میں رسونتی کی یادداشت اسے لوٹا دی۔ صحت مند ہوتے ہی وہ پارس کے لیے مچلنے لگی۔ یہودیوں نے موقعے سے فائدہ اٹھا کر اسے مجھ سے بدظن کر دیا اور نقلی پارس کو اس کے پاس پہنچا کر اسے یہ یقین دلا دیا کہ وہی اس کا بیٹا ہے جسے میں اس سے دور رکھنے کے لیے نقلی پارس کہہ رہا ہوں۔ رسونتی میرا ساتھ چھوڑ گئی۔ اعلیٰ بی بی بابا صاحب کی آخری رسومات میں شرکت کے لیے جا رہی تھی۔ منجالی میرے پاس پہنچ چکی تھی مگر ابھی میں اس سے مل نہیں سکا تھا۔ پاسں انجلو نے اس کی رہائش کا بندوبست کر دیا تھا۔ دوسری طرف سونیا اور مرجانہ بابا فرید واسطی کی وصیت کے مطابق اصلی پارس کی حفاظت کا کام انجام دے رہی تھیں۔ انھوں نے ایک خصوصی طیارے کے ذریعے پارس کو محفوظ مقام تک پہنچانے کا پروگرام بنایا۔ سونیا پارس کو لے کر طیارے میں روانہ ہوئی لیکن پرواز کے دوران معلوم ہوا کہ طیارہ دشمن کے کنٹرول میں ہے۔ انھوں نے اصل پائلٹ کو ختم کر کے اس کی جگہ اپنا آدمی بٹھا دیا تھا جس نے ہزاروں فٹ کی بلندی پر جہاز کو تباہ کر کے رسونتی اور پارس کی موت کا سامان کر دیا۔ طیارے کی تباہی نے مجھے دہلا ڈالا۔ میں نے گھبرا کے سونیا کے دماغ میں چھلانگ لگائی تو معلوم ہوا کہ وہ کہیں آرام سے بیٹھی قہقہے لگا رہی تھی۔ وہ خوش تھی کہ اس نے یہودیوں کو ان کی چال لوٹا دی تھی۔ اس نے دشمن ہی کی ایک عورت کو اپنے میک اپ میں جہاز میں سوار کر دیا تھا اور خود اس عورت کے میک اپ میں پارس کو ساتھ لے کر دشمن کے ساتھ روانہ ہوئی تھی۔ ایک ہنگامہ خیز سفر کے بعد وہ پیرس پہنچی اور پارس کو سائرہ بانو کی خفیہ کمین گاہ تک پہنچا دیا۔ منجالی رنگون پہنچی تو اس نے آتے ہی اندھے قاتل کو نشانہ بنایا اور مجھے اس سے نجات دلا دی۔ پیرس میں شی سپر نامی ایک خطرناک عورت تربیت یافتہ کتوں کا کاروبار کر رہی تھی۔ یہودیوں نے اس سے خطرناک قسم کے کتے حاصل کر کے ان سے میری بوٹیاں نچوانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ چنانچہ میرے ایما پر سونیا اس خوف ناک عورت کے محفوظ قلعے میں جا گھسی۔ وہ بھی کتوں کو اشاروں پر چلانے کا فن جانتی تھی چنانچہ اس نے شی سپر کو اسی کے سدھائے ہوئے ایک کتے کا چارہ بنا دیا۔ میں نے اس کے دماغ میں جھانکا تو وہ فتح مندانہ شان سے شی سپر کے میک اپ میں کھڑی اسی کے سے انداز میں سگریٹ پی رہی تھی۔ اس کے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔

سونیا نے شی سپر کو ٹھکانے لگا دیا تھا لیکن اب شی سپر کی جگہ لینے کے لیے ایک تیز طرار جنگجو قسم کی لڑکی چاہیے تھی۔ اعلیٰ بی بی نے اس کے لیے پیرس کی جولی تھامسن کا نام تجویز کیا۔ اس نے وہاں ایک خطرناک تنظیم کی بنیاد رکھی تھی۔ میں نے اس سے رابطہ قائم کیا تو وہ میرا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گئی۔ میں نے اسے شی سپر کے میک اپ میں اس کے محل میں پہنچا دیا۔ منجالی نے ایک یہودی سراغ رساں کو دام میں لانے کی کوشش کی لیکن اس کی محتاط طبیعت نے اسے بچا لیا۔ پھر مجھے معلوم ہوا دشمن رسونتی کو نیویارک پہنچانے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ میں نے انھیں ایسا کرنے سے روکنے کے لیے بڑے بڑے یہودی ایجنٹوں کو ہراساں کرنا شروع کر دیا۔ جولی تھامسن نے شی سپر کا کردار بڑی خوش اسلوبی سے ادا کیا تھا لیکن ڈاکٹر سیموئیل اور اس کا باڈی گارڈ ڈیڈی بلا اس سے بھی زیادہ عیار نکلے۔ انھوں نے عین وقت پر اسے بے نقاب کر دیا اور شراب پلا پلا کے بالکل بے سدھ کر کے ڈال دیا۔ سیکن میں نے شی سپر کے محل سے نکلنے کے تمام راستے مسدود کر دیے۔ وہ اپنے خطرناک ہتھیاروں کے باوجود بے بسی سے خوف ناک کتوں کے غولِ بیابانی کے نمودار ہونے کے خیال سے لرزہ براندام تھے۔ میری مشکل یہ تھی اور شی سپر کے کتوں نے مل کر ایسا ہنگامہ کیا کہ ڈیڈی بلا کے سوا سارے ہی دشمن ٹھکانے لگ گئے۔ میں جس تھرڈ کلاس ہوٹل میں چھپا ہوا تھا وہاں میری ٹیلی پیتھی نے کچھ ایسی کرشمہ سازی کی کہ رنگون انٹیلی جنس کا ایک ذمے دار افسر میرا گرویدہ ہو گیا۔ میں نے منشیات فروشوں کی بیخ کنی میں اس کی مدد کرنے کا وعدہ کر لیا۔ دشمنوں نے رسونتی کی برین واشنگ کرنا چاہی لیکن میں نے انھیں ناکام بنا دیا۔ مرجانہ اور اس کی والدہ

وغیرہ نے میرے بیٹے کو یہودیوں کی نظروں سے محفوظ رکھنے کے لیے اس کی آیا جمیلہ کی شادی ایک بڑے عرب سرمایہ دار جواد الخیری سے کر کے جمیلہ اور پارس کو اس کے عالی شان قلعہ نما محل میں منتقل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ تارڈ بلیا شدید زخمی حالت میں اسپتال لایا گیا جس کی اطلاع مجھے ہوئی تو میں نے اسے زخموں کی تکلیف کے کرب سے آزاد کر دیا۔ یہودی پاگل ہو گئے تھے۔ انہوں نے مجھے بلیک میل کرنے کے لیے پاکستان میں میرے عزیز جاوید اور اس کی بیوی کو ہلاک کر کے اس کی بہن ریحانہ کو اغوا کر لیا۔ وہ مجھے بے بس کر کے اپنی شرائط منوانا چاہتے تھے لیکن وفا پیشہ ریحانہ نے میرا سر بلند رکھنے کی خاطر جان دے دی۔ میرے پیروں میں جو زنجیریں یہودیوں نے ڈالنا چاہی تھیں۔ انھیں ریحانہ نے توڑ دیا تھا۔

دشمن مجھے مصائب میں مبتلا کر رہے تھے اور دوست مصائب سے نجات دلانے پر کمربستہ تھے۔ انجلو نے بھارت میں ریڈ پاور کے باس وجے آنند سے میرا رابطہ کرا دیا۔ وجے آنند نے رسونتی کو یہودیوں سے آزادی دلانے کا وعدہ کیا۔ میری ملاقات ایک نوجوان کرپا وان سے ہوئی وہ مجھ سے بے حد متاثر تھا اور ٹیلی پیتھی کی ابتدائی مشقیں کر رہا تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ وہ منشیات فروشوں کی تنظیم گولڈن رنگ کے مقامی سربراہ چینتا گنی کا بیٹا ہے تو میں نے اس کے ذریعے کیپٹن سور وشان کے ہاتھوں اس تنظیم کا خاتمہ کرانے کا فیصلہ کر لیا اور چینتا گنی کے لیے خاصی مشکلات پیدا کر دیں۔ ادھر اعلیٰ افسران کے ساتھ ایک خاصی طویل بے نتیجہ میٹنگ کے بعد میں نے تمام مقامی یہودی ایجنٹوں کو حکم دے دیا کہ وہ بر سرحد پار کر جائیں۔ انھوں نے اپنی زندگی کے دن بڑھانے کے لیے پیدل سرحد کی جانب سفر شروع کر دیا اور اسی دوران وجے آنند نے ایک سخت مقابلے کے بعد رسونتی کو یہودیوں سے چھڑا لیا مگر میں نے یہودیوں کو دھوکا دینے کے لیے انھیں دھمکی دی اگر رسونتی نہ ملی تو میں ان سب کو ہلاک کر دوں گا۔ جمیلہ جواد الخیری سے شادی کر کے میرے پارس کے ساتھ جواد کے قلعہ نما محل میں منتقل ہو گئی تھی مگر بازی ایک بار پھر پلٹ گئی اور سونیا دشمنوں میں گھر کے بے نقاب ہو گئی۔ اس بار دشمن نے سونیا کے مقابل ڈبل جو ٹیل کو لا کھڑا کیا تھا۔

ان میں ایک چونکہ اصلی نہیں تھی لہٰذا سونیا نے انھیں زیر کر کے تل ابیب میں آزادانہ رہنے کی سہولت حاصل کر لی۔ یہودیوں نے مختلف موقعوں پر مجھے سونیا کے سامنے تماشا بنانا اور کمتر ثابت کرنا چاہا لیکن ریڈ پاور کے ایجنٹوں نے انھیں ناکام کر دیا۔ وہ وہاں سونیا کی بھی مدد کر رہے تھے۔ یہودیوں کے ایک ربی اسفند یار نے ہپناٹزم کے ذریعے سونیا پر گرفت کرنا چاہی تو میں نے اس کے ارادے ناکام کر دیے۔ میں نے کرپا وان کو فرار دینا کر خود منظر سے غائب ہو جانے کا منصوبہ بنایا اور باس انجلو کے تعاون سے اپنے چہرے پر انٹر پول کے ایک گم شدہ افسر عزت علی کا چہرہ سجا لیا اور کرپا وان کی پراسرار موت کا انتظام کر دیا۔ میں نے نقلی جو ٹیل کے دماغ تک رسائی حاصل کر کے اسے ربی اسفند یار کے اثر سے نکالنا چاہا تو ربی نے اس کے دماغ کی پلیٹ صاف کر کے اسے میرے لیے ناکارہ بنا دیا۔ میں عزت علی کے میک اپ میں سنگاپور کے لیے روانہ ہوا تو جیسے قیامت آگئی قدم قدم پر عجیب عجیب تماشے ہونے لگے ایئرپورٹ پر منجالی نامی ایک لڑکی اور تین جنگجو میرے استقبال کے لیے موجود تھے۔ منجالی عزت علی کی معاون اور تینوں اشخاص اس کے محافظ تھے ہم ایک کار میں ایئرپورٹ سے روانہ ہوئے راستے میں یہ انکشاف ہوا کہ انٹر پول کے مقامی چیف نے عزت علی کو ختم کرنے کے لیے اس کار کے دروازوں سے ایک طاقتور بم منسلک کر دیا تھا۔ دروازہ کھولتے ہی ہم سب کے پرخچے اڑ جاتے۔ میں نے منجالی کو اس کی اطلاع دی وہ فوراً میری مدد کو دوڑ پڑی۔

**منجالی** جس کار میں میرے پیچھے آرہی تھی اس کار کو ریڈ پاور کا آدمی ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس نے ڈرائیور سے پوچھا: ”کیا اس کار میں کوئی لمبی سی رسی ہوگی؟“

”رسی تو نہیں ہے۔ ہاں، تار کا بڑا سا لچھا ہے۔“

منجالی نے میری کار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ”آگے والی گاڑی کے پیچھے جو نمبر پلیٹ ہے اس پر پھندا ڈال کر اسے روکنا چاہتی ہوں۔“

ڈرائیو کرنے والے نے حیرانی سے پوچھا: ”آپ اس طرح کیوں روکنا چاہتی ہیں؟ حکم دیجیے، میں گاڑی آگے لے جا کر ان کا راستہ روک دیتا ہوں۔“

”میں جیسا کہہ رہی ہوں، ویسا ہی کرو۔“

منجالی اسے تفصیل سے نہیں بتانا چاہتی تھی کہ جبراً گاڑی آگے لے جا کر راستہ روکنے سے ہم سب کے لیے کتنا خطرہ تھا۔ اس نے پوچھا: ”تار کا لچھا کہاں ہے؟“

”وہ ڈکی میں رکھا ہوا ہے۔“

”ایسا کرو، کار کو روکتے ہی فوراً ڈکی کھولو اور وہ لچھا نکال کر لے آؤ۔ خیال رہے، آگے والی گاڑی بہت دور نہ نکل جائے۔“

”آپ اطمینان رکھیں، میں پھر اس گاڑی تک پہنچ جاؤں گا۔“

اس نے فوراً ہی کار کو بریک لگائے۔ اندر سے ڈکی کھولی، دوڑتا ہوا ڈکی کے پاس گیا۔ پھر تار کا لچھا نکال کر لے آیا۔ گاڑی اسٹارٹ کی، تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتا ہوا ہماری گاڑی کے قریب پہنچنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس وقت تک منجالی نے تار کے سرے پر پھندا بنا لیا تھا۔ اس نے کہا: ”آگے والی گاڑی کو ہارن دو۔ جیسے تمھیں آگے نکلنے کے لیے راستہ نہ مل رہا ہو۔“

وہ ہارن بجانے لگا۔ پھر منجالی کی ہدایت کے مطابق وہ ہماری گاڑی کے برابر آ کر گاڑی چلانے لگا۔ منجالی نے اپنی کھڑکی سے جھانکتے ہوئے، ہماری طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ میرے پاس بیٹھی ہوئی نیما نے کار کی کھڑکی کے شیشے نیچے کر دیے۔ منجالی نے پوچھا: ”کیا بات ہے۔ ہم اتنی دیر سے ہارن بجا رہے ہیں۔ ہمیں راستہ کیوں نہیں مل رہا تھا؟“

نیما نے کہا "ہم ایک مصیبت میں گرفتار ہیں۔ کیا تم کسی طرح اس گاڑی کو روک سکتی ہو؟"

اس کی بات ختم ہوتے ہی گاڑی کی رفتار خود بخود سست ہونے لگی۔ ہم جانتے تھے کہ گاڑی کا ایندھن ختم ہوگا تو یہ خود بخود رُکنے لگے گی لیکن ایندھن اتنی جلدی ختم نہیں ہوسکتا تھا۔ دراصل آگے چڑھائی آگئی تھی۔ گاڑی چڑھائی پر نہیں جاسکتی تھی۔ آگے جاکر رُکنے والی تھی لیکن جہاں یہ رُکتی وہاں سے پھر ڈھلان یعنی پیچھے کی طرف چلنے لگتی۔ اس سے پہلے ہی منجالی کی گاڑی ہماری گاڑی کے پیچھے آگئی۔ ڈرائیور نے گاڑی ہمارے پیچھے روک دی تھی۔ وہ دوڑتی ہوئی ہماری کھڑکی کے پاس آئی۔ میں نے شیشے نیچے کرکے کہا "مس! کیا تم کسی میکنیک کو بلاسکتی ہو۔ اس کار کے پچھلے پہیئے کے ساتھ ایک بم منسلک ہے۔ اسے الگ کرنا ہے۔"

منجالی نے کہا "یہ کام میں خود کرسکتی ہوں لیکن یہ کیا قصہ ہے؟"

میں نے کہا "یہ بعد میں بتایا جائے گا۔ پہلے ہمیں اس مصیبت سے نجات دلائی جائے۔"

اگرچہ میں منجالی کو پہلے ہی اس کے متعلق بتاچکا تھا لیکن وہاں اپنے محافظوں پر یہ ثابت کرنا تھا کہ منجالی میرے لیے اجنبی ہے۔ اور ہماری موجودہ سچویشن کے بارے میں کچھ نہیں جانتی ہے۔ بہرحال، وہ اپنی کار کی ڈکی سے تمام اوزار لے کر آگئی۔ پھر سڑک پر لیٹ کر سرکتے ہوئے ہماری گاڑی کے نیچے چلی گئی۔ میں خیال خوانی کے ذریعے ہاری پارکی انٹرپول کے چیف کے دماغ میں اور منجالی کے دماغ میں پہنچنے لگا۔ چیف کا دماغ مجھے بتاتا تھا کہ اس بم کو کس طرح پہیئے سے علیحدہ کرنا چاہیے۔ یہی باتیں میں منجالی کو بتاتا جاتا تھا۔ وہ اس کے مطابق عمل کررہی تھی۔

ایک منٹ سے بھی کم وقت لگا۔ بم گاڑی سے الگ ہوگیا۔ اسی وقت دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ اس شاہراہ پر روشنی تھی لیکن کچھ رات کا بھی غلبہ تھا۔ کچھ لوگ دوڑتے ہوئے ہماری کار کے چاروں طرف آکر کھڑے ہوگئے۔ ان کے ہاتھوں میں ریوالور اور اسٹین گنیں تھیں۔ شاہراہ پر سے گزرنے والی گاڑیاں دور جاکر رُکتی جارہی تھیں۔ فٹ پاتھ پر چلنے والے ان ہتھیاروں کو دیکھ کر وہاں سے بھاگ رہے تھے۔ ان مسلح افراد نے منجالی کو نہیں دیکھا تھا کیوں کہ وہ کار کے نیچے تھی۔ ان میں سے ایک نے ریڈپاور کے ڈرائیور کو ریوالور کی زد میں لے کر کہا "خبردار! اپنی جگہ سے حرکت نہ کرنا۔ گاڑی جہاں ہے وہیں رہے گی۔"

ہماری کار کے اطراف تین مسلح جوان تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا "تم سب کی موت ہر طرح تیار ہے۔ دروازہ کھولوگے تو دھماکا ہوگا اور کسی طرح باہر نکلنے میں کامیاب ہوئے تو ہم زندہ نہیں چھوڑیں گے اور پھر دھماکے کا انتظار کیوں کیا جائے۔ کھڑکی کے یہ شیشے توڑ کر تمہارا کام تمام کیوں نہ کیا جائے؟"

میں نے نیما کی طرف جھکتے ہوئے آہستگی سے کہا "وہ لڑکی جو کار کے نیچے گئی تھی۔ یقیناً اب تک اس بم کو ہٹا چکی ہے۔ اگر تم سب ایک وقت میں اچانک ہی دروازے کو باہر کی طرف کھولو گے تو یہ دشمنوں کی توقع کے خلاف ہوگا۔"

ریڈپاور کے ڈرائیور کو جس آدمی نے ریوالور کی زد پر لے رکھا تھا، میں اس کے دماغ میں آسانی سے پہنچ کر ریوالور کو ہاتھ سے گراسکتا تھا لیکن پھر بھی محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ میں بہت مجبوری کی حالت میں ٹیلی پیتھی کا ہتھیار استعمال کرنا چاہتا تھا۔

ویسے منجالی نے مجھے کچھ کرنے کا موقع نہیں دیا۔ وہ ریوالور والا ہماری کار کے پچھلے حصے سے لگا کھڑا تھا یعنی ڈکی کی طرف تھا اور اسی طرف منجالی زمین پر کار کے نیچے لیٹی ہوئی تھی۔ وہ لیٹے ہی لیٹے زمین پر سرکتے ہوئے اس ریوالور والے کے قدموں تک پہنچی پھر کار کے نیچے سے سر نکال کر اپنے دانت اس کی ایک ٹانگ میں گاڑ دیے۔

میں ریوالور والے کے دماغ میں اس کا نتیجہ دیکھنے کے لیے نہیں رہا کیوں کہ نتیجہ ظاہر تھا۔ مجھے اپنی جگہ دماغی طور پر موجود رہنا تھا البتہ دماغی طور پر حاضر رہ کر بھی میں نے ریوالور والے کے حلق سے ایک کرب ناک کراہ سنی۔ اسی وقت ایک اور دشمن نے اسٹین گن کے دستے سے ہماری کھڑکی کے شیشے کو توڑنا چاہا۔ میرے آس پاس بیٹھے ہوئے فائٹروں نے ایک ہی وقت میں پتا نہیں کس زبان میں کیا کہہ کر ایک جھٹکے سے دروازے کو باہر کی طرف کھولا۔ تینوں مسلح جوان جو کھڑے ہوئے تھے وہ دروازے کی زد میں آکر پیچھے لڑکھڑاتے ہوئے گئے۔ ان کا اتنا ہی لڑکھڑانا کافی تھا۔ تینوں فائٹر بجلی کی طرح پھرتیلے تھے۔ اس سے پہلے کہ دشمن سنبھلتے، وہ کار سے باہر نکل کر ان کو اپنے حملوں کی زد میں لے چکے تھے۔ وہ انھیں ہتھیار استعمال کرنے کا موقع نہیں دے رہے تھے۔ ان میں سے دو کے ہتھیار تو پہلے ہی گرچکے تھے۔

میں کار سے نکل آیا تھا۔ ادھر منجالی زمین پر کھسکتے ہوئے کار سے باہر آگئی تھی۔ ہم دونوں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اپنے محافظوں کی کیا مدد کرسکتے ہیں۔ کیوں کہ وہ دشمنوں پر چھائے ہوئے تھے۔ ہماری ضرورت ہی نہیں تھی۔ میں نے منجالی کا ہاتھ پکڑ کر کار کی طرف کھینچتے ہوئے کہا "چلو یہاں سے۔"

نیما کار کے پچھلے دروازے کو کھولتا دیکھ کر ریڈپاور کا ڈرائیور اسٹیئرنگ سیٹ پر آگیا تھا۔ منجالی نے کہا "یہاں سے فوراً نکل چلو۔"

اس نے حکم کی تعمیل کی۔ کار کو فوراً اسٹارٹ کرکے پیچھے کی طرف لے گیا۔ ہمارے سامنے کھڑی ہوئی گاڑی بھی پیچھے آنے لگی۔ لیکن وہ سست رفتاری سے ڈھلان کی طرف آرہی تھی۔ ہماری

گاڑی تیزی سے پیچھے کی طرف گئی۔ پھر اس نے ایک یوٹرن لیا۔ اس کے بعد میرے دشمنوں اور میرے محافظوں سے دور ہوتی چلی گئی۔ چونکہ میں اپنی جان بچانے والوں کو یونہی نہیں چھوڑ سکتا تھا اس لیے نیما کے دماغ میں موجود رہا۔

وہ بڑی جی داری سے لڑ رہے تھے۔ دشمن بُری طرح مار کھا رہے تھے جس کے ہاتھ میں اسٹین گن تھی اس نے انھیں نشانے پر رکھنا چاہا۔ میں اس کی آواز سن چکا تھا۔ میں نے اس کے دونوں ہاتھوں کو اوپر اٹھا دیا۔ اسٹین گن سے فائرنگ ہوئی لیکن وہ نوّے ڈگری کی فائرنگ تھی۔

میں نے ٹیلی پیتھی کا استعمال کرتے وقت احتیاطاً اس کی زبان سے چیخ کر کہا "تم سب رُک جاؤ۔ ابھی میں نے نوّے ڈگری پر فائر کیا ہے۔ اب تم لوگوں پر فائر کروں گا۔"

اس کی زبان سے یہ کہلانے کا مقصد تھا کہ وہ ابھی کسی کو ہلاک نہیں کرنا چاہتا ہے صرف دھمکی دے رہا ہے اور اس میں ٹیلی پیتھی کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ اتنی دیر میں ایک فائٹر نے اس اسٹین گن والے کے پیٹ پر لات ماری تھی۔ وہ تکلیف سے کراہتا ہوا جھکنے لگا۔ اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ اپنے ہتھیار کو اپنے ہاتھوں سے استعمال کر سکتا کیوں کہ اس پر پے در پے جوڈو کراٹے کے حملے ہو رہے تھے۔

ان چار مسلح جوانوں میں سے ایک کو منجالی نے ختم کیا تھا۔ باقی تین مار کھا کر اتنے نڈھال ہو گئے تھے کہ ان میں بھاگنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ میں اُدھر سے مطمئن ہو کر دماغی طور پر حاضر ہو گیا۔ منجالی نے مسکرا کر پوچھا "آپ نے انھیں کیوں چھوڑ دیا؟"

"میں نے کہاں چھوڑا؟ ابھی انہی کے پاس تھا۔ اطمینان ہونے کے بعد آیا ہوں۔ وہ چاروں سنگاپوری فائٹر بڑے باکمال ہیں۔ انھوں نے دشمنوں پر قابو پا لیا ہے۔"

"لیکن آپ انھیں چھوڑ کر کیوں چلے آئے۔ کیا عزت علی کا یہ روپ ختم کر دیں گے؟"

"یہ روپ میرے لیے مصیبت بن گیا ہے۔ تقدیر نے مجھے انٹرپول والوں سے ٹکرا دیا ہے۔ میں دیکھوں گا کہ اب میں کیا کر سکتا ہوں۔ چیف آفیسر کا دماغ میری مٹھی میں آ گیا ہے۔ دوسری وہ فائٹر نیما ہے جس کے ذریعے میں انٹرپول میں کسی وقت بھی موجود رہ سکتا ہوں۔"

"ہاں! میں تھوڑی دیر پہلے سوچ رہی تھی کہ آپ کے ساتھ اتنی الجھنیں، اتنی پریشانیاں ہیں۔ ہر طرف آپ کو خیال خوانی کے ذریعے حاضر رہنا پڑتا ہے۔ ایسی صورت میں عزت علی کا یہ روپ بڑی دشواریاں پیدا کرے گا۔"

ہم سوچ کے ذریعے گفتگو کر رہے تھے تاکہ ریڈ پاور کا وہ ڈرائیور مجھے فرہاد علی کی حیثیت سے نہ پہچان سکے۔ میں نے منجالی سے کہا۔

"اسے کہہ دو۔ مجھے رسونتی کی رہائش گاہ تک پہنچا دے۔"

منجالی نے اسے حکم دیا۔ وہ گاڑی کو اسی طرف لے جانے لگا۔ میں نے سوچ کے ذریعے کہا "منجالی! ایک بات مجھے نہیں معلوم تھی جو رسونتی کے قریب پہنچ کر معلوم ہوئی۔"

اس نے کہا "آپ نے دو گھنٹے بعد مادام سونیا سے آنے کا وعدہ کیا تھا؟"

میں نے پیشانی پر ہاتھ مار کر کہا "اوہ، ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے وہاں پہنچنے کے لیے سوچا تھا۔ پھر باتوں میں بھول گیا۔ ابھی وہاں سے آتا ہوں۔"

میں سونیا کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے کہا "میں ایک گھنٹے سے انتظار کر رہی ہوں۔"

"میں نے دو گھنٹے بعد آنے کا وعدہ کیا تھا۔"

"جی ہاں، وہ دو گھنٹے کب کے گزر گئے۔ اس کے بعد ایک گھنٹہ تمھارے انتظار میں گزر گیا۔ کہاں پھنسے رہے؟"

"کیا بتاؤں۔ اس وقت عزت علی نامی ایک شخص کے روپ میں ہوں۔ پہلے تو وہ بڑا پُراسرار نظر آیا۔ بعد میں انکشاف ہوا کہ وہ انٹرپول کا کوئی آفیسر تھا۔ میں تو مصیبت میں گرفتار ہو گیا۔ بڑی مشکلوں سے جان بچائی ہے۔"

"کیا انٹرپول میں رہنے کا ارادہ نہیں ہے۔ بہت بڑا عہدہ ملا ہے۔"

"طعنے نہ دو۔ میں اتنے بڑے بین الاقوامی ادارے کو چھوڑ تو نہیں سکتا لیکن ابھی اس ادارے میں رہ بھی نہیں سکتا۔ تم اسرائیلی حدود سے نکل آؤ گی تو پھر دیکھا جائے گا۔ ثباتِ معظم نے میری باتوں کا کیا جواب دیا ہے؟"

"وہ کہتا ہے جس طرح سرِ بازار میرا مذاق اڑایا گیا اور مجھ پر کچرا پھینکا گیا تھا اس کا تعلق اس سے نہیں ہے۔ اس نے کبھی ایسا حکم نہیں دیا تھا۔ دراصل یہاں کے عام یہودی تمھارے اور میرے نام سے نفرت کرتے ہیں۔ وہ ہمیں مار ڈالنا چاہتے ہیں۔ ان کے اعلیٰ حکام نے سختی سے انھیں منع کیا ہے۔ لہٰذا وہ میرا مذاق اڑا کر مجھ پر کچرا پھینک کر اپنے انتقامی جذبے کی تسکین کر رہے تھے۔"

"کیا تم جب بھی شہر میں جاؤ گی تو لوگ اسی طرح سلوک کریں گے اور ثباتِ معظم کچھ نہیں کرے گا؟"

"وہ کہتا ہے کہ عوام کو کنٹرول کرنا بعض اوقات دشوار ہو جاتا ہے۔ بہتر ہے کہ آئندہ میں تنہا ہوٹل سے نہ نکلوں جب بھی نکلوں گی تو ان کے محافظ میرے آس پاس رہا کریں گے۔"

"بھئی یہ بڑے مکار ہیں۔ یہ کبھی اعتراف نہیں کرتے کہ انھوں نے تمھیں قیدی بنا کر رکھا ہے۔ تمھیں آرام سے ہوٹل میں رہنے کی اجازت دی ہے۔ لیکن تم نکلتی ہو تو ان کے آدمی تم پر کچرا اچھالتے

ہیں۔ اس طرح تمھیں ایک جگہ پابند کیا جا رہا ہے اور سمجھایا جا رہا ہے کہ تمھاری بہتری ہوٹل کے کمرے تک محدود رہنے میں ہے۔ فرق اتنا ہے کہ انھوں نے آہنی سلاخوں کے پیچھے تمھیں قید نہیں کیا، ایک عالیشان ہوٹل کے کمرے میں محدود کر دیا ہے۔ باہر نکلو گی تو مسلح فوجی تمھارے ساتھ رہیں گے۔ جس طرح قیدیوں کے ساتھ سپاہی رہا کرتے ہیں۔ بات وہی ہے لیکن انھوں نے انداز بدل دیا ہے۔"

"میں نے ان سے پوچھا تھا، مجھے کب تک یہاں رکھا جائے گا؟ وہ مجھ سے پوچھتے ہیں، بھلا مجھے یہاں کیا تکلیف ہے؟ ہاں! میں فرہاد کے پاس جانا چاہتی ہوں۔ میں نے اقرار کیا۔ وہ ہنسنے لگے۔ ثبات معظم نے کہا، ہمیں اچھی طرح معلوم ہے۔ فرہاد تم سے دور بھاگتا ہے اور تم اس کے پیچھے پیچھے بھاگتی ہو۔ تم اس سے ایک عرصے سے جدا ہو۔ پھر یہاں سے جاکر اس سے کہاں ملو گی؟"

میں نے پوچھا "تم نے کیا جواب دیا؟"

"کیا جواب دوں؟ تمھاری بے وفائی، بے مروتی کے باعث وہ میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تم مجھ سے دور ہی بھاگتے ہو؟"

"کیوں مجھے الزام دے رہی ہو۔ تم نے خود ہی کہا تھا کہ بابا صاحب کے ادارے میں اس وقت تک رہو گی جب تک یوگا کی مشقیں مکمل نہیں ہو جائیں گی اور بابا صاحب کے سائے میں رہ کر ان سے کچھ اور قوتیں بھی حاصل کرو گی۔"

"میں نے کہا تھا لیکن بابا صاحب تو گزر گئے۔"

"یوگا کی مشقیں تو نہیں گزریں۔ میں کیسے سمجھ لیتا کہ تم میرے پاس آنا چاہتی ہو۔ وہ تو میں نے حالات سے مجبور ہو کر تمھیں شاہینہ تک جانے کے لیے کہا تھا۔ اگر میرے پاس آنا چاہتی ہو تو وہاں سے نجات حاصل کرنے کے بعد ضرور آجانا۔ وہ لوگ تمھاری رہائی کے متعلق کیا کہتے ہیں؟"

"ثبات معظم کہہ رہا تھا کہ میرے متعلق اجلاس ہوتے رہتے ہیں۔ یہودیوں کی بہت سی اہم شخصیتیں اس اجلاس میں شریک ہوتی ہیں۔ اجلاس میں شامل لوگوں کے درمیان اختلافِ رائے پایا جاتا ہے۔ جب تک وہ ایک فیصلے پر متفق نہیں ہوں گے اس وقت تک میں ان کی مہمان رہوں گی۔ دوسرے لفظوں میں قیدی بن کر رہوں گی۔"

سونیا کو کال بیل کی آواز سنائی دی۔ وہ صوفے سے اٹھ کر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے دروازے کے پاس آئی۔ پھر اسے کھول دیا۔ باہر اس کی نگاں آنٹی کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے اندر آکر کہا "بیٹی! ثبات معظم صاحب تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ وہ دس منٹ میں یہاں پہنچنے والے ہیں۔"

سونیا نے طنزیہ انداز میں مسکرا کر کہا "میرے لیے تو ایسے اہتمام کیے گئے ہیں جیسے واقعی میں ایک معزز مہمان ہوں اور مجھ سے ملاقات کے لیے پہلے سے اطلاع دی جاتی ہے لیکن یہ اطلاع مجھے ٹیلی فون پر بھی دی جا سکتی تھی۔"

آنٹی نے مسکرا کر کہا "تم بہت خوش نصیب ہو۔ تمھارا اور فرہاد کا کچھ ایسا رعب اور دبدبہ ہے کہ تمھیں ایک قیدی کی حیثیت سے نہیں رکھا جا سکتا، البتہ تمھیں نظر بند رکھا گیا ہے۔ اس میں بھی تمھاری بھلائی ہے۔ خواہ مخواہ باہر جاؤ گی تو لڑائی جھگڑے ہوں گے۔"

میں نگاں آنٹی کی پوری باتیں نہ سن سکا۔ ہماری کار اب اس رہائش گاہ کے سامنے پہنچ گئی تھی جہاں رسوتی کا قیام تھا۔ میں نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا "مہجالی! میں تم سے رابطہ قائم کروں گا۔ تم اپنے گھر چلی جاؤ۔"

وہ اسی کار میں چلی گئی۔ میں کوٹھی کے احاطے میں داخل ہوا۔ رسوتی دروازے پر آگئی تھی۔ مجھے دیکھ کر مسکرانے لگی۔ میں نے سوچا، اگر مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دوں گا تو وقت گزرتا جائے گا اور سونیا کے پاس نہیں پہنچ سکوں گا۔ کچھ دیر بعد ثبات معظم اس کے پاس پہنچنے والا تھا۔

میں نے رسوتی کے قریب آکر نرمی سے کہا "تم مجھ پر خواہ مخواہ شبہ کر رہی تھیں۔ میں آگیا ہوں لیکن اس وقت سونیا ایک عجیب سچویشن میں ہے۔ ایک دشمن سے اس کی ملاقات ہونے والی ہے۔ میرا وہاں موجود رہنا ضروری ہے۔"

وہ میرے ساتھ اس بنگلے میں داخل ہوتے ہوئے بولی "اب تم آگئے ہو تو جی بھر کر خیال خوانی کرو۔ میں نے سونیا کے پاس جانے سے کبھی نہیں روکا۔ میں تمھارے لیے چائے لاؤں؟"

"چائے پیوں گا تو پھر کھانا اچھی طرح نہیں کھا سکوں گا۔ ایسا کرو میں مسلسل ٹیلی پیتھی میں مصروف رہوں تو تم آدھے گھنٹے بعد مجھے مخاطب کرنا اور کھانا میز پر لگا دینا۔ ضروری خیال خوانی ہوئی تو میں کھانے کے دوران بھی مصروف رہوں گا ورنہ ہم جی بھر کر باتیں کریں گے۔"

وہ خوش ہو کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ میں ایک صوفے پر بیٹھ کر پھر سونیا کے پاس پہنچ گیا۔ ثبات معظم اس کے پاس بیٹھا ہوا فرانسیسی زبان بول رہا تھا۔ میں سونیا کے دماغ سے اس کا ترجمہ سن رہا تھا۔ اس نے آتے ہی پوچھا "کیا مسٹر فرہاد نے رابطہ قائم کیا ہے؟"

سونیا نے جواب دیا "انھوں نے وعدہ تو کیا تھا لیکن ابھی تک آئے نہیں ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہیں الجھے ہوئے ہیں۔ اکثر ان کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔ وعدہ کر کے جاتے ہیں۔ پھر کئی کئی گھنٹے بلکہ کئی کئی دن تک مجھ سے رابطہ قائم نہیں کرتے۔"

"آپ یہاں ہیں۔ انھیں آپ کی فکر ضرور ہوگی۔ وہ زیادہ دیر تک آپ سے غافل نہیں رہیں گے۔"

"ہاں، وہ غافل نہیں رہیں گے لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنی بے پناہ مصروفیات کے باعث مجھے مخاطب نہیں کرتے ہیں۔ چند سیکنڈ کے لیے چپ چاپ میرے دماغ میں جھانکتے ہیں پھر مجھے بخیریت دیکھ کر واپس چلے جاتے ہیں۔ ہوسکتا ہے وہ میرے دماغ میں چپ چاپ آکر واپس چلے گئے ہوں۔"

اس نے مسکرا کر کہا "بھئی یہ ٹیلی پیتھی بڑا عجیب و غریب علم ہے۔"

سونیا نے مسکرا کر کہا "عجیب ہے مگر غریب نہیں ہے۔"

وہ تائید میں سر ہلا کر بولا "جی ہاں، جی ہاں۔ ہم نے اپنے کتنے ہی ذہین افراد کو اس علم کے حصول کے لیے دن رات مصروف رکھا۔ انھیں ہر طرح کی سہولتیں فراہم کیں۔ ٹیلی پیتھی سے متعلق دنیا جہان کی کتابیں حاصل کیں اور اس سلسلے میں جتنے ماہرین دستیاب ہوسکتے تھے ان کی خدمات حاصل کیں۔ آج بھی ہمارے یہاں ٹیلی پیتھی سیکھنے میں سیکڑوں طالب علم مصروف ہیں لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہاں کون سی خامی رہ جاتی ہے۔ کیسی غلطی ہوتی ہے کہ یہ علم حاصل ہوتے ہوتے رہ جاتا ہے۔ ہمارے کئی طلبہ و طالبات نے کہا ہے کہ وہ پوری طرح اپنے آپ کو منزل کے قریب محسوس کرتے ہیں لیکن منزل سے بھٹک جاتے ہیں۔ کاش مسٹر فرہاد ہمارے دوست ہوتے اور ہماری رہنمائی کرتے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ انھیں کس طرح اپنی دوستی اور خلوص کا یقین دلائیں۔"

"کسی کو اپنے خلوص کا یقین دلانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ آدمی کے اندر سچائی ہو تو وہ خود بخود باہر آجاتی ہے۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"مطلب صاف ہے۔ منزل تک پہنچنے کے لیے خود چل کر جانا پڑتا ہے لیکن آپ منزل سے دور بھاگتے ہیں۔"

"وہ کیسے؟"

"اگر آپ فرہاد کو دوست بنانا چاہتے ہیں، اپنے خلوص کا ثبوت دینا چاہتے ہیں تو پھر انگریزی میں باتیں کریں۔ اس سے دور بھاگنے کے لیے یہ فرانسیسی زبان کیوں استعمال کر رہے ہیں؟"

وہ صوفے پر پہلو بدلتے ہوئے بولا "ہم اپنی حفاظت کے لیے ایسا کرنے پر مجبور ہیں۔ دیکھیے نا، جب تک ہمارے درمیان دوستی کا یقین نہ ہوجائے اور ایک دوسرے سے کوئی نقصان نہ پہنچنے کا معاہدہ ہوجائے تو پھر ہم کھل کر فرہاد صاحب کے سامنے آئیں گے۔"

"آپ کو دوستی کا یقین کیسے ہوسکتا ہے اور آپ کس قسم کا معاہدہ چاہتے ہیں؟"

"دیکھیے، ہم آپ کو قیدی بنا کر رکھنا نہیں چاہتے بلکہ آپ کی موجودگی سے کچھ فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ فرہاد صاحب کے سامنے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ہم ان کے دوست ہیں۔ اگر دشمن ہوتے تو اب تک آپ زندہ سلامت نظر نہ آتیں۔ پلک جھپکتے ہی ہمارا کوئی بھی آدمی تھائیں سے گولی مار کر آپ کو ختم کرسکتا ہے لیکن ہم دوستی اور محبت کے کسی رابطے کو ختم نہیں کرنا چاہتے۔"

"میرا خیال ہے، ہم خواہ مخواہ کی باتوں میں وقت ضائع کر رہے ہیں۔ ایسے دوستی کے دعوے ہم بار بار سن چکے ہیں۔ آپ واضح اور غیر مبہم طریقے سے کام کی باتیں کریں۔ میں اسرائیلی حدود سے باہر جانا چاہتی ہوں۔ اس کی صورت کیا ہوسکتی ہے؟ کوئی ہیر پھیر کی بات نہ کریں۔ دل میں جو ہے، اسے زبان پر لے آئیں۔"

وہ صوفے پر ذرا سیدھا ہو کر جیسے سنبھل کر بیٹھ گیا پھر اس نے کہا۔ "ہم دو شرائط پر آپ کو یہاں سے جانے کی اجازت دے سکتے ہیں۔ پہلی شرط یہ ہے کہ یہاں ہمارے بہت سے ٹیلی پیتھی کے ذہین طلبا و طالبات موجود ہیں۔ ان میں سے مسٹر فرہاد کسی ایک کا انتخاب کر کے اس کی رہنمائی کریں۔ اُسے یہ علم سکھا دیں۔ انھیں زیادہ محنت کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ انھوں نے اس علم کے سلسلے میں تمام ابتدائی مشقیں کی ہیں۔ تمام مراحل سے گزرتے رہے ہیں۔ وہ کوشش کریں گے تو چند ہی دنوں میں ہمارا کوئی طالب علم ٹیلی پیتھی کا یہ علم حاصل کرلے گا۔"

سونیا نے ایک قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "آپ چند دن کی باتیں کر رہے ہیں۔ کیا یہ علم اتنا آسان ہے؟"

"میں نے کہا نا کہ ہمارے طالب علم تمام کٹھن مرحلوں سے گزر چکے ہیں۔"

"اگر گزر چکے ہوتے اور کہیں خامی نہ ہوتی تو وہ کامیاب بھی ہوچکے ہوتے۔ فرہاد شاید انھیں ابتدا سے مشقیں کرائیں گے۔ بشرطیکہ وہ اس کام کے لیے راضی ہوجائیں۔"

"جہاں تک آپ کی آزادی کا سوال ہے۔ ہم حلفیہ کہہ سکتے ہیں، جس دن ہمارا کوئی لڑکا یہ علم حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائے گا، اس دن آپ کے لیے یہاں کی سرحدیں کھل جائیں گی، آپ جہاں چاہیں گی جاسکیں گی۔"

"دوسری شرط کیا ہے؟"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا "ہم نے دوسری شرط پر عمل کرانے کے لیے ڈبل ہوٹیل کو تیار کیا تھا لیکن ان میں سے ایک تمھارے ہاتھوں بُری طرح زخمی ہوگئی ہے۔"

"تو کیا ہوا۔ زخم بھر بھی جاتے ہیں۔ آپ ڈبل جوٹیل سے کیا کام لینا چاہتے تھے؟"

"ہم چاہتے تھے، فرہاد اس سے شادی کرلے اور اس طرح وہ ایک اور بچے کا باپ بن جائے۔ اس بچے کو ہم نہایت اعلیٰ ماحول میں پالیں گے اور اس طرح ہمارے ہاتھوں فرہاد صاحب کو ان کے پہلے بیٹے کا جو صدمہ پہنچا ہے اس کا کفارہ ادا ہوجائے گا۔"

"یعنی آپ فرہاد کی آئندہ نسل کو پالنے کا ٹھیکہ لے رہے ہیں؟"

"مادام! آپ طنزیہ انداز میں گفتگو نہ کریں۔"
"کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ بے اختیار زبان پر طنز آجاتا ہے۔ کبھی ہنسی آجاتی ہے۔ ہاں! بات ہو رہی تھی ڈبل جوئیل کی۔ ان میں سے ایک میرے ہاتھوں زخمی ہو گئی لیکن دوسری تو سلامت ہو گی۔"
"دوسری سلامت ہے لیکن وہ مصنوعی جوئیل ہے۔ ہمارے ربی اسفندیار نے ہپناٹزم کے ذریعے اسے سنگل جوئیل کے دماغ سے وابستہ کر رکھا تھا جو ابھی زخمی پڑی ہے۔"
"پھر طنزیہ انداز میں کہوں گی تو آپ کو شکایت ہو گی۔ آپ لوگوں نے سنگل جوئیل کے دماغ میں یہ بات بٹھا دی ہے کہ فرہاد کے موجودہ بیٹے پارس نے اسی سنگل جوئیل کے بطن سے جنم لیا ہے۔"
وہ چند لمحوں تک چپ رہا۔ پھر اس نے کہا "مسٹر فرہاد آپ کے دماغ میں آجائیں تو آپ ہماری یہ دو شرطیں پیش کر دیں۔"
"مسٹر ثبات معظم! آپ لوگوں نے اپنی ان دو شرائط کے ہر پہلو پر غور کر لیا ہو گا؟"
"بیشک کوئی بات کھٹک رہی ہو تو ہمیں بتائیں۔"
"ہاں! کھٹک رہی ہے۔ آپ کو ان دو شرائط کی تکمیل کے دوران نقصان پہنچ سکتا ہے۔"
"وہ کیسے؟"
"ایسے کہ فرہاد آپ کے کسی طالب علم کو یا کسی طالبہ کو ٹیلی پیتھی کے علم سے روشناس کرائے گا تو کیا وہ فرہاد سے متاثر نہیں ہوں گے؟ کیا فرہاد کی سوچ کی لہریں ان پر اس حد تک اثر انداز نہیں ہوں گی کہ وہ آپ کی وفاداری کو بھول کر فرہاد کے وفادار ہو جائیں؟"
"ہم نے اس پہلو پر غور کر لیا ہے۔ ہمارے پاس ایسا طریقۂ کار ہے کہ ہمارے طلبا و طالبات فرہاد سے ٹیلی پیتھی تو سیکھ سکتے ہیں لیکن اس کی ٹیلی پیتھی سے متاثر ہو کر اس کے تابع فرمان نہیں بن سکتے۔"
"وہ کیسے؟"
"جب مسٹر فرہاد کسی کو علم سکھانے کے لیے راضی ہو جائیں گے تو ہم اگر مناسب سمجھیں گے تو اس بات کی وضاحت کر دیں گے۔"
"دوسری شرط کے متعلق بھی میں یہی کہوں گی کہ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ جو عورت فرہاد سے شادی کر کے اس کے بچے کی ماں بنے گی وہ فرہاد پر دل و جان سے نثار نہیں ہو گی اور اس کی وفادار نہیں بنے گی؟"
"ہم اس مسئلے پر غور کر رہے ہیں۔ ہم نے اس سلسلے میں ڈبل جوئیل کو تیار کیا تھا لیکن فرہاد نے مصنوعی جوئیل کو ٹریپ کر لیا۔"
سونیا نے پوچھا "آپ کو یہ باتیں کیسے معلوم ہوئیں؟"
"ہمارے ربی اسفندیار نے ہپناٹزم کے ذریعے اس مصنوعی جوئیل کے دماغ سے یہ باتیں معلوم کر لی تھیں۔ اب اس مصنوعی جوئیل کے دماغ کو واش کر دیا گیا ہے۔ اسے اصلی جوئیل کے دماغ سے علیحدہ کر دیا گیا ہے۔ اس کا نام کلارا ہے۔ اب وہ فرہاد کو پہچان نہیں سکے گی اور نہ ہی اسے یاد رہے گا کہ وہ کس طرح اس کے کام آنا چاہتی تھی۔"
سونیا کچھ سوچتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ٹہلنے کے انداز میں چلتے ہوئے اپنے صوفے کے پیچھے گئی۔ پھر صوفے کی پشت پر ہاتھ ٹیک کر کہا "اب میں سمجھ گئی۔ جو بھی طالب علم فرہاد کے ذریعے ٹیلی پیتھی حاصل کرنا چاہے گا، اسے ربی اسفندیار ہپناٹزم کے ذریعے کنٹرول میں رکھیں گے یعنی ایک طالب علم کے دماغ میں ایک طرف سے فرہاد اثر انداز ہوں گے تو دوسری طرف سے ربی اسفندیار کا تاثر بھی قائم رہے گا۔ اِدھر ٹیلی پیتھی اس طالب علم کے دماغ میں جگہ بناتی جائے گی اُدھر ربی اسفندیار اسے آپ لوگوں کا مطیع و فرمانبردار رہنے پر مجبور کرتے رہیں گے۔"
"آپ درست سمجھ رہی ہیں۔"
"پھر تو وہ مصنوعی جوئیل کیا نام بتایا تھا آپ نے۔ ہاں کلارا۔ کلارا کو بھی آپ لوگ دوبارہ کنٹرول کر سکتے ہیں۔"
اس نے انکار میں سر ہلا کر کہا "نہیں، کلارا بہت کمزور دماغ کی لڑکی ثابت ہوئی۔ ہم کوئی مستقل مزاج لڑکی کا انتظام کر رہے ہیں۔ ایسی کئی سمجھ دار لڑکیاں ہماری نظروں میں ہیں۔ انھیں بھی ربی اسفندیار اپنے کنٹرول میں رکھیں گے لیکن یہ بات پریشان کن ہے کہ ہمارے ربی اسفندیار آخر کب تک ایک عورت کے دماغ کو ہپناٹزم کے ذریعے کنٹرول کر سکتے ہیں۔ مسٹر فرہاد کوئی بھی موقع پا کر اس لڑکی کو کہیں سے کہیں لے جا سکتے ہیں جس طرح انھوں نے مادام رسوتی کو پھر قابو کر لیا ہے۔ بہر حال ہم اس مسئلے پر غور کر رہے ہیں۔ پہلے یہ تو معلوم ہو کہ مسٹر فرہاد ہماری ان دو شرائط کو کہاں تک تسلیم کرتے ہیں؟"
"وہ میرے دماغ میں پہنچیں گے تو میں اُن سے باتیں کروں گی۔"
وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا "جتنی جلدی یہ معاملات طے پائیں گے، اتنی جلدی آپ کی رہائی ممکن ہو سکے گی۔"
وہ کمرے سے چلا گیا۔ دروازہ بند ہو گیا۔ پھر میں نے اسے مخاطب کیا "ہیلو! میں ساری باتیں سن رہا تھا۔"
"پھر خاموش کیوں رہے؟"
"اگر اپنی موجودگی کی اطلاع دیتا تو وہ ابھی اپنی شرائط تسلیم کرانے کے لیے یہاں بیٹھا رہ جاتا اور مجھ سے شرائط طے کرنے کی کوشش کرتا۔"
"تم معاملات کو ٹال رہے ہو اور میں یہاں قیدی بنی ہوئی ہوں۔ آخر کب تک ٹالتے رہو گے۔ انھیں جواب تو دینا ہی ہو گا۔"
"بیشک جواب دیں گے لیکن اچھی طرح سوچ سمجھ کر۔ تم بھی سوچو کہ اس سلسلے میں کیا کرنا ہے۔ یہاں سنگاپور میں مجھے آنکھیں کھلی رکھنی ہیں۔ اس لیے اجازت دو۔ پھر تم سے رابطہ قائم کر کے پوچھوں گا کہ ان دو شرائط کے سلسلے میں تمہاری کیا رائے ہے اور میں نے کیا سوچا ہے۔ او کے سونیا!"

میں دماغی طور پر اپنی جگہ حاضر ہوگیا لیکن اپنی آنکھیں بند رکھیں تاکہ رسونتی آئے تو یہی سمجھے کہ میں خیال خوانی میں مصروف ہوں۔ میں نے اسے کہہ دیا تھا کہ وہ آدھے گھنٹے بعد مجھے مخاطب کرسکتی ہے۔ شاید آدھا گھنٹہ نہیں گزرا تھا یا گزر بھی گیا ہو تو کیا فرق پڑتا ہے۔ میں موقعے سے فائدہ اُٹھا کر منجالی کے پاس پہنچنا چاہتا تھا۔ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ بخیریت اپنی رہائش گاہ تک پہنچ گئی ہے یا نہیں لیکن میری خیال خوانی کی پرواز نہ ہوسکی۔ اسی وقت رسونتی نے مجھے مخاطب کیا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے کہا "میرے سر کے تاج! تم نے آدھے گھنٹے کی بات کہی تھی۔ اب ایک گھنٹہ ہو رہا ہے۔ میں یہاں آکر تمھیں مخاطب کرنا چاہتی تھی لیکن پارس نے اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ بڑا ضدی ہے۔ بہت ستاتا ہے۔ بڑی مشکل سے سُلا کر آئی ہوں۔"

میں نے پوچھا "پارس تو سوگیا۔ اپنے متعلق کیا خیال ہے؟"

وہ ذرا دور کھڑے ہوکر دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر گھورتے ہوئے بولی "اے جی! کون ہو تم؟"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "اپنے مذہب کے لحاظ سے تمھارا مجازی خدا ہوں۔ تمھارے دھرم کے انوسار تمھارا پتی دیو اور دُنیا کے ناتے تمھارا جیون ساتھی۔"

"جی نہیں۔ آپ میرے کچھ نہیں ہیں۔ ذرا آئینے میں اپنا مُنہ تو دیکھیں۔ اس وقت میرے سامنے نہ تو میرا مجازی خدا ہے، نہ پتی دیو ہے نہ جیون ساتھی ہے۔ میرے سامنے تو عزت علی ہے۔ چھی چھی! میں کسی پرائے مرد سے آزادانہ طور پر بات کرنا بھی پسند نہیں کرتی۔ اونہہ۔"

وہ اونہہ کہہ کر ایک ادائے ناز سے گھوم کر باہر جانے لگی۔ میں نے دل کو تھام لیا۔ فوراً ہی اپنی جگہ سے اُٹھ کر باتھ روم میں گیا۔ پھر وینشنگ کریم کے ذریعے عزت علی کا میک اپ اتارنے لگا۔ پندرہ منٹ کے بعد میں آئینے کے سامنے اپنا اصلی چہرہ دیکھ رہا تھا۔

تقدیر نے میرے اور رسونتی کے ساتھ عجیب تماشا دکھایا تھا۔ بہت عرصہ پہلے جب ہم دونوں وحشی قبیلے میں جا پھنسے تھے تو ایک وِچ ڈاکٹر نے پیشگوئی کی تھی کہ رسونتی میرے بیٹے کو جنم دے گی۔ اسی وحشی قبیلے میں غلام سے دوبارہ ملاقات ہوئی تھی۔ پھر میں نے رسونتی کو غلام کی حفاظت میں چھوڑ دیا تھا۔ وہ دِن ہے اور آج کا دن، اس طویل عرصے میں ہم کبھی ایک دوسرے سے نہ مل سکے۔ اگر ملے بھی تو اس حالت میں کہ کبھی رسونتی کی یادداشت گم ہوگئی اور کبھی میں اُسے وہ محبت نہ دے سکا جس کی وہ تمنا کرتی تھی کیوں کہ یادداشت واپس آنے کے بعد جب وہ مجھے پہچاننے لگی تھی تو بابا فرید واسطی چل بسے تھے۔ مجھے ان کا غم تھا اور میں اس سوگوار ماحول میں اسے محبت نہیں دے سکتا تھا۔

بہت سارا وقت گزرنے لگا۔ رات اتنی لمبی ہوگئی تھی جیسے آگے بڑھنا بھول گئی ہو۔ وہ بھی گزرنا نہیں چاہتی تھی۔

رات کے دو بجے ہم کھانے کے لیے بیٹھے۔ رسونتی میز کے دوسری طرف میرے سامنے تھی۔ ہم ایک دوسرے سے مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہے تھے۔ کھانے کے دوران اس نے پوچھا "فرہاد! پہلے تو تم ایسے نہ تھے؟"

"میں پہلے کیسا نہ تھا؟"

"یہی میں بہت دیر سے سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ تم میں کیسی کیسی تبدیلیاں آگئی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ بس یہی سوچ کر رہ جاتی ہوں کہ تم پہلے جیسے نہیں رہے۔"

"بھئی اپنے ذہن میں میرا تجزیہ کرو۔ ذرا اطمینان سے سوچو، آخر میں پہلے جیسا کیوں نہیں رہا؟ کیا پہلے میں جوان تھا۔ اب بوڑھا ہوگیا ہوں؟"

وہ چونک کر بولی "نہیں، ایک بات سمجھ میں آرہی ہے۔ تم میں پہلے سے بہت زیادہ کشش پیدا ہوگئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تم مقناطیس کی چار دیواری میں زندگی گزارتے رہے ہو۔ باہر نکلے ہو تو تم میں کشش ہی کشش ہے۔ میں کئی بار تم سے ناراض ہوتی رہی مگر تمھاری طرف کشاں کشاں آتی رہی۔"

"تم بیوی ہو۔ مجھے دل و جان سے چاہتی ہو۔ ہر دم میری طرف کھنچی آتی ہو۔ یہ ایک بیوی کے لیے کوئی غیر معمولی بات تو نہیں ہے۔"

وہ پریشان ہوکر بولی "کوئی غیر معمولی بات ہے۔ سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔"

میں سر جھکا کر کھانے لگا۔ ذرا دیر بعد وہ ایک دم سے چونک کر سر اُٹھاتے ہوئے بولی "وہ جو تمھارے بدن میں حرارت پیدا ہوگئی ہے وہ مجھے مشکوک کرتی ہے۔"

"مجھے اپنی کسی حرارت کا علم نہیں ہے۔ تم نے خواہ مخواہ طیارے میں مجھ سے ناراض ہونے کی کوشش کی تھی۔"

"میں خوب سمجھتی ہوں۔ اس چڑیل کو اب کبھی دیکھ لوں گی تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔"

میں سمجھ رہا تھا۔ وہ منجالی کو چڑیل کہہ رہی تھی۔ میں نے کہا "رات زیادہ ہوگئی ہے۔ چپ چاپ کھانا کھا کر سو جاؤ۔ کھانے کے دوران غصہ کرنے سے بدہضمی ہوجاتی ہے۔"

"میں کھانے کے بعد سوجاؤں گی۔ تم کیا کرو گے؟"

"میں تل ابیب میں پولٹری فارم کھولنے کے امکانات پر غور کروں گا۔"

"کیا یہ کوئی مذاق ہے؟"

"تقدیر میرا مذاق اڑا رہی ہے۔ ایک طرف تم دیوانہ وار محبت کرنے والی بیوی ہو۔ دوسری طرف وہ دیوانہ وار دشمنی کرنے والے

یہودی ہیں۔ تم دونوں کو میرے بچوں کی ضرورت ہے۔ سُنا ہے تمھارے ہاں بھگوت گیتا کے کورو خاندان میں کسی کے پورے ایک سو بچے تھے۔"

وہ ناگواری سے بولی۔"ہوگا۔ مجھے گیتا یاد نہیں ہے۔"

"یہودی ایک سو بچوں سے کم پر راضی نہیں ہوں گے۔ اگر میرے ایک سو ہو گئے تو تمھیں گیتا یاد آجائے گی۔"

اس نے جواب نہیں دیا۔ کھانے کے بعد ملازمہ کو آواز دی۔ ریڈیاور کے باس نے ہمارے لیے ایک باورچی اور ایک ملازمہ کا انتظام کر رکھا تھا۔ وہ میز پر سے پلیٹیں اٹھانے لگی۔ ہم خواب گاہ میں آگئے۔ وہ سونے کے لیے بستر پر چلی گئی۔ میں کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ اگرچہ کوئی اہم خیال خوانی نہیں تھی۔ سونیا کی طرف سے اطمینان تھا۔ میں آرام سے سو سکتا تھا لیکن میں نے سوچا "پہلے رسونتی سو جائے" اس کے بعد دیکھا جائے گا۔

میں نے کرپادان کے پاس پہنچ کر پوچھا۔"تم پیرس کب جا رہے ہو؟"

"کل صبح کی فلائٹ سے جانے والا ہوں۔ میں نے تمام انتظامات کر لیے ہیں۔"

"تم وہاں پہنچو گے تو تمھارے استقبال کے لیے ایک لڑکی آئے گی۔ وہی تمھاری رہائش کا انتظام کرے گی۔"

میں اس سے ضروری باتیں کرنے کے بعد باس اینجلو کے پاس پہنچا۔ میں نے اسے مخاطب کیا تو وہ خوش ہو گیا۔ اس وقت وہ سونے کے لیے جا رہا تھا۔ میں نے کہا۔"میں آپ کے آرام میں خلل ڈال رہا ہوں۔"

"جناب! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ مجھ سے دور ہو کر بھی یاد کر رہے ہیں۔"

"میں بتانے آیا ہوں کہ بخیریت سنگاپور پہنچ گیا ہوں۔ میں نے عزت علی کا میک اپ ختم کر دیا ہے۔ ویسے آپ جانتے ہیں ..... عزت علی کون تھا؟"

"پُراسرار آدمی ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ بہت ہی گہرا آدمی تھا۔"

"آپ کو یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ وہ انٹرپول کا ایک بڑا آفیسر تھا۔"

باس اینجلو کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ اس نے پوچھا۔"کیا واقعی؟"

"ہاں ابھی میں اپنے معاملات میں بُری طرح اُلجھا ہوا ہوں۔ انٹرپول کے معاملات میں اُلجھوں گا تو قصہ بڑا طول پکڑ لے گا اور مصروفیات اتنی بڑھیں گی کہ کھانے اور سونے کی فرصت بھی نہیں ملے گی۔ فی الحال انٹرپول سے الگ ہوں۔ ضرورت پیش آئے گی تو اُدھر کا رُخ کروں گا۔"

"جناب فرہاد صاحب! اگر آپ مجھ سے رابطہ قائم نہ کرتے تب بھی میں سنگاپور کے باس جے آر جے ناتھن کے ذریعے آپ سے رابطہ قائم کرنے والا تھا۔"

"کوئی اہم بات ہے؟"

"جی ہاں بہت ہی اہم بات ہے۔ تل ابیب میں ہمارے خفیہ ایجنٹ ہیں، ان کی آوازیں میرے پاس ریکارڈ ہو کر آئی ہیں۔ سب سے بڑی بات تو یہ کہ ثبات معظم بھی آپ کو انگریزی بولتا سُنائی دے گا۔ کیا آپ اسی وقت سُننا پسند کریں گے؟"

"یہ اتنی اہم بات ہے کہ مجھے ایک ٹانگ پر کھڑے ہو جانا چاہیے۔ آپ کیسٹ کو ریکارڈر میں لگائیے۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

میں نے دوسرے ہی لمحے منجالی سے رابطہ قائم کیا۔ وہ سو رہی تھی۔ میرے دماغ میں پہنچتے ہی چونک کر اُٹھ گئی۔ پھر اس نے مجھے مخاطب کیا۔"میرے آقا! کیا آپ میرے پاس آئے ہیں؟"

"ہاں، تم سو رہی تھیں۔ مجھے افسوس ہے کہ....؟"

اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔"آپ تو غیروں کی طرح تکلف برت رہے ہیں۔ فرمائیے کیا حکم ہے؟"

"فوراً کیسٹ ریکارڈر نکالو۔ میں جس لب و لہجے میں بولتا جاؤں گا، اسی لب و لہجے کی نقالی کرتی جاؤ اور اسے ریکارڈ کرتی جاؤ۔"

ذرا دیر کے لیے میری خیال خوانی کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ دوسری خواب گاہ میں فرحی پارس رو رہا تھا۔ اس کی نیند اُچاٹ ہو گئی تھی۔ رسونتی کی آوازیوں آرہی تھی جیسے وہ اسے گود میں لے کر اِدھر سے اُدھر ٹہلا رہی ہو اور منا رہی ہو۔ میں نے اس کے دماغ میں جھانک کر دیکھا تو بڑی حیرانی ہوئی۔ کیوں کہ وہ گہری نیند سو رہی تھی اور پارس کے جھولے کے سرہانے رکھے ہوئے کیسٹ ریکارڈر کے ذریعے اس کی آواز سُنائی دے رہی تھی یعنی کیسٹ کے ذریعے وہ اسے بہلا رہی تھی۔ پارس کے رونے سے شاید اس کی آنکھ ذرا دیر کے لیے کھلی ہو گی۔ اس نے جھولے کو ہلا دیا تھا۔ اب جھولا ہل رہا تھا۔ کیسٹ جاری تھا۔

میں اپنی جگہ سے اُٹھ کر دروازے پر آیا۔ پھر وہاں سے دوسری خواب گاہ میں جھانک کر دیکھا۔ واقعی وہ آرام سے سو رہی تھی۔ کیسٹ ریکارڈر سے اس کی ممتا بھری آوازیں نشر ہو رہی تھیں۔ جھولا ہل رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی رسونتی کی گنگناہٹ سنائی دی۔ وہ بہت ہی میٹھے سُروں میں اپنے بیٹے پارس کے لیے ایک گیت گا رہی تھی۔

میں دروازے سے گزر کر اس کی خواب گاہ میں آگیا۔ دبے قدموں چلتا ہوا پارس کے جھولے کے پاس پہنچا۔ میں نے آج تک رسونتی کے ہونٹوں سے گیت نہیں سُنا تھا۔ اب سُن کر یاد آرہا تھا، وہ تو بچپن سے ایک مندر کی داسی تھی۔ وہاں اس نے یوگا کی مشقیں کیں اور ٹیلی پیتھی کا علم بھی حاصل کر لیا۔ پوجا کرنے کے دوران یہ

بھجن گایا کرتی تھی۔ یقیناً اسے گانے کا سلیقہ آتا ہوگا اور سُر تال پر بھی عبور حاصل ہوگا۔ میں چند لمحوں تک گم صم ہو کر اس کی مدھر آواز میں کھویا رہا۔ ذرا سی دیر میں بابا سو گیا لیکن کیسٹ جاری تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر ریکارڈر کو آف کر دیا۔

میں نے زندگی میں پہلی بار ایسی ماں کو دیکھا تھا جو کیسٹ ریکارڈر کے ذریعے اپنے بچے کو لوری سُناتی تھی۔ رموتی نے اس سائنسی ایجاد کا بڑا فائدہ اٹھایا تھا یعنی بچہ روتا، نیند اُچاٹ ہوتی تو فوراً ہی ریکارڈر کو آن کر دیا۔ جھولے کو ذرا ہلا دیا اور کروٹ بدل کر سو گئی۔ لاجواب آئیڈیا ہے۔ یعنی ماں سوتی رہے۔ ممتا کی لوری جاگتی رہے اور بچے کو بھی ماں کا پیار ملتا رہے اور وہ بہل کر سو جائے جیسے فرضی پارس سو گیا تھا۔

میں وہاں موجود تھا اس لیے میں نے کیسٹ ریکارڈر کو آف کر دیا تھا۔ ورنہ عام طور پر یہ اس وقت تک چلتا ہوگا جب تک کہ کیسٹ پورا نہ ہو جائے اور پھر خود بخود بند ہو جاتا ہوگا۔ میں نے پارس کو دیکھا۔ معصوم سا بچہ پالنے میں آنکھیں بند کیے گہری نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔ پتا نہیں یہ کس کے جگر کا ٹکڑا تھا۔ کس نے ممتا کا عذاب اٹھانے کے بعد کتنی تکلیفوں سے اسے جنم دیا تھا اور اب وہ ہاتھ سے بے ہاتھ ہو گیا تھا پھر بھی خدا کا شکر ہے کہ اچھے ہاتھوں میں تھا۔ اگر اس کی قسمت نے ساتھ دیا تو اس کی زندگی انشاء اللہ سنور جائے گی۔

میں نے پیار بھری نظر بچے پر ڈالی پھر وہاں سے اپنی خوابگاہ میں آ گیا۔ رنگوں میں اینجلو اور سنگاپور میں منجالی میرے منتظر تھے۔ میں نے اینجلو سے کہا "سوری، ذرا دیر ہو گئی۔ آپ کیسٹ ریکارڈر آن کریں۔"

اس نے آن کر دیا۔ مجھے ایک شخص کی آواز سُنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا "میں سُن رہا تھا اور اس کی آواز کے ساتھ آواز ملا کر اس کے لب و لہجے کو ذہن نشین کر رہا تھا۔ پھر میں نے اینجلو سے کہا۔ "ریکارڈر بند کر دیجیے۔ میں اس شخص کے دماغ میں پہنچ کر ابھی آتا ہوں۔"

اس نے ریکارڈر کو بند کر دیا۔ میں نے اس کے لب و لہجے کا سہارا لیتے ہوئے سوچ کی پرواز کی۔ پھر اس کے دماغ میں پہنچ گیا۔ اس وقت تل ابیب میں رات کے ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ ایک کلب میں رقص و سرود کی محفل جمی ہوئی تھی۔ وہاں بڑے افسران زیادہ نظر آ رہے تھے۔ ایسے شہری بھی تھے جو بہت زیادہ دولت مند تھے یا کسی نہ کسی طرح حکومت پر اپنا اثر رکھتے تھے۔ وہاں ادھیڑ عمر کی دولت مند خواتین کے علاوہ نوجوان عورتیں اور

لڑکیاں بھی تھیں۔ سبھی قیمتی ملبوسات میں تھیں۔ ان کے گلے اور کانوں میں ہیرے موتیوں سے مزین زیورات تھے۔ ایسا لگتا تھا، جیسے ـــــ سونا ان کے لیے کوئی وقعت نہ رکھتا ہو۔ وہ ہیرے موتیوں سے کھیلنے والی عورتیں تھیں۔ میں جس شخص کے دماغ میں پہنچا وہ ایک حسین دوشیزہ کے ساتھ ـــــ آرکسٹرا کی دھن پر رقص کر رہا تھا۔ اس کا نام ڈربی فائن تھا، وہ مغربی ساحل پر کوسٹ گارڈ آفیسر کی حیثیت سے متعین کیا گیا تھا۔ اس وقت اپنی ہم رقص سے محبت بھری باتیں کر رہا تھا۔ میں اسے مخاطب کرتا تو وہ چونک جاتا یا پھر اسے اپنی موجودگی کا یقین دلانے کے لیے مجھے کچھ ایسے ثبوت دینے پڑتے کہ وہ وہاں تماشا بن جاتا۔ میں نے سوچا، ابھی اسے تفریح کرنے دی جائے، بعد میں دیکھا جائے گا۔

میں نے منجالی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "میں تمھارے دماغ میں بول رہا ہوں۔ اسی کے مطابق تم اس لب و لہجے کو اونچی آواز میں ریکارڈ کرو۔"

وہ میرے حکم کی تعمیل کرنے لگی۔ میں بولتا گیا۔ وہ میرے ساتھ ساتھ بولتی گئی۔ یہ تو میں پہلے ہی اعتراف کرچکا ہوں کہ وہ غضب کی نقال تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس کی آواز میں مردانہ پن نہیں تھا۔ مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ جب مجھے لب و لہجہ یاد آتا تو میں ڈربی فائن کے مردانہ آہنگ کو بھی یاد کر لیتا۔ پھر میں نے انجلو سے کہا۔ "آپ مجھے دوسری آواز سنائیں۔"

اس نے دوسری آواز سنائی۔ میں اسی کے مطابق اس دوسرے شخص کے دماغ میں پہنچ گیا۔ یہ وہی تلوار باز تھا جس نے ایک بلند عمارت کی چھت پر سونیا کی جان بچائی تھی۔ سونیا کو چار پہلوانوں نے گھیر رکھا تھا۔ جن میں سے چوتھا یہی شخص تھا۔ جو دشمنوں سے ملا ہوا تھا لیکن عین وقت پر اس نے بازی پلٹ دی تھی۔ اس کا نام گونل تھا۔ وہ وہاں کے سپاہیوں کو گوریلا جنگ کی تربیت دیا کرتا تھا۔ اعلیٰ حکام اس پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ کوئی اس پر شبہ نہیں کرتا تھا۔ میں نے اسے بھی مخاطب نہیں کیا۔ منجالی کے پاس آکر اس کے لب و لہجے کو ریکارڈ کرایا۔ پھر انجلو سے کہا کہ وہ تیسری آواز سنائے۔

اس نے تیسری، چوتھی، پانچویں آوازیں سنائیں۔ یہ وہی لوگ تھے جو ڈنر کے وقت ہوٹل میں سونیا کے درپردہ محافظ تھے۔ جس نے بھی میرے کٹے ہوئے سر کو ڈش بنا کر کھانے کی کوشش کی تھی، انھوں نے اسے ہلاک کردیا تھا۔ میں نے ان تینوں کے لب و لہجے کو بھی ریکارڈ کرالیا۔ آخر میں ثبات معظم کی آواز سنائی دی۔ وہ بڑے عمدہ لہجے میں انگریزی بول رہا تھا۔ کسی اجلاس میں تقریر کر رہا تھا۔ ماسک مین کے کسی ایجنٹ نے اس کی تقریر کو ریکارڈ کرلیا تھا۔ وہی ریکارڈنگ میں سن رہا تھا۔ اسے ذرا دیر سننے کے بعد میں نے انجلو سے کہا۔ "بہت بہت شکریہ۔ ریکارڈر بند کر دیجیے۔ میں ثبات معظم کے پاس جارہا ہوں۔"

اور میں اس کے دماغ میں پہنچ گیا۔ اس وقت وہ بھی اسی کلب میں تھا جہاں تھوڑی دیر پہلے میں ڈربی فائن کو ایک لڑکی کے ساتھ رقص کرتے دیکھ چکا تھا۔ ثبات معظم ایک بالکونی میں "مین یہودی معززین کے ساتھ بیٹھا تھا۔ چوتھی ایک نوجوان لڑکی تھی جو اس کی بیٹی تھی۔ جس وقت میں اس کے دماغ میں پہنچا تو وہ لڑکی اسے مخاطب کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "پاپا! آئی ایم گیٹنگ لیٹ۔ مجھے جانے دیجیے۔ سویرے کلاس اٹینڈ کرنی ہے۔"

اس نے کہا۔ "آل رائیٹ بے بی! یو مے گو۔"

لڑکی اٹھ کر جانے لگی۔ میں نے ثبات معظم کو چھوڑ دیا۔ اس لڑکی کے دماغ میں بیٹھ کر اس کے ساتھ جانے لگا۔ اس کا نام ایبنہ معظم تھا۔ عام طور پر ایمی کہلاتی تھی۔ وہ کلب میں جدھر سے گزر رہی تھی، لوگوں کی نگاہیں اٹھ رہی تھیں۔ وہ سب ایسے دیکھ رہے تھے جیسے بھری بہار کو گزرتے دیکھ رہے ہوں۔

اس کی سوچ بتا رہی تھی کہ اس میں بلا کی کشش ہے۔ وہ زمین پر پاؤں رکھ کر چل رہی تھی لیکن اس کے قدم دیکھنے والوں کے دلوں پر پڑ رہے تھے۔ وہ روزانہ صبح دس بجے اسپیشل ٹریننگ کی ایک کلاس اٹینڈ کرتی تھی۔ اس کلاس میں اس کے علاوہ اور چوبیس لڑکیاں تھیں، جو ہر اعتبار سے دلنواز تھیں۔ اس کے باوجود انھیں سکھایا جاتا تھا کہ کس طرح ناز و انداز سے اپنے حسن کے خنجر کو دو دھاری کرنا چاہیے۔ انھیں سکھایا جاتا کہ کسی کے دل کو تسخیر کرنے کے ہنر کیا ہوتے ہیں۔ اگر وہ لڑکیاں مقابلۂ حسن میں شریک ہوتیں تو ان میں سے ہر لڑکی دنیا کی حسین ترین لڑکی کہلاتی۔ انھیں بڑے بڑے انعامات سے نوازا جاتا لیکن انھیں ان کی توقع سے بھی زیادہ انعامات دینے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ شرط صرف اتنی سی تھی کہ ان پچیس لڑکیوں میں سے کوئی ایک فرہاد علی تیمور کو تسخیر کرلے۔

ثبات معظم دل و جان سے چاہتا تھا کہ اس کی بیٹی ایمی یہ مقابلہ جیت لے، فرہاد کو تسخیر کرلے۔ آخر ایک دن تو بیٹی کی شادی کرنی ہی ہے۔ اگر فرہاد سے رشتہ ہو جائے اور یہ اس کے بچے کی ماں بن جائے تو یہودی قوم، اسرائیلی حکومت تمام عمر اس کی بیٹی کے ناز نخرے برداشت کرتی رہے گی۔

ایمی جہاں سے گزر رہی تھی، فوجی جوان ایک طرف ہٹ کر اسے راستہ دے رہے تھے۔ اس کی سوچ نے بتایا کہ وہ پچیس لڑکیاں جہاں سے گزر جاتی ہیں، وہاں کھڑے ہوئے لوگ انھیں احتراماً ہٹ کر راستہ دیتے ہیں۔ ان کی جو ضرورت ہوتی ہے وہ ایک اشارے میں

پوری ہو جاتی ہے۔ وہاں کے حکام کی جو قدر و منزلت ہے وہ ہی ان پچیس لڑکیوں کی ہے کیوں کہ وہ ایک بہت بڑی جنگ لڑنے کے لیے تیار ہو رہی تھیں۔ میں نے اسی کی سوچ میں پوچھا۔ "لیکن فرہاد تو ٹیلی پیتھی جانتا ہے۔ جب کبھی میرا اس کا سامنا ہوگا تو وہ چپکے سے میرے ذہن کو ٹٹول کر معلوم کرلے گا کہ میں یہودیوں کی آلۂ کار ہوں اور اسے محبت کا فریب دے رہی ہوں۔"

اس کی سوچ نے جواب دیا۔ "میں کئی بار یہی باتیں سوچ چکی ہوں لیکن ربی اسفندیار کہتے ہیں کہ ہم پچیس لڑکیاں ایک ہفتے کے بعد اپنی موجودہ زندگی کو بھول جائیں گی۔ اس کے بعد ہمارے والدین نئے ہوں گے، ہمارا ملک نیا ہوگا، ہماری رہائش گاہ بدل جائے گی۔ فرہاد ہمارے دماغوں میں جھانک کر کچھ بھی معلوم کرے گا تو ہمارے دماغ سے وہی نئی زندگی کی باتیں نکلیں گی۔ موجودہ زندگی یا ہمارا ماضی، سب کچھ ہمارے دماغ کے تہ خانے میں دفن ہو جائے گا اور فرہاد کی سوچ کی لہریں اس تہ خانے تک نہیں پہنچ سکیں گی۔"

میں نے فی الحال اسے چھوڑ دیا۔ وہ روزانہ صبح دس بجے اسپیشل ٹریننگ کی کلاس اٹینڈ کرتی تھی۔ اس کے ساتھ باقی چوبیس لڑکیاں بھی ہوا کرتی تھیں۔ میں نے سوچا، اسی وقت اس کے دماغ میں پہنچنا چاہیے اور اس کے ذریعے دوسری لڑکیوں کو بھی ٹٹولنا چاہیے۔ میں نے باس انجیلو کے دماغ میں جھانک کر دیکھا۔ اس نے کیسٹ ریکارڈر کو ایک طرف رکھ دیا تھا اور اب آرام سے بستر پر لیٹ گیا تھا۔ سوچ رہا تھا، سو جائے۔ اگر فرہاد صاحب کو ضرورت ہوگی تو وہ مجھے اُٹھا لیں گے۔

میں نے کہا۔ "ہاں، مسٹر انجیلو! میں نے آپ کو زحمت دی۔ بہت رات ہو چکی۔ آپ سو جائیں۔ میں بعد میں رابطہ قائم کروں گا۔"

میں نے منجالی کے پاس پہنچ کر کہا۔ "تم بھی سو جاؤ۔ مجھے ابھی جاگنا ہے۔ بہت ضروری خیال خوانی کرنی ہے۔"

"میرے آقا! کوئی تو رات ایسی ہو جب آپ آرام سے سو سکیں۔ رات بھر خیال خوانی کرتے ہیں۔ سونے کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔"

"مجبوری ہے۔ میں جلد سونے کی کوشش کروں گا۔"

میں اس سے رخصت ہو کر سوچنے لگا، تمام لوگوں کے دماغوں میں پہنچ چکا ہوں۔ اب لوگوں سے بعد میں بھی رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے۔ شب بیداری کیا ضروری ہے۔ سو جانا چاہیے۔ پھر دماغ نے کہا۔ اس وقت ثبات معظم اس کلب کی بالکونی میں تین یہودی اکابر کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔ یقیناً کوئی ضروری گفتگو ہو رہی ہوگی۔ کم از کم میں ان تینوں یہودیوں کے دماغوں تک تو پہنچ سکتا ہوں۔

میں نے اُدھر جانا چاہا۔ اچانک سونیا کی یاد آگئی۔ پچھلی رات جب وہ سونے کے لیے اپنے بستر پر گئی تھی تو ربی اسفندیار نے ہپناٹزم کے ذریعے اسے اپنی معمولہ بنایا تھا۔ کیا آج بھی ایسا ہو سکتا ہے؟

یہ خیال آتے ہی میں سونیا کے دماغ میں پہنچ گیا۔ واقعی وہی عمل جاری تھا۔ مجھے سونیا کے دماغ سے ربی اسفندیار کی آواز سنائی دی۔ وہ پوچھ رہا تھا۔ "جس وقت ثبات معظم تم سے گفتگو کر رہا تھا، کیا فرہاد تمہارے دماغ میں موجود نہیں تھا؟"

سونیا آنکھیں بند کیے چاروں شانے چت لیٹی ہوئی تھی۔ اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ وہ بالکل ساکت تھی اور ربی اسفندیار کے ٹرانس میں آگئی تھی۔ اس لیے اس کی معمولہ بن کر اس کی مرضی کے مطابق جواب دے رہی تھی۔ اس نے جواب دیا۔ "ہاں، فرہاد موجود تھا۔"

"تم نے ثبات معظم کو کیوں نہیں بتایا؟"

"میں خود نہیں جانتی تھی کہ وہ موجود ہے۔ ثبات معظم کے جانے کے بعد اس نے سوچ کے ذریعے مجھے مخاطب کیا تھا۔"

"وہ ان دو شرائط کے متعلق کیا کہتا ہے؟"

"وہ فی الحال اس بات کو ٹالنا چاہتا ہے۔ اسی لیے اس نے خاموشی اختیار کی تھی۔"

"سونیا میرے لیے جان دینے والی عورت تھی۔ میرے لیے تمام راز اپنے دل کی گہرائی میں چھپا کر رکھنا جانتی تھی لیکن اس وقت معمولہ بن کر میرے متعلق سب کچھ صاف صاف کہہ رہی تھی۔"

تنویمی عمل کرنے والے اپنے معمول پر چند اصولوں کے مطابق بندش کرتے ہیں۔ بندش کے جو اصول ہیں ان میں سے پہلا یہ ہے کہ تنویمی عمل کرنے والا اپنے معمول کو آنکھیں بند کرنے کے لیے کہتا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ معمول دُنیا کو نہ دیکھے۔ کوئی منظر اس کی نگاہوں کے سامنے نہ ہو۔ عامل کا دوسرا حکم ہوتا ہے کہ وہ باہر کی کوئی آواز نہ سُنے۔ اس کے کان صرف اپنے عامل کی آواز سنیں گے۔ اسی طرح وہ دماغ کو اپنے بس میں رکھنے کے لیے حکم صادر کرتا ہے کہ وہ جو پوچھے گا، صرف اسی بات کا جواب دیا جائے گا۔ کوئی فاضل بات نہیں کی جائے گی۔ معمول اسی بات پر عمل کرتا ہے۔ غرض یہ کہ ایک تجربہ کار تنویمی عمل کرنے والا اپنے معمول کے دل و دماغ کو پوری طرح گرفت میں لے لیتا ہے لیکن آج تک کوئی بڑے سے بڑا عامل بھی اپنے معمول کو اس بات کا پابند نہیں بنا سکا کہ اس کے دماغ میں کسی دوسرے کی سوچ کی لہریں نہ آسکیں۔ اس لیے کہ لہروں کو کوئی نہیں روک سکتا۔ روکنے کا عمل یہی ہے کہ جہاں سوچ کی لہریں پہنچ رہی ہیں۔ وہ اپنی سانس روک لے۔

بہرحال سونیا کے دماغ میں میری سوچ کی لہروں کے لیے جگہ تھی اور میں ربی اسفندیار کا عمل دیکھ رہا تھا۔ پھر میں نے چپکے چپکے سونیا کے دماغ میں کہنا شروع کیا۔ "مجھ پر جو عمل کیا جا رہا ہے، میں آہستہ آہستہ اس سے نجات حاصل کر رہی ہوں۔ میں کسی کی پابند

نہیں ہوں ۔ میں آزاد ہوں ۔ آزاد ہو رہی ہوں ۔ میرے دماغ کو فرہاد کی سوچ کی لہریں تقویت پہنچا رہی ہیں۔"

میں اس کے دماغ میں بار بار یہی کہتا رہا ۔ اسفندیار کوئی سوال کرتا تھا تو میں اس کی سوچ کے ذریعے جواب دینے لگتا تھا ۔ وہ سونیا سے کہہ رہا تھا "اب فرہاد تم سے رابطہ قائم کرے تو تم اس سے ضد کرو گی کہ وہ تمہیں یہاں سے رہائی دلانے کے لیے دونوں شرائط کو تسلیم کرلے۔"

"میں ضد کروں گی اور اسے دونوں شرائط تسلیم کرنے پر مجبور کروں گی۔"

"سونیا! تم میری مطیع اور فرماں بردار ہو۔"

"میں تمہاری مطیع اور فرماں بردار ہوں۔"

"مجھے بتاؤ' فرہاد ان دنوں کس ملک میں ہے۔"

"وہ ان دنوں فرانس میں ہے۔"

"وہ فرانس کے کس شہر میں ہے؟"

"پیرس میں۔"

"اس کی رہائش کہاں ہے؟"

"میں نہیں جانتی ۔ وہ کسی کو نہیں بتاتا ہے ۔ جب چاہتا ہے چپکے سے آکر ملاقات کرلیتا ہے۔"

"وہ تم لوگوں سے جھوٹ بول سکتا ہے۔"

"وہ ہم لوگوں سے جھوٹ بول سکتا ہے۔"

"میری بات کو نہ دُہراؤ ۔ میرے سوال کا جواب اپنی طرف سے دو ۔ بتاؤ کیا وہ پیرس کے علاوہ کسی دوسرے شہر میں نہیں رہ سکتا' کسی دوسرے ملک میں نہیں رہ سکتا؟"

"نہیں رہ سکتا۔"

"تم کیسے کہہ سکتی ہو ۔ وہ جرمن سے' اٹلی سے' ترکی سے' یونان سے' کسی بھی ملک سے' کسی بھی طیارے سے صرف ایک گھنٹے میں پیرس پہنچ سکتا ہے اور تم لوگوں سے کہہ سکتا ہے کہ وہ پیرس میں ہے۔"

"ممکن ہے' وہ ایسا کرتا ہو ۔ میں نہیں جانتی۔"

"کل فرہاد تم سے رابطہ قائم کرے گا تو تم اس وقت گھڑی میں یہاں کا وقت دیکھو گی اور اچانک ہی اس سے وقت پوچھو گی ۔ وہ یقیناً جس ملک میں ہوگا اسی ملک کا وقت بتائے گا ۔ ہم یہاں کے وقت کے مطابق اس کے بتائے ہوئے وقت کا موازنہ کریں گے اور اندازہ کرسکیں گے کہ وہ کس ملک میں ہے ۔ آج تم نے سونے میں دیر کردی ۔ کل تم سونے کے لیے ٹھیک دس بجے بستر پر آجاؤ گی۔"

"کل میں ٹھیک دس بجے اپنے بستر پر سونے کے لیے آجاؤں گی۔"

"اور تم اسی طرح میری معمولہ بنو گی۔"

"میں اسی طرح تمہاری معمولہ بنوں گی۔"

"جو ہدایات دی ہیں اسے یاد رکھو گی اور فرہاد کو میری ہدایت کے مطابق عمل کرنے پر مجبور کرو گی۔"

"میں تمہاری ہدایات کے مطابق فرہاد کو عمل کرنے پر مجبور کروں گی۔"

"اب تم آہستہ آہستہ نیند کی آغوش میں چلی جاؤ۔"

"میں آہستہ آہستہ نیند کی آغوش میں چلی جاؤں گی۔"

"تم میری باتوں کا جواب نہیں دو گی ۔ چپ چاپ سکون سے سو جاؤ گی ۔ تم سو رہی ہو ۔ تم سو رہی ہو . . . ."

سونیا کے دماغ میں دو طرفہ کارروائیاں جاری تھیں ۔ اُدھر ربّی اسفندیار تھا ۔ اِدھر میں تھا ۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کا عمل ختم ہونے کے بعد سونیا دردِ سر محسوس کرے ۔ دو طرفہ عمل کے نتیجے میں وہ پریشان ہوسکتی تھی یا عمل ختم ہونے کے باوجود اس کے چہرے سے پریشانی کا اظہار ہوسکتا تھا ۔ ربّی اسفندیار نے اسے سونے کی تاکید کی تو میں بھی اسے ٹیلی پیتھی کی لوری سُناتا گیا حتیٰ کہ وہ گہری نیند سو گئی ۔

ربّی اسفندیار یقیناً اس کی خواب گاہ سے باہر چلا گیا ہو گا ۔ اپنے معمول یا اپنی معمولہ کو تنویمی عمل کے دوران سلا دینے کے بعد عامل اس کمرے میں نہیں رہتا ۔ ویسے بھی سونیا کی طرف سے مجھے اس حد تک اطمینان تھا کہ اسے کوئی جانی یا جسمانی نقصان نہیں پہنچائے گا اس لیے میں وہاں سے ثبات معظّم کے پاس چلا آیا ۔

وہ اسی کلب میں بالکونی کی ایک میز کے پاس بیٹھا ہوا تھا ۔ میز کے اطراف وہی تین یہودی اکابر تھے ۔ ان میں سے ایک کہہ رہا تھا "یہ دُنیا کچھ سمجھ میں نہیں آتی ۔ بڑے ہی دوغلے قسم کے لوگ ہیں ۔ ہم یہودیوں سے نفرت کرتے ہیں مگر ہمارے ساتھ تجارت بھی کرتے ہیں۔"

دوسرے نے کہا "ہم سے تجارت نہیں کریں گے تو کہاں جائیں گے ۔ دُنیا میں سب سے بڑا اور سب سے اہم اور سب سے منافع بخش کاروبار لوہے کا ہے ۔ لوہے کی پیداوار' لوہے کی صنعت پر اور لوہے کی تجارت پر ہماری اجارہ داری ہے ۔ خواہ وہ امریکا میں ہو یورپ میں ہو' ایشیا میں ہو یا جاپان میں ہو ۔ ہم ہی ہم اس کاروبار پر چھائے ہوئے ہیں۔"

تیسرے نے کہا "لوہے کے بعد نگیٹو فلم کا کاروبار دوسری حیثیت رکھتا ہے اور یہ کاروبار بھی ہماری مٹھی میں ہے۔"

ثبات معظّم نے اعتراض کرتے ہوئے کہا "اب یہ بات نہیں رہی ۔ اتنی بڑی دُنیا میں ایک ننھا سا ملک جاپان ہمارے مقابلے پر بڑا کامیاب ہے ۔ لوہے کی صنعت ہو یا فلم کی وہ مارکیٹ پر چھا رہا ہے۔"

"بیشک ۔ لیکن وہ بہت محدود ہے ۔ پھر یہ کہ لوہے کی خام

پیداوار ہمارے ہاں زیادہ ہے۔ جاپان میں نہ ہونے کے برابر ہے۔"

"بہرحال جو کچھ ہو، کہنے کا مقصد یہ ہے کہ لوگ ہم سے نفرت کرتے ہیں لیکن ہمارے محتاج ہیں۔ ہمارا کھاتے ہیں، ہم پر غراتے ہیں۔"

ایک نے ہنستے ہوئے کہا۔ "یہ تو صنعتی اور تجارتی زندگی کی اشد ضروریات ہیں۔ لیکن وہ کاروبار جن کا تعلق انسانی زندگی سے کچھ ضروری نہیں ہے اس کے لیے بھی لوگ ہمارے محتاج ہیں۔ مثلاً کاسمیٹک کے پرفیومری، ایسے جتنے بھی سنگھار کے سامان ہیں، ان کو زیادہ سے زیادہ ہم ہی تیار کرتے ہیں۔"

ایک نے کہا۔ "مسلمان بڑی نفرت سے کہتے ہیں کہ یہودیوں کا نام لو تو وضو ٹوٹ جاتا ہے لیکن مسلمان عورتیں ہمارے کاسمیٹک سے سنگھار کرتی ہیں۔ ہمارے پرفیوم سے معطر معطر اپنے مردوں کی توبہ توڑتی رہتی ہیں۔"

اس بات پر سبھی قہقہے لگانے لگے۔ وہ مسلمانوں کا مذاق اُڑا رہے تھے۔ مجھے غصہ آنا چاہیے تھا مگر یقین کیجیے غصہ نہیں آیا بلکہ شرم سے میرا سر جھک گیا۔ وہ جھوٹ تو نہیں کہہ رہے تھے، ان کی ایک ایک بات سچ تھی اور سچ کا زہر پینا بڑے دل گردے کا کام ہوتا ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ عورتوں کو سنگھار نہیں کرنا چاہیے۔ نہیں، یہ ان کا فطری حق ہے۔ بات صرف عورتوں کی ہی نہیں، مردوں کی بھی ہے۔ مردوں کو بھی خوب سے خوب تر بن کر رہنا چاہیے۔ کسی کے سامنے آنے کے لیے اچھی صورت بنا کر آنا ضروری ہوتا ہے۔ جب ہم پالش کے ذریعے اپنے جوتوں کو چمکا سکتے ہیں تو کاسمیٹک کے ذریعے اپنے چہرے کو کیوں نہیں چمکا سکتے۔ یہ بے حیائی نہیں ہے بلکہ یہ حسن کی معراج کو پا لینے کی بات ہے۔ شاعری کو زندہ رکھنے کے لیے حسن کو زندہ رکھنا ضروری ہے اور حسن کی زندگی خوب سے خوب تر رہنے میں ہے۔

میں اس موضوع پر تقریر نہیں کرنا چاہتا لیکن مسلمانوں کی تجارت کے سلسلے میں بنیادی کمزوریوں کی نشان دہی کر دینا چاہتا ہوں۔ ہمیں سمجھایا جاتا ہے کہ ہم اپنے ملک کی مصنوعات استعمال کریں لیکن ہماری مصنوعات کی قیمتیں بھی زیادہ ہوتی ہیں معیار بھی نہیں ہوتا۔ بیرونی مال کی چمک دمک، اشتہار بازی، پھر ان کے مال کی کوالٹی، اوزان اور قیمت اتنی مناسب ہوتی ہے کہ سب اسی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں۔ غیر ملکی مصنوعات خواہ دوست ملکوں کی ہوں یا دشمن ملکوں کی، ان کا بائیکاٹ کرنے کا سب سے سیدھا راستہ یہی ہے کہ ہماری ملکی مصنوعات تیار کرنے والے سیدھے، سچے اور ایمان دار ہوں۔ صرف منافع خور نہ ہوں۔

ثبات معظم نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "جس طرح دُنیا کی بڑی سے بڑی تجارت پر ہماری اجارہ داری ہے اسی طرح ٹیلی پیتھی کی صلاحیت ہمارے کسی یہودی کے پاس ہوتی تو آج یہ دُنیا ہمارے قدموں تلے ہوتی۔"

ایک یہودی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تجارت اور صلاحیت وہی پائیدار ہوتی ہے جو ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتی رہتی ہے۔ مثلاً فرہاد علی تیمور کی عمر کیا ہوسکتی ہے؟"

"ہم میں سے کون کہہ سکتا ہے کہ کسی کی عمر کتنی ہے۔ ہم یہاں بیٹھے بیٹھے مر سکتے ہیں۔ اسی طرح فرہاد جہاں بھی ہے وہاں پلک جھپکتے ہی اس کی طبعی عمر ختم ہوسکتی ہے۔ اسے بھی موت آسکتی ہے۔"

"پھر بھی فرض کرلو کہ اس کی عمر دس برس، بیس برس یا پچاس برس تک ہوسکتی ہے۔ وہ آدھی صدی تک زندہ رہ سکتا ہے۔ اس کے بعد اس کی ٹیلی پیتھی کہاں جائے گی؟ کیا وہ صلاحیت اس کی اولاد میں منتقل ہوسکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ یہ وراثت والی بات نہیں ہے کہ باپ کے پاس جو جائداد ہے وہ بیٹے کو دے دی گئی۔"

دوسرے نے کہا۔ "ہاں، اگر ہم اپنی موجودہ پالیسی پر مستقل مزاجی سے قائم رہے تو دنیا کی بڑی بڑی تجارتیں ہماری آئندہ نسلوں تک بھی اسی طرح منتقل ہوتی رہیں گی جس طرح ہمارے آبا و اجداد نے اپنی تمام تجارتوں اور اپنی تمام صلاحیتوں کو ہم میں منتقل کیا تھا۔"

ثبات معظم نے کہا۔ "تم لوگ فرہاد کے سلسلے میں پچاس برس تک اسے زندہ رکھنے کی باتیں کر رہے ہو جب کہ ہم اسے پچاس سیکنڈ بھی برداشت نہیں کر سکتے۔"

"اسے برداشت کرنا یا نہ کرنا آپ لوگوں کا کام ہے۔ اگر آپ اسے مار سکتے ہیں تو دیر کس بات کی ہے۔ مگر ہم کاروباری لوگ ہیں، ہر معاملے میں اپنا منافع پہلے دیکھتے ہیں۔ اگر فرہاد کی ٹیلی پیتھی سے ہم فائدے اٹھا سکتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ اسے زندہ رکھیں۔ ہر ممکن طریقے سے سمجھوتا کریں یا اس کے ذریعے اپنے ہاں کے لوگوں کو ہی باصلاحیت بنائیں۔ کوئی بھی علم ورثے میں نہیں ملتا۔ کسی اُستاد کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ ہماری جوان نسل اگر فرہاد کے ذریعے یہ علم حاصل کر سکے تو جس طرح دُنیا کی بڑی بڑی تجارتوں پر ہماری اجارہ داری ہے اسی طرح ٹیلی پیتھی کے علم پر بھی ہماری اجارہ داری ہو گی۔"

میں نے اس یہودی کے دماغ میں رہ کر اسے ٹیڑھی نظروں سے دیکھنے پر مجبور کیا۔ اس نے نظروں کو یوں گھمایا کہ سامنے میز پر رکھی ہوئی ہر چیز دو دو نظر آنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اس کے دماغ کو آزاد چھوڑ دیا۔ وہ پریشان ہو کر سوچنے لگا: ٹھیک ہے کہ ہم نے کھانے سے پہلے شراب پی تھی لیکن ہم نارمل رہے تھے۔ بہت زیادہ نشے میں نہیں تھے۔ پھر کھانے کے بعد سرور کچھ کم ہو جاتا ہے۔

میں اچھی طرح محسوس کررہا ہوں کہ میں نشے میں نہیں ہوں۔ پھر میں نے ٹیڑھی نظروں سے ہر چیز کو کیسے دیکھا؟"

اس نے چور نظروں سے اپنے آس پاس بیٹھے ہوئے ساتھیوں کو دیکھا۔ اگر وہ اپنی حالت بیان کرتا تو اس کے ساتھی اس کا مذاق اڑاتے۔ یہی سمجھتے کہ وہ کچھ زیادہ نشے میں ہے۔ شاید بہکنے والا ہے۔

میں ثبات معظم کے دماغ میں پہنچ گیا۔ اس نے ایک زور کی سرد آہ بھری۔ تینوں یہودی چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ وہ جھینپ کر بولا "بہت رات ہوچکی ہے۔ اب ہمیں اٹھنا چاہیے۔"

"ہاں، میں بھی اتنی رات تک جاگنے کا عادی نہیں ہوں۔"

تیسرے نے کہا "ہاں بھئی، راتیں تو جوانوں کے لیے ہوتی ہیں۔ اب ہمارے آرام کا وقت ہے۔"

وہ سب اٹھنے لگے۔ اسی وقت ثبات معظم نے پھر ایک زور کی آہ بھری۔ وہ سب اٹھتے اٹھتے رہ گئے۔ انھوں نے چونک کر پھر اسے دیکھا۔ ایک نے پوچھا "کیا بات ہے؟"

وہ جھینپ کر بولا "کوئی خاص بات نہیں۔ بس مجھے امی کی ماں یاد آگئی۔ وہ مجھ سے اتنی محبت کرتی تھی، اتنی محبت کرتی تھی کہ میں نے اس کے مرنے کے بعد دوسری شادی نہیں کی۔"

سب قہقہہ لگاتے ہوئے اٹھنے لگے۔ ثبات معظم اپنی جگہ پریشان تھا۔ اس نے باتیں بنائی تھیں۔ دراصل وہ خود نہیں جانتا تھا کہ دو بار آہیں کیوں بھر چکا ہے۔ اسے تو امی کی ماں دور دور تک بھی یاد نہیں آئی تھی۔

وہ کلب کی عمارت سے باہر آئے۔ پھر ایک دوسرے سے رخصت ہوکر اپنی اپنی کاروں کی طرف جانے لگے۔ ثبات معظم اسٹیئرنگ سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔ اس نے جیب سے چابی نکالی اور کی ہول میں ڈالنے لگا لیکن چابی سوراخ میں نہیں گئی۔ وہ پریشان ہوکر سوچنے لگا "کیا بات ہے۔ ایسا تو میرے ساتھ پہلے کبھی نہیں ہوا۔ وہاں میں نے اتنے معزز لوگوں کے سامنے دو بار آہیں بھریں۔ آخر کیوں؟ بغیر کسی وجہ کے میرے منہ سے آہیں کیسے نکل گئیں؟ ابھی میں پورے ہوش و حواس میں ہوں۔ پھر بھی چابی سوراخ میں نہیں ڈال سکا۔"

میں نے اس کی سوچ میں کہا "میرا وہم ہے۔ بھلا سوراخ میں چابی کیوں نہیں جائے گی؟"

اس سوچ کے ساتھ ہی اس نے کی ہول میں چابی ڈالی تو وہ چلی گئی۔ اس نے اسے گھمایا۔ کار اسٹارٹ کی۔ پھر اسے ڈرائیو کرتے ہوئے جانے لگا۔ میں نے اسے چھوڑ دیا۔ اب سے کچھ عرصہ پہلے میں نے سوچا تھا کہ دشمنوں کو یکبارگی مارنے سے بہتر ہے کہ انھیں دہشت میں مبتلا کیا جائے۔ انھیں نفسیاتی مریض بنایا جائے۔ وہ آہستہ آہستہ نیم پاگل ہوجائیں گے۔ ان کے لیے یہی مناسب سزا تھی۔

میں ڈربی فائن کے دماغ میں پہنچ گیا۔ وہ کلب کی عمارت سے باہر نکل رہا تھا۔ اس کے ساتھ وہی دوشیزہ اور اس کے والدین تھے اور وہ باتیں کرتے جارہے تھے۔ میں ڈربی فائن کے ذریعے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ اس دوشیزہ کا نام کلاڈیا تھا۔ اس کا باپ ایک اسلامی ملک میں چیف انجینئر تھا۔ اس اسلامی ملک میں تیل نکالنے اور نئی صنعتیں قائم کرنے کے سلسلے میں امریکہ کے بہت سے پروجیکٹ کام کررہے تھے۔ انہی میں سے ایک پروجیکٹ میں وہ چیف انجینئر تھا۔ اس کے پاسپورٹ اور کاغذات کے مطابق وہ ایک امریکی عیسائی تھا۔ دو ماہ کی چھٹیاں لے کر اپنی فیملی کے ساتھ امریکہ گیا تھا لیکن وہاں صرف ایک ہفتے قیام رہا۔ دراصل وہ خاندان یروشلم میں اپنی چھٹیاں گزارنا چاہتا تھا اور بیت اللہ (بیت المقدس) کی زیارت کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے وہ امریکہ سے خفیہ طور پر وہاں چلے آئے تھے۔ اب کسی بھی اسلامی ملک کو کیا پڑی ہے کہ کسی کے متعلق اتنی چھان بین کرے۔ ان ملکوں کے پاس بے اندازہ دولت آچکی تھی۔ وہ دولت کے نشے میں چور تھے۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے بہت زیادہ ذہانت کی ضرورت نہیں ہے کہ یہودی دوشیزائیں، یہودی ڈاکٹرز، انجینئرز اور دوسرے ہنرمند تمام اسلامی ممالک میں امریکہ جیسے ملکوں کی مدد سے پہنچتے ہیں۔ پھر وہاں انھیں جاسوسی کی بڑی سہولتیں حاصل ہوجاتی ہیں۔

اس چیف انجینئر کا نام رینڈال اسکاؤٹ تھا۔ میں نے اس کے لب و لہجے کو ذہن نشین کرنے کے بعد فی الحال اسے بھی چھوڑ دیا۔ ڈربی فائن کے ساتھ لگا رہا۔ وہ وہاں سے رخصت ہوکر اپنی جیپ کے پاس آیا۔ وہاں تین مسلح فوجی تھے۔ انھوں نے اسے دیکھ کر سلیوٹ کیا۔ وہ جیپ کے پچھلے حصے میں بیٹھ گیا۔ وہ فوجی بھی بیٹھ گئے۔ ایک نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ پھر جیپ اسٹارٹ کرکے ایک طرف جانے لگا۔ اسی وقت میں نے چپکے سے کہا "ہیلو مسٹر فائن!"

وہ ایک دم سے اپنی سیٹ پر سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔ اس نے کن انکھیوں سے اپنے قریب بیٹھے ہوئے فوجیوں کو دیکھا۔ پھر پوری توجہ سے اپنی دماغی حالت کا تجزیہ کرنے لگا۔ میں نے کہا "میں فرہاد علی تیمور تم سے مخاطب ہوں۔ میں نے مائیکروفون کے بھیجے ہوئے کیسٹ کے ذریعے تمھاری آواز سن لی تھی۔"

وہ سوچنے لگا "کیا مسٹر فرہاد علی تیمور اسی طرح دماغ میں بولتے ہیں؟ کیا میں یقین کرلوں کہ اس وقت فرہاد صاحب میرے دماغ میں موجود ہیں؟"

"مسٹر فائن! یقین کرنے کے لیے اپنے دل میں تہیہ کرلو۔ دماغ

کی پوری قوتِ ارادی سے سوچ لو کہ تم اپنی اوپری جیب میں ہاتھ نہیں ڈالو گے۔"

اس کی سوچ نے کہا۔"ہاں، میں اپنی اوپری جیب میں ہاتھ نہیں ڈالوں گا۔"

دوسرے ہی لمحے میں اس کے دماغ پر قابض ہو گیا۔ اس نے اوپری جیب میں دو انگلیاں ڈال کر امریکی دس ڈالر کا ایک نوٹ نکالا۔ میں نے اس کے دماغ کو آزاد چھوڑ دیا۔ اس کے ذہن کو ایک ہلکا سا جھٹکا لگا۔ اس نے چونک کر اپنے ہاتھ میں دس ڈالر کا نوٹ دیکھا، پھر سوچنے لگا۔"یہ تو میری اوپری جیب میں تھا۔ باہر کیسے آگیا؟ کیا میں نے اسے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر نکالا ہے؟"

"ہاں، تم نے نکالا ہے۔ اب میں تمہارے دماغ پر پوری طرح قابض نہیں رہوں گا۔ تم اپنے ہوش و حواس میں رہو گے لیکن بے اختیار وہی حرکت کرو گے جو میں چاہوں گا۔ یعنی اب یہ نوٹ تم واپس اپنی اوپری جیب میں رکھو گے۔"

میں نے سوچ کی لہروں کے ذریعے اسے مجبور کیا۔ وہ نوٹ رکھنا نہیں چاہتا تھا لیکن بے اختیار اس کا ہاتھ اپنی جیب میں چلا گیا۔ نوٹ اس کی جیب میں پہنچ گیا۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "مسٹر فرہاد علی تیمور! میں قائل ہو گیا ہوں۔ آپ واقعی میرے دماغ میں موجود ہیں۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ مجھے آپ کی موجودگی سے کتنی خوشی حاصل ہو رہی ہے۔"

"بیان کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ دل اور دماغ کی جو کیفیت الفاظ میں دوسروں کے سامنے ظاہر نہیں کی جا سکتی، اسے میں سوچ کی لہروں کے ذریعے دماغ سے پڑھ لیتا ہوں۔"

"اوہ، میں تو بھول ہی گیا تھا۔ ساری دنیا مختلف زبانوں کی ترجمان ہوتی ہے لیکن آپ مختلف جذبوں کے ترجمان ہیں۔"

"کیا اس وقت ڈیوٹی پر جا رہے ہو؟"

"جی ہاں، ہماری شفٹ بدلتی رہتی ہے۔ آج سے میری شفٹ رات کے دو بجے سے صبح نو بجے تک ہے۔"

"تمہاری ڈیوٹی اسرائیل کے مغربی ساحل پر ہے؟"

"جی ہاں، ایک وقت میں چھ آفیسروں کی ڈیوٹی ہوتی ہے۔ ان کے ساتھ ان کا فوجی عملہ ہوتا ہے۔ ہر آفیسر سمندر کے ساحل پر چار میل تک گشت کرتا ہے۔ ہر چوتھے میل پر ایک چیک پوسٹ ہے جہاں سے دوسری طرف آنے والا آفیسر آ کر ملاقات کرتا ہے۔ ہم ایک دوسرے کو اپنی رپورٹ دیتے ہیں۔ پھر اپنے دفتر رپورٹ پہنچاتے ہیں کہ ہم نے ساحل پر کچھ نہیں دیکھا ہے۔ سب خیریت ہے۔"

"وہاں کس قسم کا خطرہ محسوس کیا جاتا ہے؟"

"وہ اسرائیل کی بحری سرحد ہے۔ وہاں سے کوئی بھی اسرائیل میں داخل ہو سکتا ہے۔ اس لیے شام کو اندھیرا ہونے سے پہلے تقریباً چونسٹھ میل تک کتنے ہی رولر چلا کر ساحلی ریت کو ہموار کر دیا جاتا ہے تاکہ رات کے اندھیرے میں کوئی بھی آئے تو ریت پر قدموں کے نشان پڑ جائیں۔ اس کے علاوہ ہر پندرہ بیس منٹ کے بعد ساحل پر دور دور تک ٹریسر گولیاں داغتے ہیں جس سے سمندر کا کچھ حصہ اور ساحل کا تمام حصہ رات کے اندھیرے میں روشن ہو جاتا ہے۔ کوئی بھی چوری سے آنے والا نظروں میں آجاتا ہے۔"

"کیا ساحل پر پہنچتے ہی تمہاری ڈیوٹی شروع ہو جائے گی؟"

"جی ہاں، ساحل پر تو پہنچ ہی گیا ہوں۔ میری ڈیوٹی جنوب سے شمال کی طرف رہتی ہے۔ پھر میں چار میل جانے کے بعد شمال سے جنوب کی طرف واپس آتا ہوں۔ ابھی میں جنوب کی چیک پوسٹ پر رپورٹ بک کا مطالعہ کروں گا۔ اس پر دستخط کروں گا۔ پھر شمال کی طرف اپنی گشتی جماعت کے ساتھ روانہ ہو جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے، چیک پوسٹ پر جو اہم افسران ہیں، میں تمہارے ذریعے ان کے دماغوں میں پہنچ جاؤں گا۔"

"کیا آپ مجھے بتانا پسند کریں گے کہ آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟"

"میں تباہی نہیں مچاؤں گا۔ صرف ہلکی پھلکی سی ذہنی پریشانیاں پیدا کروں گا تاکہ وہ سوچتے رہیں کہ ان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ بار بار سوچنے کے باوجود ان کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ اس طرح وہ ذہنی مریض بن جائیں گے۔"

"جناب! میں سمجھ گیا۔ بہت اچھا طریقہ ہے۔ دشمن کو جان سے مارنے سے بہتر یہ ہے کہ اسے ذہنی خلجان میں مبتلا رکھا جائے۔"

اس وقت تک وہ چیک پوسٹ پر پہنچ گیا تھا۔ ساحلی چٹانوں کی بلندی پر چیک پوسٹ کی عمارت تھی اور اس عمارت کی چھت پر کئی ہزار وولٹ کی موونگ اسپاٹ لائٹیں نصب کی گئی تھیں۔ ان کے ذریعے دور ساحل اور سمندر تک دیکھا جا سکتا تھا۔

ڈربی فائن نے وہاں پہنچتے ہی چیک پوسٹ کے آفس انچارج سے گفتگو کی۔ میں نے فائن سے کہا۔"میرے لیے اتنا کافی ہے۔ میں اس کے دماغ میں پہنچ جاؤں گا۔ کوشش یہی کریں کہ انگریزی میں گفتگو ہوتی رہے۔"

وہ اپنے ایک چھوٹے سے دفتر میں آیا۔ اس سے پہلے ڈیوٹی دینے والا آفیسر اپنی رخصتی کے وقت کی رپورٹ لکھ رہا تھا۔ وہ اس سے باتیں کرنے لگا۔ میں نے اس کے لب و لہجے کو بھی ذہن نشین کر لیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ وہاں سے روانہ ہو گیا۔ ڈربی فائن اپنی ڈیوٹی کے آغاز کی رپورٹ لکھنے بیٹھ گیا۔ میں اسے چھوڑ کر اس آفیسر کے دماغ میں پہنچا جو اب آرام کرنے اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ ان افسروں اور دوسرے فوجیوں کے کوارٹرز ساحلی علاقے میں ہی تھے۔ جب مجھے

یقین ہوگیا کہ جاتے ہی وہ اپنے گھر میں سو جائے گا تو میں نے اسے تھوڑی دیر کے لیے چھوڑ دیا۔ ثبات معظم کے پاس پہنچ گیا۔ وہ لباس بدلنے کے بعد بستر پر لیٹ گیا تھا اور سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے ٹیلی پیتھی کی لوری سنا کر اُسے تھپک تھپک کر سلا دیا۔ صرف پانچ منٹ لگے، وہ گہری نیند سو گیا۔ میں نے اس کے خوابیدہ دماغ کو ٹرانس میں لانے کی کوشش کی۔ اس سے کہا کہ اب وہ میری ہدایات پر اُٹھے گا۔ اس کی آنکھیں بند رہیں گی۔ وہ نیند کی حالت میں رہے گا لیکن وہی عمل کرے گا جو اس کا دماغ اسے کہتا رہے گا۔

وہ میرا معمول بن کر بستر پر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس نے اپنے سرہانے کے تکیے کو اٹھا کر پائینتی رکھا۔ پھر بستر کے نیچے رکھے ہوئے جوتے اُٹھا کر سرہانے کے تکیے کی جگہ رکھ دیے۔ اس کے بعد وہ ان جوتوں پر سر رکھ کر اور تکیے پر پاؤں رکھ کر سو گیا۔ میں نے اسے سونے کے لیے چھوڑ دیا۔

اتنی دیر میں وہ چیک پوسٹ والا آفیسر اپنے بستر پر آکر لیٹ گیا تھا۔ میں نے اسے بھی تھپک تھپک کر سلا دیا۔ اس کے سونے کے بعد میں نے خوابیدہ دماغ کو اپنی مٹھی میں رکھا۔ پھر اسے بستر سے اُٹھا دیا۔ وہ جوتے پہن کر اپنی رہائش گاہ سے باہر نکلا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں جیسے وہ جاگ رہا ہو لیکن نیند کی حالت میں وہ میرا معمول تھا۔ میرے مشورے کے مطابق عمل کر رہا تھا۔ اس کی رہائشگاہ چیک پوسٹ سے تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔ میں اسے چیک پوسٹ سے ایک میل دور لے گیا۔ وہاں تاریکی تھی اور دور دور تک کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ ایک ساحلی کاٹیج کی آڑ میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ انتظار کرنے لگا۔ تقریباً پندرہ منٹ کے بعد ٹریسر گولی کی روشنی چاروں طرف پھیل گئی اور دور تک ساحل اور سمندر دکھائی دینے لگا۔ پھر رفتہ رفتہ تاریکی چھانے لگی۔ اب پندرہ بیس منٹ کا وقفہ ہونے والا تھا۔ میں نے اسے ساحل کی طرف جانے پر مجبور کیا۔ وہ جب ہموار کی ہوئی ساحلی ریت پر پہنچا تو الٹے قدموں سمندر کی طرف جانے لگا۔ تیزی سے چلتے ہوئے اس مقام تک پہنچ گیا جہاں تک سمندر کی لہریں آکر پلٹ جاتی تھیں۔ اب دیکھنے والے یہی سمجھتے کہ کوئی سمندر کی طرف سے ساحل کی طرف آیا ہے۔

اس نے میری ہدایات کے مطابق اپنے جوتے اتار لیے۔ اب وہ ننگے پاؤں تھا۔ پھر وہ ننگے پاؤں سمندر سے ساحل کی طرف تیزی سے دوڑتے ہوئے جانے لگا۔ کیوں کہ پندرہ بیس منٹ کا وقفہ پورا ہونے والا تھا۔ یعنی جب وہ ساحل پر اسی کاٹیج کے قریب پہنچا تو ہموار کی ہوئی ساحلی ریت پر دو طرح کے نشان تھے۔ دیکھنے والے یہی سمجھ پاتے کہ سمندر سے دو شخص آئے ہیں۔ ایک جوتے پہنے ہوئے تھا۔ دوسرا ننگے پاؤں تھا۔ جب وہ کاٹیج کے پاس آگیا تو میں نے اسے جوتے پہنائے۔

پھر اسے تیزی سے چلاتا ہوا اس کی خواب گاہ تک پہنچا دیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے جوتے اتارے۔ اس کے فرشتے بھی نہیں جانتے تھے کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ وہ بستر پر لیٹ گیا۔ پھر میں نے اسے ہدایت دی۔ وہ میری ہدایت کے مطابق آنکھیں بند کر کے سونے لگا۔ میں نے اسے چھوڑ دیا۔

اتنی دیر میں ڈربی فائٹن شمالی چیک پوسٹ تک پہنچ گیا تھا اور وہاں اس آفیسر سے باتیں کر رہا تھا جو دوسری طرف چار میل کا فاصلہ طے کر کے اس چیک پوسٹ پر آیا تھا اور وہ دونوں اپنی اپنی رپورٹ ایک رجسٹر پر لکھ رہے تھے۔ میں نے اس چیک پوسٹ کے آفس انچارج کی بھی باتیں سنیں لیکن وہاں کے ایک فوجی جوان کو اپنا ٹارگٹ بنایا۔ مجھے اس کے بھی سونے کا انتظار تھا۔ اس لیے فی الحال اسے چھوڑ دیا۔

وہاں جوڈو کراٹے سینٹر میں بلیک بیلٹر اور ٹیچر کی حیثیت سے گوٹیل کام کر رہا تھا۔ گوٹیل ماسکو میں کا آدمی تھا اور یہ وہی تھا جس نے ایک بلند عمارت کی چھت پر تلوار بازی کا مظاہرہ کیا تھا اور سونیا کے دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ اس وقت وہ گہری نیند میں تھا۔ واقعی رات اتنی گہری تھی کہ ہر شخص گہری نیند سو رہا تھا۔ میں نے گوٹیل کے خوابیدہ دماغ سے پوچھا ”میں تمہارے ذریعے کس کو ٹارگٹ بنا سکتا ہوں؟“

اس کے خوابیدہ دماغ نے جواب دیا ”بہت سے جوڈو کراٹے سیکھنے والے طلبا اور طالبات ہیں۔ اس کے علاوہ میں یہاں کے اعلیٰ حکام سے کبھی کبھی ملاقات کرتا ہوں۔ میرے ذریعے آپ اُن کے دماغوں تک پہنچ سکتے ہیں۔ ویسے ایک خاص بات ہے۔“

میں نے پوچھا ”کیا بات ہے؟“

”میرے ہاں جوڈو کراٹے سینٹر میں ایک تیس سالہ جوان ہے۔ وہ میرے شاگردوں میں سب سے زیادہ پھرتیلا ہے۔ لڑنے کے دوران اپنے داؤ پیچ اتنی پھرتی سے اور ایسے غیر متوقع انداز میں استعمال کرتا ہے کہ مقابل دیکھتا کا دیکھتا رہ جاتا ہے۔ وہ بلیک بیلٹر ہے اور اس کا دعویٰ ہے کہ وہ مادام سونیا کو شکست دے سکتا ہے۔ میں فوجی جوانوں کو گوریلا جنگ کی ٹریننگ دیتا ہوں۔ گوریلا فوج کے افسران کا بھی یہی خیال ہے کہ وہ جوان یقیناً سونیا پر بھاری پڑے گا۔ سب کی متفقہ رائے ہے کہ اسے سونیا سے ٹکرایا جائے۔ اگر سونیا راضی نہ ہو تو ایک دوستانہ ریسلنگ کا اہتمام کیا جائے۔ اس کے لیے کل صبح دس بجے کا وقت مقرر کیا گیا ہے۔ مادام سونیا کو فری اسٹائل کشتیاں دیکھنے کے لیے یہاں کے اسٹیڈیم میں بلایا جائے گا اور اسی دوران وہ جوان مادام سونیا کو چیلنج کرے گا۔“

”تم اس نوجوان کو مخاطب کرو۔ میں اس کے دماغ میں پہنچنا چاہتا ہوں۔“

وہ میری ہدایت کے مطابق بیدار ہوگیا۔ اپنے بستر سے اٹھ کر خواب گاہ سے نکل کر دوسرے کمرے میں آیا۔ وہاں اس نے ٹیلیفون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کیے۔ تھوڑی دیر بعد ہی اس بلیک بیلٹ جوان سے رابطہ قائم ہوگیا۔ وہ اس وقت جاگ رہا تھا۔ گوئیل نے پوچھا "کیا تم ابھی تک جاگ رہے ہو؟"

"ہاں، پتا نہیں، مجھے کیوں بے چینی سی ہے۔ میں کئی بار سونے کی کوشش کر چکا ہوں لیکن بار بار یہ خیال دماغ پر حاوی ہوجاتا ہے کہ سونیا عورت نہیں چڑیل ہے۔ اگر عورت ہوتی تو آج تک کسی نہ کسی شہ زور سے شکست کھا چکی ہوتی۔ اس کا ریکارڈ بتاتا ہے کہ بڑے بڑے شہ زور اس سے مات کھا کر یا تو میدان چھوڑ گئے یا مر گئے۔"

"تم اس سے مرعوب ہو۔ خواہ مخواہ مقابلہ کرو گے تو اپنی ہی بے عزتی کراؤ گے۔"

"ٹیچر! میں مرعوب نہیں ہوں۔ بس یہ ہے کہ سونیا کی دھاک بیٹھی ہوئی ہے اس لیے میرے ذہن پر حاوی ہوگئی ہے۔ کل جب میں اسے شکست دوں گا تو اس کے برعکس میں اس کے دماغ پر حاوی رہا کروں گا۔"

"اگر تم اب تک جاگ رہے ہو تو کل مقابلہ کیسے کرو گے؟ اس وقت چار بج رہے ہیں۔"

"میں نیند کی گولی کھا کر سو رہا ہوں۔ صبح آٹھ بجے تک تازہ دم ہو کر بیدار ہوجاؤں گا۔"

گوئیل نے ریسیور رکھ دیا۔ میں اس جوان کے دماغ میں پہنچ گیا۔ وہ ریسیور رکھنے کے بعد اپنے بستر کے سرہانے والی میز سے ایک شیشی اٹھا کر ایک خواب آور گولی نکال رہا تھا۔ میں چاہتا تو اسے ٹریپ کر کے ایک کی جگہ دس گولیاں کھلا سکتا تھا پھر وہ ہمیشہ کے لیے سو جاتا لیکن میں نے اسے چھوڑ دیا۔ مجھے سمندر کے اس ساحلی علاقے سے دلچسپی تھی، جہاں ڈربی فاش اپنی ڈیوٹی پر تھا۔ میں اس کے ذریعے مختلف افسروں اور فوجی جوانوں کے دماغوں میں پہنچتا رہا۔ انھیں ٹریپ کرتا رہا۔ تقریباً ایک گھنٹے کے اندر میں نے اس ساحل پر چار جگہ ایسے نشان بناتے جیسے سمندر کے راستے سے کچھ لوگ خفیہ طور پر تل ابیب میں داخل ہوئے ہوں۔ یہ کام کرنے کے بعد میں دماغی طور پر اپنی جگہ حاضر ہوگیا۔

سنگاپور میں دن نکل آیا تھا۔ آٹھ بج کر پندرہ منٹ ہو چکے تھے۔ اسی وقت روشنی بیدار ہوئی تھی۔ جب میں نے اپنی آنکھیں کھول کر دیکھا تو وہ میری خواب گاہ کے دروازے پر کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے حیرانی سے پوچھا "تم ابھی تک جاگ رہے ہو؟"

"ہاں، مجبوری تھی۔ اب جا کر سو جاؤں گا۔"

"ایک دن تم ضرور پاگل ہوجاؤ گے۔ یہ مسلسل خیال خوانی تمہارے حق میں بہت ہی نقصان دہ ثابت ہوگی۔"

"میں سمجھتا ہوں۔ لیکن حالات مجھے مجبور کر دیتے ہیں۔"

میں بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ میں نے آنکھیں بند کر کے سنجالی سے کہا "میں تمام رات جاگتا رہا ہوں۔ اب سونے جا رہا ہوں۔ چار گھنٹے بعد بیدار ہونا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد تم سے رابطہ قائم کروں گا۔"

میں نے سونیا کے دماغ میں جھانک کر دیکھا۔ ابھی وہاں صبح ہونے والی تھی۔ وہ سو رہی تھی۔ میں مطمئن ہو کر اپنے دماغ کو ضروری ہدایات دے کر سو گیا۔

میرے سونے کے دوران اسرائیل کے مغربی ساحل پر جیسے پوری اسرائیلی فوج حرکت میں آگئی تھی۔ انٹیلی جنس کے لوگ ساحل پر پہنچ گئے تھے۔ ریت پر بنے ہوئے قدموں کے نشانات کی تصویریں اتاری جا رہی تھیں اور تحقیقات ہو رہی تھیں کہ پندرہ بیس منٹ کے وقفے سے جو ٹریسر گولیاں داغی جاتی ہیں۔ اتنے کم وقفے میں کون کشتی یا موٹر بوٹ کے ذریعے آسکتا ہے۔ میں نے وہاں قدموں کے نشانات بنانے میں بہت سوچ بچار سے کام لیا تھا۔ ایک شخص کو تو صرف ایک بار جوتا پہنا کر الٹے قدموں سمندر تک لے گیا تھا۔ پھر دوسری بار ننگے پاؤں لایا تھا۔ اس طرح یہ تاثر قائم ہوتا تھا کہ سمندر سے دو آدمی آئے ہیں۔ ایک جوتے پہنے ہوئے تھا۔ دوسرا ننگے پاؤں تھا۔ باقی تین جگہ جو نشانات بنوائے، وہاں میرا یہ عمل رہا کہ جس فوجی کو بھی میں نے نیند کی حالت میں ٹریپ کیا، وہ ایک جوڑا جوتا پہن کر گیا اور دوسرا ایک جوڑا ہاتھ میں لے کر گیا۔ سمندر تک جاتے وقت وہ الٹے قدموں گیا پھر وہاں جا کر اس نے پہلے جوتے اتارے۔ دوسرے جوتے پہنے۔ اس طرح ریت پر مختلف جوتوں کے تلووں کے نشان پائے گئے۔ جہاں بھی میرے شکار ہونے والوں نے اپنے پاؤں کے جوتے تبدیل کیے وہاں سمندر کی لہریں آتی تھیں۔ اس لیے جوتے تبدیل کرنے کی جگہ کے نشانات لہروں کے ذریعے مٹ گئے تھے۔

اس ساحلی علاقے میں آج تک ایسا نہیں ہوا تھا کسی کی مجال نہیں تھی کہ کوئی اس راستے سے گزر سکتا۔ رات کے اندھیرے میں راستہ بھٹکنے والا پرندہ بھی ٹریسر گولیوں کے ذریعے نظر آجاتا تھا۔ یہ انھیں شدید طور پر حیران کر دینے والی بات تھی۔ چار جگہ سے کم از کم آٹھ آدمی تل ابیب میں داخل ہو گئے تھے اور انھیں اس کا علم نہ ہوسکا۔ اور نہ ہی یہ سراغ مل رہا تھا کہ کون لوگ آئے ہیں اور تل ابیب کی شہری آبادی میں کہاں گم ہوگئے ہیں۔ ویسے وہ جوتوں کے تلووں کے نشانات کے ذریعے سراغ لگانے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہاں ڈیوٹی دینے والے افسران اور فوجیوں کی شامت آگئی تھی۔ انھیں ڈانٹا جا رہا تھا۔ سخت وارننگ دی جا رہی تھی۔ ان میں بے چارہ ڈربی فاش بھی شامل تھا۔ میں نے جان بوجھ کر اس کے علاقے میں بھی ایسے ہی نشانات بنوائے

تھے تاکہ اس پر شبہ نہ ہو کہ دوسری جگہ کو نشان بنے۔ صرف ڈبل فائن کی جگہ کیسے محفوظ رہی؟

یہ سب کچھ میرے سونے کے دوران ہوتا رہا۔ جاگنے کے بعد میں نے یہ معلومات حاصل کی تھیں۔ میرے سونے کے دوران ثبات معظم بھی اپنے وقت پر صبح بیدار ہو گیا تھا۔ بیدار ہوتے ہی اس کی کھوپڑی گھوم کر رہ گئی تھی۔ اس نے حیرانی سے دیکھا۔ اس کے سرہانے تکیے کی جگہ جوتے رکھے ہوئے تھے اور پاؤں کے نیچے تکیہ تھا۔ وہ ایک دم سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا۔ حیرانی سے کبھی تکیے کو اور کبھی جوتوں کو دیکھتا رہا تھا۔

اس کے دماغ میں سب سے پہلا خیال یہی آیا "کیا فرہاد میرے دماغ میں پہنچ گیا ہے؟"

وہ ایک دم سے پریشان ہو کر پہلو بدلنے لگا۔ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ادھر سے ادھر ٹہلنے لگا۔ پھر اس نے جوتوں کو دیکھا۔ آگے بڑھ کر انھیں فرش پر رکھ دیا۔ سوچنے لگا "کیا میں رات کو کچھ زیادہ ہی نشے میں تھا؟"

اس سوال کے ساتھ ہی اسے یاد آیا کہ پچھلی رات یہودی تاجروں کے سامنے دو بار اس نے سرد آہیں بھری تھیں اور وہ سب کچھ اس سے بے اختیار ہوا تھا۔ آخر ایسا کیوں ہوا تھا۔ کیا فرہاد؟ وہ آگے نہ سوچ سکا۔ دھپ سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ نہ بیٹھتا تو گر پڑتا۔ اس کے گھٹنے کانپ رہے تھے۔ بار بار میری دہشت طاری ہو رہی تھی۔ اس نے سہمے ہوئے انداز میں مجھے مخاطب کیا "مسٹر فرہاد! کیا آپ میرے دماغ میں موجود ہیں؟"

میں اس وقت سو رہا تھا۔ اسے بھلا جواب کیا ملتا۔ اگر میں موجود ہوتا تب بھی جواب نہ دیتا۔ اسے تو دماغی مریض بنانا مقصود تھا۔ پہلے تو اس کے دماغ میں یہ بات آئی کہ یہ مضحکہ خیز واقعہ اپنے اعلیٰ حکام کو سنایا جائے پھر اس کے مفاد پرست ذہن نے سمجھایا "یہ سراسر حماقت ہو گی۔ جب وہاں کے حکام کو پتا چلے گا کہ فرہاد میرے دماغ میں پہنچ چکا ہے تو ثبات معظم کو اسرائیل کی حدود سے نکال دیا جائے گا۔ ایک ہفتے بعد اس کی بیٹی امینہ عرف امی فرہاد کو ٹریپ کرنے کی مہم پر روانہ ہونے والی تھی۔ اس کے بعد اسے ایک بہت بڑا اعزاز حاصل ہونے والا تھا۔ ایسے وقت وہ فرہاد کی موجودگی کا اپنے دماغ میں اعتراف کر کے جیتی ہوئی بازی کو ہار میں تبدیل کرنا نہیں چاہتا تھا۔

اس نے اپنے دماغ کو سمجھایا "ابھی مجھے سکون سے دیکھنا چاہیے کہ آگے آگے کیا ہوتا ہے۔ پچھلی رات میں نے دو بار بے اختیار آہیں بھری ہیں۔ پھر جوتے کو جانے کیسے سرہانے رکھ کر سو گیا لیکن ان باتوں سے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ لہٰذا فی الحال پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں غیر شعوری طور پر بہت زیادہ ڈسٹرب ہوں۔ بہت سے معاملات میں الجھا ہوا ہوں۔ شاید الجھنوں کے باعث ایسی حرکتیں سرزد ہو رہی ہیں۔ میں کسی ماہر نفسیات سے رجوع نہیں کر سکتا۔ اسے کچھ بتاؤں گا تو وہ سب کچھ میرے اعلیٰ حکام تک پہنچ جائے گا۔ دانشمندی یہی ہے کہ ابھی صبر کروں۔"

وہ صبح ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر لباس تبدیل کرنے کے بعد اپنے پروگرام کے مطابق سونیا کے پاس پہنچ گیا۔ پہنچتے ہی اس نے سوال کیا "مادام! کیا مسٹر فرہاد سے رابطہ قائم ہوا تھا؟ آپ نے ہماری شرائط پیش کی تھیں؟"

سونیا نے جواب دیا "ہاں فرہاد کو آپ کی پہلی شرط منظور ہے۔ وہ کہتے ہیں، آپ کے کسی بھی طالب علم کو ٹیلی پیتھی کا علم سکھا سکتے ہیں۔ اسی شرط پر مجھے رہا کیا جائے۔ آپ کی دوسری شرط نامعقول ہے۔ وہ کہتے ہیں، ان کی بیوی رسونتی سے ان کا ایک بچہ ہے۔ یہی ایک بچہ ان کو بلیک میل کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ یہی تجربہ اتنا تلخ ہے کہ آئندہ وہ کسی بچے کے باپ بننا پسند نہیں کریں گے۔"

ثبات معظم نے ہنستے ہوئے کہا "آپ عورت ہیں۔ یہ نہیں چاہتیں کہ آپ کے فرہاد صاحب کسی دوسری عورت سے شادی کریں ـــــ اور باپ بنیں۔"

"میں جو کہہ رہی ہوں۔ کسی حسد اور جلاپے کے تحت نہیں کہہ رہی ہوں۔"

"میں کیسے مان لوں۔ ہاں مسٹر فرہاد آپ کی گائیڈ آنٹی کے ذریعے مجھ سے گفتگو کریں تو میں مان لوں گا۔"

سونیا نے جواب دیا "شاید وہ گھنٹے دو گھنٹے بعد مجھ سے رابطہ قائم کریں۔ اس وقت میں کہوں گی کہ وہ گائیڈ آنٹی کے ذریعے آپ سے گفتگو کریں۔"

"شکریہ مادام! ایک اور بات۔ ابھی دس بجے یہاں کے ایک بہت ہی خوب صورت کورڈ اسٹیڈیم میں فری اسٹائل کشتیوں کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے ساتھ چلیں اور تماشا دیکھیں۔"

سونیا ایک جگہ محدود رہ کر اکتا رہی تھی۔ اس نے یہ دعوت قبول کر لی۔ سنگاپور کے وقت کے مطابق ساڑھے بارہ بجے میری آنکھ کھلی۔ میں نے سب سے پہلے منجالی سے رابطہ قائم کیا۔ پھر ہم دونوں نے مل کر لندن کے عبرانی ٹیچر سے تھوڑی سی عبرانی سیکھی۔ اسے ریکارڈ کیا۔ ذہن نشین کیا۔ پھر میں نے تقریباً سوا ایک بجے آنکھیں کھول کر دیکھا...
رسونتی دوسرے کمرے میں فرضی پارس کے ساتھ تھی۔ میرے بیدار ہونے کا انتظار کر رہی تھی تاکہ دوپہر کا کھانا کھا سکے۔ مجھے بھی بھوک لگ رہی تھی لیکن مجبوری تھی۔ ابھی ایک ضروری کام رہ گیا تھا۔

میں نے کبریا دان کے پاس پہنچ کر دیکھا۔ وہ طیارے میں سفر کر

رہا تھا۔ میں نے مرجانہ سے رابطہ قائم کیا۔ اسے بتایا کہ کرپا دان کس طیارے سے پیرس پہنچنے والا ہے۔ پہلے وہ معلوم کرلے کہ وہ فلائٹ کس وقت وہاں پہنچنے والی ہے۔ اس کے بعد وہ میک اپ کرکے ائیرپورٹ جائے اور کرپا دان کو اپنے ہاں مہمان رکھے۔ پھر میں نے پوچھا۔ وہ کس لباس میں ائیرپورٹ جائے گی اور اس کا کوڈ ورڈز کیا ہونا چاہیے؟ یہی باتیں میں نے کرپا دان کو بتادیں۔ اسے بھی کوڈ ورڈز یاد کرادیے۔ وہاں سے مطمئن ہونے کے بعد میں اپنی جگہ سے اٹھا۔ پھر غسل خانے کی طرف جاتے ہوئے خیال خوانی کے ذریعے رسونتی کو بتایا کہ آدھ گھنٹے بعد میں اس کے پاس آرہا ہوں۔ وہ کھانا تیار رکھے۔

غسل وغیرہ کے دوران میں نے اعلیٰ بی بی سے رابطہ قائم کر کے اسے بھی کرپا دان کے متعلق بتایا۔ اس نے کہا "میں ابھی میکی براڈلے سے رابطہ قائم کرتی ہوں اور اس سے کہتی ہوں کہ وہ پہلی فرصت میں کرپا دان کو اٹینڈ کرے۔"

"میکی براڈلے سے کہنا کہ ایک ہفتے کے اندر کرپا دان مکمل فرہاد علی تیمور بن جائے۔ تم اور مرجانہ مل کر اسے میرے چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے اور باتیں کرنے کے انداز سکھاتی رہو گی۔ کوشش کرنا کہ اس میں کسی بات کی کمی نہ رہ جائے۔"

"تم اطمینان رکھو۔ میں تمہاری توقع سے بڑھ کر اسے فرہاد علی تیمور بنا دوں گی۔"

میں نے تھوڑی دیر تک اس سے باتیں کیں پھر دماغی طور پر واپس آگیا۔ لباس تبدیل کرکے رسونتی کے پاس پہنچ گیا۔ فرضی پارس فرش پر کھیل رہا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر پیار کیا۔ رسونتی خوش ہو کر بڑے فخر سے دیکھنے لگی۔ میں نے پارس کو اس کی گود میں دیتے ہوئے کہا "بہت زوروں کی بھوک لگ رہی ہے۔"

"کھانا تیار ہے لیکن مجھ سے باتیں کرتے رہنا۔ خیال خوانی کرو گے تو جھگڑا کروں گی۔"

"بس ایک ذرا سی ٹیلی پیتھی کروں گا۔ اس کے بعد دیر تک تم سے باتیں کرتا رہوں گا۔"

اس نے بڑی مشکلوں سے اجازت دی تو میں کھانے کی میز پر پہنچ کر جواد الخیری کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے پوچھا "خیریت تو ہے؟"

"آپ سے ایک کام لینا چاہتا ہوں۔ ایک ہندو کو مسلمان بنانا چاہتا ہوں۔"

"کیا زبردستی بنانا چاہتے ہو؟"

"نہیں، کسی کو زبردستی کسی بھی مذہب کی طرف مائل نہیں کیا جاسکتا۔ یہ تو دل کا سودا ہوتا ہے۔ کرپا دان نامی ایک ہندو نوجوان راضی خوشی فرہاد علی تیمور بننا چاہتا ہے۔ میرا ایسا عقیدت مند ہے کہ اسلام بھی قبول کرنے کو تیار ہوجائے گا۔"

"یہ کام کوئی مولوی یا عالم دین ہی کرسکتا ہے۔"

"کوئی بھی مولوی اسے مسلمان کرسکتا ہے لیکن آپ یہ سارے انتظامات کردیجیے گا۔ یہ بات کسی دوسرے کو معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ اس لیے آپ سے درخواست کررہا ہوں۔"

"بھئی، میں نے کب انکار کیا ہے۔ میرے لیے تو یہ ایک تیر سے دو شکار کرنے والی بات ہوگی۔ آپ کے بھی کام آؤں گا اور اسے مسلمان بنا کر ثواب بھی حاصل کرلوں گا۔"

"آپ کو جلد ہی اعلیٰ بی بی سے اطلاع مل جائے گی۔ آپ اسی کے مطابق یہ کام کردیں۔"

اس سے رخصت ہوکر میں نے جمیلہ کی خبر لی۔ اس کے ذریعے اپنے بیٹے پارس کو پیار کیا۔ پھر دماغی طور پر حاضر ہو کر رسونتی سے کہا "لو، میں آگیا۔ اب ہم خوب باتیں کریں گے۔"

اس نے پوچھا "پھر کسی بہانے ٹیلی پیتھی تو نہیں کرو گے؟"

"ہرگز نہیں۔"

"کیا سونیا خیریت سے ہے؟"

میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا "ابھی تو خیریت سے ہے بعد میں پتا نہیں کیا ہوگا۔"

"کیا ہوگا؟"

"ایک بہت ہی زبردست دشمن سے اس کا مقابلہ ہونے والا ہے۔ تم تو جانتی ہو وہ اچھی فائٹر ہے۔ اسے شکست دے ہی دے گی۔ کیا ضروری ہے کہ میں تمہیں چھوڑ کر وہاں جاؤں۔"

وہ لقمہ اٹھا کر منہ میں رکھنے والی تھی۔ فوراً ہی اس لقمے کو پلیٹ پر رکھتے ہوئے بولی "ارے واہ، وہ کسی دشمن سے مقابلہ کررہی ہے اور میں یہاں آرام سے بیٹھ کر کھاؤں اور تم سے باتیں کرتی رہوں۔ یہ نہیں ہوسکتا۔ تم سونیا کے پاس جاؤ۔"

میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا "کیا تمہارے دل میں سونیا کے خلاف ذرا سی بھی جلن پیدا نہیں ہوتی؟"

"تم کیسی باتیں کرتے ہو۔" اس نے میز پر سے چھری اٹھاتے ہوئے کہا "مجھے بتاؤ، میں سونیا کے نام پر اپنے جسم کا کون سا حصّہ کاٹ کر تمہارے سامنے رکھ دوں؟"

میں نے اس کے چھری والے ہاتھ کو پیار سے تھام کر کہا "میں جانتا ہوں، تم سونیا سے اتنی محبت کرتی ہو جتنی شاید مجھ سے اور پارس سے بھی نہیں کرتی ہوگی۔ چلو، تم کھاتی رہو۔ میں ابھی اس کے پاس سے آتا ہوں۔"

جب میں سونیا کے پاس پہنچا تو وہ وہاں کے ان ڈور اسٹیڈیم

میں پہنچ چکی تھی۔ دو پہلوان ایک رنگ کے اندر لڑ رہے تھے۔ میں نے چپکے سے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”میں آ گیا ہوں۔“

”مجھ سے ملنے آئے ہو یا کشتی دیکھنے آئے ہو؟“

”میں تمہارے لڑنے کا تماشا دیکھنے آیا ہوں۔“

وہ مسکرا کر بولی۔ ”کیا تم مجھے یہاں کسی سے لڑانا چاہتے ہو؟“

میں نے اسے بتایا کہ ابھی کیا ہونے والا ہے۔ اس نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔ ”یہ تو سراسر میری توہین ہے کہ ایک نوآموز فائٹر جس نے ابھی تک عملی میدان میں قدم نہیں رکھا ہے۔ وہ مجھے چیلنج کرے۔“

”کبھی ایسا بھی ہوتا ہے اسے برداشت کرو۔ تم ان سے کہنا کہ اگر وہ جوان تمہارا ایک طمانچہ برداشت کر لے اور اس کے بعد بھی لڑنے کا حوصلہ رکھے تو تم بڑی خوشی سے اس کے چیلنج کو قبول کرو گی۔“

اس نے کہا۔ ”نبات معظم تمہیں پوچھ رہا ہے۔“

”ابھی میری موجودگی ظاہر نہ کرنا۔ بعد میں دیکھا جائے گا۔“

ہماری باتوں کے دوران وہ پہلی کشتی ختم ہو چکی تھی۔ وہی بلیک بیلٹ جوان رنگ میں آ کر اپنی قوت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ پہلے اس کے سامنے چار اینٹیں لا کر رکھی گئیں۔ اس نے کھڑی ہتھیلی سے کراٹے کا کمال دکھایا اور ان اینٹوں کو ایک ہی وار میں توڑ ڈالا۔ وہ تمام لوگ تالیاں بجانے لگے۔ پھر اس نے لوہے کی ایک سلاخ کو بڑی آسانی کے ساتھ موڑ دیا۔ اس کے بعد چار پہلوان آئے۔ انھوں نے ایک رسّے کو تھام لیا۔ اس رسّے کے دوسرے سرے کو اس جوان نے تھام کر زور لگانا شروع کیا۔ رسّہ کشی کے دوران دونوں طرف سے طاقت کا مظاہرہ ہونے لگا لیکن ذرا سی دیر میں وہ جوان چاروں کو اپنی طرف کھینچتا ہوا رنگ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لے گیا۔ آخر میں اعلان کیا گیا۔ جو اپنی شہ زوری پر اور اپنے لڑنے کے انداز پر ناز کرتا ہے وہ آ کر اس جوان سے مقابلہ کرے۔

اس جوان نے اسٹیج پر سے للکار کر کہا۔ ”نہیں، میں کسی کا چیلنج قبول نہیں کروں گا بلکہ میں چیلنج کروں گا۔ دُنیا کی سب سے دلیر عورت کو۔ یہاں مادام سونیا تشریف رکھتی ہیں۔ میں نے سنا ہے، انھوں نے بڑے بڑے شہ زوروں کو شکست دی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ میرے مقابلے پر آئیں۔“

چاروں طرف سے تالیوں کا شور گونجنے لگا۔ نبات معظم نے مسکرا کر کہا۔ ”کیا خیال ہے مادام! چلی جائیے۔ آپ تو یقیناً جیت کر آئیں گی۔“

”مسٹر معظم! یہ مجھے اچھا نہیں لگتا کہ آج کل کے بچے مجھے چیلنج کریں۔ آپ لوگ میری توہین کرنے کا سلسلہ کب تک جاری رکھیں گے؟“

”میں بڑی سے بڑی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہاں کوئی آپ کی توہین نہیں کرنا چاہتا۔ بس یہ ایک جوان کا چیلنج ہے اور یہ جوان کسی سے کم بہادر نہیں ہے۔“

سونیا اپنی جگہ سے اُٹھ کر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اسٹیج کی طرف جانے لگی۔ سب لوگ تالیاں بجا رہے تھے۔ اس نے اسٹیج پر پہنچ کر کہا۔ ”میں یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ جو نوآموز لڑکے ابھی داؤ پیچ سیکھ رہے ہیں۔ جنھوں نے ابھی زندگی کا کوئی تجربہ حاصل نہیں کیا، عملی میدان میں قدم نہیں رکھا۔ وہ مجھے چیلنج کریں۔ بہرحال اتنے لوگوں کے درمیان اس نوجوان نے مجھے چیلنج کیا ہے تو اسے سبق بھی سکھانا چاہیے۔ میں ایک شرط پر لڑنے کے لیے راضی ہوں کہ پہلے یہ میرا طمانچہ کھائے۔ اگر اس نے میرے طمانچے کو برداشت کر لیا اور یہاں ثابت قدم رہا تو میں بخوشی لڑوں گی اور آپ لوگوں کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کروں گی۔“

اس جوان نے تمام حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”کوئی اپنی خوشی سے طمانچہ کھانے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ سونیا میں اتنی صلاحیت ہے تو وہ مجھے طمانچہ مار کر دکھائے۔ میں چیلنج کرتا ہوں کہ یہ مجھے ایک ہاتھ نہیں مار سکیں گی۔“

وہ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہو گئے۔ میں نے سونیا سے کہا۔ ”یہ جب پہلا حملہ کرے گا تو اسے میں ناکام بناؤں گا۔ بس اس سے تم فائدہ اٹھا لینا۔“

پھر ایسا ہی ہوا۔ وہ جوان پینترے بدلتا ہوا ایسے وقت آگے بڑھا جب اسے پوری امید تھی کہ اس کا حملہ کامیاب رہے گا لیکن میں نے اس حملے کو ناکام بنا دیا۔ اگرچہ یہ مناسب نہیں تھا۔ آزادانہ لڑنے کے لیے چھوڑ دینا چاہیے تھا لیکن میں اس کھیل کو طول دینا نہیں چاہتا تھا۔ انجام سے واقف تھا کہ سونیا اسے طاقت سے نہیں مار سکے گی تو مکاری سے ضرور زمین چاٹنے پر مجبور کر دے گی۔

اس نے حملہ کیا جو ناکام رہا۔ اس کی ناکامی کے جواب میں اچانک ہی ایک زوردار تڑاخ کی آواز کے ساتھ سونیا کا طمانچہ اس کے منہ پر پڑا۔ میں نے اس کے منہ کو دوسری طرف گھما دیا بلکہ وہ خود دوسری طرف گھوم گیا اور لڑکھڑاتا ہوا اسٹیج کے ایک سرے کی طرف گیا۔ وہاں ذرا سا ڈگمگانے لگا۔ حالانکہ وہ کمزور نہیں تھا لیکن میں اسے ایسا کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔ تب اچانک قہقہوں کی سی بھنبھناہٹ اُبھرنے لگی۔ سب لوگ آپس میں کچھ کہہ رہے تھے کیوں کہ اس جوان کا ایک پاؤں بھیگ رہا تھا۔ جہاں کھڑا ہوا تھا وہاں کی زمین بھی بھیگ رہی تھی۔

سونیا نے حقارت سے کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے، تم لوگوں کے ہاں کوئی مرد نہیں ہے۔ اسی لیے ایسے بزدل مجھے چیلنج کرتے ہیں۔“

نبات معظم نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر کہا۔ ”یہ ناممکن سی بات ہے۔ ہمارا یہ جوان بہت بڑا دلیر ہے۔ اس نے ابھی اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا ہے اور ہم پچھلے دو برس سے اس کی کارکردگی دیکھتے آ رہے ہیں۔ ایک جوان مرد اور مضبوط قوتِ ارادی رکھنے والا فائٹر اس حال کو کیسے پہنچ سکتا ہے۔ میں مسٹر گوتیل سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اس سلسلے

میں کچھ روشنی ڈالیں۔"

سونیا اسٹیج سے اتر کر جانے لگی۔ گوڈیل نے اسٹیج پر آ کر کہا۔ "معزز حاضرین! یہاں ابھی جو کچھ ہوا ہے، میں اس کی توقع تو نہیں کر سکتا تھا لیکن اتنا جانتا تھا کہ یہ مادام سونیا کا ایک ہاتھ بھی برداشت نہیں کر سکے گا۔"

ایک شخص نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ "تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارا یہ شاگرد ابھی مکمل طور پر ایک فائٹر نہیں بن سکا تھا۔"

"یہ بات نہیں ہے، اس میں یقیناً کسی صلاحیت کی کمی نہیں ہے لیکن صلاحیتیں حاصل کرنا اور بات ہے، عملی میدان میں ان صلاحیتوں کا استعمال کرنا اور بات ہے۔ اس دنیا میں طرح طرح کے لڑنے والوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ طرح طرح کے تجربات حاصل ہوتے رہتے ہیں۔ یہ نوجوان تجربات سے بالکل خالی ہے۔ میں آپ لوگوں کے سامنے اس جوان سے چند سوالات کرتا ہوں۔ ان سوالات کے جواب سن کر آپ کو اس کی کمزوری کا علم ہو جائے گا۔"

یہ کہہ کر اس نے اس جوان سے پوچھا۔ "کیا آج صبح چار بجے میں نے فون پر تم سے گفتگو کی تھی؟"

وہ شرمندہ سا تھا، سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔

ثبات معظم نے گرج کر کہا۔ "زبان سے جواب دو۔"

اس نے زبان سے کہا۔ "ہاں، مسٹر گوڈیل نے صبح چار بجے مجھ سے گفتگو کی تھی۔"

گوڈیل نے کہا۔ "میں نے اس سے پوچھا، آج یہاں مقابلہ ہے، پھر یہ صبح چار بجے تک کیوں جاگ رہا ہے۔ تب اس نے جواب دیا کہ مادام سونیا اس کے حواس پر چھائی ہوئی ہیں۔ ایک بے چینی سی ہے کہ جانے کل کے مقابلے میں کیا ہوگا؟"

ایک شخص نے اس جوان سے پوچھا۔ "کیا تم نے یہ بات مسٹر گوڈیل سے کہی تھی؟"

نوجوان نے تائید کی۔ پھر گوڈیل نے کہا۔ "میں نے اس جوان کو اسی وقت سمجھایا تھا کہ سونیا کو چیلنج نہ کرے۔ کیوں کہ یہ شعوری یا غیر شعوری طور پر مادام سونیا سے مرعوب ہے۔ اس پر اس نے انکار کیا۔ کہنے لگا۔ مرعوب ہرگز نہیں ہے۔ جب مادام سونیا کو شکست دے گا تو آئندہ مادام سونیا اس سے مرعوب رہا کریں گی لیکن آج کا نتیجہ آپ لوگوں کے سامنے ہے۔"

یہ کہہ کر گوڈیل اسٹیج سے اتر گیا۔ سونیا اپنی جگہ آ کر بیٹھ گئی تھی —— ثبات معظم اسے حیرانی سے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "کیا یہ ممکن ہے کہ تمہارا ایک طمانچہ کھانے کے بعد کسی شہ زور کی یہ حالت ہو جائے؟"

"آنکھوں سے دیکھنے کے بعد بھی آپ کو ممکن نظر نہ آئے تو یہ آپ کی آنکھوں کا قصور نہیں، آپ کے دماغ کا فتور ہے۔"

دماغ کے فتور کی بات چلی تو اسے یاد آیا کہ پچھلی رات اس سے کیسی غیر معمولی حرکتیں سرزد ہوئی تھیں۔ غیر معمولی بھی، حیرت انگیز بھی اور ناقابلِ یقین بھی۔ اس نے کچھ سوچ کر سونیا کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنے سنجیدہ مزاج کے برعکس کوئی غیر معمولی حرکت کر بیٹھے؟"

"ہاں، ایسا اکثر ہوتا ہے۔ جو آدمی کبھی سنجیدگی سے مسکراتا بھی نہیں ہے، وہ کبھی اچانک ہی قہقہہ لگانے لگتا ہے۔"

"یہ تو کوئی بات نہیں ہے۔ اس سے بھی زیادہ غیر معمولی، حیرت انگیز، ناقابلِ یقین...؟"

"اب حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین تو یہی ہو سکتا ہے کہ آدمی پاگل بن جائے اور اپنے آپ کو اُلٹا لٹکا دے۔"

"ہاں کچھ اسی قسم کی حرکتیں ہو جاتی ہیں کہ ایک سنجیدہ آدمی تعجب کرے کہ وہ خود کبھی ایسا کر سکتا ہے۔ یہی خیال پیدا ہو کہ اس سے یہ حرکت کرائی گئی ہے یا تو جادو ٹونے کے عمل سے یا پھر ٹیلی پیتھی کے عمل سے۔"

سونیا نے ذرا گھور کر اسے دیکھا۔ پھر پوچھا۔ "کیا فرہاد نے کسی کے ساتھ ایسی کوئی حرکت کی ہے؟"

"نہیں، بس ایسے ہی پوچھ رہا ہوں۔"

وہ یہ کہہ نہیں سکتا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو چکا ہے۔ اگر بات زبان سے نکلتی تو پرائی ہو جاتی۔ رتی اسفندیار جیسا اثر، کے ذریعے سونیا سے ایسی باتیں اگلوا لیتا۔ بڑی مشکل تھی، وہ اپنی ذہنی پریشانی کا ذکر کسی سے نہیں کر سکتا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا، اسی وقت میں نے بے اختیار اسے سرد آہ بھرنے پر مجبور کیا۔ اس نے سرد آہ بھرتے ہی چونک کر سونیا کو دیکھا پھر پریشان ہو کر پہلو بدلتے ہوئے دوسری طرف دیکھتے ہوئے سوچنے لگا۔ "یہ پھر میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟"

سونیا نے مجھ سے پوچھا۔ "کیا تم اس کے دماغ میں پہنچ گئے ہو؟ اسے پریشان کر رہے ہو؟"

میں نے مختصر طور پر بتایا کہ کس طرح میں اس کے دماغ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ سونیا نے اس سے پوچھا۔ "کیا بات ہے، آپ کچھ پریشان نظر آ رہے ہیں؟"

اس نے یوں چونک کر دیکھا جیسے کوئی اس کے دماغ کے اندر کی چوری پکڑ رہا ہو۔ پھر اس نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ "نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔"

وہ ٹھیک نہیں تھا۔ اندر سے کمزور ہو چلا تھا۔ اسے یہ بات زیادہ پریشان کر رہی تھی کہ ابھی ابھی اس نے کس طرح سرد آہ بھری ہے۔ وہ جوتے اس کے سرہانے کیسے آ گئے تھے۔ تکیہ پاؤں کے نیچے کیسے چلا گیا تھا۔ وہ بہت کچھ سمجھ رہا تھا لیکن یقین کرنے کے لیے پھر بھی تیار

نہیں تھا۔ جب تک میں کسی کے دماغ میں پہنچ کر اپنی موجودگی کا یقین نہیں دلاتا، اس وقت تک کسی کو یقین نہیں آتا۔ وہ اپنے آپ کو سمجھا رہا تھا۔ "میری کوئی نفسیاتی کمزوری ہے۔ جس کی تہ تک مجھے خود پہنچنا ہوگا۔ میں کسی ڈاکٹر سے، ماہرِ نفسیات سے مشورہ نہیں لے سکتا۔ اوہ، مائی گاڈ، یہ مجھے کیا ہو رہا ہے۔ ہمیں تو پوری طرح یقین دلایا گیا ہے کہ فرہاد فرانسیسی زبان نہیں جانتا ہے اور میں نے سونیا کے سامنے کبھی انگریزی میں گفتگو نہیں کی۔"

میں نے اس کی سوچ میں کہا۔ "اس سے کیا ہوتا ہے۔ میں بہت سے لوگوں کے سامنے انگریزی میں گفتگو کرتا ہوں۔ ان لوگوں میں کوئی فرہاد کا جاسوس بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے ذریعے وہ میرے دماغ میں راستہ بنا سکتا ہے۔"

اس خیال نے اسے اور زیادہ کمزور بنا دیا۔ وہ اپنے آپ کو بیمار محسوس کر رہا تھا۔ اندر سے ہولے ہولے لرز رہا تھا اور اِدھر اُدھر محتاط نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ کوئی اس کی کمزوری کو نہ پکڑ سکے۔

ان ڈور اسٹیڈیم میں بہت سے مشہور یہودی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک شخص نے اچانک ہی ثبات معظم کو عبرانی زبان میں مخاطب کیا۔ میں اس کے دماغ سے اس کا ترجمہ سن سکتا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "مسٹر معظم! آپ اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ سونیا سے کام کی باتیں پوچھیں۔"

اس نے سنبھل کر سونیا کی طرف رُخ کرتے ہوئے پوچھا۔ "ان دنوں مسٹر فرہاد کس ملک میں ہیں؟"

سونیا نے جواب دیا۔ "رنگون میں ہیں۔"

"دیکھیے، آپ جھوٹ بول رہی ہیں۔"

یقیناً وہ جان بوجھ کر جھوٹ بول رہی تھی۔ ربّی اسفندیار کے ہپناٹزم کے دوران اس نے میری موجودگی پیرس میں بتائی تھی۔ اس وقت یہ تاثر دے رہی تھی کہ اسے ربّی اسفندیار کی معمولہ بننے کی باتیں یاد نہیں ہیں۔ ثبات معظم نے کہا۔ "مادام! آپ کے فرہاد صاحب ان دنوں پیرس میں ہیں۔"

سونیا نے چونک کر دیکھا جیسے بھید کھل گیا ہو۔ پھر وہ سنبھل کر بولی۔ "وہ کس ملک میں ہیں، یہ کوئی بتا نہیں سکتا ہے۔ خیال خوانی کے ذریعے مجھ سے یہی کہتے ہیں کہ وہ رنگون میں ہیں۔ وہ رنگون میں ہوں یا پیرس میں، کوئی ان کے دماغ میں جھانک کر نہیں بتا سکتا کہ وہ کس وقت کہاں رہتے ہیں۔"

"ہمارے جاسوس بتا سکتے ہیں اور ہمارے جاسوس جلد ہی ان کی رہائش گاہ کا پتا بھی معلوم کر لیں گے۔"

"جب آپ کو اتنا یقین ہے تو پھر مجھ سے کیوں پوچھتے ہیں؟"

"ہم آپ کی گفتگو کے دوران جھوٹ اور سچ کو تولنا چاہتے ہیں۔"

"آپ نے ناپ تول سے کیا معلوم کیا؟"

"ابھی تو معلوم کر رہے ہیں۔ بائی دی وے فرہاد صاحب ہمیں ٹال رہے ہیں۔ ہماری دو معقول شرائط کا جواب نہیں دے رہے ہیں۔"

"میں سمجھ رہی تھی، یہاں آ کر کچھ تفریح ہوگی لیکن میں بہت بور ہو رہی ہوں۔ کیا آپ مجھے میرے ہوٹل تک بحفاظت پہنچانا پسند کریں گے؟"

پیچھے بیٹھے ہوئے شخص نے عبرانی زبان میں کہا۔ "اسے ہوٹل پہنچا دو۔"

ثبات معظم اٹھ کر جانے لگا۔ سونیا اس کے ساتھ ہو گئی۔ میں نے کہا۔ "میں یہاں مصروف ہوں۔ تمہارے لیے وہاں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ میں پھر تم سے ملاقات کروں گا۔"

میں اس سے رخصت ہو کر کھانے کی میز پر حاضر ہو گیا۔ رسونتی کھا چکی تھی۔ میں نے دوبارہ کھانا شروع کرتے ہوئے رسونتی کو سونیا کے حالات بتائے۔ وہ سنتی رہی، میں کھاتا رہا۔ تمام باتیں سننے کے بعد اس نے پوچھا۔ "کیا تم باپ بننا چاہتے ہو؟"

"باپ رے باپ، میں تو نہیں چاہتا۔ میرے دشمن چاہتے ہیں۔"

"لعنت ہے ان پر۔ دشمنی کی انتہا ہو گئی ہے۔ لعنت ہے، ہزار بار لعنت ہے۔"

"تم صبح سے شام تک اور شام سے پھر صبح تک لعنت بھیجتی رہو پھر بھی دشمنوں پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ کیوں کہ وہ گناہ کے حق میں نہیں ہیں۔ وہ تو باقاعدہ کسی لڑکی کی مجھ سے شادی کرائیں گے اور جائز اولاد پیدا کرائیں گے۔"

اس نے غصے سے پوچھا۔ "کیا تم شادی کر لو گے؟"

"بھئی میں نے کہا نا میں نہیں کرنا چاہتا۔ وہ کرانا چاہتے ہیں۔"

وہ چڑ کر بولی۔ "تمہارے مذہب میں کتنی شادیاں جائز ہیں؟"

"ویسے چار ہیں۔ یوں دیکھا جائے تو ایک ہی کافی ہے۔ دشمنوں کا طریقۂ کار کچھ اور ہوگا۔ مثلاً ایک بار شادی کرائیں گے۔ اگر میری منکوحہ میرے بچے کی ماں بننے والی ہوگی تو کوئی معقول وجہ پیش کر کے طلاق دلائیں گے۔ پھر دوسری شادی کرا دیں گے۔ بھئی اس میں صرف اسلام کی بات نہیں ہے۔ تمہارے ہندو مذہب میں تو یہی ہوتا ہے کہ ایک کو چھوڑ کر دوسرے سے شادی کی جا سکتی ہے۔ یہی سلسلہ وہ بھی کریں گے۔"

"اور تم اس کے لیے تیار بیٹھے ہو۔ تمہاری تو ہر روز عید ہونے والی ہے۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تمہارے ساتھ رہوں گا۔ تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا اور جب چھوڑ کر نہیں

جاؤں گا تو کسی دوسری سے شادی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

میں دُرست کہہ رہا تھا۔ میں ایک طویل عرصے تک صرف اس کے ساتھ گھریلو زندگی گزارنا چاہتا تھا اور ایک جگہ سکون سے رہ کر بہت سارے کام نمٹانا چاہتا تھا۔ عبرانی زبان سیکھنے میں زیادہ وقت صرف کرنا چاہتا تھا۔ پھر یہی ہوا۔ اُدھر ڈاکٹر میکی براڈلے کریادان کے چہرے کی پلاسٹک سرجری کرنے لگا۔ کبھی مرجانہ اور کبھی اعلیٰ بی بی اور کبھی اعلیٰ بی بی کے ماتحت کریادان سے ملتے رہتے تھے۔ کوئی نہ کوئی صبح و شام اس کے ساتھ رہتا تھا۔ کبھی اسے میری فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔ میرے اٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے کے انداز سکھائے جاتے تھے۔ میرا لب ولہجہ اسے یاد کرایا جاتا تھا۔

وہ ذہین تھا۔ اسے جو سکھایا جا رہا تھا اسے کم سے کم وقت میں سیکھتا جا رہا تھا لیکن صرف ذہین ہونے سے ٹیلی پیتھی کا علم حاصل نہیں ہوتا۔ اس کے لیے قوتِ ارادی اور مستقل مزاجی لازمی ہوتی ہے ...

کریادان میں ان باتوں کی کمی تھی۔ دوسری طرف میں نے دُشمنوں کو ٹالنے کے لیے پہلی شرط تسلیم کرلی تھی کہ ٹیلی پیتھی سیکھنے کے سلسلے میں ان کے کسی طالب علم کی مدد کروں گا۔ اس دوران میں خیال خوانی کے ذریعے کتنے ہی اہم یہودی افراد کے دماغوں میں سُرنگ بناتا رہا۔ تبات معظم اب ذہنی مریض بنتا جا رہا تھا۔ ایک ہفتے کے بعد اس کی بیٹی ایمی اور دوسری چوبیس حسین لڑکیوں کے دماغ بالکل آئینے کی طرح صاف کر دیے گئے تھے۔ ہپناٹزم کے ذریعے ان کے برین واش کیے گئے تھے۔ انھیں ایک نئی زندگی دے کر نئے والدین کے سائے میں رکھا گیا تھا۔ ان کے ملک اور ان کی قومیت بدل گئی تھی۔ میں نے ان چوبیس لڑکیوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ ان کے پیچھے لگے رہنے کا فائدہ نہیں تھا، خواہ مخواہ وقت ضائع ہوتا۔ ایک نہ ایک دن وہ مجھ سے یا میرے فریب میں کریادان سے ٹکرانے والی تھیں۔ جب وہ وقت آتا تو پھر دیکھا جاتا۔

میں نے میکی براڈلے سے کہا تھا کہ دن رات محنت کرکے پوری توجہ صرف کرکے کریا کو فرہاد بنا دے لیکن وہ بے چارہ اپنی مصروفیات سے مجبور تھا۔ اس نے بار بار مجھ سے معذرت چاہتے ہوئے کہا "مسٹر فرہاد! آپ سہولت سے یہ کام کرائیں گے تو کام پختہ ہوگا۔ کہیں کوئی خامی نہیں رہے گی۔"

میں نے بھی جب یہ دیکھا کہ تل ابیب میں سونیا کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے تو میں نے میکی براڈلے کو چھوٹ دے دی تاکہ وہ سہولت سے اپنا کام کرتا رہے۔ اُدھر تل ابیب میں سب لوگ ہراساں تھے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ شبہ تو ضرور تھا کہ فرہاد ٹیلی پیتھی کے ذریعے چپکے چپکے سرنگ بنا رہا ہے لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ بار ہا سونیا کے ذریعے مجھ سے شکایتیں کی گئیں۔ میں نے انھیں یقین دلایا اور انھیں یقین کرنا پڑا کہ میں کسی عبرانی بولنے والے یا فرانسیسی بولنے والے کے دماغ میں نہیں پہنچ سکتا۔ اور نہ ہی اتنی جلدی یہ زبانیں سیکھ سکتا ہوں۔

ایک ہفتے کے بعد یہودیوں کے لیے پانی سر سے اونچا ہونے لگا۔ ہر دوسری تیسری رات کوئی نہ کوئی سمندر کے راستے سے تل ابیب میں داخل ہوتا تھا۔ اس کے قدموں کے نشانات ملتے تھے لیکن وہ گرفت میں نہیں آتا تھا۔ دماغی امراض کے ڈاکٹروں اور نفسیات کے ماہرین کے ہاں لوگوں کی بھیڑ لگنے لگی۔ دماغی اور نفسیاتی مریضوں کی بڑھتی ہوئی تعداد نے وہاں کے اعلیٰ حکام کو پریشان کردیا۔ ربی اسفندیار نے آخر دو چار لوگوں کے دماغوں میں ہپناٹزم کے ذریعے پہنچ کر معلوم کرلیا کہ جب وہ رات کو گہری نیند سو جاتے ہیں تو ان کا دماغ نیند کی حالت میں انھیں بستر سے اٹھاتا ہے۔ پھر وہ ایسی حرکتیں کرتے ہیں کہ دوسرے دن بیدار ہونے کے بعد خود انھیں ایسی حرکتیں غیر معمولی، ناقابلِ یقین اور بہت ہی حیرت انگیز لگتی ہیں۔

ربی اسفندیار کی اس تحقیقات نے ثابت کردیا کہ یہ ٹیلی پیتھی جاننے والے فرہاد کی کارستانی ہے۔ اس کی تحقیقات مکمل ہونے تک دو ہفتے گزر چکے تھے۔ پھر ایک رات وہ اپنے معمول کے مطابق سونیا پر ہپناٹزم کا عمل کر رہا تھا۔ ہر رات جب وہ سونے کے لیے جاتی تھی تو وہ تنویمی عمل کے لیے پہنچ جاتا تھا۔

اس نے تنویمی عمل کے دوران پوچھا "کیا فرہاد یہاں مختلف لوگوں کے دماغوں تک پہنچ گیا ہے؟"

سونیا اس کی معمولہ بنی اس کے سامنے بستر پر چاروں شانے چت لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا "میں نہیں جانتی۔"

"کیا فرہاد تمھیں اپنے منصوبوں کے متعلق کچھ نہیں بتاتا ہے؟"

"وہ مجھ سے کوئی بات نہیں چھپاتے ہیں لیکن انھیں شبہ ہوگیا ہے کہ مجھ پر تنویمی عمل کیا جا رہا ہے اور ان کی سوچ کی لہریں میرے دماغ کے تہ خانے تک نہیں پہنچ رہی ہیں۔ اسی لیے شاید وہ مجھ سے اہم باتیں چھپانے لگے ہیں۔"

"آئندہ وہ تم سے رابطہ قائم کرے تو تم اس سے کہو گی کہ اس قسم کی حرکتیں بند کردے ورنہ اس کے حق میں بُرا ہوگا بلکہ تمھیں ایسا نقصان پہنچایا جائے گا جس کی وہ توقع بھی نہیں کرسکتا ہے۔"

"آئندہ وہ مجھ سے رابطہ قائم کریں گے تو میں ان سے یہ باتیں کہوں گی۔"

"فرہاد یہاں جسے چاہتا ہے اپنا معمول بنا لیتا ہے۔ اس سے کہو، کسی کو بھی اپنا معمول بنا کر کل صبح دس بجے مجھ سے گفتگو کرے۔"

"میں اس سے کہوں گی کہ کل صبح دس بجے وہ آپ سے گفتگو کرے۔"

بات دوسرے دن کے لیے ٹل گئی۔ میں اسی طرح حیلے بہانوں

سے پندرہ دن گزار چکا تھا۔ دوسرے دن صبح دس بجے سونیا کے کمرے میں ربی اسفندیار میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس کمرے میں گارڈ آئی کے علاوہ مجریہ کا ایک افسر بھی تھا۔ اس کے دو اسسٹنٹ وہاں کھڑے ہوئے تھے۔ وہ سب میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے سونیا کی زبان سے کہا۔ "مسٹر اسفندیار! میں موجود ہوں۔ آپ نے کہا تھا کہ آپ کے کسی آدمی کو معمول بنا کر آپ سے گفتگو کروں۔"

ربی اسفندیار نے مسکرا کر کہا۔ "خوش آمدید، مسٹر فرہاد علی تیمور! مجھے توقع تھی کہ سونیا کے یہاں آنے کے بعد آپ مجھ سے کسی نہ کسی طرح ملنا اور باتیں کرنا پسند کریں گے۔ کل رات میں نے سونیا سے اپنی یہ خواہش ظاہر کر دی تھی۔"

"مسٹر اسفندیار! آپ کی خواہش محض بات کرنے کی نہیں تھی بلکہ آپ مجھے کسی طرح چیلنج کرنے کے لیے بے قرار ہیں۔ مجھے اس ملاقات میں مزید دھمکیاں دیں گے اور میں وہ دھمکیاں سننے اور ان کا جواب دینے آیا ہوں۔"

"مسٹر فرہاد علی تیمور! کیا آپ کبھی دوستانہ انداز میں گفتگو کرنا پسند نہیں کرتے ہیں؟"

"دوستوں کے ساتھ دوست ہوں اور دشمنوں کے ساتھ دشمن۔"

"ہم آپ کے دشمن نہیں ہیں۔"

"یہ فضول باتیں ہیں۔ آپ نے بلایا، میں آ گیا لیکن سونیا کے ذریعے گفتگو نہیں کروں گا۔ آپ نے ٹھیک فرمایا تھا کہ میں آپ کے آدمیوں کے دماغوں تک پہنچ گیا ہوں۔ آپ کی تحقیقات غلط نہیں ہیں۔ یہاں آپ کی مجریہ کا ایک اہم افسر بیٹھا ہوا آپ سے گفتگو کر رہا تھا۔ میں پہلے تھوڑی دیر تک سونیا کے دماغ میں رہ کر سنتا رہا۔ پھر میں اس مجریہ کے افسر کے دماغ تک پہنچ گیا۔"

ربی اسفندیار اور وہ افسر حیرانی سے سونیا کو دیکھنے لگے پھر ربی اسفندیار نے پوچھا۔ "ہم تو عبرانی زبان میں گفتگو کر رہے تھے۔ کیا آپ یہ زبان جانتے ہیں؟"

دوسرے ہی لمحے میں اس افسر کے دماغ میں پہنچ چکا تھا۔ میں نے اس کی زبان سے کہا۔ "اب میں اس کی زبان سے بول رہا ہوں اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ میں اتنا کچھ جانتا ہوں جتنا میرے ریکارڈ میں بھی نہیں لکھا ہوا ہے۔ آپ چاہیں تو میرے ریکارڈ میں اضافہ کر دیں کہ — فرہاد صرف فرانسیسی ہی نہیں، عبرانی زبان بھی جانتا ہے۔"

اس افسر کی پریشانی قابلِ دید تھی۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ میں نے اسے بٹھا دیا۔ وہ سہم کر بولا۔ "ربی! محترم ربی! میں اٹھ کر جانا چاہتا تھا لیکن ایسا لگا جیسے زبردستی مجھے بٹھا دیا گیا۔ پلیز مجھے اس سحر سے نجات دلائیں۔"

ربی اسفندیار نے ہاتھ اٹھا کر آشیرباد دینے کے انداز میں کہا۔ "تم اطمینان سے بیٹھو۔ میں تمہارا محافظ ہوں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ مسٹر فرہاد تمہارے ذریعے کیا باتیں کرنا چاہتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "باتیں آپ کریں گے۔ آپ نے مجھے بلایا ہے۔"

"پتا نہیں تم کتنی زبانیں جانتے ہو لیکن یہ جو میرے لوگوں کے دماغوں میں پہنچ رہے ہو تو اسے چھچھوری حرکتیں کہتے ہیں۔ لوگوں کو دماغی اور نفسیاتی مریض بنانے کا فائدہ کیا ہے۔ یہ تو وہی بات ہے کہ کھسیانی بلی کھمبا نوچے۔"

"مسٹر اسفندیار! میں اس وقت آپ کے ایک اہم دماغ میں بیٹھا ہوا ہوں۔ پھر بھی آپ کہتے ہیں کہ کھسیانی بلی ہوں۔ آپ کھمبا نوچنے کی بات کر رہے ہیں۔ ابھی مجھے چیلنج کریں تو میں ساحلِ سمندر کے لمبے لمبے ٹاوروں کو نوچ کر پھینک دوں۔"

"میں چیلنج نہیں کروں گا۔ آپ یہ بتائیں کہ کیا ہمارے مغربی ساحل کی طرف سے آپ کے آدمی ہر رات تل ابیب میں داخل ہوتے ہیں؟"

"آپ کا خیال درست ہے۔"

"ہمارے سراغ رساں جلد ہی ان آدمیوں کا سراغ لگائیں گے اور انہیں گولی مار دیں گے۔ آپ کو شکایت نہیں ہونی چاہیے۔"

"میں شکایت نہیں کروں گا۔"

"ہم نے مادام سونیا کو ایک معزز مہمان کی طرح رکھا ہے ورنہ ہم چاہتے تو انہیں کال کوٹھری میں بھیج دیتے۔"

"آپ سونیا کو اپنی مرضی کے مطابق کوئی ہلکی سی بھی سزا دے کر دیکھ لیں کہ اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔"

ربی اسفندیار نے کہا۔ "ہم اپنے وعدے پر قائم ہیں۔ مادام سونیا کو ذہنی، جسمانی اور جانی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ آپ نے بھی وعدہ کیا ہے کہ سیاسی سطح پر ہمارے بڑوں کے دماغ میں نہیں پہنچیں گے۔"

"میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔ میں نے ابھی تک آپ کے کسی بھی سرکاری آدمی کو نہیں چھیڑا ہے۔ لیکن ٹیلی پیتھی ایک کینسر ہے جو اندر ہی اندر پھیلتا ہے۔ میں آپ کے چھوٹے لوگوں کے درمیان اندر ہی اندر پھیل رہا ہوں۔ تل ابیب کو اپنی لپیٹ میں لے رہا ہوں۔ ایک دن پورا تل ابیب پاگلوں کا اڈہ بن جائے گا اور وہ دن جلد آنے والا ہے۔"

"یہ وعدے کی خلاف ورزی ہو گی۔"

"میں نے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا کہ تل ابیب کے باشندے پاگل نہیں ہوں گے۔"

"کیا آپ چاہتے ہیں کہ ہم مادام سونیا کو ہمیشہ اپنی قید میں رکھیں۔"

"اگر سونیا کی قید کی معیاد بڑھتی گئی تو میں تل ابیب سے یروشلم تک پہنچوں گا۔ اسرائیل کے ہر چھوٹے بڑے شہر اور گاؤں کو اپنی لپیٹ میں لوں گا۔ آپ ایک سونیا کی دھمکی نہ دیں۔ سونیا میرے لیے قربانی دے سکتی ہے لیکن پوری اسرائیلی قوم پاگل ہو جائے یہ شاید آپ میں سے کوئی پسند نہیں کرے گا۔"

وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر بولا "آپ، آپ اپنی حد سے بڑھ رہے ہیں۔"

"میں اپنی حد میں ہوں۔ میں چاہتا تو آپ کے فوجی افسروں کے ذریعے بحری، بری اور فضائی فوج میں ہلچل پیدا کر دیتا لیکن مجھے اپنے وعدے کے مطابق سیاست کو ہاتھ میں نہیں لینا چاہیے۔ آپ میری شرافت کو اور وعدے کی پابندی کو دیکھیں۔ میں آخری وقت تک اپنے وعدے پر قائم رہوں گا اور میرا اس میں نقصان بھی نہیں ہے۔ آپ کی سیاست آپ کو مبارک ہو۔ آپ کے سربراہ سلامت رہیں۔ آپ کی فوجیں اپنی فتح و نصرت پر بغلیں بجاتی پھریں لیکن آپ کا مقصد یہودی قوم کے ایک ایک فرد کو دوسری قوموں سے برتر بنا کر ساری دنیا میں پھیلانا ہے تو یہ مقصد کیسے پورا ہوگا جب یہودی قوم کا ایک ایک فرد دماغی مریض کہلانے گا۔"

ربی اسفندیار اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگا۔ پھر وہ اپنی جگہ آ کر بیٹھ گیا۔ اس آفیسر کو دیکھتے ہوئے گویا مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگا "مسٹر فرہاد! ہم اس معاملے کو اپنے بڑوں تک پہنچائیں گے اور ان سے کسی مثبت فیصلے کی درخواست کریں گے۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ سونیا کو جلد سے جلد رہا کر دیا جائے گا۔ آپ وعدہ کریں کہ آپ ہمارے آدمیوں کے دماغوں تک نہیں پہنچیں گے۔"

"آپ سونیا کی رہائی کے متعلق جلد از جلد فیصلہ سنائیں اور اس پر عمل کریں۔ جب تک عمل نہیں کیا جائے گا، میں آپ کے چھوٹے بڑے دماغوں تک پہنچتا رہوں گا۔ مجھے روکنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ فیصلہ اور فوری فیصلہ اور پھر اس فیصلے پر فوری عمل۔"

اس نے کچھ سوچ کر کہا "ذرا ایک منٹ۔ میں ابھی فیصلے کے متعلق کچھ کہہ سکتا ہوں۔"

وہ ٹیلیفون کے پاس آیا۔ اس نے ریسیور اُٹھا کر نمبر ڈائل کیے۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ میں عبرانی زبان بھی سمجھ لیتا ہوں۔ تاہم اسے یقین تھا کہ میں اس کے دماغ میں نہیں پہنچ سکوں گا اور میں بھی جانتا تھا، میری سوچ کی لہریں اس کے دماغ میں پہنچیں گی تو وہ سانس روک لے گا۔

دوسری طرف سے رابطہ قائم ہوا۔ وہ عبرانی زبان میں کچھ کہنے لگا۔ اگرچہ میں کچھ کچھ یہ زبان سمجھنے لگا تھا لیکن روانی سے بولنے پر یہ زبان پلّے نہیں پڑتی تھی۔ میں اس فوجی آفیسر کے دماغ میں بیٹھ کر اس کے ذریعے ترجمہ سُن رہا تھا۔ ربی اسفندیار نے جہاں رابطہ قائم کیا تھا، وہاں اعلیٰ حکام کی ایک میٹنگ ہو رہی تھی اور وہ اسی سلسلے میں تھی۔ ربی اسفندیار انھیں میرے متعلق تفصیل سے بتا رہا تھا پھر اس نے میرا چیلنج سُنایا کہ فرہاد ہر حال میں سونیا کی رہائی چاہتا ہے اور انکار کی صورت میں دھمکی دیتا ہے کہ پہلے تل ابیب کے باشندے دماغی مریض بنیں گے۔ اس کے بعد یہ سلسلہ یروشلم تک جائے گا۔

اس کے ذریعے میرا یہ چیلنج سُن کر دوسری طرف سے کچھ کہا گیا۔ اس نے جواباً کہا "میں یہ بات کہہ چکا ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ جب تک فیصلہ ہوتا رہے گا اور فیصلے پر عمل نہیں ہوگا، اس وقت تک وہ خیال خوانی کے ذریعے عوام کے درمیان شر بنگ بناتا رہے گا۔"

دوسری طرف سے پھر کچھ کہا جا رہا تھا اور وہ سُن رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے جواباً کہا "میں آپ لوگوں کی اس بات کا جواب ابھی نہیں دے سکتا۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں، وہ ہماری بحری فوج کے ایک آفیسر کے دماغ میں موجود ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ وہ فرانسیسی اور عبرانی زبان بھی سمجھ لیتا ہے۔ اس کا یہ دعویٰ مجھے درست نظر آ رہا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ دوسری طرف کی باتیں سننے لگا۔ اس کے بعد اس نے ریسیور رکھ دیا۔ پھر پلٹ کر اپنے فوجی آفیسر کو دیکھتے ہوئے کہا "مسٹر فرہاد علی تیمور! میں نے آپ کی باتیں اعلیٰ حکام تک پہنچا دی ہیں۔ انھوں نے فیصلہ سُنا دیا ہے۔ مادام کو رہا کر دیا جائے گا لیکن ہم دو دن کی مہلت چاہتے ہیں۔"

میں اس آفیسر کی زبان سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اس نے ہاتھ اُٹھا کر کہا "ہم جانتے ہیں، آپ کا جواب کیا ہوگا۔ جب تک مادام کو یہاں سے روانہ نہیں کیا جائے گا۔ اس وقت تک آپ ہمارے آدمیوں کو دماغی مریض بناتے رہیں گے لیکن ہم صرف دو دن کی مہلت چاہتے ہیں۔ اگر دو دن کے بعد ہم نے وعدہ پورا نہ کیا۔ مادام کو یہاں سے بحفاظت پیرس نہ پہنچایا، تب آپ انتقامی کارروائی کر سکتے ہیں۔"

میں نے آفیسر کی زبان سے سونیا کو دیکھتے ہوئے پوچھا "تمھارا کیا خیال ہے۔ جہاں اتنے دنوں تم ان کی مہمان رہ چکی ہو، دو دن اور سہی؟"

سونیا نے ایک گہری سانس لے کر کہا "ہاں دو دن اور سہی۔"

میں نے کہا "مسٹر اسفندیار! ہم دو دن تک انتظار کریں گے۔ آج میں صبح دس بجے آیا تھا۔ پرسوں دس بجے ٹھیک اس وقت سونیا کی رہائی چاہوں گا۔"

وہ خوش ہو کر بولا "آپ کا بہت بہت شکریہ، آپ اپنے فیصلے میں لچک پیدا کر لیتے ہیں۔ یہ بڑی خوبی کی بات ہے لیکن میں آپ سے ایک اور عرض کرنا چاہتا ہوں۔"

"فرمائیے، میں سُن رہا ہوں۔"

"میں یہودی قوم کا ربی ہوں۔ اپنے دین کا عالم اور پیشوا ہوں۔ کیا تم دوسرے مذہب کے بزرگوں اور عالموں کی عزت نہیں کرتے ہو؟ تم اب تک مجھے مسٹر اسفندیار کہہ کر مخاطب کرتے رہے۔ اگر ربی اسفندیار کہہ لیتے تو کیا فرق پڑتا؟"

"مسٹر اسفندیار! میں ہر مذہب کے پیشواؤں، عالموں اور بزرگانِ دین کی بہت عزت کرتا ہوں لیکن وہ بزرگ اور عالم جو اپنے دین کی پیشوائی کا لبادہ اوڑھ کر جھوٹ بولتے ہیں اور مذہب کا سودا کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے، ایسے لوگوں کی عزت کوئی بھی نہیں کرتا۔ دو دن کے بعد جب آپ اپنا وعدہ پورا کر دیں گے۔ خود کو سچا ثابت کر دیں گے تو میں آپ کی نیکی، پارسائی اور سچائی کا اعتراف کرتے ہوئے آپ کو آپ کے دین کی مناسبت سے مخاطب کروں گا۔"

سونیا نے کہا۔ "فرہاد! میں باہر تفریح کے لیے جانا چاہتی ہوں۔ یہ بہتر ہوگا کہ جس آفیسر کے ذریعے تم گفتگو کر رہے ہو، وہی مجھے تل ابیب کی سیر کرائے۔"

میں نے ربی اسفندیار سے پوچھا۔ "کیا آپ سونیا کی خواہش سُن رہے ہیں؟"

"ہاں سُن رہا ہوں۔ ابھی اس پر عمل کیا جائے گا۔"

"اچھی بات ہے مسٹر اسفندیار! پھر ملاقات ہوگی۔ میرا اور سونیا کا خدا حافظ۔"

اس آفیسر نے اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "مادام! میں ابھی آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔ پھر آپ جہاں کہیں گی، آپ کو تفریح کے لیے لے جاؤں گا۔"

وہ ربی اسفندیار کے ساتھ کمرے سے باہر چلا گیا۔ میں نے کہا۔ "اب بتاؤ سونیا! کیا تم میری باتوں سے مطمئن ہو؟"

"ہاں، مطمئن تو ہوں لیکن انھوں نے دو دن کا وقت کیوں لیا ہے؟"

"ظاہر ہے، وہ اپنے لیے کچھ نئے چور دروازے بنائیں گے جس کے ذریعے وہ ہم سے اپنے مقاصد حاصل کر سکیں۔"

"مثلاً کیسے چور دروازے؟ ہاں، ایک بات میرے دماغ میں آ رہی ہے۔ یہ ربی اسفندیار ہر رات سونے سے پہلے میرے کمرے میں آکر مجھے ٹرانس میں لاتے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں، ان لوگوں نے اسی طرح ایک بار مرجانہ کی برین واشنگ کی تھی۔ ہپناٹزم کے ذریعے اس کے دماغ کو بالکل صاف کر دیا تھا اور نئی باتیں دماغ میں بھر دی تھیں۔ جیسا کہ یہ میرے ساتھ کرتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے۔ ایسے وقت تم ہمیشہ میرے دماغ میں موجود رہتے ہو۔ اب یہ دو دن ربی اسفندیار کے لیے بہت اہم ہیں تمھیں اپنی تمام مصروفیات چھوڑ کر وقتاً فوقتاً میرے دماغ میں پہنچنا ہوگا۔ دیکھنا ہوگا کہ یہ کس وقت مجھے ٹریپ کرتے ہیں، کس وقت مجھے ٹرانس میں لاتے ہیں؟"

"ہاں، میں سمجھتا ہوں کہ اب یہ صرف سونے کے وقت تمھارے کمرے میں نہیں آئے گا بلکہ وقت بے وقت بھی تمھیں ٹرانس میں لا کر اپنی معمولہ بنانے اور تمھارے دماغ کو سلیٹ کی طرح صاف کرنے کی کوشش کرے گا لیکن تمھارے دماغ کی سلیٹ پر جو کچھ لکھا ہے میں اسے مٹنے نہیں دوں گا۔ میں تمھارے پاس آتا رہوں گا۔ فی الحال جا رہا ہوں۔"

میں اپنی جگہ دماغی طور پر حاضر ہو گیا۔ سنگاپور میں سہ پہر کا وقت تھا۔ میں سمندر کے کنارے جس چھوٹے سے ولا میں تھا، وہ اس وقت خالی تھا۔ ماسک مین کی طرف سے دی ہوئی ایک ملازمہ اور باورچی اس بنگلے سے باہر اپنے سرونٹ کوارٹر میں تھے۔ میں بنگلے سے باہر آ گیا۔ باہر دور تک ریتیلی زمین تھی۔ اس کے بعد سمندر کا نیلا پانی تا افق نظر آ رہا تھا۔ ساحل پر دور دور تک ناریل کے درخت نظر آ رہے تھے۔ پکنک منانے والے، سمندر میں غوطے لگانے والے، سیر و تفریح کرنے والے، ہنستے، کھیلتے، دوڑتے، بھاگتے نظر آ رہے تھے۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا سمندر کے کنارے کنارے کھلی فضا اور تازہ ہواؤں میں سانس لینے لگا۔ مجھے بڑا لطف آ رہا تھا۔ گھر کی چہار دیواری اور خیال خوانی کے مسلسل عمل سے نجات پا کر عجیب سی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میں بہت عرصے بعد ایک طویل قید سے رہا ہو کر کھلی فضا میں پہنچ گیا ہوں۔

رسونتی صبح ناشتہ کرنے کے بعد اکثر پارس کو لے کر تفریح کے لیے نکل جاتی تھی۔ میں بھی چاہتا تھا کہ وہ تفریح کرتی رہے اور میری خیال خوانی میں مداخلت نہ کرے۔ پچھلے ایک ہفتے سے وہ روز صبح جاتی تھی اور شام تک واپس آ جاتی تھی۔ میں نے کبھی اس کے دماغ میں جھانک کر یہ نہیں معلوم کیا کہ وہ کہاں جاتی ہے، کیا کرتی ہے یا اسے کسی قسم کا خطرہ ہے یا نہیں؟

میرے اطمینان کی وجہ ماسک مین کے آدمی تھے جو اس کے آگے پیچھے لگے رہتے تھے۔ پھر یہ کہ وہ میک اپ میں رہتی تھی۔ کوئی اسے رسونتی یا میری شریکِ حیات کی حیثیت سے پہچان نہیں سکتا تھا۔

بہت دور نکل کر میں نے اپنے بنگلے کی طرف پلٹ کر دیکھا۔ اب وہ بنگلہ ایک ساحلی موڑ پر نظر آ رہا تھا۔ میں چلتے چلتے ساحل کے ساتھ ساتھ دوسری طرف مڑنے لگا تھا۔ یہ اچھا ہی ہوا کہ میں نے پلٹ کر دیکھ لیا یا یوں کہنا چاہیے کہ تقدیر مہربان ہوتی ہے تو شیطان کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میں نے دیکھا، میرے بنگلے کے سامنے دو گاڑیاں آکر رکی تھیں اور کتنے ہی لوگ اس میں سے کود کود کر بنگلے کی طرف دوڑتے

جا رہے تھے۔ میں نے فوراً ہی بنگلے کے باورچی کے دماغ میں چھلانگ لگائی۔ وہ اس وقت تک سرونٹ کوارٹر سے نکل کر وہاں پہنچ گیا تھا۔ اس کے ذریعے پتا چلا کہ آنے والے مسلح ہیں اور انھوں نے بنگلے کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ ان میں سے چار آدمی ریوالور اور اسٹین گن لے کر بنگلے میں داخل ہو گئے تھے۔ میں دروازہ کھول کر آیا تھا، اس لیے انھیں دروازہ توڑنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

ایک شخص باورچی کا گریبان پکڑ کر پوچھ رہا تھا۔ "فرہاد کہاں ہے؟"

باورچی نے حیرانی سے پوچھا۔ "کون فرہاد؟ ہم کسی فرہاد کو نہیں جانتے ہیں۔"

"جھوٹ مت بولو۔ یہاں کون رہتا ہے؟"

"ایک دیوی جی دہلی سے آئی ہیں۔ وہ اپنے پتی اور بچے کے ساتھ یہاں رہتی ہیں۔"

اس نے گریبان سے پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ "اور اس دیوی کا پتی مسلمان ہے؟"

"یہ ہم نہیں جانتے۔"

اتنے میں چاروں آدمی بنگلے سے باہر آگئے۔ انھوں نے کہا۔ "ہم نے ایک ایک کونہ دیکھ لیا ہے۔ وہ یہاں موجود نہیں ہے۔"

یہ تمام باتیں ملایائی زبان میں ہو رہی تھیں۔ میں باورچی کے دماغ سے ان کا ترجمہ سمجھ رہا تھا۔ ایک مسلح جوان نے باورچی کی گردن دبوچ کر پوچھا۔ "تمھارا صاحب کس وقت باہر گیا ہے؟"

"پتا نہیں جی، ہم اپنے کوارٹر میں تھے۔ وہ ہمیں بتا کر نہیں گئے۔"

"تم اپنے کوارٹر میں کب گئے تھے؟"

"یہی کوئی دو گھنٹے پہلے۔"

ایک نے کہا۔ "ہو سکتا ہے وہ ساحل پر تفریح کے لیے گیا ہو۔ آؤ اسے تلاش کرتے ہیں۔"

یہ سنتے ہی میں تیزی سے سمندر سے اور ساحل سے دور ہوتے ہوئے شہر کی طرف جانے لگا۔ میرے چہرے پر ہلکا سا میک اپ تھا۔ میرے دشمن مجھے پہچان نہیں سکتے تھے مگر ہاں، میں ساحل پر ہوتا اور انھیں مجھ پر شبہ ہو جاتا تو وہ میرا میک اپ اُتار سکتے تھے۔

میں ایک سڑک کے کنارے چلتے چلتے رُک گیا۔ وہ سڑک بہت زیادہ مصروف نہیں تھی۔ شاذ و نادر ہی گاڑیاں وہاں سے گزرتی تھیں۔ میں نے منجالی کو مخاطب کیا۔ وہ فوراً ہی اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے کہا۔ "میں ابھی دشمنوں کی گرفت میں آتے آتے رہ گیا۔ تقدیر مہربان تھی۔ میں ان سے دور تھا۔ انھیں دیکھتے ہی بہت دور چلا آیا ہوں۔ تم فوراً گاڑی لے کر آؤ۔ میں تمھیں جگہ بتا رہا ہوں۔ یہ شہر اب بھی تمھارے لیے اجنبی ہے لہٰذا ڈرائیور کو ساتھ لو اور اسے بتاؤ کہ میں چنگی روڈ پر ایک فیکٹری کے سامنے کھڑا ہوا ہوں۔ اس فیکٹری میں ہیرے تراشے جاتے ہیں اور ان پر پالش کی جاتی ہے۔"

وہ میری باتیں سنتے سنتے کار میں آکر بیٹھ گئی تھی ——— ڈرائیور کار کے پاس ہی موجود تھا۔ اس نے اسٹیئرنگ سیٹ سنبھال لی پھر تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتے ہوئے منجالی کے بتائے پتے پر چلنے لگا۔ میں وہاں کھڑا ہوا دور تک دیکھتا رہا۔ سوچتا رہا کہ یہ اچانک کیا ہو گیا؟

میں نے اتنے جتن کیے۔ اپنی ذہانت سے چھپ چھپا کر رنگون سے یہاں پہنچا اور اتنی جلدی دشمنوں کو پتا بھی چل گیا کہ میں مشرقی ساحل کے ایک بنگلے میں پایا جا سکتا ہوں۔ آخر یہ اچانک کیسے ہو گیا؟ دشمن ٹیلی پیتھی تو نہیں جانتے تھے۔ یقیناً انھوں نے کسی کا سہارا لیا اور جس کا بھی سہارا لیا، وہ کوئی میرا اپنا ہی تھا۔

فوراً ہی میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ میں نے رسونتی کو بہت چھوٹ دی تھی۔ اسے آزادی سے گھومنے کا موقع دیا تھا۔ یقین تھا کہ دشمن اسے پہچان نہیں سکیں گے۔ کیا دشمنوں نے اسے پہچان لیا ہے اور اس کی لاعلمی میں ہماری رہائش گاہ تک پہنچ گئے؟

لیکن رسونتی کہاں ہے؟

میں پلک جھپکتے ہی اس کے پاس پہنچ گیا۔ وہ ایک مندر میں تھی۔ میں نے رسونتی کو اس کے دھرم کے معاملات میں کبھی نہیں روکا۔ اسے بلا روک ٹوک پوجا پاٹ کی اجازت دی۔ اس وقت بھی وہ اپنے نقلی بیٹے پارس کو لے کر اس مندر کے اندر ایک پجاری کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ ان کے سامنے ایک ناگ دیوتا کی بڑی سی مورتی تھی۔ اس مورتی کی تہ میں ایک چھوٹا سا تہ خانہ تھا جہاں زہریلے ناگ پالے جاتے تھے۔ پوجا کرنے والے دودھ سے بھرے ہوئے کٹورے اور کلسیاں لے کر آتے تھے۔ وہ تمام دودھ تہ خانے کے زہریلے سانپوں تک پہنچایا جاتا تھا اور انھیں دودھ پلا کر ناگ دیوتا کو خوش کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔

رسونتی یقیناً پوجا کرنے آئی تھی۔ اس نے بہت پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ہمارا بیٹا پارس ہم دونوں کے مطابق پروان چڑھے گا۔ میں نے اس بات پر اعتراض نہیں کیا کیوں کہ میرا بیٹا پارس میرے پاس تھا۔ اور مسلمان کی حیثیت سے پرورش پا رہا تھا اور وہ خوش فہم فرضی پارس کو اپنے ڈھنگ پر چلا رہی تھی۔

میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا، کہیں دشمنوں نے اسے پہچان نہ لیا ہو۔ یقیناً پہچان لیا ہوگا۔ کیوں کہ اس وقت وہ میک اپ میں نہیں تھی۔ اپنے دیوتا کے سامنے اصلی روپ میں تھی۔ میں آہستہ آہستہ اس کے دماغ کو کرید نے لگا۔ معلوم کرنے لگا کہ قصّہ کیا ہے؟ عورت اگر کمزور ہو تو وہ اپنی سوکن کو برداشت کر لیتی ہے۔ اگر اس کے ہاتھ میں ذرا سی بھی طاقت آ جائے تو وہ اپنے مرد کو تو سر پر بٹھاتی ہے

لیکن سوکن کو نیست و نابود کر دینا چاہتی ہے۔

قصہ یوں شروع ہوتا ہے کہ سنگاپور میں ایک بہت مشہور شاہراہ ہے جس کا نام سمبر نگون ہے۔ سمبر نگون شاہراہ کے اطراف سے کتنی ہی بڑی بڑی سڑکیں دوسری سمت جاتی ہیں۔ ان میں سے چوتھی سڑک کا نام ہندو روڈ اور پانچویں سڑک کا نام نوریں روڈ ہے۔ ان دونوں سڑکوں کے درمیان ہندوستانی آبادی ہے۔ یہاں کے بازاروں میں ہندو مہاجن چھائے ہوئے ہیں۔ ہندوستان سے آنے اور جانے والے سوداگر بھی یہاں اپنا مال لاکر بیچتے ہیں اور یہاں سے طرح طرح کے مال خرید کر لے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ بھارتی جیا موئی باور چیوں اور دھوبیوں کی تعداد زیادہ ہے۔ مسلمان کم نظر آتے ہیں۔ ہندوؤں کی آبادی زیادہ ہے اس لیے ان کے مندر بھی جگہ جگہ پائے جاتے ہیں۔ وہیں ایک ناگ دیوتا کا مندر ہے۔ ایک ہفتہ پہلے رسونتی اسی مندر میں پوجا کے لیے آئی تھی۔ وہاں سے واپس آکر شام کو اس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں ٹیلی پیتھی کے ذریعے اس کی خبر رکھتا ہوں یا نہیں؟

میں نے اسے جواب دیا تھا "میں بھلا تمھارے دماغ میں پہنچ کر کیا کروں گا جب کہ تم ہر طرح سے محفوظ ہو۔ ماسک مین کے آدمی تمھارے اطراف پہرہ دیتے رہتے ہیں۔ پھر تم میک اپ میں رہتی ہو۔ بھلا تمھیں کس بات کا خطرہ ہے؟"

"پھر بھی کبھی تو میری یاد آتی ہوگی؟"

"یاد آنا اور بات ہے، دماغ کو پڑھنا اور بات ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ میں بہت مصروف ہوں۔ جب تک سونیا اسرائیل کی حدود سے باہر نہیں نکلے گی، آزاد نہیں ہوگی اس وقت تک میں کسی اور طرف دھیان نہیں دے سکتا۔ تم بھی تو یہی کہتی ہو کہ پہلے سونیا کو آزاد کرایا جائے؟"

اس نے مطمئن ہو کر کہا "ہاں، میں یہی چاہتی ہوں۔ جب میں صبح یہاں سے جایا کروں اور شام تک نہ آیا کروں تو میرے لیے پریشان نہ ہونا۔ ماسک مین کے کسی بھی آدمی سے پوچھ لینے سے میری خیریت معلوم ہو جائے گی۔"

بہرحال اسی دن یہ طے پا گیا تھا کہ میں اس کے دماغ میں نہیں آیا کروں گا۔ اس کے بعد بھی وہ کئی بار سوچ کے ذریعے مجھے پکارتی رہی۔ میں موجود نہیں رہتا تھا۔ بھلا جواب کیا ملتا۔ اس لیے وہ مطمئن ہو گئی کہ میں پوجا کے سمے اس کے دماغ میں نہیں آتا ہوں۔

اس کے بعد ہی سے اس نے اپنے ناگ دیوتا کے سامنے ہاتھ جوڑ کر پرارتھنا کی۔ پرارتھنا یا التجا یہ تھی کہ اسے سوکنوں کے عذاب سے بچایا جائے۔ اگر کوئی ایسی ویسی سوکن ہوتی تو اس کے لیے وہ کرشن بھگوان کے مندر میں یا شنکر بھگوان کی پوجا کے لیے جاتی لیکن اب جو سوکن تھی وہ زہریلی تھی۔ اس زہریلی لڑکی کو دیکھ کر وہ سہم جاتی تھی اور اسے یقین تھا کہ اس کے شوہر فرہاد علی تیمور کو اس ناگن کے زہر سے عشق ہو گیا ہے۔

وہ ناگ دیوتا کے سامنے التجا کرتے وقت زیر لب بڑبڑاتی تھی لیکن عورتوں کی عادت ہوتی ہے، پہلے اپنا دکھڑا دھیمے سروں میں سناتی ہیں۔ پھر اپنے دکھوں میں، اپنے جذبوں میں بہتے بہتے ان کی آواز کچھ تیز ہو جاتی ہے۔ اسے بھی اس بات کا احساس نہیں رہا تھا کہ وہ ذرا اونچی آواز میں دیوتا کے سامنے دکھڑا رو رہی ہے اور اس دوران وہ اپنے پارس کی سلامتی کے لیے بھی التجا کر رہی ہے۔ یقیناً پارس کا نام اس کے لبوں پر آیا ہوگا تو اس کے دیوتا نے بھی سنا ہوگا۔ مندر میں جب وہ پوجا کرتی تھی تو کوئی اور نہیں ہوتا تھا۔ پجاری چلا جاتا تھا۔ صرف اس کے ناگ دیوتا اس کے سامنے ہوتے تھے۔

جب اس کی پرارتھنا ختم ہو گئی۔ وہ اپنے آنسو پونچھنے لگی تو اسے اپنے سر پر ایک ہاتھ محسوس ہوا۔ اس نے چونک کر دیکھا تو وہی پجاری اس کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ اس نے اس کے قریب ہی پالتھی مار کر بیٹھتے ہوئے کہا "بیٹی! ناگ دیوتا سے بھید چھپاؤ اچھا نہیں ہوتا۔ ناگ دیوتا پاتال میں پہنچ کر بھی چھپنے والوں کی اصلیت معلوم کر لیتے ہیں۔ اگر تم کچھ چھپا رہی ہو تو تمھاری پرارتھنا ٹال جائے گی۔ دیوتا سے کچھ پانا چاہتی ہو تو سچ سچ بتا دو۔ تم کون ہو؟ کہاں سے آئی ہو اور کس کی پتنی ہو؟"

رسونتی نے آنکھیں بند کر لیں۔ سوچ کے ذریعے مجھے پکارنے لگی "فرہاد! تم میرے دماغ میں موجود ہو تو مشورہ دو۔ کیا مجھے اپنے دیوتا کے سامنے سب کچھ اگل دینا چاہیے۔ کچھ نہیں چھپانا چاہیے؟"

میں موجود نہیں تھا۔ دوسری طرف پجاری نے کہا "اگر کوئی الجھن ہے تو کچھ نہ کہو۔ ناگ دیوتا خود معلوم کر لیں گے لیکن تمھارے کسی کام نہیں آئیں گے کیوں کہ تم نے اپنے دیوتا پر وشواس (اعتماد) نہیں کیا ہے۔"

وہ جلدی سے بولی "نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ میں اپنے دیوتا پر پورا وشواس رکھتی ہوں۔ میں کبھی کوئی بات نہیں چھپا سکتی۔ میں ذرا الجھن میں پڑ گئی تھی۔ میرے پتی مسلمان ہیں۔ ان کے ہاں ایک سے دو اور دو سے چار شادیاں کرنے کا رواج ہے۔ وہ میرے اوپر سوکن لاتے رہتے ہیں۔ ان دنوں ایک زہریلی لڑکی نے انھیں پھانس رکھا ہے۔ ان کا من مجھ سے نہیں لگتا ہے۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ وہ میرے پاس ہوتے ہیں مگر ان کا دل مجھ سے دور رہتا ہے۔"

"تم ٹھیک استھان پر آئی ہو۔ اگر وہ زہریلی ہے تو ناگ دیوتا اس کا سارا زہر نچوڑ کر رکھ دیں گے۔ اگر اس میں کشش ہے تو وہ ایک کیچوے کی طرح بدنما، بے ڈھنگی ہو جائے گی۔ اسے تمھارا پتی دیکھ کر منہ پھیر لیا کرے گا۔"

رسونتی نے خوش ہو کر پوچھا "سچ مہاراج؟ کیا وہ زہریلی لڑکی سچ

مجھے میرے پتی کی زندگی سے بالکل نکل جائے گی؟"

"بالکل نکل جائے گی۔ تم اس لڑکی کا پتا بتاؤ۔"

"میں نہیں جانتی۔ وہ اس سے چھپ چھپ کر ملنے جاتے ہیں۔ مجھ سے کسی کام کا بہانہ کر دیتے ہیں لیکن میں خوب سمجھتی ہوں۔"

"تم کہاں رہتی ہو؟"

اس نے مشرقی ساحل کے اس بنگلے کا پتا بتا دیا۔ میں نے اپنا سر تھام لیا۔ ساری بات سمجھ میں آگئی۔ ایسے ہی وقت میری خیال خوانی کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ منجالی کی کار میرے سامنے آکر رک گئی تھی۔ اس نے میرے لیے پچھلا دروازہ کھول دیا۔ میں اس کے پاس آکر بیٹھتے ہوئے دروازے کو بند کرتے ہوئے بولا۔ "اپنی رہائش گاہ چلو۔"

ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کردی۔ میں نے منجالی سے سوچ کے ذریعے کہا۔ "رسوتی کی حماقت سے یہ ہو رہا ہے۔ میں اس وقت اس کے دماغ میں ہوں۔ تھوڑی دیر بعد تم سے باتیں کروں گا۔"

میں پھر رسوتی کے دماغ میں پہنچ گیا۔ پجاری اسے کچھ دیر انتظار کرنے کے لیے وہاں بٹھا کر چلا گیا تھا اور وہ بیٹھی رہ گئی تھی۔ اسی دوران دشمنوں نے ہمارے بنگلے پر چھاپہ مارا تھا۔ بہر حال تھوڑی دیر بعد پجاری واپس آگیا۔ اس نے رسوتی کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "بیٹی! تمہاری منو کامنا بہت جلد پوری ہونے والی ہے۔ آج رات وہ زہریلی لڑکی یہاں آئے گی اور ناگ دیوتا کے سامنے سر پٹک پٹک کر مر جائے گی۔"

اس نے خوش ہو کر پوچھا۔ "سچ؟ کیا وہ مر جائے گی؟"

وہ بہت خوش تھی۔ پجاری نے کہا۔ "ضرور مر جائے گی۔ تم ناگ دیوتا کو کچھ بھینٹ کرو۔ کل صبح تمہیں اس کی موت کی خبر ملے گی۔"

رسوتی نے اپنے گلے سے سونے کا قیمتی ہار اتارا، جس میں ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ اس نے ناگ دیوتا کے سامنے اس ہار کو رکھ دیا۔ اب میں پجاری کے دماغ میں رہ کر اس کے خیالات پڑھ رہا تھا۔ وہ شدید حیرانی سے ہیرے جڑے ہوئے ہار کو دیکھ کر سوچ رہا تھا۔ "یہ عورت کتنی مالدار ہے، ہمارے صاحب ٹھیک کہتے ہیں۔ یہ فرہاد علی تیمور کی پتنی ہے۔"

اس کا صاحب کون تھا؟ میں اس کے دماغ کو کریدنے لگا۔ پتا چلا، اس مندر میں خفیہ مائیک نصب کیے گئے ہیں۔ وہاں آکر پوجا کرنے والے پرارتھنا کرنے والے اپنے دیوتا کے سامنے جو کچھ بھی کہتے ہیں، وہ سب دوسری طرف سنائی دیتا ہے۔ اکثر ایسے لوگ آتے ہیں جو مصیبتوں میں گرفتار ہوتے ہیں۔ وہ مجرم بھی ہوتے ہیں، گنہگار بھی ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو بڑی آسانی سے بلیک میل کیا جا سکتا ہے۔

ایک مجرم یا گنہگار عدالت میں اپنے جرم یا گناہ کا اقرار نہیں کرتا۔ لیکن خدا سے دعا مانگتے وقت گڑگڑاتے وقت وہ سچ بولتا ہے اور اپنی نجات چاہتا ہے اسی لیے بلیک میلنگ کرنے والے ایک بہت بڑے گروہ نے مندر کو اپنا اڈہ بنایا تھا تاکہ وہاں مجرموں اور گنہگاروں کو اپنی گرفت میں لے سکے۔ ان سے زیادہ سے زیادہ مال سمیٹنے کے لیے انھیں آلۂ کار بنا سکے۔

رسوتی نہ تو مجرم تھی اور نہ ہی گنہگار لیکن پرارتھنا کرنے کے دوران اس کی زبان سے ایک آدھ بار پارس کا نام نکلا تھا اور یہ آواز دور تک اسپیکروں کے ذریعے بلیک میلروں کے کانوں تک پہنچی تھی۔

میں یہ تو نہیں کہتا کہ میں اور میرا بیٹا پارس ساری دنیا میں مشہور ہیں اور جو بھی نام سنتا ہے وہ ہمارا تصور کرنے بیٹھ جاتا ہے۔ ایسی بات نہیں ہے مگر ہاں، خطرناک تنظیموں کے تمام افراد اور بلیک میلنگ جیسی واردات کرنے والے مجرم ضرور میرا اور میرے بیٹے پارس کا نام جانتے ہیں۔ اس بلیک میلنگ کرنے والے گروہ کا سرغنہ بھی یقیناً پارس کا نام جانتا ہوگا۔ اسی لیے رسوتی کی زبان سے اس کا نام سن کر چونک گیا ہوگا۔ پجاری ابھی اس سرغنہ کے پاس نہیں گیا تھا اور نہ ہی اس سے ابھی کوئی رابطہ قائم ہوا تھا۔ اس لیے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ صرف اندازے کے طور پر یہ رائے قائم کر رہا تھا کہ اس نے پارس کا نام سننے کے بعد یہ دیکھا ہوگا کہ ایک ہندو عورت پوجا کر رہی ہے اور اپنے پتی کو مسلمان بتا رہی ہے تو اسے فوراً فرہاد علی تیمور، رسوتی اور پارس کا خیال آیا ہوگا۔

یہاں تک معلومات حاصل کرنے اور اپنے طور پر رائے قائم کرنے کے بعد میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میں منجالی کے ساتھ اس کی رہائش گاہ کے سامنے پہنچ گیا تھا۔ میں نے کہا۔ "تم اندر جا کر اپنا سامان لے آؤ۔ ہم یہاں سے جا رہے ہیں۔"

اس نے یہ نہیں پوچھا کہ کہاں جا رہے ہیں۔ وہ تو میرے ساتھ جہنم میں جانے کے لیے بھی تیار تھی۔ فوراً میرے حکم کی تعمیل کے لیے چلی گئی۔ میں نے بنکاک کے پاس جے آہجے ناتھن کے پاس پہنچ کر دیکھا۔ وہ ایک بڑے سے ٹرانسمیٹر کے سامنے کھڑا ہوا رابطہ قائم کرنے کے بعد کسی سے کہہ رہا تھا۔ "مجھے آدھے گھنٹے کے اندر معلوم ہونا چاہیے کہ فرہاد صاحب کے بنگلے پر کن لوگوں نے حملہ کیا تھا، وہ لوگ کہاں سے آئے تھے اور کہاں گئے ہیں؟ میں کوئی بہانہ نہیں سنوں گا۔ سمجھے آپ؟"

وہ پھر کسی دوسرے سے رابطہ قائم کرنے لگا۔ رابطہ قائم ہونے کے بعد اس نے پوچھا۔ "کیا مادام رسوتی خیریت سے ہیں؟"

جواب ملا۔ "وہ خیریت سے ہیں اور اس وقت ناگ دیوتا کے مندر میں ہیں۔"

"ان پر کڑی نظر رکھو۔ ابھی ان کے بنگلے کو دشمنوں نے گھیر لیا تھا۔ وہ کون لوگ تھے۔ ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا۔ جب تک معلوم نہ ہو اس وقت تک مادام کو اپنی نظروں سے اوجھل نہ کرو۔"

"جناب! مادام نے ہمیں منع کیا ہے کہ ہم مندر کے اندر نہ آئیں۔"

"ٹھیک ہے، مندر کو چاروں طرف سے گھیرے رکھو۔ کسی پر بھی شبہ ہو تو اسے مادام کے قریب نہ جانے دو۔"

اس نے ٹرانسمیٹر کو آف کر دیا۔ میں نے اسے مخاطب کیا تو وہ اچھل پڑا۔ جلدی سے بولا۔ "جناب! یہ آپ ہیں؟"

"میں ہوں اور میں اس وقت سنگاپور چھوڑ کر منجالی کے ساتھ تمہارے ڈرائیور کو لے کر ملایا جا رہا ہوں۔ مجھے بتاؤ، وہاں میری رہائش کا انتظام کہاں ہو سکتا ہے؟"

"جناب! پے نانگ بہت مشہور جگہ ہے۔ وہاں آپ کی رہائش کا انتظام ابھی ہو جائے گا۔"

"ریوتی کو آئندہ میری اور منجالی کی رہائش گاہ کا علم نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بھی نہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہم پے نانگ میں ہیں، بالی میں ہیں یا بنکاک میں۔"

"ہم مادام کو نہیں بتائیں گے لیکن جناب! یہ قصہ کیا ہے۔ کچھ ہمیں بھی معلوم ہونا چاہیے تاکہ ہم حالات سے باخبر رہ کر آپ لوگوں کی حفاظت کر سکیں۔"

"میں خود معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ وہ کون دشمن تھے جنھوں نے ہمارے بنگلے کا محاصرہ کیا تھا۔ معلوم ہوتے ہی میں آپ کو ضرور بتاؤں گا۔"

اس وقت تک منجالی اپنا سامان لے کر آ گئی تھی۔ کار اسٹارٹ ہو گئی تھی۔ میں نے ڈرائیور سے کہا۔ "اب ہم ملایا جا رہے ہیں۔ ہمیں پے نانگ لے چلو۔"

وہ حکم کی تعمیل کرنے لگا۔ میں نے سوچ کے ذریعے کہا۔ "منجالی! ابھی میں نے معلوم کیا ہے کہ کن لوگوں نے میرے اس بنگلے کو گھیرا تھا۔ وہ کسی بلیک میلر کے آدمی ہیں۔ اگر میرے آزمائے ہوئے اور مجھ سے چوٹ کھائے ہوئے دشمن ہوتے تو اس بلیک میلر کی طرح جلد بازی سے کام نہ لیتے۔ بنگلے کو گھیرنے کے بجائے کسی طرح میری موجودگی یا عدم موجودگی کا پتا چلاتے۔ اس کے بعد وہ محاصرہ کرتے مگر اُن کی حماقت سے میں اس وقت صحیح سلامت نظر آ رہا ہوں۔"

منجالی نے کہا۔ "صحیح سلامت نہیں، زندہ سلامت کہیے۔"

"زندہ سلامت اس لیے نہیں کہتا ہوں کہ وہ لوگ مجھے گرفتار کرنے کے بعد بھی زندہ ہی رکھتے۔ جب وہ بلیک میلر ہی ٹھہرا تو اس نے یقیناً یہی سوچا ہوگا کہ مجھے اپنی گرفت میں لینے کے بعد اپنی آواز مجھے نہیں سنائے گا۔ بہت محتاط رہے گا۔ اور میرے دشمنوں کے ہاتھوں مجھے بہت مہنگے داموں فروخت کر دے گا۔"

"میں سمجھ گئی۔ آپ ایک معمولی بلیک میلر کی وجہ سے سنگاپور کبھی نہ چھوڑتے۔ یہ جگہ چھوڑنے کا سبب یہی ہے کہ اب یہ بات دشمنوں تک پہنچے گی اور دشمن آپ کا محاصرہ کرنے کے لیے سنگاپور کو مرکز بنا لیں گے۔"

"ہاں، اس سے پہلے ہی میں یہ جگہ چھوڑ رہا ہوں۔"

"میرے آقا! میں ایک مشورہ دوں؟"

"ہاں، ضرور۔"

"پے نانگ بھی آپ کے لیے محفوظ جگہ نہیں ہو سکتی۔ دشمن آپ کو سنگاپور سے ملایا کی آخری سرحد تک تلاش کریں گے۔ کیوں نہ ہم تھائی لینڈ چلے جائیں؟"

میں نے اس کے مشورے پر غور کیا۔ وہ درست کہہ رہی تھی۔ دشمن صرف سنگاپور تک محدود ہو کر تلاش نہیں کریں گے۔ سنگاپور اور ملایا کے درمیان ایک چھوٹا سا پل تھا جسے پار کر کے ایک جگہ سے دوسری جگہ آسانی سے پہنچا جا سکتا تھا۔ دشمن یہ سوچ سکتے تھے کہ میں بہ آسانی کار کے ذریعے سنگاپور سے ملایا پہنچ سکتا ہوں۔ ویسے ملایا سے تھائی لینڈ کا راستہ بھی نہایت آسان تھا۔ کار کے ذریعے یا ریل گاڑی کے ذریعے وہاں پہنچا جا سکتا تھا لیکن تھائی لینڈ میں بنکاک کی آبادی اتنی گھنی تھی، اتنا معروف ترین شہر تھا کہ دشمن مجھے آسانی سے وہاں تلاش نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے منجالی کے مشورے کو تسلیم کر لیا۔

اس نے سوچ کے ذریعے پوچھا۔ "میرے آقا! آپ نے مادام کے لیے کیا انتظامات کیے ہیں؟"

"تمہاری مادام نے تو ناک میں دم کر رکھا ہے۔ اگر اس سے دور رہتا ہوں تب بھی اپنے آپ کو مجرم سمجھتا ہوں کہ اسے ایک بیوی کے حقوق نہیں دیتا ہوں۔ جب قریب رکھتا ہوں تو وہ کوئی نہ کوئی مصیبت مجھ پر نازل کر دیتی ہے۔"

"آپ ایک عورت کے دل سے سوچ کر دیکھیے۔ مادام نے مجھ سے دشمنی کی ہے یا کر رہی ہیں تو یہ ان کا حق ہے کیوں کہ وہ سمجھتی ہیں کہ میں ان کا حق چھین رہی ہوں۔"

"اگر میں اس سے ناانصافی کروں تو کہا جا سکتا ہے کہ اس کا حق چھینا جا رہا ہے۔ میں اس کے لیے دشمنوں سے لڑتا ہوں۔ میں ان کی گرفت سے اسے چھڑا کر یہاں تک لے آیا۔ اس سے پہلے بھی اس نے مجھے زبردست نقصانات پہنچائے ہیں۔ خود میری زندگی کو خطرات میں ڈال دیا۔ مجھے دشمنوں کے نرغے میں لانے کی نادانی کرتی رہی۔ میں مانتا ہوں، صرف وہی میری بیوی بن کر رہنا چاہتی ہے۔ اسے بھی مان لینا چاہیے کہ میں نے اس کے سوا کسی کو اپنی بیوی نہیں بنایا۔ پھر یہ حماقتیں کیسے برداشت کی جا سکتی ہیں۔ میں نے آخری بار اسے اپنے پاس رہنے کا موقع دیا تھا۔ اب میں یہ حماقت نہیں کروں گا۔ وہ بے شک میری بیوی ہے۔ میں اسے سزا نہیں دوں گا کیوں کہ وہ میرے

بیٹے پارس کی ماں ہے۔ اس لیے میں اس کی ہزار خطائیں معاف کر سکتا ہوں لیکن اب اسے اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا۔"

میں نے پاس بیٹے آرچے ناتھن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "ہم بے ہانگ میں خود کو محفوظ نہیں پائیں گے لہٰذا یہ فیصلہ کیا ہے کہ بنکاک چلے جائیں۔ ہم کم سے کم وقت میں پہنچنا چاہتے ہیں۔ میرے پاس میرا اپنا سامان، پاسپورٹ وغیرہ کچھ نہیں ہے اور پاسپورٹ بھی عزت علی کے نام کا تھا جو میرے لیے بے کار تھا۔"

"آپ بالکل فکر نہ کریں۔ میں اپنا ہیلی کاپٹر سنگاپور سے لے کر روانہ ہو رہا ہوں۔ راستے میں جہاں بھی آپ کی گاڑی نظر آئے گی۔ وہاں میں اپنا ہیلی کاپٹر اتاروں گا۔ آپ لوگ اس میں سوار ہو جائیں۔ میں آپ کو بنکاک پہنچا دوں گا۔ راستے میں کوئی رکاوٹ پیدا ہو گی تو میں اس سے نمٹ لوں گا۔"

اس وقت شام کے پانچ بج چکے تھے۔ روشنی مندر سے نکل آئی تھی اور اب اپنی کار میں بیٹھ کر اسی بنگلے کی طرف جانا چاہتی تھی۔ ماسک مین کے ڈرائیور نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے کہا "مادام! ابھی ہمیں اطلاع ملی ہے کہ دشمنوں نے آپ کے بنگلے کو گھیر لیا تھا اور ہمارے صاحب کو تلاش کر رہے تھے۔ صاحب وہاں موجود نہیں تھے، آپ ہمیں بتائیں۔ کیا آپ کا وہاں جانا مناسب ہے؟"

وہ پریشان ہو کر بولی "کن لوگوں نے ہمارے بنگلے کو گھیر لیا تھا۔ بھلا انھیں کیا معلوم کہ وہاں کون رہتا ہے؟"

"یہ ہم نہیں جانتے۔ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم آپ کو دوسری رہائش گاہ میں پہنچائیں۔"

"میں فرہاد سے مشورہ کیے بغیر کسی دوسری جگہ نہیں جاؤں گی۔"

"مادام! آپ کی حفاظت کرنا ہمارا فرض ہے۔ فرہاد صاحب سے آپ کا رابطہ قائم ہو گا تو وہ بھی آپ کو ہماری خدمت گزاری اور وفاداری کا یقین دلائیں گے۔"

وہ پریشان ہو کر سوچنے لگی "یہ میری تقدیر کیسی ہے۔ ابھی میں ایک دشمن لڑکی کو اپنے راستے سے ہمیشہ کے لیے ہٹانے کا انتظام کر کے آئی ہوں۔ آج رات وہ ضرور مر جائے گی۔ میں نے سوچا تھا فرہاد صرف میرے ہو کے رہیں گے مگر یہاں وہ کمبخت دشمن کیسے پہنچ گئے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہیں فرہاد مجھ سے دور رہنے کے لیے کوئی چکر تو نہیں چلا رہے ہیں۔"

محبت میں بدگمانی ہوتی ہے لیکن ایسی بھی کیا بدگمانی کہ بیوی ہر بات پر اپنے شوہر کو مدعا الزام ٹھہرا لے۔ کوئی واقعہ ہو، کیسے ہی حالات ہوں، وہ ہمیشہ شک و شبے کی عینک لگا کر مجھے دیکھتی تھی اور اسی انداز سے سوچتی تھی۔

میں نے اسے مخاطب کیا۔ ”رسونتی! تم ہمیشہ کتّے کی دُم کی طرح ٹیڑھی رہو گی۔ تمھیں کبھی عقل نہیں آئے گی۔ تم نے ناگ دیوتا کے مندر میں جاکر جو حماقت کی ہے اس کی وجہ سے دشمن اس بنگلے تک پہنچ گئے۔ میں ساحل پر نہ ہوتا، اس بنگلے پر ہوتا تو تمھارا کچھ نہیں بگڑتا۔ میں جان سے چلا جاتا یا دشمن مجھے بے دست و پا کر کے رکھ دیتے۔“

وہ حیرانی سے بولی۔ ”یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ میں نے تو کسی دشمن کے سامنے تمھارا ذکر نہیں کیا ہے۔“

”تم نے اپنا میک اپ کیوں اتار دیا؟“

”پجاری جی کہہ رہے تھے کہ دیوتا کے سامنے کوئی بھید نہیں رکھنا چاہیے اور میرا بھی یہی عقیدہ ہے کہ کوئی اپنے بھگوان یا اپنے دیوتا کے سامنے چھپ نہیں سکتا۔“

”تم نے نہ چھپ کر، خود کو ظاہر کر کے بہت کمال کر دیا ہے۔ اب اس کا نتیجہ بھگتنے کے لیے تیار رہو۔“

”تم مجھے الزام دے رہے ہو۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ میں پوجا کروں، اپنے ناگ دیوتا کے سامنے کچھ کہوں تو دشمن کہیں سے آکر سن لیں۔“

”یہ وہ دشمن نہیں تھے جو دن رات میرے پیچھے لگے رہتے ہیں۔ یہ دوسرے ہی قسم کے مجرم ہیں لیکن یہ مجرم مجھے میرے جانی دشمنوں کے پاس پہنچانا چاہتے تھے۔ بہرحال میں تم سے بحث کرنا نہیں چاہتا۔ اس مندر میں تمھیں خوب بیوقوف بنایا گیا ہے۔ میں کسی بیوقوف عورت کے ساتھ اور زیادہ زندگی نہیں گزار سکتا۔ میں تمھیں بیوی کی حیثیت سے مانتا ہوں کیوں کہ تم میرے بیٹے کی ماں ہو لیکن تمھارے ساتھ ایک دن، ایک رات بھی نہیں گزاروں گا۔“

وہ رونی صورت بنا کر بولی۔ ”فرہاد! مجھ سے دور رہ کر ایسی دھمکیاں نہ دو۔ پہلے میرے پاس آؤ۔ میں محبت سے تمھیں سمجھاؤں گی۔ میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں کسی اور کام سے گئی تھی۔“

”ہاں بہت نیک مقصد لے کر گئی تھیں۔ سنجالی کو مار ڈالنا چاہتی تھیں۔ دیکھ لو، جسے اللہ رکھتا ہے، اسے کوئی نہیں چکھ سکتا۔ تمھارے لیے اس سے بڑی سزا اور کیا ہوگی کہ جسے تم ہمیشہ کے لیے ختم کر دینا چاہتی تھیں، وہ اس وقت میرے ساتھ ایک طیارے میں سفر کر رہی ہے اور ہم کہاں جا رہے ہیں، یہ تم کبھی معلوم نہیں کر سکو گی۔“

وہ گڑگڑا کر کہنے لگی۔ ”نہیں فرہاد! نہیں۔ مجھ سے دور نہ جاؤ۔ میں تمھارے بغیر زندہ نہیں رہ سکوں گی۔“

”بے مقصد گفتگو سے بہتر ہے کہ میری چند ہدایات پر عمل کرو۔ پہلی ہدایت یہ ہے کہ ماسک مین کے آدمی جہاں تمھاری رہائش کا بندوبست کرتے ہیں وہاں جاکر رہو۔ دوسری بار اس مندر کا رُخ نہ کرنا۔ دشمن مجھے نہ پاکر اب تمھیں اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کریں گے کیوں کہ تم بہت مہنگے داموں دشمن کے ہاتھوں فروخت کی جا سکتی ہو۔“

”فرہاد! میں تمھاری ہر ہدایت پر، تمھارے ہر حکم پر بلا چوں و چرا عمل کروں گی۔ تمھارے قدموں میں رہوں گی۔ ایک بار تم میرے پاس آکر میری بات سن لو۔“

”بکواس مت کرو۔ میری تیسری ہدایت یہ ہے کہ اگر دشمنوں میں گھر جاؤ تو یہی کہنا کہ دہلی سے یہاں آئی تھیں اور ایک مسلمان شخص تمھارے ساتھ تھا اور تمھیں یقین دلا رہا تھا کہ فرہاد جلد ہی رنگون سے یہاں آنے والا ہے لیکن کچھ ایسی رکاوٹیں ہیں کہ وہ رنگون سے نکل نہیں سکتا۔“

”تم جیسا کہہ رہے ہو، میں ویسا ہی کروں گی مگر ایک بار صرف ایک بار اپنے پارس بیٹے کی خاطر ایک بار آجاؤ۔“

”پارس کو آئندہ لوریاں دیتے وقت یہ بھی سمجھاتی رہنا کہ ماں حد درجہ بیوقوف ہو تو اس کی سزا اولاد کو بھی ملتی ہے۔ شوہر صرف اپنی بیوی سے دور نہیں ہوتا بلکہ باپ اپنے بیٹے سے بھی دور ہو جاتا ہے اور اسی میں اس کے باپ کی سلامتی ہوتی ہے۔“

یہ کہہ کر میں خاموش ہوگیا۔ وہ مجھے آوازیں دینے لگی۔ گڑگڑانے لگی۔ پھر خاموش رہ کر اپنے دماغ میں مجھے محسوس کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کا دل کہہ رہا تھا، دماغ کہہ رہا تھا کہ میں اسے چھوڑ کر جا چکا ہوں۔ جب اسے یقین ہوگیا کہ میری طرف سے کوئی جواب نہیں ملے گا بلکہ میں چلا گیا ہوں تو وہ ایک دم سے جنون میں مبتلا ہوگئی۔ چیخ کر بولی۔ ”گاڑی روکو۔“

ڈرائیور نے گھبرا کر گاڑی سڑک کے کنارے روک دی — وہ دیوانہ وار دروازہ کھول کر باہر نکلتے ہوئے بولی۔ ”فرہاد! تم میرے دماغ میں آؤ یا نہ آؤ، میرے پاس آؤ یا نہ آؤ، میں اپنے آپ کو تباہ کر لوں گی۔ میں مندر جا رہی ہوں۔ چاہے دشمن مجھے پکڑ لیں یا مجھے اپنے دیوتا کے چرنوں میں جگہ مل جائے۔ میں وہاں ضرور جاؤں گی۔“

ان حالات میں بیوی میکے جانے کی دھمکی دیتی ہے۔ وہ مندر جانے کی دھمکی دے رہی تھی اور اس پر عمل بھی کر رہی تھی۔ پارس کو گود میں لیے فٹ پاتھ پر تیزی سے بھاگ رہی تھی۔ اس کا دماغ کہہ رہا تھا۔ ”فرہاد مجھے ضرور روکے گا۔ ضرور واپس بلائے گا۔ آجاؤ، میری رسونتی! میں تمھیں معاف کرتا ہوں اور تمھیں ایک بار پھر گلے سے لگاتا ہوں۔“

اب میں ایسی حماقت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ وہ چلتی رہی، چلتی رہی، پھر ایک جگہ جاکر رک گئی۔ تھک گئی۔ سمجھ گئی کہ میں اس کے دماغ سے جا چکا ہوں اور اس کی دھمکی مجھ پر اثر نہیں کرے گی۔ جب میں موجود ہی نہیں ہوں تو اثر کیسے کرے گی؟

وہ ہار کر، پچھتا کر، اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اسی وقت وہی گاڑی اس کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ ڈرائیور نے اتر کر کہا۔ ”مادام! ہمارا کچھ

## ۱ یونان

میں دیکھنے کے لیے بہت کچھ ہے۔ خواہ اسے دیدۂ عبرت سے بغور دیکھا جائے یا ڈھلے ہوئے دیدے کی سرسری نظر سے۔ ایتھنز میں اکروپولس کی پہاڑی پر سیاحوں کا ایک گروہ کھڑا تھا۔ گائیڈ مختلف سمتوں میں اشارے کرتا اور ایک ازبر تقریر کو دہراتا جاتا۔ سامنے منروا کا مندر تھا۔ جن دنوں پیری کلیس نے اس عمارت کو تعمیر کیا، وہ دنیا کی خوبصورت ترین عمارت تھی۔ آج اسے سب سے خوبصورت کھنڈر کا درجہ حاصل ہے۔ سب کی نگاہیں مندر پر جمی ہوئی تھیں اور مسافر اسے دیکھ کر واہ واہ کر رہے تھے۔ میری نگاہ البتہ کاغذ کے چھوٹے سے پرزے پر جمی ہوئی تھی۔ یہ داخلے کا ٹکٹ تھا۔ میں نے اس کی پشت پر لکھی عبارت کو بار بار پڑھا۔ اس پر لکھا تھا کہ پیری کلیس کے عہدِ حکومت میں ملک مالا مال اور لوگ نہال ہو گئے مگر وہ اتنا پُرنظر تھا کہ اس کی ذاتی ملکیت میں پھوٹی کوڑی کا بھی اضافہ نہ ہوا۔ میں نے اس عبارت پر غور کرنے کے بعد سر اٹھا کر پارتھینن پر نظر ڈالی تو مجھے عمارت میں اس کے حسنِ صورت کے ساتھ اس کے بنانے والے کے حسنِ سیرت کی جھلک بھی نظر آئی۔ عمارت کی چھت گر چکی ہے مگر اس کے ستون دو ہزار برس سے ایستادہ ہیں۔ لغزش سے پیری کلیس خود بھی محفوظ رہا اور اس کے بنائے ہوئے ستون بھی۔ سورج کی روشنی میں یوں لگتا تھا کہ یہ عمارت دودھ میں نہائی ہوئی ہے۔ شفق پھوٹی تو گویا اس پر سنہرا پانی چڑھ گیا۔ پیری کلیس نے ایتھنز میں کتنی ہی عمارتوں پر سونے کا ملمع کرایا تھا۔ اب اس کی روایت کو شفق ہر روز پورا کرتی ہے۔ پیری کلیس کے عہدِ زریں کے بارے میں جو جملہ ٹکٹ کی پشت پر چھپا ہوا تھا وہ پلوٹارک کی کتاب سوانح سے نقل ہے۔ میں نے وہ ٹکٹ سنبھال کر رکھ لیا اور وطن واپس لے آیا۔ پلوٹارک کی ضخیم کتاب کون پڑھے گا، لیکن اس کا یہ ایک جملہ شاید کسی صاحبِ اختیار کی نظر سے گزرے اور دل میں گھر کرلے۔ اس خیال کو کئی برس ہو گئے ہیں اور وہ ٹکٹ ابھی تک میرے پاس ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس کو بھیجوں۔ یک انار و صد بیمار۔

ماخوذ از آوازِ دوست : مختار مسعود صفحہ ۴۰

---

خیال کریں۔ اگر آپ اِدھر اُدھر بھٹک جائیں گی تو باس آپ کو گولی مار دے گا۔"

اس نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ رسونتی شکست خوردہ انداز میں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ پھر وہ گاڑی دوسری رہائش گاہ کی طرف جانے لگی۔ میں دماغی طور پر منجالی کے پاس پہنچ گیا۔ ہماری گاڑی ایک لمبی ویران سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ منجالی مجھے دیکھ کر مسکرانے لگی۔ بعض لوگ بڑے بدنصیب ہوتے ہیں۔ دوسروں کے لیے گڑھا کھودتے ہیں اور خود اس میں گر جاتے ہیں۔ رسونتی نے منجالی کے لیے گڑھا کھودا تھا لیکن میں منجالی کے پاس تھا اور منجالی کو گرانے والی خود ایک طویل جدائی کے گڑھے میں گر چکی تھی۔

ہم ہائی وے پر تھے۔ کبھی کبھی کوئی گاڑی ہمیں کراس کرتے ہوئے گزر جاتی تھی یا کوئی گاڑی اوور ٹیک کر کے آگے نکل جاتی تھی۔ ہماری کار کی رفتار سست تھی۔ ہمیں باس جے آر جے تانفسن کا انتظار تھا پھر یہ انتظار ختم ہو گیا۔ ہیلی کاپٹر کی آواز سنائی دی۔ ہم نے کار کے پچھلے حصے سے دیکھا۔ اس وقت رات کے آٹھ بجے تھے۔ اندھیرے میں دور آسمان پر سرخ اور سبز روشنی جلتی بجھتی نظر آرہی تھی۔ میں نے فوراً ہی دماغی رابطہ قائم کیا۔ جے تانفسن نے کہا۔ "جناب! میں ہیلی کاپٹر میں آرہا ہوں۔"

"میں ہیلی کاپٹر کی آواز سن رہا ہوں۔ ہمیں بہت دور سرخ اور سبز روشنیاں جلتی بجھتی نظر آرہی ہیں۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم آپ کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ اب میں ہائی وے کے اوپر سرچ لائٹ کی روشنی پھینکتا چلوں گا اور اس کار کو پہچان لوں گا۔"

تھوڑی دیر بعد ہم نے دیکھا، وہ ہیلی کاپٹر بہت دور ہائی وے پر آگیا تھا اور سرچ لائٹ کے ذریعے روشنی پھینکتا ہوا ہمارے قریب آتا جا رہا تھا۔ میں نے ڈرائیور سے کہا۔ "گاڑی ایک طرف روک دو۔"

ڈرائیور نے گاڑی سڑک کے کنارے روک دی۔ میں اور منجالی باہر نکلے۔ منجالی نے اپنے ایک بیگ کو شانے سے لٹکایا۔ ایک چھوٹی سی اٹیچی ہاتھ میں لی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے اٹیچی لیتے ہوئے کہا۔ "آؤ، میرے ساتھ۔"

وہ میرے ساتھ چلتے ہوئے بولی ـــــ "میرے آقا! میں یہ سامان خود اٹھاؤں گی۔ مجھے اچھا نہیں لگتا کہ آپ . . .؟" میں نے اُسے مزید کچھ کہنے کا موقع ہی نہ دیا۔

ہم اس ہائی وے سے دور ایک کھلے میدان میں آگئے۔ ہیلی کاپٹر کی روشنی ہم پر پڑ رہی تھی اور اب وہ ایک طرف اُتر رہا تھا۔ زوردار ہوائیں چل رہی تھیں۔ ہم نے ایک دوسرے کے ہاتھوں کو اچھی طرح

گرفت میں لے لیا تھا تاکہ ہم ابھی تنکے کی طرح اُڑ نہ جائیں۔

ہیلی کاپٹر زمین پر اُتر گیا تھا لیکن پنکھا گردش کر رہا تھا۔ باس جے آر جے نائقس نے کہا تھا کہ یہاں زیادہ دیر تک رُکنا مناسب نہیں ہے۔ اس لیے کہ پرائیویٹ ہیلی کاپٹر کی سڑک پر لینڈنگ غیر قانونی ہے۔ فوراً ہی ہمیں سوار ہو کر یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ میں منجالی کا ہاتھ پکڑ کر اُدھر دوڑتے ہوئے جانے لگا۔ چند قدم تک دوڑنے کے بعد ہی اچانک منجالی کی چیخ سُنائی دی۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

میں سمجھ نہ سکا، اس پر کیا افتاد آپڑی ہے؟ وہ مجھ سے ہاتھ چھڑانے کے بعد اُدھر بھاگی جا رہی تھی جدھر سے ہم آئے تھے۔ میں نے اس کی طرف دوڑتے ہوئے کہا "منجالی! رُک جاؤ۔ کیا بات ہے؟"

وہ دوڑتے دوڑتے ایک جگہ رُک گئی لیکن اُلٹے قدموں مجھ سے دُور جاتے ہوئے ہاتھ اُٹھا کر مجھے قریب آنے سے روکتے ہوئے بولی۔ "میرے آقا! میرے قریب نہ آنا۔ میں ابھی اپنے آپ میں نہیں ہوں۔ میں آپ کو ڈس لوں گی۔ خدا کے لیے مجھ سے دور ہو جائیے۔ میں نہیں چاہتی کہ آپ میرے زہر سے مارے جائیں۔"

ہم اندھیرے میں تھے۔ میں اسے دیکھ کر اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ اس پر کیا بیت رہی ہے اور وہ اپنے آپ میں کیوں نہیں ہے۔ میں اس کے دماغ میں پہنچنا چاہتا تھا۔ اسی وقت ہیلی کاپٹر کی سرچ لائٹ ہماری طرف گھوم گئی۔ وہ روشنی میں نہا گئی۔ میں نے دیکھا، وہ چہرے سے بہت زیادہ پریشان نظر آ رہی تھی۔ میں نے توجہ سے دیکھا تو اس کی پیشانی سے ایک کوڑی چپکی ہوئی تھی۔ یہ پہلے نہیں تھی۔ اب اچانک کہاں سے آگئی؟ کیا منجالی نے اسے سنگھار کے طور پر چپکایا ہے؟

ہرگز نہیں، وہ ایسا سنگھار نہیں کرتی تھی کہ ماتھے پر بندیا کی جگہ کوڑی چپکا لے۔ میں نے فوراً ہی اس کے دماغ میں پہنچ کر دیکھا۔ وہ اپنے دماغ کے اندر بین کی آواز سن رہی تھی جیسے کوئی سپیرا بین بجا کر ناگن کو اپنے قابو میں کرنے کی کوشش کر رہا ہو اور ناگن تڑپ رہی ہو، مچل رہی ہو اور اپنے آپ میں نہ ہو۔

منجالی نے دُرست کہا تھا۔ وہ اپنے آپ میں نہیں تھی۔ بین کی آواز پر تڑپ رہی تھی، مچل رہی تھی اور جھوم جھوم کر جیسے رقص کرنا چاہتی تھی لیکن پہلے بین بجانے والے کے سامنے پہنچنا چاہتی تھی۔ اس لیے وہ پھر اس سمت بھاگ رہی تھی جدھر سے بین کی آواز سُنائی دے رہی تھی۔ یہ آواز صرف وہی سُن رہی تھی۔ ہمیں سنائی نہیں دے رہی تھی۔

میں نے اپنی زندگی میں کالے جادو کے تماشے بہت دیکھے ہیں۔ اچانک میرا دماغ ناگ دیوتا کے مندر کی طرف گیا۔ دوسرے ہی لمحے میں پجاری کے دماغ میں پہنچ گیا۔ مندر کا ماحول بڑا ہی پُراسرار تھا۔ اس وقت پوجا کرنے والوں کے لیے داخلہ بند کر دیا گیا تھا۔ مندر کا بڑا دروازہ اندر سے مقفل تھا۔ جہاں ناگ دیوتا کا بڑا سا مجسمہ تھا، وہاں پجاری کے علاوہ چار آدمی اور بھی تھے۔ ایک شخص پتلون پر اوور کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ سر پر فلیٹ ہیٹ تھا۔ وہ ایک اونچی سی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا جس سے پتا چلتا تھا کہ وہ ان کا باس ہے۔ باقی دو آدمی اس کے آس پاس ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوئے تھے۔ تیسرا شخص ایک سپیرا تھا۔ لانبے قد کا دُبلا پتلا آدمی تھا۔ لانبے لانبے بال تھے۔ اس وقت وہ بین کو مُنہ سے لگائے بجا رہا تھا اور ناگ دیوتا کے سامنے رقص کرتا جا رہا تھا اور بین بجاتا جا رہا تھا۔

پجاری کے دماغ نے بتایا کہ ابھی ناگ دیوتا کے پھن کے اوپر جو ایک کوڑی رکھی ہوئی تھی، اچانک ہی وہاں سے اُڑتی ہوئی کہیں چلی گئی تھی۔ نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ یقیناً وہ کالا عمل کامیاب ہو رہا تھا۔ وہ بین بجانے والا کالے عمل کا ماہر تھا۔ اس نے دعویٰ کیا تھا کہ ناگ دیوتا کے پھن پر جو کوڑی ہے وہ یہاں سے اُڑتی ہوئی جائے گی اور اس زہریلی لڑکی کی پیشانی سے چپک جائے گی۔ پھر وہ کوڑی اسے کھینچتے ہوئے یہاں لے آئے گی۔

میں خیال خوانی کے دوران منجالی کے پیچھے دوڑتا جا رہا تھا۔ احتیاطاً میں نے اس سے فاصلہ رکھا تھا۔ اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ اسے ہاتھ لگاؤں گا، پکڑوں گا، آگے جانے سے روکوں گا تو وہ غصہ ور ناگن کی طرح پھنکارتے ہوئے مجھے ڈس لے گی۔ دوسری طرف مجبوری یہ تھی کہ میں صرف پجاری کے دماغ میں پہنچ سکتا تھا۔ اس کے ذریعے میں بین بجانے والے کو تھوڑی دیر تک روک بھی لیتا تو باقی دو آدمی پجاری کو اپنی گرفت میں لے لیتے۔ بین کا عمل پھر شروع ہو جاتا۔ میں چاہتا تھا، پہلے باقی لوگوں کے دماغوں میں بھی پہنچ جاؤں تاکہ ایک شکار کسی طرح ہاتھ سے نکل جائے تو دوسرے تیسرے میری ٹیلی پیتھی کی گرفت میں رہ سکیں۔

اس وقت تک وہ ہائی وے پر پہنچ گئی تھی۔ ایک طرف دوڑ رہی تھی۔ ایک کار اُدھر سے گزر رہی تھی۔ رات کے وقت تنہا ایک جوان لڑکی کو دوڑتے بھاگتے دیکھ کر کار والے نے اس کے قریب رفتار دھیمی کر دی تھی۔ وہ اسے لفٹ دینا چاہتا تھا۔

منجالی سحر زدہ تھی۔ اسے صرف ایک ہی دُھن سمائی تھی کہ ناگ دیوتا کے مندر میں پہنچ جائے۔ تب ہی اس کے اندر کی بے چینی اور تڑپ ختم ہوگی ورنہ وہ تڑپ تڑپ کر مر جائے گی۔ جب اس نے ایک کار کو اپنی طرف آتے دیکھا تو فوراً ہی رُک گئی۔ کار بھی اس کے قریب پہنچ کر رُک گئی تھی۔ ڈرائیو کرنے والا اپنی سیٹ سے باہر نکل کر پوچھنے لگا۔ "مِس تم کون ہو۔ کہاں جا رہی ہو؟"

اس کی بات ختم ہوتے ہی منجالی کا ایک اُلٹا ہاتھ اس کے مُنہ پر پڑا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا، منجالی نے اسے ڈس لیا۔ اس کار

والے کے حلق سے ایک چیخ نکلی۔ پھر وہ اس کا انجام دیکھے بغیر اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ کار کو اسٹارٹ کیا۔ جب تک میں اس کار کے قریب پہنچتا، وہ آگے نکل گئی۔ میں نے خیال خوانی کے ذریعے آواز دی۔

"منجالی! رُک جاؤ۔ رُک جاؤ منجالی!"

لیکن اس کا جنون بڑھ گیا تھا۔ وہ جیسے میری آواز سنتے ہوئے بھی نہیں سُن رہی تھی۔ میری سوچ کی لہریں ڈوب رہی تھیں اور کالا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ میں چاہتا تو اس کے دماغ کو جھٹکا دے کر کار کو روک سکتا تھا لیکن فائدہ کیا ہوتا۔ یہی کہ میں اس کے قریب پہنچ کر کار میں داخل ہو جاتا یا پھر اسے باہر کھینچ لیتا۔ دونوں ہی صورتوں میں میرے لیے خطرہ تھا۔ بچاؤ کی صرف ایک ہی صورت تھی کہ اس بین بجانے والے کو روکا جاتا۔

میں نے منجالی کو جانے دیا۔ آخر اس کی منزل مجھے معلوم ہی تھی۔ میں دوڑتا ہوا ہیلی کاپٹر کی طرف جانے لگا۔

میری خیال خوانی جاری تھی۔ میں نے باس جے آر جے ناتھن سے کہا "میں تنہا آرہا ہوں۔ ہیلی کاپٹر، آپ کے ساتھ واپس سنگاپور جاؤں گا۔ آپ اپنے کسی ماتحت سے رابطہ قائم کریں۔ مجھے ہنڈرسن روڈ اور لورسس روڈ کے درمیان ہندوستانی آبادی میں پہنچنا ہے۔ وہاں ایک ناگ دیوتا کا مندر ہے۔ میرے لیے ایک گاڑی تیار رکھی جائے۔ آپ ہیلی کاپٹر ایسی جگہ اُتاریں جہاں سے میں فوراً اس گاڑی کے ذریعے ناگ مندر تک پہنچ سکوں۔"

یہ ہدایات دیتے ہوئے میں ہیلی کاپٹر کے قریب پہنچ گیا۔ اس پر سوار ہوا تو کاک پٹ بند کر دیا گیا۔ منجالی آندھی طوفان کی رفتار سے ڈرائیو کر رہی تھی۔ میں اسے اپنے کنٹرول میں نہیں رکھ سکتا تھا۔ لیکن اس کے ذریعے اس کے راستے کو دیکھ سکتا تھا۔ کبھی کبھی کوئی گاڑی اسے کراس کرتی تھی لیکن کوئی گاڑی اسے اوورٹیک نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی جنونی رفتار سے آگے کوئی نہیں نکل سکتا تھا۔

ہمارا ہیلی کاپٹر اب پرواز کرتا ہوا سنگاپور کی طرف جا رہا تھا۔ اس کی کار سے بہت دور آگے نکل گیا تھا لیکن میں پریشان تھا۔ اگر یہ ہائی وے سے آگے جا کر آبادی میں داخل ہو گی اور اسی رفتار سے گاڑی چلائے گی تو کیا ہو گا؟ اگر حادثہ نہیں ہو گا تو کم از کم ٹریفک پولیس والوں کی گرفت میں آئے گی اور جب وہ لوگ اسے پکڑ کر لے جانا چاہیں گے تو وہ جنونی انداز میں انھیں بھی ڈسنا شروع کر دے گی پھر افراتفری اور دہشت کا عالم ہو گا۔ انسانی آبادی میں کوئی زہریلا سانپ نکل آئے تو لوگ اسے لاٹھی سے مار دیتے ہیں یا پھر گولی مار دیتے ہیں۔ منجالی کے ساتھ کیا ہو گا؟

میں نے پریشان ہو کر اسے مخاطب کیا "منجالی! میری آواز سُنو۔ مجھے پہچانو۔ میں تمھاری بھلائی کے لیے روک تو نہیں سکتا۔ میں بھی تمھارے ساتھ وہاں تک جاؤں گا جہاں تک تمھیں وہ سپیرا کھینچ رہا ہے۔"

وہ کچھ نہ بولی۔ میں نے کہا "تم اس رفتار سے گاڑی ڈرائیو کرو گی تو تمھارے لیے بڑے خطرات ہیں۔ میں آگے ہیلی کاپٹر روک رہا ہوں۔ تم گاڑی سے اُتر کر میرے پاس آجاؤ۔ میں وعدہ کرتا ہوں تمھیں وہاں تک پہنچاؤں گا، جہاں تم پہنچنا چاہتی ہو۔ تم بھی وعدہ کرو کہ میرے لیے منجالی رہو گی۔ ناگن نہیں بنو گی۔"

وہ کوئی جواب نہیں دے رہی تھی۔ بس کار کو تیز رفتاری سے ڈرائیو کر رہی تھی۔ اس کی پیشانی سے وہ کوڑی یوں چپکی ہوئی تھی جیسے اس کے جسم کا ایک حصہ ہو۔ کوئی طاقت اس کوڑی کو اس کی پیشانی سے الگ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ عامل ہی اسے اس کوڑی سے نجات دلا سکتا تھا۔

میں نے باس جے آر جے ناتھن سے پوچھا "کیا آپ کے پاس مضبوط رسیاں یا نائیلون کی ڈوریاں ہیں؟"

"جی ہاں۔ آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟"

"اس ہیلی کاپٹر کو آگے لے جا کر ہائی وے کے قریب روکیے۔ آپ کے ماتحت میرے ساتھ دوڑتے ہوئے اس گاڑی کی طرف جائیں گے۔ میں منجالی کو ذرا دیر کے لیے اس جادو سے آزاد کرا لوں تو آپ کے ماتحت فوراً ہی منجالی کے دونوں ہاتھ پُشت پر باندھ دیں گے۔ اس کے پاؤں بھی ڈوریوں سے باندھے جائیں گے۔ مُنہ پر مضبوطی سے کپڑا باندھا جائے گا۔ اس کے بعد اسے ہیلی کاپٹر میں لا کر ڈال دیا جائے گا۔"

"ہم آپ کے حکم کے منتظر رہیں گے۔"

اس نے حکم دیا کہ ہیلی کاپٹر کو آگے لے جا کر ہائی وے کے قریب اُتارا جائے۔ میں انتظار کرنے لگا۔ جیسے ہی ہیلی کاپٹر زمین پر پہنچا، میرے لیے کاک پٹ کھولا گیا۔ میں دو ماتحتوں کے ساتھ باہر آگیا۔ ان کے ہاتھوں میں نائیلون کی ڈوریاں تھیں اور ایک بڑا سا کپڑا تھا۔ منجالی کی کار ابھی ذرا دور تھی۔ ہم ہائی وے کے کنارے کھڑے ہو گئے۔ جیسے ہی اس کار کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں، میں نے منجالی کے ذریعے دیکھا۔ ونڈ اسکرین کے پار دور میرے ساتھ وہی دو ماتحت کھڑے ہوئے تھے۔ میں فوراً ہی اس پجاری کے دماغ میں پہنچ گیا۔ میں نے آس پاس دیکھا۔ وہ بلیک میلر اسی طرح کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ماتحت آس پاس کھڑے ہوئے تھے۔ ناگ دیوتا کے مجسمے کے سامنے وہی کالا عامل بین بجا رہا تھا۔ اس عامل کے پیچھے ذرا فاصلے پر پجاری کھڑا ہوا تھا۔ اچانک ہی اس نے عامل کی کمر پر ایک لات ماری۔ اس سے پہلے کہ کوئی اس سچویشن کو سمجھتا، پجاری نے لپک کر اس کے ہاتھ سے بین چھین لی۔ پھر اسے ناگ دیوتا کے مجسمے پر

مار مار کر توڑنے لگا۔ اتنی دیر میں بلیک میلر کے دو آدمی دوڑتے ہوئے اس کے پاس پہنچ گئے تھے۔ انھوں نے اسے دونوں طرف سے گرفت میں لے لیا لیکن دیر ہو چکی تھی۔ وہ بین ٹوٹ چکی تھی۔ میں فوراً ہی دماغی طور پر اپنی جگہ حاضر ہوگیا۔ منجالی کی کار میرے قریب ہی ذرا فاصلے پر رکی ہوئی تھی۔ ہم دوڑتے ہوئے اس کے پاس گئے۔ سب سے پہلے میں نے اس کی پیشانی کو دیکھا۔ وہاں وہ کوڑی نہیں تھی۔ پتا نہیں کہاں چلی گئی تھی۔ وہ اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھی ہوئی آگے پیچھے جھوم رہی تھی۔ اس پر ابھی تک اس سحر کا کچھ اثر باقی تھا لیکن مجموعی طور پر وہ اس سحر سے نکل چکی تھی۔ دماغ تھک گیا تھا۔ وہ نڈھال ہو رہی تھی۔ میں نے اس کے قریب پہنچ کر دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ”آؤ، باہر نکلو۔“

میں نے اسے سہارا دے کر باہر نکالا۔ پھر اس سے کہا۔ ”دیکھو اپنے ہاتھ پیچھے بندھوالو۔ تمھارے منہ پر بھی کپڑا باندھ دیا جائے گا۔ یہ تمھاری بھلائی کے لیے کیا جا رہا ہے۔ کسی کو نقصان نہ پہنچانا۔“

میری گفتگو کے دوران میرے ماتحتوں نے اپنا کام جاری رکھا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ پشت پر باندھ دیے گئے تھے۔ منہ پر بھی کپڑا باندھا جا رہا تھا۔ وہ اعتراض نہیں کر رہی تھی۔ کیونکہ اب وہ دل وجان سے میری ہدایات پر عمل کر رہی تھی۔

پھر اس نے میری دوسری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ہیلی کاپٹر کی طرف میرے ساتھ دوڑنا شروع کیا۔ ایسے وقت میں ٹیلی پیتھی کے ذریعے پجاری کے دماغ میں بھی جا رہا تھا۔ ان دونوں نے پجاری کو اپنے قابو میں کرنے کے بعد اس کے دونوں ہاتھ اور پاؤں باندھ دیے تھے اور اسے ایک طرف فرش پر ڈال دیا تھا۔ اس کے سامنے موجود رہنے والے بڑے محتاط تھے۔ اپنے منہ سے آواز نہیں نکال رہے تھے۔ میں پجاری کے ذریعے دیکھ رہا تھا، وہ کالا عمل کرنے والا اشارے کے ذریعے دو ٹکڑے ہو جانے والی بین کو دکھاتے ہوئے جیسے زبانِ بے زبانی سے کہہ رہا تھا۔ یہ تو ٹوٹ چکی ہے۔ عمل کیسے ہوگا؟

اسی وقت اس کے ذہن کو ایک جھٹکا لگا اور وہ پیچھے کی طرف لڑکھڑا کر گر پڑا۔ سب حیرانی سے ناگ دیوتا کے مجسمے کو دیکھ رہے تھے۔ وہ کوڑی واپس آکر ناگ دیوتا کے پھن سے چپک گئی تھی۔ وہ کالا عامل جو زمین پر گر پڑا تھا۔ اب خون کی قے کر رہا تھا اور اس کا جسم پھڑک رہا تھا۔

پجاری نے چیخ کر کہا۔ ”فوراً ہی دوسری بین کا بندوبست کرو۔ اسے بین لاکر دو۔ اسے بجانے کا موقع دو۔ نہیں تو یہ مر جائے گا۔“

بلیک میلر نے اپنے ایک ماتحت کو اشارہ کیا۔ وہ دوڑتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی بلیک میلر نے اپنی جیب سے ریوالور نکال لیا۔ وہ پجاری کو دیکھ رہا تھا۔ میں اس کے تیور کو سمجھ گیا لیکن کچھ کر نہیں سکتا تھا کیوں کہ اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ میں نے پجاری کے دماغ میں ایک اہم سوال پیدا کیا۔ ”بلیک میلر کا اڈّہ کہاں ہے؟“

پجاری نے اس اڈّے کا تصور کیا۔ پتا چلا، اسی ناگ دیوتا کے مندر کے تہ خانے میں وہ اڈّہ ہے۔ اس کا تصور زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ نہ ہی میں اس سے کوئی دوسرا سوال کر سکا۔ ایک کھٹکے کی آواز سنائی دی۔ سائلنسر لگے ہوئے ریوالور سے گولی چلی اور پجاری ختم ہوگیا۔

میں ٹیلی پیتھی کے دوران اپنی زبان سے منجالی کو بتاتا جا رہا تھا کہ ناگ دیوتا کے مندر میں کیا ہو رہا ہے۔ یہ بات مجھے آر جے ناتھن بھی سنتا جا رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”جناب! آپ کا سنگاپور میں رہنا مناسب نہیں ہے۔ آپ حکم دیں تو ہم واپس اس طیارے کو بنکاک لے جاتے ہیں۔ بلیک میلر وہاں موجود ہے تو ہمارے آدمی اسے صبح تک زندہ نہیں رہنے دیں گے۔ وہ پاتال میں بھی ہوگا تو اسے زمین کے اوپر کھینچ لائیں گے۔“

”مسٹر ناتھن! آپ صبح تک کی بات کر رہے ہیں۔ ان کا ایک آدمی دوسری بین لینے گیا ہے۔ اگر وہ لے آیا اور پھر اسی کالے جادو کا عمل شروع ہوا تو ہم منجالی کو اپنے قابو میں نہیں رکھ سکیں گے۔ یہ ہمارے لیے خطرناک بن جائے گی۔“

”جناب! آپ نے کہا تھا کہ وہ بلیک میلر آپ کو گرفت میں لے کر خطرناک تنظیموں سے سودا کر سکتا ہے۔ یقیناً اس نے خطرناک تنظیموں تک یہ بات پہنچا دی ہوگی کہ آپ سنگاپور میں ہیں اور آپ کا سودا اس بلیک میلر سے کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ یہ ایک اندازہ ہے مگر اسے اہمیت دینی چاہیے۔“

”آپ کی یہ بات درست ہے۔ سنگاپور میں میرے لیے خطرہ ہے۔“

”آپ میرے مشورے کے مطابق بنکاک چلیں۔ میں ٹرانسمیٹر کے ذریعے اپنے آدمیوں کو حکم دیتا ہوں۔ وہاں بڑے بڑے پولیس آفیسروں سے ہمارے دوستانہ تعلقات ہیں۔ میرے کہنے پر فوراً ہی وہ اس مندر کو چاروں طرف سے گھیر لیں گے۔ بلیک میلر اور اس کے آدمیوں کو وہاں سے نکلنے نہیں دیں گے۔“

”ٹھیک ہے، آپ کوشش کریں۔ ان کا اڈّہ اسی ناگ دیوتا کے مندر کے تہ خانے میں ہے لیکن آتنی ہوشیاری سے محاصرہ کرنا ہوگا کہ وہ بچ کر نہ نکل سکیں۔“

”ہیلی کاپٹر بنکاک کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے منجالی کو دیکھ کر اس کے سر پر محبت سے ہاتھ رکھا۔ پھر اس کے شانے کو تھپک کر کہا۔

"سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لو اور دماغ کو پُرسکون رکھو۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ وہ عامل دوبارہ ٹین نہ بجا سکے۔ میں وہ کالا عمل ختم کر دوں گا۔"

باس جے آر جے ناتھن ٹرانسمیٹر کے ذریعے اپنے ماتحتوں سے باتیں کر رہا تھا۔ میں اس کے دماغ کے ذریعے اس کے ماتحتوں کے دماغوں میں پہنچ رہا تھا۔ ناتھن نے میری ہدایت کے مطابق ان سے کہہ دیا کہ فرہاد ان کے دماغ میں جب بھی کوئی حکم دے، فوراً اس کی تعمیل کی جائے۔

دوسری طرف ناتھن کے چار ماتحت اس کی گفتگو سُن رہے تھے۔ جب رابطہ ختم ہو گیا تو ان میں سے ایک ٹیلیفون کے پاس جا کر ایک پولیس آفیسر سے رابطہ قائم کرنے لگا۔ میں نے اسے روک دیا۔ اس کے دماغ میں کہا "میں فرہاد علی تیمور بول رہا ہوں۔ میری ہدایات پر عمل کرو۔ اس وقت اپنے جتنے ساتھیوں کو لے کر ناگ مندر کو گھیر سکتے ہو، گھیر لو۔ پولیس والوں کی مدد حاصل کی تو دشمنوں پر ان کے محاصرے کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ جب وہ دیکھیں گے کہ چاروں طرف سے گھیرے جا چکے ہیں تو چور دروازے سے نکل جائیں گے۔ میں چاہتا ہوں، تم لوگوں کے ذریعے میں ان کے دماغوں تک پہنچوں اور تم لوگوں کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ناگ مندر کے اندر یا باہر جو بھی مندر سے تعلق رکھنے والے ہوں، ان سے گفتگو کرتے رہو۔ شاید کوئی دماغ ان دشمنوں تک میری رہنمائی کر سکے۔"

جے آر جے ناتھن کا وہ ماتحت حیرانی سے اپنے دماغ میں میری سوچ کی لہروں کو سُن رہا تھا۔ میں نے فوراً ہی ثابت کیا کہ میں فرہاد اس کے دماغ میں موجود ہوں۔ اس کے بعد اس نے اپنے ساتھیوں کو میرا حکم سُنایا۔ پھر وہ لوگ اپنے دوسرے ساتھیوں سے رابطہ قائم کرنے لگے۔ کوئی ٹیلیفون کے ذریعے، کوئی ٹرانسمیٹر کے ذریعے اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا تھا کہ وہ فوراً ہی ناگ مندر پہنچیں اور اسے گھیرے میں لیں لیکن کسی کو شبہ نہ ہو۔

میں نے ان کے تمام ساتھیوں میں سے صرف دو ایسے بندوں کا انتخاب کیا جو جلد سے جلد مندر تک پہنچ سکتے تھے۔ ان کے وہاں پہنچنے کے دوران میں نے پچھلی سیٹ پر منجالی کو دیکھا۔ وہ سیٹ کی پُشت سے ٹیک لگانے کے بعد آنکھیں بند کر کے سو گئی تھی۔ مجھے اس پر بڑا پیار آیا۔ میں پریشان ہو کر سوچنے لگا، اس دوران اگر انہیں دوسری بین مل جائے گی تو کیا ہوگا۔ افسوس تو اس بات کا تھا کہ میں ان میں سے کسی کے دماغ تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ پجاری کو مار دیا گیا تھا اور اسی بات کا مجھے اندیشہ تھا۔ اسی لیے میں نے ابتدا میں پجاری کو اپنا آلۂ کار بنانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بہت مجبور ہو کر ایسا کرنا پڑا تھا۔

وہ دونوں مندر کے پاس پہنچ گئے۔ میں نے ایک کے دماغ پر قابض ہو کر کہا "اس وقت میں فرہاد علی تیمور اپنی موجودگی کا ثبوت دے رہا ہوں۔ وقت نہیں ہے ایک ہی ثبوت کو کافی سمجھو۔"

میں نے اس سے فوراً ہی اُلٹی سیدھی حرکتیں کرائیں۔ یقین آیا تو اس نے تسلیم کرتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے جناب! میں آپ کا خادم ہوں، حکم دیجیے۔"

میں نے اس کے ذریعے اس کے ساتھی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ مندر کی چار دیواری سے باہر دھرم شالہ ہے۔ اس کے بعد وہ جو بڑا گیٹ ہے، اسے اندر سے مقفل کیا گیا ہے۔ ہمیں اس مندر کی چار دیواری کے اندر پہنچنا ہے۔ میں ایک طرف سے جاتا ہوں۔ تم دوسری طرف سے جاؤ لیکن ایک بات کا خیال رکھو۔ کسی سے جھگڑا نہیں کرنا ہے اور یہ تاثر نہیں دینا ہے کہ فرہاد کسی کے ذریعے یہاں پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے۔"

اس نے پوچھا "جناب! اگر کوئی سامنے پہنچ گیا اور اس سے ٹکرانا پڑا تو کیا ہوگا؟"

"مجبوری کی بات اور ہے لیکن کوشش یہی کی جائے کہ جھگڑا نہ ہو۔ اگر کوئی اچانک سامنے آ جائے تو اُسے یقین دلانا کہ تم کوئی باہر سے آئے ہوئے آدمی نہیں ہو۔ انہی میں سے ایک ہو اور اگر وہ اپنے تمام آدمیوں کو جانتے ہوں گے اور تمہاری بات کا یقین نہیں کریں گے تب مجبوری ہے۔ تم کسی ہنگامے کے بغیر، کوئی آواز پیدا کیے بغیر اسے ختم کر دینے کی کوشش کرنا۔"

وہ دوسری طرف چلا گیا۔ میں دھرم شالہ کے ایک طرف آیا، جہاں دھرم شالہ کی چار دیواری ختم ہوتی تھی، وہاں سے مندر کی چار دیواری شروع ہو جاتی تھی اور وہ دیوار بہت اُونچی تھی۔ میں نے اس ساتھی کو سوچ کے ذریعے پکارا اور اسے اپنے پاس آنے کا حکم دیا۔ وہ دوڑتا ہوا میرے پاس آگیا۔ میں نے کہا "نیچے بیٹھو۔ میں تمہارے کاندھے پر چڑھ کر اس دیوار کے پار جانا چاہتا ہوں۔"

اس نے حکم کی تعمیل کی۔ میں اس کے کاندھے پر چڑھ گیا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس طرح میرا ہاتھ اس دیوار کے اوپری سرے پر پہنچ گیا۔ میں نے دونوں ہاتھوں کے زور پر دیوار سے ذرا اُونچا ہو کر دیکھا۔ سامنے مندر کا صحن تھا اور وہاں ایک شخص کھڑا ہوا تھا۔

میں نے اپنے ساتھی سے کہا۔ مجھے نیچے اتارے۔ وہ آہستہ آہستہ بیٹھنے لگا۔ میں نے نیچے اتر کر کہا "اِدھر سے جانے میں دیکھ لیے جانے کا اندیشہ ہے۔ سامنے ہی ایک شخص کھڑا ہوا ہے۔ آؤ ہم دیوار کے اس آخری سرے پر چلیں۔"

ہم اس آخری سرے پر پہنچے۔ وہاں بھی میں نے اسی طرح اس کے کاندھے پر سوار ہو کر دیوار کے اوپری سرے سے اندر دیکھا۔

کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ بہت دور مندر کے صحن کے سرے پر وہی شخص کھڑا ہوا تھا لیکن اس کی پشت نظر آرہی تھی۔ وہاں بجلی کی تیز روشنی تھی اور وہاں دور تک دیکھا جاسکتا تھا۔

میں اس وقت ہیلی کاپٹر میں سفر بھی کررہا تھا اور مندر کی اس دیوار پر بھی چڑھا ہوا تھا کیوں کہ جب میں کسی کے دماغ پر قبضہ کرتا ہوں تو میرے ہی حکم کے مطابق اس کا جسم بھی حرکت کرتا ہے۔ لہٰذا دوسرے الفاظ میں یہی کہنا مناسب ہے کہ اس دیوار پر میں ہی چڑھا ہوا تھا۔ میں نے جوتے اتارے، پھر آہستگی سے دیوار کے دوسری طرف اتر گیا۔ نیچے ذرا کودنا پڑا تھا لیکن آواز پیدا نہیں ہوئی تھی۔

مندر کے چاروں طرف بہت بڑا احاطہ تھا لیکن چھپے رہنے کی کافی گنجائش تھی۔ وہ مندر بڑے بڑے ستونوں پر کھڑا ہوا تھا اور میں ہر ستون کے پیچھے چھپ کر اس آدمی تک پہنچ سکتا تھا۔ میں ایک ستون کے پیچھے آکر کھڑا ہوگیا۔ سوچنے لگا کہ کس طرح اسے ٹریپ کیا جائے۔

مجھے اس ستون سے آگے بڑھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ میرے سوچتے سوچتے مندر کا اندرونی دروازہ کھلا۔ دروازہ کھلتے ہی میں نے دیکھا، ناگ دیوتا کا ایک بڑا سا مجسمہ نظر آرہا تھا۔ دو آدمی باہر آرہے تھے۔ ایک نے آواز دے کر اس شخص کو بلایا جو مندر کے صحن میں کھڑا ہوا تھا۔ میں بیٹھ گیا، پھر زمین پر لیٹ گیا۔ مندر کے چکنے فرش پر پھسلتے ہوئے یا سانپ کی طرح رینگتے ہوئے دوسرے ستون کے پاس پہنچ گیا۔ وہاں سے پھر تیسرے ستون کے پاس آیا۔ اس وقت تک وہ شخص اپنے دو ساتھیوں کے قریب پہنچ چکا تھا۔ میں بھی تیسرے ستون کے پاس پہنچ کر ان کی باتیں واضح طور پر سن سکتا تھا۔ ان میں سے ایک کہہ رہا تھا۔ "دونوں لاشوں کو چور دروازے سے پار کردیا ہے۔ کسی بات کا اندیشہ نہیں ہے۔ مندر کا دروازہ کھول دو۔"

دوسرے شخص نے کہا۔ "کوئی پوچھے تو کہہ دینا کہ ناگ دیوتا کو دودھ سے اشنان کرایا جارہا تھا۔"

وہ ان کی باتیں سن کر پلٹ گیا پھر دروازہ کھولنے کے لیے ادھر جانے لگا۔ وہ دونوں مندر کے اندرونی دروازے کی طرف جانے لگے۔ میں نے جس شخص کے دماغ پر اپنا قبضہ جمایا ہوا تھا، اسے ذرا آزاد چھوڑ کر کہا۔ "اب میں تمھیں چھوڑ رہا ہوں۔ ایک ستون کے پاس تمھارے جوتے رکھے ہوئے ہیں۔ انھیں اٹھالو۔ مندر کا دروازہ کھل رہا ہے۔ کچھ لوگ پوجا کے لیے ضرور آئیں گے۔ تم ان میں گھل مل کر باہر چلے جانا۔"

میں نے اسے چھوڑ دیا۔ پھر ان دو میں سے ایک کے دماغ میں پہنچ گیا جو مندر کے اندرونی حصے سے آئے تھے۔ وہ بلیک میلر کے خاص آدمی تھے۔ انھیں اطمینان تھا کہ پجاری اور اس کا لے عامل کی موت کے بعد فرہاد کسی طرح ان کے دماغ میں نہیں پہنچ سکے گا اور مندر کا دروازہ بھی اندر سے بند تھا۔ کسی طرح کا اندیشہ نہیں تھا۔ اس لیے انھوں نے بلا جھجک گفتگو کی تھی۔

اب میں کھل کر ان کے دماغوں میں پہنچ گیا تھا۔ ان میں سے ایک کے دماغ کو ٹٹول رہا تھا۔ کالے جادو کا عمل ایسا ہوتا ہے کہ بات بگڑ جائے یا عمل الٹ جائے تو عامل خود اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ اس عامل نے اپنے عمل سے ناگ کے مجسمے کے پھن پر رکھی ہوئی کوڑی کو منجالی کے پاس روانہ کیا تھا۔ وہ کامیاب بھی ہوگیا تھا لیکن وہ عمل الٹ گیا۔ کوڑی واپس آکر پھر ناگ کے پھن پر چپک گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ وہیں خون کی قے کرکے تڑپ تڑپ کر مرنے لگا۔ بلیک میلر اور اس کے ماتحتوں نے اسے بچانے کی بہت کوشش کی۔ اس کے لیے دوسری بین بھی منگوائی گئی لیکن جب تک بین وہاں لائی گئی، وہ کالے عمل کا ذکری کرنے والا اس دنیا سے رخصت ہوچکا تھا۔

فی الحال اطمینان تھا۔ وہ عمل کرنے والا جہنم میں چلا گیا تھا لیکن اتنی بڑی دنیا میں کالا عمل کرنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ جب ایک بین کے ٹوٹنے کے بعد دوسری بین دستیاب ہوسکتی ہے تو ایک عامل کے مرنے کے بعد دوسرے عامل کو بھی تلاش کیا جاسکتا تھا۔ میں ادھر سے اس وقت تک مطمئن نہیں ہوسکتا تھا جب تک بلیک میلر میرے ہاتھوں اپنے انجام کو نہ پہنچتا۔

میں نے جو طریقہ کار اختیار کیا تھا، اس کے ذریعے رفتہ رفتہ اس بلیک میلر کے خاص ماتحت کے دماغ میں پہنچ گیا تھا۔ اب کسی دم خود اس کے پاس تک بھی پہنچنے والا تھا۔

ایسے ہی وقت میری ٹیلی پیتھی کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ باس جے آر جے ناتھن مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "مسٹر فرہاد علی تیمور! آپ کو ڈسٹرب کرنے کی معافی چاہتا ہوں۔ ہم اس وقت ملایا اور تھائی لینڈ کی سرحدی چوکی پر ہیں۔ آپ کو دماغی طور پر یہاں حاضر رہنا چاہیے۔ ویسے پریشانی کی بات نہیں ہے۔ میں ان لوگوں سے نمٹنا جانتا ہوں۔"

میں نے دیکھا، ہیلی کاپٹر ایک جگہ زمین پر کھڑا ہوا تھا۔ کاک پٹ سے باس ناتھن نکل کر جارہا تھا۔ دور ایک عمارت کے پاس مسلح فوجی نظر آرہے تھے۔ ایک اونچے ٹاور پر دو طرفہ سرچ لائٹیں لگی ہوئی تھیں اور وہ دائیں سے بائیں حرکت کررہی تھیں۔ چاروں طرف رات کی تاریکی کو دور دور تک روشن کررہی تھیں۔

ایک جیپ کار ہیلی کاپٹر کے پاس آکر رک گئی۔ اس میں سے دو آفیسر اور چار مسلح جوان اتر رہے تھے۔ جے آر جے ناتھن کو دیکھ کر ایک آفیسر نے اس سے مصافحہ کیا۔ دوسرے نے بھی بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "ہیلو، مسٹر ناتھن! آپ ہمارے لیے

بڑے معتبر ہیں لیکن جانے کیوں آج کل اوپر سے سخت احکامات دیے جا رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک ایک گاڑی اور ایک ایک پرائیویٹ ہیلی کاپٹر کو چیک کیا جائے۔ ہم صرف اپنی ڈیوٹی پوری کرنا چاہتے ہیں۔"

ناتھن نے کہا۔ "مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آپ جا کر دیکھ لیں۔ میرے دو ماتحت ہیں۔ ان کے علاوہ دو مہمان ہیں۔ مہمانوں میں ایک مرد ہے اور ایک لڑکی ہے۔"

وہ آفیسر سے باتیں کر رہا تھا۔ دوسرا آفیسر سیڑھیاں چڑھتا ہوا کاک پٹ کے پاس آ گیا تھا پھر اس نے مجھے دیکھا۔ اس وقت تک میں ایک رسالہ اٹھا کر اس کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ اسے اپنے سامنے محسوس کرتے ہوئے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ مجھے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں اس کی آنکھوں کے راستے اس کے دماغ میں پہنچ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا "قد اور جسامت بالکل وہی ہے۔ چہرے کی ساخت بھی ایسی ہے کہ یہ میک اپ زدہ چہرہ ہو اور اس کا میک اپ اتارا جائے تو اس کے پیچھے سے عزت علی کا چہرہ نمودار ہو سکتا ہے۔"

ایسا سوچتے ہوئے اس نے پیچھے والی سیٹ پر منجالی کو دیکھا۔ وہ گہری نیند میں تھی۔ پھر وہ واپس سیڑھیوں سے اترتا ہوا نیچے چلا گیا۔ جے آر جے ناتھن نے اس کی طرف پلٹ کر پوچھا۔ "کیا آپ مطمئن ہیں؟"

اس نے ناتھن کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "آپ کیسی بات کرتے ہیں۔ بھلا آپ سے بے اطمینانی کبھی ہو سکتی ہے؟"

"تو کیا میں جا سکتا ہوں؟"

"بے شک۔"

جے آر جے ناتھن نے ان لوگوں سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس ہیلی کاپٹر کے پرواز کرنے کے پندرہ منٹ کے اندر آپ سب کا حصہ آپ کے گھروں میں پہنچ چکا ہوگا۔ فون کر کے معلوم کر لیجیے گا۔"

دوسرے آفیسر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "جناب! اب آپ شرمندہ کر رہے ہیں۔ ہم جانتے ہیں۔ آپ جو کہتے ہیں وہی کرتے ہیں۔"

جے آر جے ناتھن سیڑھیاں چڑھتا ہوا ہیلی کاپٹر کے کاک پٹ تک پہنچ گیا۔ سیڑھیاں فولڈ ہو گئیں۔ کاک پٹ بند ہو گیا۔ اس کے بعد ہیلی کاپٹر کا پنکھا گردش کرنے لگا۔ ایک منٹ کے اندر ہی وہ فضا میں پرواز کر رہا تھا۔ جے آر جے ناتھن ٹرانسمیٹر کے ذریعے کسی کو ہدایات دے رہا تھا کہ ان افسران کا حصہ ان کے گھروں میں پہنچا دیا جائے۔ میں اس آفیسر کے دماغ میں پہنچ گیا جس نے میرے سامنے آ کر مجھے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا اور میرے پیچھے چھپے ہوئے انٹرپول کے فلائنگ آفیسر عزت علی کو محسوس کر رہا تھا۔

وہ آفیسر پہلے دفتر میں آیا تھا۔ دو چار لوگوں سے ہنستے بولتے ہوئے وہ اپنے خاص چیمبر میں جا رہا تھا۔ وہاں پہنچ کر اس نے دروازے کو اندر سے بند کیا۔ پھر ٹیلیفون کا ریسیور اٹھا کر ڈائل کرنے لگا۔ اس کی سوچ بتا رہی تھی کہ وہ کسی بگ لیڈی سے رابطہ قائم کر رہا ہے۔

رابطہ قائم ہو گیا۔ دوسری طرف سے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ "ہیلو اٹ از سیون نائین او ون او۔"

آفیسر نے کہا۔ "ابھی دس منٹ پہلے مسٹر جے آر جے ناتھن

## جملہ ہائے معترضہ

طارق سلطان اعوان
حیدرآباد

◎ دوسرے وارڈز کی طرح ہمارے وارڈ میں بھی T.V لگایا جائے۔

آئی وارڈ کے مریضوں کا مطالبہ

◎ نرس سوئے ہوئے مریض سے: "اٹھو بابا! نیند کی گولیاں کھا لو۔"

◎ کراچی میں ایک شام صبح کے وقت منائی گئی کیونکہ اس شام کوئی اور شام منائی جا رہی تھی۔

◎ بس میں سوار ہوتے سے پہلے توبہ کر لیں ممکن ہے کہ یہ آپ کا آخری سفر ہو۔

◎ ڈرائیور کو گاڑی تیز چلانے پر مجبور نہ کریں کیونکہ وہ اسے خود ہی تیز چلانے کا مختار ہے۔

◎ بسم اللہ پڑھ کر سوار ہوں، لاحول پڑھ کر اتریں۔

◎ اری کمبخت! میں نے تیرے باپ کی چٹنی بنا دی ہے تو بھائی کے کباب بنا دے۔"

پڑوسن کی ماں کی آواز

◎ قیدیوں کی سزا میں ایک یہ سزا بھی رکھی جائے کہ وہ ہر دوسرے دن لازماً پنجابی فلم دیکھیں۔

ایک تجویز

◎ ایک آدم خور نے اپنے قبیلے کے ڈاکٹر سے کہا "پتا نہیں میرے بیٹے کو کیا ہو گیا ہے؟ اب یہ کسی کو کھاتا ہی نہیں ہے۔"

کا ایک ہیلی کاپٹر بنکاک کی طرف گیا ہے۔ اس ہیلی کاپٹر میں مسٹر ناتھن کے دو اسسٹنٹ تھے۔ ان کے علاوہ دو مہمان۔ ان میں سے ایک مرد اور دوسری ایک سیاہ فام لڑکی تھی۔ مرد کا قد اور جسامت بالکل عزت علی کے مطابق ہے۔ چہرے کی ساخت بھی ویسی ہے۔ یعنی اس چہرے پر عزت علی کا میک اپ کیا جائے تو وہ مکمل عزت علی ہوگا یا پھر یوں سمجھ لیجیے کہ وہ شخص جسے میں نے دیکھا ہے، اگر وہ میک اپ میں ہوگا تو یقیناً اس کے پیچھے عزت علی چھپا ہوگا۔"

"کیا آپ اس ہیلی کاپٹر کی منزل بتا سکتے ہیں؟"

"جے آر جے ناتھن کا پتا لیڈی صاحبہ کو معلوم ہے۔ اس ہیلی کاپٹر کی پہچان بتائے دیتا ہوں۔ وہ سفید رنگ کا ہے۔ اس ہیلی کاپٹر کے سامنے والے حصے میں سرخ دھاریاں ہیں۔ اس کا نمبر بی کے ففٹین ہے۔"

"تھینک یو مسٹر آفیسر! میں آپ کا پیغام ابھی لیڈی صاحبہ تک پہنچا رہی ہوں۔"

آفیسر نے ریسیور رکھ دیا۔ میں دماغ کے ٹیلیفون کے ذریعے اس بات کرنے والی کے پاس پہنچ گیا۔ وہ ریسیور رکھنے کے بعد انٹرکام کے ذریعے رابطہ قائم کر رہی تھی۔ ذرا دیر بعد دوسری طرف سے گرجنے اور برسنے کی آواز سنائی دی۔ اس کے باوجود وہ آواز بڑی ہی رس بھری تھی۔ اس آواز سے عمر کا اندازہ ہو سکتا تھا لیکن مجھے اندازہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں اس برسنے والی کے دماغ میں پہنچ گیا۔ وہ ایک قد آدم آئینے کے سامنے ذرا فاصلے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے ایک جام تھا۔۔۔ ایسے وقت وہ کسی کی مداخلت برداشت نہیں کرتی تھی۔ اس لیے غصے سے پوچھ رہی تھی۔ "ایسی کیا قیامت آگئی ہے کہ مجھے ڈسٹرب کیا جا رہا ہے؟"

دوسری طرف سے اس کی لیڈی سیکریٹری نے کہا۔ "مادام! بہت اہم اطلاع ہے۔ مسٹر جے آر جے ناتھن کا ہیلی کاپٹر بنکاک کی طرف آ رہا ہے۔ اس میں ایک ایسا شخص موجود ہے جس کا حلیہ عزت علی سے ملتا ہے۔ قد، جسامت، چہرے کی ساخت بالکل وہی ہے۔ صرف چہرہ وہ نہیں ہے۔ اس پر میک اپ کا شبہ کیا جا سکتا ہے۔ مسٹر ناتھن نے اسے اپنا مہمان بتایا تھا۔"

"اس ہیلی کاپٹر میں اور کتنے لوگ موجود تھے؟"

"مسٹر ناتھن کے دو اسسٹنٹ اور دو مہمان۔ ایک مہمان یہی شخص ہے جس کا حلیہ بتا چکی ہوں۔ دوسری ایک سیاہ فام لڑکی ہے۔"

سیاہ فام لڑکی کا ذکر سن کر وہ عورت چونک گئی۔ اس نے پوچھا۔ "کیا جے آر جے ناتھن اپنے اسی ہیلی کاپٹر میں ہے جس کا نمبر بی کے ففٹین ہے؟"

"یس مادام!"

اس نے انٹرکام سے رابطہ ختم کر دیا۔ گلاس کو میز پر رکھ دیا پھر ٹیلیفون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگی۔ اس کی سوچ بتا رہی تھی کہ وہ انٹرپول کے چیف آفیسر سے رابطہ قائم کر رہی ہے۔ میں نے ایک گہری سانس لے کر سوچا، تقدیر جن ہاتھوں میں پھینکنا چاہتی ہے۔ انسان ان ہاتھوں میں جانے سے بچ نہیں سکتا۔ پہلے میں نے انٹرپول والوں سے حتی الامکان کترانے کی کوشش کی۔ انھیں نظرانداز کر دیا مگر تقدیر پھر ان کے قریب پہنچا رہی تھی۔

ٹیلیفون کے دوسری طرف سے اسی انٹرپول کے چیف آفیسر کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو، میں وانڈرمین بول رہا ہوں۔"

وہ عورت جو ینگ لیڈی کہلاتی تھی۔ اس نے کہا۔ "مسٹر وانڈرمین! ابھی اطلاع ملی ہے کہ مسٹر جے آر جے ناتھن کے ہیلی کاپٹر میں ایک ایسا شخص آ رہا ہے جس پر ہم عزت علی کا شبہ کر سکتے ہیں۔ میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ عزت علی ہے اور اس یقین کی وجہ اس کے ساتھ والی سیاہ فام لڑکی ہے۔ تمھیں یاد ہے، سنگاپور میں عزت علی اور اس کے چاروں محافظ زندہ بچ کر نہیں جا سکتے تھے۔ گاڑی کے نیچے بم منسلک کیا گیا تھا۔ ایک سیاہ فام لڑکی نے اس گاڑی کے نیچے پہنچ کر اس بم کو وہاں سے الگ کر دیا تھا۔ کیا یہ وہی سیاہ فام لڑکی نہیں ہو سکتی؟"

وانڈرمین نے کہا۔ "تھینک یو مادام! آپ نے بڑی اہم اطلاع پہنچائی ہے۔ وہ ہیلی کاپٹر یقیناً فلائنگ کلب کے سامنے پہنچ کر اترے گا۔ میں ابھی انتظامات کرتا ہوں۔ پھر آپ سے رابطہ قائم کروں گا۔"

اب میں وانڈرمین کے دماغ میں تھا۔ وہ دوسرے نمبر ڈائل کر کے اپنے ایک ماتحت سے کہہ رہا تھا۔ "فوراً اپنے ساتھیوں کے ساتھ فلائنگ کلب پہنچو۔ تم لوگوں میں سے کسی کے پاس ایک اسٹل میک اپ کیمرہ ہونا چاہیے۔ جے آر جے ناتھن کے ساتھ جو بھی شخص نظر آئے، اس کی تصویریں اتارو۔ ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں، ان میں بہروپیا کون ہے؟"

میں دماغی طور پر اپنی جگہ واپس آ کر ناتھن کو ساری باتیں بتانے لگا۔ اس نے ٹرانسمیٹر کے ذریعے اپنے ان ماتحتوں سے رابطہ قائم کیا، جو بنکاک میں موجود تھے۔ وہ انھیں فلائنگ کلب میں پہنچنے کی تاکید کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا کم از کم چار عدد کاریں وہاں پہنچائی جائیں۔

میں نے منجالی کی طرف دیکھا۔ وہ اسی طرح آرام سے گہری نیند سو رہی تھی۔ میں معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ اندر سے بھی اتنی ہی پُرسکون ہے یا نہیں؟ کہیں ایسا نہ ہو، اس کالے جادو کے اثر سے وہ اندرونی طور پر بالکل ہی کمزور ہو گئی ہو۔

یہ معلوم کرنے کے لیے میں اس کے دماغ میں پہنچا۔ اس نے

**ایک** بار کسی نے اعتراض کیا کہ مسلمان یونہی قحط الرجال کا رونا روتے رہتے ہیں۔ سقوطِ بغداد کے بعد یہ اُن کی عادت بن چکی ہے۔ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے مہدیٔ آخر الزماں کے انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں۔ اگر کوئی کام کرنا چاہے تو کرنے نہیں دیتے۔ بولنا چاہے تو سُنتے نہیں، لکھنا چاہے تو پڑھتے نہیں، اگر کوئی رہنمائی کرے تو لوگ غالب کی طرح اس کے پُرزے اُڑا دیتے ہیں۔ یہ لیڈر کے پیچھے چلنے کے بجائے لیڈر کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ ہندوؤں کو دیکھو وہ کتنے فرزانے ہیں۔ اپنے ہر راہنما کو اوتار اور مہاتما بنا لیتے ہیں۔ ایک صاحبِ دل نے اس اعتراض کا یوں جواب دیا کہ ہندو کا دیوتا بے حس و حرکت بُت، ان کی دھرتی ماتا پامال، اُن کی گاؤ ماتا بے زبان، وہ ہر حال میں اپنے لیڈر کو جو انسان ہوتا ہے ان سے بہتر پاتے ہیں، اس لیے بے پایاں عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ مسلمان اپنے لیڈر کو دیکھتے ہیں تو بے اختیار قرنِ اوّل کی یاد آجاتی ہے۔ وہ اسے تحقیق کی کسوٹی پر گھستے ہیں اور سارا ملمع اُتر جاتا ہے۔ یہ کوئی نفسیاتی عارضہ یا اجتماعی نقص نہیں بلکہ معیار اور مزاج کا فرق ہے۔ یہ جواب نواب بہادر یار جنگ نے دیا تھا۔

ماخوذ از مختار مسعود - آوازِ دوست

فوراً ہی چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ اس کا دماغ بہت ہی زہریلا، بہت ہی حساس تھا۔ فوراً ہی میری سوچ کی لہروں کو محسوس کر لیتا تھا۔ چونک کر آنکھ کھولتے ہی جب اس نے مجھے اپنی طرف دیکھتے پایا تو بے اختیار مسکراتے ہوئے بولی۔ "سو میں تھینکس مائی لارڈ۔ آئی ایم آل رائٹ۔"

میں نے کہا۔ "آرام سے سوتی رہو۔"

"میں کب سو رہی تھی۔ میں تو آنکھیں بند کیے دماغ کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔"

"یہی کوشش کرتی رہو۔"

"اب میں بالکل پُرسکون ہوں۔ بالکل نارمل ہوں۔"

میں نے اسے مندر کی تمام باتیں سُنائیں پھر اس سے کہا۔ "ذرا انتظار کرو۔ میں وہاں کے کچھ اور حالات معلوم کرتا ہوں۔"

یہ کہتے ہی میں اس بلیک میلر کے خاص ماتحت کے دماغ میں پہنچ گیا۔ وہ تہ خانے کے ایک بڑے سے کمرے میں تھا۔ اس زمین دوز کمرے کی دیواریں پتھریلی تھیں۔ انھیں توڑ توڑ کر، کاٹ کاٹ کر کمرے کی صورت میں تراشا گیا تھا۔ وہاں چاروں طرف بڑی بڑی آہنی سی الماریاں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک طرف بڑی سی میز کے پیچھے ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔ دو آدمی ایک الماری کو کھول کر اس میں سے ایک مووی کیمرہ اور فلم کے رول نکال رہے تھے۔ کسی فلم کی شوٹنگ کے لیے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اس خاص ماتحت کو دیکھتے ہی سب اپنی جگہ سے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

بلیک میلر کے اس خاص ماتحت کا نام وکرم تھا۔ وہ ایک ایزی چیئر پر بیٹھ کر سگریٹ سُلگانے لگا۔ اس کی سوچ بتا رہی تھی کہ اس کا بلیک میلر باس اس وقت تہ خانے میں موجود نہیں ہے۔ نہیں گیا ہوا ہے۔ میں اس کے دماغ کو دھیرے دھیرے کُریدنے لگا۔ پتا چلا دوسری بین مل گئی ہے لیکن بین بجانے والا وہ عامل مر چکا ہے۔ کسی دوسرے عامل کی تلاش ہے۔ اس کا باس کہہ رہا تھا۔ اگر سنگاپور میں کوئی کالا جادوگر نہ مل سکا تو ہندوستان سے کسی کو پکڑ کر لایا جائے گا..... اس کا مطلب یہ تھا کہ ابھی سنجالی کو ان کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ میں وقتاً فوقتاً ان کے دماغوں میں رہ کر معلوم کر سکتا تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور شاید اس دوران میں اس بلیک میلر کے دماغ میں بھی پہنچ جاتا۔

میں نے وکرم کی سوچ میں پوچھا۔ "اس وقت میرا باس کہاں ہو گا؟"

وہ سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر دھواں چھوڑتے ہوئے سوچنے لگا۔ "کہاں ہو گا؟ کون جانتا ہے؟ وہ تو بہت ہی پُراسرار ہے۔ کتنے ہی بہروپ میں میرے سامنے آچکا ہے۔ اس کا اصلی چہرہ کیا ہے۔ میں آج تک سمجھ نہ سکا۔ بس کوڈ ورڈ کے ذریعے اور اس کی چند مخصوص حرکات کے ذریعے اسے پہچان لیتا ہوں اور اس کے احکامات کی تعمیل کرتا ہوں۔ میں ہی کیا، سب اس کے حکم کی تعمیل پر مجبور ہوتے ہیں۔ وہ ہمیں خوب عیش کراتا ہے۔ جانے کیسے کیسے ذرائع کا مالک ہے۔ آج تک کوئی پولیس والا مندر کے اس تہ خانے میں چھاپہ مارنے کی جرأت نہ کر سکا۔ وہ ایک خطرناک فائٹر بھی ہے۔ تنہا پانچ دس کو ایسے کھلاڑی کے انداز میں مارتا ہے، جیسے زندگی اور موت اس کے لیے کھیل ہو اور اس کا وہ زبردست ناقابلِ شکست کھلاڑی ہو۔"

میں نے اس کے دماغ میں یہ خیال پیدا کیا۔ "رسونتی مندر میں پوجا کرنے آئی تھی تو اسے ہی اپنی گرفت میں رکھنا چاہیے تھا۔ اسے چھڑانے کے لیے فرہاد ضرور آتا۔"

اس کی سوچ نے کہا۔ "باس ہمیشہ بڑے شکار پر ہاتھ ڈالتا ہے اس لیے اس نے رسونتی کو ڈھیل دے دی۔ صرف اس سے معلومات حاصل کرتا رہا۔ جب معلوم ہوا کہ وہ فلاں رہائش گاہ میں موجود ہے تو اسی وقت اس نے اپنے آدمیوں کو بھیج دیا۔ اب جتنے آدمی فرہاد کو پکڑنے گئے تھے وہ سب ناکام ہونے کے بعد موت کے منہ میں جاچکے ہیں۔ باس کسی بھی ناکامی کو برداشت نہیں کرتا ہے اور نہ ہی ناکام ہونے والوں کو زندہ چھوڑتا ہے۔"

اس نے میری مرضی کے مطابق گہری سانس لیتے ہوئے سوچا۔ "باس اب ایک لمبا چکر کاٹ کر فرہاد تک پہنچنا چاہتا ہے۔ کیا ضرورت ہے کہ پہلے منجالی کو شکار کیا جائے پھر فرہاد کو یہاں تک آنے پر مجبور کیا جائے۔"

اس کی سوچ نے کہا۔ "رسونتی پوجا کے وقت بڑبڑا رہی تھی کہ فرہاد منجالی کا دیوانہ ہے۔ لہٰذا باس نے یہی رائے قائم کی۔ فرہاد جب کسی کا دیوانہ ہوتا ہے تو اس کے لیے جان کی بازی لگا دیتا ہے۔ رہ گئی رسونتی تو اسے ابھی گرفت میں نہیں لینا چاہیے۔ آزاد رکھی جائے۔ ایک ہندو عورت اپنے دھرم کرم سے مجبور ہے۔ یہ اس کی فطرت ہے کہ شوہر خواہ مسلمان ہو یا کوئی ہو وہ اس کے قدموں میں جھکتی ہے لیکن پوجا کے لیے مندروں میں بھی ضرور جاتی ہے۔ اس کا عقیدہ اسے کھینچ کر یہاں بھی لایا کرے گا۔ اس لیے اسے آزاد چھوڑا گیا ہے۔"

میری ٹیلی پیتھی کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ ہیلی کاپٹر زمین پر اُتر گیا تھا۔ سامنے رات کے وقت فلائنگ کلب کی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ میں نے باس جے آر جے ناتھن سے کہا۔ "وہاں آپ کے جو آدمی ہیں، ان میں سے کسی سے رابطہ قائم کریں۔"

وہ فوراً ہی ٹرانسمیٹر کے ذریعے رابطہ قائم کرنے لگا۔ میں نے کہا۔ "آپ اسے حکم دیں کہ فلائنگ کلب کے اندر یا باہر جو بھی شخص کیمرہ لیے کھڑا ہے، اس سے باتیں کرے۔ میں اس کے ذریعے اس کے دماغ میں پہنچ جاؤں گا۔"

باس نے میری ہدایت کے مطابق اسے مخاطب کیا اور حکم دیا۔ میں ٹرانسمیٹر کے ذریعے اس کی آواز سُن رہا تھا پھر میں اس کے دماغ میں پہنچ گیا۔ اب وہ ذرا فاصلے پر کھڑے ہوئے ایک اور شخص کو دیکھ رہا تھا جس کے گلے سے کیمرہ لٹک رہا تھا۔ فلیش لائٹ وغیرہ کا سارا انتظام تھا۔ وہ آگے بڑھ کر اس کے قریب گیا پھر اس نے پوچھا۔ "مسٹر! کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ ہیلی کاپٹر سرکاری ہے یا کسی نے چارٹرڈ کیا ہے؟"

کیمرہ مین نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ پھر ناگواری سے کہا۔ "یہ بات آپ انکوائری کاؤنٹر سے معلوم کر سکتے ہیں۔"

میں کیمرہ مین کے دماغ میں پہنچ گیا۔ پتا چلا، اس کے پاس اینٹی میک اپ کیمرہ نہیں ہے بلکہ وہ کوئی اور ہی فوٹو گرافر ہے۔ میں نے باس جے آر جے ناتھن کے ماتحت پر قبضہ جمایا۔ پھر اسے اِدھر اُدھر لے جاتے ہوئے دیکھنے لگا کہ اور کس کے پاس کیمرہ ہے۔ اچانک ہی ایک شخص نظر آیا جو کلب کے باہر اس گیٹ کی طرف کھڑا ہوا تھا جہاں سے ہیلی کاپٹر والے اُتر کر آسکتے تھے۔ اس ماتحت نے میری مرضی کے مطابق اس کیمرہ مین کو بھی مخاطب کیا۔ اور میں اس کے دماغ میں پہنچ گیا۔ اس بار صحیح آدمی میرے نشانے پر آیا تھا۔ اس کے پاس اینٹی میک اپ کیمرہ تھا۔ وہ میرے ہی انتظار میں وہاں کھڑا ہوا تھا۔ میں نے باس ناتھن سے کہا۔ "اب ہم اُتر کر جا سکتے ہیں۔"

کاک پٹ ہٹا دیا گیا۔ ہم باری باری اُترتے ہوئے زمین پر پہنچے۔ پھر اطمینان سے کلب کی عمارت کی طرف جانے لگے۔ ہمیں آتے دیکھ کر کیمرہ مین بالکل تیار ہوگیا تھا۔ میں چلتے چلتے اس کے قریب آیا تو اس کے دماغ پر چند سانسوں کے لیے قابض ہوگیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کیمرے کا بٹن دبا کر میری تصویر اُتارتا، میں نے اس لمحے اس کیمرے کی آنکھ کو ذرا سا دوسری طرف ہٹا دیا۔ فلیش کی لائٹ کوندی اور تصویر اُتر گئی۔ مجھے یقین تھا، میں کیمرے کے فریم میں نہیں آیا تھا۔ اس نے تاریک رات کی ایک تصویر اُتار لی تھی۔

باس جے آر جے ناتھن مجھے اور منجالی کو لے کر ایک دفتر میں داخل ہوا۔ وہاں قانونی کارروائی لازمی تھی۔ یہ بتانا تھا کہ کون لوگ ہیلی کاپٹر میں آئے ہیں۔ قانون پر عمل دو طرح کے لوگ کراتے ہیں۔ ایک وہ جو قانون کے محافظ ہوتے ہیں۔ دوسرے وہ جو سرمایہ دار ہوتے ہیں۔ ناتھن کے پاس سرمائے کی کمی نہیں تھی اور وہ قانون میں لچک پیدا کر سکتا تھا۔

دوسری طرف جے آر جے ناتھن کے ماتحتوں نے اس اینٹی میک اپ کیمرے والے کو گھیر لیا تھا۔ پھر سختی سے پوچھ رہے تھے۔ "تم ہمارے باس کے مہمانوں کی تصویریں اُتارنے والے کون ہوتے ہو؟"

وہ اپنی صفائی میں کچھ کہہ رہا تھا۔ اس کے ساتھی بھی چلے آئے تھے۔ ناتھن کے ایک ماتحت نے کہا۔ "ہم جانتے ہیں کہ تم لوگ کون ہو اور تم لوگ بھی جانتے ہو کہ ہم کون ہیں؟ ریڈ پاور والوں سے کوئی بات چھپی نہیں رہتی، اور تم انٹرپول والے بھی اپنے شکار کو اس کی قبر سے کھود کر نکال لے آتے ہو۔ ہم تمھیں یقین دلاتے ہیں، تمھارا

کوئی شکار ہمارے پاس نہیں ہے۔لیکن ہم جو راز اپنی حد تک رکھنا چاہتے ہیں۔ اسے یہ نہیں چاہتے کہ کیمرے کی آنکھ سے کوئی دیکھے۔ لہٰذا آئندہ ایسی تصویریں نہ اُتاریں۔"

اس کیمرہ مین کو یقین تھا کہ اس نے میری تصویر اُتار لی ہے۔ اس لیے ان لوگوں نے باس جے آر جے ناتھن کے ماتحت کی بات مان لی اور وہاں سے ہٹ گئے۔ میں ان لوگوں کے دماغوں میں جھانک رہا تھا۔ وہ وہاں سے ہٹنے کے بعد مختلف جگہ پھیل گئے تھے۔ چار آدمی دو گاڑیوں میں بیٹھ گئے تھے۔ دو اپنی موٹر سائیکل سنبھال رہے تھے۔ گاڑی میں بیٹھنے والے کے پاس ایک ٹرانسمیٹر تھا، جس کے ذریعے وہ اپنے آدمیوں کو ضروری اطلاعات فراہم کر سکتا تھا۔

میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد باس ناتھن کو ان کے متعلق بتاتا جا رہا تھا۔ باس ناتھن نے کہا "جب تک انھیں یقین نہ ہو جائے کہ آپ عزّت علی ہیں۔ وہ اس وقت تک میرے پاس آکر آپ کا مطالبہ نہیں کریں گے اور آپ تو عزّت علی نہیں ہیں۔"

"فرہاد علی تیمور تو ہوں۔ اس روپ میں بھی کسی کے سامنے ظاہر ہونا نہیں چاہتا۔"

"اس کا ایک ہی طریقہ ہے۔ آپ اپنے چہرے پر ڈبل میک اَپ کریں۔ یعنی اپنے چہرے پر ایک میک اَپ چڑھانے کے بعد دوسرا یہی میک اَپ چڑھائیں جس میں آپ ابھی موجود ہیں۔ اس طرح ایکٹی میک اَپ کیمرے کے ذریعے آپ کے اندر چھپا ہوا جو چہرہ نظر آئے گا وہ مسٹر فرہاد کا نہیں ہوگا بلکہ وہ ہوگا جو پہلے میک اَپ کے طور پر کسی اور کی صورت اختیار کی گئی ہوگی۔"

"آپ کا خیال مُناسب ہے۔ یہ بات پہلے میرے دماغ میں بھی آئی تھی لیکن اتنی جلدی میک اَپ نہیں ہو سکتا۔ وہ بھی ڈبل میک اَپ۔ اس کے لیے کافی وقت کی ضرورت ہے۔"

"آپ میرے ساتھ سیدھے میری رہائش گاہ میں چلیں۔ اگر ہم انٹرپول والوں کو ڈاج نہیں دیں گے۔ اِدھر سے اُدھر نہیں بھٹکائیں گے تو یہ زیادہ شبہ نہیں کریں گے۔ میرے ہاں میک اَپ کا بہترین اور جدید سامان ہے۔ آپ وہاں اپنے کام میں مصروف رہیں۔ انٹرپول کے افسران مجھ سے رابطہ قائم کریں گے تو میں اس وقت تک ٹالتا رہوں گا جب تک کہ آپ کے چہرے پر ڈبل میک اَپ نہیں ہو جائے گا۔"

یہ باتیں طے ہونے کے بعد ہم اس دفتر سے باہر نکلے۔ پھر ایک کار میں باس جے آر جے ناتھن کے ساتھ بیٹھ گئے۔ میں انٹرپول کے مختلف لوگوں کے دماغوں میں جھانکتا جا رہا تھا۔ اس بات کا یقین تھا کہ ہمیں وہ کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ وہ تو صرف عزّت علی تک پہنچنا چاہتے تھے اور ان کے لیے محاورے کے مطابق دلّی ابھی دور تھی۔ ہم بغیر کسی رُکاوٹ کے باس ناتھن کی رہائش گاہ میں پہنچ گئے۔

بڑی شاندار کوٹھی تھی۔ ریڈ پاور کے باس بڑے شاہانہ انداز میں زندگی گزارتے تھے۔ میں وہاں جاتے ہی اس کے خاص کمرے میں پہنچ کر میک اَپ میں مصروف ہو گیا۔ سنجالی وہیں میرے قریب ہی بستر پر آرام سے لیٹ گئی۔ میں باس ناتھن کے دماغ میں رہ کر دیکھ رہا تھا۔ اس وقت وہ ٹیلیفون کا ریسیور اُٹھا کر انٹرپول کے چیف آفیسر وانڈرمین سے گفتگو کر رہا تھا۔ وانڈرمین کہہ رہا تھا "مسٹر ناتھن! ہم آپ کے معاملے میں مداخلت نہیں کرنا چاہتے لیکن ہمیں ایک آدمی کی تلاش ہے اور وہ آپ کا مہمان بھی ہو سکتا ہے۔"

"آپ کو شبہ ہے۔ میرے مہمان کا آپ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"مسٹر ناتھن! بڑے تعجب کی بات ہے۔ ہمارے کیمرہ مین نے آپ کے مہمان کی تصویر اُتارنا چاہی لیکن وہ تصویر بالکل ڈارک ہو گئی ہے۔"

"آپ کا کیمرہ مین یا تو اناڑی ہوگا یا پھر زیادہ نشے میں ہوگا یا کسی لمحاتی انتشار میں مبتلا ہو گیا ہوگا ورنہ ایک اچھا کیمرہ مین تیزی سے حرکت کرنے والوں کو بھی کیمرے کی آنکھ میں سمو لیتا ہے۔"

"آپ دُرست کہہ رہے ہیں۔ کیا آپ میرے کیمرہ مین کو اپنے مہمان کی ایک تصویر اُتارنے کا موقع دیں گے؟"

"مسٹر وانڈرمین! میرا مہمان ابھی رات کے کھانے کے بعد یہاں سے روانہ ہوگا۔ وہ ایک ہوٹل میں قیام کرے گا۔ آپ کے آدمی آزادانہ اس سے مل سکتے ہیں۔ اس کی ایک نہیں، ہزار تصویریں اُتار سکتے ہیں لیکن میری میزبانی کے دوران مداخلت نہ کریں۔"

"اچھی بات ہے۔ میرے آدمی آپ کے مہمان کا انتظار کرتے رہیں گے۔"

مجھے اطمینان ہو گیا کہ اب وہ مجھ تک پہنچنے کے لیے کوئی زور یا زبردستی سے کام نہیں لیں گے۔ میں وانڈرمین کے پاس پہنچ گیا۔ وہ ریسیور رکھنے کے بعد آرام سے ایک کرسی پر بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا "یہ عزّت علی میرے لیے مصیبت بن گیا ہے۔ کتنی بار اس پر قاتلانہ حملے کرائے لیکن یہ ہر بار بچ کر نکل گیا۔ آخری بار جس کار سے بم کو منسلک کیا گیا تھا، وہاں سے اس کا بچ نکلنا تقریباً ناممکن تھا لیکن یہ بھی ممکن ہو گیا۔"

میں نے اس کی سوچ میں کہا "شاید میری منصوبہ بندی میں کوئی بھول رہ جاتا ہے۔ جو میری سمجھ میں نہیں آتا۔ مجھے شروع سے اپنے منصوبے کا جائزہ لینا چاہیے۔ یہ دشمنی کہاں سے شروع ہوئی؟"

اس کا دماغ شروع سے سوچنے لگا۔ میں کبھی عزّت علی سے دشمنی کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا تھا کیوں کہ وہ بے حد ذہین بلکہ چالاک آفیسر ہے مگر میری بدقسمتی کہ میں نے گولڈن ریکٹ والوں سے سازباز کی۔ انٹرپول والوں کا کوئی بھی آفیسر کوئی بھی رُکن کسی خطرناک

تنظیم یا بین الاقوامی سطح پر بدنام ہونے والے بلیک میلر، اسمگلر، قاتل یا کسی طرح کے جرم کرنے والوں سے دوستی نہیں کرسکتا۔ قانون کے مطابق ان کے خلاف ثبوت فراہم کرکے انھیں آہنی سلاخوں کے پیچھے بھیجنا ان کا فرض ہوتا ہے۔ عزت علی کو معلوم ہوگیا تھا کہ میں خفیہ طور سے گولڈن رکیٹ والوں کی مدد کرتا ہوں۔ ان کے خلاف کوئی ثبوت ہاتھ آجائے تو اسے کسی نہ کسی طرح ضائع کردیتا ہوں۔ بس یہیں سے عزت علی میرے پیچھے پڑگیا۔ میرے خلاف ثبوت فراہم کرنے لگا۔

وہ سوچنے کے دوران اپنی جگہ سے اُٹھ کر اس میز کے پاس آیا جس پر شراب کی مختلف بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے ایک بوتل کو کھول کر اپنے لیے ایک پیگ بنایا۔ پھر اس کا ایک گھونٹ لینے کے بعد سوچنے لگا۔ "معلوم ہوتا ہے، عزت علی کے ہاتھ میرے خلاف کوئی ثبوت لگ گیا ہے مگر اس ثبوت کو اور مستحکم کرنے کے لیے وہ مجھ سے چھپ رہا ہے ورنہ جتنی بار میں اسے قتل کرنے کا منصوبہ بناچکا ہوں، وہ اب تک میرے خلاف کارروائی کرسکتا تھا لیکن وہ خاموش ہے، روپوش ہے۔ آخر وہ کیا کر رہا ہے؟"

اس نے دو چار گھونٹ پیے۔ میں ان چاروں محافظوں کو نہیں بھلا سکتا جنھوں نے سنگاپور کے ائیرپورٹ سے میری حفاظت کی ذمے داری اپنے سر لی تھی۔ مجھے عزت علی سمجھ کر اس قاتل سے میری جان بچائی تھی، جو وانڈرمین کی طرف سے مجھے قتل کرنے آیا تھا اور وانڈرمین کو میری موت کا ذریعہ بنا رہا تھا۔ ان میں ایک ملایائی لڑکی نیما انگریزی زبان جانتی تھی۔ میں اس کے دماغ میں پہنچ کر ان سب کی خیریت معلوم کرسکتا تھا لیکن میں نے اسے ضروری نہیں سمجھا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ لوگ انٹرپول سے تعلق رکھتے تھے اور انھوں نے مجھے عزت علی سمجھ کر میرا ساتھ دیا تھا۔ وہ اپنی حفاظت خود کرنا جانتے تھے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ میں ان کی خیریت معلوم کرکے یا ان سے مزید رابطہ قائم کرکے انٹرپول والوں کے ساتھ ملوث ہونا نہیں چاہتا تھا۔ میرے دوستوں اور دشمنوں کا حلقہ جتنا وسیع ہوتا جاتا ہے، اتنی ہی مصیبتیں بھی پاؤں پھیلاتی جاتی ہیں۔

اس وقت میں نے وانڈرمین کی سوچ کے ذریعے نیما اور اس کے تینوں فائٹر ساتھیوں کے متعلق سوال کیا۔ اس کی سوچ نے جواب دیا۔ "میں ان چاروں کو بھی زندہ چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ میرے خلاف گواہ بن سکتے تھے لیکن وہ تو شروع سے ہی خطرناک فائٹر مانے گئے ہیں۔ وہ چاروں، دشمنوں کی جس بستی میں جاتے ہیں، وہاں پر صرف دشمنوں کو نابود نہیں کرتے بلکہ اس بستی کو بھی تہس نہس کر کے رکھ دیتے ہیں۔ میں نے اسی لیے خوب سوچ سمجھ کر اس ٹائم بم کو کار کے نیچے منسلک کیا تھا تاکہ وہ سب ایک ساتھ فنا ہو جائیں لیکن ایسا نہ ہوسکا۔ ان چاروں نے ہمارے حملہ آوروں کو ہلاک کردیا۔ دوسری طرف عزت علی ایک سیاہ فام لڑکی کے ساتھ فرار ہوگیا۔ پتا نہیں وہ کالی لڑکی کون ہے؟"

میں نے اس کی سوچ میں پوچھا۔ "وہ چاروں خطرناک فائٹر زندہ ہیں؟ یقیناً وہ عزت علی کا پتا جانتے ہوں گے اور اس کے اشارے کے منتظر ہوں گے۔ جب بھی وہ چاہے گا، ان چاروں کے ذریعے مجھے ہلاک کردے گا؟"

"نہیں عزت علی مجھے ہلاک نہیں ہونے دے گا۔ اسی لیے تو ان چاروں فائٹروں نے مجھے ہاتھ نہیں لگایا ہے۔ جانے وہ بھی کہاں گم ہوگئے ہیں۔ وہ جب بھی آئیں گے، اپنے باس عزت علی کے ساتھ آئیں گے اور میرے خلاف تمام ثبوت لے کر آئیں گے۔ کاش یہی شخص عزت علی ہو، جس سے ابھی ہمارا سامنا ہونے والا ہے۔"

میں نے پھر اس کی سوچ میں پوچھا۔ "یہ بگ لیڈی کیا بلا ہے؟"

اس کی سوچ نے جواب دیا۔ "بڑی خوب صورت بلا ہے۔ پہلے میں اس کی خوب صورتی کے جال میں آیا۔ اس کے بعد گولڈن رکیٹ کے جال میں اُلجھتا چلا گیا۔ ویسے میرا نقصان نہیں ہوا۔ گولڈن رکیٹ سے میں نے اتنی دولت کمائی ہے کہ آدھی صدی تک انٹرپول کا آفیسر رہ کر بھی کبھی اتنا نہیں کما سکتا تھا۔ افسوس صرف اس بات کا ہے کہ میں لیڈی آرپر کے قریب نہ پہنچ سکا۔"

اس کی سوچ کے ذریعے لیڈی آرپر کا نام سُن کر میں چونک گیا۔ اس سے پہلے ایک یہودی سیکرٹ ایجنٹ ٹونی بیکر کے ذریعے مجھے پتا چلا تھا کہ بنکاک میں گولڈن رکیٹ کی جو شاخ ہے اس کی ہیڈ ایک لیڈی ہے جس کا نام لیڈی آرپر ہے۔ ٹونی بیکر نے اس کے حُسن کی تعریف بڑے شاعرانہ انداز میں کی تھی۔ میں نے اسی وقت سوچ لیا تھا کبھی اس سے سامنا ہوگا تو لیڈی آرپر جیسا نام اس کے لیے مناسب نہیں ہوگا۔ میں اسے لیڈی آرپار کیا کروں گا۔

میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ حالات اتنی جلدی مجھے لیڈی آرپار کے قریب لے آئیں گے۔ میں اس کے متعلق ٹونی بیکر کے تاثرات معلوم کرچکا تھا۔ اب وانڈرمین کے تاثرات معلوم کر رہا تھا۔ اس کی سوچ بتا رہی تھی، وہ ایسی عورت ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ شاید کیمرہ بھی اس کے حسن کی مکمل تصویر نہ اتار سکے۔ بڑے بڑے افسران، اعلیٰ حکام، کروڑپتی اور ارب پتی سرمایہ دار اسے حسنِ مغرور کہتے ہیں۔ آج تک کسی نے اس عورت کو مسکراتے نہیں دیکھا۔ یہ بھی ایک عجیب سی بات ہے کہ حُسن کبھی نہ مسکرائے، تیور چڑھے رہیں تو اسے اور چار چاند لگ جاتے ہیں۔ لوگ پہلے سوالی بن کر اس کے سامنے آتے ہیں۔ پھر اس کے پیچھے زر خرید غلاموں کی طرح چلتے رہتے ہیں جس طرح وانڈرمین اس کے پیچھے چل رہا تھا لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ شاید کبھی اسے حاصل نہیں کرسکے گا۔ ایک خوش فہمی بھی

تھی کہ شاید اس کی مردانہ خوبیوں کے آگے وہ حسن کبھی موم ہو جائے۔ اسی خوش فہمی میں مبتلا ہو کر بڑے بڑے افسران اور بڑے بڑے شہ زور اس کے اشاروں پر ناچتے تھے۔

وانڈر مین نے ریسیور اٹھا کر لیڈی آربر کے نمبر ڈائل کیے۔ پہلے اس کی سیکریٹری کی آواز سنائی دی۔ پھر اس نے انتظار کرنے کے لیے کہا۔ تھوڑی دیر بعد لیڈی آربر کی آواز سنائی دی۔ وانڈر مین نے کہا۔ "ابھی میں نے باس جے آر جے ناتھن سے گفتگو کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جو شخص اس کے ساتھ آیا ہے وہ اس کا مہمان ہے جو ابھی رات کے کھانے کے بعد اس سے رخصت ہو کر کسی ہوٹل میں قیام کرے گا۔"

لیڈی آربر نے غرا کر کہا۔ "مسٹر وانڈر مین! تمہاری باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ باس ناتھن کے اس مہمان کی تصویر حاصل نہیں ہو سکی۔"

"ہمارے فوٹو گرافر سے غلطی ہوگئی۔ وہ اس شخص کو کیمرے کے فریم میں نہ لا سکا۔"

"میں ایسے نوکروں کو گولی مار دیا کرتی ہوں۔"

"مادام! انٹرپول کا معاملہ کچھ اور ہے۔ ہم پہلی، دوسری، تیسری وارننگ دیا کرتے ہیں۔ انسان سے غلطی ہو ہی جاتی ہے۔"

وہ سخت لہجے میں بولی۔ "اب اس شخص کی تصویریں اتارنے کا تکلف نہ کرو۔ نہ ہی اسے ہوٹل تک جانے کا موقع دو۔ تمہارے آدمی اگر اسے اٹھا کر نہ لا سکے تو میں اپنے آدمیوں کو اس کے پیچھے لگاؤں گی اور میرا چیلنج ہے کہ وہ آدھی رات سے پہلے یہاں میرے قدموں میں ہوگا۔"

"میں آپ کو زحمت نہیں دوں گا۔ صرف گھنٹے، دو گھنٹے کی بات ہے۔ آپ کو خوشخبری ملے گی کہ وہ شخص میرے ہاں موجود ہے۔ آپ چاہیں تو دو گھنٹے کے اندر کسی وقت بھی آکر اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتی ہیں۔"

وہ بولی۔ "میرا خیال ہے اس شخص کو میرے ہاں لانا مناسب ہوگا تاکہ میرے کتے اس کی بو سونگھ سکیں۔"

"مادام! اگر وہ شخص عزت علی ہے تو اسے میرے ہاں لایا جانا چاہیے کیوں کہ اسے یہاں زندہ دفن کرنے کے تمام انتظامات پہلے سے ہو چکے ہیں۔"

وہ غرا کر بولی۔ "بڑی مدت کے بعد تم نے میری بات کی تہ دیکی ہے۔ آئندہ محتاط رہو۔ میں اپنے فیصلے کے بعد کسی دوسرے کا فیصلہ سننا بھی گوارا نہیں کرتی۔ وہ شخص میرے ہاں لایا جائے گا اور جہاں تک اسے زندہ دفن کرنے کا تعلق ہے، اس کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ میرے کتے صرف اس کی ہڈیاں چھوڑیں گے۔ اور ہڈیوں سے کسی کی شناخت نہیں ہوتی۔"

یہ کہہ کر اس نے ریسیور کو کریڈل پر پٹخ دیا۔ وانڈر مین نے اپنے ریسیور کو ذرا ناگواری سے مگر بے بسی سے دیکھا پھر بڑبڑاتے ہوئے اسے کریڈل پر رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "اس عورت کی ہزار باتیں بھی برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ جانے کمبخت کب تک دوڑاتی رہے گی۔ مشکل تو یہ ہے کہ اس سے کوئی محبت بھرا اشارہ بھی نہیں ملتا اور دل ہے کہ خوش فہمی میں مبتلا ہوتا چلا جا رہا ہے۔"

بات صرف خوش فہمی کی نہیں تھی۔ وانڈر مین کو گولڈن رنگیٹ کی طرف سے ہزاروں ڈالر کی آمدنی تھی۔ اس آمدنی کے باعث بھی وہ برداشت کر رہا تھا۔ سوچتا تھا۔ اس حسینہ سے مخاصمت مول لے گا تو اتنی بڑی آمدنی ہاتھ سے نکل جائے گی۔

میرا دوہرا میک اپ مکمل ہو گیا۔ ہم ایک میز کے اطراف کھانے کے لیے بیٹھ گئے۔ میں نے باس ناتھن کو بتایا کہ وہ لوگ کس قسم کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔ مجھے ہوٹل تک جانے نہیں دیں گے۔ گھیر کر لیڈی آربر کے ہاں لے جائیں گے۔

باس ناتھن نے کہا۔ "میں آپ کے یہاں سے روانہ ہونے سے پہلے ہی اپنے تمام آدمیوں کو لیڈی آربر کی کوٹھی کے اطراف پھیلا دوں گا۔ ضرورت پڑی تو وہ سب کے سب اندر گھس جائیں گے۔"

"آپ بھول رہے ہیں۔ اس کے احاطے میں خطرناک قسم کے بلڈ ہاؤنڈ ہیں۔ وہ آنے والوں کو بھنبھوڑ کر رکھ دیں گے۔"

منجالی نے مسکرا کر کہا۔ "میں آپ کے ساتھ چلوں گی تو کتے جہاں ہیں وہیں رہ جائیں گے۔"

میں نے چونک کر منجالی کو دیکھا۔ یہ تو بھول ہی گیا تھا کہ اس کی موجودگی میں کوئی بھی کتا میرے قریب نہیں آ سکتا بلکہ مجھ سے دور بھاگ سکتا ہے۔ میں نے کہا۔ "بڑی مشکل ہے۔ تم میرے ساتھ جاؤ گی اور کتے تم سے خوف زدہ ہو کر بھاگنا چاہیں گے تو اس واقعے کی کڑی رنگون والے واقعے سے ملائی جائے گی۔ پھر جلد ہی یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ فرہاد علی تیمور بنکاک میں موجود ہے۔ میں فی الحال اپنے آپ کو ظاہر کرنا نہیں چاہتا۔"

"میرے آقا! کیا آپ تنہا ان خطرناک کتوں کے درمیان جائیں گے؟"

"دشمن کسی طرح بھی کتوں سے کم نہیں ہوتے۔ اس لحاظ سے میں ہمیشہ کتوں کے درمیان زندگی گزارتا ہوں۔"

"لیکن دشمن بولنے والے کتے ہوتے ہیں اور یہ بھونکنے والے کتے ہیں۔ آپ بولنے والوں کے دماغوں میں پہنچ کر اپنا دفاع کر سکتے ہیں لیکن بھونکنے والے آپ کی ٹیلی پیتھی سے متاثر نہیں ہوں گے۔"

"میری زندگی میں ایسے کئی واقعات ہیں جہاں میری ٹیلی پیتھی کام نہیں آئی خصوصاً گونگے دشمنوں کے سامنے میں نہتا رہ چکا ہوں۔ اس بار بھی شاید یہی ہو گا۔"

منجالی نے باس ناتھن سے پوچھا۔ "اس لیڈی آریہ کا بنگلہ یہاں سے کتنی دور ہے؟"

"یہی کوئی دو میل کے فاصلے پر ہے۔"

"میرے آقا! میں یہیں رہوں گی۔ جب آپ دیکھیں کہ آپ کے پیچھے کتے چھوڑے جا رہے ہیں تو آپ فوراً ہی مجھ سے رابطہ قائم کر لیں۔ میں وہاں پہنچ جاؤں گی۔"

"ہاں، یہ مناسب ہے۔"

ایک ملازم ٹیلیفون اٹھائے ہوئے باس جے آر جے ناتھن کے پاس آیا۔ میں نے آہستگی سے کہا۔ "اگر میرے متعلق گفتگو ہو اور وہی دشمن ہوں تو ان سے کہنا میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

اس نے ریسیور کو کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ "ہیلو جے آر جے ناتھن مائی سیلف۔"

یہ کہہ کر وہ دوسری طرف کی آواز سننے لگا۔ وانڈر مین پوچھ رہا تھا۔ "تم اپنے مہمان کو کب رخصت کرو گے؟"

باس ناتھن نے کہا۔ "آپ کے آدمیوں نے فلائنگ کلب میں میرے مہمان کو چوکنا رہنے پر مجبور کر دیا ہے۔ میرا مہمان صلح جو اور امن پسند ہے۔ وہ سمجھ گیا ہے کہ یہاں سے نکلے گا تو ان دیکھے دشمنوں سے ٹکراؤ ہو گا۔ اس لیے وہ کوئی صلح کا راستہ نکالنا چاہتا ہے اور آپ سے گفتگو کرنا چاہتا ہے۔"

"میں تیار ہوں۔ ریسیور اسے دے دو۔"

میں نے ریسیور لے کر کہا۔ "ہیلو مسٹر! میں آپ کو نہیں جانتا اور شاید آپ بھی مجھے نہیں جانتے ہیں۔ پتا نہیں کس شبہے میں مجھے خواہ مخواہ پریشان کر رہے ہیں۔"

"ہمیں ایک شخص کی تلاش ہے۔ ہم اپنا شک دور کرنا چاہتے ہیں۔"

"اگر یہ بات ہے تو ہم کہیں ملاقات کر لیتے ہیں۔ میں آپ کا شبہ دور کر دوں گا۔"

"اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے۔ کیا ابھی تم میرے ہاں آنا پسند کرو گے؟"

"میں ضرور آؤں گا لیکن یہاں اجنبی ہوں۔ راستہ نہیں جانتا ہوں۔"

"جب تم اس کوٹھی سے باہر نکلو گے تو تمہاری کار کے آگے ایک سفید رنگ کی کار ہو گی۔ تم اس کے پیچھے آ سکتے ہو۔"

"میں یہی کروں گا۔ بس اب نکلنے ہی والا ہوں۔"

"وہ نیگرو لڑکی بھی یقیناً تمہارے ساتھ ہو گی۔"

"نہیں، وہ بیمار ہے۔ اگر تمہارے ذرائع وسیع ہیں تو یہ معلوم کر سکتے ہو کہ وہ سفر کے دوران سوتی رہی۔ میں ایسی حالت میں اسے اپنے ساتھ لے کر نہیں نکلوں گا۔ تم سے ملاقات کرنے کے بعد کسی ہوٹل میں کمرہ لوں گا۔ اس کے بعد اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

"بائی دی وے، وہ تمہاری کون ہے؟"

"یہ سوال غیر ضروری ہے۔ میں ریسیور رکھ رہا ہوں۔"

اور میں نے ریسیور رکھ دیا۔ منجالی پریشان ہو کر مجھے دیکھ رہی تھی۔ وہ بڑی فکرمند تھی۔ میں نے کہا۔ "فکر نہ کرو۔ میں انشاءاللہ بخیریت واپس آؤں گا۔"

میں وہاں سے اٹھ گیا۔ باس ناتھن نے کہا۔ "جناب! آپ نے تو کچھ کھایا ہی نہیں ہے۔"

"بس تھوڑا سا چکھ لیا ہے۔ کسی بھی مہم پر روانہ ہونے سے پہلے کبھی پیٹ بھر کر نہیں کھانا چاہیے۔"

میں ان سے باتیں کرتا ہوا ڈرائنگ روم میں پہنچا۔ منجالی وہیں رک گئی۔ کیونکہ اس کی علالت کا بہانہ کیا گیا تھا۔ اس کا کوٹھی سے باہر دکھائی دینا مناسب نہیں تھا۔ میں باس ناتھن کے ساتھ باہر آیا۔ وہاں میرے لیے ایک کار موجود تھی۔ اسٹیئرنگ سیٹ پر ڈرائیور بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے لیے

پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ میں وہاں بیٹھ گیا۔ دروازہ بند ہوا۔ پھر اس نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ میں نے ہاتھ ہلا کر پاس نا تھن کو خدا حافظ کہا۔ وہ کار احاطے سے باہر نکل آئی۔ میں نے دیکھا، سامنے ایک سفید رنگ کی کار کھڑی ہوئی تھی جو آہستہ آہستہ آگے کی طرف رینگ رہی تھی۔ میں نے ڈرائیور سے کہا۔ "اس سفید رنگ کی کار کے پیچھے چلتے رہو۔"

اس کے بعد میں آرام سے سیٹ کی پُشت سے ٹیک لگا کر لیڈی آرپار کے دماغ میں پہنچ گیا۔ واشنگٹن اپنے آدمیوں کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ لیڈی آرپار اپنے خاص ملازم سے کہہ رہی تھی۔ "جب وہ گاڑی یہاں آئے اور وہ شخص کوٹھی کے اندر داخل ہو جائے تو مین گیٹ بند کر دینا۔ کتوں کو کھلا چھوڑ دینا تاکہ وہ یا اور کوئی اس کوٹھی سے باہر نہ جا سکے۔"

واشنگٹن نے مُسکرا کر کہا۔ "مادام! آپ تو جیسے میرے لیے بھی باہر نکلنے کا راستہ بند کر رہی ہیں۔"

اس نے غرا کر کہا۔ "اگر میں تمھارا راستہ بند کر رہی ہوں تو یہ کوئی مسکرانے کی بات نہیں ہے۔ وقت بے وقت مُسکرانا مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

وہ فوراً ہی سنجیدہ ہو گیا۔ لیڈی آرپار نے ناگواری سے کہا۔ "تم گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہو۔ ابھی مسکرا رہے تھے۔ میرے کہتے ہی سنجیدہ ہو گئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمھاری مُسکراہٹ فطری اور بے اختیاری نہیں تھی۔ میری خوشامد کے لیے تھی اور تمھاری یہ سنجیدگی بھی بے اختیار نہیں ہے۔ یہ بھی میری خوشامد کے لیے ہے اور میں سمجھ چکی ہوں کہ خوشامدی مرد مجھے کتوں کی ہلتی ہوئی دُم کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔"

وہ دل ہی دل میں گالیاں دینے لگا۔ میں نے اس کی سوچ میں اسے بجھڑ کا یا۔ "میں مرد ہوں۔ اس ایک عورت کے مُنہ پر اسے کتیا بھی نہیں کہہ سکتا جب کہ وہ میرے لیے کتوں کی مثال دے رہی ہے۔" بے اختیار اس نے کہا۔ "کیا تمھیں نرمی اور سہولت سے گفتگو کرنا نہیں آتا ہے۔ جب دیکھو کسی کتیا کی طرح غراتی رہتی ہو۔"

وہ کسی کے معمولی سے تیور بھی برداشت نہیں کرتی تھی۔ کجا یہ کہ واشنگٹن نے اسے کتیا کہہ دیا تھا۔ میں فوراً ہی اس عورت کے دماغ میں پہنچ گیا تاکہ ردِعمل معلوم کر سکوں۔ یقیناً وہ آتش فشاں کی طرح لرز گئی تھی۔ اندر زلزلہ پیدا ہو گیا تھا۔ اچانک اس کے دماغ نے سمجھایا۔ "صبر، ذرا سا صبر۔ ابھی وہ اجنبی آنے والا ہے۔ جب یہ تصدیق ہو جائے کہ اس کے پیچھے عزت علی چھپا ہوا ہے تو وہ اور یہ واشنگٹن دونوں ہی کتوں کی خوراک بنیں گے اور میں تماشا دیکھتے ہوئے پوچھوں گی کہ کتیا کون ہے؟"

وہ اسے گھور کر دیکھتے ہوئے، غراتے ہوئے بولی۔ "جب میں کتیا ہوں تو تمھاری بات کا بُرا نہیں مانوں گی۔ مجھے ایسے لوگ پسند ہیں جو منہ پر سچ کہتے ہیں۔"

واشنگٹن اسے حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ اب تک یہی سمجھ رہا تھا کہ جوابی کارروائی ہوگی اور اس کے لیے اسے تیار رہنا چاہیے۔ اس سے سخت گفتگو کرنا چاہیے اور دیکھنا چاہیے۔ اس حسینہ میں کتنا دم خم ہے۔ صرف دکھاوے کا رُعب و دبدبہ ہے یا اندر بھی کچھ کس بل رکھتی ہے۔

اس وقت تک ہماری کار لیڈی آرپار کی شان دار کوٹھی کے سامنے پہنچ گئی۔ سفید کار سے ایک شخص نے اتر کر اشارہ کیا کہ ہماری کار اس احاطے سے اندر جا سکتی ہے۔ دربان نے مین گیٹ کو کھول دیا تھا۔ ہماری کار رینگتے ہوئے کوٹھی کے بیرونی دروازے کے سامنے پہنچ کر رُک گئی۔ ڈرائیور نے گاڑی سے نکل کر میرے لیے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ میں دروازے سے باہر آ گیا۔ دروازے کے سامنے ایک ادھیڑ عمر کی عورت کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔ "آپ اپنے ڈرائیور کو بھی اندر لے آئیں۔ ابھی اس کوٹھی کے باہر کتے چہل قدمی کریں گے۔"

ڈرائیور میرے ساتھ کوٹھی کے اندر آ گیا۔ دروازہ بند کر دیا گیا۔ میں نے اس عورت کی آواز سے پہچان لیا کہ وہ لیڈی آرپار کی سیکریٹری تھی۔ اس نے ڈرائنگ روم تک ہماری رہنمائی کی۔ وہ ڈرائنگ روم جو ابھی ذرا دیر پہلے لیڈی آرپار اور واشنگٹن سے آباد تھا۔ اب خالی نظر آ رہا تھا۔ وہ میری آمد کی خبر سنتے ہی وہاں سے چلے گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ڈرامائی انداز میں میرے سامنے آنا چاہتے تھے۔ میں وہاں ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ سیکریٹری بھی وہاں سے چلی گئی۔ ڈرائنگ روم کے دوسری طرف کا دروازہ کھلا۔ ایک کیمرہ مین میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس کے روبرو کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "پتا نہیں، تم لوگ میری تصویر کیوں اُتارنا چاہتے ہو۔ وہاں فلائنگ کلب میں بھی میری تصویر اتاری گئی تھی۔"

میری گفتگو کے دوران اس نے فلیش لائٹ کے ذریعے تصویر اتار لی۔ پھر خاموشی سے چلا گیا۔ میں نے چاروں طرف گھوم کر دیکھا۔ وہ ایک بہت بڑا ہال نما ڈرائنگ روم تھا۔ ایک طرف اونچا سا زینہ اوپری منزل کی طرف چلا گیا تھا۔ ڈرائنگ روم کی سجاوٹ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ دنیا جہان کا قیمتی سامان وہاں آرائش کے طور پر رکھا گیا تھا۔

اس ڈرائنگ روم میں چار دروازے تھے۔ یقیناً وہ چار مختلف سمتوں میں کوٹھی کے اندر کھلتے ہوں گے۔ دس منٹ کے بعد ایک دروازہ کھلا۔ پھر واشنگٹن ایک شانِ بے نیازی سے چلتا ہوا اندر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی تصویر تھی۔ اس نے مجھے دیکھتے ہوئے فخریہ انداز میں کہا۔ "ہیلو مسٹر عزت علی! میں تمھاری جُرأت کی داد دیتا ہوں۔ تھوڑی دیر پہلے تم سے فون پر گفتگو ہوئی۔ تم نے میری آواز کو بھی پہچانا، مجھے بھی پہچانا۔ اس کے باوجود یہاں جال میں پھنسنے کے لیے چلے آئے۔

میں تصدیق کر چکا ہوں ۔ باہر تمہارا کوئی آدمی نہیں ہے اور کتے کسی کو اندر آنے نہیں دیں گے۔"

میں چپ چاپ طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے اُسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔" بہت زیادہ خوش فہمی اچھی نہیں ہوتی۔ اگر تمہارے پاس ہتھیار ہے تو چپ چاپ سامنے رکھ دو۔"

میں نے انجان بن کر پوچھا۔" تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں عزت علی ہی ہوں؟"

اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی تصویر کو میری طرف کیا ۔ اس میں عزت علی کا چہرہ نظر آرہا تھا۔ میں نے ڈبل میک اپ اسی ترتیب سے کیا تھا کہ پہلے اپنے چہرے پر عزت علی کا میک اپ چڑھایا تھا۔ اس کے اوپر وہ میک اپ کیا جس میں سنگاپور سے یہاں تک آیا تھا۔ ظاہر ہے اینٹی میک اپ کیمرے نے اوپر والے میک اپ کے پار پہنچ کر تصویر اتاری تھی اور اس کیمرے کا لینس اتنا پاور فل نہیں تھا کہ وہ دوسرے میک اپ کے پار فرہاد علی تیمور کی اصلی تصویر اتار سکتا۔ اس لیے عزت علی کی تصویر اتر گئی تھی۔

میں نے اس تصویر کو دیکھ کر کہا۔" مجھے شبہ تھا کہ اینٹی میک اپ کیمرے سے میری تصویر اتاری گئی ہے۔"

" اس کے باوجود تم مطمئن تھے۔" اس نے جیب سے ریوالور نکال لیا پھر سخت لہجے میں کہا۔" مجھے باتوں میں نہ بہلاؤ۔ دوسری طرف گھوم جاؤ۔ میں تمہاری تلاشی لوں گا۔"

میں دونوں ہاتھ اٹھا کر دوسری طرف گھومنے لگا۔ گھومتے گھومتے میں نے اس کے دماغ کو ذرا سا بہکایا اور ایک ٹھوکر اس کے ریوالور پر ماری۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل کر فضا میں اچھلا۔ اس سے پہلے کہ وہ نیچے آتا، میں نے ریوالور کو کیچ کر لیا۔

وہ بوکھلا کر ایک قدم پیچھے چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ڈرائنگ روم کے چاروں دروازے کھل گئے۔ واشڈ مین کے ماتحت اپنے ہاتھوں میں ریوالور لیے کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے کہا۔" بے شک چاروں طرف سے مجھ پر گولیاں برسیں گی لیکن یاد رکھو، اس دوران ایک گولی تمہارے چیف آفیسر کے سینے میں اتر جائے گی۔ جسے یہ سودا منظور ہو وہ گولی چلائے۔"

واشڈ مین نے چیخ کر دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔" نہیں کوئی میرے حکم کے بغیر گولی نہ چلائے۔"

میں نے کہا۔" شاباش، اب دوسرا حکم دو کہ یہ اپنے ریوالور میرے قریب پھینک دیں۔ ریوالور پتھر کی طرح نہ ماریں ورنہ ۔۔۔"

میں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ واشڈ مین نے انہیں حکم دیا۔ وہ ذرا قریب آکر ریوالور میرے قدموں کی طرف پھینکنے لگے۔ میں نے کہا۔" اب انہیں حکم دو۔ یہ جن دروازوں کے پیچھے سے آئے ہیں۔ وہیں سے چلے جائیں۔"

وہ حکم کے مطابق چلے گئے۔ دروازے پھر بند ہو گئے۔ میں نے کہا۔" واشڈ مین! اب میرے ریوالور کے آگے چلتے رہو اور ایک ایک دروازے کو ادھر سے بند کرتے رہو تاکہ اُدھر سے کوئی کھول کر نہ آسکے۔"

وہ میرے ریوالور کے آگے چلنے لگا۔ ایک ایک دروازے کو بند کرنے لگا۔ پھر ہم اُدھر آگئے جہاں ریوالور فرش پر پڑے ہوئے تھے۔ میں نے اسے ذرا دور جانے کا حکم دیا پھر چاروں ریوالور فرش پر سے اُٹھا لیے۔ انہیں لے کر ایک دیوار کے پاس آیا۔ اس ڈرائنگ روم کے وہیر قالین کو اٹھا کر پانچوں ریوالوروں کو اس کے نیچے ٹھونس دیا۔ اس کے بعد قالین کو برابر کر دیا۔ پھر واشڈ مین کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔" تمہارا ریوالور بھی قالین کے نیچے چلا گیا ہے۔ اب ہم دونوں نہتے ہیں۔ سنا ہے دو آدمیوں کے درمیان دھماکا نے اور ہلاک کرنے والا کوئی ہتھیار نہ ہو تو وہ مجبوراً شرافت سے گفتگو کرتے ہیں۔"

میں کہتا ہوا اس کے قریب جا رہا تھا۔ قریب ہوتے ہی اچانک اس نے مجھ پر چھلانگ لگائی۔ پھر مجھے لیے ہوئے صوفے پر گر پڑا۔ میں نے اسے صوفے کے دوسری طرف اُچھال دیا۔ وہ قالین پر گرا۔ پھر اس سے پہلے کہ اپنے پیروں پہ کھڑا ہوتا۔ میں بھی صوفے سے اچھل کر اس پر آگیا۔ وہ اُٹھ رہا تھا۔ میرے بوجھ سے زمین بوس ہو گیا۔ میں نے اس سے الگ ہو کر اسے اُٹھنے کا موقع دیا۔ جب وہ ذرا سا اُٹھا تو میں نے اس کے منہ پر ٹھوکر ماری۔ وہ چیختے ہوئے ذرا سا سیدھا ہوا۔ میں نے اس کے جبڑے پر گھونسہ رسید کیا۔ اس کا منہ دوسری طرف گھوم گیا۔ میں نے دوسری طرف گھونسہ رسید کیا۔ اتنی سی دیر میں پتا چل گیا کہ وہ میرے مقابلے کا فائٹر نہیں ہے لہٰذا اس پر اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے اسے دونوں ہاتھوں سے اُٹھایا۔ اپنے سر سے بلند کیا پھر صوفے کے درمیان فرش پر پٹخ دیا۔ اس کے بعد میں نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔" ہاں، اب بتاؤ۔ وہ تمہاری لیڈی آرپار کہاں ہے۔ جس کے ساتھ مل کر مجھے کئی بار قتل کرنے کی ناکام کوششیں کر چکے ہو؟"

میری بات ختم ہوتے ہی ڈرائنگ روم کے زینے کی بلندی پر لیڈی آرپار کی غراتی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھی۔" یونان سنس، میرا نام آرپ ہے۔ آرپار نہیں۔"

میں نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ واقعی وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ لفظوں میں اس کی تصویر کھینچنا دشوار تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک زنجیر تھی اور زنجیر کے دوسرے سرے پر ایک خطرناک قسم کا بلڈ ہاؤنڈ بندھا ہوا تھا۔ یعنی گلاب کے ساتھ کانٹا بھی تھا۔

میں نے مسکرا کر کہا۔" کاش تم اُردو زبان سمجھ سکتیں تو تمہیں آرپار

کے معنی معلوم ہوتے۔ کوئی بات نہیں۔ وقت آئے گا تو میں تمھیں آرپار کے بیچے بھی سمجھا دوں گا۔"

وہ آگے بڑھتے ہوئے، کتے کو اپنے ساتھ لیے ہوئے زینے کے ایک پائدان پر پہنچی۔ پھر ناگواری سے بولی "بہت اسمارٹ ہو۔ میں تمھارے لڑنے کا انداز دیکھ رہی تھی۔ لیکن جس سے لڑ رہے تھے، وہ صرف کتے کی طرح بھونکنا اور دھمکیاں دینا جانتا ہے لیکن میرا یہ کتا دھمکیاں نہیں دیتا۔ بھونکتا کم ہے اور بھنبھوڑتا زیادہ ہے۔"

اچانک اس نے کتے کی زنجیر کو ہاتھ سے چھوڑتے ہوئے کہا۔

"جاؤ۔ ان دونوں کو زندہ نہ چھوڑو۔"

میں اس سچویشن کے لیے تیار نہیں تھا۔ فوراً ہی آگے بڑھ کر ایک تپائی اٹھالی، تاکہ آنے والے کتے کو روک سکوں۔ اُدھر وانڈرمین نے بھی میری دیکھا دیکھی یہی کیا تھا۔ اس نے دوسری تپائی کو اٹھا کر اپنے سامنے ڈھال بنالیا تھا۔ کتا اپنی مالکن کا حکم سنتے ہی زینے سے اُترتے ہوئے، بھونکتے ہوئے ہماری طرف آرہا تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے، پہلے میری ہی طرف چلا آرہا تھا۔

ہاں، پہلے میری طرف آنے کی وجہ تھی۔ وانڈرمین کو کئی بار وہاں دیکھ چکا تھا۔ اس سے کچھ شناسائی تھی۔ وہ بعد میں اس سے نمٹ سکتا تھا۔ میں اس کے لیے مکمل اجنبی تھا۔ پہلے وہ میری طرف لپکنے کے لیے آیا۔ صوفے کے قریب پہنچا، پھر اچانک ہی ٹھٹک گیا۔

میرا اس سے تین یا چار فٹ کا فاصلہ تھا۔ وہ رُک کر میری طرف دیکھ کر غرّا رہا تھا جیسے حملہ کرنے سے پہلے کوئی داؤ سوچ رہا ہو لیکن وہ غرّاتے ہوئے پیچھے ہٹنے لگا۔ پھر مجھ سے فاصلہ رکھتے ہوئے ایک طرف جانے لگا، جس طرح ایک چیتا شکاری کے گرد چکر لگاتا ہے اور اسے بھی چکرانے پر مجبور کرتا ہے، اسی طرح وہ میرے چاروں طرف فاصلہ رکھ کر گھوم رہا تھا۔ میں بھی اس کے ساتھ ساتھ اس تپائی کو ڈھال بنائے ہوئے گھومتا جا رہا تھا۔ بہت محتاط تھا کسی وقت بھی وہ حملہ کرتا تو میں تپائی کے ذریعے اسے روک سکتا تھا۔

لیڈی آرپار نے اپنے کتے کو غصے سے مخاطب کیا "یو سپرمین! یہ کیا ہو رہا ہے؟ حملہ کیوں نہیں کرتے ہو؟ کم آن۔ جمپ اپ۔"

اس خطرناک بلڈ ہاؤنڈ نے اپنی مالکہ کے حکم پر ایک چھلانگ لگائی لیکن مجھ پر نہیں، وانڈرمین پر آیا۔ وانڈرمین جیتا ہوا تپائی سے اس کا راستہ روکتا ہوا بیٹھ گیا۔ کتا اپنی چھلانگ کے زور میں اس پر سے ہوتا ہوا دوسری طرف چلا گیا۔ وہ تپائی سے ٹکرایا تھا اور تپائی وانڈرمین کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔

وہ دماغی کام کرنے والا ایک ذہین اور چالاک آفیسر تھا لیکن دشمنوں یا درندوں سے لڑتے وقت حاضر دماغ نہیں رہتا تھا۔ اسے فوراً ہی فرش پر لڑھکتے ہوئے اپنی تپائی کے پاس پہنچنا تھا لیکن وہ بوکھلاہٹ میں مبتلا ہوگیا۔ کتے نے دور جا کر پھر گھوم کر اس پر چھلانگ لگائی۔ اگرچہ وہ عزت علی کا جانی دشمن تھا لیکن اس وقت میرا بھی دشمن تھا لیکن میں اسے اس طرح مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا کہ اصل دشمن لیڈی آرپار فخر کرے۔ میں نے فوراً ہی چھلانگ لگائی اور وانڈرمین کے پاس پہنچ کر اس کتے کی طرف تپائی بڑھائی۔ وہ چھلانگ لگا کر پہنچنے ہی والا تھا۔ میرے سامنے آتے ہی اپنی چھلانگ لگانے والی صلاحیتوں کو بھول گیا۔ اچانک ہی گر پڑا۔ اس کے حلق سے ایسی آوازیں نکلنے لگیں جیسے وہ کسی اندرونی کرب میں مبتلا ہو یا کسی خوف ناک بلا کے سامنے آگیا ہو۔ وہ گرا پھر گرتے ہی تڑپ کر اُٹھا اور وہاں سے پلٹ کر دور چلا گیا۔

میں حیرانی سے اس خطرناک کتے کو دیکھنے لگا۔ وہ دور جا کر اپنی دونوں ٹانگیں آگے کی طرف بڑھا کر اپنے جسم کو کھینچ رہا تھا۔ پیچھے کی طرف بیٹھ رہا تھا۔ اپنا سر جھکا رہا تھا۔ میں حیران ہو کر سوچنے لگا "آخر کیا بات ہے؟ کیا میں کوئی غیر معمولی انسان ہوں کہ کتا میرے قریب آتے ہی کھڑک جاتا ہے؟"

مجھے یوں لگا جیسے منجالی کے زہر! اس کی حرارت نے مجھے غیر معمولی بنادیا ہے۔ تب مجھے خیال آیا۔ رسونتی نے بار ہا کہا تھا کہ مجھ میں غیر معمولی تبدیلی آئی ہے۔ ایسی تبدیلی جس کی تفصیلات لفظوں میں بیان نہیں کی جاسکتی۔ بس اتنا کہا جاسکتا ہے کہ میرے اندر ایک زہریلی کشش پیدا ہوگئی ہے۔

یہ ایک عورت کا خیال تھا۔ ایک بیوی کے سچے تاثرات تھے۔ جب سے رسونتی نے منجالی کے حوالے سے مجھے غیر معمولی کہا تھا، تب ہی سے میں نے اس مسئلے پر غور کرنا شروع کیا تھا۔ اکثر میں نے دیکھا تھا، جو لوگ مجھ سے مصافحہ کرتے تھے تو میرا ہاتھ تھام کر چونک جاتے تھے۔ منجالی ایک عورت ہے اور مجھ جیسے مرد سے پہلے بھی متاثر تھی اور ملنے کے بعد تو اس حد تک متاثر تھی کہ میرے قدموں کی خاک بنی رہتی تھی لیکن میں ایک مرد ہو کر بڑی حد تک اس سے متاثر ہو رہا تھا۔ خربوزے سے خربوزے کا رنگ پکڑنا ثابت ہو رہا تھا۔ اس کی حرارت مجھ میں اس حد تک آگئی تھی کہ ایک کتا میلوں دور سے نہ سہی چند قدم کے فاصلے پر مجھے غیر معمولی سمجھ کر مجھ سے بدک رہا تھا ــــ میں زہریلا نہیں تھا۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ وہ زہریلی حرارت دن رات میرے ساتھ رہی تو میرا کیا بنے گا۔

وہ بلڈ ہاؤنڈ اپنی جگہ سے اُٹھ گیا۔ مجھ سے ایک طویل فاصلہ رکھتے ہوئے، ایک لمبا چکر کاٹتے ہوئے دوڑتے ہوئے اپنی مالکہ کی طرف جانے لگا۔ زینے پر اچھلتا ہوا، چڑھتا ہوا اس حسینہ کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے قدموں میں لوٹنے لگا۔ لیڈی آرپار نے اس کی زنجیر کو تھام کر اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر پوچھا "کیا بات ہے۔ تم اس پر حملہ کیوں

نہیں کرتے؟"

اس کی بات ختم ہوتے ہی بند دروازوں کے پیچھے سے ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے کچھ لوگ وہاں لڑ جھگڑ رہے ہوں۔ ہم آواز کی سمت بند دروازوں کو دیکھنے لگے۔ کبھی کبھی ایسی آواز بھی آتی تھی، جیسے کراٹے کا حملہ کرنے سے پہلے دہشت زدہ کر دینے والی آواز حلق سے نکالتے ہیں۔ میں تیزی سے چلتا ہوا دروازے کی طرف گیا پھر ایک دروازے کو کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی کوئی شخص مجھ پر آپڑا۔ میں اسے نہ سنبھالتا تو شاید اس کے ساتھ خود بھی فرش پر گر پڑتا۔ میرے ہاتھ سے تپائی چھوٹ گئی تھی۔ میں نے دیکھا، وہ شخص زخمی تھا اور وانڈرمین کا آدمی تھا۔ اسی لمحے ایک نوعمر لڑکی جمناسٹک کا کرتب دکھانے کے انداز میں ہوائی قلابازیاں کھاتی ہوئی اس کمرے میں آ کر دونوں پاؤں پر کھڑی ہوگئی۔ وہ نیما تھی۔

وانڈرمین کے باقی تین آدمی بھی بُری طرح سہمے ہوئے انداز میں چیختے چلاتے کمرے کے اندر آئے۔ ان کے پیچھے وہ تینوں ملایائی فائٹر تھے جنھوں نے ائیرپورٹ پر میری جان بچائی تھی اور میرے محافظ بن کر رہے تھے۔ وہ تینوں ان لوگوں کی پٹائی کر رہے تھے۔ وہ مار کھا رہے تھے لیکن ان میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ جوابی حملے کر سکتے۔ اچانک ہی وانڈرمین نے للکار کر کہا "خبردار، کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے ورنہ گولی ماردوں گا۔"

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وانڈرمین قالین کے اس حصّے کے پاس پہنچ گیا تھا جس کے نیچے میں نے ریوالور چھپائے تھے۔ اس کے دونوں ہاتھ میں دو ریوالور تھے۔ اسے دیکھتے ہی سب اپنی اپنی جگہ رُک گئے۔ ایک ریوالور کا رُخ ہم سب کی طرف تھا۔ دوسرے ریوالور کا رُخ لیڈی آرپار کی جانب تھا۔ پہلے اس نے نیما کو دیکھتے ہوئے پوچھا "تم سب یہاں کیسے داخل ہوئے جب کہ باہر خطرناک قسم کے کتے ہیں؟"

نیما نے ملایائی زبان میں جواب دیا۔ جس کا ترجمہ میں اس کے دماغ سے سمجھ رہا تھا۔ اس نے کہا "باہر جتنے بھی کتے ہیں وہ زہریلا گوشت کھا کر ہمیشہ کے لیے آرام کر رہے ہیں۔"

وانڈرمین نے لیڈی آرپار کو دیکھتے ہوئے شدید نفرت سے کہا۔ "یُو بِچ لیڈی! میں نے تمھارے جیسی ذلیل عورت زندگی میں کبھی نہیں دیکھی۔ میں نے تمھارے لیے انٹرپول جیسے بین الاقوامی ادارے سے غداری کی۔ اس خیال سے تمھارے اشاروں پر ناچتا رہا کہ ایک دن تم میری بن جاؤ گی لیکن آج تم نے مجھ پر اپنا کتّا چھوڑ دیا۔ میں تمھیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

یہ کہتے ہی اس کی انگلی ٹرائیگر پر دب گئی لیکن میں نے نشانہ بھٹکا دیا۔ میرا دل بڑا کمزور ہے۔ میں اتنی حسین و جمیل عورت کو اپنی آنکھوں کے سامنے مرتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اسی وقت اس حسینہ نے کتے کی زنجیر چھوڑ دی۔ وہ غراتا ہوا، بھونکتا ہوا تیزی سے دوڑتا ہوا وانڈرمین کے پاس آیا۔ پھر اس نے چھلانگ لگائی۔ اس کے ساتھ ہی دوسری بار فائر ہوا اور وہ کتا فضا میں چھلانگ لگانے کے ساتھ ہی زمین پر آ گیا۔

وانڈرمین دوبارہ اس حسینہ پر گولی چلا سکتا تھا۔ میں نے کتے کے چھلانگ لگانے کے دوران موقع سے فائدہ اٹھا کر وانڈرمین کے دماغ میں دہشت پیدا کر دی۔ گولی تو اس نے چلائی جو صحیح نشانے پر پہنچی۔ اُدھر کتا گرا۔ اِدھر یہ تھرتھرا گیا۔ اس کے دماغ میں یہ تصور قائم ہوا کہ وہ خطرناک کتا اس پر کود رہا ہے۔ اس کے دونوں ہاتھوں سے ریوالور گر پڑے۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے دیوار سے جا کر لگ گیا۔

جب اس نے دیکھا کہ اس پر دہشت طاری ہوئی تھی کتا اس سے ذرا دور گر پڑا ہے اور تڑپ تڑپ کر جان دے رہا ہے تو وہ فوراً ہی سنبھل گیا۔ سب سے پہلے اس نے قالین پر پڑے ہوئے دونوں ریوالوروں کی جانب دیکھا لیکن اُدھر بڑھتے ہی اچانک کہیں سے فائرنگ ہوئی۔ وہ پھر اچھل کر پیچھے چلا گیا۔ ہم سب نے آواز کی سمت دیکھا۔ زینے کی بلندی پر لیڈی آرپار کے پیچھے ایک قد آور شخص کھڑا ہوا تھا۔ اس نے اپنے آدھے چہرے پر ایک رومال باندھ رکھا تھا۔ صرف آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا "نیما! وہ دونوں ریوالور اُٹھا لو۔"

وہ دوڑتی ہوئی آئی۔ پھر اس نے دونوں ریوالور اٹھا لیے، اپنے ساتھیوں کے پاس آ کر کھڑی ہوگئی۔ لیڈی آرپار زینے کی ریلنگ سے ٹیک لگائے سر اُٹھائے آنے والے کو دیکھ رہی تھی۔ آنے والے نے کہا "یُو بِچ لیڈی! تم مجھے میری آواز سے پہچان گئی ہو اور وانڈرمین نے بھی سمجھ لیا ہے۔ آج تم دونوں کی زندگی کی آخری رات ہے۔"

یہ کہتے ہی اس نے اپنے چہرے پر سے رومال کو ہٹا دیا۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ میرے سامنے زینے کی بلندی پر عزّت علی کھڑا ہوا تھا۔ انٹرپول کا چیف فلائنگ آفیسر عزّت علی۔

لیڈی آرپار اور وانڈرمین حیرانی سے کبھی میری طرف دیکھ رہے تھے کیوں کہ اینٹی میک اپ کیمرے نے مجھے عزّت علی ثابت کیا تھا۔ دوسری طرف آنے والے کا لب ولہجہ، اس کا انداز اس کا اسٹائل بتا رہا تھا کہ وہ بھی عزّت علی ہے۔

حقیقت کو میں سمجھ رہا تھا کیوں کہ میں! آخر میں تھا اور میرے سامنے حقیقتاً عزّت علی تھا لیکن یہ حیرت کی بات تھی کہ مردہ، زندہ کیسے ہوگیا تھا؟

ٹیلی پیتھی کے ساحر فرہاد علی تیمور کی دلچسپ اور مقبول سرگزشت کے باقی واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے

حبیب اشعر دہلوی

حبیب اشعر دہلوی، زباں پہ بار بخدا یا یہ کس کا نام آیا ـــــ ان کی ادبی خدمات محتاجِ بیان نہیں۔ انہوں نے اردو زبان میں اپنی بے شمار تخلیقات پیش کرنے کے ساتھ ساتھ عربی کی بہترین کہانیاں اور افسانے بھی اردو داں طبقے سے متعارف کرائے ہیں۔ یہ اتنا بڑا کام ہے جو بعض ادارے بھی نہیں کر پاتے۔ اس ماہ ہم ان کی ایک ایسی ہی کہانی سے سسپنس کی زینت میں اضافہ کر رہے ہیں جسے انہوں نے عربی سے اردو میں منتقل کیا ہے۔ کہانی کے مصنف سید مصطفیٰ لطفی المنفلوطی بھی عربی ادب کی مشہور شخصیت ہیں۔ ان کے کئی افسانے، کہانیاں اور ناول اردو میں بھی ترجمہ ہو کر شائع ہو چکے ہیں۔

**ایک ایسی عربی کہانی جس میں ہر دور کے انسانوں کے لیے عبرت کا سامان ہے**

**پچھلی** گرمیوں میں، میں نے ایک خواب دیکھا۔ جیسے میں ایک بہت بڑے شہر میں ہوں لیکن اس شہر کا نام کیا ہے؟ وہ دنیا کے کس خطے میں آباد ہے؟ اور اس کے رہنے والے ـــــ تاریخ کے کس دور میں زندگی بسر کر رہے ہیں؟ یہ کچھ معلوم نہیں۔ چند گھنٹے میں اِدھر اُدھر پھرتا رہا اور دیکھا کہ ہر نسل اور ہر قوم کے ہزارہا انسان ہیں، جو بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے ہیں۔ میں نے خیال کیا کہ کرۂ ارض نے سمٹ سمٹا کر ایک شہر کا روپ دھار لیا ہے اور ایک شہر نہیں، بلکہ پوری دنیا، مشرق سے لے کر مغرب تک میری نگاہوں کے سامنے ہے۔

کہیں رکتا، کہیں ٹھٹکتا، میں چلتا رہا۔ ابھی اس سڑک پر ہوں، ابھی اس بازار میں یہاں تک کہ ایک بہت بڑی عمارت کے پاس پہنچا جس سے زیادہ عالیشان اور جس سے زیادہ پُرشکوہ عمارت آج تک میری نظر سے نہ گزری تھی۔ دروازے پر خلقت کا اژدہام تھا اور اندر صحن میں سپاہی کمر سے تلواریں لٹکائے پہرا دے رہے تھے۔ میں نے ایک شخص سے پوچھا۔ "یہ عمارت کیا

ہے؟ اور اس کے دروازے پر بھیڑ کیسی ہے؟"

اس کے جواب سے معلوم ہوا کہ یہ عمارت بادشاہ کا محل ہے آج کا دن شاہی دربار کا دن ہے جس میں جہاں پناہ لوگوں کے مقدمات کا فیصلہ اور ان کے باہمی جھگڑوں کا تصفیہ فرمائیں گے تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ نقیب نے آواز لگائی "دربار شروع ہو رہا ہے۔ جسے دیکھنا ہو اندر آ جائے۔"

یہ سنتے ہی ہجوم سیلاب کی طرح بہنے لگا۔ لوگوں کے پیچھے پیچھے میں بھی اندر داخل ہوا اور سب سے آخری قطار میں بیٹھ گیا۔ عالم پناہ، صحن کے وسط میں ایک تختِ زرنگار پر جلوہ افروز تھے، جس کی چمک آفتاب کو شرما رہی تھی۔ دائیں جانب ایک صاحب اونی جبہ پہنے بیٹھے تھے اور بائیں جانب ایک بزرگ قبا میں لپٹے تشریف فرما تھے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ جبے والے صاحب گرجا کے کاہن ہیں اور قبا والے بزرگ شہر کے قاضی۔ بادشاہ سلامت کے سامنے ایک کاغذ رکھا تھا جسے وہ بڑے غور سے ملاحظہ فرما رہے تھے۔ تھوڑی دیر تک حضور اس کاغذ پر جھکے رہے پھر فرق مبارک اٹھا کر فرمایا "مجرموں کو حاضر کیا جائے۔"

صحن کے بائیں سمت قید خانہ تھا۔ یہ فرمان فضا میں گونجتے ہی اس کا دروازہ کھلا، جیسے شیر کا دہانہ کھلتا ہے اور سپاہی ایک بڈھے کھوسٹ کو دھکیلتے ہوئے باہر لائے جو قدم قدم پر مارے ضعف کے ڈھیر ہوا جاتا تھا۔

معدلت پناہ نے انتہائی حقارت و کراہت کے ساتھ فرمایا "اس کا جرم کیا ہے؟"

کاہن نے عرض کی "یہ چور ہے جہاں پناہ! اس نے کلیسا میں گھس کر آٹے کی ان بوریوں میں سے ایک بوری چرائی ہے جو فقیروں اور مسکینوں کے لیے جمع کی گئی تھیں۔"

مجمعے میں ایک کھلبلی سی مچ گئی اور وہ چلایا۔ "لعنت ہو اس کمینے مجرم پر یہ اللہ کے گھر سے اللہ کا مال چراتا ہے۔"

اس کے بعد گواہ طلب کیے گئے اور کلیسا کے پادریوں نے اس کے خلاف گواہی دی۔ جہاں پناہ تھوڑی دیر تک کاہن سے سرگوشی فرماتے رہے، پھر گرجے "اسے مقتل میں لے جا کر پہلے اس کے دونوں ہاتھ پاؤں کاٹو اور پھر بائیں۔ اس کے بعد اس کی گردن اڑا دو اور اس کے جسم کی تکا بوٹی کر کے چیلوں گدھوں اور بھوکے درندوں کے لیے پھینک دو۔"

بوڑھا معدلت پناہ کے حضور جھک گیا اور رحم طلبی کے لیے اپنا لرزتا ہوا کمزور ہاتھ اس کی طرف بڑھایا لیکن سپاہیوں نے اس کے منہ پر ایک مکا مارا اور گھسیٹتے ہوئے قید خانے کی طرف لے گئے۔

اس کے بعد وہ ایک اٹھارہ سال کے نوجوان کو لے کر آئے جس کا چہرہ زرد اور جسم نحیف و نزار تھا اور وہ مارے خوف کے کانپ رہا تھا۔ سپاہیوں نے اسے بادشاہ سلامت کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا اور شاہی آواز فضا میں گونجی "اس کا جرم بتایا جائے؟"

ایک نے کہا "یہ قاتل ہے۔ ایک سرکاری افسر لگان وصول کرنے اس کے گاؤں گیا اور اس سے رقم کا مطالبہ کیا۔ لیکن اس نے نہایت بدتمیزی اور گستاخی کے ساتھ انکار کر دیا۔ افسر نے اسے لعنت ملامت کی، جس پر شدتِ غضب سے بے آپے ہو گیا۔ اس نے اپنی نیام سے تلوار کھینچ لی اور ایک ہی ہاتھ میں افسر کا کام تمام کر دیا۔"

لوگ چیخے "اف، کتنے شرم و خوف کی بات ہے، جس نے بادشاہ کے کسی نائب کو قتل کیا، اس نے گویا خود بادشاہ کو قتل کیا۔"

اس کے بعد مقتول افسر کے سپاہی آئے اور باری باری شہادت دی۔ شاہ عدل گستر نے تھوڑی دیر کے لیے فرق مبارک جھکایا اور اس کے بعد منہ اونچا کر کے فرمایا "مجرم کو مقتل میں لے جا کر درخت کی شاخوں پر سولی دے دو۔ اس کے بعد اس کی ساری رگیں کاٹ ڈالو، تاکہ اس کے جسم میں خون کا ایک قطرہ باقی نہ رہے۔"

نوجوان کے منہ سے بے اختیار ایک چیخ نکل گئی۔ جسے سپاہیوں کے بے درد ہاتھوں نے پورا نہ ہونے دیا اور وہ اسے واپس قید خانے میں لے گئے۔

زیادہ دیر نہ گزری تھی، سپاہی ایک حسین دوشیزہ کو لیے مرگ وبلا کے اس خوفناک غار سے نکلے۔ لڑکی واقعی حسن و رعنائی کا ایک تابناک ستارہ تھی اگر اس کی پیشانی پر رنج و مایوسی کا خاکستری بادل نہ چھایا ہوتا۔ دولت پناہ نے دریافت فرمایا "اس نے کیا جرم کیا ہے؟"

قاضی نے عرض کی "یہ زانیہ ہے۔ کل اس کا ایک رشتے دار جب اس کے پاس پہنچا تو یہ ایک نوجوان کے ساتھ تنہائی میں بیٹھی تھی۔ وہ نوجوان اس کا عاشق تھا اور اس واقعے سے پہلے اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا۔"

مجمع غصے سے بے قابو ہو کر چلّایا "اسے جان سے مار دو۔ اسے سنگسار کر دو، اس نے بہت بڑا جرم کیا ہے۔ اس نے بہت بڑی خیانت کی ہے۔"

بادشاہ سلامت نے فرمایا "گواہ کہاں ہے؟"

دوشیزہ کا وہ رشتے دار حاضر ہوا جس نے اس جرم کا انکشاف کیا اور اس کے خلاف شہادت دی۔ قاضی نے تھوڑی دیر تک

بادشاہ سے سرگوشی کی اور اس کے بعد جہاں پناہ کی زبانِ عدل ترجمان نے سزا کا اعلان کیا۔

"اس لڑکی کو مقتل میں لے جاؤ اور سنگسار کردو ـــــــ اس طرح کہ نہ اس کے گوشت پر کھال باقی رہے، نہ اس کی ہڈیوں پر گوشت۔"

حاضرین میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ انھوں نے بادشاہ کے انصاف و تدبر پر حیرت اور اس کی سطوت و شوکت پر احترام و تعظیم کا اظہار کیا پھر بادشاہ اس کے قاضی اور کاہن کے حق میں دعائیہ نعرے لگائے۔

شاہ دادگستر اٹھے تو سارا مجمع کھڑا ہو گیا۔ اور ان کے تشریف لے جانے کے بعد لوگ بھی خوشی خوشی اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔

جب وہاں کوئی نہ رہا تو میں بھی اپنے دل میں رنج و غم کا بوجھ لیے اس عمارت سے نکلا۔ میرا دماغ ان عجیب و غریب فیصلوں میں الجھا ہوا تھا جن میں ملزموں کو صفائی کا کوئی موقع نہیں دیا گیا، ان کے دشمنوں کے سوا اور کسی کو شہادت میں طلب نہیں کیا گیا۔ اور جرم و سزا میں تناسب کا رتی بھر لحاظ نہیں رکھا گیا، سب سے زیادہ تعجب مجھے اس پر تھا کہ لوگ زبردست قوت کے سامنے اطاعت و کمزوری کی کیسی تصویریں بن جاتے ہیں۔ اس کی تقدیس و تعظیم میں کیسے غلو سے کام لیتے ہیں۔ اس پر کیسا آنکھیں بند کرکے اعتماد کرتے ہیں اور اس کے ہر حکم کے آگے کس طرح سر جھکا دیتے ہیں۔ اس سے بے پروا کہ وہ حکم انصاف پر مبنی ہو۔ یا نا انصافی پر، اس میں رحمت و شفقت پائی جاتی ہو یا سنگ دلی و بے دردی۔ میں اپنے دل سے بار بار کہہ رہا تھا،

"کاش، میں جان سکتا کہ اس ہجوم میں کیا ایک بھی چور یا قاتل یا زانی نہ تھا جو ان قسمت کے ماروں کی مجبوری کو محسوس کرکے ان پر ترس کھاتا، ان کے جرائم کو بھی اسی نظر سے دیکھتا جس نظر سے وہ اپنے جرم کو دیکھتا ہے اور ان کے لیے بھی اسی رحم و درگزر کا امیدوار ہوتا جس رحم و درگزر کی امید وہ اپنے لیے کرتا؟ اگر وقت کے ہاتھوں اسے بھی ان بدنصیبوں کی طرح، انھی کے سے ججوں کے سامنے مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا ہونا پڑتا۔

کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ زانیہ درحقیقت زانیہ نہ ہو؟ کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ قاتل نے اپنی عزت اور اپنے مال کو بچانے کے لیے قتل کیا ہو؟ اور کیا اس کا امکان نہیں ہے کہ چور نے اپنے گھر والوں کے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے چوری کی ہو؟

کیا بادشاہ نے اپنی زندگی میں ایک دفعہ بھی قتل کے جرم کا ارتکاب نہیں کیا کہ وہ قاتلوں کے جرائم پر غور کرتے وقت رحم و ہمدردی سے کام لے سکتا؟ کیا ایک بھی ناجائز دینار کسی دن کاہن کے ہاتھ نہیں لگا کہ اپنے کلیسا کی ویرانی ہوئی یورش پر اس کے غم و افسوس کی آگ دہکی پڑ سکتی اور وہ چور کے اس فعل کو معاف کرسکتا؟

کیا اپنی زندگی میں ایک بار بھی قاضی کے قدموں میں لغزش نہیں ہوئی کہ وہ بدکاری کے گڑھے میں گرنے والے مردوں اور رسوائی کے جال میں پھنسنے والی عورتوں کے خلاف اپنے شعلۂ غضب کو ٹھنڈا کرسکتا؟

یہ ان کرسیوں پر بیٹھے ہوئے لوگ کون ہیں؟ جو زیردستوں کے جان و مال پر جس طرح چاہتے ہیں، حکم چلاتے ہیں۔ اپنی مرضی سے انسانوں میں خوش بختی اور بدبختی تقسیم کرتے ہیں۔

یہ نہ معصوم نبی ہیں، نہ پاک فرشتے، اور نہ ان کے ہاتھوں میں اللہ تعالیٰ کا عطا کیا ہوا کوئی اختیار نامہ ہے کہ یہ اس کے بندوں کی دیکھ بھال کریں، ان کے جھگڑے اور نصیب ان میں بانٹیں؟ پھر یہ کس حق کی بنا پر اس طرح اکڑے بیٹھے ہیں اور یہ اقتدار انھوں نے کون سی قوت سے حاصل کیا ہے، کہ یہ تمام انسانوں سے بڑھ کے ہو گئے؟

کون ہے بادشاہ؟ کیا وہ دنیا کا سب سے ظالم انسان یا کسی ایسے جابر ظالم کی اولاد نہیں ہے، جس نے اپنے جبر و قہر سے لوگوں کی گردنوں اور کندھوں کو سیڑھی بنایا اور اس پر چڑھ کر تختِ حکومت پر جا براجمان ہوا؟

کون ہے کاہن؟ کیا وہ دنیا کا سب سے زیادہ عیار اور سب سے زیادہ مکار انسان نہیں ہے، جس نے کمزور روحوں اور بیمار دلوں کی جیب پر ڈاکے ڈالے ہیں؟ کون ہے قاضی؟ کیا وہ دنیا کا سب سے زیادہ نفس پرست انسان نہیں ہے جو حق کو باطل کا لباس پہنا دیتا ہے اور باطل کو حق کا؟ ظالم اور جابر، چور اور ڈاکو آخر نیکوکار اور پرہیزگار کب تھے؟ کتنی عجیب بات ہے کہ اگر ایک شخص اپنی شرافت و ناموس کو خطرے میں دیکھ کر مشتعل ہو جاتا ہے اور اس اشتعال میں توہین کرنے والے کو قتل کر دیتا ہے تو اسے مجرم کہا جاتا ہے، لیکن جب بادشاہ قاتل کو قتل کراتا ہے، تو اسے انصاف پرور کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اگر چرانے والا اپنا یا اپنے بال بچوں کا پیٹ بھرنے کے لیے لقمہ چراتا ہے، تو اسے چور کہتے ہیں۔ لیکن جب قاضی اس کے ہاتھ پاؤں اور ناک کان کاٹنے کا حکم دیتا ہے، تو اسے صاحب الرائے کے تمغۂ امتیاز سے سرفراز کیا جاتا ہے۔ اگر عورت کبھی مرد کے دھوکے میں آکر اور کبھی شیطان کی وسوسہ اندازی کے جال میں پھنس کر رسوائی کے چہ بچے میں گرتی ہے، تو اس پر لعنت ملامت کی بوچھار کی جاتی ہے۔ لوگوں کو اس کی صورت بھی گھناونی نظر آتی ہے لیکن جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ اسے برہنہ کرکے کسی چیز سے باندھ رکھا ہے اور اس پر ہر طرف سے پتھر برسائے جا رہے ہیں تو یہ منظر انھیں بہت خوش آئند معلوم ہوتا ہے اور وہ اس کی سزا و انجام سے بہت مسرور ہوتے ہیں۔

جس طرح آگ کو آگ سے نہیں بجھایا جاسکتا' جس طرح زہر پینے والے کو اور زہر پلا کر زندگی نہیں بخشی جاسکتی اور جس طرح دایاں ہاتھ کٹنے والے کا علاج بایاں ہاتھ کاٹ کر نہیں کیا جاسکتا اسی طرح برائی کو برائی سے دور نہیں کیا جاسکتا' مصیبت کو مصیبت سے نہیں مٹایا جاسکتا۔

میں اپنے دل سے اسی طرح کی باتیں کرتا چلا جارہا تھا کہ رات ہوگئی اور میرا گزر ایک ایسے تاریک و وحشت ناک میدان کے قریب سے ہوا، جس کی فضا میں پرندوں کے غول منڈلا رہے تھے۔ میں اسی میدان میں ہولیا اور چلتے چلتے اس کے بالکل وسط میں پہنچ گیا۔ جہاں میری آنکھوں نے ایک ایسا خوفناک منظر دیکھا کہ اس کا اثر آج بھی میرے دل پہ طاری ہے۔

بوڑھے کا بے سر و پا جسم خاک و خون میں تھڑا پڑا تھا۔ اس کا سر اور ہاتھ پاؤں چاروں طرف اس طرح بکھرے ہوئے تھے گویا نوحہ گر عورتیں اس کے گرد حلقہ کیے اس پہ ماتم کر رہی ہیں۔ نوجوان ایک گھنے درخت میں اس طرح لٹکا ہوا تھا، گویا اسی کی ایک شاخ ہے۔ اس کی رگوں کا ایک ایک قطرۂ خون بہہ چکا تھا اور وہ ایسا معلوم ہورہا تھا، جیسے مٹی ہوئی پرچھائیں۔ یا گزرا ہوا خیال۔ نوجوان دوشیزہ گوشت کا ایک لوتھڑا تھی۔ جس کا نہ سر دکھائی دیتا تھا، نہ پاؤں' اور چاروں طرف اس کے خون میں رنگے ہوئے سنگ ریزوں کے ڈھیر لگے تھے اور ان تینوں لاشوں کے قریب ہی ایک گڑھا خون سے لبریز تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ انہی بے گناہوں کا خون ہے اور مجھے محسوس ہوا کہ ایک سیاہ پردہ آہستہ آہستہ میری آنکھوں پہ پڑتا جارہا ہے' یہاں تک کہ ہر چیز میری نگاہوں سے اوجھل ہوگئی اور میں بے ہوش ہوکر زمین پر گر پڑا۔ جب مجھے ہوش آیا' تو رات کا ایک حصہ گزر چکا تھا۔ میں نے آنکھیں کھولیں' ایک سیاہ سایہ آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہا تھا' میں اسے دیکھ کر ڈر گیا اور ایک درخت کے تنے کے پیچھے جا چھپا۔ لیکن وہ سایہ برابر آگے بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ میرے قریب پہنچ کر اس نے ایک چھوٹا سا چراغ جلایا جو اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس چراغ کی روشنی میں پتا چلا کہ وہ ایک سفید بالوں والی بوڑھی عورت تھی' جس کے کپڑوں اور ظاہری حالت سے غربت اور محتاجی ٹپک رہی تھی۔ اس نے ایک ایک چہرے کو غور سے دیکھا' پھر بوڑھے کی لاش کے قریب پہنچ کر تھوڑی دیر اس پہ جھکی ماتم کرتی رہی اور اس کے بعد ——— اس کے سر اور ہاتھ پاؤں کی طرف گئی' انہیں جمع کیا اور بوڑھے کے جسم سے جوڑ دیا پھر درخت کے نیچے ایک گڑھا کھود کر اسے دفن کردیا اور اس کی قبر کے پہلو میں کھڑے ہوکر الوداعی انداز میں کہنے لگی۔

"اے مظلوم شہید! تو نے میری اور اپنی بدنصیب اولاد کی راہ میں جو مصیبت اٹھائی' وہ گویا خدا کی راہ میں اٹھائی۔ وہ روح جس نے تیرے جسم سے پرواز کی ہے اور وہ جسم جو تیری قبر میں سمایا ہے اللہ کی حمایت و حفاظت کے سائے میں ہیں۔ تو سب شوہروں سے اچھا شوہر اور سب سرپرستوں سے اچھا سرپرست تھا۔ تیری زبان اور تیرے ہاتھ ان سب سے زیادہ پاک اور تیرا دل اور تیری روح ان سب سے زیادہ شریف تھے۔ جا اپنا صلہ پانے کے لیے اپنے پروردگار کے پاس جا اور اس سے تمام انسانوں' یہاں تک کہ اپنے قاتلوں اور ظالموں کے لیے بھی رحمت و مغفرت طلب کر' میری بھی خدا سے دعا ہے کہ وہ مجھے بہت جلد تجھ سے ملادے کیوں کہ تیری جدائی کے بعد میرے لیے صبر و تشفی کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ہے تجھ سے ملنے کی امید۔"

اس کے گریہ و ماتم پر میں رو پڑا اور اس دل دوز منظر نے مجھے بے حد صدمہ پہنچایا۔ میرے دل نے کہا کہ یہ جو کچھ کہہ رہی ہے، سچ کہہ رہی ہے اور بوڑھا یقیناً عدالتی فیصلے کا شہید ہے۔ میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ اس کا قصہ سنوں۔ چنانچہ میں درخت کی آڑ سے نکل کر اس کی طرف چلا۔ پہلے تو وہ مجھے دیکھ کر ڈری لیکن فوراً ہی سنبھل گئی' گویا اسے یاد آگیا کہ جو مصیبت اس پہ نازل ہوچکی ہے۔ اس کے مقابلے میں زندگی کے آئندہ مصائب کی کوئی حیثیت نہیں۔ میں نے ایک لمحے کا توقف کیے بغیر اس سے کہا۔

"آپ مجھ سے بالکل خوف نہ کھائیے' میں یہاں نووارد ہوں' نہ اس شہر کے متعلق کچھ جانتا ہوں' نہ اس کے باشندوں کے متعلق۔ میں نے ابھی ابھی آپ کو اس قبر پہ کھڑے نوحہ و ماتم کرتے دیکھا اور میرا دل آپ کے رنج و الم پہ رونے لگا۔ میں آپ کا قصہ سننا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے آپ کے کسی کام آسکوں۔"

میرے یہ الفاظ سن کر وہ آنسوؤں سے رونے لگی۔ اور سسکیاں بھر بھر کے اس نے سنانا شروع کیا۔

"میرا شوہر اپنی زندگی میں کبھی چور نہ تھا' بلکہ اس نے اپنی جوانی اور پختہ عمری کے دن غیر معمولی محنت و مشقت میں بسر کیے۔ وہ ایک لمحے کے لیے چین سے نہ بیٹھا اور ہر وقت اپنی اور اپنے گھر والوں کی روزی کے لیے دوڑ دھوپ کرتا رہتا۔ یہاں تک کہ اس کا بیٹا جوان ہوگیا اور وہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ جس نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے باپ کا بوجھ بٹالیا اور اس کا قوتِ بازو بن گیا۔ لیکن ابھی ہم اس کی امداد و اعانت سے کچھ زیادہ راحت اندوز نہ ہونے پائے تھے کہ موت نے اپنا ظالم ہاتھ بڑھایا' اور ہمارے اس نورِ نظر کو ہم سے چھین لیا' جو اپنے بوڑھے ماں باپ اور چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کی زندگی کا تنہا سہارا تھا۔ اس نے اپنے پیچھے پانچ بچے چھوڑے جن میں سب سے بڑے لڑکے کی عمر دس برس کی ہے۔ دادا کو اب بڑھاپے نے آلیا تھا۔ ان یتیموں کا بوجھ پڑ جانے سے اس کی رہی سہی قوتیں بھی جواب

دے گئیں۔ وہ کام کاج سے بالکل جاتا رہا اور ہم روز بروز بدبختی، فاقہ کشی کے جنگل میں پھنستے چلے گئے۔ ہم ان دنوں جس مصیبت و ہلاکت سے دوچار تھے، اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہیں کبھی اس سے واسطہ پڑ چکا ہو۔ یہاں تک کہ جب ایک دن سورج ہم پہ طلوع ہوا، تو ہمارے ہاتھ بالکل خالی تھے گھر میں کوئی چیز نہ تھی، جس سے ہم اپنے بچوں کا پیٹ بھر سکتے یا کم سے کم انہیں بہلا ہی سکتے۔ یہ دیکھ کر ہمارے اوسان جاتے رہے اور ہم نے سمجھ لیا کہ اگر خدا ہی نے ہم پر اپنی رحمت کا کوئی دروازہ نہ کھولا، تو ہم سب کے سب ہلاک ہو جائیں گے۔ ان حالات میں مجھے کوئی چارہ اس کے سوا نظر نہ آیا کہ میں بھی زندگی کے اسی راستے میں پناہ لوں جہاں ہر مجبور و فاقہ کش پناہ لیتا ہے، چنانچہ میں بھیک مانگنے نکلی لیکن انسانوں کے ہجوم میں مجھے ایک نہ ملا، جو میرے حال پر ترس کھا کر کچھ دے دیتا یا کوئی راستہ ہی بتا دیتا۔ سب سے بڑی بات، جو میرے اور ان کی ہمدردی کے درمیان حائل رہی، یہ تھی کہ نہ میں پیشہ ور گداگروں کی سی گدڑی پہنے تھی اور نہ میرے ہاتھ میں کاسۂ گدائی تھا۔ ناچار میں اپنے گھر واپس ہوئی خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس وقت میرے دل پر رنج و غم کا کتنا بوجھ تھا گھر پہنچ کر میں نے دیکھا کہ معصوم بچے بھوک سے بلک رہے ہیں اور بوڑھا دادا ان کے سامنے بیٹھا کف افسوس مل مل کے زمین پر اپنے آنسوؤں کا چھڑکاؤ کر رہا ہے۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کرے اور انہیں کس طرح بہلائے۔ خدا گواہ ہے، اگر موت اس وقت میرے سامنے مجسم ہو کر آ جاتی تو اس کا منظر میرے لیے ان بچوں کے منظر سے کم ہولناک ہوتا، جو میرے گھر میں داخل ہوتے وقت مجھے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھ رہے تھے اور ان کی نگاہیں میرا طواف کر رہی تھیں کہ میں ان کے پیٹ کی آگ بجھانے کا کیا سامان لے کر آئی ہوں جبکہ میرے پاس ان کے لیے کچھ نہ تھا۔ سوائے ایک قاتل مایوسی اور ایک ہلاکت آفریں پژمردگی کے، چنانچہ میں بوڑھے کے پاس گئی اور اس سے کہا: میں نے سنا ہے کہ شہر کے گرجا میں صدقے کا مال ہے، جو کاہن اعظم فقیروں اور مسکینوں میں تقسیم کرتا ہے۔ اگر تم اس کے پاس جاؤ اور اسے اپنی بپتا سنا کر رحم و ہمدردی کی بھیک مانگو تو امید ہے کہ ہم ان معصوموں کے پیٹ کی آگ بجھا سکیں گے۔ یہ سن کر اس کا چہرہ امید کی روشنی سے چمک اٹھا وہ اپنی لکڑی کے سہارے کھڑا ہوا اور اسے ٹیکتا گرجا کی طرف روانہ ہو گیا۔ کاہن کے حجرے میں پہنچ کر اس نے اپنا سارا دکھڑا رو دیا اور وہ سارے آنسو اس کے قدموں میں بہا دیے، جو زمانے نے اس کی مجروح پلکوں میں باقی چھوڑ دیے تھے۔ لیکن کاہن اس کے ساتھ اسی بدسلوکی سے پیش آیا جس بدسلوکی سے حاجت روا بھکاری کے ساتھ پیش آتا ہے۔ اور بولا گرجا انہی لوگوں کی امداد کر سکتا ہے، جنہوں نے اپنے اچھے دنوں میں گرجا کی امداد کی ہو۔ تم نے چونکہ اپنی فارغ البالی کے زمانے میں گرجا کا کوئی خیال نہیں کیا، اس لیے جاؤ اپنا رستہ لو، رزق کے دروازے تمہارے سامنے کھلے ہوئے ہیں۔ اگر وہ تم پر تنگ ہوں تو جرائم کے دروازے ان سے زیادہ وسیع ہیں ——— وہ رنج و مایوسی کے ہجوم میں کاہن کے حجرے سے نکلا، دنیا اس کی نگاہ میں شکاری کے جال یا بھٹ تیتر کے گھونسلے کی طرح تنگ تھی۔ چلتے چلتے جب وہ گرجا کے صحن میں پہنچا، تو اسے ایک کونے میں آٹے کی بوری نظر آئی۔ اس کے دل نے کہا: یہ بوری لے چل۔ اور اگر وہ مفلسی اور فاقہ کشی کا مارا نہ ہوتا تو اس کا دل اسے ہرگز یہ مشورہ نہ دیتا لیکن غیرت و حیا نے اس کا دامن پکڑ لیا اور وہ بوری کی طرف سے نگاہیں پھیر کر اپنی راہ چلتا رہا۔ یہاں تک کہ جب اس کے قریب پہنچا، تو اس کی نظر دوبارہ اس بوری پر پڑی اور اس کے دل نے پھر وہی مشورہ دیا اس نے پھر اس خیال کو دفع کرنا چاہا لیکن نہ کر سکا۔ اب وہ اس بوری کے پاس بیٹھ گیا اور اپنے دل سے کہنے لگا: یہ آٹا فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہے اور میرے خیال میں مجھ سے زیادہ ضرورت مند اور مجھ سے زیادہ فقیر اس شہر کی چار دیواری میں اور کوئی نہ ہوگا۔ اگر اس بوری کی طمع جرم بھی ہے، تو بھی کاہن نے مجھے زندگی کی راہ میں ارتکاب جرم کی اجازت دے دی ہے۔ اس کے بعد وہ اٹھا اور اس بوری کو اپنی پیٹھ پر لاد کر ہانپتا کانپتا چلنے لگا۔ لیکن وہ ابھی گرجا کے دروازے سے بھی نہ نکلا تھا کہ بوجھ اس کے لیے ناقابل برداشت ہو گیا اور اس نے محسوس کیا کہ وہ چلنے سے عاجز ہے۔ دل نے کہا بوری کو پیٹھ سے اتار پھینکے لیکن فوراً ہی معصوم بچوں کا منظر اس کی آنکھوں میں پھر گیا کہ وہ گھر کی دیواروں کے نیچے بھوک سے بلبلا رہے ہیں اس نے ہمت کی اور آگے بڑھا۔ کبھی لکڑی کا سہارا لیتا اور کبھی دیواروں کا یہاں تک کہ ہمت جواب دے گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ سانس اس کے سینے میں گھٹ کر رہ گیا ہے، نیچے اترتا ہے، نہ اوپر چڑھتا ہے، آنکھوں میں جو رہی سہی روشنی تھی وہ ایک دم بجھ گئی ہے اور اسے اپنے گرد و پیش کی کوئی چیز نظر نہیں آتی سانس کے سینے میں خون نے ایک جوش سا مارا۔ وہ اپنی چادر میں الجھ کر گرا اور گرتے ہی بے ہوش ہو گیا۔ اسی اثنا

## ایک

کنجوس دولت مند کا اکلوتا لڑکا بیمار پڑ گیا تو مسجد کے پیش امام نے مشورہ دیا کہ قرآن مجید ختم کرا دو یا ایک بکرا صدقہ دو۔ اللہ تعالیٰ لڑکے کو شفا دے گا۔

اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا: "بکرا پڑی تو یہاں سے بہت دور ہے۔ کلام پاک ختم کراتے ہیں۔ آپ چند بچے لے آئیے۔"

میں پہرے کے سپاہی ادھر سے گزرے اور انہوں نے اس کو لوری کے پاس بے ہوش پڑے دیکھا تو انہیں کچھ شک ہوا اور ادھر گرجا کے پادری لوری کی بوری جھپٹتے اسے گرجا کے گوشوں میں ڈھونڈنے لگے۔ جب بوری انہیں گرجا میں کہیں نہ ملی، تو وہ مایوس ہو کر اس کی تلاش میں باہر نکلے اور ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس جگہ پہنچ گئے، جہاں پہرے کے سپاہی بوڑھے کے گرد حلقہ کیے کھڑے تھے اور گم شدہ بوری انہیں مل گئی۔ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ بوری گرجا میں تھی اور بڈھا قید خانے میں۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ آپ نے دیکھ ہی لیا افسوس ہے اس پر کہ وہ مظلوم و بے گناہ مارا گیا۔ اب اللہ مجھ پر اور میرے بدقسمت معصوم بچوں پر رحم کرے۔“

یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھی، چادر کے پلو سے آنسو پونچھے اور قبر پر ایک طویل نظر ڈال کر بولی ”الوداع، اے میری جوانی کے رفیق اور میرے بڑھاپے کے سہارے رخصت۔ اے سب سے بہتر شوہر اور سب سے نیک دل ساتھی! اس وقت تک کے لیے رخصت، جب تک خدا آخرت میں مجھے اور تجھے نہ ملا دے۔“

اس کے بعد وہ مڑی اور جس راستے آئی تھی، اسی راستے واپس چلی گئی ابھی اس کا سراپا تاریکی میں تحلیل ہی ہوا تھا کہ میں نے ایک اور سایہ دیکھا، جو اسی جگہ جھلک رہا تھا، جہاں پہلا سایہ اوجھل ہوا تھا۔ وہ سایہ دبے دبے پاؤں میری طرف بڑھنے لگا اور میں درخت کی آڑ میں ہو گیا کہ دیکھوں وہ کیا کرتا ہے؟ چاند نے آہستہ آہستہ کھیت کرنا شروع کر دیا تھا اور اپنی شعاعوں کے ابتدائی تار اس وسیع میدان میں پھیلا دیے تھے۔ میں نے چاندنی روشنی میں اس سائے کو دیکھا کہ وہ ایک حسین، نوجوان لڑکی ہے اور رو رہی ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں آج تک آنسوؤں کو اس کے سے حسین رخساروں پر بہتے نہیں دیکھا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے اپنی آنکھوں کو گردش دی۔ اس لاش پر اس کی نظر پڑی جو درخت کی شاخوں میں لٹکی ہوئی تھی تو وہ اس کی طرف گئی اور ہاتھ بڑھا کر اس رسی کی گرہ کھول دی، جس میں وہ لاش بندھی تھی۔ لاش نیچے گر پڑی جسے اس نے اپنے ہاتھوں پر اٹھایا اور آہستہ سے زمین پر لٹا دیا۔ لاش کے پہلو میں بیٹھ کر وہ تھوڑی دیر تک اسے ساکن و جامد نظروں سے اس طرح گھورتی رہی گویا ہوش و حواس سے عاری ہے۔ اس کے بعد ”ہائے میرے بھائی!“ کا نعرہ لگایا اور اس پر اوندھ کر اسے چمٹانے اور پیار کرنے لگی۔ اس کے بالوں اور پیشانی کو بوسے دینے لگی تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ ایسے ٹھنڈے سانس بھرتی تھی، گویا اس کا دل پگھلا جا رہا ہے انجام کار اس کی طاقت جواب دے گئی کچھ دیر تک تو وہ چکراتی رہی اس کے بعد اس کے پہلو میں بے دم ہو کر گر پڑی جس طرح درخت کا تنا زمین پر گرتا ہے۔ میں ڈرا کہ اسے کوئی ناگوار صورت پیش نہ آ گئی ہو۔ چنانچہ درخت کی آڑ سے نکل کر اس کی طرف چلا اور قریب پہنچ کر دیکھا کہ اس کا سانس آہستہ آہستہ جاری ہے یہ معلوم کر کے کہ وہ زندہ ہے، میں اس کے سرہانے قرآن پڑھنے بیٹھ گیا۔ کبھی اس پر روتا، کبھی اس کے لیے خدا سے دعا مانگتا تھوڑی دیر کے بعد اسے ہوش آ گیا۔ مجھے اپنے قریب دیکھ کر اس نے ایک حیرت ناک نگاہ مجھ پر ڈالی اور میری طرف بڑھ کر کہا۔ ”اجنبی! تم کس پر رو رہے ہو؟“

میں نے کہا۔ ”محترم خاتون! آپ پر اور آپ کے اس غریب اور مصیبت زدہ مرنے والے پر۔“

وہ بولی۔ ”ہاں، یہ غریب اور مصیبت زدہ ہی تھا۔ اس لیے جتنا اس پر رو سکتے ہو، روؤ، یہ جوانی کا سنگھار، زندگی کا حسن، روحوں کے لیے پھول اور دلوں کے لیے سرمایہ قرار تھا، انہوں نے اس کو قتل کر کے اس پر ظلم کیا ہے کیوں کہ نہ یہ قاتل تھا۔ نہ مجرم بلکہ مرد تھا جس نے اپنی آبرو کو ایک ایسے شکاری کے چنگل میں دیکھا، جو اسے پھاڑ کھانا چاہتا تھا اور اس کی طرف بڑھنے والے ہاتھ کو کاٹ کر اپنی غیرت و شرافت کا اس سے انتقام لے لیا۔ اگر وہ اس کے ساتھ انصاف کرتے تو اس پر اور اس کی جوانی پر ترس کھا کر اسے زندہ رہنے دیتے کہ نہ اپنی آبرو کو بچانے والا مجرم ہوتا ہے اور نہ اپنے قاتل کو قتل کرنے والا گناہ گار۔“

”محترم خاتون! کیا آپ مجھے یہ پورا قصہ سنا سکتی ہیں؟“ میں نے کہا۔

کہنے لگی۔ ”ہاں، سنو ایک دن ہمارے گاؤں میں ایک سرکاری افسر آیا، جو لگان وصول کرنے کے لیے پورے ملک کا دورہ کر رہا تھا۔ وہ گاؤں کے ایک ایک گھر میں پہنچا اور جب ہمارے مکان پر آیا تو میں اپنے دروازے پر کھڑی تھی۔ اس نے مجھے کچھ ایسی مشکوک نگاہوں سے دیکھا کہ میرا دل خوف و دہشت سے دھڑکنے لگا۔ اس کے بعد اس نے مجھ سے میرے بھائی کے متعلق پوچھا اور میں نے وہ جگہ بتا دی جہاں وہ تھا۔ اس نے میرے بھائی سے لگان کی رقم طلب کی، میرے بھائی نے اس سے چند دن کی مہلت چاہی اور کہا کہ غلہ کٹتے ہی مال گزاری ادا کر دوں گا۔ لیکن افسر بولا کہ یا تو رقم ابھی ادا کرو یا جتنے دن کی مہلت چاہتے ہو، اتنے دن کے لیے اس لڑکی کو میرے پاس بطور ضمانت رکھو۔“ اس نے میرے متعلق اپنے سپاہیوں کو اشارہ کیا اور سپاہیوں نے چاروں طرف سے مجھے گھیر لیا۔ اس سے پہلے میں ان بدقسمت لڑکیوں کی داستان سن چکی تھی، جو بطور ضمانت شاہی محل میں داخل کی گئی تھیں اور جن میں سے ایک بھی نہ نکلی تھی، جو اپنی عصمت کو بھینٹ چڑھائے بغیر وہاں سے نکل سکی ہو۔ مارے ڈر کے میں اپنے بھائی کی طرف بھاگی اور اس

سے جھپٹ گئی۔ وہ میرے اور افسر کے بیچ میں آگیا اور اس سے بولا۔ "تمہیں اس لڑکی سے کوئی واسطہ نہیں۔ رقم مجھے ادا کرنا ہے، اس لیے میں ہی اس کا ذمے دار بھی ہوں اگر تمہیں ضمانت ہی لینا ہے تو میرے مال کی ضمانت خود مجھ سے لو۔ جب تک لگان ادا نہ ہو، میں تمہارے پاس رہوں گا۔"

افسر نے کہا۔ "مجھے یا رقم چاہیے یا ضمانت اور ضمانت بھی وہ جو میں چاہتا ہوں۔ اگر تم نے انکار کیا تو اس کا بدلہ تمہاری جان ہوگی۔"

افسر کی یہ بات سن کر میرے بھائی کو اتنا غصہ آیا کہ اس کی پیشانی پسینے سے تر ہوگئی۔ میں نے اس سے پہلے کبھی اس کو اتنا غصہ آتے نہیں دیکھا تھا۔ اس نے کہا۔ "اگر یہ بات ہے تو میری شرافت کی قیمت میری زندگی ہوگی۔" یہ کہہ کر اس نے تلوار کھینچی اور ایک ہی ہاتھ میں اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔ وہ اپنی جگہ کھڑا رہا۔ اس کی تلوار سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ آخر کار سپاہیوں نے اسے گرفتار کر لیا اور قید خانے لے گئے۔ یہ ہے اس کی زندگی، جناب! اور یہ ہے اس کی موت۔ اس لیے اگر میں اس کو روتی ہوں، تو اس نوجوان کو روتی ہوں جو ہمت و شجاعت میں تمام نوجوانوں کا سردار تھا، جو باعتبار عزت و غیرت سب لوگوں میں یکتا تھا اور مہربانی و دل سوزی میں تمام بھائیوں سے بڑھ کر تھا۔" اس کے بعد وہ بولی۔ "میں اسے دن نکلنے سے پہلے دفن کر دینا چاہتی ہوں، کیا آپ اس سلسلے میں میری مدد کریں گے۔ میں بہت نڈھال ہوگئی ہوں۔ مجھ سے کچھ کام نہیں ہو سکتا۔"

میں اٹھا اور درخت کے سائے میں بوڑھے کی قبر کے پاس ایک گڑھا کھود کر اسے دفن کر دیا۔ لڑکی قبر کی طرف بڑھی اور اس کے پہلو میں تھوڑی دیر تک سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ رو رہی تھی یا اس کے حواس گم تھے جب وہ اپنی جگہ سے اٹھی تو میں نے دیکھا کہ قبر اس کے آنسوؤں سے تر ہے۔ اس کے بعد اس نے میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ نے ایک ایسے موقع پر میری مدد فرمائی ہے جب کہ لوگ عموماً مدد کرتے ہوئے کتراتے ہیں۔"

یہ کہا اور اپنی راہ چلی گئی۔

میری نگاہ اس کا تعاقب کرتی رہی تاآں کہ اس کی چادر کا آخری گوشہ بھی میری نگاہوں سے چھپ گیا۔ اب جو میں نے اپنے حواس بجا کیے تو دیکھا کہ سنگسار کی ہوئی عورت کی لاش اپنی جگہ پڑی ہے۔ میرے ذہن میں ایک ابال سا پیدا ہوا اور میں نے اپنے دل میں کہا۔ "اگر میں اپنے لیے کسی ٹال کو توشۂ آخرت بنا سکتا ہوں، جو قیامت کے دن مجھے اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے احسان کا امیدوار کر سکے، تو وہ یہ ہے کہ اس غریب عورت کو مٹی میں چھپا دوں۔"

چنانچہ میں نے ان دو شہیدوں کی قبروں کے برابر ایک اور قبر کھودی۔ پھر اس عورت کے جسم پر اپنی چادر ڈالی اور اسے اٹھا کر قبر میں لٹا دیا۔ میں ابھی اس پر مٹی ڈال ہی رہا تھا کہ پشت کی جانب آہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو ایک نوجوان سیاہ چادر میں اس طرح لپٹا کھڑا تھا کہ اس کے چہرے کی سفیدی کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اس نے فوراً مجھ سے سوال کیا۔

"کیوں جناب! یہ کس کی قبر ہے، جس پر آپ مٹی ڈال رہے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "ایک سنگسار کی ہوئی عورت کی۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی کہ میں نے اس کی لاش کو یہاں پڑے دیکھا۔ مجھے اس کے حال پر ترس آیا اور میں نے اس کے لیے یہ قبر کھودی، جو تم دیکھ رہے ہو۔"

"جناب! مجھے اس نوجوان لڑکی سے ایک نسبت ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو اس سے پہلے کہ مٹی اس کے اور میرے درمیان حائل ہو، میں اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت کر دوں۔" نوجوان نے کہا۔

میں نے کہا۔ "بڑے شوق سے۔"

یہ کہہ کر میں تھوڑا سا پیچھے ہٹ گیا۔ نوجوان قبر کے پاس گیا اور اس پر جھک کر دفن ہونے والی سے سرگوشی میں کچھ کہتا رہا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ستارے اس سرگوشی کو آسمانوں میں دہرا رہے ہیں اور ہوائیں اسے فضا میں بکھیر رہی ہیں آخر کار اس کا دل ذرا ٹھہرا، وہ اٹھا اور لاش پر مٹی ڈالنے لگا۔ یہاں تک کہ وہ اس میں چھپ گئی۔ اب وہ میری طرف متوجہ ہو کر بولا۔ "میں آپ کی اس ہمدردی کا بہت ممنون ہوں، جو آپ نے اس مظلوم لڑکی کے لیے روا رکھی۔ آپ نے اس کا ستر ڈھانپا، جسے لوگوں نے کھول دیا تھا اور اس کی حرمت بچائی، جسے لوگوں نے ضائع کر دیا تھا۔ اللہ آپ کو جزائے خیر دے اور جس طرح آپ نے اس پر احسان کیا ہے، وہ آپ پر احسان فرمائے۔"

اس نے واپس ہونا چاہا۔ لیکن میں نے یہ کہہ کر اسے روک لیا۔

"کیا یہ لڑکی واقعی مظلوم ماری گئی ہے، جیسا کہ تم کہتے ہو؟"

اس کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے بڑی پرسکون اور مطمئن نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہاں جناب! اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ مجھے اس کی قبر پر اس طرح ماتم کرتے نہ دیکھتے میں ہی وہ بدنصیب ہوں جس سے یہ متہم کی گئی۔ اور میں آپ سے بھی وہی کہتا ہوں جو قیامت کے دن خدا کے حضور اس کا مقدمہ پیش کرتے ہوئے کہوں گا کہ یہ اس الزام سے بری ہے، جو لوگوں نے اس پر لگایا ہے۔ یہ شبنم آلود پھول سے زیادہ پاک اور شفاف قطرے سے زیادہ صاف ہے۔

میں اس لڑکی کو اس وقت سے چاہتا تھا جب یہ لڑکپن میں ادھر ادھر کھیلتی پھرتی تھی اور اسی طرح یہ بھی مجھ سے محبت کرتی تھی اس کے بعد ہم جوانی کی منزل میں داخل ہوئے اور ہمارے ساتھ ہماری محبت بھی جوان ہوئی۔ اس وقت ہم نے اخلاص و وفا کا پیمان

باندھا اور میں نے اس کے باپ کو شادی کا پیغام دیا جسے اس نے ہنسی خوشی قبول کر لیا۔ لیکن ہماری شادی میں کچھ ہی دن باقی رہ گئے تھے کہ اس کے باپ کو موت نے آلیا اور ہمارا نکاح پورے ایک سال کے لیے ملتوی ہو گیا۔ یہ مدت گزر چکی تھی یا عنقریب گزرنے والی تھی کہ اس لڑکی کو میراث کے کسی معاملے میں قاضیٔ شہر کے پاس جانا پڑا۔ قاضی اسے دیکھتے ہی اس پر ریجھ گیا۔ اور اس کے چچا کے پاس آدمی بھیجا جو باپ کے بعد اس کا ولی تھا۔ یہ شخص ان لالچی اور خوشامدی لوگوں میں سے ہے، جو اگر دوسرے کنارے پر دینار چمکتا دیکھیں تو خون کے دریا میں بھی اترنے سے گریز نہیں کرتے۔ جب اس کے پاس قاضیٔ شہر کا یہ پیغام پہنچا کہ وہ اس کی بھتیجی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ تو وہ پھولا نہ سمایا اور ایک لمحے کا توقف کیے بغیر پیغام قبول کر لیا۔ وہ یہ خوش خبری لے کر لڑکی کے پاس آیا۔ لیکن لڑکی نے ناگوار چہرے کے ساتھ اس کا استقبال کیا اور کہا کہ میں، ایک وقت میں دو مردوں کی منگیتر نہیں ہو سکتی۔ بدبخت چچا نے اس کی بات کی کوئی پروا نہ کی اور کہا "تمہاری شادی ہنسی خوشی ہو یا زور زبردستی سے، ہو گی اسی کے ساتھ جس سے میں چاہوں گا۔ تمہیں اپنے اوپر کوئی اختیار نہیں ہے۔ تمہارا ولی میں اور صرف میں ہوں۔ تھوڑے دنوں کے بعد شادی کی تیاری شروع اور نکاح کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ شادی سے ایک دن پہلے دن ڈوبتے ہی اس نے اپنا زیور اور کپڑے سمیٹے اور رات کی تاریکیوں میں گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔ اس سے بے خبر کہ کہاں جانا ہے اور کس راستے پر چل رہی ہے۔ اس کے چچا نے اس کے بھاگنے کی اطلاع قاضی کو پہنچا دی اور قاضی نے اپنے آدمی اس کی تلاش میں ہر جگہ دوڑا دیے۔ کچھ آدمیوں کو یہ ایک دیوار تلے بیٹھی نظر آئی اور وہ اس کی طرف چلے، انہیں دیکھ کر یہ ڈر گئی اور اپنا تھیلا وہیں چھوڑ چھاڑ تیزی سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ میں اس وقت اپنے گھر واپس جا رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی یہ مجھ سے بولی "وہ میرا پیچھا کر رہے ہیں۔ اگر میں ان کے ہاتھ آگئی تو بے مجھے مار ڈالیں گے۔ مجھ پر رحم کرو۔ اللہ تم پر رحم کرے گا۔"

صورتِ حال کی نزاکت محسوس کرتے ہوئے میں اسے اپنے گھر لے لیا۔ اور ایک کمرے میں چھپا دیا۔ لیکن ابھی ایک گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ اس کا چچا قاضی کے سپاہیوں کو ساتھ لیے میرے گھر میں داخل ہوا۔ اور نہایت سختی سے اس کا مطالبہ کیا۔ میں نے لاعلمی ظاہر کی۔ لیکن اسے میری بات کا یقین نہ آیا اور اس نے ایک ایک کمرے کو اتھل پتھل کرنا شروع کیے یہاں تک کہ اسے پا لیا اور چلایا یہ ہے زناکار لڑکی اور یہ ہے وہ لڑکا! میں نے ایمان کی پوری قوتوں کے ساتھ قسم کھا کر اسے یقین دلایا کہ لڑکی کا دامن اس تہمت سے بالکل پاک ہے لیکن اس نے میری ایک نہ سنی اور سپاہیوں کو اسے پکڑنے کا حکم دیا۔

میں نے ان کا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ لیکن ایک سپاہی نے میرے سر پر اس زور سے ڈنڈا مارا کہ میرے حواس جاتے رہے اور میں بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا۔ ایک گھنٹے کے بعد جب مجھے ہوش آیا تو میرا سارا بدن بخار سے پھنک رہا تھا۔ کچھ دن میں صاحبِ فراش رہا۔ جہاں تھوڑی سی دیر کے لیے ہوش آتا وہ منظر مجسم ہو کر میری آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا۔ مجھے اپنے رگ و پے میں ایک کپکپی سی دوڑتی محسوس ہوتی اور میں پھر غفلت و بے خبری کے عالم میں پہنچ جاتا۔ تاآنکہ اللہ نے مجھ پہ اپنا کرم فرمایا اور میں نے کل اتنا افاقہ محسوس کیا کہ گھر سے نکل سکوں۔ باہر آ کے مجھے معلوم ہوا کہ اس غریب پہ کیا بیت گئی اور جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں اب میں اسے آخری بار الوداع کہنے اور اس کی لاش پہ مٹی ڈالنے یہاں آیا ہوں۔ اس کے بعد میرے لیے زندگی میں کوئی لذت، کوئی حلاوت نہیں رہی اور میں اب جلد سے جلد اس سے جا ملنا چاہتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنی محبوبہ کی قبر پہ ایک طویل نگاہ ڈالی جس کی تہوں میں مایوس نگاہوں کے رنج و غم اور سوزش و بے قراری کا مکمل مفہوم سمٹ آیا تھا۔ اور اپنی راہ چلا گیا۔

وہ تھوڑی ہی دور گیا ہو گا کہ چاند اپنی منزل کی طرف ڈھلنے لگا اور زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ چھپ گیا۔ اب فضا میں تاریکی تھی اور سکون اور میدان وحشت و انقباض کا محشرستان بن گیا تھا۔ میں اٹھا اور ایک اونچی پہاڑی پر چڑھ گیا جو ان تینوں قبروں کو جھانک رہی تھی۔ میں نے اپنی چادر بچھائی اور ایک چٹان پر سر رکھ کر اپنے دل سے باتیں کرنے لگا۔

"افسوس، کیا دنیا میں کوئی منصف اور کوئی رحم دل نہیں رہا اور اگر زمین ان کے وجود سے خالی ہو گئی ہے، تو کیا وہ آسمان پہ بھی نہیں ہیں؟

مجرم تھا وہ مذہبی پیشوا جس نے اس غریب بوڑھے کو اس ایک درہم کے دینے میں بھی بخل سے کام لیا جس سے وہ اپنا اور اپنے اہل و عیال کا پیٹ بھر لیتا۔ پھر جب وہ چوری کرنے پر مجبور ہو گیا تو چور کو تو چوری کی سزا دے دی گئی لیکن سنگ دل کو اس کی سنگ دلی کا کوئی بدلہ نہیں ملا، حالانکہ اگر سنگ دل اپنی سنگ دلی کا اظہار نہ کرتا تو چور کو بھی چوری کرنے کی نوبت نہ آتی۔

مجرم تھا وہ بادشاہ، جس نے اپنے افسر کو ایک آزاد اور پاک دامن لڑکی کی عصمت پر ڈاکا ڈالنے بھیجا اور جب اس کا بھائی اپنی بہن کی عزت خطرے میں دیکھ کر اپنے حواس کھو بیٹھا اور اسی اضطراب و اضطرار میں اس سے قتل کا جرم سرزد ہو گیا تو اس نوجوان کو تو اس جرم کی پاداش میں سولی پہ چڑھا دیا گیا لیکن وہ شخص سزا سے محفوظ رہا جو درحقیقت اس جرم کا بانی مبانی تھا۔

مجرم تھا وہ قاضی، جس نے ایک دوشیزہ پر اس کی مرضی کے خلاف شادی کے لیے دباؤ ڈالا اور جب وہ اپنے گھر سے نکل بھاگنے پر مجبور ہو گئی تو اسے تو اس کے بھاگنے کی سزا مل گئی لیکن قاضی اپنے ظلم و استبداد کی پاداش سے بچ گیا۔

اور اس طرح مجرم بے گناہ ٹھہرا اور بے گناہ مجرم، بلکہ مجرم بے گناہ کا قاضی اور اسے سزا دینے کا حق دار بن گیا۔

"تو کیا آج کے بعد آسمان زمین پر ٹوٹ پڑے گا یا اب بھی اسے اپنے ستاروں سے روشن اور اپنی بارشوں سے شاداب رکھے گا؟"

اس کے بعد میں ان قبروں کی طرف متوجہ ہوا۔ میری نگاہ اس گڑھے پر پڑی جو ان بے گناہوں کے خون سے لبریز تھا اور میں نے دیکھا کہ اس کی سطح پر ایک ستارے کا عکس تملا رہا ہے۔ میں نے اس ستارے کی طرف نظر اٹھائی تو کیا دیکھتا ہوں کہ مریخ جو قدیم یونانیوں کی دیومالا میں لڑائی کا دیوتا کہلاتا ہے، اس طرح شعلہ فشاں ہے، جیسے دشمن کے دل میں غضب و انتقام کا انگارا دہک رہا ہو۔ تھوڑی دیر تک میں اس پر نگاہیں جمائے رہا۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ وہ آہستہ آہستہ اپنی بلندیوں سے نیچے کی طرف آ رہا ہے۔ جتنا جتنا وہ اترتا جاتا تھا ــــ اس کا حجم بڑھتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ جب اس کے اور زمین کے درمیان ایک میل یا شاید اس سے بھی کم کا فاصلہ رہ گیا تو اس میں ایک شدید لرزہ پیدا ہوا اور اس نے ایک عذاب کے فرشتے کا روپ دھار لیا جس کی آنکھوں اور نتھنوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں اور اس کے پروں کی جنبش ان چنگاریوں کو فضا میں اڑا رہی تھی۔ وہ اترتا رہا، اترتا رہا، یہاں تک کہ اس درخت کی پھننگ پر آ بیٹھا، جو ان مظلوموں کی قبروں پر سایہ فگن تھا۔ اس نے اپنے بازو پھڑپھڑائے، جس سے زمین کا گوشہ گوشہ لرز اٹھا اور چاروں طرف روشنی ہو گئی۔ اس کے بعد اس نے ایک ایسی آواز میں جیسے آسمان پر بجلی کڑکتی ہے، کہنا شروع کیا۔

"لوگ پھر اپنی پہلی حالت پر آ گئے ہیں۔ زمین پھر شر و فساد سے بھر گئی ہے اور یہاں ایک بھی ایسی پاک جگہ نہیں رہی جہاں آسمان کا کوئی فرشتہ آ کر ٹھہر سکے۔

طاقت ور اور طاقت ور ہو گئے ہیں۔ کمزوروں پر اور کمزوری چھا گئی ہے۔ فقیروں کے گوشت مال داروں کے پیٹ میں اتر رہے ہیں اور اس پر بھی نہ طاقت ور بس کرتے ہیں نہ مال داروں کا پیٹ بھرتا ہے۔ محتاج بھوک سے مرے جا رہے ہیں لیکن کوئی ان کی ہمدردی کرنے والا نہیں۔

حکام نے اللہ سے کیا ہوا عہد توڑ دیا ہے۔ وہ تلواریں نیام میں کر لی ہیں جو اللہ نے حق و انصاف قائم کرنے کے لیے ان کے ہاتھوں میں دی تھیں اور ان کی جگہ دوسری تلواریں نکال لی ہیں جنہیں شریعت سے کوئی واسطہ ہے نہ فطرت سے کوئی علاقہ۔ ان تلواروں سے وہ اپنی خواہشوں اور لذتوں کی راہیں کھولتے ہیں۔ اور جس طرح چاہتے ہیں اپنے دل کے تقاضے پورے کرتے ہیں۔

قاضیوں نے ظلم و حرص کا پیشہ اختیار کر لیا ہے اور قانون کو اپنے لیے ڈھال بنا لیا ہے۔ اب وہ من مانی کرتے ہیں لیکن ان پر کوئی زد نہیں پڑتی، اب وہ جس پر چاہتے ہیں، ہاتھ ڈال دیتے ہیں لیکن ان پر ہاتھ ڈالنے والا کوئی نہیں۔

مذہبی پیشوا دنیا کے کتے بن گئے ہیں۔ انہوں نے اپنی عبادت گاہوں کو ڈاکوؤں کے غاروں میں تبدیل کر دیا ہے جہاں وہ خدا کے بندوں کا چرایا ہوا مال جمع کرتے ہیں، لیکن فقیروں اور مسکینوں کو اس میں سے ایک حبہ تک نہیں دیتے۔

عوام نے اپنے ضمیر کو کچل ڈالا ہے اب وہ حکام کی خواہشوں، قاضیوں کی ظلم آفرینیوں اور مذہبی پیشواؤں کی چوریوں میں ان کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ اس لیے وقت آ گیا ہے کہ اللہ کا انتقام بادشاہ اور رعایا، حاکم اور محکوم سب پر نازل ہو۔

تخت الٹ دیے جائیں، عبادت کدے ڈھا دیے جائیں اور عدالت گاہیں مسمار کر دی جائیں۔ شہروں اور بستیوں کو میدانوں اور جنگلوں کو پہاڑوں اور کھنڈروں کو برباد ہو جانا چاہیے۔ زمین پر ایک سیل خون آنا چاہیے جس میں مرد اور عورتیں، بوڑھے اور بچے نیک اور بد، مجرم اور بے گناہ سب غرق ہو جائیں۔ اللہ اپنے بندوں پر کبھی ظلم نہیں کرتا لیکن اس کے بندے خود اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔

فرشتے نے اپنی بددعا ختم کی ہی تھی کہ مظلوموں کے خون سے لبریز گڑھا ابلنا شروع ہوا جس طرح حضرت نوحؑ کی بددعا کے دن تنور ابلا تھا اور اس میں سے خون ابل ابل کر تمام زمین پر سیلاب کی طرح موجیں مارنے لگا۔ زمین ایک سرخ سمندر معلوم ہو رہی تھی جس کی چنگھاڑتی موجوں میں کھیت اور مویشی، محل اور جھونپڑیاں، حیوان اور انسان، بولنے والے اور بے زبان سب بہے چلے جا رہے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ طوفان کی موجیں آہستہ آہستہ بلند ہوتی جا رہی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ پہاڑی کی اس چوٹی سے ٹکرانے لگیں جس پر میں بیٹھا تھا۔ میرے منہ سے ایک خوفناک چیخ نکلی اور میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ یہ ۱۸ جولائی ۱۹۱۴ء کی صبح تھی۔ اور میرے کمرے کی کھڑکی کے نیچے اخبار فروش چلا رہا تھا۔

"اعلان جنگ! جرمنی نے دنیا کو تباہی کے دہانے پر پہنچا دیا۔"

# قیامت

اشرف طارق

پہاڑی راستہ خطرناک حد تک پیچیدہ اور ناہموار تھا لیکن صبا انتہائی بے نیازی سے اس پتھریلے راستے پر جیپ دوڑا رہی تھی۔ خطرناک موڑ اور سیدھی ڈھلان پر بھی وہ جیپ کی رفتار میں فرق نہیں آنے دے رہی تھی۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ شفق کی رعنائیوں نے آسمان پر سونے کی مہین چادر بچھا دی تھی۔ صبا سیاہ جینز اور جیکٹ میں ملبوس تھی۔ سر پر اسکارف بھی اسی رنگ کا تھا۔ برابر والی نشست پر اس کا پاکستانی محافظ خان جیپ چاپ لاتعلق سا بنا بیٹھا تھا۔ تقریباً بیس منٹ کی مسافت طے کرنے کے بعد جیپ ایک نسبتاً نیم پختہ سڑک پر پہنچ گئی۔ اس سڑک کے دونوں جانب یوکلپٹس کے خوشبودار جھنڈ اور مختلف النوع خودرو جھاڑیوں کا طویل سلسلہ تھا۔ خاموش تاریک جنگل میں جیپ کے انجن کا شور نہایت پرہول اور وحشتناک سا لگ رہا تھا۔ دفعتاً مخالف سمت سے کسی گاڑی کی روشنی نظر آئی اور چند ثانیے بعد ایک فوجی ویگن کچھ فاصلے پر آکر رک گئی۔ صبا نے بھی اپنی جیپ ٹھہرالی۔ دراصل راستہ تنگ تھا اور دو گاڑیوں کا ایک دوسرے کے قریب سے گزرنا صرف اسی صورت میں ممکن تھا کہ ایک گاڑی کو کچے پر اتار لیا جاتا۔

ویگن میں سے چار افراد یکے بعد دیگرے چھلانگیں لگاتے ہوئے باہر نکلے وہ سب کے سب مسلح تھے۔ انہوں نے جیپ کی طرف کڑی نظروں سے دیکھا جو ان کے خیال کے مطابق ان کے سفر کے دوران مداخلتِ بے جا کا سبب بنی تھی۔

صبا نے گردن موڑ کر اپنے محافظ خان پر نظر ڈالی اور یکایک اس کے ہونٹوں پر ایک ایسی مسکراہٹ دوڑ گئی جو کسی بھوکے چیتے کی آنکھوں میں اس وقت نمودار ہوتی ہے جب اس کا شکار اس کی زد میں ہوتا ہے۔ ویگن کا ڈرائیور ایک لمبا تڑنگا ادھیڑ عمر شخص تھا جو غالباً دوسری گاڑی والوں کا سردار تھا۔

اس کے ایک ساتھی نے اسے مخاطب کر کے کہا۔ ”نصیری! جیپ ایک لڑکی ڈرائیو کر رہی ہے اور اس کے ساتھ صرف ایک مرد ہے۔“

”میں دیکھ چکا ہوں۔“ وہ غرایا۔

اس نے دوبارہ سرگوشی میں کہا۔ ”مرد کو مار کر کھڈ میں پھینک دیتے ہیں اور لڑکی.....“

”تجھے خبر ہے یہ لڑکی کون ہے؟“ نصیری سرد لہجے میں بولا۔

”نہیں استاد!“

نصیری آہستگی سے بولا۔ ”اگر میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا رہی ہیں تو یہ لڑکی شیخ نعمان کی بھتیجی ہے۔“

”شیخ نعمان کی بھتیجی؟ شیخ نعمان تو ہمارے صاحب مہلب کا بزنس پارٹنر ہے۔“

”ہاں۔“ نصیری نے جواب دیا۔

”اور ہم مہلب کی ہدایت پر مال لے کر اسی کی طرف جا رہے ہیں۔“

”تم درست کہتے ہو لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔“

”وہ کیا استاد؟“

”نعمان کی بھتیجی رات کے وقت ادھر کہاں جا رہی ہے؟“

”واقعی یہ تعجب کی بات ہے۔ اس طرف تو مہلب ہی کا گھر ہے۔“

نصیری قدرے توقف کے بعد بولا۔ ”آج تک ادھر خود شیخ نعمان بھی کبھی نہیں آیا۔ اسے جب کوئی ضرورت ہوتی ہے اپنے آدمیوں کو بھیج دیتا ہے۔“

”استاد! تم اس لڑکی سے بات کرو۔ معاملہ صاف ہو جائے گا۔“ اس کے ساتھی نے تجویز پیش کی۔ دوسرے دو افراد ان کے عقب میں خاموشی سے کھڑے تھے۔

نصیری نے صبا کی جیپ کی جانب قدم بڑھائے تو صبا بھی جیپ سے اتر آئی۔ محافظ نے اس کی تقلید کی۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔

”کون ہو تم اور ادھر کہاں جا رہی تھیں؟“ نصیری نے صبا کے قریب جا کر انجان بنتے ہوئے بارعب لہجے میں پوچھا۔

وہ پُرسکون لہجے میں بولی۔ ”تم کیوں پوچھ رہے ہو؟ کیا یہ سڑک تمہاری جاگیر ہے؟“

”یہ سڑک میری نہیں، مہلب کی جاگیر ہے اور میں اس کا دستِ راست ہوں نصیری۔ شیخ نعمان مجھے اچھی طرح جانتا ہے۔“

”اچھا اچھا، تم نصیری ہو، مہلب کے دستِ راست۔“ صبا نے اثبات میں سر ہلایا۔

نصیری اسے اچھی طرح پہچاننے کے باوجود مسلسل تجاہلِ عارفانہ برت رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ صبا خود ہی اپنے انکل نعمان کا حوالہ دے لیکن صبا نے ایسا کرنے کے بجائے اچانک کہا۔ ”تم وہی نصیری ہو نا جس

لبنان کے مسلمانوں پر توڑی جانے والی قیامتِ صغریٰ کا لہو رنگ فسانہ۔ تاریخ کے اوراق کے لیے ایک خون رنگ تماشا، ظلم و بربریت کی وہ داستانِ دل گیر جو صدیوں تک حساس دلوں کو خون رُلاتی رہے گی۔

# قیامت
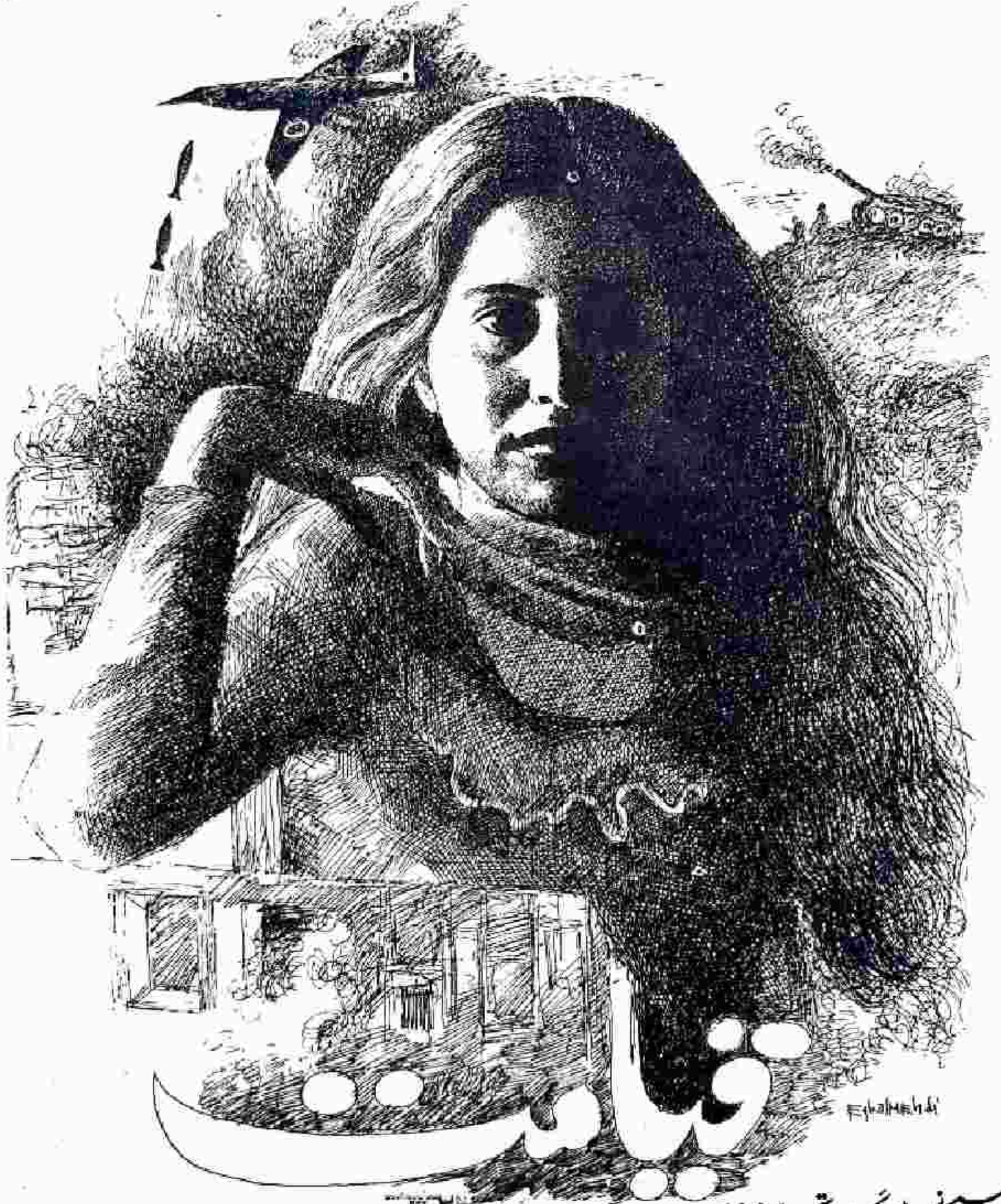
نے مہلب کے ساتھ مل کر تنظیم آزادیٔ فلسطین کے مضبوط مورچے قلعہ بالفورٹ پر اسرائیلیوں کا قبضہ کرایا تھا؟"

"ہاں۔" وہ متکبرانہ شان سے بولا۔ "یہ میرے تینوں آدمی بھی اس آپریشن میں شریک تھے۔ اگر ہم یاسر عرفات کے فدائین کی سپلائی لائن بروقت نہ کاٹ دیتے تو اسرائیلی زندگی بھر قلعہ بالفورٹ پر قبضہ نہیں کر سکتے تھے اگر ایسا نہ ہوتا تو اسرائیلی بیروت میں نہ گھس پاتے۔"

صبا نے اپنی ہتھیلیاں ملتے ہوئے سوال کیا۔ "تم، مہلب اور تمہارے ساتھی سب فلسطینی ہی ہو نا؟"

"ہاں۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "لیکن یہ تم کیوں پوچھ رہی ہو؟"

وہ معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔ "بس یہ کہ لاکھوں محروم وطن فلسطینیوں سے غداری کا معاوضہ تم لوگوں کو کیا ملا تھا؟"

"لڑکی!" نصیری مشتعل ہو کر چیخا۔ "اس لہجے میں گفتگو کرنے والوں کی میں زبان کھینچ لیتا ہوں۔ تم شیخ نعمان کی بھتیجی ہو اسی لیے تمہیں بخش رہا ہوں۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو اس کی ہڈیاں پٹخ چکی ہوتیں۔ میں اپنے باپ کی بھی بات برداشت نہیں کرتا۔"

"بہت خوب تھوک دو" وہ منہ بگاڑتے ہوئے کہنے لگی۔ "غلطی میری ہے جو میں نے ایسے الفاظ استعمال کیے حالانکہ تم جیسے لوگوں کے لیے......"

اس نے اپنا جملہ نامکمل چھوڑ کر نصیری کی ٹھوڑی پر ایک بھرپور گھونسا رسید کیا۔ یہ ناگہانی ضرب اتنی شدید تھی کہ اس کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچ گئے۔ صبا نے اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر کسی ماہر کمانڈو کی طرح اس کے دونوں بازو نہایت مضبوطی سے پیچھے کی جانب موڑ کر لے اپنی آڑ بنا لیا۔ اس کا یہ وار ایسا بھرپور تھا کہ نصیری کے منہ سے بے ساختہ چیخیں نکلنے لگیں۔ یہ سب کچھ آناً فاناً میں ہوا اور اس کے تینوں ساتھی ہکا بکا رہ گئے۔ اور جب وہ سنبھل کر اپنے سرغنہ کو بچانے کے لیے صبا کی طرف بڑھے تو خان نے آگے بڑھ کر انہیں اپنی مشین گن کی زد میں لے کر کہا۔ "خبردار، کوئی حرکت نہ کرے ورنہ ایک ایک کا جسم چھلنی کر دوں گا۔ اپنے ہتھیار زمین پر پھینک دو۔"

تینوں نے اپنے استاد نصیری کی طرف دیکھا جو صبا کی گرفت میں ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ صبا نے اپنے مخصوص آرٹ سے کام لیتے ہوئے اس کی ہڈیوں پر دباؤ ڈالا ہوا تھا اور نصیری کو یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی اس کی ہڈیاں چٹخ جائیں گی۔

وہ سرد لہجے میں بولی۔ "غدار نصیری! اپنے ساتھیوں سے کہو کہ خان کے حکم کی تعمیل کریں۔ میرا محافظ بڑا سفاک ہے، ویسے بھی اس کا تعلق پاکستان کے قبائلی علاقے سے ہے جہاں ملک و قوم کے غداروں کو زندہ زمین میں گاڑ دیا جاتا ہے۔"

"پھینک دو ہتھیار پھینک دو۔" نصیری کربناک آواز میں چلّایا لیکن اس کے کہنے سے پہلے ہی اس کے تینوں آدمی خان کے حکم کی تعمیل کر چکے تھے۔

"خان!" صبا نے خان کو آواز دی۔

"جی بی بی!" اس نے مؤدبانہ جواب دیا۔

"ان لوگوں کو اپنے نشانے میں رکھتے ہوئے ویگن کا جائزہ لو۔ شاید ان کا کوئی ساتھی اندر چھپا ہوا ہو۔"

"او کے بی بی!" یہ کہتے ہوئے خان مستعدی سے آگے بڑھا۔ اس نے تینوں کے ہتھیار پاؤں سے کچھ فاصلے پر دھکیل دیے اور پھر ویگن کے اندر جھانکنے کے بعد بولا۔ "بی بی! اندر کوئی نہیں ہے۔"

"گڈ۔" صبا نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "اب تم ایک ریوالور نصیری کو دے دو۔" پھر وہ نصیری سے مخاطب ہو کر بولی۔ "اے مسٹر! تم نے میرے ہاتھوں کی گرفت کا تجربہ کر لیا۔ میرا شکار کبھی مجھ سے بچ کر نہیں نکل سکا، اس لیے اگر تم اپنی خیریت چاہتے ہو تو بلا چون و چرا میرے احکامات پر عمل کرو۔" اس نے نصیری کا ایک بازو آزاد کر دیا۔ وہ اپنے بازو کو جھٹکا دیتے ہوئے بولا۔ "تم میرے ساتھ زیادتی کر رہی ہو۔ میں مہلب اور نعمان سے تمہاری شکایت کروں گا۔"

وہ بمشکل اپنا جملہ مکمل کر پایا تھا کہ صبا نے اس کے دائیں رخسار پر ایک تھپڑ جڑ دیا۔ ضرب اتنی بھرپور تھی کہ نصیری کا سر گھوم گیا۔ اس نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ لگے ہی لمحے ایک زوردار گھونسا اس کی پیشانی پر رسید کیا اور وہ لڑکھڑا کر زمین پر جا گرا۔ اس کے تینوں ساتھی بے بسی کی حالت میں اپنے استاد کو دیکھ رہے تھے۔ صبا چند قدم چل کر نصیری کے پاس آئی اور اچھل کر اپنا ایک پاؤں اس کی بائیں ہتھیلی پر دے مارا۔ فضا میں نصیری کی دلخراش چیخ گونج اٹھی۔ یہ منظر دیکھ کر نصیری کے تینوں ساتھی سہم گئے۔ وہ صبا کو ایک عام سی لڑکی سمجھ رہے تھے۔ لیکن اب ان پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ لڑکی نہیں کوئی بلا یا آسیب تھی۔ نصیری ایک پیشہ ور قاتل تھا اور ان گنت افراد اس کے ہاتھوں اب تک اپنی زندگیوں سے محروم ہو چکے تھے۔ ہر شخص اس سے خوفزدہ رہتا تھا لیکن یہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایک دن وہ ایک لڑکی کے ہاتھوں اس کی ایسی درگت بنتی دیکھیں گے۔

صبا ان تینوں کے اندرونی اضطراب سے بے نیاز، شاہانہ انداز میں چند قدم آگے بڑھی اور نصیری کو گردن پکڑ کر کھڑا کر دیا پھر اسے ایک جھٹکا دیتے ہوئے بولی۔ "میں مہلب سے ملنے جا رہی ہوں تم میرے ساتھ چلو گے۔"

"لیکن مہلب نے مجھے مال دیا ہے نعمان تک پہنچانے کے لیے۔"

وہ بولا تو اس کے لہجے کی سختی دم توڑ چکی تھی۔

"میں تمہاری بکواس نہیں سننا چاہتی۔ جو کہتی ہوں اس پر عمل کرو ورنہ تمہاری لاش کھڈ میں پڑی ہوگی۔" صبا نے اس کا منہ اس کے ساتھیوں کی طرف کر کے اپنی مشین گن اس کی کمر سے لگا کر کہا۔

خان، صبا کا اشارہ پاتے ہی نصیری کو رہا کر چکا تھا۔ اس کے تینوں ساتھی آنکھیں پھٹ پھٹا کر حیرت سے منہ کھولے کھڑے تھے۔ صبا نے نصیری سے کہا۔ "نصیری! تم میری مشین گن کی زد میں ہو۔ میری انگلی کی ایک معمولی سی جنبش تمہارا جسم چھلنی کر دے گی۔ لہٰذا کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرنا۔ اب اپنے پستول سے اپنے تینوں ساتھیوں کو نشانہ بناؤ۔ خیال رہے نشانہ ان کے دل کا لینا ہے۔"

"ک... ک... کک... کیا؟" وہ ہکلانے لگا۔

وہ بولی۔ "میرے پاس وقت نہیں ہے۔ اگر زندہ سلامت مہلب کے پاس جانا چاہتے ہو تو اپنے ساتھیوں کا کام تمام کر دو۔ میں تین تک گنتی گنوں گی۔ گنتی مکمل ہونے کے بعد اگر تمہارا کوئی ساتھی زندہ رہا تو اپنے انجام کے تم خود ذمہ دار ہو گے۔ ہاں تیار ایک... دو...."

اس کے دو کہتے ہی فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی۔ جو کچھ ہوا وہ قطعی ناگہانی تھا۔ تینوں میں سے صرف ایک نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن وہ چند قدم ہی چلا تھا کہ نصیری کے پستول کی دو گولیوں نے اسے جا لیا اور وہ اُچھل کر نیچے جا گرا۔ اس خونی تماشے کے مکمل ہوتے ہی خان نے ریوالور نصیری کے ہاتھ سے چھین لیا۔ صبا اس کے سامنے آ کر سفاکانہ انداز میں غرائی۔ "نصیری! تیرا رنگ کیوں فق ہو گیا ہے؟"

وہ متوحش نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم نے ایسا کیوں کیا؟ ان لوگوں سے تمہاری کیا دشمنی تھی؟ مہلب اور نعمان کو اس واقعے کا علم ہوگا تو وہ یقیناً آپے سے باہر ہو جائیں گے اور تمہارے ساتھ ساتھ میری بھی شامت آئے گی حالانکہ میرا کوئی قصور نہیں۔"

"تم مہلب اور انکل نعمان کی پروا نہ کرو۔" اس نے بے نیازی سے کہا۔ "ان کو میں خود جواب دے لوں گی۔ تمہیں اس وقت صرف میرے احکامات کی تعمیل کرنا ہے۔"

"تمہارے احکامات؟" نصیری نے کہا۔

وہ رکھائی سے بولی۔ "اپنے ساتھیوں کی لاشیں اٹھا کر ویگن میں رکھو اور ویگن اسٹارٹ کر کے کھڈ میں گرا دو۔"

نصیری کا رنگ یکدم زرد پڑ گیا۔ وہ اپنے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے بمشکل بڑبڑایا۔ "ویگن میں لاکھوں ڈالر کی ہیروئن ہے اور اسے ہر قیمت پر شیخ نعمان کے ہاں پہنچانا ہے۔"

صبا نے ایک زوردار ہاتھ اس کے دائیں رخسار پر جڑ دیا۔ وہ غصے سے پھنکاری۔ "میں تمہاری کچھ نہیں سننا چاہتی۔ جو کہتی ہوں اس پر عمل کرو ورنہ تمہاری مکروہ لاش بھی تمہارے ساتھیوں سمیت کھڈ میں گرا دی جائے گی، سمجھے۔"

نصیری تیورا کر رہ گیا۔ اس لڑکی نے اس کی سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں سلب کر لی تھیں۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کس جال میں پھنس گیا ہے اور یہ خوفناک درندہ صفت لڑکی اس سے کاہے کا انتقام لے رہی ہے۔ بہرحال یہ بالکل عیاں تھا کہ اگر اس نے صبا کی ہدایت پر عمل نہیں کیا تو وہ اسے موت کے گھاٹ اتارنے میں ذرا تامل نہیں کرے گی۔ چنانچہ وہ جلدی جلدی اپنے ساتھیوں کی لاشیں اٹھا کر ویگن میں رکھنے لگا۔ صبا اور خان اسے اپنے نشانے کی زد میں لیے کھڑے تھے۔ ویگن میں لاشیں رکھنے کے بعد نصیری نے ویگن اسٹارٹ کی اور جلدی سے نیچے اتر آیا۔ چند ثانیے تک ویگن سرکتی رہی پھر رُک گئی۔

صبا چلائی۔ "خان! اس کتے کو ساتھ لے کر ویگن کو دھکا لگاؤ۔ مجھے پہلے ہی دیر ہو گئی ہے۔"

"جی بے بی!" خان نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا اور ویگن کو دھکیلنے لگا۔ چند ثانیوں کے بعد ویگن کئی سو فٹ نیچے گہرائی میں پڑی تھی اور شعلے اسے اپنی لپیٹ میں لے چکے تھے۔

اس کام سے فارغ ہو کر خان نے نصیری کو رسیوں سے جکڑا اور منہ میں کپڑا ٹھونس کر اپنی جیپ کے عقبی حصے میں لٹا دیا۔ راستے میں صبا نے خان سے کہا۔ "ہمارا پہلا مرحلہ مکمل ہو گیا۔"

"جی بے بی!" خان نے مؤدبانہ جواب دیا۔

"دو مرحلے ابھی باقی ہیں۔"

"جی بے بی!"

"نصیری سے پوچھو الوندال اس وقت کہاں ہے؟"

خان نے نصیری کا منہ کھول کر صبا کا سوال دہرایا۔ وہ خوفزدہ آواز میں بولا۔ "میں الوندال سے کبھی نہیں ملا۔ مجھے اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔"

صبا نے خان سے کہا۔ "خان! تم غداروں اور دشمنوں کے منہ کھلوانے کا فن جانتے ہو؟"

"جی بے بی!" خان نے زیر لب جواب دیا اور مخصوص انداز میں اپنی دو انگلیوں سے نصیری کی ناک پکڑ لی۔ اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ صبا نفرت سے بولی۔ "جب تیری غداری کے بعد قلعہ بالفورث میں سیکڑوں فدائین کو اسرائیلی درندوں کے ہاتھوں بے رحمی سے قتل ہونا پڑا تھا تو تجھے ذرا بھی تکلیف محسوس نہیں ہوئی تھی۔ آج تیری صرف ناک پکڑی گئی تو تو گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا ہے۔ توڑ دو اس ذلیل کی ناک، پھوڑ دو خبیث کی آنکھیں اور ٹکڑے ٹکڑے کر دو اس کا ناپاک جسم۔ یہ انسانیت کے نام پر دھبا ہے۔ ان کتوں نے غداری

زندگی ہوتی تو اسرائیلیوں کی کیا مجال تھی جو قلعہ بالفورٹ سے آگے نکل کر بیروت میں داخل ہو سکتے۔"

نصیری کی آواز ابھری۔ "مجھ پر رحم کھاؤ، میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ میں مر گیا تو وہ تباہ ہو جائیں گے۔"

"یہ جو ہزاروں فلسطینی قتل ہو گئے، کیا ان کے بہن بھائی اور بچے نہیں تھے؟" صبا کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔

وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے بولا۔ "میں نے جو کچھ کیا، مہلب ابوالندال کے حکم پر کیا۔ شیخ نعمان بھی ان کا ساتھی ہے۔"

"زیادہ بکواس کی ضرورت نہیں۔ بے بی کے سوال کا جواب دو۔ ابوالندال کہاں مل سکتا ہے؟" خان نے اس کی ناک دباتے ہوئے کہا۔

"میں اپنے بچوں کی قسم کھا کر کہتا ہوں مجھے کچھ نہیں معلوم۔ اس کے بارے میں تمہیں صرف مہلب ہی بتا سکتا ہے۔" وہ گھگھیایا۔

"خان فی الحال اس کتے کو چھوڑ دو۔" صبا نے خان سے کہا۔

خان نے اس کی ناک چھوڑ کر اس کے منہ میں دوبارہ کپڑا ٹھونس دیا تاکہ اس کے حلق سے کوئی آواز نہ نکل پائے۔

نصف گھنٹے کی مسافت طے کرنے کے بعد جیپ ایک تاریک فارم میں داخل ہو گئی۔ یہاں پھلوں کا وسیع و عریض باغ تھا۔ یہاں چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ چند فرلانگ پر ایک چھوٹا سا کاٹیج دکھائی دے رہا تھا۔ جس کے کوریڈور میں بلب روشن تھا۔ کاٹیج کے گیٹ پر دو مسلح محافظ دیوار سے ٹیک لگائے یوں بیٹھے تھے جیسے نشے میں دھت ہوں۔ صبا کو جیپ سے اترتے دیکھ کر بھی وہ اسی طرح بیٹھے رہے۔ اسے قدرے حیرت ہوئی بہرحال اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں خان کو جیپ میں بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا اور پنجوں کے بل چلتی ہوئی دونوں چوکیداروں کے قریب پہنچ گئی۔ اس کی آنکھیں اچانک حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ دونوں قید حیات سے آزاد ہو چکے تھے۔ کسی نے انہیں گولی کا نشانہ بنایا تھا۔ صبا نے مشکوک انداز میں ادھر ادھر دیکھا اور پنجوں کے بل چلتے ہوئے کوریڈور میں جا کر اطراف کا جائزہ لیا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ بلا خوف و جھجک دروازہ کھول کر ایک کمرے میں داخل ہو گئی۔ گو وہاں تاریکی تھی لیکن دریچے کے سفید پردوں سے کوریڈور کی روشنی چھن چھن کر آ رہی تھی۔ یہ ڈرائنگ روم تھا۔ اس سے ملحقہ ایک بیڈ روم تھا۔ صبا نے اندر قدم رکھتے ہی بلب روشن کر دیا۔ وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ وہ دوسرے بیڈ روم کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ وہاں بلب روشن تھا۔ فرش پر ایک ادھیڑ عمر عورت پڑی تھی۔ اس کا تمام جسم گولیوں سے چھلنی تھا۔ صبا کو حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔ یہ صورتحال غیر متوقع تھی۔ وہ ادھر ادھر جھانکنے کے بعد فوراً باہر نکلی اور جیپ اسٹارٹ کرتے ہوئے خان کو مخاطب کر کے بولی۔ "خان! اس ذلیل بے غیرت شخص سے دریافت کرو کہ کاٹیج اور حویلی کے علاوہ مہلب کا اور کون کون سا ٹھکانہ ہے؟"

خان نصیری کی طرف مڑا اور اس کے منہ سے رومال نکال کر صبا کا سوال دہرایا۔ نصیری نے جواب دیا۔ "اس کے یہی دو ٹھکانے ہیں۔"

"وہ ابوالندال سے کہاں پر ملتا ہے؟ بیروت میں چرس کے مافیا کے اڈے کس کس جگہ ہیں؟" صبا غصے سے چیخی۔

وہ گھبرا کر بولا۔ "ابوالندال کے ٹھکانے کا اس کے سوا کسی کو علم نہیں۔ منشیات کا اڈہ خود اس کا اپنا کاٹیج ہے۔"

صبا نے غرا کر کہا۔ "لگتا ہے تجھے اپنی زندگی عزیز نہیں۔ خان! اس کا گلا گھونٹ کر اس کی لاش جیپ سے باہر پھینک دو۔"

"جی بے بی!" خان نے تعمیل میں سر ہلایا۔

"مجھے مت مارو، مجھے مت مارو، میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے مہلب کے تیسرے ٹھکانے کا علم نہیں ہے۔" نصیری خوف زدہ ہو کر چیخنے لگا۔

صبا نے جیپ کی رفتار تیز کرتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے تھوڑی دیر میں تیرے اس بیان کی صداقت بھی ظاہر ہو جائے گی۔ یاد رکھ اگر تو نے دھوکا دینے کی کوشش کی تو سمجھ لے کہ بے موت مارا جائے گا۔"

"مجھے منظور ہے۔" وہ کراہتے ہوئے بولا۔

صبا نے سوال کیا۔ "تو نے مہلب کے کاٹیج میں کسی چھوٹی بچی کو دیکھا ہے؟"

"ہاں وہ اس کی نواسی ہے۔ اس نے یہی بتایا تھا۔" وہ جلدی سے بولا۔

"آخری بار تو نے بچی کو کب اور کہاں دیکھا تھا؟" صبا نے پھر سوال کیا۔

وہ بولا۔ "آج جب ہم لوگ بیروت سے نکل کر تمہارے قافلے کی طرف روانہ ہو رہے تھے تو مہلب کی ملازمہ کوریڈور میں اسے لے کر گھوم رہی تھی۔"

صبا نے اس سے مہلب کی ملازمہ کا حلیہ دریافت کیا۔ اس نے اس کا جو حلیہ بیان کیا وہ اسی عورت کا تھا جس کی لاش تھوڑی دیر پہلے وہ کاٹیج کے ایک بیڈ روم میں دیکھ چکی تھی۔ اسے شدید حیرت ہوئی اور وہ سوچ میں پڑ گئی۔ بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ مہلب کے کاٹیج میں اس کی ملازمہ اور دونوں چوکیداروں کو کس نے اور کیوں قتل کیا ہے؟

صبا الجھ سی گئی لیکن اس نے اس مسئلے پر خان یا نصیری سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ خاموشی سے جیپ دوڑاتی رہی۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد اس کی جیپ ایک پرانی طرز کی عمارت کے پاس رکی۔ اس کی دیواریں خاصی اونچی تھیں اور باہر سے روشنی کی ایک کرن تک دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ خان کو مخاطب کر کے بولی۔ "تم [illegible] میں ابھی

پھلانگ کر اندر جاتی ہوں۔ میرا اشارہ ملتے ہی جیپ اندر لے آنا اور وہاں اس غدار کے منہ میں رومال نہیں ٹھونسنا ہے۔ اب اس کی ضرورت نہیں رہی لیکن اگر یہ شور کرنے کی کوشش کرے تو فوراً اس کا گلا گھونٹ دینا۔"

"جی بی بی!" خان نے اثبات میں سر ہلایا۔

نصیر گھگھیایا۔ "میری آواز نہیں نکلے گی خدا کے لیے مجھے مت مارنا۔"

صبا نے اس کی بات سنی ان سنی کر کے پیچھے کر دی اور اس کی جگہ خان نے لے لی۔ صبا دیوار کے قریب جا کر کچھ دیر اس کا جائزہ لیتی رہی پھر اس نے کسی چھپکلی کی طرح دیوار پر چڑھنا شروع کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ دیوار پر جا کھڑی ہوئی۔ عین اسی وقت حویلی کے اندر سے کئی کتوں کی غراہٹیں سنائی دیں۔ صبا نے ہونٹ سکیڑ کر ایک مخصوص سیٹی کی آواز نکالی۔ اس آواز میں جانے کیا جادو تھا کہ کتوں کی غراہٹیں بند ہو گئیں۔ کتوں کے خاموش ہوتے ہی صبا گیٹ کے ستون کے سہارے آہستہ آہستہ نیچے سرکنے لگی۔ اس دوران وہ دھیمی آواز میں سیٹی بھی بجاتی جا رہی تھی۔ نیچے اترنے کے بعد آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہوئیں تو اس نے دیکھا کہ لوہے کے بڑے گیٹ کے قریب درخت کے تنے کے ساتھ ایک درجن السیشن نسل کے دراز قد کتے بندھے ہوئے تھے لیکن وہ سیٹی سن کر غرانا بھول گئے تھے اور اطاعت گزاری کے انداز میں دمیں ہلا رہے تھے۔ صبا نے نہایت آہستگی سے گیٹ کھولا اور پھر خان کو اشارہ کیے بغیر مڑ کر دبے قدموں عمارت کی راہداری میں پہنچ گئی۔ ساری عمارت تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ یہ اندازہ لگانا خاصا مشکل تھا کہ کمرے کس طرف ہیں اور ان کے اندر داخل ہونے کا راستہ کدھر ہے۔ بہرحال اس نے تھوڑی سی جدوجہد کے بعد کوریڈور تلاش کر لیا۔ یہاں اتنی تاریکی تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا لیکن وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتی رہی۔ اچانک وہ کسی کے بولنے کی دھیمی آواز سن کر ٹھٹک گئی۔ آواز اس کے قریب ہی ایک دروازے کے پیچھے سے آ رہی تھی۔ اس نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی لیکن ہلکی بھنبھناہٹ کے سوا کچھ سمجھ میں نہ آ سکا۔ وہ کسی اچانک خیال کے تحت مسکرائی۔ پھر اس نے اپنے منہ سے ایسی آوازیں نکالنا شروع کر دیں جیسے دو بلیاں آپس میں لڑ پڑی ہوں۔ اندر والوں نے ان آوازوں پر توجہ نہیں دی تو وہ بند دروازے پر اس طرح ہاتھ مارنے لگی جیسے بلیاں لڑتے ہوئے دروازے سے ٹکرا رہی ہوں۔ اس کی محنت رائیگاں نہیں گئی۔ دروازے کی طرف بڑھتے قدموں کی آہٹ سن کر وہ تیزی سے اتنی دور چلی گئی کہ آنے والا دروازہ کھولتے ہی اسے نہ دیکھ سکے۔ چند منٹ بعد دروازہ کھلا تو کمرے کی روشنی کوریڈور میں دور تک روشن کر گئی۔ آنے والے نے دروازے سے سر نکال کے بلیوں کو دھتکارا لیکن اس سے پہلے ہی بلیاں خاموش ہو گئیں۔

اندر سے کسی نے کرخت آواز میں کہا۔ "ڈاکٹر! تم کیوں بلیوں کے پیچھے پڑ گئے لعنت بھیجو ان پر۔"

ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "مطلب! تم نہیں جانتے بلیوں کا لڑنا بڑا نحس ہوتا ہے۔"

اچانک صبا کے منہ سے سانپ کے پھنکارنے کی آواز نکلی۔ ڈاکٹر نے دہشت زدہ ہو کر دروازہ بند کرنا چاہا مگر صبا نے تاریکی سے نکل کر تیزی سے اس کی ناک پر زوردار گھونسہ رسید کیا۔ ڈاکٹر چیخ مار کر پیچھے الٹ گیا۔ مطلب اسے گرتا دیکھ کر اس کی طرف لپکا۔ وہ ڈاکٹر کو سنبھالنے کے لیے اس پر جھکا تو صبا کا گھٹنہ پوری شدت سے اس کی پشت پر لگا اور وہ کراہ کر ڈاکٹر کے قریب ہی گر گیا۔ گرنے سے اس کے ہاتھ میں دبا ہوا ریوالور چل گیا اور گولی ڈاکٹر کے سر میں جا گھسی۔ صبا نے مطلب کو سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ ایک ٹھوکر سے اس کے ہاتھ کا ریوالور نکال دیا۔ مطلب نے جھپٹ کر ریوالور تک پہنچنا چاہا مگر صبا نے اسے اٹھنے کی مہلت بھی نہیں دی۔ اس کے دائیں شانے پر مخصوص انداز میں دو تین ٹھوکریں لگا کر اس کا بازو پکڑا اور اسے اس زور سے جھٹکا دیا کہ مطلب کی چیخیں نکل گئیں۔ اس کا بازو اکھڑ گیا تھا۔ پھر وہ اسے بال پکڑ کر کھینچتی ہوئی کمرے میں لائی اور اس کی گردن پر اس وقت تک ضربیں لگاتی رہی جب تک وہ بالکل بے دم نہ ہو گیا۔

مطلب کو بے دم کر کے اس نے کمرے میں نظر دوڑائی اور ایک کونے میں ایک نوجوان کی سربریدہ لاش دیکھ کر اچھل پڑی۔ نوجوان کو قتل ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ لاش سے ذرا فاصلے پر ایک نوجوان لڑکی ایک ستون سے بندھی کھڑی تھی۔ وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں سسکیاں لیتے ہوئے دھیمی آواز میں کہہ رہی تھی۔ "ظالمو! ثمینہ کو مت مارو، یہ بے گناہ ہے۔ اس کا کوئی قصور نہیں، تم جیسا کہو گے میں ویسا ہی کروں گی۔"

صبا کی نظر مسہری پر پڑی وہاں ایک معصوم سی بچی آنکھیں بند کیے بے حس و حرکت لیٹی تھی۔ اسے دیکھ کر یہی گمان ہوتا تھا جیسے وہ مر چکی ہو۔ وہ دوڑ کر اس کے پاس پہنچی اور اسے آہستہ سے ہلایا۔ بچی نے کوئی حرکت نہیں کی۔ رسیوں سے بندھی لڑکی کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور وہ ہذیانی انداز میں چلائی۔ "اس بھیڑیے نے ثمینہ کو مار ڈالا خدا اس پر اپنا عذاب نازل کرے، میرا سارا کنبہ اس کے ہاتھوں برباد ہو گیا ہے۔"

صبا نے بچی کی نبض دیکھی، دل کی دھڑکن کا معائنہ کیا اور لڑکی کو مخاطب کر کے بولی۔

"حوصلہ رکھو، یہ زندہ ہے۔"

"کیا کہا، ثمینہ زندہ ہے، تم جھوٹ بولتی ہو۔ ان ظالموں نے میرے سامنے پہلے ہاشم کا سر کاٹا کیونکہ وہ ثمینہ کو اس ذلیل کی قید سے

پکڑ کر میرے پاس لایا تھا۔ پھر انھوں نے ثمینہ کو زہر کا انجکشن لگا دیا۔"
وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

صبا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے جلدی جلدی لڑکی کو آزاد کر کے پوچھا۔ "تمہارا نام سوشی ہے نا؟"

"ہاں میں بدنصیب سوشی ہوں۔" وہ آزاد ہوتے ہی دیوانہ وار بچی کی طرف لپکی۔ صبا کو اپنی طرف سے غافل پا کر مہلب اپنے معذور بازو کو سنبھال کر اٹھا اور تیر کی طرح کمرے سے باہر نکل گیا۔ آہٹ سن کر صبا نے پلٹ کر دیکھا اور اسے کمرے سے نکلتے دیکھ کر اس کی طرف لپکی مگر مہلب کی رفتار حیرت انگیز تھی۔ صبا کمرے سے نکلی تو وہ گیٹ کے قریب اپنی جیپ میں پہنچ کر اسے اسٹارٹ کر چکا تھا۔ اسے ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر صبا نے باریک سی سیٹی بجائی۔ سیٹی کی آواز سنتے ہی خان نے اپنی جیپ طوفان کی طرح گیٹ کے اندر داخل کر دی۔ مہلب کا راستہ مسدود ہو گیا۔ کتوں کے لیے یہ صورتحال قطعاً غیر متوقع تھی چنانچہ انھوں نے زنجیروں میں بندھے بندھے اچھل کود شروع کر دی اور نہایت وحشتناک انداز میں غرانے لگے۔ مہلب نے راستہ مسدود دیکھا تو جیپ سے اتر کر جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا ایک طرف بھاگا لیکن وہ خان کی عقابی نظروں سے نہ بچ سکا۔ اس نے کسی چیتے کی طرح عقب سے چھلانگ لگا کر اس کی گردن دبوچ لی۔ اس وقت تک صبا بھی وہاں پہنچ گئی تھی۔ "خان!" وہ غضبناک آواز میں بولی۔

"جی بی بی!" خان نے مؤدبانہ انداز میں جواب دیا۔

"اسے چھوڑ دو۔ تم گیٹ بند کرو اور نصیری کو اٹھا کر میرے پیچھے پیچھے آؤ۔" اس نے مہلب کے سر کے بال اپنی مٹھی میں جکڑے اور اسے زمین پر گھسیٹتے ہوئے کمرے کی طرف بڑھنے لگی۔

کمرے میں پہنچتے پہنچتے مہلب بالکل نڈھال ہو چکا تھا۔ صبا کے پیچھے پیچھے خان بھی نصیری کو لے کر کمرے میں آ گیا۔ نصیری کے ہاتھ پاؤں ابھی تک رسیوں سے جکڑے ہوئے تھے اور اس کے چہرے کا رنگ بالکل فق تھا۔

سوشی دیوانگی کے عالم میں بچی کو اپنے سینے سے چمٹائے زار و قطار رو رہی تھی۔ صبا نے مہلب کو مخاطب کر کے کرخت آواز میں پوچھا۔ "کیا ثمینہ کو تم لوگوں نے زہر کا انجکشن لگایا تھا؟"

"نہیں۔" اس نے خائف آواز میں جواب دیا۔

سوشی چیخی۔ "یہ جھوٹا ہے، مکار ہے بکواس کرتا ہے۔ اس نے باسم کو مار کر ثمینہ کو زہریلا انجکشن لگایا اور مجھے بھی ہلاک کرنا چاہتا تھا۔"

صبا نے قہر آلود نظروں سے زمین پر درد سے کراہتے ہوئے مہلب کو دیکھا اور اس کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ رسید کر کے بولی۔ "جانور کی اولاد! ان لوگوں کے ساتھ تو نے ایسا سلوک کیوں کیا؟ جلدی بول ورنہ میں تیری بوٹیاں کر دوں گی۔" اس نے جیب سے ایک شکاری چاقو نکال لیا۔

موت کو قریب پا کر مہلب گھگھیانے لگا۔ "خدا کے لیے مجھے مت مارو میں سب کچھ بتا دیتا ہوں، یہ بچی میرے مرحوم بھتیجے کی نشانی ہے، سوشی کا ذہنی توازن خراب ہے، میں نے اسے اپنے کاٹیج میں رکھا ہوا تھا۔ باسم میرے دو محافظوں اور ملازمہ کو قتل کر کے بچی کو اٹھا کر سوشی کے پاس لے آیا اور اسے میرے خلاف ورغلانے لگا۔ تبھی میں اور ڈاکٹر یہاں پہنچ گئے۔ اس نے ہم دونوں پر حملہ کرنا چاہا۔ جواباً میں نے اسے مار ڈالا۔ سوشی پر دماغی دورہ پڑ گیا تھا اس لیے اسے رسیوں سے باندھ دیا اگر ایسا نہ کرتے تو یہ اپنا سر دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر مر جاتی۔ بچی بلک بلک کر رو رہی تھی اس لیے ڈاکٹر نے اسے نیند کا انجکشن لگا دیا۔ پانچ چھ گھنٹے بعد یہ دوبارہ بیدار ہو جائے گی۔ اب تم بتاؤ میرا کیا قصور ہے؟" وہ گفتگو کے دوران بازو میں اٹھنے والی ٹیسوں کے سبب کراہتا بھی جا رہا تھا۔

سوشی کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن صبا نے اسے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا اور مہلب کو مخاطب کر کے درشت لہجے میں بولی۔ "تمہارے گناہوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ میں تمہارے بارے میں ایک ایک بات جانتی ہوں۔ تم غداروں کے اس ٹولے سے تعلق رکھتے ہو جس نے مظلوم فلسطینی قوم کو زخم زخم کر دیا ہے۔ یہ تم لوگ تھے جنھوں نے لندن میں اسرائیلی سفیر پر ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت حملہ کیا اور الزام عائد ہوا یاسر عرفات کے سر کیونکہ اس کے آدمیوں نے اسرائیلی سفیر کو زخمی کر دیا۔ مقصد یہ تھا کہ اسرائیلی درندوں کو لبنان کی بین الاقوامی سرحد پار کر کے انتقاماً یاسر عرفات کے ٹھکانوں پر بھرپور فوجی حملہ کرنے کا بہانہ ہاتھ آ جائے۔ پھر تم لوگوں نے اس حملے کے آغاز میں قلعہ بالفورٹ کی رسد کاٹ دی جس کے نتیجے میں اسرائیلی فلسطینیوں کے اس مضبوط دفاعی حصار کی اینٹ سے اینٹ بجانے میں کامیاب ہو گئے۔ اگر تم خارش زدہ کتے غداری نہ کرتے تو اسرائیلیوں کی کیا مجال تھی کہ وہ صیدون اور بیروت کو روند سکتے۔ میں نے عہد کیا تھا کہ تمہیں اور ابو ندال کو سسکا سسکا کر موت کے گھاٹ اتاروں گی لیکن میں حالات کے ہاتھوں مجبور تھی۔ آج دوپہر جب مغربی بیروت سے پی ایل او کے پہلے دستے کا انخلا عمل میں آ رہا تھا تو مجھے ڈاکٹر الناصر نے پیغام بھیجا کہ مہلب کے آدمی باسم کو ہلاک کر دیا گیا ہے، تمہیں یاد ہو گا کہ یہ وہی شخص تھا جسے تم نے سوشی کے ساتھ شادی کا لالچ دے کر، یاسر عرفات کو ہلاک کرنے بھیجا تھا۔ پاکستانی صحافی اشعر کو سوشی تمہاری اصلیت سے پہلے ہی آگاہ کر چکی تھی۔ اس نے وہ سب کچھ باسم کو بتایا۔ باسم نے قسم کھائی تھی کہ وہ ثمینہ کو سوشی کے حوالے کر کے تمہیں زندہ زمین میں گاڑ دے گا۔ ڈاکٹر الناصر نے مجھے ہدایت کی کہ میں بھی فوراً تمہارے ٹھکانے پر پہنچ جاؤں لیکن مجھے قدرے تاخیر ہو گئی ورنہ میں باسم کو اس طرح

مرنے نہ دیتی۔ بہرحال میں تمہارے معاون نصیری کو راستے سے پکڑ کر لے آئی ہوں۔ تمہارے مظالم کی داستانیں رقم ہیں مہلب! میری ذاتی عدالت تم لوگوں کے جرائم کی سزا تجویز کرے گی لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ تیرا سرغنہ ابوندال اس وقت کہاں ملے گا؟ کیونکہ اس کی موجودگی کے بغیر تاریخ اس رات کے مقدمے کو مکمل قرار نہیں دے سکتی۔"

مہلب کو سانپ سونگھ گیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک ٹک صبا کو گھورے جا رہا تھا دفعتاً وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔ "تمہیں میرے خلاف کسی نے بھڑکا دیا ہے، میں تمہارے انکل نعمان کا دوست ہوں اور میں نے کبھی اس کے مشورے کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھایا اگر تم واقعی مجھے مجرم سمجھتی ہو تو اس کے پاس لے چلو۔"

صبا نے ایک طنزیہ قہقہہ لگایا۔ بولی۔ "نعمان بھی تمہاری طرح غدار ہے، اس کے گھناؤنے جرائم کی سزا اسے ضرور ملے گی لیکن تم وہ منظر دیکھنے کے لیے زندہ نہ رہ سکو گے۔ بولو ابوندال کہاں چھپا ہوا ہے؟"

"ابوندال اس وقت لبنان سے باہر ہے۔" اس نے مردہ لہجے میں جواب دیا۔

وہ اسے گھورتے ہوئے بولی۔ "کیا تم سچ بول رہے ہو؟"

"ہاں۔" مہلب نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

صبا، خان کی طرف مڑی اور بولی۔ "خان! تمہیں مجرموں سے سچ اگلوانے میں بڑی مہارت ہے نا؟"

"جی بی بی!" خان نے مؤدبانہ کہا۔

"آج کی رات مہلب تمہارا شکار ہے۔"

"جی بی بی!" خان بدستور مؤدب تھا۔

"تمہیں ساٹھ سیکنڈ میں اس کی تہ تک پہنچنا ہے۔"

"جی بی بی!" وہ مہلب کی طرف بڑھا۔

"یقین کرو میں سچ کہہ رہا ہوں۔" مہلب اسے اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر چلّایا۔

خان نے اس کی سُنی اَن سُنی کر دی اور جھک کر اپنے مخصوص انداز سے اس کی ناک پکڑ لی۔ مہلب فرش پر بری طرح لوٹنے لگا۔ اس کے حلق سے عجیب و غریب آوازیں نکل رہی تھیں۔ سونی، ثمینہ کو سینے سے چمٹائے دم بخود کھڑی تھی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ مہلب جیسے ظالم شخص کی یہ درگت بھی بن سکتی ہے۔ تیس سیکنڈ بھی نہیں گزرے تھے کہ مہلب کے نتھنوں سے خون بہنے لگا۔ وہ چلّایا۔ "مجھے چھوڑ دو میں بتاتا ہوں۔"

خان نے سوالیہ نظروں سے صبا کی جانب دیکھا اس نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلایا۔ خان مہلب کی ناک چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ مہلب نے اپنا بایاں ہاتھ ناک پر رکھا اور اسے سہلاتے ہوئے بولا۔ "ابوندال تریپولی میں ہے۔"

"تو تریپولی میں کس جگہ ہے" صبا نے اس کی اذیت کو نظر انداز کرتے ہوئے سوال کیا۔

"یہ مجھے نہیں معلوم لیکن میرا قیاس ہے کہ وہ الفتح کے کسی کمانڈر سے چھپ کر ملنے گیا ہے۔"

"کیوں؟" صبا نے پلکیں جھپکاتے ہوئے پوچھا۔ "اب جبکہ یاسر عرفات اور ان کے فدائین مغربی بیروت سے ہمیشہ کے لیے جا رہے ہیں تو کیا وہ ان سے مصالحت کرنا چاہتا ہے؟"

"نہیں، یہ بات نہیں۔"

"پھر وہ الفتح کے کمانڈر سے ملنے تریپولی کیوں گیا ہے؟"

"یاسر عرفات کے دشمنوں کا خیال ہے کہ وہ مغربی بیروت سے نکل کر تریپولی جائے گا کیونکہ وہاں اس کی دس ہزار فوج موجود ہے۔ ابوندال نے تریپولی میں مقیم الفتح کے چند کمانڈروں سے ساز باز کرکے یاسر عرفات کے خلاف ایک بغاوت کا منصوبہ تشکیل دیا ہے۔ اسی کی تیاریوں کے ضمن میں وہ وہاں گیا ہے۔" وہ سسکتے ہوئے بولا۔

صبا کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہو گئیں۔ اس نے کہا۔ "اس بغاوت کا اصل مقصد کیا ہے؟"

مہلب نے نحیف آواز میں جواب دیا۔ "یاسر عرفات کو قتل کرکے الفتح تنظیم پر اپنا کنٹرول قائم کرنا۔"

چند ثانیوں کے لیے کمرے میں خاموشی ہو گئی پھر صبا نے سوشی سے کہا۔ "اس غدار نے فلسطینی فدائین کو جو نقصان پہنچایا ہے اس کی تلافی ناممکن ہے۔ تم پر بھی اس نے بے پناہ مظالم کیے ہیں، تم اس وقت یہاں موجود ہو میں چاہتی ہوں تم ہی اس کی سزا تجویز کرو۔"

سوشی نے کپکپاتی آواز میں جواب دیا۔ "میں نے پاکستانی صحافی اشعر کے سامنے اقرار کیا تھا کہ جب روز ثمینہ میرے قبضے میں آ گئی میں اس خبیث کو زندہ اپنے کتوں سے نچوا ڈالوں گی۔"

صبا سفاکانہ لہجے میں بولی۔ "میں تمہاری خواہش ضرور پوری کروں گی۔"

یہ سنتے ہی مہلب چلایا۔ "سوشی! میں اپنے تمام جرائم کا اقرار کرتا ہوں بلاشبہ میں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتیاں کی ہیں لیکن خدا کے لیے مجھے مت مارو، میری توبہ میں دوبارہ کبھی ایسی حرکتیں نہیں کروں گا۔ ایک موقع دے دو۔ میں ساری زندگی شریف انسان بن کر گزار دوں گا۔ میں تمہارا انکل ہوں، تمہارے باپ کا بھائی ہوں، میرا تم سے خون کا رشتہ ہے۔ مجھے مت مارو۔"

سوشی نے غصے سے کہا۔ "تم انسان نہیں بھیڑیے ہو تم نے میرے باپ بھائی اور راحیل کو قتل کیا۔ مجھے اور میری ماں کو ذہنی مریضہ بنا دیا۔ ثمینہ کو مجھ سے چھینا، جھوٹ بول کر اور فریب دے کر مجھے یاسر عرفات کے قتل پر اکسایا۔ منشیات کا عادی بنایا، وہ کون سا ظلم ہے جو تم نے مجھ پر نہیں کیا۔ تم میری ایک ایک سانس میں جہنم دہکا چکے ہو۔ مجھے حیرت ہے کہ تقدیر بھول بھٹک کر آج مجھ پر کیسے مہربان ہو گئی ہے جو میں تجھے اپنے پاؤں میں گرا ہوا دیکھ رہی ہوں۔ مجھے سو جنم ملتے تو میں ہر بار تجھے کتوں سے نچوا کر موت کے گھاٹ اتارتی۔"

صبا سوشی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ "میں اس کی ٹانگیں توڑ دوں یا سلامت رکھوں۔ میرا مطلب ہے کہ اسے کتوں سے بچنے کے لیے دوڑنے کا موقع دینا چاہتی ہو یا نہیں؟"

سوشی نے اسی لہجے میں جواب دیا۔ "اسے اپنی ٹانگوں پر چل کر مقتل کی طرف جانا چاہیے۔ اس نے اپنے مخالفوں کو کبھی مداخلت کا موقع نہیں دیا تھا لیکن میں اسے مداخلت کا پورا حق دوں گی۔"

صبا خان سے مخاطب ہو کر بولی۔ "تم سوشی کے ساتھ اوپر کی منزل پر جاؤ اور اس کی امی اور نانا کو لا کر جیپ میں سوار کر دو میں مہلب اور نصیری کو لے کر گیٹ پر پہنچتی ہوں۔"

"جی بی بی!" خان نے حسب عادت نرمی سے کہا اور سوشی کو اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ جیسے منتظر کھڑی تھی۔ فوراً باہر کی طرف لپکی، ان دونوں کے جانے کے بعد صبا نے مہلب اور نصیری کے سر کے بال پکڑے اور انہیں گھسیٹتی ہوئی کوریڈور میں لے آئی۔ وہ دونوں با آواز بلند فریاد کر رہے تھے کہ کسی طرح ان کی جان بخشی کر دی جائے۔ مہلب نے انہیں ابوندال کو گرفتار کرانے کا لالچ بھی دیا صبا نے کہا۔

"ابوندال مجھ سے نہیں بچ سکتا۔ وہ ایک نہ ایک دن ضرور میرے ہتھے چڑھے گا، اس کام کے لیے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت نہیں ہے۔"

انہیں بے دردی سے گھسیٹتی ہوئی گیٹ کے قریب لے آئی۔ وہاں پنجروں میں بند کتے بے تابی سے اچھل رہے تھے۔ مہلب نے ایک بار پھر عاجزی سے کہا۔ "صبا! خدا کے لیے مجھ پر ترس کھاؤ۔ میں اپنے سارے گناہوں کی تلافی کر دوں گا مجھے زندہ رہنے کا ایک موقع دے دو۔"

نصیری بھی گڑگڑایا۔ "میں۔ آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میری جان بخشی کر دی جائے گی۔ میں مانتا ہوں میں نے غلط کام کیے۔ تنظیم آزادی فلسطین سے غداری بھی کی لیکن میں مجبور تھا۔ مہلب مجھے جان سے مارنے کی دھمکی دے کر غلط کام کرنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ مجھے چھوڑ دیں میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔"

"تم فکر مت کرو میں تمہیں کتوں کے حوالے نہیں کروں گی۔ اس سزا کا مستحق صرف مہلب ہے۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

مہلب بے ساختہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ وہ روتے ہوئے بولا۔ "یہ میرے ساتھ ظلم ہے صبا! تم مجھے مارنے سے پہلے ایک بار نعمان کے پاس لے چلو۔ وہ تمہیں بتائے گا کہ اصل مجرم میں نہیں ہوں۔"

"میں تمہاری یہ خواہش پوری کر سکتی ہوں لیکن ایک شرط ہے۔"

صبا نے آہستگی سے کہا۔
وہ بولا۔ ”مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔“
خان سوشی کے معذور نانا اور اس کی پاگل ماں کو جیپ میں سوار کر چکا تھا۔ سوشی ثمینہ کو اپنے ساتھ لپٹائے صبا کے پاس کھڑی تھی۔ صبا نے کہا۔ ”دیکھو مہلب! غدار ہمیشہ پیٹھ میں چھرا گھونپتے ہیں اس لیے ان کو انہی کے کسی ساتھی کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتارنا چاہیے۔ اپنے اسی اصول کے تحت میں نے نصیری کو حکم دیا کہ وہ اپنے تینوں ساتھیوں کو گولی مار دے اور اس نے میرے حکم کی تعمیل کی۔ اب شرط کے مطابق پہلا کام تمہیں یہ کرنا ہے کہ نصیری کی گردن تن سے الگ کر دو، چاقو میں تمہیں دیتی ہوں، بولو تیار ہو؟“
”ہاں میں تیار ہوں۔“ مہلب نے فوراً جواب دیا۔
صبا نے اپنا شکاری چاقو اس کی طرف پھینکا اور خود اس پر ریوالور تان کر کھڑی ہو گئی۔

نصیری دہشت زدہ ہو کر چلایا۔ ”مہلب! مجھے نہ مار، تو جانتا ہے میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ ان کا میرے سوا کوئی آسرا نہیں۔“
مہلب نے جواب دیا۔ ”تو صبا کو دھوکا دے سکتا ہے لیکن مجھے نہیں، مجھ سے تیری کون سی بات چھپی ہے۔ تیری ابھی تک شادی نہیں ہوئی تو بچے کہاں سے آ گئے؟“ وہ اپنے مجروح ہاتھ میں چاقو تھام کر اس کی جانب بڑھا۔
نصیری دوبارہ چلایا۔ ”مہلب! اپنی جان بچانے کے لیے تو مجھے موت کے گھاٹ اتارنا چاہتا ہے۔ میں تیرا ہمیشہ وفادار رہا ہوں، جہاں تیرا پسینہ گرا وہاں اپنا خون بہایا ہے۔ کیا میری خدمت کا صلہ......“
وہ اپنی بات مکمل نہ کر سکا۔ مہلب نے نہایت بے دردی سے اس کی گردن پر تیز دھار چاقو پھیر دیا تھا۔ اس کے حلق سے خرخر کی آواز نکل کر رہ گئی۔
صبا نے فوراً آگے بڑھ کر مہلب کے ہاتھ سے خون آلود چاقو لے لیا اور نصیری کو تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہوتے دیکھتی رہی۔
مہلب عاجزانہ بولا۔ ”صبا! میں نے تیرے حکم کی تعمیل کر دی۔ اب تو اپنا وعدہ پورا کر اور مجھے اپنے انکل نعمان کے پاس لے چل۔“
صبا نے قہقہہ لگا کر کہا۔ ”ہاں کیوں نہیں لیکن ابھی ایک اور کام باقی ہے۔“
”ابوندال کی تلاش؟“ وہ سوالیہ نظروں سے صبا کو دیکھتے ہوئے بولا۔
صبا نے حقارت سے کہا۔ ”ابوندال کا ذکر چھوڑ دو۔ وہ میرا شکار ہے، میں اپنے شکار کو خود تلاش کرنے کی عادی ہوں۔“
”پھر کون سا کام ہے؟“ اس نے گھبرا کر دریافت کیا۔
صبا نے اس کا سوال نظر انداز کر کے خان سے کہا۔ ”تم دونوں جیپیں گیٹ سے پندرہ گز دور لے جا کر کھڑی کر دو۔ مہلب جیپ سے تین گز کے فاصلے پر ہو گا۔ سوشی اپنے کتوں کو اس کے تعاقب میں دوڑائے گی۔ اگر مہلب کتوں کے پہنچنے سے پہلے جیپ میں سوار ہو گیا تو اس کی خواہش ضرور پوری کر دی جائے گی۔“
”جی بے بی!“ خان سعادت مندی سے بولا۔
مہلب چلایا۔ ”نہیں نہیں، مجھ پر ظلم نہ کرو، میرا ایک بازو بے کار ہو چکا ہے اور تکلیف سے میری جان نکلی جا رہی ہے۔ اب چند قدم بھی نہیں چل سکتا۔“
”بکواس بند کر غدار! قلعہ بالفورٹ کے فلسطینی فدائین کی رسد تم لوگوں نے کاٹی تھی تو وہ سب کے سب اسرائیلی حملہ آوروں کے ہاتھوں قتل ہو گئے تھے۔ تم نے ان کے لیے بچنے کا ایک راستہ بھی نہیں چھوڑا تھا لیکن بے غیرت ذلیل! میں تمہیں پھر بھی ایک موقع دے رہی ہوں۔“
سوشی، صبا کے ساتھ وہیں کھڑی رہی اور خان باری باری دونوں جیپیں مقررہ جگہ پر لے گیا۔ پھر وہ صبا کے اشارے پر مہلب کو گیٹ سے باہر گھسیٹ لایا۔ تب وہ بآواز بلند چلائی۔ ”خان! تم خالی جیپ میں جا کر بیٹھ جاؤ، دوسری جیپ میں خود ڈرائیو کروں گی۔“
”جی بے بی!“ خان نے کہا اور باہر چلا گیا۔
سوشی نے کتوں کے پاس جا کر انہیں زنجیروں سے آزاد کر دیا اور پھر جیسے ہی مہلب لڑکھڑاتا ہوا جیپ کی طرف بڑھا اس نے کتوں کو اس پر جھپٹنے کا اشارہ کیا۔ کتے اشارہ پاتے ہی مہلب کی طرف لپک پڑے۔ مہلب نے بھاگ کر جیپ تک پہنچنے کی کوشش کی مگر کتوں نے اسے زیادہ مہلت نہ دی۔ جلد ہی اس کی خوفناک چیخوں نے فضا کا سکوت درہم برہم کر دیا۔ جیپ سے صرف چند قدم کے فاصلے پر کتوں نے اسے شکار کر لیا تھا۔ صبا اور سوشی اس کے قریب پہنچیں تو کتے اس کی ہڈیوں سے گوشت علیحدہ کرنے میں مصروف تھے۔

❁

اسرائیلی وزیر اعظم بیگن اور وزیر جنگ جنرل شیرون کی طرح عیسائی فلانجسٹ ملیشیا کا سربراہ بشیر جمائل بھی اشعر سے شدید نفرت کرتا تھا۔ اگر کبھی اس کی کسی پریس کانفرنس میں اشعر موجود ہوتا تو ان دونوں کے درمیان نوک جھونک اکثر تلخ کلامی تک پہنچ جاتی تھی۔ اسرائیلیوں اور اسرائیل نوازوں میں وہ فلسطینیوں کا زبردست حامی اور یاسر عرفات کا معتقد سمجھا جاتا تھا۔ اور یہ بات بھی کسی سے پوشیدہ نہیں تھی کہ مشہور انقلابی شاعرہ انجلا سے اس کا کیا رشتہ ہے۔ چنانچہ فلانجسٹوں کی نظر میں بھی وہ اتنا ہی مجرم تھا جتنا اسرائیلی اسے مجرم سمجھتے تھے۔ دونوں ہی کی نظر میں وہ قابل گردن زدنی تھا۔ جب ایک معاہدے کے بعد لبنان سے فلسطینیوں کے انخلا کا عمل شروع ہوا اور بیروت کے لاکھوں شہری فلسطینی باشندوں کو اشک بار آنکھوں سے ہاتھ ہلا ہلا کر

رخصت کر رہے تھے اس وقت اشعر بھی اس اژدہام میں موجود یہ دل دوز منظر دیکھ رہا تھا کہ اس کے اطالوی معاون نے اسے اطلاع دی۔ "مسٹر اشعر! بشیر جمائل آپ سے فون پر گفتگو کرنا چاہتا ہے۔"

اشعر چونک پڑا۔ اسے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا۔ اس نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا کہا تم نے؟ بشیر جمائل مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے؟"

"جی ہاں جناب! بشیر جمائل آپ سے گفتگو کرنا چاہتا ہے۔" معاون نے جواب دیا۔

اشعر حیران تھا۔ جن حالات کے تحت بشیر جمائل لبنان کا صدر منتخب ہوا اور اس کے جو عزائم تھے ان کے پیش نظر تو اشعر کو یہ توقع تھی کہ برسر اقتدار آتے ہی وہ اسے ناپسندیدہ شخصیت قرار دے کر لبنان سے نکال دے گا مگر ایسا کرنے کے بجائے وہ اشعر سے گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ یہ بات اشعر کے لیے انتہائی حیران کن تھی۔ وہ ان ہی خیالوں میں غلطاں پیچاں فون کے پاس پہنچا اور ریسیور اٹھا کر کان سے لگاتے ہوئے بولا۔ "میں اشعر بول رہا ہوں۔ فرمائیے؟"

"مسٹر اشعر! یقیناً آپ کے لیے یہ بات حیرت کا باعث ہوگی کہ میں نے آپ کو کیوں فون کیا ہے۔" بشیر جمائل کی چہکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"جی ہاں! یہ تو واقعی یہ حیرت کی بات ہے۔" اشعر نے جواب دیا۔

"دراصل میں چاہتا ہوں کہ اب پرانی باتیں فراموش کر کے آپ سے دوستانہ تعلقات استوار کروں۔ اپنے دل میں کسی بدگمانی کو جگہ نہ دیں۔ میں آپ سے چند اہم معاملات پر گفتگو کرنے کا خواہشمند ہوں۔" بشیر جمائل نے کہا۔ "یوں سمجھ لیجیے کہ میں آپ کو ایک خصوصی انٹرویو دینا چاہتا ہوں۔"

"ایک صحافی کی حیثیت سے میرا فرض ہے کہ میں اپنے اخبار کے لیے آپ کا انٹرویو کروں خواہ میرے اور آپ کے درمیان تعلقات کی نوعیت کیسی ہی ہو۔ بہرحال فرمائیے مجھے کس وقت اور کہاں پہنچنا ہے؟" اشعر نے کہا۔

"شکریہ مجھے آپ سے یہی امید تھی۔ آج رات نو بجے ہوٹل الیگزینڈر کی پانچویں منزل پر میری سیکرٹری آپ کے استقبال کے لیے موجود ہوگی۔" بشیر جمائل نے جواب دے کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

اشعر کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ بشیر جمائل جو اسے سخت ناپسند کرتا تھا، جس نے ماضی میں کئی بار اسے انٹرویو دینے سے صاف انکار کر دیا تھا اچانک اس پر اتنا مہربان کیوں ہو گیا ہے۔ اس نے اس سلسلے میں اپنے دوست شیخ یمنی سے مشورہ کیا۔ شیخ یمنی نے اس کی بات سن کر کہا۔ "برادر عزیز! اس میں ضرور کوئی چکر ہے۔"

"میں سمجھا نہیں تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" اشعر نے کہا۔

"کمال ہے یار! تم اتنے سینئر صحافی ہو کر بشیر کی باتوں میں خطرے کی بو نہیں محسوس کر سکے۔" شیخ یمنی نے کہا۔

"تمہارا مطلب ہے کہ اس طرح وہ مجھے مشرقی بیروت کے ایک ہوٹل میں بلا کر میرا کام تمام کرنا چاہتا ہے؟"

"ہاں، بالکل یہی بات ہے۔" شیخ یمنی نے جواب دیا۔

"نہیں دوست! میں بشیر جمائل کو اتنا احمق نہیں سمجھتا کہ وہ صدارت کا عہدہ سنبھالنے سے قبل ایسی کوئی حرکت کر کے دنیا کی نظروں میں خود کو ذلیل کرنے کا سامان کرے گا۔ اس کے علاوہ میں کوئی اتنا اہم شخص بھی نہیں ہوں جس سے اسے کوئی خطرہ محسوس ہو۔"

"ہوں، تم بھی ٹھیک ہی کہہ رہے ہو لیکن پھر بھی میں تمہیں یہی مشورہ دوں گا کہ اس افراتفری کے زمانے میں تمہارا مشرقی بیروت میں جانا مناسب نہیں ہے۔" شیخ یمنی نے اسے سمجھایا۔

"لیکن میں بشیر جمائل سے وعدہ کر چکا ہوں۔"

"ٹھیک ہے، تم اس سے کوئی بہانہ بھی کر سکتے ہو۔"

"اب یہ مناسب نہیں ہے۔" اشعر بولا۔

"کیوں؟ کیوں مناسب نہیں ہے؟" شیخ یمنی نے پوچھا۔

"یہ بددیانتی ہوگی۔ اپنے پیشے سے بددیانتی۔" اشعر نے جواب دیا۔

"اچھا تو پھر میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔" شیخ یمنی بولا۔

"نہیں، اگر اس نے واقعی اس طرح میرے قتل کا سامان کیا ہے تو تم بھی میرے ساتھ خواہ مخواہ اس کا نشانہ بن جاؤ گے۔"

"پروا مت کرو، تمہارے ساتھ مرا تو موت کا دکھ نہیں ہوگا۔"

"میں تمہاری محبت کی قدر کرتا ہوں لیکن میں تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے جاؤں گا۔"

"کیوں؟" شیخ یمنی نے پوچھا۔

"اس لیے کہ بشیر جمائل نے مجھے تنہا بلایا ہے۔"

"ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔" شیخ یمنی نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔

اس نے اشعر سے زیادہ اصرار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اسے یقین تھا کہ اشعر اسے ساتھ لے جانے پر کبھی آمادہ نہیں ہوگا۔ چنانچہ اس نے فیصلہ کر لیا کہ جب اشعر مشرقی بیروت کے لیے روانہ ہوگا تو وہ خاموشی سے اس کا تعاقب کرے گا اور اگر اسے کوئی خطرہ ہوا تو اس کی مدد کرنے کی کوشش کرے گا۔

اشعر کو ڈور ہوٹل پہنچا تو میمونہ کو بے چین و پریشان ٹہلتے دیکھ کر فکرمندی سے پوچھا۔ "خیر تو ہے تم کچھ پریشان نظر آ رہی ہو؟ انجلا کی طبیعت کیسی ہے؟"

میمونہ نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔ "اشعر! انجلا نہ جانے کہاں چلی گئی ہے۔"

"کیا؟ کہاں چلی گئی ہے؟ یہیں کہیں ہوگی جانے گی کہاں؟" اشعر نے بوکھلا کر کہا۔

"اس کا کچھ پتا نہیں چل رہا ہے۔ ایک گھنٹہ قبل وہ یہ کہہ کر نیچے گئی تھی کہ ذرا لوبیرو کوکو سے باتیں کر کے واپس آتی ہوں، مگر پھر وہ نہ جانے کہاں غائب ہوگئی۔ پورا ہوٹل چھان مارا ہے میں نے وہ کہیں نہیں ہے۔"

"اچھا ٹھہرو، میں معلوم کرتا ہوں۔"

اشعر اسے دلاسہ دے کر واپس مڑا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ نیچے جا کر اس نے پہلے ہوٹل کے مالک ابویوسف کے پالتو طوطے کوکو کے پنجرے کے پاس انجلا کو دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہ وہاں نہیں تھی۔ اشعر نے صفوان نامی ایک بیرے سے پوچھا۔ "صفوان! تم نے انجلا کو دیکھا ہے؟ وہ تھوڑی دیر پہلے کوکو سے باتیں کرنے نیچے آئی تھی۔"

"ہاں جناب! میں نے تقریباً ایک گھنٹہ قبل انہیں کوکو کے پاس کھڑے دیکھا تھا۔" صفوان نے بتایا۔

"پھر وہ کہاں گئی ہے؟"

"یہ میں نہیں جانتا جناب! کیا وہ اپنے کمرے میں نہیں ہیں؟"

"نہیں وہ وہاں نہیں ہے۔"

"جناب! میں خود بھی حیران تھا۔ ایک گھنٹہ قبل میں نے ادھر سے گزرتے ہوئے انہیں کوکو سے باتیں کرتے دیکھا تھا اور پانچ منٹ بعد جب میں دوبارہ ادھر سے گزرا تو وہ موجود نہیں تھیں۔ مجھے حیرت ہوئی تھی کہ وہ اتنی جلدی کوکو کے پاس سے کیسے چلی گئیں۔ سب جانتے ہیں کہ کوکو سے ان کی بڑی گہری دوستی ہے، وہ جب بھی اس کے پنجرے کے پاس جاتی ہیں گھنٹوں کھڑی اس سے باتیں کیا کرتی ہیں۔ مگر میں یہ سوچ کے خاموش ہوگیا کہ شاید آج ان کی طبیعت ٹھیک نہ ہو۔"

اسی وقت ہوٹل کا مالک ابویوسف وہاں آگیا۔ وہ اشعر کا گہرا دوست تھا۔ اس نے اشعر سے پوچھا۔ "کیوں میرے پاکستانی دوست! صفوان سے کیا باتیں ہو رہی ہیں؟"

اشعر کے جواب دینے سے پہلے ہی صفوان بول پڑا۔ اس نے ابویوسف کو انجلا کی گمشدگی کے بارے میں بتایا تو ابویوسف چکرا کر رہ گیا۔ اس نے اشعر کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "میرے ساتھ آؤ میں استقبالیہ سے معلوم کرتا ہوں۔ اگر انجلا باہر گئی ہے تو وہاں موجود لڑکیوں میں سے کسی نے اسے باہر جاتے ضرور دیکھا ہوگا۔"

وہ اشعر کے ساتھ استقبالیہ کاؤنٹر کی طرف چل دیا۔ جہاں دو سوئس اور دو لبنانی لڑکیاں ڈیوٹی دے رہی تھیں۔ ابویوسف نے ان کے قریب پہنچ کر پوچھا۔ "تم لوگ انجلا کو جانتی ہو؟"

"جی ہاں جناب!" انھوں نے بیک زبان کہا۔

"کیا تم اس کے متعلق کچھ جانتی ہو؟"

"آپ کی بات کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا جناب!" ایک لبنانی لڑکی نے کہا۔

ابویوسف نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "ایک گھنٹہ قبل وہ نیچے

ہفتۂ صفائی منایا جا رہا تھا۔
شوہر نے بیوی سے کہا۔ "بیگم! گھر کی اچھی طرح صفائی کرانی ہے، کہیں کوئی کچرا نہ رہ جائے۔ ایک ایک کونے سے فالتو چیزیں نکلوا کر پھنکوا دو۔" بیگم نے معصومیت سے جواب دیا۔ "دیکھیے میں ساری فالتو چیزیں کیسے پھنکوا سکتی ہوں۔ آخر کو آپ میرے شوہر ہیں۔"

٭٭٭
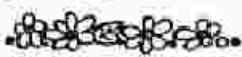
"کرکٹ کے ایک نامور کھلاڑی کو پورے سیزن میچ کے دوران ایک بار بھی چوٹ نہیں لگی لیکن جب بیوی کی فرمائش پر اسے ایک ایسے بڑے اسٹور میں جانا پڑا جہاں عورتوں کی آرائش اور ملبوسات کی سیل لگی تھی اور عورتوں کی بے انتہا بھیڑ تھی۔ وہاں سے خریداری کے بعد جب وہ نکلا تو اس کی ایک آنکھ کے اوپر نیل کا نشان تھا، ایک پاؤں زخمی اور کچھ پسلیاں ٹوٹ چکی تھیں۔" (محسن خان کے لیے ہم دعا ہی کر سکتے ہیں۔) (ماخوذ)

مرسلہ: مرزا ذوالفقار حسین (آرزو نقی)
(سعودی عرب)

آئی تھی اور یہاں کوکو کے پنجرے کے پاس کھڑی اس سے باتیں کر رہی تھی۔ کیا تم میں سے کسی نے اسے باہر جاتے ہوئے دیکھا تھا؟"

چاروں لڑکیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر بیک وقت نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولیں۔ "نہیں جناب!"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ تمہارے سامنے باہر نہیں گئی۔" ابویوسف بولا۔

"جی ہاں جناب! ہم میں سے کسی نے انہیں باہر جاتے نہیں دیکھا۔" ایک لڑکی نے جواب دیا۔

"تم لوگوں نے اسے کوکو کے پاس کھڑے ہوئے تو دیکھا ہوگا؟" اشعر نے سوال کیا۔

ایک سوئس لڑکی نے جواب دیا۔ "نہیں جناب! ممکن ہے جس وقت وہ وہاں کھڑی تھیں، ہمارے کاؤنٹر پہ گاہکوں کا زیادہ ہجوم ہو اور ہم انہیں نہ دیکھ سکے ہوں۔"

ابویوسف، اشعر کا ہاتھ پکڑ کے ہوٹل کے اس دربان کی طرف بڑھ گیا جو ہوٹل میں آنے جانے والوں کے لیے دروازہ کھولتا تھا۔ دربان نے ابویوسف کو دیکھ کر سلام کیا۔ ابویوسف نے اس کے سلام کا جواب

دے کر پوچھا "تم انجلا بی بی کو جانتے ہو؟"
دربان نے جواب دیا "کیوں نہیں جناب! اشعر صاحب کی بہن کو یہاں کون نہیں جانتا۔"
"ایک گھنٹے کے دوران میں تم نے انہیں ہوٹل سے باہر جاتے دیکھا ہے؟"
"جناب! مجھے یہاں ڈیوٹی دیتے ہوئے ابھی صرف دس منٹ ہوئے ہیں۔ اس دوران میں نے انہیں نہیں دیکھا۔" دربان نے جواب دیا۔
"تم سے پہلے یہاں کون ڈیوٹی دے رہا تھا؟"
"جوزف نیگرو جناب!" دربان نے جواب دیا۔
ابو یوسف نے اشعر سے کہا "اشعر! تم میرے آفس میں بیٹھو میں جوزف کو بلوا تا ہوں۔ شاید اس سے ہمیں کوئی کام کی بات معلوم ہو سکے۔"
اسی وقت فوزیہ وہاں پہنچ گئی۔ وہ بے حد اداس اور مضمحل تھی کیونکہ لبنان سے رخصت ہونے والے فلسطینی مجاہدین میں اس کا عامر بھی شامل تھا۔ چونکہ وہ خود اپنے اسپتال کی ذمہ داریوں کی وجہ سے لبنان سے نہیں جا سکتی تھی لہٰذا عامر کی جدائی نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔ یہاں آ کر اس نے اشعر کو پریشان حال دیکھا تو اپنا غم بھول گئی۔ اس نے اشعر سے پوچھا "اشعر بھائی! خیریت تو ہے؟ آپ اس قدر پریشان کیوں ہیں؟"
"ہاں فوزیہ! اچھا ہوا اس وقت تم آ گئیں۔ انجلا دیر سے لاپتا ہے۔ ہم لوگ اس کی وجہ سے سخت پریشان ہیں۔"
"کیا؟ کیا کہا؟ انجلا لاپتا ہے؟" فوزیہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولی۔
اشعر کو اچانک کچھ خیال آیا اور وہ فوزیہ کو انجلا کی گمشدگی کے بارے میں مزید کچھ بتائے بغیر استقبالیہ کاؤنٹر پر پہنچا اور ریسیور اٹھا کر کسی کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ ابو یوسف اور فوزیہ بھی اس کے قریب جا کر کھڑے ہو گئے۔ چند لمحے بعد دوسری جانب سے سلسلہ مل گیا۔ اشعر نے پوچھا "شہابی ہیں؟"
پھر وہ کچھ دیر خاموش کھڑا رہا۔ غالباً دوسری جانب سے اسے انتظار کرنے کو کہا گیا تھا۔ اس دوران ہوٹل کا منیجر ابو یوسف کے پاس پہنچ گیا۔ ابو یوسف نے اسے دیکھتے ہی اس سے جوزف نیگرو کو بلوانے کے لیے کہا تو وہ فوراً الٹے قدموں واپس چلا گیا۔
اسی لمحے اشعر کی آواز سنائی دی۔ وہ فون پر شہابی سے مخاطب تھا "شہابی! میں جانتا ہوں تم اور ڈاکٹر الناصر اس وقت بے حد مصروف ہو گے۔ تمہیں جلد از جلد فدائین کے دوسرے دستے کی روانگی کے انتظامات کرنا ہیں لیکن میں جس سلسلے میں تمہیں زحمت دے رہا ہوں وہ بھی بے حد اہم ہے۔" پھر اس نے شہابی کو انجلا کی گمشدگی کے بارے میں بتا کر اس سے اس سلسلے میں مدد کی درخواست کی۔
پھر وہ کچھ دیر خاموش کھڑا شہابی کی بات سنتا رہا۔ اس کے بعد اس نے کہا "ٹھیک ہے میں آ رہا ہوں۔ مجھے بھی ڈاکٹر الناصر سے ایک اہم مسئلے پر بات کرنا ہے۔" وہ سلسلہ منقطع کر کے مڑا۔
ابو یوسف نے کہا "کیا تم کہیں جا رہے ہو؟"
"ہاں، مجھے یاسر عرفات نے فوراً طلب کیا ہے۔" اشعر نے جواب دیا۔
"تم چلے جاؤ گے تو انجلا بی بی کا مسئلہ کیسے حل ہو گا؟"
اشعر نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ فوزیہ سے بولا "فوزیہ! تم اوپر بھابی کے پاس جا کر اسے تسلی دو۔ میں یاسر عرفات سے مل کر جلد واپس آنے کی کوشش کروں گا۔"
"لیکن یہ انجلا کا کیا معاملہ ہے؟ مجھے کچھ بتاؤ تو؟"
"اس وقت مجھے بہت جلدی ہے۔ تم اوپر جاؤ۔ میمونہ تمہیں سب کچھ بتا دے گی۔ اسے یہ بھی سمجھا دینا کہ فکر نہ کرے۔ میں نے شہابی کو اطلاع دے دی ہے اس کے آدمی جلد ہی انجلا کو ڈھونڈ نکالیں گے۔" اشعر نے جواب دیا۔
فوزیہ حیرت سے اشعر کو دیکھ رہی تھی۔ چند لمحے قبل اشعر کے چہرے پر جو پریشانی اور فکر مندی چھائی ہوئی تھی۔ اس کا اب کہیں پتا نہیں تھا اس کی جگہ اطمینان اور بے پروائی نے لے لی تھی۔ ابو یوسف نے بھی یہ تبدیلی محسوس کر لی۔ اس نے کہا۔
"اشعر! کیا تمہیں انجلا کی کوئی فکر نہیں رہی۔ تم اسے بالکل ہی بھول گئے ہو؟"
"ابو یوسف! تم نے یہ بات کیسے کہہ دی؟ انجلا میری چھوٹی بہن ہے۔ میں اسے اپنی زندگی سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔ یہ خیال تمہارے دل میں کیسے آیا کہ میں اسے بھول گیا ہوں؟" اشعر نے قدرے ناگواری سے کہا۔
"اس لیے کہ تم اس کی تلاش کا معاملہ ادھورا چھوڑ کر جا رہے ہو۔" ابو یوسف نے جواب دیا۔
"برادر ابو یوسف! اس کی وجہ یہ نہیں ہے جو آپ نے سمجھی بلکہ وجہ یہ ہے کہ شہابی نے مجھے یقین دلایا ہے کہ جب میں یاسر عرفات سے ملاقات کر کے واپس ہوٹل پہنچوں گا تو انجلا وہاں موجود ہو گی۔ اور مجھے شہابی کی صلاحیتوں اور اس کی زبان پر پورا یقین ہے۔ میرے اطمینان کا سبب یہی ہے کہ مجھے امید ہے میری واپسی پر انجلا مجھے یہیں ملے گی۔"
فوزیہ نے کہا "کہیں انجلا شہابی کے ساتھ ہی تو نہیں گئی ہے؟"
"نہیں، نہ، یہ خیال غلط ہے۔ اب تم اوپر جاؤ، میمونہ اکیلی پریشان ہو رہی ہو گی۔"
فوزیہ لفٹ کی طرف چلی گئی اور اشعر ابو یوسف سے رخصت ہو کر ہوٹل سے باہر نکل گیا۔

مغربی بیروت میں آج سوگوار سا سکوت تھا۔ بموں کے خوفناک دھماکوں، بمبار طیاروں کی اعصاب شکن گڑگڑاہٹ اور ساٹھ ہزار اسرائیلی حملہ آوروں کی فائرنگ کے شور نے بارہ ہفتے تک شہر کے اس حصے پر قیامت کا سماں باندھے رکھا تھا۔ یہاں کی بیشتر شاندار اور فلک بوس عمارتیں توپوں کے وزنی گولوں اور طیاروں کی قیامت خیز بمباری کی بدولت زمین بوس ہو چکی تھیں۔ بجلی منقطع تھی اور آب رسانی کا سلسلہ ٹوٹ جانے کے بعد العطش العطش کی دم توڑتی آوازوں نے سانحہ کربلا کی یاد تازہ کر دی تھی۔ بارود کی بو اور آگ کے شعلوں کے سوا کچھ باقی نہ رہا تھا۔ جلی ہوئی مسخ لاشوں، زخموں سے بے حال بوڑھوں، بچوں اور عورتوں سے گلی کوچے پٹے پڑے تھے۔ تباہی کا ایسا ہولناک منظر، بربریت کا ایسا لرزہ خیز مظاہرہ چشم فلک نے جنگ عظیم کے بعد پہلی بار دیکھا ہوگا۔

زمین پر قیامتِ صغریٰ کی یہ منظر کشی صرف اس لیے کی گئی تھی کہ یہاں ارضِ فلسطین کے خانماں بربادوں نے پناہ حاصل کر لی تھی۔ اور اسرائیل اور فلانجسٹوں کو یہ بات پسند نہیں آئی تھی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ وطنِ عزیز کی آزادی کے لیے یاسر عرفات کی قیادت میں جو فدائین سر سے کفن باندھے آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں انہیں کہیں پناہ مل سکے۔ بارہ ہفتے مغربی بیروت پر آگ برسانے کے بعد بالآخر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے تھے۔ آج مغربی بیروت میں سکوت تھا مگر اس خطۂ شہر کا ہر باشندہ سوگوار تھا۔ مجاہدین کے دستے یکے بعد دیگرے رخصت ہو چکے تھے اور لاکھوں اشک بار آنکھیں انہیں الوداع کہہ رہی تھیں۔

آسمان اداس اور انسانیت نوحہ کناں تھی کہ امن، آشتی اور انسانی عظمتوں کے گن گانے والی عظیم طاقتیں یا تو مہر بہ لب تھیں یا مظلوموں کو مشورہ دے رہی تھیں کہ ظالموں کے آگے سرنگوں ہو جائیں ظالم کا ہاتھ روکنے کے بجائے سر جھکا کر ظلم سہنے کی خو اپنائیں کہ یہ بین الاقوامی غنڈہ گردی تو انہیں برداشت کرنا ہی پڑے گی۔ کیونکہ خود ان کی قوم نے مصلحت کو شعار بنا لیا ہے۔ مسلم ممالک کے ہتھیاروں کا ذخیرہ اس غنڈہ گردی کو روکنے کے لیے نہیں باہم دست و گریباں ہونے کے لیے ہے۔ نوے کروڑ مسلمان ان کے لیے دعا کے سوا کچھ نہیں کر سکتے کہ انہیں اپنے باہمی جھگڑوں سے ہی فرصت نہیں۔

اشعر پی ایل او کے ہیڈ کوارٹر کی عمارت میں داخل ہوا تو اسے درجنوں باوردی مسلح فدائین دکھائی دیے جو اگلے روز روانہ ہونے والے دستے کی روانگی کے انتظامات کرنے میں مصروف تھے۔ وہاں اس کی ملاقات چند یورپی صحافیوں سے بھی ہوئی۔ ان میں سے ایک پرتگالی یہودی تھا وہ اشعر کو دیکھتے ہی بولا۔ "اب تم اپنے پاکستان کی خیر مناؤ۔"

"کیا مطلب ہے؟" اشعر نے آنکھیں دکھاتے ہوئے پوچھا۔

وہ ہنس کر کہنے لگا۔ "سوویت یونین نے افغانستان ہڑپ کر لیا۔ اسرائیلیوں نے لبنان کو عملاً اپنی کالونی کی شکل دے دی ہے۔ پی ایل او کے انخلا کے بعد بیگن کو کوئی فکر نہیں رہے گی۔ ظاہر ہے اس کے بعد اگلا ٹارگٹ پاکستان ہوگا جو اس وقت اسلامائزیشن کا سب سے بڑا علمبردار بن چکا ہے۔"

اشعر نے جواب دیا۔ "مسٹر! ایک زمانے میں تمہارا ملک پرتگال تجارت کی جوڑ توڑ کے بہانے مختلف غریب ممالک کو اپنی نوآبادیاں بنانے کے جنون میں مبتلا تھا لیکن جب ایشیائی اور افریقی اقوام بیدار ہوئیں تو پرتگالی صرف پرتگال میں محصور ہو کر رہ گئے۔ تم غالباً اپنے شرمناک ماضی کے حوالوں سے یہ اندازہ لگا رہے ہو کہ اسرائیل، سوویت یونین یا کوئی اور فوجی طاقت تاریخ کا پہیہ الٹا چلا دے گی۔ نہیں میرے دوست! یہ تمہاری بھول ہے، حماقت ہے، ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ تاریخ کا پہیہ ہمیشہ آگے کی طرف چلتا ہے۔ افغانستان مفتوح ہو سکتا ہے اور نہ ہی لبنان۔ فوجی تسلط صرف ایک محدود مدت کے لیے ہوتا ہے۔ رہ گئی بات میرے مقدس وطن پاکستان کی تو بابائے قوم قائداعظم نے کہا تھا کہ خدا کی قسم میں اس وقت تک اپنی شکست تسلیم نہیں کروں گا جب تک دشمن آٹھ کروڑ مسلمانوں کو اٹھا کر بحیرہ عرب میں نہ پھینک دے۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ چالیس لاکھ اسرائیلی آٹھ کروڑ پاکستانیوں کو بحیرہ عرب میں دھکیل سکتے ہیں؟ جو ان کی ساٹھ ہزار فوج جدید ترین اسلحہ سے لیس ہونے کے باوجود پانچ ہزار فلسطینی فدائین کو شکست نہیں دے سکی تو آٹھ کروڑ پاکستانیوں کو کس طرح زیر کر سکے گی؟"

یوگوسلاویہ کا ایک صحافی بے ساختہ بولا۔ "واہ واہ اشعر! کیا دندان شکن جواب دیا ہے تم نے۔ میں نے ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بڑے قصے سنے ہیں۔ میرا بڑا جی چاہتا ہے کہ پاکستان جاؤں اور اس بہادر قوم کو اپنی آنکھوں سے دیکھوں۔"

"ضرور جاؤ۔" اشعر نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔ "تم میرے کراچی، لاہور، پشاور، راولپنڈی، سرگودھا اور سیالکوٹ کو دیکھو گے تو تمہیں خود بخود یہ احساس ہوگا کہ یہ تمام شہر مغربی بیروت کے برادر ہیں۔ اسی کی طرح خوددار اور آزادی کے متوالے۔"

پرتگالی یہودی صحافی اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ اسی دوران شہابی ادھر آ نکلا۔ وہ اشعر کو دیکھتے ہی اس کی طرف لپکا اور اس کا بازو پکڑ کر اندر لے گیا۔

پرتگالی صحافی کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہوئیں اور وہ ایک دوسرے صحافی کو ٹہوکا دیتے ہوئے بولا۔ "یہ پاکستانی اپنے آپ کو بڑا تیس مار خاں سمجھتا ہے۔ دو چار روز کی بات اور ہے پھر اس کی ساری اکڑفوں نکل جائے گی۔"

"وہ کیسے؟" ایک صحافی نے کریدا۔

اس نے اپنے کندھوں کو ایک مخصوص انداز میں جھٹکا دیا اور

کہا۔ ”دو تین روز میں فلسطینیوں کا انخلا مکمل ہو جائے گا اس کے بعد بیروت پر عملاً اسرائیلیوں اور فلانجسٹوں کی حکومت ہوگی۔ وہ اس پاکستانی کے نام سے خار کھاتے ہیں یا تو یہ جیل ہی ہوگا اور یا پھر لبنان سے باہر نکال دیا جائے گا۔“

”اشعر کو نتائج کی کوئی پروا نہیں مسٹر!“ یوگوسلاویہ کے صحافی نے اس کے سینے پر ٹھوکا مارتے ہوئے کہا۔ ”وہ سر پھرا ہے اور اصولوں پر کبھی سودے بازی نہیں کرتا۔ سب جانتے ہیں کہ صیدون پر اسرائیلی بمباری کی رات اس کی بیوی اور بچہ بچھڑ گئے تھے۔ وہ چاہتا تو اپنے بارے میں ایک ڈسپیچ تیار کرکے بھجوا دیتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ کہتا تھا کہ یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے۔ اس کی خبر رساں ایجنسی اسے تنخواہ اس بات کی نہیں دیتی۔ وہ تو شیخ ممبی نے دوڑ دھوپ کی اور اس طرح یہ بات منظرِ عام پر آئی۔ پرتگال کے یہودی صحافی کا قصہ ایک بار پھر لٹک گیا۔

اشعر کمرے میں داخل ہوا تو اس کی ملاقات سب سے پہلے ڈاکٹر الناصر سے ہوئی۔ وہ عجیب و غریب حلیے اور میک اپ میں تھا۔ اشعر اسے اس وقت تک نہیں پہچان سکا جب تک اس نے گفتگو کا آغاز نہیں کیا۔ ڈاکٹر الناصر فلسطینی قوم کے ان گنے چنے ہیروز میں سے ایک تھا جن کے سامنے تاریخ ہمیشہ مقروض رہتی ہے۔ وہ کہنے لگا۔ ”برادر اشعر! ابو عمار تم سے ایک بہت ضروری مسئلے پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔“

”میں اسی لیے حاضر ہوا ہوں جناب!“ اشعر نے فرطِ عقیدت سے انھیں نے ہاتھ چومتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر الناصر فوراً اپنی جگہ کھڑا ہو گیا اور جلدی سے بولا۔ ”یہ کیا کر رہے ہو برادر! تم نے اور تمہاری پاکستانی قوم نے جس خلوص سے ہماری اخلاقی مدد کی ہے ہم فلسطینی کبھی اس احسان کو نہیں چکا سکتے۔“

”ملال اس بات کا ہے برادر الناصر! کہ ہم پاکستانی اس آگ اور خون کے طوفان میں آپ لوگوں کے لیے کچھ بھی نہ کر پائے۔“ وہ دکھی لہجے میں بولا۔

الناصر نے اس کے شانے پر تھپکی دی اور کہا۔ ”ایسا مت کہو، پاکستان نے اسرائیل کے دوست ممالک کو ناراض کرکے سفارتی سطح پر ہمارے حق میں باقاعدہ جنگ لڑی ہے۔ ابھی رات ہی ابو عمار چند ساتھیوں میں بیٹھے کہہ رہے تھے کہ زندگی نے مہلت دی تو وہ ایک بار پاکستان ضرور جائیں گے تاکہ وہاں کے عوام، صحافیوں، ادیبوں اور فنکاروں کا شکریہ ادا کر سکیں جنھوں نے جنگِ بیروت کو اپنی لفظی جنگ تصور کیا۔“

”یہ سر عرفات کی بڑی اعلیٰ ظرفی ہے۔“ اشعر کا چہرہ وفورِ جذبات سے تمتمانے لگا تھا۔

دفعتاً ڈاکٹر الناصر نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ”اشعر! آج رات تم شاید ایک خوشخبری سن سکو۔“

”خوشخبری؟“ اشعر نے حیرت سے دہرایا۔

”ہاں، اسے خوشخبری ہی کہنا چاہیے۔ اگر سوشی اپنے گھر کے بچے کچھے افراد کے ہمراہ مغربی بیروت چلی آئے۔“ الناصر آہستگی سے بولا۔

وہ بڑبڑا کر بولا۔ ”میرے خدا یہ میں کیا سن رہا ہوں؟“

الناصر نے وضاحت کی۔ ”میں نے صبا کو یہ فریضہ سونپا ہے۔ وہ اس وقت شاید اپنے مشن پر روانہ ہو چکی ہو۔ بہرحال دعا کرو۔ البندال کا ٹولہ نہایت خطرناک جرائم پیشہ افراد پر مشتمل ہے اور پھر مطلب تو اس کا دستِ راست ہے۔“

اشعر کی آنکھوں میں وہ مناظر گھوم گئے جب وہ تریپولی جاتے ہوئے اتفاقاً مطلب کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ وہ اسے زخمی اور بیہوش کرکے حویلی میں لے گیا جہاں اس کی ملاقات سوشی سے ہوئی۔ ابتدا میں وہ لڑکی اس کے لیے ایک پریشان کن معمہ بنی رہی لیکن بہت جلد یہ تلخ حقیقت واشگاف ہوئی کہ وہ بے حد دکھی اور مظلوم لڑکی تھی اسی نے اشعر کو مطلب کی قید سے نجات دلائی اور بعد ازاں صیدون میں اپنی ایک مشنری سہیلی جولیانہ کے ہاں چھوڑ گئی جس کے باپ نے اشعر کو اس کی گمشدہ بیوی میمونہ اور بچے مونی سے ملوا دیا۔ اشعر کی بڑی آرزو تھی کہ وہ کسی طرح سوشی کو اس مذبح خانے سے نکال لے لیکن بعض ناگزیر دشواریوں کے سبب اس کے لیے جلد ایسا کرنا ممکن نہ تھا تاہم اس نے سوشی کی دکھ بھری داستان ڈاکٹر الناصر کو سنا دی تھی اور الناصر نے وعدہ کیا تھا کہ مغربی بیروت سے فلسطینی فدائین کے انخلا سے پہلے پہلے وہ سوشی کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کرے گا۔

اشعر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے صبا کو ہدایت کر دی ہے نا کہ وہ پہلے ثمینہ کو اپنے قبضے میں کرے خدانخواستہ مطلب نے بچی کو کوئی گزند پہنچایا تو سوشی صدمے ہی سے مر جائے گی۔“

”تم فکر مت کرو میرے دوست!“ الناصر نے اسے تسلی دی۔ ”صبا واقعتاً اس صدی کی بایونک گرل ہے۔ وہ ذہانت، حکمتِ عملی اور ایکشن میں مجھ پر بھی بھاری ہے۔ جو کچھ کرے گی درست ہی کرے گی۔“

اشعر نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ”میں نے صبا کو نہیں دیکھا۔ البتہ عامر اور شہابی سے اس کا ذکر سنا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ آپ جیسا حقیقت پسند شخص بھی اس کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہا ہے۔“

الناصر نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا اور تھوڑی دیر کے بعد بولا۔ ”تم اگر صبا سے ذاتی طور پر ملو تو زندگی بھر کے لیے اس کی یادوں سے پیچھا نہیں چھڑا سکو گے۔“

”واقعی؟“ اس بار وہ دنگ رہ گیا۔ ڈاکٹر الناصر کے متعلق اس کے شناسا کہتے تھے۔ یہ بات زبان زدِ عام تھی کہ اس کے سینے میں دل نہیں پتھر ہے اور وہ کبھی کسی لڑکی یا خاتون کے

متعلق بات کرنا گوارا نہیں کرتا جبکہ صبا کے معاملے میں یہ بات غلط ثابت ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر الناصر بھی چہرے کے تاثرات سے اس کی دلی کیفیات کو بھانپ گیا۔ وہ سنجیدہ ہو کر بولا۔ ”تم کسی غلط فہمی کا شکار مت بنو اشعر برادر! صبا کو مرد کی آنکھ سے نہیں ایک حریت پسند اور مجاہدہ کے حوالے سے دیکھو۔ دو تین دن میں مغربی بیروت سے فلسطینی فدائین کا انخلا مکمل ہو جائے گا۔ اس کے بعد شاید کبھی یہ جگہ ہمارا محاذ نہ بن سکے۔ ان حالات میں جبکہ اس خطے میں اسرائیلیوں اور فلنجیوں کا تسلط ہوگا، صبا سارے لبنان میں پی ایل او کی انٹیلی جنس کی سربراہ ہوگی۔ اسے ہی خفیہ طور پر اسرائیلیوں اور فلنجیوں کے خلاف ہماری جنگ کا سلسلہ قائم رکھنا ہے۔ اب تم فیصلہ کر لو کہ وہ مجھ پر بھاری ہے یا نہیں؟“

”آپ کی گفتگو سے میں واقعی پریشان ہو گیا ہوں۔“ اشعر نے کھلے دل سے اعتراف کیا۔

”مجھے حیرت ہے کہ میں آتنی عظیم فلسطینی مجاہدہ سے آج تک نہیں مل پایا۔“

”جو کچھ میں نے تمھیں بتایا ہے اس کی کسی کو بھنک نہ پڑنے پائے ورنہ سارا کھیل بگڑ جائے گا کیونکہ اسرائیلی فلنجی اور میجر حداد کی ملیشیا یہی سمجھتی ہے کہ وہ ان کی ایجنٹ ہے اور ہماری دشمن ہے۔ اس لیے برادر! تم بھول کر بھی اس سے ملاقات کرنے کی کوشش نہ کرنا، ہو سکتا ہے تمھاری اس غلطی کے باعث اس کی حیثیت ہمارے دشمنوں کی نظر میں مشتبہ ہو جائے۔ سمجھ گئے نا؟“

”برادر! آپ بالکل فکر نہ کریں۔ میں آپ کی ہدایات کا ہمیشہ خیال رکھوں گا۔“

”اور ہاں ایک بات اور۔“ ڈاکٹر الناصر نے سرگوشی کی۔ ”شہابی خفیہ طور پر بیروت میں مقیم رہے گا۔ اس کا رابطہ تم سے ہوگا اور کچھ عرصے کے لیے جب تک انخلا کے بعد صورتحال درست نہیں ہو جاتی، میرے اور شہابی کے درمیان پیغام رسانی تمھارے توسط سے ہوگی تمھیں اعتراض تو نہیں؟“

”اعتراض!“ اشعر ہنسا۔ ”برادر! آپ کیسی بات کر رہے ہیں فلسطینیوں کے کاز کی خاطر تو میں اپنا خون دینے کے لیے تیار ہوں۔“

”شاباش!“ الناصر کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ”اب ابو عمار کے پاس چلیں وہ تمھارے منتظر ہوں گے۔“

وہ اس کے بازو میں بازو ڈال کر ایک طرف کوریڈور میں چلنے لگا۔ کچھ دور چل کر الناصر نے ایک دروازے پر آہستگی سے دستک دی پھر دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے اشعر تھا۔ یہ یاسر عرفات کا آفس تھا۔ وہ ایک صوفے پر تنہا بیٹھے کسی گہری سوچ میں مستغرق تھے۔ ان دونوں کو دیکھ کر چونکے اور اٹھ کر اشعر سے مصافحہ کیا۔ ڈاکٹر الناصر باہر جانے لگے تو انھوں نے آواز دے کر ٹھہرایا اور ایک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ الناصر فوراً بیٹھ گئے۔

رسمی گفتگو کے بعد یاسر عرفات نے اشعر کی طرف مڑ کر دیکھا اور کہا۔ ”برادر! الناصر کی اطلاع ہے کہ بشیر جمائل نے تمھیں آج رات مشرقی بیروت کے الیگزینڈر ہوٹل میں انٹرویو دینے کے لیے بلایا ہے؟“

”جی سر!“ اشعر بھی مسکرا دیا۔ اس کے لیے یہ بات مسرت کا باعث تھی کہ الناصر کی انٹیلی جنس اس قدر باخبر ہے۔

یاسر عرفات نے اپنی عقابی نظریں اس کے چہرے پر مرکوز کرتے ہوئے پوچھا۔ ”پھر تم نے کیا فیصلہ کیا؟ میرا مطلب ہے جا رہے ہو؟“

”جی سر!“ اس نے اثبات میں جواب دیا۔

”گڈ ویری گڈ۔“ وہ بولے۔ ”تم بلاشبہ دلیر نوجوان ہو۔ تمھاری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ یقیناً تامل کرتا۔“

اشعر نے آہستگی سے سوال کیا۔ ”سر آپ کا کیا خیال ہے؟“

”خیال؟ کیسا خیال؟“ انھوں نے بھنویں اچکاتے ہوئے دریافت کیا۔

وہ بولا۔ ”یہی کہ مجھے آج رات مشرقی بیروت جانا چاہیے یا نہیں؟“

یاسر عرفات نے فوراً جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر تک ہونٹ بھینچ کر سوچتے رہے پھر دبے دبے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ”تمھیں ضرور جانا چاہیے۔ بشیر جمائل بڑا خود غرض اور کمینہ شخص ہے۔ وہ وقت پر گدھے کو بھی باپ بنانے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اس وقت اسے تمھاری ضرورت ہے اسی لیے اس نے نفرت و کدورت کو وقتی طور پر بالائے طاق رکھ کر تمھیں بلایا ہے۔“

ڈاکٹر الناصر نے ان کی تائید میں سر ہلایا۔ اشعر کچھ پریشان سا ہو گیا۔ بولا۔ ”سر معاف کیجیے میں نہیں سمجھ سکا۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ اسرائیلیوں کی دھاندلی اور پشت پناہی کے طفیل وہ لبنان کا صدر منتخب ہو گیا ہے اور کچھ دنوں بعد وہ اپنے عہدے کا حلف بھی اٹھا لے گا۔ پھر میں یہ بات سمجھنے سے قاصر ہوں کہ وہ مجھ سے اپنا کون سا مطلب نکلوانا چاہتا ہے؟“

یاسر عرفات نے نہایت خود اعتمادی سے جواب دیا۔

"میرے پاکستانی دوست! لبنان کے اندرونی حالات سے ناواقف لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ابوعمار کے پانچ ہزار فدائین کے مغربی بیروت سے چلے جانے کے بعد اس ملک میں حالات نارمل ہوجائیں گے اور بشیر جمائل اور اسرائیلیوں کو اپنی من مانی کرنے کی چھٹی مل جائے گی۔ نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ ہم فلسطینیوں کے انخلا کے بعد اسرائیلیوں اور فلنجیوں کو دروز ملیشیا اور شیعہ عمل ملیشیا کی جانب سے خونریز مزاحمت کا سامنا کرنا ہوگا۔ میں نے اپنا تمام بھاری اسلحہ بھی ان دونوں ملیشیاؤں میں بانٹ دیا ہے۔ ولید جنبلاط اور نبی بری نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ ہمارے چلے جانے کے بعد وہ بیروت میں مقیم فلسطینیوں اور لبنانی مسلمانوں کی حفاظت کریں گے۔ اس کے علاوہ وہ صاف صاف اعلان کر چکے ہیں کہ انھیں بشیر جمائل صدر کی حیثیت سے منظور نہیں اور اگر بشیر جمائل نے زبردستی اپنے آپ کو لبنان کا صدر منوایا تو ان کے ملیشیا اس کے خلاف جنگ لڑیں گی۔ بشیر جمائل اس خطرے کو بھی سمجھ چکا ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ کسی نہ کسی طرح اسے صدارتی محل میں پاؤں جمانے کا موقع مل جائے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہوگا۔ اگر ولید جنبلاط اور نبی بری مذاکرات کے لیے تیار ہوجائیں۔ اس وقت لبنان میں تم واحد صحافی ہو جس کے ولید جنبلاط اور نبی بری سے گہرے مراسم ہیں۔ وہ تمھیں درمیانی آدمی بنانا چاہتا ہے۔"

"اس سلسلے میں سر! آپ کا کیا مشورہ ہے؟" اشعر نے دریافت کیا۔

یاسر عرفات نے اپنی ہتھیلیاں مسلتے ہوئے کہا۔ "تمھیں اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ مناسب یہ ہوگا کہ تم اپنے طور پر بشیر کو اسرائیلیوں سے بدظن کرنے کی کوشش کرو۔ وہ لالچی شخص ہے۔ لبنانی مسلمانوں کا تعاون حاصل کرنے کی خواہش میں ممکن ہے وہ اسرائیلیوں سے دور ہوجائے۔"

"ابوعمار!" ڈاکٹر الناصر نے مداخلت کی۔ "اگر اس نے ایسا کرنے کا ارادہ بھی کیا تو اسرائیلی اس کے خون کے پیاسے بن جائیں گے۔"

وہ کہنے لگے۔ "بن جائیں۔ ہماری حکمت عملی یہ ہونا چاہیے کہ اسرائیل کے اتحادی کم سے کم ہوں۔ اگر بشیر جمائل تل ابیب سے دور ہوجاتا ہے تو مقبوضہ مغربی کناروں میں ہمارے بارہ لاکھ فلسطینی بیادر اسرائیلیوں پر زیادہ بہتر طریقے سے دباؤ ڈال سکتے ہیں۔"

ڈاکٹر الناصر اور اشعر دونوں نے اسی طرح اثبات میں سر ہلایا جیسے یاسر عرفات کے تجزیے سے مکمل طور پر متفق ہوں۔ اشعر وہاں سے باہر نکلا تو شہابی اس کا منتظر تھا۔ اس نے پوچھا۔ "انجلا کے متعلق کیا خبر ہے؟"

شہابی نے اداس نظروں سے اسے دیکھا اور بولا۔ "آپ واپس پہنچیں گے تو وہ کمرے میں ہوگی۔"

اشعر نے مسکرا کر کہا۔ "مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے انجلا نے تمہارے ساتھ کچھ ملی بھگت کرکے ہم لوگوں کو پریشان کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔" شہابی نے کوئی جواب نہیں دیا بس اداسی سے مسکراتا رہا۔ اشعر نے مزید استفسار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ جانتا تھا کہ دوسروں کی طرح شہابی بھی فلسطینی فدائین کے مغربی بیروت سے جانے پر غمزدہ ہے۔

وہ پی ایل او کے ہیڈ کوارٹر کی عمارت سے نکل کر اپنی گاڑی میں بیٹھ رہا تھا کہ شیخ یمنی کی آواز سن کر رک گیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا شیخ یمنی اسے آوازیں دیتا ہوا اس کی طرف آرہا تھا۔

اشعر نے پوچھا۔ "برادر! کیا بات ہے۔ کیوں چیخ رہے ہو؟" شیخ یمنی نے قریب آکر اس کی کار کا دروازہ کھولا اور گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہنے لگا۔ "میری گاڑی خراب ہوگئی ہے اچھا ہوا تم مل گئے۔ اپنے ہوٹل ہی جارہے ہونا؟"

"ہاں ہاں۔" اس نے جواب دیا اور کار اسٹارٹ کردی۔ راستے میں اشعر نے انجلا کا قصہ چھیڑ دیا۔ انجلا کی گمشدگی کی خبر سن کر یوں لگتا تھا جیسے شیخ یمنی پر بجلی گری ہو۔ وہ حواس باختہ ہوکر بولا۔

"یہ تم کیسی بہکی بہکی باتیں کررہے ہو؟"

"کیا مطلب؟"

"انجلا کو میں نے ایک ٹیکسی میں بیٹھے دیکھا تھا۔"

"کیا وہ تنہا تھی؟"

"نہیں۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی بھی تھی اور دونوں پرانے شناساؤں کی طرح باتوں میں محو تھیں۔ میں نے انجلا کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے بار بار ہارن بجایا لیکن میری گاڑی ذرا فاصلے پر تھی اس لیے اس نے ہارن کی آواز پر توجہ نہیں دی۔"

اشعر بھونچکا سا ہوگیا، وہ متجسسانہ نظروں سے شیخ یمنی کو گھور کر بولا۔ "تم نے اسے کہاں دیکھا تھا؟"

"مزارع کورنک کے چوراہے پر۔" شیخ یمنی نے اطمینان سے جواب دیا۔ "اس وقت ٹریفک رکا ہوا تھا۔"

"تم نے اس ٹیکسی کا تعاقب کیوں نہیں کیا؟"

"میں نے سوچا شاید وہ اپنی کسی دوست کے ہمراہ... شاپنگ کے لیے نکلی ہو۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ ہوٹل سے غائب ہوچکی ہے۔"

"یار شیخ! کبھی کبھی تمھاری باتیں سن کر سر پیٹنے کو جی چاہتا ہے۔"

"کیوں؟"

"ارے بدھو! تمھیں علم ہے کہ انجلا ایک تو بیمار ہے دوسرے اسرائیلی اور فلنچی ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ کئی بار اسے موت کے گھاٹ اتارنے کی بھی ناکام کوششیں کرچکے ہیں۔ چنانچہ وہ میمونہ کے بغیر کبھی باہر نہیں نکلتی۔"

"اوہ برادر! اس کا تو مجھے خیال ہی نہیں آیا۔"

شیخ یمنی کے چہرے پر تشویش کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ اس نے فکرمندی سے سوال کیا۔ "کیا انجلا میمونہ بھابی کو بتا کر باہر نہیں نکلی تھی؟"

"نہیں۔" اشعر نے انکار میں سر ہلایا۔

وہ بولا۔ "یہ اس کی غلطی ہے۔"

"ہاں اس میں کیا شبہ ہے۔" اشعر نے برجستہ کہا۔

وہ گفتگو کرتے ہوئے ہوٹل کو ڈور پہنچ گئے۔ شیخ یمنی نے اسے بتایا کہ وہ انجلا سے ملنے کے بعد اپنے ہوٹل ہالی ڈے ان کے لیے روانہ ہوگا۔ اشعر نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ دونوں اوپر جانے کے لیے لفٹ میں قدم رکھنے والے تھے کہ عقب سے ریسپشنسٹ نے آواز دی۔ "مسٹر اشعر!"

اشعر نے مڑ کر آواز دینے والی کو دیکھا۔

لڑکی نے کہا۔ "سر! آپ کے لیے پیغام ہے۔"

"پیغام؟" اس نے قریب جا کر پوچھا۔ "کیسا پیغام؟"

لڑکی نے اپنی ڈائری دیکھنے کے بعد ایک کاغذ پر ایک فون نمبر درج کرکے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ایک صاحب کا چار پانچ بار فون آچکا ہے۔ آپ ان سے اس نمبر پر فوراً بات کرلیں۔"

"ان صاحب کا نام کیا تھا؟" اشعر نے دوبارہ استفسار کیا۔

"سوری سر! نام انھوں نے نہیں بتایا۔" لڑکی نے جواب دیا۔

اشعر کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہوئیں۔ اس نے درشت لہجے میں کہا۔ "تمھیں نام تو معلوم کرنا چاہیے تھا۔"

اس نے جواب دیا۔ "سر! میں نے بہت اصرار کیا لیکن وہ صاحب معاف کیجیے بڑے بدتمیز قسم کے تھے انھوں نے مجھے ڈانٹ پلادی۔"

"حیرت ہے۔ میرے ملنے والوں میں ایسا کونسا شخص ہوسکتا ہے؟" وہ از خود ہی بڑبڑایا پھر اس نے کاغذ کا پرزہ اپنی جیب میں ڈالا اور لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔

اشعر اور شیخ یمنی جب کمرے میں پہنچے تو یہ دیکھ کر ان کی جان میں جان آئی کہ انجلا، میمونہ اور موتی کے ساتھ گپ شپ لگا رہی ہے۔ پاس ہی موتی کی آیا لیلیٰ بھی کھڑی تھی۔ اشعر کو دیکھتے ہی انجلا اچک کر کھڑی ہوئی اور چلائی۔

"اشعر بھائی! اللہ آج دل بہت اداس ہے، ہمیں باہر کی سیر کرا دیں۔"

"سیر کی بچی!" اشعر نے آگے بڑھ کر پیار سے ہلکی سی چپت رسید کی۔

"یہ تمھیں بتائے بغیر باہر جانے کی کیا سوجھی تھی؟ میرا اور میمونہ کا خوف کے مارے حشر نشر ہوگیا۔"

انجلا نے منہ بسور لیا اور روہانسی آواز میں بولی۔ "میں تو کہیں بھی نہیں گئی، آپ بلاوجہ مجھ پر غصہ اتار رہے ہیں۔"

میمونہ جلدی سے اٹھی اور اشعر کو بازو سے پکڑ کر بولی۔

"آپ اطمینان سے بیٹھیں میں سارا قصہ سناتی ہوں۔"

وہ غرایا۔ "میرا غصہ اس طرح ٹھنڈا نہیں ہوگا۔ غضب خدا کا اسے ضرورت کیا تھی ایسی بچکانہ حرکت کرنے کی؟"

انجلا نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "اشعر بھائی! میں کہے دیتی ہوں کہ بلاوجہ مجھ پر الزام تراشی نہ کریں ورنہ میں آپ سے بات چیت بند کردوں گی۔ ہاں۔" وہ سسکیاں لینے لگی۔ "ایک ذرا سا مذاق کیا کیا کہ جان عذاب میں آگئی۔ پہلے میمونہ باجی جلی کٹی سناتی رہیں اب یہ آگئے کوتوال بن کر رعب جھاڑنے۔ ٹھیک ہے میں اب یہاں نہیں رہوں گی۔ میرے لیے سینٹی فورڈ یم ہی بہتر ہے۔"

شیخ یمنی نے مداخلت کی بولا۔ "نہیں نہیں انجلا! ایسا مت کہو دراصل..."

وہ بات کاٹتے ہوئے چلائی۔ "چپ رہیں جی! آپ کون ہوتے ہیں بیچ میں رکیل کا کردار ادا کرنے والے۔ اشعر بھائی میرے اپنے ہیں، میں ان سے جس طرح چاہوں پیش آؤں میری مرضی ہے۔"

میمونہ جلدی سے بولی۔ "اشعر! انجلا باہر کہیں نہیں گئی۔"

"کیا کہا؟ باہر نہیں گئی؟" اشعر نے اپنی بیوی کو غصے سے گھورا۔

میمونہ نے اس کے تیور بھانپتے ہوئے وضاحت کی۔
"اس نے مجھے اور تمہیں ستانے کے لیے شرارت کی تھی۔"
"آپ لوگوں کو ستانے کے لیے نہیں بلکہ فوزیہ کو ذہنی دباؤ سے نجات دلانے کے لیے۔" انجلا نے بڑی بھی پر آنکھیں نکالتے ہوئے صفائی پیش کی۔
اشعر اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر دھم سے صوفے پر بیٹھ گیا اور چلایا۔ "تم لوگ مجھے پاگل بنا دو گے خدا کے لیے جو کچھ کہنا ہے صاف صاف کہو۔ میں پہلے ہی پریشان ہوں۔" انجلا اس کے قریب آگئی، بولی۔ "اشعر بھائی! آج دوپہر جب ہم عامر بھائی کو خدا حافظ کہنے گئے تو اس وقت آپ نے دیکھا تھا فوزیہ کی حالت کتنی خراب تھی؟"
"ہاں، وہ ایک قدرتی بات ہے۔ اپنے محبوب شوہر سے بچھڑنا کوئی معمولی واقعہ نہیں ہوتا پگلی!"
"مجھے احساس ہے تبھی تو میں نے یہ چکر چلایا۔" وہ بولی۔
"چکر؟ کیسا چکر؟"
"میں نے لیلیٰ کو اپنا ہم راز بنا لیا تھا چنانچہ میں پہلے نیچے اتر کر کوچ کے پاس گئی اور پھر فوراً ہی عقبی غلام گردش سے ہوتی ہوئی لیلیٰ کے کوارٹر میں جا پہنچی اور کافی دیر تک وہاں لیٹی سے کتاب پڑھتی رہی۔"
"لیکن اس کا مقصد کیا تھا؟"
"اللہ آپ اتنے بدھو ہیں مجھے علم نہ تھا۔"
"بابا صاف صاف کہو، مجھے پہیلیاں بوجھنا نہیں آتیں۔"
"تو سنیے۔ میں جانتی تھی کہ کچھ دیر بعد فوزیہ آئے گی اور جب اسے علم ہوگا کہ انجلا لاپتا ہو چکی ہے تو وہ یقیناً میری فکر میں پڑ جائے گی اس طرح وقتی طور پر عامر بھائی کا غم اس کے دل سے اتر جائے گا اور ایسا ہی ہوا۔ جب اسے آپ نے یہ خبر سنائی اور اوپر میمونہ باجی نے اس کی تصدیق کی تو اس کا بُرا حال ہو گیا۔"
"تم نے اپنی باجی میمونہ کو اپنے راز میں کیوں شریک نہیں کیا؟ اس بچاری کا اپنا حشر خراب تھا۔"
"واہ اشعر بھائی! باجی میمونہ کو راز داں بنانے کا مطلب یہ ہوتا کہ آپ کی ایک ڈانٹ سن کر وہ سارا بھید کھول دیتیں۔" اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔
اشعر فوراً شیخ عینی کی طرف مڑا اور بولا۔ "کیوں بھئی شیخ! تم کونسی کہانی سنا رہے تھے؟"
یہ جملہ سنتے ہی سب کی نظریں شیخ عینی پر مرکوز ہو گئیں۔ وہ ہڑبڑا کر کہنے لگا۔ "خدا کی قسم برادر اشعر! میں نے جو کچھ کہا وہ سو فیصد درست کہا ہے۔"
"یعنی تم نے انجلا کو اپنی آنکھوں سے ٹیکسی میں سوار دیکھا تھا؟" اشعر نے سوال کیا۔
"ہاں ہاں اور ان کے ساتھ ایک نوجوان سی لڑکی بھی بیٹھی تھی۔" وہ بولا۔
انجلا فوراً تن کر بیٹھ گئی اور خونخوار نظروں سے اسے گھورتے ہوئے چلائی۔ "یہ میرا ذکر کیا ہو رہا ہے؟"
اشعر نے مختصراً وہ سب کچھ بتا دیا جو اس نے راستے میں شیخ عینی سے سنا تھا اور پھر بولا۔ "مجھے حیرت ہے کہ شیخ کی نظریں دھوکا کیسے کھا گئیں۔"
وہ احتجاج کرتے ہوئے بولا۔ "برادر! ایسا مت کہو۔ میں نے جو کچھ دیکھا وہ حقیقت تھی۔"
"یعنی تم نے جس لڑکی کو دیکھا وہ واقعی انجلا تھی؟" اشعر نے دریافت کیا۔
شیخ عینی نے منہ سے کچھ کہنے کے بجائے محض اثبات میں سر ہلا دیا۔ میمونہ اور لیلیٰ نے ایک دوسرے کا منہ دیکھا جیسے زبانِ خاموشی سے استفسار کر رہی ہوں کہ یہ کیا معمہ ہے۔ لیکن انجلا ان کے تاثرات سے بے نیاز اٹھ کر کھڑی ہوئی اور غصے سے چلائی۔ "مجھے اس قسم کا مذاق بالکل پسند نہیں۔"
شیخ عینی نے بے بسی سے کہا۔ "انجلا! میری بات کا یقین کرو، میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔"
اشعر نے انجلا کا بازو پکڑ کر اپنے برابر صوفے پر بٹھایا اور سمجھانے والے انداز میں بولا۔ "طیش میں آنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے سارا معاملہ کچھ گڑبڑ لگ رہا ہے۔"
"کیا مطلب؟" اس نے بگڑ کر پوچھا۔ "یعنی میں جھوٹ بول رہی ہوں؟"
لیلیٰ نے پہلی بار مداخلت کی، وہ اشعر کو مخاطب کر کے بولی۔ "سر! انجلا واقعی میرے کوارٹر میں تھی۔ اگر آپ کو میری گواہی پر یقین نہیں تو شہابی صاحب سے پوچھ لیں۔"
"شہابی سے پوچھ لیں؟" اشعر اور عینی نے بیک زبان کہا۔ دونوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر لیلیٰ کو تکنے لگے تھے۔ وہ بچاری سٹپٹا گئی۔ تاہم اشعر نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے سوال کیا۔ "یہ شہابی بیچ میں کیسے ٹپک پڑا؟"
انجلا نے جلدی سے جواب دیا۔ "یہ بھید بھی آج ہی انکشاف ہوا ہے کہ اس نے میری حفاظت کے لیے خفیہ طور پر دو آدمی مقرر کیے ہوئے ہیں۔ مجھے اگر پہلے سے معلوم ہوتا تو میں ان کی آنکھوں میں بھی ضرور دھول جھونکتی۔ بہرحال انھوں

نے مجھے لیلیٰ کے کوارٹر میں جاتے اور لیلیٰ کو باہر سے قفل لگاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے شہابی کو فون پر اطلاع دی ہوگی تھوڑی دیر میں وہ بھاگا بھاگا چلا آیا۔ اس نے لیلیٰ کو نیچے بلایا اور اس سے تالا کھلوا کر مجھ سے ملنے آگیا۔ مجھے سخت تاؤ آیا لیکن میں نے ضبط سے کام لیا اور اسے سارا قصہ اس وعدے پر سنا دیا کہ وہ کسی سے تذکرہ نہیں کرے گا۔ اس نے اقرار کر لیا لیکن کہنے لگا کہ جب آپ باہر جا کر دوبارہ واپس آئیں تو مجھے اپنے کمرے میں موجود رہنا پڑے گا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید میں اس کی بات نہ مانتی مگر اس وقت مجبوری تھی۔ یہ ہے شہابی کا قصہ۔" وہ فاتحانہ انداز میں آنکھیں نچا رہی تھی۔

اشعر دوبارہ شیخ عیسیٰ کی طرف مڑا اور بولا۔ "یار شیخ! وہ لڑکی کون تھی جس پر تمھیں انجلا کا گمان ہوا؟"

شیخ عیسیٰ نے زیرلب کہا۔ "میں خود اتنی دیر سے یہی سوچ رہا ہوں۔"

انجلا نے خشمگیں نظروں سے دونوں کو باری باری گھورا اور شکایت آمیز لہجے میں بولی۔ "اشعر بھائی! آج آپ کا دماغ ٹھکانے نہیں ہے کیا؟"

وہ اس کا ہاتھ تھپتھپا کر بولا۔ "تم چپ رہو، مجھے یہ معاملہ کچھ مشکوک سا لگتا ہے۔"

شیخ عیسیٰ نے فکرمندی سے کہا۔ "تم کہہ سکتے ہو کہ مجھے دھوکا ہوا لیکن میں اپنی آنکھوں دیکھی بات کیسے جھٹلا سکتا ہوں۔ وہ لڑکی ہوبہو انجلا جیسی تھی۔ اشعر تم میری جگہ ہوتے تو تم بھی ہکابکا رہ جاتے۔"

اشعر بولا۔ "حیرت ہے کہ جس روز فدائین کا انخلا شروع ہوا اسی دن تمھیں وہ لڑکی دکھائی دی۔ مجھے تو یہ اسرائیلی انٹیلی جنس موساد کی کوئی چال لگتی ہے۔"

میمونہ گھبرا گئی، پریشان ہو کر بولی۔ "اللہ خیر کرے۔ اشعر میری مانیں آپ انجلا کو پاکستان بھجوا دیں۔"

انجلا کا موڈ بگڑ گیا۔ وہ خفگی سے بولی۔ "یعنی میں اس آگ اور خون کے سمندر میں سب کو چھوڑ کر پاکستان چلی جاؤں؟ جی میں ایسا نہیں کر سکتی۔ میں اسی بیروت میں رہوں گی اور اگر اسرائیلی مجھے مارنا چاہتے ہیں تو یہ حسرت بھی پوری کر لیں۔"

"اللہ نہ کرے جو اسرائیلیوں کی یہ ناپاک حرکت پایۂ تکمیل کو پہنچے۔"

اشعر بولا۔ "جب تک میں زندہ ہوں انشاء اللہ تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔"

اسی رات سوا آٹھ بجے اشعر مشرقی بیروت کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں اس نے اپنے اسٹاف فوٹوگرافر کو بھی ساتھ لے لیا۔ اس کا نام شبیر حسین تھا۔ اس کا تعلق پاکستان کے شہر راولپنڈی سے تھا۔ بیروت آنے سے پہلے پنڈی کے مال روڈ پر اس کا اسٹوڈیو تھا۔ اشعر کے ساتھ کام کرتے ہوئے اسے ساڑھے تین برس گزر چکے تھے۔ اسرائیلی حملے کے دوران اس نے بعض ایسی مشکل تصاویر اتاریں جنھوں نے امریکی اور یورپی فوٹوگرافروں کو بھی حیرت میں ڈال دیا۔ وہ غیرشادی شدہ تھا اور راولپنڈی میں اس کی صرف ایک بیوہ بہن تھی جسے وہ ہر ماہ ایک معقول رقم بھیج دیتا تھا تاکہ وہ اپنے تین بچوں کو بہتر طریقے سے تعلیم دلوا سکے۔ اشعر نے کئی بار چاہا کہ اس کی کسی لڑکی سے شادی کرا دی جائے لیکن وہ رضامند نہیں ہوا۔ وہ اکثر مسکرا کر کہتا تھا۔ "سر! میں اپنی شادی فوٹوگرافی کے فن کے ساتھ کر چکا ہوں۔" جب اسے علم ہوا کہ اشعر اسے اپنے ہمراہ فلنجیوں کے گڑھ مشرقی بیروت لے جانا چاہتا ہے تو وہ بالکل خوفزدہ نہیں ہوا بلکہ اس کے برعکس اس کی مسرت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ دراصل اسے کبھی مشرقی بیروت کے مناظر کی فلم بندی کرنے کا موقع نہیں ملا تھا اور یہ خلش اسے ہمیشہ بےچین کیے رہتی تھی۔ راستے میں وہ اشعر کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ "سر! مجھے بشیر جمائل سے شدید نفرت ہے اگر وہ مجھے ہزاروں ڈالر کی پیشکش بھی کرتا تو میں کبھی اس کی تصویر نہ کھینچتا۔"

"پیشہ ورانہ مجبوریاں انسان کو ذاتی پسند ناپسند سے بالاتر کر دیتی ہیں شبیر حسین! بشیر جمائل فلنجیوں کا سرغنہ ہے اسی کے حکم پر اس کے ساتھی بےگناہ اور مظلوم مسلمانوں کا خون بہاتے ہیں۔ تمھاری نفرت بلاجواز نہیں۔" اشعر نے آہستگی سے کہا۔

مشرقی بیروت جانے والی سڑک میوزیم کے قریب سے گزرتی تھی۔ اس کے دونوں طرف فلسطینیوں اور اسرائیلیوں کے جنگی مورچے قائم تھے۔ فلسطینی فدائین کا انخلا شروع ہو چکا تھا لیکن ان کی حکمت عملی یہ تھی کہ اسرائیلیوں کے اچانک حملے سے محفوظ رہنے کے لیے اپنے مورچے آخری لمحے تک اسی حالت میں رہیں جیسا کہ جنگ کے دوران تھے۔ یاسر عرفات اعلان کر چکے تھے کہ وہ فدائین کے آخری دستے کے ساتھ مغربی بیروت سے جائیں گے۔ اس پس منظر میں یہ خطرہ بدستور موجود تھا کہ جنرل شیرون بدعہدی کرتے ہوئے یکایک اپنی فوج کو مغربی بیروت پر دھاوا بولنے کا حکم صادر کر دے کیونکہ اسی طرح وہ یاسر عرفات کو ہلاک کرنے کی اپنی

دیرینہ خواہش کی تکمیل کر سکتا تھا۔ فدائین اس قسم کی ناخوشگوار صورتِ حال سے نمٹنے کا عہد کیے ہوئے تھے۔

اشعر کی کار جب گرین لائن عبور کر کے مشرقی بیروت کی حدود میں داخل ہوئی تو فوجی چوکی پر متعین فلنجی فوجیوں نے اسے پوچھ گچھ کے لیے روک لیا لیکن جونہی ان پر اس کی اصلیت آشکارہ ہوئی انھوں نے فوراً اسے آگے جانے کی اجازت دے دی۔ لگتا تھا جیسے بشیر جمائل کی طرف سے انھیں احکامات جاری کیے جا چکے تھے کہ اشعر کو روکا نہ جائے اور یہ کہ اس کے ساتھ نہایت احترام سے پیش آیا جائے۔

مغربی بیروت کے برعکس، مشرقی بیروت میں زبردست چہل پہل تھی۔ ہر طرف ٹریفک کا شور تھا — اور کاروباری مراکز مردوں عورتوں اور بچوں سے بھرے ہوئے تھے۔ جشن کا سا یہ سماں دیکھ کر احساس ہوتا تھا جیسے عیسائیوں کو . . . فلسطینی فدائین کے انخلا پر بے حد مسرت ہوئی ہو۔ ایک لحاظ سے وہ اپنی خوشیوں کا اظہار کرنے میں حق بجانب بھی تھے کیونکہ ان کے نزدیک لبنان میں ان کی حاکمیتِ اعلیٰ قائم ہونے کی راہ میں تنظیم آزادیٔ فلسطین سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔

سڑکوں پر جا بجا رنگ برنگے دلکش بینر اور سائن بورڈ لگا رہے تھے۔ اکثر دیواروں پر انھوں نے قدِ آدم پوسٹر چسپاں دیکھے جن پر بیگن اور شیرون کی سہ رنگی تصاویر تھیں اور ان کے نیچے جلی حروف میں لکھا تھا: "ہم اپنے اسرائیلی بھائیوں کو لبنان میں خوش آمدید کہتے ہیں۔"

شبیر حسین زیرِ لب بولا: "سر! مشرقی بیروت کو دیکھ کر تو یوں گمان گزرتا ہے جیسے یہ آزاد لبنان کا حصہ نہیں اسرائیلی کالونی ہے۔"

"تمھارا مشاہدہ بالکل درست ہے یار!" اس نے گاڑی کا گیئر بدلتے ہوئے کہا۔ شبیر حسین نے کیمرہ آنکھ سے لگا کر ایک تصویر اتاری تو اشعر نے بے ساختہ کہا: "ارے، کیوں بلاوجہ فلم ضائع کر رہے ہو؟"

"کیا مطلب سر؟" شبیر حسین نے حیرت سے پوچھا۔

وہ آہستگی سے بولا: "چلتی کار میں تمھارا فوکس شارپ نہیں ہو گا۔"

شبیر حسین نے ہنس کر کہا: "سر! میں نے اس فن میں اپنی ذاتی تکنیک ایجاد کی ہے۔ ابھی کل سہ پہر کی بات ہے، میں نے مزارع کورنگ پر اسی طرح آپ کی سسٹر ان لا کی تصویر کھینچی تھی — اور اس کا فوکس بے حد شارپ نکلا۔"

"میری سسٹر ان لا کی تصویر؟" اشعر بھونچکا ہو کر بولا: "تمھارا اشارہ انجلا کی طرف ہے؟"

"جی ہاں سر! میں معافی چاہتا ہوں کہ میں نے بے خبری میں ان کی تصویر اتار لی۔ میری نیت یہ تھی کہ میں بعد میں مس انجلا کو یہ تحفے میں پیش کروں گا تو وہ حیران ہوں گی۔" اس نے جلدی سے صفائی پیش کی۔

اشعر نے سوال کیا: "انجلا مزارع کورنگ پر کیا کر رہی تھی؟"

"جی، وہ اپنی کسی دوست لڑکی کے ہمراہ کار سے اتری تھیں۔ میں اس وقت وہاں سے گزر رہا تھا۔ میں نے سوچا موقع اچھا ہے چنانچہ ان دونوں کی تصویر اتار لی۔" اس نے جواب دیا۔

اشعر استفہامیہ لہجے میں بولا: "کیا تصویر میں ان دونوں کے چہرے بالکل واضح ہیں؟"

"جی سر!"

چند ثانیوں کے لیے خاموشی طاری ہو گئی۔ اشعر سوچ میں پڑ گیا۔ عجیب صورتِ حال تھی۔ انجلا کا کہنا تھا کہ وہ ہوٹل کوڈور سے ایک لمحے کے لیے بھی باہر نہیں نکلی جبکہ شیخ عیسیٰ بضد تھا کہ اس نے مزارع کورنگ پر ٹیکسی میں انجلا کو ایک لڑکی کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اشعر نے اس کی بات اس لیے جھٹلا دی تھی کہ شاید اسے غلط فہمی ہوئی ہو لیکن اب اس کے اسٹاف فوٹو گرافر شبیر حسین نے شیخ عیسیٰ کی بات کی تصدیق کر دی تھی۔ اس نے نہ صرف انجلا کو مزارع کورنگ پر دیکھا بلکہ اس کی تصویر بھی اتار لی تھی۔

اشعر نے سوال کیا: "شبیر حسین! وہ تصویر اس وقت کہاں ہے؟"

"جی میرے گھر پر اسٹوڈیو میں۔ لیکن سر! آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟ کیا آپ کو میری اس حرکت سے صدمہ پہنچا ہے؟" وہ گھبرا کر بولا۔

اشعر نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا: "نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ اس سے پہلے تم انجلا کی فرمائش پر پیتی تھیٹر میں اس کی درجنوں تصویریں اتار چکے ہو۔ اس میں بھلا برا ماننے کی کیا بات ہے۔"

شبیر حسین کی جان میں جان آئی۔ وہ کہنے لگا: "سر! پرسوں کل میں نے مس انجلا کو پہلی بار پیتی تھیٹر سے باہر دیکھا تھا۔ مجھے دلی مسرت تھی کہ اللہ نے انھیں تندرست کر دیا۔ بس اسی

کیفیت میں میں نے ان کی تصویر اتار لی۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" اشعر بولا۔ "تم یہاں سے واپسی پر مجھے وہ تصویر دے دینا۔ میں انجلا کو دکھاؤں گا۔"

"او کے سر!" شبیر حسین نے اثبات میں سر ہلایا۔

اشعر نے سوچا۔ شبیر حسین نے جس لڑکی کی تصویر بنائی ہے وہ انجلا ہرگز نہیں ہو سکتی۔ اگر وہ انجلا نہیں تھی تو پھر کون تھی۔ شیخ میمنی اور شبیر حسین کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس لڑکی اور انجلا کی مشابہت میں رتی برابر فرق نہیں ہے۔ یقیناً یہ کوئی چکر ہے۔"

وہ خیالات میں الجھا ہوا ہوٹل الیگزینڈر کے سامنے پہنچ گیا۔ یہ فائیو اسٹار ہوٹل مشرقی بیروت کا سب سے مہنگا اور پرتعیش ہوٹل تھا۔ اسرائیل اور دیگر ممالک سے آنے والے وی آئی پی افراد بالعموم یہیں قیام کرتے تھے۔ مغربی بیروت کے ہوٹل کمو ڈور کی طرح اکثر غیر ملکی رپورٹر بھی یہیں ٹھہرے ہوئے تھے۔ یہ بات عام طور پر مشہور تھی کہ اسرائیلی اور فلنجی سیاست کے بارے میں خبروں کا حصول یہاں بآسانی ہو جاتا ہے۔ سیاحوں کے لیے بھی یہ جگہ جنت کے مترادف تھی۔ ہوٹل کے یہودی مالک نے یہاں تفریح کا ہر سامان مہیا کیا ہوا تھا۔

اشعر اور شبیر حسین اندر داخل ہونے لگے تو دو لڑکیوں نے انھیں خوش آمدید کہا اور پھر دروازہ کھول دیا۔ اندر عجیب رومان پرور ماحول تھا۔ فانوسوں کے جھاڑ، سُرخ کارپٹ، کارنر میں رکھے ہوئے قد آور مجسمے، پیتل کے چمک دار گملوں میں لگے ہوئے عجیب و غریب پودے، ساری فضا معطر معطر تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس شاداب اور زندگی سے بھرپور حصے کا جنگ زدہ بیروت سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔

اشعر لفٹ کی طرف جانے لگا تو کسی نے اس کا نام لے کر پکارا۔ وہ پلٹا۔ ایک ادھیڑ عمر امریکی ٹی شرٹ اور پتلون میں ملبوس اس کی طرف لپکا اور "ہائے" کہہ کر اس سے لپٹ گیا۔ یہ ڈیوڈ ایکمن تھا۔ امریکی جریدے ٹائمز کے یروشلم بیورو کا چیف۔ جنگِ بیروت کے دوران وہ خبروں کی کوریج کے لیے — ہوٹل الیگزینڈر میں مقیم تھا۔ اس نے تعجب سے پوچھا۔ "اشعر! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

اشعر مسکرا کر بولا۔ "کیوں میرا یہاں داخلہ منع ہے؟"

"نو نو۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "میرا مطلب ہے کہ فلسطینیوں کا انخلا مغربی بیروت میں عمل پا رہا ہے۔ خبریں تو وہاں ہیں۔ یہاں تو صرف فتح کے جشن کی رنگینیاں ہیں اور بھلا تمھیں ان رنگینیوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔"

"میں اسی جشن کا جائزہ لینے ادھر آنکلا ہوں۔" اشعر نے گول مول جواب دیا۔

"او کے او کے۔" وہ آگے بڑھ گیا۔

اشعر اور شبیر حسین لفٹ میں سوار ہو کر پانچویں فلور پر آ گئے۔ یہاں بھی ویسا ہی ماحول تھا۔ وہ دونوں چلتے ہوئے بالکونی کی طرف جانا چاہتے تھے کہ ایک طرف سے ایک باوردی مسلح فلنجی فوجی نمودار ہوا اس نے انھیں روکتے ہوئے رعب دار آواز میں کہا۔ "ادھر جانا منع ہے۔"

اشعر فوراً سمجھ گیا کہ اس جانب ہی بشیر جمائل کا کمرہ ہوگا۔ اس نے بغور فلنجی فوجی کا جائزہ لیا اور پھر اپنی جیب سے کارڈ نکال کر اُسے دکھاتے ہوئے بولا۔ "مجھے مسٹر بشیر جمائل نے آج رات نو بجے انٹرویو دینے کے لیے مدعو کیا ہے۔"

فلنجی فوجی نے کارڈ پر نظر ڈالی اور بولا۔ "پلیز آپ ان کا نام لینے کے بجائے مسٹر پریذیڈنٹ کہیں۔"

"مسٹر! مجھ سے بحث کرنے کے بجائے مناسب ہوگا کہ تم انھیں میری آمد کی اطلاع دے دو۔" اشعر نے تلخی سے کہا۔

"آپ وہاں صوفے پر بیٹھ جائیں۔ پریذیڈنٹ کی سیکریٹری خود ہی آپ کو لینے کے لیے آجائے گی۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

اشعر چپ چاپ مُڑا اور کچھ فاصلے پر رکھے ہوئے صوفے پر جا بیٹھا۔ شبیر حسین نے بھی ایسا ہی کیا۔

چند منٹ گزرے تھے کہ ایک دُبلی پتلی دراز قد لڑکی ہلکے کاسنی بلاؤز اور اسکرٹ میں ملبوس نمودار ہوئی۔ اور باریک آواز میں منمنائی۔ "مسٹر اشعر! میرا نام جلینی ہے مس جلینی، میں پریذیڈنٹ کی پرائیویٹ سیکریٹری ہوں۔"

"آپ سے مل کر خوشی ہوئی مس جلینی!" اشعر نے اخلاقاً کہا۔

وہ بولی۔ "پریذیڈنٹ آپ کو ٹھیک نو بجے طلب فرمائیں گے۔ ابھی پندرہ منٹ باقی ہیں آپ میرے ساتھ آئیے۔"

وہ دونوں اس کے ساتھ چل دیے۔ اس کے ساتھ چلتے ہوئے اشعر سوچ رہا تھا۔ یہ چہرہ یہ آنکھیں وہ پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہے لیکن کہاں؟ یہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ ان دونوں کو لفٹ کے ذریعے چھٹے فلور پر لے گئی۔

یہ ایک سجا سجایا بڑا سا ہال تھا۔ چند کے سوا باقی سب میزیں مہمانوں سے بھری ہوئی تھیں۔ جینی نے اشعر سے کہا۔ ”آپ تھوڑی دیر یہاں بیٹھیں میں ٹھیک نو بجے آپ کو لینے آجاؤں گی۔“ پھر باوقار انداز میں چلتی ہوئی غائب ہوگئی۔

جینی کے جانے کے بعد اشعر اس کے بارے میں غور کرتا رہا۔ وہ بار بار ذہن پر زور ڈال رہا تھا کہ اس نے جینی کو آج سے قبل کہاں دیکھا تھا مگر اسے کچھ یاد نہیں آرہا تھا۔ اس کے بارے میں سوچتے سوچتے اشعر کو وہ لڑکی یاد آگئی جو انجلا سے مشابہت رکھتی تھی۔ اور جسے اس کے ساتھی فوٹوگرافر شبیر حسین اور شیخ یمنی نے مغربی بیروت کی شاہراہ پر دیکھا تھا۔ انجلا کی کسی ہم شکل کا مغربی بیروت میں دیکھا جانا معنی خیز تھا۔ ممکن ہے وہ فلنجیوں یا اسرائیلیوں کی ایجنٹ ہو اور اسے کسی خاص مقصد کے تحت انجلا کے میک اپ میں وہاں بھیجا گیا ہو۔ شیخ یمنی کی بات تو شک و شبے میں پڑ گئی تھی لیکن شبیر حسین اگر مغربی بیروت میں ہی اس بات کا ذکر کر دیتا تو وہ اس کے سلسلے میں کوئی اقدام ضرور کرتا۔

اشعر انہی خیالوں میں غلطاں تھا کہ جینی نے آکر اطلاع دی۔ ”پریذیڈنٹ آپ کے منتظر ہیں جناب!“

اشعر اور شبیر حسین اٹھ کر کھڑے ہوگئے لیکن جینی نے اشعر سے کہا۔ ”آپ تنہا پریذیڈنٹ سے ملاقات کریں گے۔ اپنے ساتھی سے کہیں یہ یہیں آپ کی واپسی کا انتظار کریں۔“

”مگر یہ تو فوٹوگرافر ہیں۔ یہ انٹرویو کے دوران بشیر جمائل کی تصاویر بنائیں گے۔“

”پلیز آداب کا خیال رکھیں۔ پریذیڈنٹ کا اس طرح نام نہ لیں انھیں صرف پریذیڈنٹ کہیں۔ پریذیڈنٹ کا حکم ہے کہ تنہائی میں آپ سے گفتگو کریں گے لہٰذا صرف آپ ہی ان کے پاس جائیں۔“

مجبوراً اشعر نے شبیر حسین کو وہیں بیٹھنے کی ہدایت کی اور خود جینی کے ساتھ چل دیا۔

لفٹ میں سوار ہونے کے بعد اشعر نے جینی سے کہا۔ ”مس جینی! کیا آپ بتا سکتی ہیں ہم اس سے قبل کہاں ملے تھے؟“

وہ کھلکھلا کے ہنستے ہوئے بولی۔ ”آپ کا خیال کیا ہے؟ ہم پہلے کہاں ملے تھے؟“

”یہی تو مجھے یاد نہیں آرہا ہے۔ لیکن یہ یقین ہے کہ ہم پہلے بھی کہیں مل چکے ہیں۔“

”ہاں۔ یہ صحیح ہے ہم پہلے بھی مل چکے ہیں اور یہ ملاقات خاصی طویل تھی۔“ جینی نے کہا۔

”اب یہ بھی بتا دو ہماری یہ ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی؟“ اشعر نے سوال کیا۔

”ابھی نہیں لیکن یہ وعدہ ہے کہ بتا ضرور دوں گی۔“ جینی نے شوخی سے کہا۔

اسی وقت لفٹ رک گئی۔ جینی اسے ساتھ لیے لفٹ سے باہر آئی اور پھر اسے ایک ایسے کمرے میں لے گئی جہاں تقریباً ایک درجن مسلح افراد بشیر جمائل کے محافظ کے طور پر موجود تھے۔ ان کے افسر نے اشعر کی جامہ تلاشی لینا چاہی مگر جینی نے سختی سے اسے روک دیا۔ وہ خفیف سا ہوکر الگ ہوگیا۔

ٹھیک نو بجے وہ اشعر کو بشیر جمائل کے خوبصورتی سے آراستہ کیے ہوئے کمرے میں لے گئی۔ خوش شکل اور وجیہہ بشیر جمائل سیاہ سوٹ میں ملبوس ایک آرام دہ صوفے پر بیٹھا فون پر کسی سے گفتگو کر رہا تھا۔ اپنی شاندار صحت کی وجہ سے وہ اٹھائیس سال سے زیادہ کا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اشعر کو دیکھتے ہی اس نے فون کا ریسیور رکھ دیا۔ اور کھڑے ہوکر اشعر کا استقبال کیا۔ اور اسے اپنے ساتھ ہی صوفے پر بٹھا لیا۔

جینی نے دوسرے صوفے پر بیٹھنا چاہا مگر بشیر جمائل نے کہا۔ ”نہیں مس جینی! میں اس بین الاقوامی شہرت یافتہ صحافی سے بالکل تنہائی میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ تم جا کر ان کی مدارات کا انتظام کرو۔“

جینی کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا۔ وہ خاموشی سے نظریں جھکائے کمرے سے نکل گئی۔

اس کے جانے کے بعد بشیر جمائل نے کہا۔ ”مسٹر اشعر! میں آپ کا اور اپنا زیادہ وقت ضائع نہیں کروں گا۔ انٹرویو سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ لوگ اپنی شہرت کے لیے انٹرویو دیتے ہیں جبکہ مجھے پہلے ہی بین الاقوامی شہرت حاصل ہے۔“

اس نے آہستگی سے پوچھا۔ ”پھر مجھے آپ نے کیوں بلایا؟“

وہ مسکرایا اور بولا۔ ”مسٹر اشعر! مجھے تم سے ایک بہت ضروری کام ہے اور یہ کام ہے لبنان کی یکجہتی کا۔“

”لیکن میں تو محض ایک رپورٹر ہوں وہ بھی غیر ملکی رپورٹر۔ اور لبنان کی یکجہتی کا مسئلہ تو آپ لبنانیوں کا ہے جسے آپ خود ہی مل بیٹھ کر طے کر سکتے ہیں۔“ اشعر نے نہایت صفائی سے پہلو بچانا چاہا۔

اسی دوران جینی ایک ٹرے لے کر آگئی جس میں وہسکی سے لبریز دو گلاس رکھے تھے۔ اس نے نہایت سلیقے سے ٹرے میز پر رکھی اور مؤدبانہ انداز میں ایک گلاس بشیر جمائل کو پیش کیا۔ دوسرا گلاس اس نے اشعر کو پیش کیا لیکن اشعر

نے نرمی سے معذرت کرلی۔ بشیر جمائیل نے جینی کو مخاطب کرکے کہا۔ "پاکستانی شراب نہیں پیتے تم ان کے لیے اورنج جوس لاؤ۔"

وہ باہر نکل گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس پلٹی تو جوس کا گلاس اس کی ٹرے پر تھا۔ جسے اشعر نے شکریے کے ساتھ اٹھالیا۔ جینی کے باہر جاتے ہی بشیر جمائیل نے اٹھ کر دروازہ لاک کردیا۔ اشعر کو حیرت ہوئی۔ بشیر جمائیل دوبارہ اپنی نشست پر بیٹھ کر بولا۔ "مسٹر اشعر! میں نہیں چاہتا کہ میری آج کی گفتگو کسی کے کانوں میں پڑے۔ دراصل ہمارے یہاں چپے چپے پر اسرائیلی انٹیلیجنس موساد کے ایجنٹ پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ میری ایک ایک بات "تل ابیب" پہنچا دیتے ہیں۔"

"آپ تو اسرائیلیوں کے بااعتماد ساتھی ہیں۔" اشعر نے کہا۔ "آپ کو ان سے گھبرانے کی کیا ضرورت ہے؟"

بشیر جمائیل اسے گھورتے ہوئے بولا۔ "اس میں کوئی شک نہیں لیکن لبنان کا صدر منتخب ہونے کے بعد مجھے احساس ہوا ہے کہ اسرائیلیوں کے بل بوتے پر حقیقی معنوں میں اپنی حاکمیت اعلیٰ قائم نہیں کرپاؤں گا۔ تم نے ولید جنبلاط اور بنی بری کے بیانات سن لیے ہوں گے۔ انھوں نے مجھے لبنان کا نیا صدر تسلیم کرنے سے انکار کردیا ہے۔"

اشعر نے جوس کا گھونٹ لے کر حلق صاف کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ جنبلاط اور بری آپ کے کٹر مخالف ہیں، اس کے ساتھ ہی سابق عیسائی صدر کامل شمعون اور فرنجی بھی آپ کی مخالفت پر تلے ہوئے ہیں۔ اور کامل شمعون کی طرح باقی تینوں کو شام کی پوری پوری حمایت حاصل ہے۔"

"مجھے احساس ہے۔ میں جانتا ہوں۔" بشیر جمائیل تردد کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ "شام کی تیس ہزار فوج وادی بیکا میں پہلے سے موجود ہے۔ اسرائیلی پی ایل او سے لڑ سکتے ہیں لیکن شام کے خلاف محاذ کھولنے سے پہلے انھیں ایک سو ایک بار سوچنا پڑے گا۔ ظاہر ہے یہ کوئی معمولی بات نہیں شام اور اسرائیل کے تصادم کا مطلب ہوگا کہ دونوں سپر طاقتیں بھی براہِ راست مشرقِ وسطیٰ میں الجھ پڑیں۔"

اشعر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دل ہی دل میں وہ خوش تھا۔ آج پہلی بار فلنجی ملیشیا کے سرغنہ کی کمزوری اس کی گرفت میں آئی تھی۔

بشیر جمائیل نے دوبارہ سلسلۂ کلام شروع کیا۔ وہ بولا۔ "برسہا برس کی خانہ جنگی نے لبنان کو تباہ کردیا ہے۔ میری خواہش ہے کہ اُسے اب کسی نہ کسی طرح متحد کیا جائے۔"

"آپ کی سوچ مثبت ہے لیکن اس کے لیے پہلا قدم آپ کو ہی اٹھانا پڑے گا۔" اشعر نے سمجھایا۔ بشیر جمائیل نے کہا۔ "اسی لیے تو مسٹر اشعر! میں نے آپ کو یہاں آنے کی زحمت دی ہے۔ دراصل مجھے کوئی ایسا شخص دکھائی نہیں دیتا جو میرے اور مسلمان لیڈروں کے درمیان سلسلہ جنبانی شروع کرانے میں معاون ہو۔"

اشعر نے خالی گلاس میز پر رکھا اور بولا۔ "وزیراعظم شفیق الوزان کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

بشیر جمائیل سگار نکال کر سلگانے لگا۔ پھر اس نے سگار کا ایک کش لے کر کہا۔ "شفیق الوزان استعفیٰ دے چکے ہیں اور میرے اصرار کے باوجود انھوں نے میرا وزیراعظم بننے سے انکار کردیا ہے۔ میری ذاتی طور پر خواہش ہے کہ کسی طرح سابق وزیراعظم صائب سلام کو یہ عہدہ سنبھالنے پر رضامند کرلیا جائے، تمھارا کیا خیال ہے؟"

اشعر نے کہا۔ "آپ نے بڑی عجیب بات کہی ہے صائب سلام کو بلاشبہ مسلمانوں میں ایک محترم اور معتبر مقام حاصل ہے لیکن آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ یاسر عرفات کے حامی ہیں اور امریکی ایلچی فلپ حبیب انھی کے ذریعے پی ایل او سے مذاکرات کرتے رہے ہیں۔ صائب سلام کے خیالات سے میں واقف ہوں۔ فلسطینیوں پر اسرائیلی حملے کا ذمّے دار وہ فلانجسٹوں کو گردانتے ہیں۔"

"مجھے ان تمام حقائق کو تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں۔" بشیر جمائیل نے گردن ہلائی۔

"مسٹر اشعر! تمھیں لبنان کی بھلائی کی خاطر یہ کام کرنا ہوگا۔"

"یعنی صائب سلام کو میں وزیراعظم کا عہدہ سنبھالنے کے لیے رضامند کروں؟"

"ہاں۔" بشیر جمائیل نے کہا۔

"لیکن یہ کام ناممکن نظر آتا ہے۔"

"کوشش کرنے میں کیا مضائقہ ہے؟"

"آپ براہِ راست انھیں یہ پیش کش کریں۔"

"نہیں یہ بے سود ہوگا۔ وہ انکار کردیں گے۔ میں اگر آپ کا پیغام لے کر ان کے پاس جاؤں تو بھی وہ انکار کردیں گے۔"

"ایک صورت ہے اس طرح وہ یقیناً مان جائیں گے۔"

"وہ کیا؟" اشعر نے پوچھا۔

"تم ان سے کہو کہ اگر وہ میرے ساتھ تعاون کرنے پر رضامند ہوجائیں تو میں نے اسرائیل کے ساتھ دوستی کا معاہدہ کرنے کا جو اعلان کیا ہے اسے منسوخ کردوں گا اور اسرائیل سے اپنے روابط بھی ختم کردوں گا۔ یقیناً یہ بہت بڑی قیمت ہے لیکن صائب سلام میرا ساتھ دیں تو میں تمام خطرات مول لینے کے لیے تیار ہوں۔" بشیر نے رکتے رکتے کہا۔

اشعر ایک لحظے کے لیے سنّاٹے میں آگیا۔ اب یہ عقدہ

کھلا تھا کہ بشیر جمائل اس سے براہ راست ملنے کے لیے کیوں بے چین تھا اور اس نے جینی کو باہر نکال کر دروازے کو لاک کس لیے کیا تھا۔ اشعر نے سوچا۔ اگر اسرائیلیوں کو اس گفتگو کی بھنک بھی پڑ جائے تو بیگن اور شیرون شاید اسے زندہ زمین میں دفن کر دیں۔

بشیر جمائل اشعر کو متفکر دیکھ کر بولا۔ "میں صائب سلام کو یہ پیغام کسی کے ہاتھوں نہیں پہنچا سکتا۔ سب کے سب اسرائیل کے وفادار اور تنخواہ دار ہیں تم خود سوچو اسرائیلی مجھے یہ سب کچھ کرنے کی اجازت دے سکتے ہیں؟"

اشعر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "لیکن مسئلہ یہ ہے کہ صائب سلام کو آپ کی بات پر کیسے یقین آئے گا؟ میرا مطلب ہے وہ اسے آپ کی سیاسی چال سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔"

"تمہارے ہوتے ہوئے مسٹر اشعر! اس بات کا کوئی خدشہ نہیں۔" بشیر نے دلیل پیش کی۔ "میں جانتا ہوں کہ مشرق وسطیٰ کے تمام چھوٹے بڑے مسلمان لیڈروں کے ساتھ تمہارے انتہائی گہرے اور بے تکلفانہ مراسم ہیں۔ وہ لوگ تم پر اعتماد کرتے ہیں اس لیے تمہاری بات توجہ سے سنیں گے۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں تم پہلے صائب سلام سے رابطہ قائم کر کے ان سے کہو کہ دوسرے مسلمان لیڈروں سے مل کر نئے لبنان کے لیے یک جہتی کا ایک لائحہ عمل تیار کر لیں پھر میں خفیہ طور پر ان سے مل کر اس معاہدے پر دستخط کر دوں گا۔ تب تو وہ مجھ سے بدظن نہیں رہیں گے نا؟" بشیر نے سوالیہ نظروں سے اشعر کو گھورا۔

اشعر سوچ میں پڑ گیا۔ وہ ابھی تک یہ طے نہیں کر پایا تھا کہ بشیر جمائل کا یہ روپ حقیقی ہے یا مصنوعی — یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں تھی کہ لبنانی مسلمانوں کے متفقہ بائیکاٹ کی صورت میں وہ اپنی حکومت تشکیل دینے کے قابل نہ تھا۔ آئین کے مطابق وزیراعظم اور پارلیمانی اسپیکر کے عہدے صرف مسلمانوں کے لیے وقف تھے اور تمام فرقوں کے مسلمان پہلے ہی یہ اعلان کر چکے تھے کہ اگر بشیر جمائل نے صدارتی عہدہ سنبھالا تو کوئی مسلمان وزیراعظم یا اسپیکر کا عہدہ قبول نہیں کرے گا اور اگر کسی نے ایسا کرنے کی کوشش کی تو اسے قتل کر دیا جائے گا۔ بشیر جمائل کے لیے یہ انتہائی کٹھن مرحلہ تھا۔ اسی لیے وہ مسلمانوں کے آگے جھکنے کو تیار ہوا تھا۔

اشعر کو خاموش دیکھ کر اس نے پوچھا۔ "مسٹر اشعر! تم چپ کیوں ہو گئے؟"

وہ کھنکارتا ہوا بولا۔ "میں سوچ رہا ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔" بشیر جمائل کے ساتھ اس کی ملاقات ایک گھنٹے بعد ختم ہوئی۔ جب وہ کمرے سے باہر نکلا تو جینی اس کی منتظر تھی۔

اس نے اشتیاق سے پوچھا۔ "کیسا رہا تمہارا انٹرویو؟"

"میرے انٹرویو ہمیشہ اسے ہوتے ہیں۔" اس نے گول مول جواب دیا۔ لفٹ میں سوار ہونے کے بعد جینی نے کہا۔

"تمہارے کھانے کا انتظام میں نے اپنے گھر کیا ہے۔"

"کیا؟" اشعر نے تعجب سے اسے دیکھا۔

"ہاں۔" وہ بے نیازی سے مسکرائی۔ "مسٹر پریذیڈنٹ نے مجھے ہدایت کی تھی کہ تمہیں میں اپنے گھر پر کھانا کھلا کر رخصت کروں۔"

"بہت بہت شکریہ تمہارا اور تمہارے پریذیڈنٹ کا۔ اب میں مزید نہیں ٹھہر سکتا۔ مغربی بیروت میں میری بیوی اور بچے میرے منتظر ہوں گے۔" اشعر نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"صرف بیس منٹ ہوں گی تمہارے ورنے میں تم پر زبردستی نہیں کر سکتی آخر میرا تم پر کیا حق ہے تمہارے انکار کی صورت میں مجھے پریذیڈنٹ کے غصے کا سامنا کرنا ہوگا۔"

"تم انھیں میری مجبوری سمجھا دینا۔" اشعر نے دلیل پیش کی۔

"وہ بڑے ضدی انسان ہیں۔ میں زیر عتاب آجاؤں گی۔" جینی کا لہجہ اداس تھا۔

"ارے۔" اشعر کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "اتنی سی بات پر تم زیر عتاب آجاؤ گی؟"

"جی یہ معمولی بات نہیں ہے۔" جینی نے کہا۔ "پریذیڈنٹ نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہیں کھانا کھلائے بغیر نہ جانے دوں۔ میری ناکامی کو وہ اپنی توہین اور میری نااہلی تصور کریں گے۔"

اشعر کو ترس آگیا۔ خندہ پیشانی سے بولا۔ "ٹھیک ہے میں تمہاری خاطر پندرہ بیس منٹ رک جاتا ہوں لیکن پلیز..."

"اوہ تھینک یو ڈیئر!" جینی نے بے تکلفانہ انداز میں اس کی بات کاٹ دی۔ وہ لفٹ سے باہر نکلے تو اشعر کو تعجب ہوا کہ وہ گراؤنڈ فلور پر پہنچ چکے تھے۔ اس نے پوچھا۔ "میرا ڈرائیور کہاں ہے؟"

وہ بولی۔ "تم پریشان مت ہو، وہ اطمینان سے کیفے ٹیریا میں بیٹھا ہے اور دو آدمی اس کی دیکھ بھال پر مامور ہیں واپسی میں تم اسے یہیں سے اپنے ہمراہ لے لینا۔"

"کیا اسے کھانا نہیں کھلاؤ گی؟" اشعر نے طنزیہ لہجے میں سوال کیا۔

"سوری آج کا ڈنر صرف تمہارے لیے ہے۔" وہ اسے اپنے ساتھ لیے پورچ میں چلی آئی۔

اشعر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "میں اپنی گاڑی میں تمہارے گھر چلوں گا تمھیں کوئی اعتراض تو نہیں؟"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "بھلا اس میں اعتراض کی کیا

بات ہے؟"

وہ دونوں کار میں بیٹھ گئے اور اشعر جینی کی ہدایت کے مطابق کار چلاتا رہا۔ "مجھے حیرت ہے کہ بشیر جمائل نے خود مجھ سے کھانے کے لیے کیوں نہیں کہا؟"

"اور مجھے حیرت ہے کہ پریذیڈنٹ نے تمھیں انٹرویو دینے کے دوران دروازہ اندر سے کیوں مقفل کر لیا؟ اس سے پہلے انھوں نے کبھی ایسی حرکت نہیں کی تھی یوں لگتا ہے جیسے انھیں مجھ پر اعتماد نہیں رہا ہے اور وہ مجھ سے کچھ چھپانا چاہتے تھے۔"

"میں ان کی نظر میں پسندیدہ جرنلسٹ نہیں ہوں جینی! چنانچہ وہ مجھ سے اپنی کسی خاص اور خفیہ بات کا ذکر تو نہیں کر سکتے۔"

وہ کنکھیوں سے اسے دیکھتی رہی پھر ایک بولی۔ "پریذیڈنٹ سے آج اکثر باتیں غیر متوقع طور پر سرزد ہوئی ہیں۔ مثلاً انھوں نے رات ساڑھے آٹھ بجے پہلی بار مجھے بتایا کہ تم ان کا انٹرویو لینے آؤ گے حالانکہ اس قسم کے شیڈول عموماً تین چار روز پہلے میرے پاس پہنچ جایا کرتے ہیں۔"

اشعر نے موضوع بدلتے ہوئے استفسار کیا۔ "جینی! تمھیں اپنے باس کے پاس ملازمت کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہو چکا ہے؟"

"تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟" جینی نے پوچھا۔

"یونہی.. اپنی معلومات میں اضافے کے لیے۔"

"میرا تقرر چھ ماہ پہلے ہوا تھا اور دیکھو میرا قدم کتنا مبارک ہے کہ میرے آنے کے بعد میرا باس غیر متوقع طور پر لیقان کا صدر منتخب ہو گیا۔"

"واقعی؟"

"ہاں، تم مجھ سے دوستی کر لو ممکن ہے تم اپنی نیوز ایجنسی کے چیئرمین بن جاؤ۔"

اشعر نے شوخ لہجے میں سوال کیا۔ "جو شخص تمھارا شوہر ہو گا اسے کون سا اعزاز ملے گا؟"

اس نے برجستہ جواب دیا۔ "آزما کے دیکھ لو۔"

"تمھارا مطلب ہے..... ؟" اشعر نے ہچکچاتے ہوئے جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔

وہ زندہ دلی سے بولی۔ "ہاں ہاں میرا مطلب بالکل واضح ہے یعنی تم مجھ سے شادی کر لو۔ اگر مقدر کے سکندر نہ بن سکو تو مجھے طلاق دے دینا۔"

اشعر کو اس کی بے باکی پر حیرت نہیں ہوئی۔ وہ فلپینی لڑکیوں کے مزاج سے بخوبی آشنا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے ذہن میں یہ کھٹک بھی موجود تھی کہ جینی کا تعلق یقیناً اسرائیلی انٹیلی جنس ہو سا عد

سے ہے کیوں کہ وہ بشیر جمائل کی پرائیویٹ سکریٹری جیسے اہم ترین عہدے پر فائز تھی۔ ایسی صورت میں وہ اسے کریدنے کے لیے اُلّو بنا رہی تھی۔

وہ بولا۔ "قسمت کی بات ہے، اگر تم چند سال پہلے مجھ سے یہ بات کہتیں تو میں فوراً تمھیں اپنی بیوی بنا لیتا لیکن تم نے آنے میں بہت دیر کر دی اور میں نے شادی کرنے میں جلدی کی۔"

جینی نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا اور بولی۔ "یہ قصور ہمارے ستاروں کا ہے۔"

وہ اسی طرح کی گفتگو کرتے ہوئے ایک شاندار بنگلے کے سامنے پہنچے۔ گیٹ پر چار باوردی مسلح فوجی کھڑے تھے جینی کو دیکھتے ہی انھوں نے سیلوٹ کیا اور گیٹ کھول دیا۔ دو نوجوان لڑکیاں کار کی آواز سنتے ہی اندر سے دوڑی آئیں، انھوں نے کار کے دروازے کھولے اور سر جھکا کر کھڑی ہو گئیں۔ جینی، اشعر کو اپنے ہمراہ ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ اشعر اس کا شاندار ڈرائنگ روم دیکھ کر بولا۔ "واہ بھئی جینی! تمھارے بنگلے پر تو قصرِ صدارت کا گماں ہوتا ہے۔"

"ایک طرح سے تو یہ غیر رسمی طور پر قصرِ صدارت ہی ہے۔" اس نے فخر سے کہا۔

"کیا مطلب؟" وہ چاروں طرف کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

جینی نے سرگوشی میں کہا۔ "پرائیویٹ سکریٹری اپنے باس کی

نصف شریکِ کار ہوتی ہے۔"

اشعر حیران تھا کہ جینی پہلی ہی ملاقات میں اس قدر گھل مل کر باتیں کر رہی تھی جیسے وہ اس کی پرانی شناسا ہو۔ جینی نے چہرے سے اشعر کے دلی جذبات کا اندازہ کرکے کہا۔ "تم سوچ رہے ہو کہ میں تم سے اس قسم کی گفتگو کر رہی ہوں؟ اشعر! نجانے کیا بات ہے، تم اجنبی ہونے کے باوجود مجھے اپنے سے لگتے ہو۔ مجھے لوگوں سے بڑا خوف آتا ہے میں اپنے اس خوف کو چھپانے کے لیے ان سے نفرت کرتی ہوں۔ ہاں میں سچ کہتی ہوں، کبھی کبھی میرے اندر نفرتوں کا آتش فشاں بیدار ہونے لگتا ہے۔ اور میرا جی چاہتا ہے کہ سبھی انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دوں۔" پھر قہقہہ لگا کر بولی۔ "میں بلاوجہ تمھیں باتوں میں الجھا بیٹھی۔ وقت تیزی سے گزر رہا ہے۔ آؤ کھانا کھالیں۔"

اشعر کو یہ لڑکی سوتی جیسی لگ رہی تھی۔ اس نے سوتی کو جب پہلی بار دیکھا تھا تو وہ بھی ایسی ہی الجھی ہوئی ڈور کی مانند لگتی تھی جس کا کوئی سرا نہ تھا لیکن جب اس کی اصلیت کھلی تو معلوم ہوا کہ وہ ایک مظلوم اور ستائی ہوئی لڑکی تھی۔ کیا یہ لڑکی بھی اندر سے دکھی ہے؟ اشعر نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

عین اس وقت ویٹرس کمرے میں داخل ہوئی اسے دیکھتے ہی جینی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اشعر نے بھی اس کی تقلید کی اور دونوں ساتھ ساتھ ڈرائنگ روم میں آگئے۔ ڈنر بے حد پرتکلف تھا۔ اشعر نے کہا۔ "جینی باقی لوگ کدھر ہیں؟"

"کیا مطلب؟ کون لوگ؟"

اشعر نے ہنس کر کہا۔ "یہ کھانا کم از کم بارہ افراد کے لیے ہے۔ ہم دو افراد تو اسے ختم نہیں کرسکتے۔ کچھ اور لوگ بھی ہونا چاہئیں نا۔"

جینی نے مسکرا کر سوال کیا۔ "اشعر! کیا پریذیڈنٹ ماسٹر ٹیلیوں سے برگشتہ ہوگئے ہیں؟" وہ چونکا اور اسے گھورتے ہوئے بولا۔ "تم نے کیسے اندازہ لگایا؟"

جینی نے کندھے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔ "میں دن رات ان کے ساتھ رہتی ہوں۔ چند روز سے میں محسوس کر رہی ہوں کہ ان کے تیور کچھ بدلے بدلے سے ہیں۔ انھیں اپنے اتحادیوں سے زیادہ دلچسپی نہیں رہی اور وہ نئے دوستوں کی تلاش میں ہیں۔ تم اپنی مثال لے لو وہ تمھارے نام سے نفرت کرتے تھے لیکن آج انھوں نے تمھیں مقفل کمرے میں انٹرویو دیا۔ میرا ذہن اب تک اسی ادھیڑ بن میں لگا ہے کہ انھوں نے تم سے کیا باتیں کی ہیں؟"

اشعر نے قہقہہ لگا کے جواب دیا۔ "مجھ سے انھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی وژن کے ذریعے منظر عام پر آجائے گا۔"

"خیر چھوڑو، مجھے کیا؟" جینی نے اپنے سر کو جھٹکا دیا۔

تھوڑی دیر تک وہ ادھر ادھر کی گفتگو کرتے رہے پھر کھانے سے فارغ ہوکر اشعر اٹھا اور بولا۔ "اب مجھے اجازت دو جینی! تمھاری دعوت کا بہت بہت شکریہ۔ یہ مجھ پر قرض رہے گا۔"

"قرض تو تم نے یہیں بے باک کردیا۔" وہ معنی خیز انداز میں ہنسی۔ "بہرحال تم مجھے ہمیشہ یاد رہوگے۔"

وہ اس کے ساتھ پورچ تک آئی جہاں اشعر کی گاڑی کھڑی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہی اسے کوئی بات یاد آگئی۔ اس نے بہ آوازِ بلند کہا۔ "جینی! تم نے ہوٹل میں مجھ سے ایک وعدہ کیا تھا۔"

"وعدہ؟" جینی نے پلکیں جھپکائیں۔

"تم نے کہا تھا کہ تم مجھے سب کچھ بتادوگی۔"

"کیا بتادوں گی؟"

"یہی کہ میں تمھیں پہلے کہاں اور کب ملا تھا؟"

جینی نے جواب نہیں دیا بس ایک ٹک سے اسے گھورتی رہی۔ اشعر کو بڑا تعجب ہوا۔ اس نے دوبارہ اپنا سوال دہرایا تو وہ سرد لہجے میں بولی۔ "یہ سوال مجھ پر قرض رہنے دو اشعر! اب تم جاؤ۔ کافی دیر ہوگئی ہے۔ ہوٹل کیفے ٹیریا میں فوٹوگرافر تمھارا منتظر ہوگا۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

اشعر سٹپٹا کر رہ گیا۔ وہ مزید کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن جینی خلافِ توقع جلدی سے واپس مڑی اور اندر چلی گئی۔

ہوٹل کی طرف سے آتے ہوئے راستے بھر اشعر کا دماغ الجھن میں گرفتار رہا۔ اسے جینی کی باتیں بڑی عجیب سی لگی تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ ان باتوں کا کیا مطلب لے۔ ان کا مقصد کیا ہے۔ آج سے قبل بھی وہ جینی سے مل چکا تھا۔ جینی نے خود بھی اعتراف کیا تھا۔ اسے یہ بھی یاد تھا کہ وہ کہاں اور کب ملے تھے مگر وہ اسے بتانے سے احتراز کر رہی تھی۔

وہ ہوٹل انگیز نڈر کے پورچ میں پہنچا تو ساڑھے دس بج چکے تھے۔ اسے تعجب ہوا کہ فوٹوگرافر شبیر حسنین باہر ہی کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کی گاڑی دیکھتے ہی وہ جلدی سے دوڑا اور دروازہ کھول کر اس کے برابر کی نشست پر بیٹھ گیا۔ اشعر نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تمھیں میری آمد کا علم ہوچکا تھا؟"

"جی سر!" شبیر نے اکتاہٹ سے جواب دیا۔ "چند منٹ پہلے مجھے منٹلر نے آکر کہا تھا کہ میں پورچ میں آکر آپ کا انتظار کروں۔ سر! آپ کہاں چلے گئے تھے؟"

اشعر نے مختصراً اسے ساری بات بتادی۔

شبیر حسین نے کہا "میں تمام وقت جس مشکل سے دوچار رہا وہ ایک عذاب سے کم نہ تھا۔ میری تو یہ جرأت آئندہ کبھی فلنجیوں کے مشرقی بیروت کا رُخ کروں۔"

"کیوں بھئی ایسی کیا بات ہوگئی؟" اشعر نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

وہ کہنے لگا "سر! کیا بتاؤں، میرا ہوٹل میں بیٹھنا محال ہوگیا تھا۔ بڑی بے ہودہ جگہ ہے یہ۔ مجھے تو اس ہوٹل پر اُس بازار کا گمان ہوتا تھا۔ خدا کی قسم مجبوری تھی آپ کے انتظار میں بیٹھا رہا۔ شراب کے بھبکوں نے میرے حواس مختل کر دیے۔"

اس نے گاڑی مزارع کورنک کی طرف موڑی تو شبیر حسین گھبرا کر بولا "سر! میرا گھر اس طرف نہیں ہے۔"

"اوہ!" اشعر نے بریک لگا کے کہا "یار! میں بھول ہی گیا تھا کہ پہلے تمھیں ڈراپ کرنا ہے۔" اس نے گاڑی شبیر حسین کے گھر کی طرف موڑ لی۔ تقریباً پندرہ منٹ کی مسافت طے کرنے کے بعد شبیر حسین کا گھر آگیا۔ وہ دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر نکلا اور بولا "آپ ذرا انتظار کریں میں مس انجلا کی تصویر لے کر ابھی آتا ہوں۔"

اشعر نے کہا "سنو! تم اطمینان سے تصویر نکالو میں ایک دوست سے مل کر واپس آتا ہوں۔"

"او کے سر!" شبیر حسین نے ہاتھ اٹھا کر اسے سلام کیا اور اشعر نے گاڑی مزارع کورنک کی طرف موڑ لی۔ مشرقی بیروت کی چکا چوند روشنیوں اور رونقوں کے برعکس مغربی بیروت اُداسی اور سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ سڑکیں ویران تھیں اور فضا میں ماتمی کیفیت رچی ہوئی تھی۔ دل بلاوجہ بین کرنے کو چاہتا تھا۔ فلسطینی فدائین کے ایک دستے کی روانگی ہو چکی تھی اور دوسرے دستے کو صبح روانہ ہونا تھا۔

اشعر پی ایل او کے ہیڈ کوارٹر میں داخل ہوا تو وہاں عجیب میلہ سا لگا ہوا تھا۔ سیکڑوں فدائین جنھیں صبح روانہ ہونا تھا وہاں جمع تھے۔ شہابی، اشعر کو وہیں مل گیا۔ اس نے نہایت پرتپاک انداز میں اسے خوش آمدید کہا اور ایک طرف تنہائی میں لے جا کر بولا "ڈاکٹر الناصر نے ہدایت کی تھی کہ جونہی تم مشرقی بیروت سے واپس آؤ تو میں تمھیں ساتھ لے کر شتیلہ کیمپ پہنچ جاؤں۔"

"کیوں خیریت تو ہے؟" اشعر نے سوال کیا۔

"ہاں! تردد کی کوئی بات نہیں۔" وہ بولا۔

اشعر نے پوچھا "کیا اس وقت الناصر سے میری ملاقات ممکن ہے؟"

شہابی نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا "وہ ابو عمار اور ابو جہاد کے ساتھ ایک نہایت اہم میٹنگ میں مصروف ہیں کیا تم انھیں بشیر جمائل سے ملاقات کی تفصیل بتانا چاہتے ہو؟"

"ہاں۔" اشعر نے جواب دیا۔

شہابی نے کہا "ملاقات کی روداد تم واپسی پر انھیں سنا دینا، اس وقت تک وہ میٹنگ سے فارغ ہو چکے ہوں گے۔"

وہ اس کا بازو پکڑ کر باہر جانے لگا۔

اشعر نے کہا "یار! میری ایک بات سن لو۔"

"ہاں ہاں کہو۔" شہابی نے استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

اشعر بولا "ڈاکٹر الناصر نے مجھے بتایا تھا کہ صبا، سوئی کو ملب کے چنگل سے چھڑانے کی مہم پر روانہ ہوئی ہے۔ مجھ اس کے بارے میں ان سے معلوم کرنا تھا۔"

"اس کے متعلق بھی تمھیں واپسی پر پتا چل جائے گا؟ اب آؤ میرے ساتھ۔" شہابی نے اسے گھسیٹا۔ اشعر دل ناخواستہ اس کے ساتھ چل دیا۔ راستے میں اس نے شہابی سے شتیلہ کیمپ جانے کا سبب جاننے کی بہت کوشش کی مگر شہابی نے ہر بار اُسے اِدھر اُدھر کی باتوں میں بہلا کر ٹال دیا۔ دفعتاً اسے اس لڑکی کا خیال آگیا جسے شیخ یمنی اور شبیر حسین نے انجلا سمجھا تھا۔ اس نے شہابی کو اس کے بارے میں بتا کر پوچھا کہ اس کا اس سلسلے میں کیا خیال ہے؟

خلاف توقع شہابی نے کسی حیرانی کا اظہار نہیں کیا۔ وہ سپاٹ لہجے میں بولا "الناصر کو اس کی اطلاع مل چکی ہے لیکن ابھی تک وہ ہمارے ہتھے نہیں چڑھی۔"

"وہ ہے کون؟" اشعر نے سوال کیا۔

"تم سنو گے تو اچھل جاؤ گے۔"

"کیا مطلب؟"

"وہ اسرائیلی انٹیلی جنس موساد کی چیف سارہ ہے۔"

"میرے خدا۔ آخر اس خطرناک قاتلہ کو انجلا کا بہروپ بھرنے کی کیا ضرورت پیش آگئی؟" اشعر نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

شہابی نے بتایا۔ فدائین کا مغربی بیروت سے انخلا ہو رہا ہے، وہ اپنے ہمراہ ان اسرائیلی اور فلنجی قیدیوں کو بھی لے جائیں گے جنھیں جنگِ بیروت کے دوران پکڑا گیا تھا۔ ان قیدیوں میں ایک پائیلٹ بھی ہے جس کا طیارہ ہم نے طیارہ شکن توپوں سے گرا لیا تھا۔ یہ پائیلٹ جنرل شیرون کی بیٹی کا منگیتر ہے۔ شیرون اپنے ہونے والے داماد کو ہر قیمت پر رہا کرانا چاہتا ہے۔ یہ مشن سارہ نے خود اپنے ذمے لیا ہے۔ چنانچہ آج وہ مغربی بیروت میں داخل ہوئی اور پلاسٹک سرجری سے اس نے اپنے چہرے پر مس انجلا کا چہرہ سجا لیا۔ وہ انجلا کے روپ میں پائیلٹ کو چھڑانے کے لیے کیا حکمتِ عملی اختیار کرے گی یہ ہم ابھی تک نہیں جان سکے ہیں۔

بہر حال وہ مغربی بیروت ہی میں کہیں چھپی ہوئی ہے۔"

"اس انکشاف نے مجھے ایک اور شبہے میں مبتلا کر دیا ہے۔" اشعر نے کہا۔

"وہ کیا؟" شہابی نے پوچھا۔

وہ بولا۔ "مغربی بیروت میں سارہ کی آمد کا مقصد یاسر عرفات پر قاتلانہ حملہ بھی ہو سکتا ہے۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ فدائین اپنی شرطیں منوا کر جس عزت و احترام سے انخلا پر تیار ہوئے ہیں اس پر بیگن اور شیرون سخت مشتعل ہیں۔ اگر خدانخواستہ یاسر عرفات کو قتل کر دیا جاتا ہے تو وہ اسے اپنی بہت بڑی فتح سے تعبیر کریں گے۔"

"تمہارا تجزیہ سو فیصد درست ہے برادر!" شہابی مسلسل اثبات میں سر ہلا رہا تھا عین اسی وقت اشعر کا دھیان جینی کی طرف چلا گیا۔ وہ بے ساختہ بولا۔ "برادر شہابی! آج میں بشیر جمائل کی پرائیوٹ سیکریٹری سے بھی ملا ہوں۔ مجھے وہ بھی بڑی پُراسرار لڑکی لگی ہے۔"

"جینی نام ہے اس کا؟" شہابی نے فوراً سوال کیا۔

"ہاں ہاں۔ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" اشعر نے بےتابی سے پوچھا۔

وہ تھوڑی دیر تک خاموشی سے سوچتا رہا پھر بولا۔ "میں اس کے متعلق صرف یہ جانتا ہوں کہ وہ بشیر جمائل کی سیکریٹری ہے۔ اس کا تعلق اسرائیلی انٹیلی جنس موساد سے ہے لیکن ڈاکٹر الناصر کا کہنا ہے کہ جینی بشیر جمائل کے لیے کبھی بھی موت کا فرشتہ بن سکتی ہے۔"

"کیا؟" وہ ہکا بکا سا اسے دیکھنے لگا۔

شہابی نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے متعدد بار الناصر کو کریدنے کی کوشش کی لیکن مجھے کامیابی نہ ہو سکی۔ وہ اس کے بارے میں کچھ کہنے سے جانے کیوں گریز کرتے ہیں مجھے خود حیرت ہے۔"

اشعر بولا۔ "مجھے یوں لگتا ہے میں نے جینی کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے لیکن کہاں اور کس جگہ؟ یہ سوچتا ہوں تو دماغ پر دھند چھا جاتی ہے۔ اس نے آج اس بات کی تصدیق کی کہ وہ بھی مجھ سے مل چکی ہے مگر اس نے دانستہ طور پر تفصیل بتانے سے پہلوتہی کی۔"

"حیرت ہے۔" شہابی بولا۔

ان کی گاڑی اب شتیلا کیمپ میں داخل ہو چکی تھی۔ شتیلا اور صابرہ کیمپ بیروت کی کچی آبادیوں کے نام تھے جہاں ہزاروں فلسطینیوں کے علاوہ مقامی باشندوں نے بھی اپنے پختہ مکان تعمیر کیے ہوئے تھے یہاں بجلی، پانی، سیوریج اور سڑکوں کا ایک باقاعدہ نظام تھا۔ شاپنگ سینٹرز، اسکول اور اسپتال بھی تھے۔ دونوں کیمپ ایک دوسرے سے ملحقہ اور بیروت کے انٹرنیشنل ایئرپورٹ سے مغربی بیروت کی طرف آتے ہوئے کامل شمعون روڈ کے عقب میں واقع تھے۔ ان کے دوسری طرف اسٹیڈیم تھا۔

اشعر کی گاڑی جب شتیلا کیمپ کی آبادی میں داخل ہوئی تو چاروں طرف تاریکی تھی۔ اسرائیلی حملے کے دوران یہاں کی بیشتر عمارتیں، سڑکیں اور اسٹریٹ لائٹس تباہ ہو گئی تھیں اور ان کی مرمت کا مسئلہ ہنوز ابھی دور نظر آتا تھا۔ فلسطینی فدائین کے انخلا کا سمجھوتہ طے پاتے ہی یہاں کے مکینوں نے مغربی بیروت کے عارضی کیمپوں سے نکل کر دوبارہ ادھر آباد ہونا شروع کر دیا تھا۔ ان کی گاڑی ایک تاریک محلے میں آ کر رک گئی۔ شہابی دروازہ کھول کر باہر نکلا اور اشعر کو بھی اپنے ہمراہ آنے کے لیے کہا۔ اس کا جی نہیں چاہتا تھا لیکن پھر بھی الوداع کر رہا۔ وہ اٹھا اور گاڑی لاک کر کے شہابی کے پیچھے پیچھے راستے پر چل دیا — تھوڑی دور جا کر شہابی نے بغور ایک مکان کا جائزہ لینے کے بعد دروازے پر دستک دی۔ اندر سے کوئی آواز نہیں آئی۔ لگتا تھا جیسے وہاں کے مکین گہری نیند میں غرق تھے۔ شہابی نے دوبارہ دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ یکایک کسی نے صحن کا بلب روشن کیا اور تب ایک بڑھیا کی آواز سنائی دی۔ "کون ہے؟"

"میں ہوں اماں شہابی! ڈاکٹر الناصر کا آدمی دروازہ کھولو۔" وہ باآواز بلند پکارا۔

"ٹھہرو بیٹا! آ رہی ہوں۔" اندر سے جواب ملا۔

اشعر کچھ فاصلے پر کھڑا تاریکی میں اِدھر اُدھر کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ چند لمحے بعد دروازہ کھول کر بوڑھی عورت نے کہا۔ "مرحبا بیٹا! کس کام سے آئے ہو؟"

"اماں! مجھے اندر تو آنے دو۔" شہابی گھر میں داخل ہو گیا۔ اشعر لاتعلق سا بنا اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ کچھ دیر تک اُسے اندر کھسر پھسر کی آوازیں سنائی دیتی رہیں پھر شہابی نے باہر جھانک کر کہا۔ "اشعر اندر آ جاؤ۔"

اندر داخل ہوتے ہی اشعر کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ سوئٹی سے اس کی اس طرح ملاقات ہو سکے گی۔ سوئٹی بھی حیرت سے آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی۔ پھر جیسے وہ ہوش میں آ کر چلائی۔ "نانا جان یہ راحیل۔" اس نے ایک چارپائی پر دراز مفلوج قسم کے ضعیف شخص کو دونوں ہاتھوں سے ہلاتے ہوئے کہا۔ "نانا جان! دیکھیں راحیل آ گیا۔" پھر وہ دوسری چارپائی کی طرف مڑی اور اس پر گم صم لیٹی ایک ضعیفہ کا بازو ہلاتے ہوئے چیخی۔ "امی! امی دیکھیے تو راحیل آیا ہے۔" وہ خوشی سے بےحال تھی اور اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو جھلملا رہے تھے۔

اقبال کاظمی

# بیسوی چوری
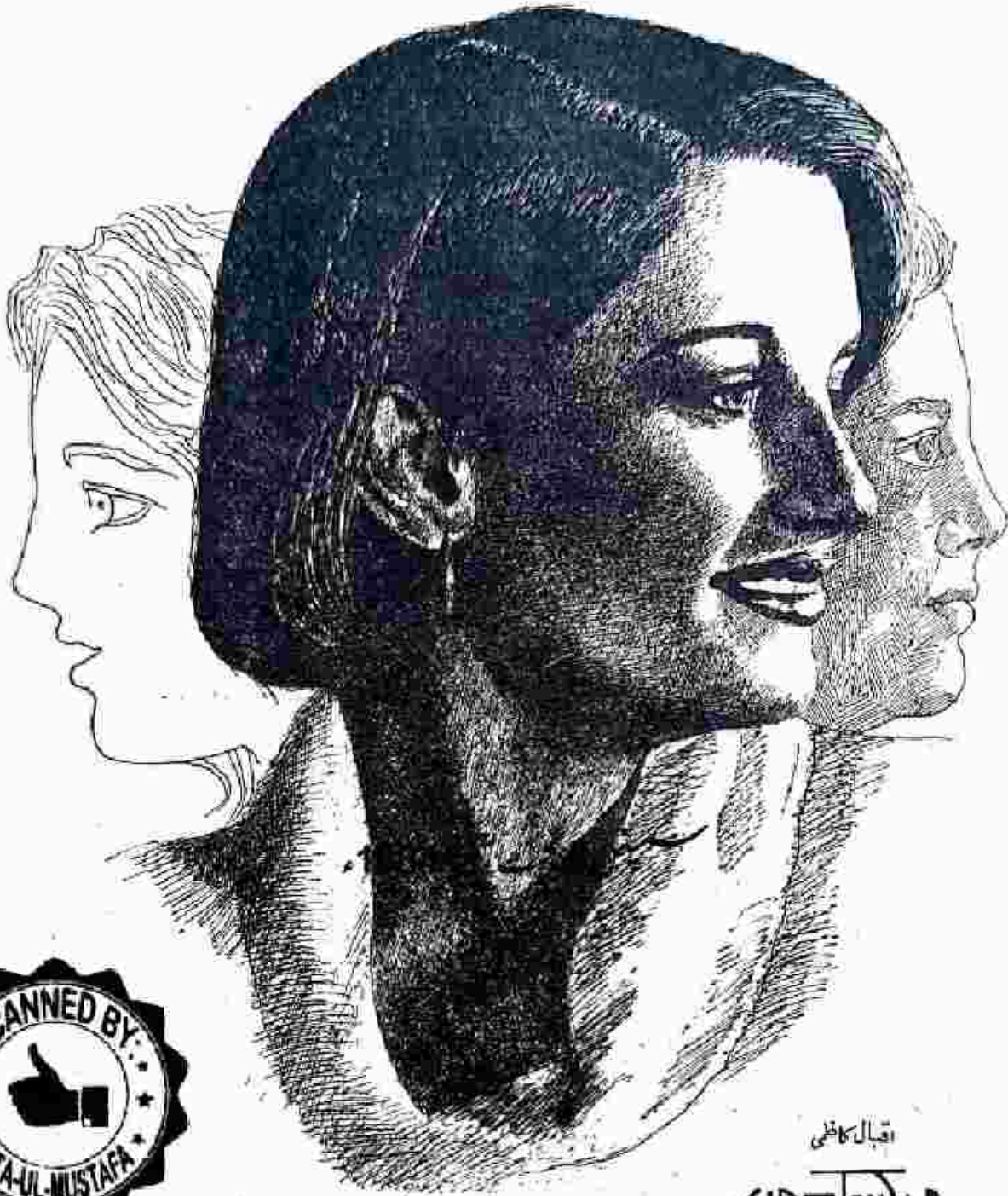
نک ویلوٹ سے سسپنس کے قارئین خوب واقف ہیں۔ پہلے یہ بے ضرر چور بیس ہزار ڈالر کے عوض ناکارہ اور بے قیمت چیزیں چرایا کرتا تھا۔ موجودہ مہنگائی کے پیش نظر اس نے اپنے معاوضے میں پانچ ہزار ڈالر کا اضافہ کر دیا ہے۔ اب اگر آپ اس سے کوئی بے قیمت چیز چوری کرانا چاہتے ہیں تو پہلے پچیس ہزار ڈالر کا انتظام کر لیجیے اور اس کا طریقہ کار جاننے کے لیے یہ کہانی پڑھ لیجیے۔

ان قارئین کے لیے بطور خاص جو نک ویلوٹ کے ہتھکنڈے والے پڑھنے کے لیے بے چین رہتے ہیں۔

دروازے کی گھنٹی بجی تو گلوریا اس وقت باتھ روم میں تھی۔ آج دفتر میں دیر تک کام کرتے ہوئے وہ تھکن سی محسوس کرنے لگی تھی۔ وہ سات بجے دفتر سے چلی تھی۔ گھر پہنچتے پہنچتے آٹھ بج گئے۔ نک ویلوٹ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ ان دنوں کوئی کیس نہ ہونے کی وجہ سے وہ دن بھر شہر کی سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا رہتا تھا مگر شام آٹھ بجے کے لگ بھگ گھر ضرور پہنچ جاتا۔

پھر وہ دونوں کھانا کھانے کے لیے چلے جاتے۔ ان کی واپسی نصف شب کے قریب ہوتی۔ اس وقت ٹنک کو گھر میں موجود نہ پا کر گلوریا نے سوچا تھا کہ اس کے آنے سے پہلے پہلے غسل کر کے تیار ہو جائے۔ اس کا خیال تھا کہ ٹھنڈے پانی کے غسل سے نہ صرف تھکن دور ہو جائے گی بلکہ وقت کی بچت بھی ہو گی اور ٹنک کے آتے ہی وہ روانہ ہو جائیں گے کیونکہ آج کھانے کے بعد انہیں ساحل پر واقع سلور سینڈز نائٹ کلب جانا تھا جہاں ٹھیک دس بجے کیبرے کا ایک خاص پروگرام ہونے والا تھا۔

گھنٹی دوسری بار بجی۔ گلوریا نے شاور بند کر دیا اور جسم پر ٹاول لگا ؤن لپیٹتی ہوئی باہر نکل آئی۔ باتھ روم جانے سے پہلے اسے خیال ہی نہیں رہا تھا کہ بیرونی دروازہ کھلا چھوڑ دے۔ اگر دروازہ صرف مقفل ہوتا تو ٹنک اپنی چابی سے اسے کھول سکتا تھا لیکن گلوریا نے اسے اوپر سے بولٹ کر دیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ آنے والا ٹنک کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس نے بولٹ گرا کر اطمینان سے ہینڈل گھما دیا۔ لیکن دروازہ کھلتے ہی اسے بری طرح چونک جانا پڑا تھا۔ ٹنک ویلوٹ کے بجائے بل ڈاگ کی سی شکل والا ایک بھاری بھر کم آدمی سامنے کھڑا تھا۔ گلوریا کے خیال میں اس کی عمر ساٹھ سال سے کسی طرح بھی کم نہیں رہی ہو گی۔ ہیٹ کسی حد تک پیشانی پر جھکا ہوا اور جسم پر سرمئی رنگ کا ڈھیلا ڈھالا سا رین کوٹ۔ اس کا ایک ہاتھ کوٹ کی جیب میں تھا۔ اس سے پہلے کہ گلوریا کچھ کہتی وہ شخص اسے ایک طرف دھکیلتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔

”ٹنک ویلوٹ کہاں ہے؟ میں تقریباً تین گھنٹے سے سڑک پر کھڑا اس کا انتظار کر رہا ہوں۔“ اس نے کمرے کے وسط میں رک کر گلوریا کو گھورا۔

”مگر تم کون ہو اور اس طرح زبردستی اندر آنے کا مقصد؟“ گلوریا تیز لہجے میں بولی۔

”مجھے افسوس ہے۔“ اجنبی نے ہیٹ اتارتے ہوئے کہا۔ ”میں ایک انتہائی اہم کام کے سلسلے میں مسٹر ٹنک ویلوٹ سے ملنا چاہتا ہوں۔ اگر تاخیر ہو گئی تو میرا مستقبل تباہ ہو جائے گا۔ یوں سمجھو کہ میں نے اپنی زندگی داؤ پر لگا رکھی ہے۔“

”اگر تم ایک منٹ کے اندر اندر یہاں سے باہر نہ نکلے تو میں وقت سے پہلے تمہارا مستقبل تاریک کر دوں گی۔“ گلوریا نے اسے گھورا۔

”مجھے غلط مت سمجھو مس! میں ایک بہت بڑی مصیبت میں پھنس چکا ہوں اور اس وقت تک اپنے گھر کا رخ نہیں کر سکتا جب تک میرا یہ مسئلہ حل نہ ہو جائے۔ میں بہت شریف آدمی ہوں۔ اس طرح اندر چلے آنے پر مجھے افسوس ہے۔ اسے تم میری بدحواسی کہہ سکتی ہو۔“

”بہتر ہو گا کہ تم نیچے لاؤنج میں جا کر انتظار کرو۔“ گلوریا نے گاؤن درست کرتے ہوئے کہا۔

اجنبی کوئی جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ ایک بار پھر دروازہ کھلا اور ٹنک ویلوٹ اندر داخل ہوا۔ یہاں کی صورتِ حال دیکھ کر اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ وہ مشتبہ نگاہوں سے پہلے اجنبی اور پھر گلوریا کی طرف دیکھنے لگا۔

”مجھے اس طرح کیوں گھور رہے ہو۔ یہ تمہارا ہی کوئی چاہنے والا ہے۔“ گلوریا یہ کہہ کر باتھ روم کی طرف چلی گئی۔

”کیوں مسٹر! کیا معاملہ ہے؟“ ٹنک نے اجنبی کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

”مسٹر ٹنک ویلوٹ؟“ اجنبی نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”بیشک یہ میرا ہی نام ہے مگر تمہارا حدود اربعہ کیا ہے؟“

”کیا ہم بیٹھ کر بات نہیں کر سکتے؟“ اجنبی ادھر ادھر دیکھنے لگا گویا بیٹھنے کی جگہ تلاش کر رہا ہو۔

ٹنک ویلوٹ چند لمحے اسے گھورتا رہا پھر سٹنگ روم میں آ گیا۔

”ہاں! اب کہو؟“ وہ صوفے پر بیٹھنے کے بعد سوالیہ نگاہوں سے اجنبی کی طرف دیکھنے لگا۔

”میں اس وقت بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہوں اور مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے مسٹر ٹنک ویلوٹ!“ اجنبی نے کہا۔ اس کے لہجے سے پریشانی عیاں تھی۔ یوں بھی چہرے سے بدحواسی ٹپک رہی تھی۔

”میرے پاس صرف پریشان حال لوگ ہی آتے ہیں لیکن ان کے پاس بھی کوئی نہ کوئی حوالہ ہونا چاہیے۔“

”مجھے رینڈ نے تمہارا پتا بتایا تھا۔ وہ چائنا ٹاؤن میں رہتا ہے۔ چند سال پہلے تم نے ایک معاملے میں اس کی مدد کی تھی۔“

”ٹھیک ہے سمجھ گیا۔“ ٹنک نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”اب اپنی بپتا سناؤ۔“

”میرا نام ڈریک ہے اور بوبری کے علاقے میں میرا چھوٹا سا کاروبار ہے۔“ اجنبی بولا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کہنے لگا۔ ”تین سال پہلے میں نے ایک اطالوی لڑکی سے شادی کی تھی لیکن بعد میں احساس ہوا کہ میں زندگی کی سب سے بڑی حماقت کا مرتکب ہو چکا ہوں۔ روزالی کا بھائی ایک بہت ہی خوفناک سنڈیکیٹ کا رکن ہے۔ وہ آئے دن نہ صرف مجھ سے لمبی لمبی رقمیں بٹورتا رہتا ہے بلکہ دھمکیاں بھی دیتا ہے کہ اگر میں نے اس کی بہن کو تنگ کیا تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ میں تین سال سے یہ سب کچھ برداشت کرتا چلا آ رہا ہوں۔ گزشتہ دنوں روزالی اپنی ماں کے ہاں گئی ہوئی تھی کہ ایک روز میری ایک دوست مجھ سے ملنے کے لیے آئی اور کمبخت جاتے ہوئے میری بیوی کی ایک میکسی لے گئی۔ یہ میکسی روزالی کو اس کی ماں نے

اپنے ہاتھ سے بنا کر دی تھی۔ اس کے سامنے والے حصے پر گلے سے لے کر دامن تک رنگین دھاگوں سے پھول کڑھے ہوتے ہیں۔ اتفاق سے دوسرے روز صبح سویرے روزالی گھر پہنچ گئی۔ آنے والے بدھ کو اس کی سالگرہ ہے اور اس روز وہ وہی میکسی پہننا چاہتی ہے لیکن الماری سے میکسی غائب پا کر اس نے ایک ہنگامہ مچا دیا۔ بدقسمتی سے ایک پڑوسن نے اسے بتا دیا کہ گزشتہ روز کوئی عورت ہمارے گھر آئی تھی۔ روزالی کہتی ہے کہ میں نے میکسی اسی عورت کو دے دی ہوگی۔ اس نے مجھے دھمکی دی ہے کہ اگر بدھ سے پہلے پہلے میکسی واپس لاکر نہ دی تو وہ ساری بات اپنے بھائی کو بتا دے گی۔ میں اسی وقت سے پریشان ہوں۔ میکسی کی واپسی کے لیے اس عورت کی منت سماجت کی، اسے ایک بڑی رقم کی پیش کش بھی کی لیکن وہ کسی طرح بھی میکسی واپس کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔ اس کے برعکس اس نے مجھے دھمکی دی کہ اگر میں نے کوئی گڑبڑ کی تو وہ میرے خلاف پولیس میں رپورٹ درج کرادے گی کہ میں اسے زبردستی اپنے گھر لے گیا تھا۔ میں ایک شریف آدمی ہوں۔ کوئی ہنگامہ نہیں چاہتا لیکن اس میکسی کے لیے اپنی ساری جمع پونجی تک خرچ کرنے کو تیار ہوں۔ آج دوپہر اتفاق سے رینڈ سے ملاقات ہو گئی۔ اس سے اپنی پریشانی بیان کی تو اس نے تمہارا پتا بتا دیا۔ اب میں یہی امید لے کر آیا ہوں کہ تم مجھے اس مصیبت سے نجات دلا سکو گے۔ اگر بدھ تک میکسی روزالی کو واپس نہ ملی تو اس کا بھائی میرا جینا حرام کر دے گا۔ اس کی سینڈیکیٹ کے آدمی دنیا کے آخری کونے تک میرا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔"

"میرا پتا تمہیں رینڈ نے بتایا تھا۔ اس نے میری شرائط کے بارے میں بھی تمہیں آگاہ کر دیا ہوگا۔" ٹمک اس کے خاموش ہونے پر بولا۔

"ہاں میں جانتا ہوں کہ تم کوئی قیمتی چیز نہیں چراتے لیکن اس میکسی کی قیمت پچیس ڈالر سے زیادہ نہیں ہو سکتی جس کے لیے میں تمہیں پچیس ہزار ڈالر دینے کو تیار ہوں۔" ڈریک نے کہتے ہوئے نوٹوں کا ایک بنڈل نکال کر سامنے پڑی ہوئی چھوٹی میز پر ڈال دیا۔

"وہ عورت کون ہے؟" میرا مطلب ہے وہ.....

"وہ حرافہ" ڈریک نے اس کی بات کاٹ دی۔ "نیو جرسی کی رہنے والی ہے۔ چھٹیاں گزارنے کے لیے یہاں آئی ہوئی ہے۔ وہ پروفیسی کے نام سے آسٹر ہوٹل میں قیام پذیر ہے۔"

آسٹر ہوٹل کا نام سن کر ٹمک دولیوٹ چونک گیا۔ نیویارک سٹی میں واقع اس عظیم الشان ہوٹل میں ڈریک جیسا آدمی داخلے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ چند لمحے ٹمک سوچتا رہا پھر نوٹوں کا بنڈل اٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔

"ٹھیک ہے مسٹر ڈریک، آج جمعرات ہے۔ وہ میکسی تمہیں منگل تک مل جائے گی تم سے رابطہ کیسے قائم کیا جائے گا؟"

"رابطہ میں خود ہی قائم کر لوں گا۔" امید ہے تم مجھے مایوس نہیں کرو گے۔" ڈریک کہتا ہوا اٹھ گیا۔

اس کے جاتے ہی گلوریا کمرے میں داخل ہو گئی۔ اس دوران وہ لباس بدل چکی تھی۔

"کون تھا یہ؟" اس نے گھورتی ہوئی نگاہوں سے ٹمک کی طرف دیکھا۔

"تمہیں اس سے غرض نہیں ہونی چاہیے۔ جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ آج رات کا کھانا ہم آسٹر ہوٹل میں کھائیں گے۔" ٹمک نے مسکراتے ہوئے جیب سے نوٹوں کا بنڈل نکال کر اس کی طرف اچھال دیا۔

"آسٹر ہوٹل میں؟" گلوریا نے آنکھیں سکیڑیں۔ "تم نے شاید آج شام کا اخبار نہیں دیکھا۔ ریاست کا گورنر آج اس ہوٹل میں مدعو ہے۔ کوئی وہاں گھسنے بھی نہیں دے گا۔"

"کسی جگہ گورنر کی آمد کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ عوام کے لیے اس طرف کے راستے بند کر دیے جائیں۔ تم تیار ہو جاؤ۔ ہم ٹھیک نو بجے یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔"

"اور وہ میکسی؟" گلوریا نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"کل پرسوں یا کسی بھی دن وہاں چلے جائیں گے۔ نائٹ کلب میں پورے ایک ہفتے کا پروگرام ہے۔" ٹمک کہتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

ٹھیک نو بجے وہ اپارٹمنٹ سے نکل گئے۔ آسٹر ہوٹل تک پہنچنے میں پینتالیس منٹ لگ گئے۔ بینکوئیٹ ہال ریاست کے گورنر کی پارٹی کے لیے مخصوص تھا۔ وہاں صرف وہی لوگ جا سکتے تھے جن کے پاس دعوت نامے موجود تھے البتہ ہوٹل کے دوسرے حصے پبلک کے لیے کھلے ہوئے تھے۔ ٹمک گلوریا کو ساتھ لے کر تین نمبر ڈائننگ ہال میں پہنچ گیا۔ ایک ویٹر نے خالی میز تک ان کی رہنمائی کی اور ٹمک کی فرمائش پر اس نے مینو پیش کر دیا۔ ٹمک نے اپنی اور گلوریا کی پسند کے کھانوں کا آرڈر دے دیا اور دونوں باتیں کرنے لگے۔

کھانے کے دوران بھی ٹمک کی نظریں سرچ لائٹ کی طرح چاروں طرف گھومتی رہیں۔ وہ بار بار اس لڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا جو ان کے دائیں طرف کی تیسری میز پر بیٹھی کسی مشروب کی چسکیاں لے رہی تھی۔ کرسی پر بیٹھی ہونے کے باوجود وہ عام لوگوں سے کچھ نکلتی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھی۔ قد لمبا ہونے کے ساتھ چہرے کے نقوش بھی خاصے دلکش تھے۔ اگرچہ اس کا رخ ان لوگوں کی طرف ہی تھا لیکن اس نے ایک مرتبہ بھی ان کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ اس کی نظریں کسی اور کو توجہ کا مرکز بنائے ہوئے تھیں۔ ٹمک نے غیر محسوس انداز میں دوسری طرف دیکھا۔ ان کے بائیں طرف دوسری میز پر ایک بڑھا بیٹھا ہوا شراب کی چسکیاں لے رہا تھا۔ اول تو اس ہوٹل میں آنا ہی دولت مندی کی نشانی تھا لیکن بڈھے کے جسم پر نظر آنے والے لباس کی قیمت کسی طرح بھی تین ہزار

ڈالر سے کم نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے سامنے رکھی ہوئی شیواس ریگل کی بوتل سے اس کے ذوقِ مے نوشی کا اندازہ بھی لگایا جاسکتا تھا۔ نک گھوم کر ایک بار پھر اس لڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔

"خوبصورت لڑکیوں کو دیکھ کر تم اپنے حواس کیوں کھو بیٹھتے ہو؟" گلوریا نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس کے لہجے میں بھرپور طنز تھا۔

"خوبصورت ہے نا؟" نک نے ڈھٹائی کا مظاہرہ کیا۔

"کوئی بدتمیزی نہیں چلے گی۔ کھانا کھاؤ اور یہاں سے اٹھ جاؤ۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔" نک نے بے بسی سے کہا اور کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا لیکن کن انکھیوں سے وہ اب بھی کبھی اس لڑکی کو اور کبھی اس بوڑھے کو دیکھ لیتا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد لڑکی نے اپنی سیٹ چھوڑ دی۔ اس کے کچھ دیر بعد نک نے گھوم کر دیکھا۔ قیمتی لباس والا وہ بوڑھا بھی غائب تھا۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد نک ویلوٹ بھی کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔

"تم یہیں بیٹھ کر میرا انتظار کرو۔ میں زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس منٹ میں لوٹ آؤں گا۔ اگر تنہائی سے بوریت محسوس کرنے لگو تو ریکریشن ہال میں چلی جانا۔"

"تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آؤ گے۔ اب چلے اس حرافہ کے پیچھے۔" گلوریا نے تلخ لہجے میں کہا۔

"اس حرافہ کے پیچھے نہیں کسی اور حرافہ کو تلاش کرنے۔" نک معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ "تمہارا کیا خیال ہے آج شام وہ شخص مجھے پچیس ہزار ڈالر خیرات کے طور پر دے گیا تھا۔"

"یہ بات مجھے اسی وقت سمجھ لینا چاہیے تھی جب تم نے یہاں آنے کی تجویز پیش کی تھی۔" گلوریا کہتی ہوئی ایک جھٹکے سے اٹھ گئی۔ "میں جا رہی ہوں۔ یہاں بیٹھ کر اپنا خون نہیں جلا سکتی۔"

نک نے اس موقع پر خاموش رہنے میں عافیت سمجھی تھی ورنہ عین ممکن تھا کہ گلوریا بھڑک اٹھتی اور بھرے ہال میں اسے گریبان سے پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی باہر لے جاتی لیکن غنیمت یہی ہوا کہ وہ مزید کچھ کہے بغیر خود ہی باہر چلی گئی۔ نک ویٹر کو اشارہ کرتا ہوا دوبارہ کرسی پر ٹک گیا۔ چند منٹ بعد اس نے بل ادا کیا اور اٹھ کر ریکریشن ہال میں چلا گیا جہاں لوگ مختلف تفریحات میں مشغول تھے۔ نک متجسس نگاہوں سے چاروں طرف دیکھتا رہا لیکن نہ تو اسے وہ لڑکی نظر آئی اور نہ ہی قیمتی لباس والا وہ بوڑھا دکھائی دیا۔ ڈائننگ ہال میں اس لڑکی کو توجہ کا مرکز بنا کر محض گلوریا کو ستانا چاہتا تھا لیکن بوڑھے اور لڑکی میں اشارے بازی دیکھ کر اسے ان دونوں میں کچھ دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ جس معاشرے کا فرد تھا وہاں ایسی باتیں معیوب نہیں سمجھی جاتی تھیں لیکن ذہنی رو بہک گئی تھی۔ حالانکہ اس طرح ذہنی رو کا بہکنا اس کے لیے مہنگا ثابت ہوا تھا۔ گلوریا کی ناراضگی کا مطلب تھا کہ اسے کئی روز تک تنہا رہنا پڑے گا۔

تقریباً آدھا گھنٹہ ریکریشن ہال میں گزارنے اور لڑکی اور دولتمند بوڑھے پر لعنت بھیجنے کے بعد وہ استقبالیہ کاؤنٹر پر آگیا جہاں ڈیسک کے پیچھے بیٹھی ہوئی ایک نیگرو لڑکی نے سفید دانتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"یس سر! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟"

"مجھے کچھ دیر پہلے معلوم ہوا ہے کہ میری ایک دوست مس پرونیسی چند روز سے اس ہوٹل میں قیام پذیر ہے۔ کیا آپ اس کے کمرے کا نمبر بتا سکتی ہیں؟"

"آپ کا نام؟" نیگرو لڑکی نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"اس کی ضرورت نہیں۔ دراصل میں اپنی دوست کو سرپرائز دینا چاہتا ہوں۔" نک مسکرایا۔

لڑکی چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر سامنے رکھے ہوئے کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہو گئی۔ چند لمحے کمپیوٹر کے کی بورڈ پر انگلیاں چلاتی رہی پھر نک کی طرف رخ کر کے بولی۔

"روم نمبر سکس زیرو ٹو — ساتویں منزل لیکن مس پرونیسی اپنے کمرے میں موجود نہیں ہے۔ اس کی واپسی اب سے ٹھیک پینتالیس منٹ بعد ہوگی۔"

"تھینک یو! میں انتظار کر لوں گا۔" نک کہتا ہوا کاؤنٹر کے سامنے سے ہٹ گیا۔

کچھ دیر تک وہ مختلف لابیوں میں ٹہلتا رہا پھر گھڑی دیکھتا ہوا لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔ اس وقت گیارہ بج کر دس منٹ ہو رہے تھے۔ ٹھیک گیارہ بجے اس نے کاؤنٹر سے دریافت کیا تھا جس کا مطلب تھا کہ پرونیسی کی واپسی اب سے آدھے گھنٹے بعد ہوگی۔

ساتویں منزل پر پہنچ کر وہ کمروں کے نمبر دیکھتا ہوا راہداری میں چلنے لگا۔ کمرہ نمبر چھ سو دو بالکل آخری سرے پر واقع تھا۔ دروازے پر 'آؤٹ' کا کارڈ لگا ہوا تھا۔ وہ راہداری کے اختتام پر واقع بالکونی میں رک کر باہر کا منظر دیکھنے لگا۔ تاحدِ نگاہ جگمگاتی ہوئی رنگ برنگی روشنیاں تھیں۔ وہ سگریٹ لگا کر ہلکے ہلکے کش لینے لگا۔ یہاں اس کے کھڑے ہونے کا انداز ایسا ہی تھا جیسے اس ہوٹل میں قیام پذیر ہو اور کمرے سے نکل کر محض وقت گزاری کے لیے یہاں آن کھڑا ہوا ہو۔

تقریباً پانچ منٹ بعد اس نے سگریٹ کو ریت میں ٹھونستے ہوئے ڈسٹ بن میں پھینکا اور راہداری میں دیکھتا ہوا پرونیسی کے کمرے کے سامنے رک گیا۔ جیب سے مخصوص چابی نکالنے اور دروازہ کھولنے میں چند سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے دروازہ بند کر دیا۔ سامنے کی عمارت پر لگے ہوئے نیون سائن کی مدھم سی روشنی کھڑکی کے راستے کمرے میں پہنچ رہی تھی۔ اگر تاریکی ہوتی تو بھی

وہ لائٹ جلانے کا خطرہ ہرگز مول نہ لیتا۔ وہ چند لمحے دروازے کے قریب کھڑا رہا پھر دبے قدموں آگے بڑھا۔

دو کمروں کا سوٹ تھا۔ ایک نشست گاہ اور دوسرا بیڈ روم۔ وہ نشست گاہ سے ہوتا ہوا بیڈ روم میں چلا گیا۔ اس کمرے میں روشنی نسبتاً زیادہ تھی۔ وہ مختلف چیزوں کو دیکھتا ہوا ملبوسات کی الماری کے سامنے رک گیا۔ اس نے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے آہستگی سے گھما دیا۔ دروازہ مقفل نہیں تھا۔ وہ اندر ہینگروں پر ٹنگے ہوئے ملبوسات کا جائزہ لینے لگا۔ مختلف قسم کے لباس تھے۔ ایک دو شب خوابی کے جامے بھی تھے لیکن وہ میکسی کہیں بھی نظر نہیں آئی جس کے لیے فریک نے اسے پچیس ہزار ڈالر دیے تھے۔ وہ الماری بند کر کے باتھ روم میں گھس گیا۔ وہاں بھی کھونٹی پر دو تین کپڑے ٹنگے ہوئے تھے لیکن وہ میکسی نہیں تھی۔ وہ باتھ روم سے نکل کر دوبارہ خوابگاہ میں آگیا اور متجسس نگاہوں سے اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے ساتھ ہی وہ سوچ رہا تھا کہ میکسی جیسی چیز کہاں رکھی جاسکتی ہے لیکن پھر دفعتاً اس کے ذہن میں خیال آیا کہ فریک کے کہنے کے مطابق پروفیسی کئی روز سے ہوٹل میں مقیم تھی۔ ممکن ہے وہ میکسی لانڈری میں گئی ہو اور اس امکان کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کہ وہ میکسی پروفیسی نے پہن رکھی ہو۔

وہ کمرے کے وسط میں کھڑا سوچ ہی رہا تھا کہ بیرونی دروازہ کھلنے کی آواز سن کر اچھل پڑا۔ اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ اس نے متجسس نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا۔ چھپنے کی کوئی جگہ نہ پاکر وہ دروازے کی آڑ میں ہوگیا۔ نشست گاہ سے ہلکے قدموں کی آواز ابھر رہی تھی جو اسی طرف آرہی تھی۔ چند سیکنڈ بعد کوئی سایہ اندر داخل ہوا۔ وہ کوئی عورت تھی جو سیدھی وارڈروب کی طرف چلی گئی تھی۔ ٹک کے لیے یہ بہترین موقع تھا۔ وہ عورت ادھر اُدھر دیکھے بغیر جیسے ہی دو قدم آگے بڑھی ٹک نہایت پھرتی سے دروازے کی آڑ سے نکل کر نشست گاہ میں پہنچ گیا۔ وہ جلد از جلد بیرونی دروازے سے باہر نکل جانا چاہتا تھا کہ دفعتاً کسی سے ٹکرا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ہلکی سی چیخ سنائی دی اور ٹک ٹکرانے والے کو ساتھ لیتا ہوا قالین پر ڈھیر ہوگیا۔

ٹک ویلوٹ پر ایک لمحے کو بدحواسی سی طاری ہوگئی لیکن اس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پالیا اور سیدھا ہوتے ہوئے اپنے ساتھ گرنے والے پستہ قامت بڈھے کو بھی سہارا دے کر اٹھا لیا جس کے منہ سے مغلظات کا سیلاب بہہ رہا تھا۔

”ہم سعودی شیخ ہے... سنبھل کر کھڑے رہنا یہاں قیامت آنے والی ہے۔“

ٹک کہتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا لیکن اس کے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ اس سے ٹکرانے والا بڈھا وہی تھا جسے اس نے ڈائننگ ہال میں دیکھا تھا۔ ٹک کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ بیڈ روم میں جانے والی لڑکی بھی وہی ہوگی جو ڈائننگ روم میں گہری نظروں سے اس بڈھے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ مس پروفیسی وہی تھی لیکن اب یہ بات بھی واضح ہوگئی تھی کہ میکسی اس کے جسم پر نہیں تھی۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ وہ میکسی یا تو کہیں اور رکھی گئی تھی یا واقعی لانڈری میں گئی ہوئی تھی۔

باہر نکلتے ہوئے ٹک کو ایک نسوانی چیخ بھی سنائی دی تھی یقیناً بڈھے کی چیخ سن کر پروفیسی بھی چیختی ہوئی باہر نکل آئی ہوگی لیکن ٹک ویلوٹ نے وہاں رکنا خطرے سے خالی نہیں سمجھا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ راہداری اس وقت بھی سنسان تھی۔ وہ لفٹ کا رخ کرنے کے بجائے تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا راہداری میں دائیں طرف مڑ گیا۔ اسٹیل ہوٹل اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ نہایت عجلت میں زینے سے اتر رہا تھا۔ زینے کے اختتام پر ایک دروازہ ہوٹل کی لابی کی طرف کھلتا تھا اور دوسرا سڑک پر۔ اس نے سڑک والے دروازے ہی کا رخ کیا تھا کیونکہ اسے یقین تھا کہ پروفیسی ٹیلیفون پر ہوٹل کے دفتر کو اپنے کمرے میں کسی چور کی موجودگی کی اطلاع دے گی اور اس کے فوراً ہی بعد چور کی تلاش شروع ہوجائے گی۔ استقبالیہ ڈیسک پر بیٹھی ہوئی نیگرو لڑکی یا ہاؤس ڈیٹیکٹو کو یقیناً اس شخص کا حلیہ بھی بتائے گی جس نے کچھ دیر پہلے مس پروفیسی کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ ایسی صورت میں اگر وہ ہوٹل میں موجود رہتا تو اس کا دھر لیا جانا یقینی تھا۔

وہ ایک طویل چکر کاٹ کر ہوٹل کے سامنے والے رخ پر آگیا۔ گلوریا جب روٹھ کر ہوٹل سے نکلی تھی تو گاڑی کی چابی اس کے پاس تھی۔ لہٰذا اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ گاڑی وہی لے گئی ہوگی۔ اس کے لیے اب کوئی ٹیکسی حاصل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا لیکن جانے سے پہلے وہ یہاں کی صورتحال کا ایک بار اور جائزہ لے لینا چاہتا تھا۔ وہ سڑک کے کنارے کھڑے ہوکر ہوٹل کی طرف دیکھنے لگا۔ چند منٹ بعد ہی ایک گاڑی اس کے قریب آکر رکی۔ وہ چونک گیا۔ یہ اسی کی گاڑی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ اس کے ساتھ ہی ٹک ویلوٹ بھی اس طرح اچھل پڑا جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ ایک لمحے کو تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ اسٹیئرنگ پر گلوریا کے بجائے خوفناک شکل والا ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔ پچھلی نشست پر بھی اسی قبیل کے دو آدمی موجود تھے اور گلوریا ان کے درمیان سینڈوچ بنی بیٹھی تھی۔

ٹک ویلوٹ پاگلوں کی طرح گاڑی کے پیچھے دوڑا لیکن ٹریفک کے ہجوم کے باوجود گاڑی انتہائی تیز رفتاری سے بہت آگے نکل چکی تھی۔ ڈرائیور یقیناً بہت ماہر تھا۔ ٹک رک کر چند لمحے دور ہوتی ہوئی گاڑی کی طرف دیکھتا رہا پھر دیوانہ وار ایک خالی ٹیکسی کی طرف لپکا جو چند قدم آگے کھڑی تھی۔

*

تقریباً دو گھنٹے تک شہر کی سڑکیں ناپنے کے بعد ٹک ووبلوٹ کی ہدایت پر ڈرائیور نے ٹیکسی کا رُخ اس کے اپارٹمنٹ کی طرف جانے والی سڑک پر موڑ دیا۔ اس صورتحال نے ٹک کو بری طرح بدحواس کر دیا تھا۔ وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ گلوریا کو لے جانے والے کون لوگ ہو سکتے تھے؟ گلوریا کو جس طرح انھوں نے اپنے قابو میں کر رکھا تھا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ ان کے ارادے نیک نہیں تھے۔ لیکن سوال تو یہ تھا کہ وہ چاہتے کیا تھے؟ گلوریا اس سے تقریباً سوا گھنٹہ پہلے ہوٹل سے نکلی تھی۔ کیا انھوں نے گلوریا کو فوراً ہی گرفت میں لے لیا تھا یا گلوریا اپنی ناراضگی بھول کر دوبارہ وہاں آئی تھی اور ان کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔ ٹک جیسے جیسے سوچتا اس کا ذہن الجھتا چلا گیا۔

اپارٹمنٹ ہاؤس کے سامنے ٹیکسی رکتے ہی وہ چونک گیا۔ چند گز آگے اس کی اپنی گاڑی کھڑی تھی۔ وہ ٹیکسی سے اتر کر گاڑی کی طرف لپکا اور ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔

چابی اگنیشن میں موجود تھی لیکن اس کے ساتھ ہی ایک مڑا تڑا سا کاغذ بھی چابیوں والے چھلے میں پھنسا ہوا تھا۔ ٹک نے جلدی سے کاغذ نکال کر اسے سیدھا کیا۔ آڑھی ترچھی ہینڈ رائیٹنگ میں صرف ایک جملہ تحریر تھا۔

”مسٹر وبلوٹ! اپنے اپارٹمنٹ میں ہماری کال کا انتظار کرو۔“

ٹک نے کاغذ جیب میں ٹھونسا، ٹیکسی کا بل ادا کیا اور بلڈنگ کے گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے عمارت کے نگران سے اپنی گاڑی کے بارے میں دریافت کیا کہ اسے کون چھوڑ کر گیا تھا لیکن اس نے لاعلمی میں سر ہلا دیا۔ ٹک لفٹ کا رُخ کرنے کے بجائے زینے کی طرف بڑھ گیا۔ اوپر پہنچ کر اپنے فلیٹ کا دروازہ کھولنے کے بعد اس نے قدم اندر رکھا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے لپک کر ریسیور اٹھا لیا۔

”مسٹر وبلوٹ؟“ ریسیور کان سے لگاتے ہی ایک نسوانی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

”ہاں۔ تم کون ہو؟“ ٹک کے لہجے میں الجھن تھی۔

”یہ جاننا تمھارے لیے ضروری نہیں ہے لیکن وہ کاغذ شاید اب بھی تمھاری جیب میں ہوگا جو تمھیں اپنی گاڑی کی چابی والے چھلے سے ملا تھا۔“

”اوہ!“ ٹک چونک گیا۔ کاغذ کی تحریر پڑھنے کے بعد فون پر اسے کسی عورت کے بجائے مرد کی آواز کی توقع تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں ایک اور خیال بجلی کے کوندے کی طرح لپکا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھی اس بلڈنگ سے زیادہ دور نہیں تھی۔ اس نے ٹک کو گاڑی سے کاغذ نکال کر جیب میں رکھتے ہوئے بھی دیکھا تھا اور عین اسی وقت فون کیا تھا جب وہ اپنے فلیٹ میں داخل ہو رہا تھا۔ گویا اسے علم تھا کہ عمارت میں داخل ہونے کے کتنی دیر بعد وہ اپنے فلیٹ میں پہنچ جائے گا۔ وہ فون اٹھا کر کھڑکی کے قریب آ گیا اور سڑک کے دوسری طرف واقع دو کاٹیجوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم لوگ کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟“

”ہم تمھارے دشمن نہیں ہیں لیکن ....“

”میری دوست کو اغوا کرنے کا مقصد؟“ ٹک نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”ہم تمھاری دوست کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ وہ جیسی آئی ہے ویسی ہی لوٹائی جائے گی لیکن اس کے لیے تمھیں ہم سے تعاون کرنا ہوگا۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔

”کس قسم کا تعاون؟“

”ہم تم سے ایک کام لینا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے تمھاری مطلوبہ فیس بھی ادا کی جائے گی لیکن یہ بات ذہن میں رکھنا کہ انکار کی صورت میں نہ صرف تم اپنی دوست سے محروم ہو جاؤ گے بلکہ گزشتہ دو سال میں تمھارے کارناموں کی فہرست بھی معہ ثبوت کے پولیس کے حوالے کر دی جائے گی۔“

”گویا تم مجھے بلیک میل کرنا چاہتی ہو؟“ ٹک کے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔ اس کی نظریں مسلسل سامنے والی کاٹیجوں کے دروازوں پر بھٹک رہی تھیں۔

”بالکل نہیں۔“ ریسیور پر ایک ہلکے سے قہقہے کی آواز سنائی دی۔ ”اسے احتیاطی تدبیر سمجھ لو۔“

”اگر تمھیں کوئی کام لینا تھا تو براہ راست مجھ سے رابطہ قائم کر سکتی تھیں۔“

”بدقسمتی سے میں تمھارے سنہرے اصولوں سے بھی واقف ہوں۔ اگر یہ طریقہ اختیار کیے بغیر میں تم سے کام کے لیے کہتی تو تم یقیناً انکار کر دیتے۔“

”گویا تم کوئی ایسی چیز چوری کرانا چاہتی ہو جو بہت قیمتی ہے یا اس کی کوئی سیاسی یا تاریخی اہمیت ہے۔ تم جانتی ہو کہ میں ہمیشہ صرف ایسی چیزیں ......“

”سب جانتی ہوں۔“ دوسری طرف سے بات کاٹ دی گئی۔ ”لیکن وہ چیز نہ تو نوادرات میں شامل ہے نہ ہی اس کی کوئی سیاسی یا تاریخی اہمیت ہے۔“

”پھر میں انکار کیوں کر دیتا جبکہ تم میری مطلوبہ فیس بھی ادا کرنے کو تیار ہو؟“ ٹک نے الجھے ہوتے لہجے میں کہا۔

”دراصل بات یہ ہے کہ ایک اور شخص اس معاملے میں ہم سے چند گھنٹوں کی سبقت حاصل کر چکا ہے۔ میرا مطلب ہے رابرٹ نامی ایک شخص اس کام کے سلسلے میں پہلے ہی تم سے رابطہ قائم کر چکا ہے اور

میں جانتی ہوں کہ تم ایک ہی کام کے لیے کسی دوسری پارٹی کی پیشکش قبول نہیں کرو گے۔"

"اوہ۔" نک کے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔ "تم روزالی تو نہیں، ڈریک کی بیوی؟"

"نہ میں روزالی ہوں نہ ڈریک سے میرا کوئی تعلق ہے لیکن میں چاہتی ہوں کہ تم وہ پیکسی چرا کر میرے حوالے کر دو۔"

"کیا وہ پیکسی بہت قیمتی ہے۔" نک نے پوچھا۔

"نہیں۔ اس کی قیمت پچیس تیس ڈالر سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔"

"یہ تمہارے سوچنے کی بات نہیں۔ میں تمہارا جواب سننا چاہتی ہوں۔"

"اگر میں انکار کر دوں تو؟"

"تو پھر میں نے جو کچھ کہا ہے اسے محض دھمکی مت سمجھنا۔"

نک چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔ "میں نہ تو تمہارا نام جانتا ہوں اور نہ ہی تمہاری صورت سے واقف ہوں۔ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ.....؟"

"کام ہو جانے کی صورت میں تمہاری دوست کو کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔ اس کے لیے تمہیں صرف میری زبان پر اعتماد کرنا ہوگا۔ اس دوران وہ میری مہمان کی حیثیت سے رہے گی۔ البتہ دوسری صورت میں....."

"ٹھیک ہے۔" نک ویلوٹ کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ "میں تیار ہوں۔"

"گڈ۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔ "مجھے یقین تھا کہ تم انکار نہیں کرو گے۔ میری نیت کے صاف ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ تمہاری گاڑی کے ڈیش بورڈ کے خانے میں پچیس ہزار کی رقم موجود ہے۔ تمہاری فیس، جو تم ہمیشہ ایڈوانس لیتے ہو۔"

دوسری طرف سے لائن بے جان ہو چکی تھی۔ نک ویلوٹ کھڑکی پر قدرے باہر کو جھک گیا اور اس کی نظریں سامنے والی دکانوں کے دروازوں پر بھٹکنے لگیں۔ اس کا خیال تھا کہ ممکن ہے وہ عورت سامنے کی کسی دکان ہی سے فون کر رہی ہو اور شاید وہ اس کی نظروں میں آ جاتے لیکن ایسا سوچنا اس کی حماقت تھی۔ ظاہر ہے اگر وہ اپنے آپ کو اس سے پوشیدہ رکھنا چاہتی تھی تو ایسی غلطی نہیں کر سکتی تھی۔

وہ تقریباً دس منٹ تک کھڑکی میں بیٹھا رہا لیکن کوئی ایسی عورت نظر نہیں آئی جس پر شبہ کیا جا سکتا۔ وہ کھڑکی سے ہٹ گیا اور فون کو گھورتا ہوا فلیٹ سے باہر نکل گیا۔

فون پر بات کرنے والی اس گمنام عورت نے غلط نہیں کہا تھا۔ پچیس ہزار ڈالر کے نوٹوں کی گڈی گاڑی کے گلوکمپارٹمنٹ میں موجود تھی۔ اس نے گڈی اٹھا کر جیب میں ڈالی اور اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کر دیا۔

گاڑی مختلف سڑکوں پر گھومتی ہوئی لانگ آئی لینڈ کی طرف نکل آئی۔ نک کے سامنے اس وقت کوئی منزل نہیں تھی۔ وہ گلوریا کے بارے میں سوچ رہا تھا جو اس وقت خطرناک قسم کے لوگوں کے قبضے میں تھی اور ان خطرناک لوگوں کو وہ پیکسی درکار تھی جس کو چوری کرانے کے لیے ایک اور شخص بھی پچیس ہزار ڈالر دے چکا تھا۔ اس کا ذہن الجھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس پیکسی میں آخر ایسی کیا بات تھی جس میں دو مختلف پارٹیاں دلچسپی لے رہی تھیں؟

ایک سگنل پر پہنچ کر اس نے گاڑی کو دائیں طرف گھما دیا۔ اب وہ لانگ آئی لینڈ کے بجائے چائنا ٹاؤن کی طرف جا رہا تھا۔ ٹیلی فون والی گمنام عورت کے بارے میں کچھ معلوم کرنا ممکن نہیں تھا لیکن ڈریک کے بارے میں وہ ایسی کوشش کر سکتا تھا۔ ڈریک نے رینڈ کا حوالہ دیا تھا جس کی ایک موقع پر وہ مدد کر چکا تھا۔ رینڈ سے ڈریک کے بارے میں معلوم ہو سکتا تھا۔

جب وہ چائنا ٹاؤن پہنچا تو رات کے دو بج رہے تھے۔ رینڈ کا مکان تلاش کرنے میں اسے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ دراصل ایک چھوٹے سے بار کا مالک تھا اور اس کی رہائش بھی بار کے اوپر ہی تھی۔ اس طرح جگائے جانے پر وہ بُرا سا منہ بناتا ہوا نیچے آیا تھا لیکن نک ویلوٹ کو دیکھتے ہی اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔

"ہیلو مسٹر ویلوٹ! خیریت؟ اوپر آ جاؤ۔ ہم اطمینان سے بات کریں گے۔" وہ دانت نکالتے ہوئے بولا۔

"میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ میں تم سے ڈریک نامی ایک شخص کے بارے میں پوچھنے آیا ہوں جسے تم نے میرا پتا دیا تھا۔" نک نے کہا۔

"ڈریک! اسے میں نے تمہارے پاس بھیجا تھا؟" رینڈ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔ اس نے تمہارا حوالہ دیا تھا۔"

"تمہیں شاید کوئی غلط فہمی ہوئی ہے مسٹر ویلوٹ! میں نہ تو کسی ڈریک کو جانتا ہوں اور نہ ہی میں نے کسی کو تمہارے پاس بھیجا تھا۔"

"کیا واقعی؟"

"ہاں۔ میں نے تو کبھی کسی سے تمہارا ذکر بھی نہیں کیا۔" رینڈ نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔" نک ویلوٹ کہتا ہوا گاڑی میں بیٹھ گیا۔

بوری کی طرف جاتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ ڈریک کون تھا؟ اس کی کہانی میں کوئی حقیقت بھی تھی یا وہ محض جھوٹ بول کر اپنا کام کرانا چاہتا تھا۔ رینڈ کے بیان سے تو کم از کم یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اس نے روزالی اور پروفیسی کے بارے میں ایک فرضی کہانی سنائی تھی۔ جس میں صرف اس حد تک صداقت تھی کہ مس پروفیسی کی

شخصیت فرضی نہیں تھی اور اس کے قبضے میں وہ میکسی ہے جو کسی وجہ سے اہمیت اختیار کر گئی تھی۔ اسے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ ڈریک اور فون کرنے والی گمنام عورت کے درمیان کوئی نہ کوئی تعلق ضرور تھا اور یہ تعلق کیا تھا یا وہ دونوں میکسی کیوں حاصل کرنا چاہتے تھے؟ اس بات کا فیصلہ تو میکسی کو دیکھنے کے بعد ہی ہوسکتا تھا لیکن نک ویلوٹ کے لیے اس وقت کی صورتحال خاصی تکلیف دہ تھی۔ گلوریا نامعلوم لوگوں کے قبضے میں تھی اور جب تک میکسی ان لوگوں کو نہیں مل جاتی گلوریا کی زندگی کے بارے میں کوئی بات یقینی طور پر نہیں کہی جاسکتی تھی۔

بوریری سے ہوتا ہوا جب وہ واپس گھر پہنچا تو صبح کے چار بج چکے تھے۔ وہ لباس تبدیل کیے بغیر کرسی پر ڈھیر ہوگیا اور سگریٹ سلگا کر لمبے لمبے کش لینے لگا۔ وہ سگریٹ نوشی کا عادی نہیں تھا لیکن جب کوئی ذہنی الجھن ہوتی تو سگریٹ پر سگریٹ سلگاتے چلا جاتا۔ اس وقت وہ ایسی ہی کیفیت میں مبتلا تھا۔

صبح سات بجے تک اس کے سامنے رکھا ہوا ایش ٹرے سگریٹ کے ٹکڑوں سے لبالب بھر چکا تھا۔ اس کے منہ کا ذائقہ بھی بری طرح بگڑ چکا تھا۔ اس نے اٹھ کر ٹھنڈے پانی سے غسل کیا جس سے کسلمندی کسی حد تک دور ہوگئی۔ پھر ناشتہ تیار کرنے ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ گیا۔ کافی کے گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے بھی وہ میکسی ہی کے بارے میں سوچتا رہا پھر دفعتاً اس کے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ اگر ڈریک نے اسے جھوٹی کہانی سنائی تھی تو اس کا مطلب تھا کہ پرڈفیسی بھی وہ نہیں تھی جو اسے ظاہر کیا گیا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ سب سے پہلے وہ پرڈفیسی کے بارے میں معلومات حاصل کرے گا۔ یہ طے کرنے کے بعد وہ ٹھیک نو بجے اپارٹمنٹ سے نکل گیا۔ چند منٹ بعد اس کی گاڑی آسٹر ہوٹل کی طرف دوڑ رہی تھی۔

*

نک ویلوٹ آسٹر ہوٹل کے ملازم کی وردی میں ملبوس وہ ٹرالی دھکیلتا ہوا مختلف راہداریوں میں گھوم رہا تھا جس پر ہوٹل میں قیام پذیر مہمانوں کے دھلے ہوئے کپڑے لدے ہوئے تھے۔ کپڑوں کے ساتھ ٹیبلوں پر مہمانوں کے ناموں کے بجائے کمروں کے نمبر لکھے ہوتے تھے۔ وہ مختلف دروازوں کے سامنے رک کر دستک دیتا۔ دروازہ کھلنے پر کپڑوں کا بنڈل، دروازہ کھولنے والے کے ہاتھ میں تھما دیتا اور آگے چل پڑتا۔

پرڈفیسی کے کمرے کی تلاشی کے بعد نک ویلوٹ کو شبہ تھا کہ میکسی دوسرے کپڑوں کے ساتھ دھلنے کے لیے لانڈری گئی ہوگی۔ آج صبح ہی اس نے ہوٹل کے ملازمین کی فہرست حاصل کرکے ان میں سے ایک ایسے آدمی کا انتخاب کیا تھا جو اس کے کام آسکتا تھا۔ ایڈگر نامی اس شخص کو رام کرنے میں نک کو کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ پچاس ڈالر کا نوٹ جیب میں آتے ہی ایڈگر نے اپنے سپروائزر کو فون کردیا تھا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ وہ کام پر نہیں آسکے گا البتہ وہ اپنے کزن کو بھیج رہا ہے جو آج کے دن اس کی جگہ کام کرے گا۔ سپروائزر کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ دوپہر کے کھانے کے وقفے سے کچھ پہلے نک ویلوٹ ایڈگر کی وردی پہن کر ہوٹل پہنچ گیا تھا جہاں سپروائزر نے اسے لانڈری سیکشن میں بھیج دیا کیونکہ ایڈگر اسی شعبے میں خدمات انجام دے رہا تھا۔ نک ویلوٹ کا بایاں جبڑا اور ناک پھولی ہوئی تھی۔ دائیں رخسار پر بھی ورم صاف نظر آرہا تھا۔ اس کا یہ حلیہ مخصوص باسپر نگ اور پیڈ کا مرہون منت تھا۔ ایڈگر کے سامنے بھی وہ اسی حلیے میں آیا تھا۔

لانڈری کے انچارج نے اسے آتے ہی مہمانوں کے دھلے ہوئے کپڑے ان کے کمروں تک پہنچانے کی ڈیوٹی پر لگادیا تھا۔ اور اس وقت وہ یہی فریضہ انجام دے رہا تھا۔ وہ تین چکر لگا چکا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اسے کمرہ نمبر چھ سو دو کے کپڑے بھی دیے جائیں گے لیکن ابھی تک ایسا نہیں ہوا تھا۔

اس وقت سہ پہر کے پانچ بج رہے تھے۔ وہ خالی ٹرالی لانڈری کے ایک مخصوص حصے میں کھڑی کرکے اس ہال نما کمرے میں چلا گیا جس کی چاروں دیواروں کے ساتھ ریک بنے ہوتے تھے۔ ہر ریک پر نمبر درج تھے۔ یہ کمروں کے نمبر تھے۔ متعلقہ کمروں کے مہمانوں کے کپڑے اسی نمبر والی ریک میں رکھے جاتے تھے۔ نک ویلوٹ کی نظریں پھسلتی ہوئی اس ریک پر جم گئیں جس پر چھ سو دو کے ہندسے لکھے ہوتے تھے لیکن وہ ریک خالی تھا۔ شام ہونے تک اس نے وہ رجسٹر بھی چیک کرلیا جس میں لانڈری میں آنے اور جانے والے کپڑوں کا اندراج ہوتا تھا لیکن گزشتہ دس دن کی تاریخوں میں کمرہ نمبر چھ سو دو یا پرڈفیسی کے نام کسی قسم کا اندراج نہیں تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ جب سے یہاں آئی تھی اس نے ایک مرتبہ بھی ہوٹل کی لانڈری میں کپڑے دھلنے کو نہیں دیے تھے۔ نک نے یہاں رک کر مزید وقت ضائع کرنے کے بجائے چھٹی کرلینے ہی میں عافیت سمجھی۔ چنانچہ آٹھ بجے کے لگ بھگ وہ سپروائزر کو اطلاع دیے بغیر رخصت ہوگیا۔

اس رات گیارہ بجے کے قریب وہ ایک بار پھر ایک عام گاہک کی طرح آسٹر ہوٹل میں داخل ہوا۔ وہ ڈائننگ ہال اور ریکریشن سے ہوتا ہوا بار روم میں پہنچا تو اسے چونک جانا پڑا۔ مس پرڈفیسی وہاں موجود تھی۔ اس مرتبہ اس کے ساتھ کوئی اور بوڑھا نظر آرہا تھا۔ نک کو سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ پرڈفیسی اتنی دولت مند ہرگز نہیں تھی کہ اتنے بڑے ہوٹل میں رہائش کے اخراجات کی متحمل ہوسکے۔ یہ اخراجات اسی طرح پورے ہوتے تھے۔ اس معاملے میں واقعی نک کو اس کی ذہانت کی داد دینا

پڑی۔ وہ ایسے دولت مند بوڑھوں کا انتخاب کرتی تھی جن سے اسے کسی قسم کا خطرہ لاحق نہیں ہو سکتا تھا۔

نک ویلوٹ نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک بار پھر اس کے کمرے کی تلاشی لینا چاہی لیکن اسے گزشتہ رات کا واقع یاد آگیا۔ آج یقیناً ہوٹل کی انتظامیہ محتاط ہوگی۔ وہ کسی قسم کا خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھا۔ وہ کچھ دیر تک بیٹھا رہا۔ اس دوران وہ مسلسل پردیسی کی حرکات کا جائزہ لے رہا تھا پھر وہ بار روم سے باہر نکل گیا اور راہداری سے گزرنے والے ایک ویٹر کو روک کر بولا۔

"کیا تم بتا سکتے ہو کہ اسیٹورڈ ٹیلر سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے؟"

"وہ بارہ بجے ڈیوٹی پر آئے گا۔ اگر آپ چاہیں تو اسے گھر پر مل سکتے ہیں۔" ویٹر نے جواب دیا۔ "وہ عقبی گلی ہی کی ایک بلڈنگ میں رہتا ہے۔"

"تم پتا بتاؤ۔ میں اسے وہیں مل لیتا ہوں۔" نک نے کہا۔

ویٹر نے پتا بتا دیا۔ نک ویلوٹ اس کا شکریہ ادا کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ عقبی گلی میں ٹیلر کا فلیٹ تلاش کرنے میں اسے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد جب وہ اس فلیٹ سے نکلا تو اس کے جسم پر ٹیلر کی وردی نظر آرہی تھی جس پر آسٹر ہوٹل کا مخصوص مونوگرام بنا ہوا تھا۔ اس کے باہر نکلنے سے پہلے ٹیلر اپنے سپروائزر کو فون پر اطلاع دے چکا تھا کہ اچانک طبیعت خراب ہو جانے کی وجہ سے وہ ڈیوٹی پر نہیں آسکتا البتہ اپنی جگہ اپنے ایک عزیز کو بھیج رہا ہے تاکہ کام کے معاملے میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے۔

نک ویلوٹ جب ہوٹل میں داخل ہوا تو ایک نئے حلیے میں تھا۔ ریڈی میڈ میک اپ کے ذریعے چہرے میں معمولی سی تبدیلی کے ساتھ ہی اس نے سر پر وگ بھی لگالی تھی۔ اس نے ہوٹل کے ملازمین کی فہرست میں سے اس مرتبہ ٹیلر کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ ٹیلر اسیٹورڈ تھا اور اس کی ڈیوٹی ساتویں منزل پر تھی۔ ہوٹل کے ہر اسیٹورڈ کے پاس ہر وقت ایک ماسٹر کی موجود رہتی تھی تاکہ ہنگامی صورتحال میں کسی کمرے کا تالا کھولا جا سکے اور اس وقت یہ چابی نک ویلوٹ کی جیب میں موجود تھی۔ اس نے ڈیوٹی روم میں پہنچ کر سپروائزر کو صورت حال سے آگاہ کیا اور طالبات پاکوٹ سے لفٹ کے ذریعے ساتویں منزل پر پہنچ گیا۔

رات بارہ بجے کے بعد ہر منزل پر صرف چار ویٹروں کی ڈیوٹی رہتی تھی جو ہر منزل پر ہولکر رہے تھے۔ اس طرح ہر ویٹر کے حصے میں چار کمرے آتے تھے۔ ہر راہداری کے سرے پر ایک چھوٹا سا کمرہ بھی موجود تھا جہاں اسیٹورڈ بیٹھا کرتا تھا۔ اس کی میز کے سامنے ایک بورڈ پر کمروں کے نمبر درج تھے۔ ہر نمبر کے ساتھ ایک چھوٹا سا بلب بھی نظر آرہا تھا۔ ویٹر کو بلانے کے لیے جس کمرے سے گھنٹی کا بٹن دبایا جاتا بورڈ پر اس نمبر کا بلب روشن ہو جاتا۔ میز پر ایک ٹیلی فون سیٹ بھی موجود تھا جس سے متعلقہ اسیٹورڈ ہوٹل کے کچن، دفتر یا دوسرے حصوں سے رابطہ قائم کر سکتا تھا۔

نک ویلوٹ نے بارہ بجے تک کی ڈیوٹی پر موجود ویٹر سے چارج لے کر اسے رخصت کر دیا اور وہ کارڈ دیکھنے لگا جس پر مختلف کمروں میں مقیم مہمانوں کے آرڈر درج کیے جاتے تھے۔ ایک مہمان کو اب سے پندرہ منٹ بعد وسکی کی بوتل پہنچانا تھی اور ایک دوسرے مہمان کو صبح چھ بجے کی فلائٹ سے کیلی فورنیا جانا تھا۔ وقت مقررہ پر جگانا تھا۔ اس کے علاوہ کارڈ پر کوئی ہدایت درج نہیں تھی۔

نک ویلوٹ کچھ دیر بعد کمرے سے نکل آیا اور اپنے حصے کی راہداریوں کے چکر لگانے لگا۔ کمرہ نمبر چھ سو دو کا دروازہ بند تھا جس پر آرٹ کی سلپ لگی ہوئی تھی۔ نک نے جیب سے ماسٹر کی نکالی اور دروازہ کھول کر بڑے اطمینان سے اندر داخل ہو گیا۔ اندر داخل ہوتے ہی وہ بڑی پھرتی سے تلاشی لینے لگا لیکن اس مرتبہ بھی اسے ناکامی ہی کا منہ دیکھنا پڑا۔ وہ میکسی کہیں بھی دکھائی نہیں دی تھی جس کے لیے اسے یہ سب پاپڑ بیلنے پڑ رہے تھے۔ دفعتاً اسے فائر اسکیپ کا خیال آگیا۔ اگر اس پردیسی اس میکسی کی اہمیت سے آگاہ تھی تو اس نے یقیناً کسی ایسی جگہ چھپایا ہوگا۔ جہاں عام آدمی کا ذہن نہ پہنچ سکتا ہو اور اس مقصد کے لیے فائر اسکیپ سے بہتر اور کوئی جگہ نہیں ہو سکتی تھی۔

فائر اسکیپ کا راستہ ڈرائنگ روم سے تھا۔ وہ بیڈ روم سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آگیا اور ایک دیوار پر آویزاں پردہ ہٹا کر کھڑکی کھولنے لگا۔ جو ہوٹل میں آتش زدگی یا کسی اور ایمرجنسی کی صورت میں اس راستے کی طرف کھلتی تھی۔ جہاں سے بحفاظت باہر نکلا جا سکتا تھا۔ وہ کھڑکی کی چوکھٹ پر ہاتھ رکھ کر دوسری طرف کود گیا۔ ایک زینہ تھا جو بل کھاتا ہوا اوپر سے نیچے تک چلا گیا تھا۔ اس نے پہلے اوپر کا رخ کیا۔ زینے پر دسویں منزل تک اسے کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ وہ نیچے اترنے لگا۔ چند منٹ بعد وہ تہ خانے کے اس وسیع و عریض کمرے میں پہنچ چکا تھا۔ جہاں سے باہر نکلنے کے کئی راستے تھے۔ یہ غنیمت تھا کہ تہ خانے اور فائر اسکیپ میں ۲۴ گھنٹے بتی جلتی رہتی تھی۔ ورنہ اسے جگہ جگہ سوچ تلاش کرنے پڑتے۔ اوپر سے نیچے تک ناکامی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ اسی راستے ساتویں منزل پر پہنچ گیا لیکن جیسے ہی وہ کمرہ نمبر چھ سو دو کی کھڑکی کے سامنے پہنچا اسے چونک جانا پڑا۔ کھڑکی بند تھی۔

وہ چند لمحے وہیں کھڑا سوچتا رہا۔ پہلے تو اس کے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ ابھی گزشتہ رات ہی پروفیسی کے کمرے میں ایک واردات ہو چکی تھی۔ اب پھر وہ ہوٹل کی انتظامیہ کو رپورٹ کر دے گی اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ فون پہ اپنے کمرے میں ــــ کسی کی مداخلت کی اطلاع دے چکی ہو۔ فوراً ہی کسی فیصلے پر پہنچ کر اس نے کھڑکی کے شیشے کو ہولے سے کھٹکھٹایا۔ فوراً ہی پردہ ہٹ گیا اور کمرے کی تیز روشنی میں پروفیسی کا چہرہ دکھائی دیا۔ اس کے پیچھے قیمتی سوٹ میں کوئی آدمی بھی موجود تھا جس کا تعلق یقیناً ہوٹل سے نہیں تھا۔

اگر نک ویلوٹ کے جسم پر ہوٹل کی وردی نہ ہوتی تو پروفیسی یقیناً شور مچا دیتی لیکن چند لمحوں کی ہچکچاہٹ کے بعد اس نے کھڑکی کھول دی۔

"کون ہو تم؟" وہ اسے گھورتے ہوئے بولی۔

"یہ آپ کو میری یونیفارم سے سمجھ لینا چاہیے میڈم کہ میرا تعلق ہوٹل ہی سے ہے۔" نک نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔

"لیکن......"

"میں اس زحمت کے لیے معذرت چاہتا ہوں میڈم! نک چو کھٹ پر چڑھ کر کمرے میں آگیا۔ "معمول کے مطابق فائر اسکیپ کو چیک کیا جا رہا تھا تاکہ کسی ایمرجنسی کی صورت میں معزز مہمانوں کو کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔"

"اوہ، میں تو ڈر گئی تھی اور ابھی منیجر کو فون کرنے ہی والی تھی۔" پروفیسی نے اطمینان کا سانس لیا۔

"ایسی کوئی بات نہیں میڈم!" نک نے کہتے ہوئے کن انکھیوں سے مرد کی طرف دیکھا پھر پروفیسی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ "اگر پسند فرمائیں تو مہمان کے لیے کچھ پیش کروں؟"

"ہاں ــ اسکاچ لے آؤ۔" پروفیسی نے جواب دیا۔

نک ویلوٹ نے فائر اسکیپ کی کھڑکی بند کر دی اور پردہ درست کر کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ باہر نکلتے ہی اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اگر اسے واپسی میں ایک منٹ کی بھی تاخیر ہو جاتی تو پروفیسی منیجر کو اطلاع کر چکی ہوتی اور اس طرح اس کی پول کھل جاتی۔ ڈیوٹی روم میں پہنچتے ہی اسے یاد آگیا کہ کمرہ نمبر چھ سو سترہ کے مہمان کو وِسکی کی بوتل پہنچانا تھی اور اب پروفیسی کا آرڈر بھی شامل ہو گیا تھا۔ پروفیسی کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کا تعلق درمیانے طبقے سے تھا اور ہوٹل کے اخراجات کے لیے وہ اپنے حسن کی دولت استعمال کر رہی تھی۔ تقریباً دس منٹ بعد دونوں کمروں میں شراب کی بوتلیں پہنچانے کے بعد وہ اپنے ڈیوٹی روم میں بیٹھ کر صورتِ حال کے بارے میں سوچنے لگا۔ اسے ہر قیمت پر یہ میکس حاصل کرنا تھی، جس کا نئی الحال کوئی اتا پتا معلوم نہیں تھا۔ بصورتِ دیگر گلوریا کی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی تھی۔

صبح آٹھ بجے دن کی ڈیوٹی والا اسٹیورڈ آگیا۔ نک کو دیکھ کر ایک لمحہ کو اس کے چہرے پر حیرت کے آثار ابھر آئے تھے۔ لیکن جب نک نے ٹیلر کے اچانک بیمار ہو جانے کے بارے میں بتایا تو وہ مطمئن ہو گیا۔ ہوٹل سے نکل کر نک سیدھا ٹیلر کے مکان پر پہنچا اور لباس تبدیل کر کے اس کا شکریہ ادا کرتا ہوا باہر نکل آیا۔ رات بھر جاگنے سے اگرچہ اس کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں لیکن وہ گھر کا رُخ کرنے کے بجائے ہوٹل کے مین گیٹ کے لان میں ایک ایسی جگہ بیٹھ گیا جہاں سے ہوٹل میں آنے جانے والے ہر شخص پر نگاہ رکھی جا سکتی تھی۔

دس بجے کے قریب وہ آدمی باہر نکلا جسے گزشتہ رات اس نے پروفیسی کے کمرے میں دیکھا تھا۔ پروفیسی کے باہر آنے تک اسے مزید ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کرنا پڑا۔ وہ جیسے ہی کرائے کی ایک گاڑی میں بیٹھی نک بھی اپنی گاڑی پر پہنچ گیا۔ جو ہوٹل کے پارکنگ پلاٹ پر موجود تھی۔ پروفیسی کی گاڑی باہر نکلتے ہی اس نے اپنی گاڑی کا انجن اسٹارٹ کیا اور اس طرح تعاقب شروع ہو گیا۔

سہ پہر پانچ بجے تک پروفیسی مختلف جگہوں پر گھومتی رہی۔ دوپہر کا کھانا اس نے ٹیکسی میں کھایا تھا۔ اس طرح نک کو بھی پیٹ بھرنے کا موقع مل گیا۔ پانچ بجے پروفیسی کی گاڑی ایک ایسی عمارت کے سامنے رکی جہاں لاکرز کرائے پر ملتے تھے۔ دروازے پر ایک مسلح محافظ موجود تھا۔ صرف وہی لوگ ایک مخصوص کارڈ دکھا کر اندر جا سکتے تھے۔ جنہوں نے کوئی لاکر کرائے پر لے رکھا تھا۔ نک اپنی گاڑی میں بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ پروفیسی کی واپسی تقریباً بیس منٹ بعد ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا پیکٹ دیکھ کر نک چونکے بغیر نہیں رہا تھا۔

پروفیسی نے پیکٹ اپنی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ڈال دیا اور انجن اسٹارٹ کر کے گاڑی کو آگے بڑھا دیا۔ نک ویلوٹ نے بھی اپنی گاڑی اس کے تعاقب میں ڈال دی۔ پروفیسی تقریباً ایک گھنٹے تک مختلف سڑکوں پر گھومتی ہوئی ایک ڈرگ اسٹور کے سامنے رک گئی۔ نک نے بھی چند گز کے فاصلے پر گاڑی روک لی۔ پروفیسی نے گاڑی کے دروازے مقفل کیے اور ڈرگ اسٹور میں ایک پبلک ٹیلی فون بوتھ میں داخل ہو گئی۔ فون پر کسی سے باتیں کرتے ہوئے بھی اس کی نظریں اپنی گاڑی کی طرف لگی رہی تھیں۔

تقریباً پانچ منٹ بعد وہ باہر نکلی اور ایک مرتبہ پھر اس کی گاڑی مختلف سڑکوں کے چکر لگانے لگی۔ اس مرتبہ گاڑی سنٹرل پارک کی ایک سڑک پر رکی تھی۔

گاڑی سے نکلتے ہوئے پروفیسی نے پچھلی سیٹ سے وہ پیکٹ بھی اٹھالیا تھا۔ نک ویلوٹ نے بھی گاڑی چھوڑ دی اور پروفیسی کے پیچھے چلتا ہوا پارک میں داخل ہوگیا۔ پروفیسی فوارے کے سامنے ایک بینچ پر بیٹھ گئی جہاں کچھ اور لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ نک بھی فوارے کے دوسری طرف ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ چاروں طرف لوگوں کی چہل پہل تھی۔ بچے اچھلتے کودتے ایک دوسرے کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ نک کی نظریں پروفیسی پر جمی ہوئی تھیں جو پیکٹ گود میں رکھے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر صاف طور پر کہا جاسکتا تھا کہ وہ یہاں محض تفریح کے لیے نہیں آئی تھی بلکہ اس کی آمد کا مقصد کچھ اور ہی تھا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد پروفیسی اٹھ کر پارک کے اس حصے کی طرف چل پڑی جہاں لوگ نسبتاً کم تعداد میں تھے۔ نک اپنی جگہ پر بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ پروفیسی روش عبور کرکے جیسے ہی دوسرے لان میں داخل ہوئی ایک شخص پودوں کی آڑ سے نکل کر تیزی سے اس پر جھپٹا۔ اس نے پروفیسی کے ہاتھ سے پیکٹ چھینا اور تیزی سے ایک طرف دوڑ لگادی۔ پروفیسی ہکا بکا سی اپنی جگہ پر کھڑی رہ گئی۔ اس نے نہ تو پیکٹ بچانے کی کوشش کی تھی اور نہ ہی شور مچایا تھا۔ اس کے برعکس کچھ اور لوگوں نے شور مچادیا تھا۔ ایک آدمی تو رہزن کے پیچھے بھی دوڑا تھا۔ یہ صورت حال دیکھ کر نک بھی اپنی جگہ سے اچھلا اور رہزن کے پیچھے دوڑ لگادی جو اس دوران بیرونی جنگلے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ وہ جنگلے پر چڑھنے کی کوشش کررہا تھا کہ نک نے اسے جھانپ لیا۔ اتنی دیر میں دوسرا آدمی بھی پہنچ گیا۔ رہزن نے بچاؤ کا کوئی راستہ نہ دیکھ کر پیکٹ ہاتھ سے چھوڑ دیا اور نک کو دھکا دیتا ہوا ایک طرف کو بھاگ نکلا۔ دوسرا آدمی اس کے پیچھے بھاگا اور نک پیکٹ لیے وہیں کھڑا رہ گیا۔

چھینا جھپٹی میں پیکٹ کا کاغذ ایک طرف سے پھٹ چکا تھا۔ پیکٹ ہاتھ میں آتے ہی نک نے محسوس کرلیا تھا کہ اس میں کوئی کپڑا تھا۔ اس نے پھٹا ہوا کاغذ ذرا سا ہٹا کر دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ پیکٹ میں موجود کپڑے کے ظاہری حصے پر مختلف رنگوں کے دھاگوں کی کڑھائی نظر آرہی تھی۔ اسے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ وہی میکسی تھی جس کی اسے تلاش تھی۔ ایک لمحہ کو اس کا دل چاہا کہ پیکٹ لے کر بھاگ نکلے لیکن اس دوران تین چار آدمی وہاں پہنچ گئے۔ ان کے پیچھے ہی پروفیسی بھی تھی۔ وہ آدمی بھی واپس آگیا جو رہزن کے پیچھے بھاگا تھا۔ وہ رہزن کو پکڑنے میں کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔ رہزن کو برا بھلا کہنے کے ساتھ لوگ پروفیسی کو محتاط رہنے کا مشورہ بھی دے رہے تھے۔

نک ویلوٹ نے پیکٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کی نظریں پروفیسی کے چہرے کی طرف اٹھ گئیں۔ اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات تھے اور آنکھوں میں عجیب سی الجھن تھی۔ نک ویلوٹ اس کی اس کیفیت سے کوئی نتیجہ اخذ نہ کرسکا لیکن پروفیسی جیسے ہی پارک سے باہر نکلی اس نے چند قدم کے فاصلے سے ایک بار پھر تعاقب شروع کردیا۔

❋

رات کے تین بج رہے تھے۔

نک ویلوٹ نے دس منزلہ آسٹر ہوٹل کی چھت کی منڈیر سے جھانک کر نیچے دیکھا۔ سڑک پر اکا دکا گاڑیاں کھلونوں کی طرح نظر آرہی تھیں۔ سامنے والی آٹھ منزلہ عمارت کی تمام اندرونی بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ پہلی اور دوسری منزل پر دکانوں کے دو تین چھوٹے چھوٹے نیون سائن روشن تھے لیکن ان کی روشنی نک کے کام میں حائل نہیں ہوسکتی تھی۔ وہ منڈیر پر جھکا گہری نظروں سے نیچے دیکھتا رہا۔

شام کو پارک سے نکلنے کے بعد بھی نک نے پروفیسی کا تعاقب جاری رکھا تھا۔ وہ پارک سے نکل کر سیدھی اس عمارت تک گئی تھی جس کے ایک لاکر سے اس نے پیکٹ نکالا تھا۔ عمارت کا مرکزی دروازہ اس وقت بند تھا۔ پروفیسی نے گیٹ پر متعین محافظ سے کچھ کہا جس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ نک نے اپنی گاڑی میں بیٹھے بیٹھے گھڑی دیکھی۔ سوا آٹھ بج رہے تھے۔ اسے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ اس سیف ڈپازٹ کمپنی کا دفتر بند ہوچکا تھا۔ پروفیسی پیکٹ سنبھالے دوبارہ اپنی گاڑی میں آگئی اور اس طرح ایک مرتبہ پھر تعاقب شروع ہوگیا جو بالآخر آسٹر ہوٹل پر ختم ہوا۔

پروفیسی اپنے کمرے میں بند ہوگئی تھی۔ رات کا کھانا بھی اس نے کمرے ہی میں منگوایا تھا۔ گویا وہ اس پیکٹ کو چھوڑ کر کہیں جانا نہیں چاہتی تھی۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ وہ پیکٹ میں موجود میکسی کی اہمیت سے آگاہ تھی۔ نک ویلوٹ ایک بار پھر اسٹورڈ ٹیلر کے فلیٹ پر پہنچ گیا۔ سو ڈالر کا نوٹ جیب میں آتے ہی ٹیلر ایک اور چھٹی کرنے پر آمادہ ہوگیا۔ اس طرح نک ٹھیک بارہ بجے ٹیلر کی وردی میں ملبوس آسٹر ہوٹل پہنچ گیا۔

رات دو بجے کے قریب اس نے ماسٹر کی سے کمرہ نمبر چھ سو دو کا تالا کھولنے کی کوشش کی تھی لیکن دروازہ اندر سے بولٹ تھا۔ نک تقریباً ایک گھنٹے تک سوچتا رہا کہ میکسی حاصل کرنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ اسے یقین تھا کہ صبح ہوتے ہی مس پروفیسی اس میکسی کو دوبارہ لاکر میں پہنچا دے گی۔ نک کے پاس صرف رات بھر کی مہلت تھی اور اس موقع سے اسے ہر صورت میں فائدہ اٹھانا تھا۔ بالآخر اس نے ایک فیصلہ کر ہی لیا اور ڈیوٹی روم کی میز کی دراز میں سے ایک بیگ نکال کر اوپر جانے والے زینے کی طرف بڑھ گیا۔ بیگ میں ایک دو ایسی چیزیں تھیں۔ جو اس نے احتیاطاً ہوٹل میں آنے سے پہلے خریدی تھیں اور اب وہ انہی چیزوں سے کام لینا چاہتا تھا۔

چھت پر پہنچ کر وہ کچھ دیر تک نیچے جھانکتا رہا پھر اس جگہ پہنچ گیا جہاں تین منزل نیچے پروفیسی کا کمرہ تھا۔ پہلی منزل سے دسویں منزل تک اوپر سے نیچے ایک قطار میں کھڑکیاں تھیں۔ جن سے تقریباً دو فٹ کے فاصلے پر ایک آہنی پائپ اوپر سے نیچے تک چلا گیا تھا۔ ہر کھڑکی کے اوپر تقریباً چھ انچ چوڑی کارنس بنی ہوئی تھی۔ یہ کارنس عمارت کے چاروں طرف بنی ہوئی تھی۔ نک چند لمحے نیچے جھانکتا رہا پھر چھت کی منڈیر پر چڑھ گیا۔ بیگ اس نے پشت پر لٹکا رکھا تھا۔ پیر نیچے لٹکا کر اس نے ایک ہاتھ سے منڈیر کو تھامے رکھا اور دوسرے ہاتھ سے پائپ پر گرفت جمانے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر دونوں ہاتھ پائپ پر جما کر آہستہ آہستہ نیچے کھسکنے لگا۔ پائپ کو دیوار کے ساتھ سہارا دینے کے لیے جگہ جگہ آہنی کلپ لگے ہوئے تھے۔ وہ ان کلپوں میں پیر پھنسا کر ایک لمحہ کو رکتا اور پھر نیچے کھسکنے لگتا۔

ساتویں منزل پر پہنچ کر وہ رک گیا۔ کھڑکی پائپ سے تقریباً دو فٹ کے فاصلے پر تھی۔ اس نے ایک ہاتھ پائپ پر جمائے رکھا اور دوسرا ہاتھ اوپر والی کارنس تک پہنچانے کی کوشش کے ساتھ ہی ایک پیر بھی کھڑکی کی کارنس تک پہنچانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کا جسم پسینے سے تر ہو رہا تھا۔ ہاتھوں کی ہتھیلیاں بھی پسینے میں بھیگ رہی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے پائپ پر اس کے ہاتھ کی گرفت کسی بھی لمحہ چھوٹ جائے گی۔ اس کے دوسرے ہاتھ کی انگلیاں اوپر والی کارنس کو چھونے لگیں۔ وہ کچھ اور آگے کو جھکا اب جوتے کی نوک کھڑکی والی کارنس تک پہنچ رہی تھی۔ اسی لمحہ نک کی نگاہ نیچے چلی گئی جہاں اس وقت کوئی گاڑی گزر رہی تھی۔ نک کو چکر سا آ گیا۔ اسی لمحہ پائپ سے اس کا ہاتھ پھسل گیا۔ اس کے جسم کو ایک جھٹکا سا لگا لیکن یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اس کے دوسرے ہاتھ کی انگلیاں اوپر والی کارنس پر گرفت جما چکی تھیں ورنہ ساتویں منزل سے سڑک پر گرنے کے بعد اس کے جسم کے اعضا تلاش کرنا بھی مشکل ہو جاتا۔

وہ چند سیکنڈ لٹکا رہا۔ یہ چند سیکنڈ صدیوں پر بھاری محسوس ہو رہے تھے۔ اس کے جسم کا تمام تر بوجھ انگلیوں پر تھا اور انگلیوں کی پوریں گویا ٹوٹی جا رہی تھیں۔ نک نے آنکھیں بند کر لیں چند لمحے بعد جب حواس بحال ہوئے تو وہ دوسرا ہاتھ اوپر والی کارنس پر جمانے کی کوشش کرنے لگا لیکن پشت پر لٹکا ہوا بیگ جھٹکا لگنے سے سامنے آ گیا تھا جو بار بار اس کے اور دیوار کے درمیان حائل ہو رہا تھا۔ نک کو اپنی موت ناچتی ہوئی نظر آنے لگی۔ وہ اس لمحے پر لعنت بھیجنے لگا جب اس نے پروفیسی کے کمرے میں پہنچنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس نے بمشکل دوسرا ہاتھ اوپر والی کارنس پر جمایا اور پیر بھی نیچے والی کارنس پر ٹکا دیے۔

نک ویلوٹ نے اپنی پیشہ وارانہ زندگی میں بڑے بڑے کارنامے انجام دیے تھے لیکن اسے دل ہی دل میں اعتراف کرنا پڑا کہ ایسی خوفناک صورت حال کا سامنا کبھی نہیں کرنا پڑا۔ اس کے جسم پر پسینہ باقاعدہ دھاروں کی صورت میں بہہ رہا تھا اور اس نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اتفاق سے کسی کی نظر اس پر پڑ جائے تو آن کی آن میں سڑک پر ہزاروں آدمیوں کا ہجوم لگ جائے گا۔ اپنے حواس پر قابو پانے کے بعد وہ ایک ایک انچ آگے سرکنے لگا۔ کندھے پر لٹکا ہوا بیگ بار بار سامنے آ رہا تھا جو اس کے لیے کسی بھی لمحے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔

کھڑکی کے آخری سرے پر پہنچ کر اس نے نیچے جھانکا۔ تقریباً تین فٹ آگے پروفیسی کے کمرے کی بالکونی تھی۔ جس کے اوپر آٹھویں منزل والے کمرے کی بالکونی بھی تھی۔ نک آہستہ آہستہ آگے جھکتا چلا گیا۔ اوپر والی بالکونی پر گرفت جما کر وہ نیچے لٹک گیا۔ پروفیسی والے کمرے کی بالکونی کا فرش اس کے پیروں سے صرف دو فٹ نیچے تھا لیکن اس کے نیچے بھیانک موت تھی جو جبڑے کھولے اس کی منتظر تھی۔ اندازے کی معمولی سی غلطی اسے موت کے منہ میں پہنچا سکتی تھی۔ وہ اوپر والی بالکونی کو تھامے اپنے جسم کو آہستہ آہستہ آگے پیچھے حرکت دینے لگا اور پھر اندر کی طرف چھلانگ لگا دی۔

دھپ کی ہلکی سی آواز ابھری اور نک ایک کونے میں دبک گیا۔ اس کا جسم پسینے میں شرابور اور سانس بری طرح پھولا ہوا تھا۔ دھپ کی آواز کے بعد بھی بدستور سناٹا طاری رہا۔ نک نے آگے جھک کر دیکھا۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور نائٹ بلب

کی نیلگوں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ دروازہ شاید اس لیے کھلا چھوڑ دیا گیا تھا کہ اس طرف سے کسی مداخلت کی توقع نہیں تھی۔ بالکونی کا دروازہ کھلا ہونے کی وجہ سے ٹک کو اب اس بیگ کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی لیکن وہ بیگ چھوڑنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ چند لمحے متذبذب کی کیفیت میں گزارنے کے بعد وہ بیگ کندھے پر لادے کمرے میں داخل ہوگیا۔

یہ بیڈروم تھا۔ کنگ سائز مسہری پر مس پروفیسی گہری نیند سو رہی تھی۔ ٹک ڈیلوٹ مسہری کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ وہ چند لمحے پروفیسی کی طرف دیکھتا رہا پھر متجسس نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ وہ پیکٹ اسے کہیں بھی نظر نہیں آیا تھا۔ اس کی نظریں ایک بار پھر پروفیسی کی طرف اٹھ گئیں اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنے آپ پر لعنت بھیجنے لگا۔ جس چیز کی اسے تلاش تھی، وہ نظروں کے سامنے تھی لیکن بدحواسی میں اسے دیکھ نہیں سکا تھا۔ وہ میکسی مس پروفیسی نے پہن رکھی تھی۔

ٹک ڈیلوٹ کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ اس نے مسہری کے قریب بیٹھ کر بیگ کھول لیا اور ایک چھوٹی سی بوتل نکال لی جو دیکھنے میں کسی پرفیوم کی بوتل لگ رہی تھی۔ جس کا ڈھکنا دبانے سے اسپرے کیا جاسکتا تھا۔ اس نے بوتل کا رخ پروفیسی کے چہرے کی طرف کر کے ڈھکنا دبا دیا۔ بوتل سے پھوار سی نکل کر پروفیسی کے چہرے پر پڑی۔ وہ ایک لمحے کو کسمائی لیکن دوسرے ہی لمحے ساکت ہوگئی۔ ٹک نے بوتل بیگ میں رکھی اور اگلے مرحلے سے نمٹنے کے لیے تیار ہوگیا۔

تقریباً دس منٹ بعد جب وہ کمرے سے نکل رہا تھا تو وہ میکسی اس کے بیگ میں موجود تھی۔ واپسی کے لیے اس نے راہداری میں کھلنے والا دروازہ ہی استعمال کیا تھا۔ اس نے دروازے کا بولٹ اس طرح اٹکا دیا کہ باہر سے دروازہ بند کرنے پر ہلکا سا جھٹکا لگنے سے بولٹ گر کر خود بخود اپنی جگہ پر فٹ ہوگیا۔

ٹک ڈیلوٹ کو یقین تھا کہ مس پروفیسی صبح دس بجے سے پہلے بیدار نہیں ہوسکے گی۔ لیکن اس کے باوجود وہ کسی قسم کا رسک لینے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے بیگ کندھے پر لٹکایا اور عقبی زینے کی طرف بڑھ گیا۔

٭

یہ تیسری رات تھی جو ٹک ڈیلوٹ نے جاگتے ہوئے گزاری تھی۔ اگر صورتِ حال معمول کے مطابق ہوتی تو شاید وہ اتنی پروا نہ کرتا لیکن معاملہ گلوریا کی سلامتی کا تھا۔ اس نے قسم کھا رکھی تھی کہ جب تک گلوریا کو آزاد نہیں کرا لیتا اس وقت تک ایک لمحے کو بھی چین سے نہیں بیٹھے گا۔

ہوٹل سے آتے ہی اس نے فلیٹ کا دروازہ اندر سے مقفل کر لیا اور میکسی کو الٹ پلٹ کر اس کا جائزہ لینے لگا۔ سوتی کپڑے کی میکسی تھی جس کے سامنے والے حصے پر گلے سے دامن تک مختلف رنگوں کے دھاگوں سے کشیدہ کاری کی گئی تھی اور کشیدہ کاری کے ذریعے قدرتی مناظر کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس میکسی پر کام کرنے والا اپنے فن میں ماہر نہیں تھا لیکن ایک بات ٹک نے خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ پوری میکسی میں صرف تین رنگوں کے دھاگے استعمال کیے گئے تھے۔ سرخ، نیلا اور پیلا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہوسکتی تھی کہ کام کرنے والے کو یا تو چوتھے رنگ کا دھاگا دستیاب نہیں تھا یا اس نے دانستہ کوئی چوتھا رنگ استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ پیلا اور سرخ رنگ کہیں کہیں نظر آرہا تھا جب کہ نیلا رنگ بکثرت استعمال کیا گیا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے کی مغز پچی کے بعد بھی ٹک ڈیلوٹ یہ معلوم کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا کہ اس میکسی میں کون سی ایسی خاص بات تھی جس کے لیے دو مختلف پارٹیاں سامنے آئی تھیں۔ اس نے میکسی کو میز پر پھیلا دیا اور مختلف زاویوں سے اس کی رنگین تصویریں کھینچنے لگا۔ فلم ڈیولپ کرنے میں مزید ایک گھنٹہ لگ گیا۔ وہ کچھ دیر تک تصویروں کو بغور دیکھتا رہا پھر دوبارہ میکسی کا معائنہ کرنے لگا۔

نیلے رنگ کا دھاگا ایک جگہ سے اُدھڑا ہوا تھا۔ اس نے تار کپڑ کر کھینچ لیا۔ دھاگا اُدھڑتا چلا گیا۔ یہ بات ٹک کے لیے حیرت کا باعث تھی کہ نیلے دھاگے میں کہیں بھی جوڑ نہیں تھا اور نہ ہی کہیں دھاگا ٹوٹا تھا۔ چند منٹ بعد ہی میکسی کے دامن کے ایک حصے سے نیلا دھاگا غائب ہوگیا۔ اس جگہ اب صرف پیلا دھاگا رہ گیا تھا لیکن نیلا دھاگا اُدھڑنے کے بعد پیلے دھاگے نے جو نقشہ اختیار کیا تھا اسے دیکھ کر ٹک کے دماغ میں تیز سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ وہ نہایت احتیاط کے ساتھ نیلا دھاگا اُدھیڑتا چلا گیا۔ تقریباً پون گھنٹے بعد میکسی سے نیلا دھاگا غائب ہوچکا تھا اور اب مختلف جگہوں پر پیلا اور سرخ دھاگا جو منظر پیش کر رہا تھا اسے دیکھ کر ٹک ڈیلوٹ کے دماغ میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ اس نے میکسی کو تہ کر کے دوبارہ بیگ میں رکھا اور اُدھڑا ہوا نیلا دھاگا کچن میں لے جا کر جلا دیا۔ اب اس کی سمجھ میں یہ بات آچکی تھی کہ اس میکسی میں لوگ اتنی زیادہ دلچسپی کیوں لے رہے تھے۔ اس نے رنگین تصویریں بھی بیگ میں ڈالیں اور بیگ کندھے پر لٹکا کر فلیٹ سے نکل گیا۔

نک ویلوٹ تین دن تک اپنے فلیٹ سے غائب رہا۔ چوتھے دن صبح سویرے واپس آ کر اس نے ناشتہ تیار کیا اور ناشتے سے فارغ ہو کر ڈرائنگ روم کے صوفے پر نیم دراز ہو گیا وہ کئی راتوں سے جاگ رہا تھا لیکن اس وقت نیند پر قابو نہ پاسکا اور اس کی پلکیں جھکتی چلی گئیں۔

ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز سن کر اس کی آنکھ کھل گئی — سب سے پہلے اس نے گھڑی دیکھی، دن کے گیارہ بج رہے تھے اس نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھا لیا۔

"مسٹر ویلوٹ؟" دوسری طرف سے ایک نسوانی آواز سنائی دی جسے پہچاننے میں نک کو زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

"بول رہا ہوں۔" نک نے جواب دیا۔

"ہمارے کام کا کیا بنا؟"

"میں صبح سے تمہاری کال کا منتظر تھا۔ میری دوست کیسی ہے؟" نک نے سوال کیا۔

"اے ون کنڈیشن میں۔" نسوانی آواز نے کہا "میں نے اپنے کام کے بارے میں دریافت کیا تھا۔"

"میکسی کہاں پہنچائی جائے؟ میں تو صبح سے تمہارے فون کا انتظار کر رہا تھا۔"

"گڈ۔ تم میکسی لے کر لانگ آئی لینڈ پہنچ جاؤ۔ ہم اپنی اپنی چیزوں کا تبادلہ کرلیں گے۔" نسوانی آواز نے کہا اور پھر اسے وہ جگہ بتانے لگی جہاں میکسی اور گلوریا کا تبادلہ کیا جانا تھا۔

فون بند کرتے ہوئے نک ویلوٹ کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے بیڈ روم میں رکھا ہوا ایک پیکٹ اٹھایا اور فلیٹ سے باہر نکل گیا تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ لانگ آئی لینڈ میں اسی جگہ موجود تھا جہاں آنے کے لیے اسے کہا گیا تھا۔ وہ انجن بند کر کے گاڑی ہی میں بیٹھا متجسس نگاہوں سے اطراف میں دیکھنے لگا۔ چند منٹ بعد ہی سیاہ رنگ کی ایک گاڑی اس کے پیچھے آ کر رکی۔ نک ویلوٹ نے عقبی منظر پیش کرنے والے آئینے میں دیکھا۔ سیاہ رنگ کے اسکرٹ، بلاؤز میں ملبوس ایک دراز قامت لڑکی کار سے اتر کر اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ نک بھی دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا اور پیچھے رکنے والی کار کی طرف دیکھنے لگا۔ پچھلی سیٹ پر گلوریا دو غنڈوں کے بیچ میں سینڈوچ بنی بیٹھی تھی۔

"ہیلو ویلوٹ!" سیاہ لباس والی لڑکی نے قریب پہنچ کر اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا "میکسی کہاں ہے؟"

"تم ایک ہاتھ سے دو، ایک ہاتھ سے لو کے اصول کا قائل ہوں۔ پہلے میری دوست کو یہاں بلاؤ۔" نک نے کہا۔

"بہت احتیاط پسند ہو۔" لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر اپنی گاڑی کی طرف رخ کر کے ہاتھ سے اشارہ کر دیا۔ ایک طرف کا دروازہ کھلا اور ایک غنڈے نے نیچے اتر کر گلوریا کا ہاتھ پکڑ کر نیچے اتار دیا۔

گلوریا تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی اس کے قریب پہنچ گئی۔ نک اس طرح گلوریا کا جائزہ لینے لگا جیسے یہ دیکھنے کی کوشش کر رہا ہو کہیں سے کوئی ٹوٹ پھوٹ تو نہیں ہوئی پھر مطمئن ہو کر اس نے گلوریا کو گاڑی میں بٹھایا اور پچھلی سیٹ پر رکھا ہوا پیکٹ اٹھا کر سیاہ لباس والی کے حوالے کرتے ہوئے بولا۔

"پیکٹ کھول کر اپنا اطمینان کر لو۔"

لڑکی نے پیکٹ کا کاغذ ایک طرف سے پھاڑ دیا اور پھر مطمئن انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولی "ٹھیک ہے۔ میں نے تمہاری دوست کا پورا پورا خیال رکھا تھا اگر نادانستہ طور پر ہماری طرف سے کوئی تکلیف پہنچی ہو تو میں معذرت خواہ ہوں۔"

نک کوئی جواب دینے کے بجائے گاڑی میں بیٹھ گیا اور انجن اسٹارٹ کر کے اسے تیز رفتاری سے ایک طرف دوڑا دیا۔ راستے بھر دونوں خاموش رہے۔ پھر اس نے جیسے ہی اپنے فلیٹ والی عمارت کے سامنے گاڑی روکی، وہ موٹا اچانک ہی کہیں سے نکل کر ان کے سامنے آ گیا۔

"میں ایک گھنٹے سے یہاں کھڑا تمہارا انتظار کر رہا ہوں مسٹر ویلوٹ! میرے کام کا کیا بنا؟"

"اچھا ہوا تم آ گئے۔ میں تو تین دن سے تمہارا منتظر تھا۔ میرے ساتھ آؤ۔ تمہاری امانت میرے کمرے میں موجود ہے۔" نک نے جواب دیا۔

گلوریا الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ نک نے آنکھ کا گوشہ دبا دیا اور وہ تینوں عمارت میں داخل ہو کر فلیٹ میں پہنچ گئے۔ نک نے موٹے ڈریک کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور دوسرے کمرے سے ایک پیکٹ لا کر اس کی طرف اچھال دیا۔

"دیکھ کر اطمینان کر لو کہ یہ تمہاری ہی نیویسی رائز والی جرمن کی میکسی ہے نا؟"

ڈریک نے پیکٹ کھول لیا اور میکسی کو پھیلا کر اس کا جائزہ لینے لگا پھر مطمئن انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا "ٹھیک ہے مسٹر ویلوٹ! یہی میکسی ہے۔ اب روزالی مجھ سے ناراض نہیں ہو گی۔"

"یہ کیا چکر ہے؟" گلوریا نے ڈریک کے جانے کے بعد الجھی ہوئی نگاہوں سے نک ویلوٹ کی طرف دیکھا۔

"ایک میکسی کے دو طلب گار تھے اور ظاہر ہے کہ میں میکسی کو دو حصّوں میں تقسیم نہیں کرسکتا تھا۔ دونوں پارٹیوں سے نمٹنے کے لیے مجھے دو عدد نقلی میکسیاں تیار کرانی پڑیں جبکہ تیسری اور اصلی میکسی اب بھی میرے پاس موجود ہے۔"

"کیا مطلب؟" گلوریا نے اسے گھورا۔

نک ویلوٹ مسکراتے ہوئے اسے تفصیل بتانے لگا۔ آخر میں بولا "میں مس پروفیسی کے بارے میں معلومات حاصل کرچکا ہوں۔ وہ محکمہ دفاع میں ایک انتہائی اہم عہدے پر فائز ہے۔ مشرقِ وسطیٰ کے بارے میں امریکی حکومت کی نئی پالیسیوں سے یہودیوں کو اختلاف ہے۔ پروفیسی بھی یہودی ہے۔ چند سرکردہ اسرائیلی یہودیوں نے بھاری رقم کا لالچ دے کر اسے اس بات پر آمادہ کرلیا تھا کہ وہ انھیں ایک خاص ملک کی ایٹمی تنصیبات کا نقشہ فراہم کرے۔ کاغذات کیمپ سے باہر لے جانا انتہائی خطرناک ہوسکتا تھا۔ اس کے لیے پروفیسی نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ سرخ اور پیلے دھاگوں سے میکسی پر اس ملک کی تمام اہم ایٹمی تنصیبات کا نقشہ کاڑھ دیا اور اس میں پیلا دھاگا اس طرح استعمال کیا کہ وہ نقشہ ایک وسیع و عریض قدرتی منظر بن گیا۔

پروفیسی کو یہ میکسی نیویارک میں ایک شخص کو پہنچانا تھی۔ لیکن کسی وجہ سے وہ شخص یہاں نہیں پہنچ سکا پھر پروفیسی نے فون پر ان سے رابطہ قائم کیا اور میکسی لے کر سینٹرل پارک پہنچ گئی۔ ان میں شاید پہلے ہی سے طے تھا کہ وہاں آنے والا شخص سیدھے سادے طریقے سے رابطہ قائم کرنے کے بجائے کسی رہزن کی طرح میکسی کا پیکٹ اس سے چھین کر بھاگ جائے گا لیکن میں اس کے آڑے آگیا اور میکسی کا پیکٹ رہزن سے چھین کر دوبارہ پروفیسی کے حوالے کردیا جبکہ رہزن فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ اسی شام پروفیسی نے میکسی دوبارہ لاکر میں رکھوانا چاہی لیکن کمپنی کا دفتر بند ہوچکا تھا جس کی وجہ سے مجبوراً اسے میکسی اپنے ہوٹل کے کمرے میں لے جانا پڑی۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے اپنی جان پر کھیل کر وہ میکسی حاصل کرلی۔"

"لیکن سوال تو یہ ہے کہ یہودیوں کو ایٹمی تنصیبات کا راز حاصل کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی جبکہ امریکی حکومت میں ان کا رسوخ ہے اور یہ لوگ اپنا اثر استعمال کرکے حکومت کو مشرقِ وسطیٰ کے بارے میں پالیسی تبدیل کرنے پر مجبور کرسکتے تھے؟" گلوریا نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

"یہودی بڑی احسان فراموش اور محسن کش قوم ہے۔ تاریخ میں قدم قدم پر اس امر کی شہادتیں ملتی ہیں کہ اپنے ذاتی مفاد کے لیے انھوں نے ہمیشہ اپنے محسنوں کو دھوکا دیا۔" نک چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کہنے لگا۔ "ہر حکومت کی اپنی پالیسی ہوتی ہے جسے چند مفاد پرستوں کی بھینٹ نہیں چڑھایا جاسکتا۔ ایٹمی تنصیبات کے راز حاصل کرکے یہودی نہ صرف حکومت کو مشرقِ وسطیٰ کے بارے میں پالیسی تبدیل کرنے پر مجبور کرسکتے تھے بلکہ حکومت کو بلیک میل کرکے اپنے لیے زیادہ سے زیادہ مراعات بھی حاصل کرنا چاہتے تھے۔"

"مگر یہ لوگ کون تھے؟ میرا مطلب ہے ڈریک اور لڑکی؟" گلوریا نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"غیر ملکی ایجنٹ، جنھیں کسی طرح میکسی کے بارے میں معلوم ہوگیا تھا لیکن اپنے ٹھکانوں پر پہنچ کر جب وہ میکسی کے دھاگے اُدھیڑیں گے تو انھیں پھول بوٹوں کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔"

"اور وہ اصلی میکسی؟"

"وہ میں تین دن پہلے ہی وزارتِ دفاع کو بھیج چکا ہوں۔ میں نے انھیں بتایا ہے کہ یہ میکسی اتفاق سے میرے ہاتھ لگ گئی تھی۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق انھوں نے میری نگرانی شروع کردی تاکہ جب میں ان لوگوں میں میکسیاں تقسیم کروں تو وہ لوگ محکمۂ دفاع کے آدمیوں کی نظروں میں آجائیں۔ مس پروفیسی کو تو گزشتہ رات ہی گرفتار کرلیا گیا تھا اور آج شام سے پہلے پہلے وہ عورت، ڈریک اور اس کے ساتھی بھی قانون کی گرفت میں آجائیں گے لیکن تم نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ میں نے میکسی کیسے چرائی تھی؟" نک مسکرایا۔

"بند کرو یہ بکواس۔ میں اس سے آگے کچھ نہیں سننا چاہتی۔" گلوریا کے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔

"اس سے آگے کچھ ہے بھی نہیں۔" نک نے گہرا سانس لیا اور پھر اس کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آگئی۔ وہ گلوریا کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔

"چلو آج دوپہر کا کھانا ہم آسٹر ہوٹل میں کھائیں گے بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔"

آسٹر ہوٹل کے نام پر گلوریا اسے گھور کر رہ گئی لیکن نک ویلوٹ کا ساتھ تو اسے بہر حال دینا ہی پڑا تھا۔

# درخشاں

راوی: جمال اصغر
تحریر: انوار مجتبیٰ صدیقی

ایک عشق گزیدہ نواب زادے کی ہنگامہ خیز سرگزشت

**عشق کی کارفرمائیاں، ایک طرفہ تماشا**

قبولیتِ عام کی جانب رواں سسپنس کا سلسلۂ درخشاں

آخری قسط

EqbalMehdi
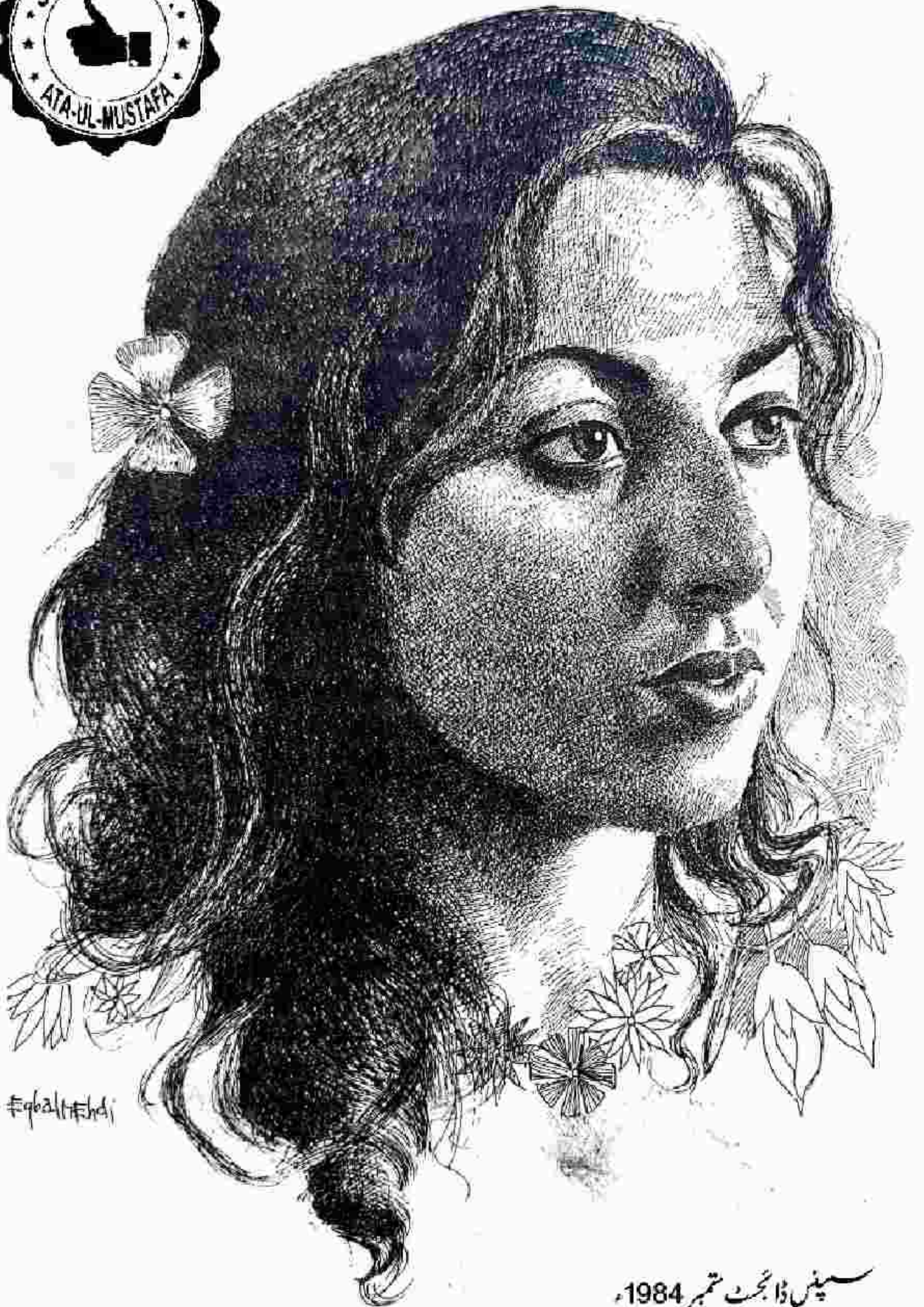
میں نے ایک جاگیردار گھرانے میں جنم لیا۔ لندن سے بار ایٹ لا کی ڈگری لے کر الٰہ آباد میں پریکٹس شروع کی لیکن ایک مقدمے میں ایک بے گناہ میری مہارت کا شکار ہو گیا جس کا صدمہ میرے والد برداشت نہ کر سکے۔ اس حادثے نے مجھے اپنے پیشے سے دل برداشتہ کر دیا۔ تنہائی کا بوجھ اتارنے کے لیے میں سیاحت پر نکل گیا۔ رنگون میں والد صاحب کے ایک دوست پریم ناتھ جی کی بیٹی کاجل میری آنکھوں کا کاجل بن گئی۔ اس نے باپ کی مخالفت کو پس پشت ڈال کر میرا ہاتھ تھام لیا اور مسلمان ہو کر میری شریک زندگی بن گئی۔ اس کا نام کاجل سے درخشاں ہو گیا۔ درخشاں کے بااثر باپ اور ہندو پنڈتوں نے میری اور درخشاں کی زندگی اجیرن کر دی اور آخر انھوں نے اپنی کالی طاقتوں کے ذریعے درخشاں کی سانسیں منقطع کر دیں۔ درخشاں نے مرتے وقت مجھے یقین دلایا کہ ہم اس دنیا میں بہت جلد دوبارہ ملیں گے۔ درخشاں کی جدائی کا غم ناقابل برداشت ہو گیا تو میں نے ایک جہاز کرائے پر حاصل کیا اور اپنے عزیز ترین دوستوں ڈاکٹر کیلاش، پادری جوزف اور اپنے جاں نثار کٹے کو لے کر ایک انجانے سفر پر نکل گیا۔ جہاز کا نائب کپتان جیکسن کچھ ماورائی طاقتوں کا مالک تھا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ ہمارا یہ سفر بڑا خوفناک ثابت ہوگا۔ اور اسی کے نتیجے میں مجھے جانِ حیات درخشاں مل سکے گی۔ ایک جزیرے پر مختصر قیام کے بعد ہمارا جہاز روانہ ہوا تو جیکسن ہمارے ساتھ نہیں تھا۔ وہ وہیں رہ گیا تھا۔ پھر ہمیں ایک خوف ناک طوفان نے آگھیرا۔ نتیجتاً سب کچھ تلپٹ ہو گیا۔ ہوش آیا تو جہاز کا نصف حصہ طوفان کی نذر ہو چکا تھا اور بقیہ نصف ایک جزیرے کی چٹانوں میں پھنسا ہوا تھا۔ ہم تینوں دوستوں اور میرے کتے کے سوا جہاز پر کوئی جاندار نہ رہا تھا۔ جزیرے کے لوگوں نے ہمیں اپنے دیوتا پر قربان کر دینا چاہا تو کیلاش نے اپنے دیوتا ہونے کا اعلان کر کے انھیں حیران کر دیا۔ اس نے جزیرے کے سردار سمورا کے گلے کی رسولی آپریشن کے ذریعے نکال کر انھیں اپنے دیوتا ہونے کا یقین بھی دلا دیا۔ سردار سمورا اور اس کی حسین و جمیل بیٹی ساوری ہمارے بے دام کے غلام ہو گئے لیکن ایک شرپسند مکالا اپنے جادوگر دوست سوکارو کے ہمراہ ہماری راہ میں حائل ہو گیا۔ جیکب ان وحشیوں کو عیسائی بنانے پر تل گیا تھا۔ آخر ایک رات ساوری میرے کیبن میں آئی تو یہ انکشاف ہوا کہ اسے بھی حالات نے مہذب دنیا سے یہاں لا ڈالا تھا۔ وہ انگریزی جانتی تھی اور چودہ سال سے ان وحشیوں کے درمیان رہ رہی تھی۔ کیلاش کی مسیحائی سے سمورا اس کا بے دام غلام ہو کر رہ گیا تھا۔ ایک رات درخشاں نے میرے خواب آباد کیے اور جلد ملنے کی نوید دے کر چلی گئی۔ پھر ایک شب پراسرار جینی نے میرے بند کیبن میں آکر ہمیں بے خبری کی موت سے بچایا۔ اس نے مجھے ایک ایسی بوٹی کھلا دی جس کے استعمال کے بعد زہر اثر نہیں کرتا۔ اس نے میرے سامنے مکالا کے بھیجے ہوئے آدمیوں کو زہریلی سوئیوں سے ہلاک کر دیا۔ صبح مکالا زلزلے کی طرح ہمارے آدھے جہاز پر آیا اور سمورا کو اپنے تین جاں نثاروں کی گم شدگی سے آگاہ کیا۔ اس نے سمورا کو ہم سے بدظن کرنے کی کوشش بھی کی۔ ہم لوگ کھانے کی میز کے گرد بیٹھے تھے۔ جیکب نے پہلا لقمہ منہ کی طرف لے جانا ہی چاہا تھا کہ جیسے زلزلہ آ گیا۔ کھانے کی میز الٹ گئی۔ سارے برتن اور کھانے پینے کی اشیا ادھر ادھر جا پڑیں۔ ساوری خوف زدہ نظروں سے باہر دیکھنے لگی جہاں دیوتا اوو کا مجسمہ بری طرح لرز رہا تھا۔

سمورا نے ہمیں آزمانے کے لیے ہمارے کھانے میں زہر ملوا دیا تھا اور پراسرار جینی نے ہمیں زہر خورانی سے بچانے کے لیے یہ کرشمہ دکھایا تھا۔ میں نے سمورا پر یہ راز فاش کر دیا اور زہر آلود مچھلی کھا کر اسے اپنے دیوتا ہونے کا یقین بھی دلایا مگر مکالا کا دوست جادوگر سوکارو اسے ہمارے خلاف ورغلا رہا تھا۔ اسی لیے مکالا بار بار ہماری راہ میں حائل ہو رہا تھا۔ سوکارو اور مکالا ہماری اصلیت ظاہر کرنے کے لیے پورا زور لگائے ہوئے تھے مگر کچھ شعبدے دکھا کر جیکب کی دماغی حالت خراب کر دی مگر وہ جلد ٹھیک ہو گیا۔ سردار سمورا نے ہمارے لیے بستی میں ایک رہائش گاہ کا بندوبست کر دیا۔ ہم شکستہ جہاز سے وہاں منتقل ہو گئے۔ ایک رات غنودگی کے عالم میں میں نے جیکسن کو دیکھا تو اس کے سامنے شکایتوں کا دفتر کھول دیا۔ اس نے میری ہمت بندھائی اور سوکارو اور مکالا سے ہوشیار رہنے کی تاکید کی۔ اس نے مجھے ایک ایسے کمرے میں پہنچا دیا جہاں مکالا، سوکارو کے ساتھ سر جوڑے ہمارے خلاف منصوبہ بندی میں مصروف تھا لیکن وہاں روشن چراغ کی لو نے تھرتھرا کے سوکارو کو میری موجودگی سے باخبر کر دیا۔ سوکارو قہر آلود نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔ میں نے سہم کر آنکھیں بند کر لیں۔

چراغ کی لو نے تھرتھرا کے سوکارو کو میری موجودگی سے باخبر کر دیا تھا۔ میں ان کی باتیں تو سن ہی چکا تھا چنانچہ میں نے چراغ پر ہاتھ رکھ کر اسے بجھا دیا۔ صبح اگر میں نے اپنی ہتھیلی پر جلنے کا گول نشان نہ دیکھا ہوتا تو میں خود بھی یقین نہ کرتا کہ رات میں سوکارو کے طلسم کدے میں تھا۔ میں نے کیلاش کو رات کے واقعات سنائے تو وہ حیران رہ گیا۔ اس نے اسی روز سردار سمورا سے سابق سردار بوگا کی منظورِ نظر تاریہ کی دست کاری کا مطالبہ کر دیا جسے اس نے تھوڑے سے رد و قدح کے بعد منظور کر لیا۔ جیکب کو کابوری کی ہمارے درمیان موجودگی پسند نہ آئی۔ اس نے ان جنگلیوں کو راہِ راست پر لانے کے لیے سردار سمورا کے گھر سے اررو دیوتا کا بت غائب کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ میں نے اسے منع کیا لیکن وہ اپنے فیصلے پر اڑا رہا۔ اسی رات سوکارو نے مجھے اپنے طلسم کے جال میں پھانس لیا۔ مجھے ہوش آیا تو میں ایک غار میں پڑا تھا۔ وہاں میری ملاقات جینی سے ہوئی جو وہاں کے عظیم ساحروں کی پناہ میں تھی انھوں نے اسے بھی باکمال کر دیا تھا۔ جینی نے مجھے ربیک تحفے میں دے دی۔ ربیک کا یہ کمال تھا کہ اسے منہ میں رکھنے والا کسی کو نظر نہیں آتا تھا۔ اسی وقت مکالا اور سوکارو وہاں آ گئے۔ ان کے آتے ہی جینی غائب ہو گئی۔ مکالا نے مجھ پر نیزہ تان لیا اور مجھے ربیک کے استعمال کا موقع دیے بغیر وار کر کے میرا بازو شدید زخمی کر دیا۔ زخمی بازو سے اس تیزی کے ساتھ خون بہا کر میں نڈھال ہو کر رہ گیا۔ اس روز مکالا میرا کام تمام کر دیتا لیکن اچانک ہوا کا رخ بدل گیا۔ وہ مجذوب جو میری والدہ کی قبر کے پاس مجھے ملا کرتا تھا بروقت وہاں پہنچ گیا۔ سارا طلسم ٹوٹ گیا۔ میرے بازو کا زخم بھی مندمل ہو گیا اور میں نے جاتے جاتے مجذوب کے ہاتھ سے لکڑی کی انگوٹھی

آثار ملی۔ دوسرے روز سمورا بدحواسی سا ہمارے پاس آیا۔ وہ اس بات سے پریشان تھا کہ بوگا کا دست راست کارڈوبا آج پھر بستی میں نظر آیا ہے۔ وہ جب بھی آتا ہے کچھ لوگ پُراسرار طور پر ہلاک ہو جاتے ہیں۔ ابھی ہم اسی مسئلے پر گفتگو کر رہے تھے کہ مناما ایک اور خبر لے آیا۔ مکالا نے سوکارو کو زخمی کر دیا تھا۔

یہ بڑی لرزہ خیز خبر تھی۔ حالات ایسے ہو گئے تھے کہ مکالا بستی کے لوگوں کو ہمارے خلاف کر سکتا تھا لیکن پُراسرار اجنبی نے سوکارو کا زخم اچھا کر کے ہمارے قدم مضبوط کر دیے۔ سمورا ہمارا اور بھی معتقد ہو گیا تھا۔ کیلاشس نے کابوری کو بوگا کا پتہ بتانے پر آمادہ کر لیا تھا لیکن اسی رات کابوری پُراسرار طور پر ہلاک کر دی گئی اور جینی کے مشورے پر کیلاشس نے اس کی لاش بستی والوں کے حوالے کر کے مکالا کو بتایا کہ کابوری کا یہ انجام اس کی ضد کا نتیجہ ہے۔ جبکہ جیکب ان وحشیوں کو دیوتاؤں سے برگشتہ کرنے کے منصوبے بنا رہا تھا۔ اس نے جزیرے کے بڑے دیوتا اوروکا مجسمہ سمورا کے گھر سے غائب کر دیا۔ سمورا نے اپنے گھر سے اوروکا مجسمہ غائب ہونے کا مطلب دیوتا کی ناراضگی سمجھا۔ وہ ہمارے پاس دوڑا آیا۔ میں نے اسے تسلی دے کر واپس بھیج دیا۔ اس رات میری درخشاں مجھے حوصلہ بخشنے کے لیے آئی۔ اس کے بعد زاریا کی روح نے آکر یہ انکشاف کیا کہ دیوتا اوروکا مجسمہ جسے جیکب نے سمورا کے گھر سے چرا کے جنگل میں ڈال دیا تھا، میرا کتا شامی میرے پاس لے کر آ رہا ہے۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ آج رات سمورا سابق سردار بوگا سے ملنے جائے گا میں اس کا پیچھا کر کے بوگا کی کمین گاہ تک پہنچ سکتا ہوں۔ اس کے جاتے ہی شامی نے اوروکا مجسمہ لا کر میرے قدموں میں ڈال دیا۔ میں نے شامی کو تھپکی دی اور مجسمہ جیکٹ میں رکھ کر سمورا کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ میں آج بوگا تک ضرور پہنچ جاؤں گا۔

میں نے سمورا کا تعاقب کر کے بوگا کا قید خانہ دیکھ لیا مگر اسی دوران سمورا نے متاما کی زندگی کی ڈور کاٹ دی لیکن مکالا نے سمورا کے لیے ایک نااتفاقی کھڑی کر دی۔ ایک نوجوان ساگو کو سمورا سے مقابلے کے لیے آمادہ کر لیا۔ ساگو نے دیوتا اوروکے غسل والے دن سمورا کو مقابلے کے لیے چیلنج کر دیا۔ میں نے سمورا کی ہمت بندھائی اور اسے یقین دلایا کہ وہ ساگو کو شکست دینے میں کامیاب ہو جائے گا۔ مکالا نے اپنے آٹھ جنگجوؤں کے ذریعے ہمیں زیر کر کے قبیلے کے لوگوں میں ہماری دیوتاؤں والی حیثیت ختم کر دینا چاہی لیکن ہم نے حیرت انگیز طور پر ان سب کو شکست دے کر اپنی حیثیت برقرار رکھی۔ موکانو نے ایک شریر جنگجو تبریر کو اپنا عمل کر کے اس کے ذریعے ہمارے بارے میں سب کچھ معلوم کر لیا چنانچہ سمورا بھی ہماری طرف سے مشکوک ہو گیا اور اس نے مکالا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ہم سے ساوری کی واپسی کا مطالبہ کر دیا۔ میں کسی طرح ساوری کو ان وحشیوں کے حوالے کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ نتیجتاً بات بگڑ گئی اسی وقت میں نے سمورا کے عقب میں جینی کو نمودار ہوتے دیکھ لیا۔

جینی مجھے اپنی غیر معمولی قوتوں کی طرف متوجہ کر کے غائب ہو گئی۔ اس روز وہ اگر ایسا نہ کرتی تو سمورا ساوری کو لے جانے میں کامیاب ہو جاتا اور ہماری دیوتاؤں والی حیثیت ختم ہو جاتی لیکن میری ایک گہری نظر نے پانسہ پلٹ دیا۔ اسی رات درخشاں نے نیم خوابی کے عالم میں مجھے اپنے دیدار سے فیض یاب کر کے یہ ہدایت کی کہ جتنی جلد ہو سکے میں بوگا کو سمورا کی قید سے آزاد کرا دوں۔ چنانچہ بیدار ہوتے ہی میں بوگا کے قید خانے جا پہنچا۔ اسی رات مجھے معلوم ہوا کہ بوگا کیسی زبردست طاقتوں کا مالک تھا۔ وہ میرا بڑا احسان مند نظر آ رہا تھا اور اس نے اپنے قبیلے میں واپس جانے کے لیے اوروہ دیوتا کے غسل کے دن کا انتخاب کیا۔ دیوتا کے غسل والے روز بڑا ہنگامہ ہوا۔ مکالا اور سوکارو اپنے عبرت ناک انجام سے دوچار ہوئے۔ بوگا ایک بار پھر سردار بن گیا اور اس نے کمال فیاضی سے کام لے کر سمورا کو اپنا نائب مقرر کر دیا۔ بوگا ہم پر بہت مہربان تھا مگر جیکب کے مذہبی جنون نے اسے ہم پر پابندیاں لگانے پر مجبور کر دیا لیکن جیکب اپنی حماقتوں سے ان کے تشدد کا نشانہ بن گیا۔ میں اسے بچانے کے لیے اسے کاندھے پر ڈال کے بھاگ نکلا۔ اچانک میرا پیر ایک گڑھے میں جا پڑا۔ میں بے توازن ہو کے گرا تو میرا سر کسی بھاری پتھر سے ٹکرا گیا اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ ہوش آنے پر میں نے خود کو ایک کشتی میں پایا۔ معلوم ہوا کہ میرے ساتھی دشمنوں کو شکست دے کر مجھے بے ہوشی کی حالت میں کشتی تک لے آئے تھے اور اب ہماری کشتی بھوری پہاڑیوں کی جانب بڑھ رہی تھی۔ وہ رات ہم نے ساحل کے قریب ہی گزاری۔ دوسری صبح ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ بھوری پہاڑیوں کے درمیان قدیم زمانے کے ایک نہایت ترقی یافتہ شہر کے کھنڈرات تھے جن میں آج بھی بیشتر چیزیں بہت اچھی حالت میں تھیں بس انسانوں کی کمی تھی۔ ایک عمارت میں اندو دیوتا کا دیو قامت سنگی مجسمہ ایک سنگی چبوترے پر ایستادہ تھا۔ ہم اس علاقے سے واقفیت حاصل کر رہے تھے کہ بوگا کچھ لوگوں کے ساتھ ساحل کے نزدیک پہنچ گیا۔ اس نے ساحل پر آنے کی کوشش نہیں کی، وہ ہمیں واپس لے جانا چاہتا تھا لیکن ہم نے اسے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ ہم اندو اور ایگا دیوتاؤں کے مہمان ہیں۔ وہ واپس چلے گئے۔ رات کو جب میرے ساتھی محو خواب تھے مجھے کسی مغنیہ کی مترنم آواز نے بے چین کر دیا۔ پھر رفیقی نامی ایک جن ظاہر ہوا جس نے مجھے بتایا کہ اسے خدا کے ایک برگزیدہ بندے نے میری نگرانی پر مقرر کیا ہے۔ اس نے بتایا یہ مترنم آواز ایرس کا ایک جال ہے۔ میں اس سے ہوشیار رہوں۔ وہ مجھے درخشاں کی تلاش سے باز رکھنے کی بھی کوشش کرتا رہا مگر میں اپنی زندگی کی جستجو سے کیسے باز آ جاتا۔ دوسرے روز ناشتے کے بعد سے ہم نے اندو دیوتا کے چبوترے کی سیڑھیوں پر طبع آزمائی کی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ چبوترے نے اپنی جگہ چھوڑ دی اور اس کے نیچے ایک تہ خانے کا زینہ نظر آنے لگا تھا۔

اس تہ خانے میں اوریگا کی ممی موجود تھی جسے کیلاشس معمولی سی کوشش سے بیدار کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اوریگا ہمیں ایک اور تہ خانے میں لے گیا جہاں میری درخشاں محو خواب تھی۔ اوریگا نے اسے بیدار کر دیا لیکن مجھ سے یہ وعدہ لے لیا کہ میں ابھی اسے مخاطب نہیں کروں گا۔ وہ رات ہم نے بڑی بے چینی سے گزاری۔ کیلی ماورائی طاقتوں نے مجھے ہراساں کرنا چاہا۔ ساوری نے عالم دیوانگی میں خود کو سمندر کے حوالے کر دیا۔ میں نے جذبات کی رو میں بہہ کر اوریگا کو سخت سست کہنا شروع کر دیا۔ اوریگا وعدے کے مطابق صبح ہوتے ہی درخشاں کے ساتھ غار سے نمودار ہوا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہا لیکن اس کے چہرے پر غیظ و غضب دیکھ کر لرز اٹھا۔

اورلیگا کی خونخوار نگاہوں سے قہر و غضب کی چنگاریاں اڑ رہی تھیں۔ وہ مجھے جن نظروں سے دیکھ رہا تھا اُن میں دنیا جہان کی نفرتیں اور حقارتیں اُبل رہی تھیں۔ اس کی نگاہوں میں کچھ ایسا سحر تھا کہ میں اپنی توجہ کسی اور جانب مبذول نہ کر سکا۔ کچھ دیر تک کسی معمول کی طرح اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں غوطے لگاتا رہا پھر ایک خیال تیزی سے میرے ذہن میں اُبھرا۔ میں نے اپنا سیدھا ہاتھ بلند کیا اور مجذوب کی انگشتری کو نہایت ادب و احترام سے چوم لیا۔

میرا خیال غلط نہیں ثابت ہوا۔ لکڑی کی انگوٹھی کو عقیدت سے چومتے ہی میں اورلیگا کی نگاہوں کے سحر سے آزاد ہو گیا۔ اس کی نگاہوں کے تیور بھی بدلنے لگے۔ میں نے پلٹ کر درخشاں کی سمت ایک نظر ڈالی۔ وہ اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ میری نگاہوں کے سامنے موجود تھی۔ اس کی سحر انگیز آنکھوں کی مقناطیسی کشش مجھے اپنی طرف کھینچنے لگی۔ میں نے اپنے ارادوں کی تکمیل کی خاطر قدم بڑھایا لیکن ٹھٹک کر رک گیا۔ اورلیگا کی ٹھوس اور بھاری آواز میری قوتِ سماعت سے ٹکرائی۔

"جمال اصغر! میں حسبِ وعدہ تمہاری امانت واپس لوٹانے آگیا ہوں۔"

"میں مقدس اورلیگا کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے جواب دیا۔ اس کی آنکھوں کے زاویے تبدیل ہو چکے تھے۔ چہرے پر فطری کرختگی کے اظہار کے طور پر جو سلوٹیں نمایاں ہوئی تھیں وہ بتدریج ختم ہو رہی تھیں۔

"کیا میں یقین کر لوں کہ تم اب وسوسوں کی قید سے چھٹکارا حاصل کر چکے ہو؟" وہ شاہانہ وقار سے بولا۔

"درخشاں کا حصول میری زندگی کی سب سے نمایاں کامیابی ہے۔ میں اس وقت بے حد مسرور ہوں لیکن کچھ سوالات ایسے ہیں جو میرے ذہن میں بدستور باقی ہیں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "کیا مقدس اورلیگا میری الجھنوں کو دور کر سکتا ہے؟"

"جو آنکھیں پوری کائنات پر محیط ہوں وہ دلوں کی گہرائیوں میں بھی جھانک سکتی ہیں۔ میں جانتا ہوں تمہاری پریشانی کا سبب کیا ہے۔"

"کیا یہ پریشانیاں دور کرنے میں تمہاری عقل و دانش میری معاونت نہیں کرے گی؟"

"تمہیں جس گوہرِ نایاب کی تلاش تھی وہ مل گیا۔ قناعت کرنے والے تفکرات اور الجھنوں سے دور رہتے ہیں۔"

"میں اس کے باوجود اصرار کروں گا کہ مجھے مطمئن کیا جائے۔" میں نے ضد کی۔

"تمہیں جینی یقیناً یاد ہو گی؟" اس کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز تبسم اُبھر آیا۔ "شاید اس نے تمہیں یاد دلانے کی کوشش کی تھی کہ تم اورلیگا کے مقابلے میں زیادہ پُراسرار قوتوں کے مالک ہو؟"

"ہاں، جینی نے یہی کہا تھا۔" میں نے اسے ٹٹولنے کی خاطر الجھانے کی کوشش کی۔ "بساط کی چالوں پر تمہاری نظر زیادہ تیز گردش کرنے کی عادی دکھائی دیتی ہے۔ کیا تم جینی کی بات کی تردید کرو گے؟"

"وقت نے تمہاری زبان کو آزاد کر دیا ہے لیکن تم ابھی الفاظ کی ترتیب سے ناواقف ہو۔" اس کے لہجے میں طنز تھا۔ "بلندیوں کا مفہوم سب سمجھتے ہیں مگر وہ لاکھوں میں چند ہوتے ہیں جو اسے حاصل بھی کر لیتے ہیں۔"

"تم میرا شمار کس قطار میں کرو گے؟" میں نے تیکھے انداز میں دریافت کیا۔ "وہ جو ابھی تک تلاش میں سرگرداں ہیں یا وہ....."

"بلندیوں پر پرواز کرنے کی خاطر بڑی مشق، بڑی کٹھن ریاضتوں کی ضرورت ہوتی ہے جمال اصغر!" اس نے سپاٹ آواز میں جواب دیا۔ "تم خوش نصیب ہو جو قسمت کی دیوی تم پر مہربان ہو گئی لیکن ابھی تمہیں کندن بننے کے لیے آگ کے شعلوں سے گزرنا ہو گا۔ داؤ پیچ سیکھنے کی خاطر اکھاڑے میں اترنا ہو گا۔ جیتنے کے لیے بڑے بڑے سورماؤں کو بھی پہلے ہار کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔"

"کچھ داؤ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا کوئی توڑ نہیں ہوتا۔" میں نے انگشتری والا ہاتھ فضا میں بلند کرتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔ "تمہارا کیا خیال ہے؟"

"تم جسے تریاق سمجھ رہے ہو میں اُسے اندھے کی لاٹھی کہوں گا۔" اورلیگا نے بڑی حسرت بھری نگاہوں سے لکڑی کی انگوٹھی کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "جہاں تک میری نگاہیں نہ جا سکتی ہوں وہاں تک پہنچنے کے لیے تمہیں صدیاں درکار ہوں گی۔"

"مجھے یقین تھا، تمہاری آنکھیں اتنی بلندی تک پرواز نہیں کر سکیں گی۔" میں نے اس کی بے بسی کا مذاق اڑانے کی کوشش کی تو اس کے تیور ایک لمحے کو خطرناک ہو گئے لیکن اس نے فوراً ہی خود پر قابو پا لیا۔

"میں تمہاری بات کی تردید نہیں کروں گا۔ میں نے کئی بار اُڑنے کی کوشش کی لیکن میری قوتِ پرواز جواب دے گئی۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"گویا تم اپنی شکست تسلیم کر رہے ہو؟"

"میں نے کہا نا، وقت نے تمہاری زبان کو بے لگام کر دیا ہے مگر تم الفاظ کی ترتیب سے ناواقف ہو۔" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ "شکست تسلیم کرنے اور تھک کر بیٹھ جانے میں بڑا فرق ہے۔ غور سے میرے بڑھاپے پر ایک نظر ڈالو۔ مجھے بتاؤ کیا تم میری عمر کا تخمینہ لگا سکتے ہو؟"

"زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو سال۔" میں نے یونہی ہوا میں تیر چھوڑا۔

"ابھی تم طفلِ مکتب ہو جمال اصغر!" وہ مسکرا دیا پھر یکلخت سنجیدگی سے بولا۔ "کیا تم یقین کرو گے کہ میری عمر ڈیڑھ ہزار سال سے

بھی زیادہ ہے۔"

"شکرہ بظاہر ایک اُونگھتا ہوا پرندہ نظر آتا ہے لیکن جب اپنے شکار پر جھپٹتا ہے تو اس کی عمر یا قوت کا تعین نہیں کرتا۔ پل بھر میں دبوچ کر بے بس کر دیتا ہے۔" میں نے الفاظ چباتے ہوئے کہا۔ "شکرے کی پرواز بھی بہت بلند ہوتی ہے۔ خطرے کی بُو پاکر بجلی کی مانند لپکتا ہے اور......"

"میرے پاس وقت بہت کم ہے۔" اس نے پُروقار انداز میں ہاتھ اٹھا کر مجھے روکتے ہوئے کہا۔ "تم کو وقت نے بولنا ضرور سکھا دیا ہے لیکن ابھی کتر بیونت کے فن میں مہارت حاصل کرنے میں تمہیں خاصا وقت لگے گا۔"

جیکب اور کیلاش میری باتوں سے اکتانے لگے۔ شاید میری باتیں ان کی سمجھ سے بالاتر تھیں لیکن درخشاں ہماری باتیں نہایت غور اور دلچسپی سے سن رہی تھی۔ میں اوریگا کی بات کا جواب دینا چاہتا تھا، مگر جیکب درمیان میں بول اٹھا۔

"مقدس اوریگا! تم دیوتاؤں کے دیوتا ہو۔ میں تمہاری قوت کا ناقابلِ یقین کارنامہ بھی اپنی گنہگار آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں لیکن تمہارا ایک عمل تمہاری شخصیت کی نفی کرتا ہے۔ تم نے......"

"میں نے تمہیں بتا دیا جیکب! ساوری کو ان عظیم قوتوں نے موت سے ہمکنار کر دیا جو اپنا راز دوسروں پر عیاں نہیں کرنا چاہتیں۔" اوریگا نے تیزی سے جواب دیا تو میں بھی ششدر رہ گیا۔

"کیا تم ان قوتوں سے واقف ہو؟" کیلاش نے دریافت کیا۔

"وہ سب اوریگا کی غلام ہیں۔" وہ شاہانہ انداز میں بولا۔ "ہر لمحہ اوریگا کی پلکوں کی جنبش پر نگاہ رکھتی ہیں۔ وہ لازوال قوتیں ہیں میرے دوست! لیکن تم...... تم ان کی بے پناہ طاقت کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔"

"گویا تم ہمیں اپنی بے پناہ قوتوں سے مرعوب کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔" جیکب نہایت معصومیت سے بولا۔ "کیا یہ بات تمہارے شایانِ شان تھی کہ تمہاری پلکوں کی جنبش نے مسیح کی ایک پیروکار کو موت کی ابدی نیند سلا دیا تھا۔"

"مجھے افسوس ہے میرے محترم دوست! لیکن ساوری نے اپنی حدود سے تجاوز کرنے کی کوشش کی تھی۔"

"درخشاں! میری زندگی۔" میں نے اوریگا کو نظرانداز کر کے درخشاں کو مخاطب کیا۔ "کیا تم اپنے جمال کو نہیں بتاؤ گی کہ چہرے کا نقوش اور آرم ہاکے کیا معنی ہیں؟"

جواب میں درخشاں نے حیرت سے اوریگا کی سمت دیکھا پھر مجھے خالی خالی نظروں سے گھورنے لگی، اس کے انداز میں بے بسی محسوس کر کے میں تڑپ اٹھا۔ درخشاں کی نیلگوں آنکھوں میں حسرتیں مچل رہی تھیں۔ شاید وہ بھی مجھے جواب دینے سے گریز کر رہی تھی۔ اوریگا کی دہشت نے غالباً اسے بھی خوفزدہ کر رکھا تھا۔

"نہیں جمال اصغر! تم غلط نتیجہ اخذ کر رہے ہو۔" اوریگا نے میری سوچ کو پل بھر میں پڑھتے ہوئے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "درخشاں کے بارے میں اتنی جلدی اپنے دل و دماغ میں شکوک اور شبہات کو کوئی جگہ مت دو۔ وہ تمہاری زندگی ہے تمہاری کسی بات سے انکار نہیں کر سکتی اسی لیے میں نے تمہیں زمین دوز تہہ خانوں میں خاموش رہنے کی تاکید کی تھی۔ تم سے ایک رات کی مہلت طلب کی تھی۔ مجھے اپنے ارادوں میں ناکامی نہیں ہوئی۔ میں جو چاہتا تھا وہ پورا ہو گیا۔"

"تم...... تم کیا چاہتے تھے؟" میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"میں تمہاری درخشاں کو گونگا اور بہرہ کرنا چاہتا تھا۔"

"نہیں۔" میں چیخ اٹھا۔ میں نے درخشاں کی سمت دیکھا، وہ بے بسی کے عالم میں گم صم کھڑی ہمیں پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ہماری حرکتوں، ہمارے چہروں کے تاثرات کو یوں پلکیں جھپکا جھپکا کر معصومیت سے دیکھ رہی تھی جیسے اُن کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ میں نے نگاہوں کا زاویہ تبدیل کیا اور اوریگا کو گھورنے لگا۔

"پریشان مت ہو میرے بچے!" اوریگا نے خلافِ توقع بزرگانہ شفقت کا اظہار کیا۔ "تمہاری درخشاں اس وقت جس کیفیت سے دوچار ہے وہ محض عارضی اور وقتی ہے۔ میرے مرنے کے بعد اس کی قوتِ گویائی اور سماعت واپس لوٹ آئے گی۔"

"اور تم......"

"کیا جیکسن نے تمہیں جنگادر کے حوالے سے نہیں بتایا کہ میری زندگی کے دن پورے ہو چکے ہیں۔" اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میں جانتا ہوں میرے بچے! تمہارے ذہن ابھی کچے ہیں۔ تمہاری تہذیب نے ابھی اتنی ترقی نہیں کی کہ وہ اوریگا کی بلندیوں کو چھو سکے۔ تمہاری جگہ میں ہوتا تو شاید میرے احساسات اور جذبات بھی وہی ہوتے جو اس وقت تمہارے ہیں۔ یہی جذبات تو ہیں جو انسان کو غلط راستے پر لگا دیتے ہیں۔ ذرا ٹھنڈے دل سے غور کرو۔ اگر مجھے تمہاری امانت کی حفاظت منظور نہ ہوتی تو میں اپنے علم کے زور سے اتنے عرصے اس کے جسم اور روح کی حفاظت کیوں کرتا؟ تم ساوری کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو۔ کیا میں تمہاری امانت کو بھی برباد نہیں کر سکتا تھا؟"

اوریگا کے لہجے میں تلوار کی کاٹ تھی۔ میں خجل ہو گیا

"مقدس اوریگا!" جیکب نے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بناتے ہوئے کہا۔ "کیا تم موت پر قابو پا سکتے ہو؟"

"کچھ دیر انتظار کرو فادر جیکب! میں تمہیں بتاؤں گا کہ اوریگا کس قوت کا نام ہے۔"

"کیا...... تم درخشاں کے جسم اور روح کو......"

"میں جانتا ہوں، تم میری باتوں پر یقین نہیں کرو گے اس لیے کہ تمہاری سائنس ابھی ہزاروں سال پیچھے ہے۔ وہ باتیں جو تمہاری سمجھ سے بالاتر ہوں تم انہیں شعبدہ بازی یا فریبِ نظر تصور کرتے ہو۔ کچھ دنوں بعد تمہیں میرا وجود بھی ایک واہمہ محسوس ہوگا لیکن اس میں تمہاری غلطی نہیں، تمہارا علم ابھی ترقی پذیر ہے۔ تم دلوں کے سربستہ راز نہیں پڑھ سکتے تو ان علوم اور لازوال قوتوں کو کیا سمجھو گے جو مجھے حاصل ہیں۔ تمہارے لاشعور اور ان کے محدود ذہن میری عقل و دانش کی ایک معمولی کرن بھی برداشت نہیں کر سکتے، اگر تم نے شعور کی بلندیوں کو تسخیر کر لیا ہوتا تو مجھ تک پہنچنے کی خاطر اتنا طویل اور پریشان کن بحری سفر تمہیں نہ اختیار کرتے۔"

"کیا یہاں تک پہنچنے کا کوئی مختصر راستہ بھی ہے؟" کیلاش نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"نہیں۔" اوریگا ٹھوس آواز میں بولا۔ "بہتر تھا اگر ہماری طرح تم بھی اپنے جسم چھوڑ کر خلا میں سفر کرتے ہوئے یہاں آجاتے۔"

"کیا مطلب؟" جیکب چونکا۔ "کیا جسم کے بغیر فضا میں سفر کرنا ممکن ہے؟"

"ہاں، وہ جو روحانی طور پر بہت بلند ہوں وہ جسم کے بغیر بھی ہزاروں میل کی مسافت پل بھر میں طے کر لیتے ہیں۔" اوریگا نے ہمیں گھورتے ہوئے قدرے حقارت سے کہا۔ "یہ وصف آج سے ہزاروں سال پہلے کے انسانوں میں موجود تھا۔ اب تم ان باتوں کو کیا کہتے ہو؟"

"میں سمجھ رہا ہوں۔" جیکب نے مدبرانہ انداز میں تائید کی۔ "مذہب سے گمراہی نے ہمیں پستی کی طرف مائل کر دیا ہے۔"

میں خاموشی سے اوریگا کی فلسفیانہ باتیں سنتا رہا مگر مجھے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میرا ذہن اس کی باتوں سے الجھ رہا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ جب تک وہ زندہ ہے درخشاں گونگی اور بہری رہے گی۔ یہ اگر حقیقت تھی تو میری زندگی کا سب سے بڑا المیہ تھی۔ وہ جو میری زندگی تھی، میری نگاہوں کے سامنے مجسمۂ حسن بنی کھڑی تھی لیکن ہم ایک دوسرے سے گفتگو کرنے سے قاصر تھے۔ ایک دوسرے کے جذبات اور احساسات سمجھنے سے قاصر تھے۔

مجھے اوریگا کی علمی قابلیت یا روحانی برتری سے بھلا کیا لگاؤ ہو سکتا تھا۔ مجھے تو صرف اس کی موت کا انتظار تھا جس کے بعد درخشاں کی قوتِ گویائی اور سماعت اسے واپس مل سکتی تھی۔

"جمال اصغر! میرے بچے! تم جو کچھ سوچ رہے ہو اسے کیا نام دو گے؟ خود غرضی؟ مطلب پرستی یا کچھ اور؟"

"تم اگر دلوں کا حال پڑھ سکتے ہو تو جذبات میں اٹھنے والے طوفانوں کا اندازہ بھی لگا سکتے ہو۔" میں نے صاف گوئی سے کہا۔

"تم مجھ سے شاکی ہو؟ اس لیے کہ میں نے تمہاری درخشاں کو بولنے اور سننے کی قوت سے محروم کر دیا ہے۔"

"میری جگہ تم ہوتے تو تمہارا ردِعمل کیا مجھ سے مختلف ہوتا؟"

"میں یقین کے ساتھ تمہارے سوال کا جواب نہیں دے سکتا، لیکن میں تم سے اس کی وجہ ضرور دریافت کرتا اس لیے کہ ہر عمل کا ایک ردِعمل ہوتا ہے۔ کوئی عمل بلا سبب نہیں ہوتا۔ کوئی نہ کوئی محرک ضرور ہوتا ہے۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ خوبصورت الفاظ سے کھیل رہا تھا۔

"نہیں، نہیں، نہیں۔" اوریگا میری سوچ پڑھ کر تلملا اٹھا۔ غصے کی شدت سے اپنے ہونٹ لہولہان کرنے لگا۔ کچھ دیر تک وہ جنون کی کیفیت سے دوچار رہا۔ پھر خود پر قابو پاتے ہوئے بولا — "جمال اصغر! مجھے تمہاری درخشاں اور تمہارا مستقبل عزیز نہ ہوتا تو جانتے ہو کیا ہوتا؟ تمہارا نصف جہاز تمہیں اور تمہارے ساز و سامان کو لے کر اوریفیا کے ساحل پر کبھی نہ آتا۔ سمندر کے ہولناک طوفان تمہیں بھی روند کر جہنم رسید کر سکتے تھے۔"

"اوریگا!" میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔ "کیا یہ غلط ہے کہ تمہاری ان مہربانیوں کے پیچھے تمہاری اپنی بھی کوئی خواہش کارفرما ہے؟"

"ہاں، اب تم نے ایک فائدے کی بات کہی ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں مرنے سے پیشتر کسی کو اپنی تمام قوتیں سونپنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میری نظریں کرۂ ارض پر اپنے کسی جانشین کو تلاش کر رہی تھیں کہ تم اور درخشاں میری نگاہوں میں آ گئے۔ میں نے تمہاری درخشاں کا انتخاب کر لیا اور پھر تمہارے وہ دشمن کامیاب ہو گئے جو ایک عرصے سے درپے آزار تھے۔۔۔۔"

"تو کیا۔۔۔۔ وہ تم تھے جس نے میرے دشمنوں کے ہاتھ مضبوط کر دیے تھے؟" میں نے اوریگا کو حقارت سے گھورا۔ میری نگاہوں میں خون اتر آیا۔ میں نے درخشاں کی سمت دیکھا۔ وہ بدستور معصوم صورت بنائے خاموش کھڑی ہمارے چہروں کو دیکھ رہی تھی۔

"جو کچھ تمہاری درخشاں کے ساتھ ہوا وہ میری نظروں کا ایک اشارہ تھا۔" اوریگا نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔ "اس کے بعد وہ الفاظ جو مرتے وقت درخشاں کی زبان سے ادا ہوئے وہ بھی میری لامحدود قوت کا ایک ادنیٰ سا کرشمہ تھا۔ میں نے ہی تمہارا پیچھا کیا جب تم نے وعدہ لیا تھا کہ تم اسے پانے کے لیے ایک طویل سفر کرو گے اور اس سفر کے دوران جو واقعات اور حادثات پیش آئے سنتے کیا تم ان کی تفصیل بھی سننا پسند کرو گے؟"

"رب عظیم کی قسم، تمہاری باتیں میری کھوپڑی میں نہیں سما رہی ہیں۔" جیکب نے مدھم آواز میں کہا۔

"کیا تم درخشاں کے جسم کو یہاں اٹھا لائے تھے؟" کیلاش نے پوچھا پھر کچھ الجھتے ہوئے بولا۔ "لیکن شریر کو چھومنتر کر دینا....."

"سب کچھ تمہاری نگاہوں کے سامنے ہے۔ تم چاہو تو اُسے ایک خواب سمجھ لو۔" اودریگا ہماری بوکھلاہٹ پر مسکرایا پھر مجھے مخاطب کر کے سنجیدگی سے بولا۔ "جمال اصغر! میں نے تمہاری درخشاں کو اپنی تمام قوتیں سونپ دی ہیں۔ میرے مرنے کے بعد وہ لازوال قوتوں کی مالک ہوگی۔ پھر تم دونوں ناقابلِ تسخیر بن جاؤ گے۔"

"کیا اس منحوس جزیرے سے ہماری زندہ واپسی بھی ممکن ہوگی؟" جیکب نے پوچھ لیا۔

"ہاں، تم بہت جلد یہاں سے واپس لوٹ جاؤ گے۔"

"اودریگا!" کیلاش نے کہا۔ "کیا تم مجھے بتاؤ گے کہ....."

"نہیں میرے دوست! ابھی تم ان تین الفاظ کے معنی نہیں سمجھ سکو گے جو سادری کی موت کا سبب بنے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ کبھی چیکا، عقلوش اور آرم یا کے بارے میں جان جاؤ لیکن جس نے بھی تمہیں یہ راز بتانے کی کوشش کی وہ موت کے چنگل سے خود کو نہیں بچا سکے گا۔"

"کیا درخشاں کو بھی اس کا مطلب معلوم نہیں؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"وہ شعوری طور پر ہر بات سے بے خبر ہے۔" اودریگا نے آسمان کی سمت دیکھا پھر تھوڑے توقف سے بولا۔ "میری بات غور سے سنو۔ میں نے درخشاں کا ماضی اس کے ذہن سے کھرچ کر نکال دیا ہے۔ نہیں، درمیان میں مت بولو۔ میرے پاس وقت کم ہے۔ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اسے ذہن نشین کرتے جاؤ۔ درخشاں صرف تمہیں اور تمہارے ان دونوں دوستوں کو جانتی ہے لیکن وہ ماضی کے بارے میں سب کچھ بھول چکی ہے۔ تمہیں وقت اور موقع کے ساتھ ساتھ اسے ماحول اور حالات سے روشناس کرانا ہوگا۔ ایک خاص بات کا خیال رکھنا۔ درخشاں پہلے بھی تمہاری تھی اور اب بھی تمہاری ہے لیکن....."

"لیکن کیا؟" اودریگا خاموش ہوا تو میں نے بے صبری سے پوچھا۔ "تم کچھ کہتے کہتے رُک کیوں گئے؟"

"مجھے افسوس ہے میرے بچے! اگر ایسا نہ ہوتا تو تمہاری درخشاں موت کی ابدی نیند سو جاتی۔ میرے خواب ادھورے رہ جاتے۔"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھ سکا؟"

"درخشاں کی رُوح پر ہمیشہ میرا تسلط رہے گا اور اسی لیے تمہاری نسل میں اضافے کے تمام امکانات ختم ہو چکے ہیں۔"

میں نے اودریگا کو گھور کر دیکھا۔ اس کی آواز میں ہلکی ہلکی لکنت پیدا ہو رہی تھی۔ بار بار وہ یوں ڈگمگانے لگتا جیسے قدموں پر اپنا بوجھ سنبھالنے میں اسے دشواری پیش آ رہی ہو۔ کیلاش بھی اس کی کیفیت کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔

"اودریگا!" میں نے کچھ سوچ کر جلدی سے پوچھا۔ "کیا درخشاں اس زبان سے واقف ہے جس میں تم نے اسے مقبرے میں بیدار کرتے وقت مخاطب کیا تھا؟"

"وہ..... دنیا کی..... تت..... تمام زبانوں پر..... عبور رکھتی ہے..... مم..... میں نے سب کچھ اس کے..... لاشعور میں محفوظ ..... کر دیا ہے..... لل لیکن..... تم..... تم اسے کچھ بتانے کی..... کوشش نہیں کرو گے..... وہ اودریگا کا..... خخ..... خواب ہے..... دنیا کی کوئی طاقت..... درخشاں کو زیر نہیں کر سکتی..... مم..... میں نے اسے دیوتاؤں کا وہ..... خاص مشروب پلا دیا ہے..... جو..... اسے زندہ رکھے گا..... اور..... اُس کا حسن بھی سدا برقرار رہے گا۔"

اودریگا کا وجود اس کے قدموں پر لرزنے لگا۔ میں نے درخشاں کی سمت دیکھا۔ اس نے اپنی آنکھیں موند رکھی تھیں۔ شاید اودریگا کی قوتوں نے وقتی طور پر اُسے آنکھیں بند رکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ مگر کیوں؟ میں پوچھنا چاہتا تھا لیکن اسی وقت اودریگا زمین پر چت لیٹ گیا۔ اپنے ہاتھ سمیٹتے ہوئے اس نے بڑی نقاہت سے جیکب کو مخاطب کیا۔

"فادر جیکب! اب تم..... اپنی نگاہوں سے دیکھو گے۔ اودریگا کو اپنی موت پر بھی..... اختیار ہے..... لیکن تم..... تم لوگ جو کچھ دیکھو گے..... اس کا تذکرہ میرے لوگوں سے..... نہیں کرو گے۔" پھر اودریگا نے ہماری جانب باری باری دیکھا اس کے بعد اس نے آسمان کی سمت نظر اٹھا کر تین بار بڑی عقیدت سے 'یاہو گاما'، 'یاہو گاما'، 'یاہو گاما' کہا پھر آنکھیں بند کرلیں۔

ہم خاموش کھڑے پلکیں جھپکائے بغیر اودریگا کو دیکھ رہے تھے۔ اس کے آنکھیں بند کرتے ہی ہماری نگاہوں نے جو منظر دیکھا وہ عقلِ سلیم تسلیم نہیں کر سکتی۔

اودریگا کا جسم تیزی سے اکڑنے لگا پھر یوں لگا جیسے اس کے جسم کا گوشت اور ہڈیاں بھربھری مٹی میں تبدیل ہو رہی ہیں۔ جگہ جگہ دراڑیں سی پیدا ہونے لگیں۔ اس کے بعد ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور اودریگا کے وجود کو مٹی کے ذرات کی شکل میں سمیٹ کر بگولوں کی طرح تیزی سے چکراتا ہوا نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔

ہم پر سکتہ طاری ہوگیا پھر میں اسی وقت چونکا جب درخشاں جمال کہتے ہوئے بے ساختہ میری طرف لپکی۔

میری اس داستانِ الم ناک کو پڑھنے والے ممکن ہے ان واقعات پر یقین نہ کریں جو میں پچھلے صفحات میں بیان کر چکا ہوں۔ کچھ قارئین ایسے بھی ہوں گے جو میری آپ بیتی کو محض میرے ذہن کی تخلیق تصوّر کریں گے لیکن میں یہی کہوں گا کہ میں نے بڑی دیانتداری سے اپنے مشاہدات قلمبند کیے ہیں۔ میں یہاں یہ بھی تسلیم کروں گا کہ کہیں کہیں میں

نے حقیقت کے اظہار میں مبالغہ آرائی کی ہلکی سی چاشنی بھی شامل کر دی ہے لیکن یہ آمیزش آٹے میں نمک سے زیادہ نہیں۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو شاید میری کہانی بے انتہا خشک اور بے مزہ ہو جاتی۔

قارئین کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ یہ زمین عجائبات کا ایک مجموعہ ہے۔ کائنات کے لاکھوں سربستہ راز ایسے ہوں گے جو ابھی تک انسانی دسترس سے دور اور نگاہوں سے پوشیدہ ہوں گے۔ کل تک ہمارے لیے جو باتیں ناقابلِ فہم اور لغو تھیں آج وہ باتیں حقیقت کے رُوپ میں ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں۔ خلا کی تسخیر اور انسانی تصویر کا برقی لہروں کے ذریعے ہزاروں میل دور تک سفر، کل لوگ ان باتوں کو مذاق سمجھتے تھے لیکن سائنس کی ترقی نے آج ان باتوں کو ممکن بنا دیا ہے۔ آج جو چیزیں محض کاغذات تک محدود ہیں اور عوام ان کے بارے میں سُن کر انہیں مضحکہ خیز قرار دیتے ہیں کیا عجب کہ وہ کل حقیقت بن جائیں۔

بہرحال درخشاں کو پا لینے کے بعد سادری کی موت کا غم میرے دل و دماغ سے چھٹ گیا۔ یوں بھی وہ میری کوئی عزیز یا رشتے دار نہیں تھی۔ وقت اور حالات نے اُسے ہمارا ہمسفر ضرور بنا دیا تھا۔ مجھے انکار نہیں کہ اس نے ہماری زندگی بچانے کے لیے ہماری مدد بھی کی لیکن وہ جن حالات سے دوچار ہو کر موت کے جنگل میں جا پھنسی تھی، اس سے نجات دلانا ہمارے اختیار کی بات نہیں تھی۔ میری طرح کیلاش اور جکیب کو بھی ایک ساتھی کے بچھڑ جانے کا صدمہ ضرور تھا لیکن درخشاں کے حصول نے ہمارے ذہنوں کی تکان کو بڑی حد تک دور کر دیا تھا۔

اوریگا نے جس پُراسرار اور ناقابلِ یقین انداز میں آسمان کی جانب سفر کیا اس نے ہماری عقل گنگ کر دی تھی۔ مٹی کے وہ ذرّات ابھی تک ہمارے ذہنوں میں چکرا رہے تھے لیکن درخشاں کی مانوس آواز نے ہم سب کو اس کی جانب متوجہ کر دیا۔ کیلاش جو بنیادی طور پر ایک سرجن تھا اور میڈیکل سائنس میں خاصی سوجھ بوجھ کا مالک تھا، درخشاں کو حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ شاید اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ جو ایک طویل عرصے بعد جُدائی کی شدتوں کو وصال کے رنگ سے ہم آہنگ کر رہی تھی، وہ میری درخشاں ہی تھی۔

جکیب بھی احمقوں کی طرح دیدے نچا نچا کر درخشاں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ پادری تھا، آواگون کے عقیدے پر اُسے مطلق یقین نہیں تھا۔ سفر کے دوران اُس نے اکثر مجھ سے کہا تھا کہ میں جس راستے پر آگے بڑھ رہا ہوں وہ خیالوں کی وادی کی طرف جاتا ہے۔ میری درخشاں مجھے داغِ مفارقت دے چکی ہے۔ مجھے اسے بھول جانا چاہیے۔ خود میں بھی ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان باتوں کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا۔ وہ سفر میں نے محض درخشاں کی رُوح کی تسکین اور ماحول سے وقتی فرار کی خاطر اختیار کیا تھا لیکن میں اس حقیقت کو کیسے جھٹلا دیتا جو اپنے وجود کی مہک سے مجھے سرشار کر رہی تھی۔

وہ میری درخشاں تھی، میں اُسے تسلیم کرنے سے کیسے انکار کر دیتا؟

ہم ایک دوسرے کو دل کی دھڑکنوں کی زبانی جُدائی کی دردناک داستان سناتے رہے۔ وہ اس طرح مجھے جکڑے ہوئے تھی جیسے موت کے آخری لمحوں تک ایک پل کو بھی مجھ سے علیحدہ نہیں ہوگی۔ خود میرا حال بھی یہی تھا۔ میرے اختیار میں ہوتا تو فضا کی رفتار کو اسی ایک نکتے پر روک دیتا اور وصال کی ان گھڑیوں کو ابدی سکون میں بدل دیتا لیکن جکیب کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ سرگوشی کے عالم میں کیلاش سے مخاطب تھا۔

”کیلاش! کیا تم یہ سب کچھ دیکھ رہے ہو؟“

”ہاں، ہم جو دیکھ رہے ہیں وہ خواب نہیں حقیقت ہے لیکن.....“

”لیکن کیا؟“

”کیا ہماری آنکھیں جو دیکھ رہی ہیں ہم اس پر اعتبار کر سکتے ہیں؟“

”اوریگا کا وجود بھی ہمارے لیے حیرت انگیز تھا۔“ جکیب نے کہا۔ ”ربِ عظیم کی قسم! مجھے اب بھی شبہ ہے کہ ہم کھلی آنکھوں سے درخشاں بھابی کو دوبارہ زندہ دیکھ رہے ہیں۔ ممکن ہے اوریگا کی پُراسرار قوتوں نے ہمیں کسی سحر میں مبتلا کر دیا ہو۔“

”ہمیں وقت کا انتظار کرنا ہوگا۔ حقیقت کیا ہے یہ راز جلد ہی کھل جائے گا۔“

میرا خیال تھا کہ درخشاں جکیب اور کیلاش کی گفتگو نہیں سُن رہی ہوگی۔ میں اس کے جذبات کی شدتوں کو اپنے دل میں محسوس کر رہا تھا۔ میں نے درخشاں کے کان میں آہستہ سے کہا۔

”خود کو سنبھالو میری زندگی! کچھ آنکھیں ہمارے پیار کو نظر لگا رہی ہیں۔“

”ان آنکھوں کو پھوڑ دو جلال!“ وہ نشے سے سرشار لہجے میں گنگنائی۔ ”میں نے تمہیں بڑی آزمائشوں کے بعد پایا ہے۔ وقت ظالم ہوتا ہے اس پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔“

”درخشاں! ذرا دیکھو تو سہی یہ دونوں.....“ میں جکیب اور کیلاش کا نام لیتے لیتے یکلخت سنبھل گیا، اوریگا نے مجھے تاکید کی تھی کہ میں خود سے اسے بیتی ہوئی باتیں یاد دلانے کی کوشش نہ کروں۔ میں نے جلدی سے جملے کی ساخت کو بدل دیا۔ ”دیکھو تو سہی، یہ کون لوگ ہیں؟“ [illegible]

”ہمارے [illegible] دشمن ہوں گے جو ہمیں [illegible] جُدا کرنا چاہتے ہوں گے لیکن اب یہ ایسا نہیں کر سکیں گے [illegible] سرسراتی آواز میں کہا۔ ”تمہاری درخشاں اب قیامت تک تمہارے ساتھ رہے گی۔“

”گھبراؤ نہیں میری رُوح! اب ہمارے دشمن ہمیں زِچ نہیں

کرسکیں گے۔"

"پھر، وہ کون ہیں جو ہمیں اور ہماری محبت کو نظر لگائے ہیں؟"

"یہ ہمارے دوست ہیں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

دوست کے نام پر وہ چونکی۔ پلٹ کر اس نے جیکب اور کیلاش کو دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں اجنبیت کا احساس دیکھ کر میرے دل کو ایک دھچکا لگا۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ میرے ساتھیوں، میرے دیرینہ دوستوں کو نہیں پہچان سکی لیکن درخشاں کی وہ کیفیت زیادہ دیر برقرار نہیں رہی۔ اس کے یاقوتی ہونٹوں پر زندگی سے بھرپور تبسم ابھر آیا۔ اس نے کیلاش کو بغور دیکھتے ہوئے بڑے پیار سے کہا۔

"کیلاش جی! آپ...."

"مجھے خوشی ہے کہ آپ نے مجھے پہچان لیا ورنہ مجھے اپنی شناخت کے لیے...." کیلاش نے اپنا جملہ نامکمل چھوڑ کر جیکب کی سمت دیکھا تو درخشاں کی نظر بھی ادھر اٹھ گئی۔ ایک پل کو وہ سنجیدہ ہو گئی پھر بولی۔

"جیکب بھائی! مجھے آپ سے دوبارہ مل کر بے حد خوشی ہوئی۔"

"ذرہ نوازی ہے آپ کی ورنہ...."

"یہ بقول بھلا کس کھیت کی مولی ہے۔" کیلاش نے جیکب کا جملہ مکمل کیا۔

"مجھے یاد آ گیا۔" درخشاں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ نے ایک بار جیکب بھائی کو شتر بے مہار کا نام بھی دیا تھا۔"

"آپ کی یادداشت قابل داد ہے۔" کیلاش نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔

"آپ اپنی سنائیے کیلاش جی! آپ نے کسی کو اپنا جیون ساتھی بنایا یا ابھی تک مریضوں ہی میں زندگی گزر رہی ہے؟"

"آپ کا کیا خیال ہے؟"

"مجھے یقین ہے کہ آپ نے ابھی تک شادی نہیں کی۔" درخشاں نے کہا۔ "بقول جیکب بھائی کے آپ ابھی تک لنڈورے سرجن بنے ہوئے ہیں۔"

"یہ ہوئی نا بات۔" جیکب بولا۔

میں حیرت سے درخشاں کو دیکھتا رہا۔ وہ ماضی کی باتوں کو اس طرح دہرا رہی تھی جیسے کل ہی کی بات ہو۔ اندریگا نے یہی کہا تھا کہ اس نے درخشاں کے لاشعور میں ماضی کو سمو دیا ہے اور مجھے خوشی تھی کہ اس کی یادداشت واپس لوٹ رہی تھی۔ مجھے اندریگا کی کہی ہوئی پراسرار باتیں یاد آنے لگیں چنانچہ میں نے درخشاں کو آزمانے کے لیے اور فرینیا کی زبان میں مخاطب کیا۔ پہلی بار اس نے مجھے حیرت سے دیکھا پھر تعجب سے بولی۔

"یہ.... یہ تم کون سی زبان بول رہے ہو؟"

میں نے اسے بغور دیکھا۔ اندریگا نے کہا تھا کہ درخشاں دنیا کی بیشتر زبانوں پر عبور رکھتی ہے۔ اس نے اپنا تمام علم اور قوتوں کے تمام خزانے درخشاں کے سینے میں اتار دیے تھے لیکن درخشاں کے چہرے کی معصومیت بتا رہی تھی کہ اندریگا نے جو کہا تھا وہ جھوٹ تھا۔ میں بڑی سنجیدگی سے سوچنے لگا۔ اندریگا نے اتنا بڑا جھوٹ کیوں بولا؟

"تم کیا سوچ رہے ہو؟" درخشاں نے دوبارہ مجھے مخاطب کیا۔ "مجھے بتاؤ جمال! ابھی تم کیا کہہ رہے تھے؟"

"یہ آپ پر اپنی قابلیت کا سکہ جمانے کی کوشش کر رہے ہیں۔" جیکب نے بھونڈے انداز میں بات بنانے کی کوشش کی۔

"بھابی! کیا آپ وشواس کر سکتی ہیں کہ انسان اپنا شریر چھوڑ کر کہیں جا سکتا ہے؟" کیلاش نے سنجیدگی سے سوال کیا تو درخشاں گڑبڑا گئی۔

"کیلاش جی! یہ.... یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟" درخشاں نے حیرت سے کہا پھر چونک کر ماحول پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے بولی۔ "یہ.... یہ ہم لوگ کہاں ہیں؟ کیا یہ بھی ہماری جاگیر کا کوئی حصہ ہے؟"

میں اور کیلاش ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگے۔

"جیکب بھائی! آپ بتائیے، ہم یہاں کیسے آ گئے اور ہماری سلویا بھابی.... لل.... لیکن شاید وہ...." درخشاں کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئی پھر معذرت طلب لہجے میں بولی۔ "میں معافی چاہتی ہوں، میں بھول گئی تھی کہ میری سہیلی خدا کو پیاری ہو چکی ہے۔"

"آپ ابھی اس جگہ کے بارے میں دریافت کر رہی تھیں؟" کیلاش نے نہایت سنجیدگی سے درخشاں کو مخاطب کیا تو وہ چونک اٹھی۔ حیرت بھری نظروں سے اطراف کا جائزہ لیتی رہی پھر میری نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر معصومیت سے بولی۔

"کیوں جمال! یہ کون سی جگہ ہے؟ ہم یہاں کب آئے؟"

"ڈاکٹروں نے تمہیں آرام کا مشورہ دیا تھا۔" میں نے درخشاں کی ذہنی حالت کو محسوس کرتے ہوئے جلدی سے کہا۔ "تبدیلی آب و ہوا تمہاری صحت کے لیے ضروری تھی اس لیے ہم یہاں آ گئے۔"

"اس مقام کا نام کیا ہے؟ کوئی پہاڑی علاقہ دکھائی دیتا ہے لیکن یہاں آبادی نظر نہیں آ رہی ہے۔" درخشاں نے الجھتے ہوئے کہا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اپنی بھولی بسری یادداشت کو کریدنے کی کوشش کر رہی ہو۔ میں نے اسے باتوں میں بہلانے کی کوشش کی لیکن کیلاش نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا پھر درخشاں کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے ٹھوس آواز میں بولا۔

"یہ علاقہ بھوری پہاڑیوں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور یہاں اوریگا کے سوا کوئی نہیں رہتا۔"

"او...رِی...گا۔" درخشاں نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ کیلاش کی جانب دیکھتے ہوئے خوابیدہ لہجے میں بولی۔ "ہاں... ہاں، مجھے یاد آرہا ہے۔ میں اسپتال میں تھی۔ نہیں... تم نے حویلی کے اندر ہی انتظامات کر لیے تھے۔ میں... میں ماں بننے والی تھی لیکن میرا کیس بگڑ گیا۔ تم نے ہنگامی طور پر آپریشن کر کے مجھے بچانے کی کوشش کی لیکن... میں شاید بیہوش ہوگئی تھی۔ پھر... مجھے ہوش آیا تو وہ... وہ میرے قریب کھڑا تھا۔ اس نے مجھے اپنا نام اوریگا ہی بتایا تھا۔ وہ طویل القامت بوڑھا جس کے سر اور داڑھی کے بال روئی کے گالے کی طرح سفید اور نرم تھے مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ میں نے انکار کرنے کی کوشش کی، مگر اس کی آنکھوں کی کشش نے میری زبان گنگ کر دی۔ پھر وہ مجھے بچوں کی طرح ہاتھوں میں اٹھا کر فضا میں پرواز کرنے لگا۔ اور... اور اس کے بعد کیا ہوا... کیا ہوا تھا اس کے بعد...؟ مم... میں...."

درخشاں اپنا جملہ مکمل نہ کر سکی۔ اگر میں نے لپک کر اسے ہاتھوں میں نہ سنبھالا ہوتا تو شاید وہ تیورا کر سنگلاخ زمین پر گر گئی ہوتی۔ جیکب نے سہم کر اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنانا شروع کر دیا۔ کیلاش نے میرا ہاتھ بٹایا اور درخشاں کو زمین پر لٹا دیا۔ میری حالت دیوانوں جیسی ہورہی تھی۔ میں نے کیلاش کو گھور کر شکایت آمیز نگاہوں میں دیکھا۔

"میں جانتا ہوں میرے دوست! تم مجھ سے خفا ہو۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ "مجھے شاید اوریگا کا نام نہیں لینا چاہیے تھا لیکن میں نے جو کچھ کیا وہ نفسیاتی طریقۂ علاج ہے۔ میں تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ وقت نے ہمیں کن حالات سے دوچار کر رکھا ہے۔"

"اب تمہارا کیا خیال ہے؟" میں نے نفرت سے ہونٹ چباتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تمہیں ابھی تک یقین نہیں آیا کہ قدرت نے رحم کھا کر درخشاں کو میری جھولی میں واپس ڈال دیا ہے؟"

"ہمت سے کام لو جمال! ابھی ہمیں اپنی کامیابی کے سلسلے میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔"

"یہ... شاید بیہوشی کی کیفیت سے دوچار ہیں۔" جیکب نے بمشکل کیلاش سے کہا۔ "کیا تم انھیں ہوش میں لانے کی کوئی تدبیر اختیار نہیں کرو گے؟"

"نہیں۔" کیلاش نے ٹھوس اور سرد لہجے میں جواب دیا۔ "یہ فرض بھی اوریگا کی روح کو ادا کرنا ہوگا۔"

میں نے کیلاش کے جواب پر اسے حقارت بھری نظروں سے گھورا پھر کچھ سوچ کر اپنے ہونٹ سختی سے دانتوں تلے بھینچ لیے۔ درخشاں کے چہرے پر نگاہیں جمادیں جو کھلے آسمان کے نیچے سنگلاخ فرش پر بے سُدھ پڑی تھی۔

"جمال! کیا میں پانی لاؤں؟" جیکب نے میری دلجوئی کی خاطر کہا۔ "منہ پر پانی کے چھینٹے دینے سے....."

"کیا تم اپنی زبان کچھ دیر کے لیے بند نہیں رکھ سکتے؟" کیلاش نے کرخت آواز میں جیکب کو مخاطب کیا۔

"تم کیسے نامعقول مرحن ہو۔ ایک مریضہ تمہاری نگاہوں کے سامنے بیہوش پڑی ہے اور تم مُدریکولا جیسے انداز میں ہمیں آنکھیں دکھا رہے ہو۔ مقدس باپ اپنا سایہ ہمارے سروں پر قائم رکھے اگر درخشاں بھابی کو..."

"کچھ نہیں ہوگا فادر جیکب! کیلاش سپاٹ آواز میں بولا۔ "کیا تمہیں یاد نہیں رہا کہ اوریگا نے آسمانوں کی سمت پرواز کرنے سے پیشتر کیا کہا تھا؟ اس نے کہا تھا کہ درخشاں نے دیوتاؤں کا وہ خاص مشروب پی لیا ہے جو اسے زندہ رکھے گا۔"

"کیلاش!" میں نے چونک کر اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔ "تم... کیا کہنا چاہ رہے ہو؟"

"میں اوریگا کی بات کی تصدیق کرنا چاہتا ہوں۔ ہاں جمال!" کیلاش نے میرا شانہ تھپ تھپاتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ "میں نے تمہاری درخشاں کو شدید ذہنی جھٹکا پہنچانے کا ایک طریقہ آزمایا ہے۔ اگر اوریگا کی پُراسرار قوت نے اسے دوبارہ نارمل کر دیا تو میں اسے درخشاں بھابی کی حیثیت سے قبول کرلوں گا۔"

"خدا کی قسم، جو کچھ ہو رہا ہے وہ کم از کم میری سمجھ سے بالاتر ہے۔" جیکب بولا۔

"میں ایک بار پھر تمہیں خاموش رہنے کا نیک مشورہ دوں گا۔" کیلاش نے نرمی سے جیکب سے کہا پھر ہاتھ بڑھا کر درخشاں کی نبض دیکھنے لگا۔ میں خاموش بیٹھا سرجن کیلاش کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا۔ درخشاں کی بیہوشی اور کیلاش کی باتوں نے مجھے بُری طرح الجھا دیا تھا۔

"کیوں؟" کیلاش نبض کا معائنہ کر چکا تو میں نے قدرے خشک آواز میں دریافت کیا۔ "بحیثیت ڈاکٹر کے تمہارا کیا خیال ہے؟"

"دل اور نبض کی رفتار بالکل نارمل ہے اور...."

"کیلاش!" میں نے اُسے بولنے کا موقع نہیں دیا۔ "تمہیں مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔"

"کیا؟"

"اگر میری درخشاں کو ہوش آگیا تو تم آئندہ اس کے بارے میں کوئی شک نہیں کرو گے۔"

"جمال! تم...."

"اگر درخشاں کی جُدائی میرا مقدر ہے تو میں وعدہ کرتا ہوں

کہ تم سے کوئی شکوہ نہیں کروں گا۔" میں جذباتی ہو گیا۔" دوسری صورت میں تم میرے معاملے کے درمیان نہیں آؤ گے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ جیسا تم چاہتے ہو ویسا ہی ہو گا۔" کیلاش نے سنجیدگی سے میری بات مان لی۔

جیکب بدستور تصویرِ حیرت بنا درخشاں کو دیکھتا رہا لیکن جب تقریباً آدھے گھنٹے بعد درخشاں نے دوبارہ آنکھیں کھول دیں تو میرے علاوہ جیکب کے چہرے پر بھی خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ کیلاش بدستور سنجیدہ رہا۔

"جمال!" درخشاں نے مجھے دیکھتے ہوئے بڑی معصومیت سے پوچھا۔" تم مجھے چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے؟"

"کہیں بھی نہیں۔" میں نے تیزی سے کہا۔" ایک پل کے لیے بھی تمہارے قریب سے دور نہیں ہوا۔"

کیلاش نے جیکب کو ساتھ آنے کا اشارہ کیا پھر چہل قدمی کے انداز میں قدم بڑھاتا ہوا ساحل کی جانب چلا گیا۔ جیکب نے ہونقوں کی طرح منہ کھول کر اس کی تقلید کی تھی۔ پھر جب ہم تنہا رہ گئے تو درخشاں نے بڑی رازداری سے کہا۔

"جمال! تم آئندہ میری خاطر اپنے دوستوں سے کبھی کوئی تکرار نہ کرنا۔"

"درخشاں!" میں چونک اٹھا۔"کیا تم؟...."

"ہاں جمال! میں تم لوگوں کی باتیں سن رہی تھی۔ کیلاش کو قائل کرنے کی خاطر میں نے اپنی بیہوشی کا ناٹک رچایا تھا۔ اگر ایسا نہ کرتی تو تمہارے عزیز دوستوں کو میرے وجود پر کبھی یقین نہ آتا۔"

درخشاں نے مجھے ایسی سحر انگیز نگاہوں سے دیکھا کہ میں اُن کی مقناطیسی کشش میں ڈوب کر رہ گیا۔ مسرت کی ایک لہر پوری شدت سے میرے وجود سے ٹکرائی۔

❁

درخشاں کو دوبارہ حاصل کر لینے کے بعد مجھے کسی سود و زیاں کا احساس باقی نہ رہا۔ میں نے اپنے ماضی کو یکسر فراموش کر دینے کی کوشش کی۔ اپنی جاگیر کے بارے میں مجھے اطمینان تھا کہ جب تک دیوان جی کی سانس باقی ہے جاگیر کے معاملات اسی طرح چلتے رہیں گے جس طرح میں انہیں چھوڑ کر آیا تھا۔

رہے میرے عزیز و اقارب تو میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ کوئی میرا سگا قریبی رشتے دار ایسا نہیں تھا جو میری موت پر بیٹھ کر آنسو بہاتا یا میری خوشیوں پر کسی مسرت کا اظہار کرتا۔ البتہ میری موت پر اُنہیں خوشی ضرور ہوتی اس لیے کہ میرے بعد وہی میری جائداد کے وارث ہوتے۔ قبلہ والد صاحب کی موت کے بعد بھی میرے اُن سوتیلے بھائی بندوں نے میرے قریب آنے کی کوشش کی تھی۔ میرے لیے کئی لڑکیوں کے رشتے آئے لیکن میں نے ان سب کو رد کر دیا۔ میں جانتا تھا کہ ان رشتوں کے پیچھے لالچ اور خود غرضی کارفرما تھی۔ وہ مجھ سے ناتا جوڑ کر میری جائداد کے حقدار بننا چاہتے تھے لیکن جب میں نے ان سب کی طرف سے منہ پھیر کر درخشاں کو اپنایا تو اُن کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔

میری شادی کے بعد سانپ کی طرح کنڈلی مارے ہوئے میرے سوتیلے رشتے دار کچھ دنوں تک اپنا سر پٹختے رہے پھر خاموش ہو گئے لیکن میں جانتا تھا کہ وہ میری موت کے خواہاں ہیں۔ ان کو میری ذات سے نہیں، میری کروڑوں کی جائداد سے پیار تھا۔ وہ مجھ سے بے خبر نہیں تھے۔ میری موت کے انتظار میں گھات لگائے بیٹھے تھے۔

میرے ماضی میں دھرا بھی کیا تھا جس کی سمت میں پلٹ کر دیکھتا۔ ایک درخشاں تھی جو کچھ عرصے کے لیے مجھ سے جُدا ہو کر دوبارہ مل گئی تھی۔ میری زندگی میں اس کے سوا اور کیا باقی رہ گیا تھا۔ دولت کی مجھے کوئی کمی نہیں تھی۔ میں نے بحری سفر پر روانگی سے پیشتر کیلاش کے مفید اور نیک مشورے پر جاگیر کی دیکھ بھال اور کسی وقتی ضرورت کے پیشِ نظر آٹھ دس لاکھ روپے مقامی بینک میں چھوڑ دیے۔ باقی تمام روپیہ دنیا کے مختلف بینکوں میں منتقل کر دیا جو اب میرے کام آ سکتا تھا۔ میں درخشاں کو لے کر کسی بھی ملک میں نہایت آرام و سکون سے رہ سکتا تھا۔ میں نے سوچا بھی یہی تھا کہ اب اپنی جاگیر کی طرف بھول کر بھی رُخ نہ کروں گا۔ صرف اپنے دیرینہ اور وفادار خادم دیوان جی کو اپنی زندگی سے باخبر کر دوں گا لیکن کسی اور کو مطلق یہ اطلاع نہیں ہونے دوں گا کہ میں زندہ ہوں۔

میری جاگیر میں ابھی میری زندگی کے بہت سے دشمن موجود تھے۔ پریم ناتھ جو درخشاں (کاجل) کا باپ تھا اور اس کے ساتھی جنہوں نے میری شادی کو اپنی مذہبی انا کا مسئلہ بنا لیا تھا وہ سب میرے دشمن تھے۔ ایسے بزدل مگر خطرناک دشمن جو یا تو پشت سے وار کرنے کے عادی تھے یا دوست بن کر مجھے زہر کا جام دینے کو ہر لمحہ تیار رہتے تھے۔

غرضیکہ درخشاں کے حصول نے مجھے زندگی کے تمام خساروں سے بے نیاز کر دیا۔ میری زندگی کے بہترین ساتھی میرے دوست جیکب اور کیلاش میرے ساتھ تھے۔ انہوں نے دکھ درد اور پریشانیوں میں میرا ساتھ دیا تھا۔ میں نے طے کر لیا کہ انہیں بھی اپنی خوشیوں میں برابر کا حصے دار بنائے رکھوں گا۔ درخشاں بھی مجھے پا کر بے حد مسرور تھی۔ شاید اس نے بھی اپنے ماضی کو یکسر فراموش کر دیا تھا لیکن اکثر ہنستے ہنستے وہ یوں خاموش ہو کر خلاؤں میں گھورنے لگتی جیسے کسی آنے والے طوفان کا اندازہ لگا رہی ہو یا اپنے گم گشتہ ماضی کو تلاش کرنے کی کوششوں میں مصروف ہو۔

اوریگا نے مجھ سے یہی کہا تھا کہ اس نے درخشاں کے ماضی کو اس کے شعور سے نکال کر لاشعور میں محفوظ کردیا ہے۔ شاید وہ اکثر اپنے لاشعور کو کریدنے کی سعی میں شعوری طور پر کچھ دیر کے لیے بالکل گم صم ہوجایا کرتی تھی۔ میرے علاوہ کیلاش نے بھی اس کی خاموشی اور کھوئے کھوئے انداز کو بڑی شدت سے محسوس کیا لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر تک برقرار نہیں رہتی تھی۔ چند لمحوں کے لیے وہ اپنے خیالوں میں محو ہوجاتی مگر پھر فوراً ہی چونک کر دوبارہ ہنسنے بولنے میں یوں مصروف ہوجاتی جیسے اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہو۔

ایک مسلمان ہونے کے ناتے درخشاں کی موت کو میں نے بھی تسلیم کرلیا تھا۔ کیلاش ہندو ہونے کے باوجود آواگون کے عقیدے پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ جیکب خالصتاً مذہبی آدمی تھا، لیکن اس کے باوجود ہم نے درخشاں کے وجود کو قبول کرلیا تھا۔ اس لیے کہ وہ خود اپنے خواب کی تعبیر بن کر ہماری نگاہوں کے سامنے موجود تھی۔ اس کی صورت شکل، چال ڈھال، عادت و اطوار اور طور طریقے کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا جو ہمیں کسی شبہے میں مبتلا کرنے کی خاطر ہمارے شکوک کو تقویت دیتا۔ میرا خیال تھا، جیکب، درخشاں کو زندہ قبول کرنے میں سب سے زیادہ پس و پیش کرے گا لیکن میرے اندازے کے برخلاف اس نے سب سے پہلے درخشاں کے وجود کو قبول کرلیا اور بہت جلد اس سے گھل مل گیا۔ بظاہر کیلاش نے بھی اپنے انداز میں کوئی ایسی نمایاں تبدیلی نہیں پیدا کی جو میں اس کے بارے میں کچھ سوچتا لیکن میں نے یہ بات اکثر محسوس کی کہ درخشاں کی طرح کیلاش بھی کبھی کبھی نہ جانے کن خیالوں میں غرق ہوجایا کرتا تھا۔ میں اسے ہمیشہ فطری عمل سمجھ کر فراموش کرجاتا۔

درخشاں کے مل جانے کے بعد ہماری جدوجہد میں وقتی طور پر ایک ٹھہراؤ آگیا، ایک جمود پیدا ہوگیا۔ جیکب کا خیال تھا کہ اب ہمیں مہذب دنیا کے بارے میں سوچنا ترک کردینا چاہیے اور اسی جزیرے میں ہی بود و باش اختیار کرلینا چاہیے۔ کیلاش ایسے موقعوں پر جیکب سے الجھ پڑتا، مجھے بھی یقین تھا کہ ہم جس طرح اچانک ایک حادثے سے دوچار ہوکر اس گمنام جزیرے تک پہنچ گئے اسی طرح کوئی دوسرا اچانک حادثہ ہمیں ان علاقوں سے نجات بھی دلادے گا۔ اوریگا نے بھی موت سے پیشتر اس بات کی پیشگوئی کی تھی کہ ہم دوبارہ مہذب دنیا میں واپس لوٹ جائیں گے اور ہوا بھی یہی لیکن قبل اس کے میں مجبوری پہاڑیوں سے اپنی واپسی کا احوال بیان کروں، ان گھنے جنگلوں کے بھی کچھ واقعات مختصراً قلم بند کرنا چاہتا ہوں جن کا ذکر سب سے پیشتر جیبنی نے کیا تھا۔

میں نے اپنے ساتھیوں سے جنگل کی سیر کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو کیلاش اور درخشاں نے فوراً اپنی آمادگی کا اظہار کردیا لیکن جیکب اس بات کے خلاف تھا کہ ہم جان بوجھ کر خود کو خطرات کے حوالے کریں۔ چنانچہ الجھتے ہوئے بولا۔

”آخر تمہیں بیٹھے بٹھائے ان گھنے جنگلوں کا خیال کیوں آگیا؟“ جیکب نے الجھتے ہوئے کہا۔

”اس لیے کہ انسان ایک جگہ بے کار بیٹھے بیٹھے اُکتا جاتا ہے۔ یکسوئی کا شکار ہونے لگتا ہے۔“ میں نے دلیل پیش کی۔

”مانے لیتا ہوں، لیکن گھنے جنگل ہی کیوں؟ ہم پہاڑی کے اوپر جاکر ان کھنڈرات کی بھی سیر کرسکتے ہیں جو آج بھی صدیوں پرانی تاریخ دہراتے نظر آتے ہیں۔“

”اور اگر میں یہ کہوں کہ ہمیں تاریخ سے زیادہ جغرافیے سے لگاؤ ہے تو؟“ کیلاش نے کہا۔ ”سمجھ میں نہیں آتا کہ جنگل کے نام پر تمہاری رُوح کیوں فنا ہونے لگتی ہے؟ ہم ایک بار پہلے بھی اس کے قریب سے ہوکر گزر چکے ہیں۔“

”اسی لیے تو اب دور دور رہنے کا مشورہ دے رہا ہوں۔“ جیکب سنجیدگی سے بولا۔ ”دشمن اگر سامنے ہو تو انسان اپنے بچاؤ کے لیے کچھ کرسکتا ہے۔ اور کچھ نہیں تو مقابلے کا خیال ترک کرکے راہ فرار ہی اختیار کرسکتا ہے لیکن گھنے جنگل کا وہ حصہ بالکل برعکس ہوتا ہے۔ ہم چلے جارہے ہیں نظر اٹھائے آسمان پر اڑتے بادلوں کا نظارہ کرتے ہوئے اور نیچے سے کسی حشرات الارض کے قبیلے کے کسی زہریلے باشندے نے سرسراتے ہوئے خیریت دریافت کرلی تو گئے کام سے۔ بھاگنے کا راستہ بھی نہیں ملتا اور لوگوں کو موت کا علم بھی اس وقت ہوتا ہے جب لاش سے تعفن پھوٹنے لگے۔“

”میں، کیلاش اور درخشاں بھی تمہارے ساتھ ہوں گے۔“ میں نے کہا۔

”میں جانتا ہوں لیکن....“

”تم نرے احمق اور گاؤدی ہو۔“ کیلاش بولا۔ ”کیا ضروری ہے کہ موت ان گھنے جنگلوں میں صرف تمہارے انتظار میں بیٹھی ہوگی؟“

”نہ سہی لیکن میں دیدہ و دانستہ خطرے میں کودنے کو تیار نہیں۔ تم کیوں نہیں چلے جاتے جہاں اور درخشاں بھابی کے ساتھ؟“

”اور تم یہاں اکیلے بیٹھ کر کیا مکھیاں مارو گے؟“

”مکھیاں مارنے میں اگر زندگی کی ضمانت ہو جیسے ہو تو مجھے یہ بھی منظور ہے۔“

”سمجھنے کی کوشش کرو فادر جیکب!“ کیلاش نے اسے آمادہ کرنے کی خاطر کہا۔ ”اکیلا آدمی کسی شادی شدہ جوڑے کے درمیان ایسا ہی سمجھا جاتا ہے جیسے کباب میں ہڈی۔ تم ساتھ ہوگے

تو یہ محاورہ مجھے شرمندہ نہیں کرے گا۔"

"تم خواہ کچھ بھی کہو لیکن میں گھنے جنگلوں کی سمت نہیں جاؤں گا۔" جیکب اپنے فیصلے پر اڑا رہا۔

"بہت ڈھیٹ معلوم ہوتے ہو۔"

"اور بھی جو منہ میں آئے بک ڈالو، میں برا نہیں مانوں گا۔"

"ٹھیک ہے تم یہیں بیٹھے رہو۔ ہم کچھ دیر تک سیر کرنے کے بعد واپس آجائیں گے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ درخشاں بھی مسکراتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوگئی۔ جیکب اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا، کیلاش ابھی تک اسے غضبناک نظروں سے گھورے جا رہا تھا۔

"کیا تم شرافت سے نہیں اٹھو گے؟"

"نہیں۔" جیکب فیصلہ کن انداز میں بولا۔

"پھر میں بھی تمہارے ساتھ رہوں گا۔" کیلاش نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں اب سمجھ گیا کہ تم یہاں سے جانا کیوں نہیں چاہتے۔"

"کوئی حماقت سوجھی ہوگی۔"

"حماقت نہیں، بہت دور کی سوجھی ہے۔ تم شاید یہاں بیٹھ کر سمندر کی بے چین لہروں میں روپا کی بے تاب روح کو تلاش کرنے کی کوشش کرو گے یا پھر تمہارا خیال ہے کہ ہمارے جانے کے بعد سادھی کی روح تمہارا دل بہلانے کے لیے آجائے گی۔"

جیکب کسی طور ہمارے ساتھ چلنے کو آمادہ نہ ہوا تو کیلاش نے بھی معذرت کرلی۔ وہ شاید اخلاقی طور پر ہماری تنہائیوں میں مخل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ میں نے زیادہ اصرار نہیں کیا اور درخشاں کے ساتھ قدم اٹھانے لگا۔ ٹامی چند قدم ہمارے ساتھ آیا پھر وہ بھی دم ہلاتا ہوا واپس لوٹ گیا۔

درخشاں بے حد مسرور نظر آرہی تھی۔ ایک طویل عرصے بعد تنہائی ملی تھی۔ ہم باتیں کرتے، ایک دوسرے کو چھیڑتے جنگل میں داخل ہوگئے۔ وہاں سوائے ویرانیوں کے اور کچھ نہ تھا۔ ہر سمت گہرا سکوت نظر آتا تھا۔ ہم گھنے جنگل میں دور تک چلے گئے لیکن نہ تو ہمیں کوئی بندہ بشر ملا نہ ہی کسی حشرات الارض کا وجود نظر آیا۔ اس خیال سے کہ کہیں ہم راستہ نہ بھٹک جائیں میں نے واپسی کا ارادہ ظاہر کیا تو درخشاں نے نہایت معصومیت سے پوچھا۔ "کیا تمہارا دل اتنی جلدی بھر گیا؟"

"... درخشاں ... نہ کہو ..."

"تم یہاں کیا دیکھنے آئے تھے ہم ..."

"... نے کہا تھا کہ اس گھنے جنگل میں ..." میں نے جملہ مکمل نہیں کیا۔ مجھے فوری طور پر اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ درخشاں کی موجودگی میں مجھے ان باتوں کا ذکر نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں نے بات بنانے کی کوشش کی۔ درخشاں کی سمت دیکھا لیکن وہ دوسری طرف متوجہ تھی۔ شاید اس نے میرا جملہ بھی نہیں سنا تھا، نہ جانے کن خیالوں میں مستغرق ہوگئی تھی۔ یہ کیفیت اس پر اکثر طاری ہو جاتی تھی۔

"درخشاں! میری زندگی! تم کن خیالوں میں گم ہو؟"

میری آواز سن کر وہ چونکی پھر سہمے ہوئے انداز میں میرے قریب آتے ہوئے بولی۔ "جمال! مجھے ایسی آوازیں سنائی دے رہی ہیں جیسے یہاں بہت سارے لوگ رو رہے ہوں۔ یہ .... یہ کون لوگ ہیں جو نظر نہیں آرہے ہیں۔ یہ .... یہ آوازیں کس قسم کی ہیں؟"

"یہ سب تمہارا وہم ہے۔" میں نے چاروں طرف گھنی جھاڑیوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہاں ہمارے سوا اور کوئی نہیں۔"

"کوئی نہیں ہے تو پھر یہ رونے دھونے کی آوازیں ؟"

درخشاں نہ جانے کس نادیدہ خوف سے کانپ رہی تھی۔

میں فوراً ہی واپسی کے خیال سے پلٹا لیکن اسی لمحے مجھے رفیقی کی بات کا خیال آگیا۔ اس نے کہا تھا کہ میں کبھی کبھی انگوٹھی چوم لیا کروں۔ کسی فوری جذبے کے تحت میں نے اپنا سیدھا ہاتھ بلند کیا اور لکڑی کی انگشتری کو نہایت عقیدت سے چوم لیا اور تب میری آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنا شروع کردیا۔

ہم جہاں کھڑے تھے وہاں چاروں طرف بلند عمارتوں کے کھنڈرات نظر آرہے تھے۔ کبھی وہ جگہ یقیناً ایک خوبصورت شہر کی طرح آباد رہی ہوگی لیکن اب وہاں ہر سمت ویرانی کا راج تھا۔

منہدم دیواروں اور ستونوں کے انبار نظر آرہے تھے۔ میں نے درخشاں کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھنا شروع کیا۔ ابھی ہم نے چند قدم کا فاصلہ طے کیا تھا کہ میرے کانوں میں بھی رونے دھونے کی آوازیں آنا شروع ہوگئیں۔ میں نے برق رفتاری سے پلٹ کر دیکھا۔ ہم اس وقت کسی وسیع عمارت کے شکستہ صحن میں ایک چبوترے کے سامنے کھڑے تھے۔ میں نے اس چبوترے کو غور سے دیکھا جس پر کسی عورت کا مجسمہ نصب تھا۔ اس مجسمے کا چہرہ حسن و جمال کا ایک حسین مرقع تھا جس پر تمکنت اور جاہ و جلال جھلک رہا تھا۔ اس کی حسین آنکھیں آسمان کی سمت اٹھی ہوئی تھیں اور تراشیدہ ہونٹ نیم وا نظر آرہے تھے۔ اس کے خدوخال اپنے اندر یقیناً بے پناہ کشش رکھتے ہوں گے جبھی اسے ایک خوبصورت لبادے کے اندر چھپا دیا گیا تھا۔ مجسمے کے دونوں ہاتھ فضا میں اوپر کی جانب بلند تھے۔ سیدھے ہاتھ میں سفید پتھر کا ایک نقشین پیالہ تھا اور اُلٹے ہاتھ میں بھی سیاہ رنگ کا ویسا ہی پیالہ موجود تھا۔

میں اس مجسمے کے حسن میں کھو گیا۔ ہر چند کہ وقت کے ہاتھوں نے اُسے جگہ جگہ سے میلا اور گرد آلود کر دیا تھا لیکن اس کے باوجود اس کے اندر ایسی کشش تھی جو میرے دل کو اپنی جانب کھینچ رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ محبت کی دیوی ہو۔

"درخشاں! کیا تم اس حسن کے خوبصورت مجسمے کو دیکھ رہی ہو؟ میرا خیال ہے کہ یہ مجسمہ اس بت کا فر کا ہوگا جو کبھی ان ویران کھنڈرات کی ہنستی بولتی آبادی کے دلوں پر راج کرتی ہوگی۔ ممکن ہے یہاں کی ملکہ ہی ہو۔"

"تم نے غلط نتیجہ اخذ کیا ہے جمال!" درخشاں نے سپاٹ آواز میں جواب دیا۔ "تم جسے محبت کی دیوی سمجھ رہے ہو وہ زندگی کی علامتوں کی ایک نایاب جھلک ہے۔ اسے غور سے دیکھو، سمجھنے کی کوشش کرو تو تمام حقیقت واضح ہو جائے گی۔ اس کے جسم کو ڈھانپنے سے یہ مراد ہے کہ ہم ہمیشہ زندگی کا صرف چہرہ دیکھتے ہیں، بقیہ حصہ ہماری نظروں سے اوجھل اور پوشیدہ رہتا ہے۔ اس کے ہاتھ اس لیے نمایاں اور آسمان کی جانب بلند ہیں کہ زندگی حرکت اور حقیقت کا تصور پیش کرتی ہے اور انسان کو اس بات کی طرف راغب کرتی ہے کہ جو کچھ طلب کرنا ہو اپنے خدا سے ہاتھ پھیلا کر طلب کرو۔"

"اور یہ سفید و سیاہ پیالے کس بات کی ترجمانی کرتے ہیں؟"

"یہ نیکی اور بدی کے پیالے ہیں جو انسان کے اپنے ہاتھوں میں ہوتے ہیں۔ وہ جسے چاہے بھرے اور جسے چاہے خالی کرے۔" درخشاں نے بدستور خوابیدہ لہجے میں کہا۔ "یہ نظریں جو آسمان کی جانب مرکوز ہیں انسان کو اس حقیقت سے آگاہ کرتی ہیں کہ حقیقی منزل دنیا میں نہیں ہے۔"

میں نے درخشاں کی جانب غور سے دیکھا۔ اس کی نظریں بدستور مجسمے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ پھر کسی خیال میں گم ہوگئی تھی۔ میں نے اسے ہوش میں لانے کی کوشش کی لیکن رونے دھونے کی آوازیں یکلخت تیز ہوگئیں۔ میں نے ان آوازوں کو توجہ سے سنا پھر قدم آگے بڑھا دیے۔ زندگی کے مجسمے کے عقب میں بے شمار ننگ دھڑنگ اور طویل العمر بوڑھے حلقہ بنائے بیٹھے بین کر رہے تھے۔ وہ بڑے دراز قد نظر آتے تھے اور ان کی عمروں کا اندازہ ان کے چہروں کی جھریوں سے لگایا جا سکتا تھا جس کے اندر نجانے کتنے اسرار نہاں تھے۔ میں جھجکے بغیر اُن کے قریب چلا گیا۔ ان کے درمیان آگ روشن تھی۔ انہوں نے میری جانب کوئی توجہ نہیں دی۔ گردن جھکائے بیٹھے بین کرنے میں مصروف رہے۔ میں نے کچھ سوچ کر انہیں اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ ان سے رونے دھونے کا سبب دریافت کیا لیکن شاید وہ گونگے، بہرے اور اندھے تھے جو نہ مجھے دیکھ سکتے تھے نہ میری آواز سن رہے تھے۔ میری الجھن میں اضافہ ہونے لگا۔ میں نے درخشاں کی جانب دیکھا۔ وہ خالی خالی نظروں سے ان بوڑھوں کی سمت دیکھ رہی تھی۔

"درخشاں! یہ کون لوگ ہیں اور اس طرح کیوں بین کر رہے ہیں؟"

"ان کے سوگ کی وجہ تم ہو جمال!"

"میں؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں جمال! تم۔" درخشاں نے میری طرف کھوئے کھوئے انداز میں دیکھتے ہوئے سپاٹ آواز میں کہا۔ "یاد کرو، جینی نے تم سے کیا کہا تھا۔ یہ وہی طویل العمر جادوگر ہیں جو ایک طویل مدت سے اوریگا کی پوجا کرتے چلے آرہے ہیں۔ یہ اپنے علاقے میں امن اور سکون کے خواہاں تھے۔ انہوں نے اور وفینا قبیلے کے لوگوں کو خوفزدہ کر کے بھوری پہاڑیوں کی طرف آنے سے روک دیا۔ یہ چاہتے تو ان کی پلکوں کی ایک جنبش قبیلے کی تمام آبادی کو نیست و نابود کر سکتی تھی لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ لیکن تم نے..... تم نے ان کے ساتھی کو پتھر مار کر اُن کے دلوں کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ ہاں جمال! اوریگا ان کا ساتھی ہے۔ یہ چاہتے تو تمہیں بھی، مگر اوریگا کا حکم تھا کہ تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو کوئی گزند نہ پہنچے لہٰذا یہ خاموش ہوگئے اور اب یہ بد بو کے اوریگا سے فریاد کر رہے ہیں۔"

"اوریگا۔" میں نے اپنا نچلا ہونٹ چباتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"ہاں جمال! اوریگا امن اور طاقت کا سرچشمہ تھا لیکن تمہاری خاطر... صرف تمہاری خاطر...."

"میری خاطر کیا کیا اس نے؟" میں نے درخشاں کی پُراسرار

خاموشی سے الجھتے ہوئے دریافت کیا لیکن اب وہ میری سمت نہیں، طویل العمر بوڑھوں کی طرف دیکھ رہی تھی پھر اس نے انہیں بلند آواز میں مخاطب کیا۔ ”سے سیدیکا، باہوگاما، ابیش، ابیش!“

اور تب میں نے دیکھا کہ وہ معمر لوگ یکلخت خاموش ہو گئے۔ انہوں نے چونک کر درخشاں کی جانب دیکھا پھر جلدی سے دوزانوں ہو کر اپنے سر زمین پر ٹیک دیے۔ میں نے درخشاں کی سمت غور سے دیکھا۔ مجھے اس کی نگاہوں میں موت کے بھیانک سائے منڈلاتے نظر آرہے تھے۔ ان حسین آنکھوں میں زندگی کی ایک معمولی سی جھلک بھی نہیں تھی۔

”درخشاں!“ میں نے اُسے آواز دی لیکن اس نے میری آواز پر کوئی توجہ نہیں دی۔ ہاتھ بلند کیے انہیں دلاسہ دیتی رہی جو اس کے سامنے بار بار اپنے سر زمین پر پٹک رہے تھے۔

”درخشاں!“ میں پوری قوت سے چلایا پھر اس کا بازو تھام کر جھنجوڑنے لگا۔ میری تمام تر توجہ درخشاں کے چہرے پر مرکوز تھی۔ میں نے اُسے زور سے جھنجوڑا تو وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ اب ان آنکھوں میں زندگی کی تمام علامتیں موجود تھیں۔ وہ میری درخشاں کی نیلگوں اور حسین آنکھیں تھیں جو میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔

”کیا بات ہے جمال! تم کس بات سے خوفزدہ ہو کر چیخ رہے ہو؟“ اس نے بڑے پیار سے مجھے مخاطب کیا۔

”درخشاں! یہ سب ....“

میری آواز میرے حلق میں گھٹ کر رہ گئی، وہ منظر جو میری آنکھیں دیکھ رہی تھیں شاید کوئی بھیانک خواب تھا جو درخشاں کے چونکتے ہی میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ میں نے تیزی سے اطراف کا جائزہ لیا جہاں ہر سمت گھنی جھاڑیاں خاموشی سے سر اٹھائے کھڑی میری وحشت کا تماشا دیکھ رہی تھیں۔

”تم کیا محسوس کر رہے ہو جمال؟“ درخشاں نے میری بوکھلاہٹ کو محسوس کرتے ہوئے بڑی معصومیت اور لگاوٹ سے پوچھا۔ ”کیا بقول جیکب کے کسی حشرات الارض نے تمہیں خوفزدہ کر دیا؟“

”آں .... ہاں .... ہاں شاید ایسا ہی ہوا ہے۔“ میں نے جلدی سے اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے کہا پھر میں نے وہاں رُکنے کی حماقت نہیں کی۔ درخشاں کا ہاتھ تھام کر گھنے جنگل سے باہر آ گیا اور اس سمت قدم اٹھانے لگا جہاں غار کے دہانے پر جیکب اور کیلاش ہمارے منتظر تھے۔

آج بھی میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ بھوری پہاڑیوں کے گھنے جنگل میں میری نگاہوں نے جو کچھ دیکھا وہ خواب تھا یا حقیقت لیکن اس کے بعد میری زندگی میں جو حیرت انگیز واقعات رُونما ہوئے جن کا ذکر میں ترتیب وار کروں گا۔ اس کی روشنی میں شاید میرے قارئین اس بات کا بہتر طور پر اندازہ لگا سکیں کہ وہ سب کچھ کیا تھا؟ اور اب میں بھوری پہاڑیوں سے اپنی واپسی کے واقعات کی طرف آتا ہوں۔

❁

بھوری پہاڑی پر چاندنی رات کا وہ منظر بے حد حسین اور دلفریب تھا۔ اگر ہم نے وہاں کے علاقوں کی سیر پہلے سے نہ کر رکھی ہوتی تو میں اس رات کو یقیناً مہیب اور پُرہول کہتا اس لیے کہ چاندنی کے باوجود پہاڑی کے اُوپری حصّے کے کھنڈرات اور منہدم مینار بے حد پُراسرار اور بڑے بھیانک نظر آرہے تھے۔

اس رات کھانا کھانے کے بعد ہم نے حسبِ معمول ساحل تک چہل قدمی کی پھر واپس غار کے دہانے پر آ گئے اور لیٹ کر باتوں میں مصروف ہو گئے۔ ہمارے پاس بستر نما کوئی چیز نہیں تھی۔ اس لیے کہ ہمارا وزنی سامان جہاز کے نصف حصے پر رہ گیا تھا۔ بہرحال ہم نے درخشاں کے آرام کے پیشِ نظر کچھ لباس سنگلاخ چٹان پر ترتیب دے کر اس طرح اس پر چادر ڈال دی کہ وہ بستر کی شکل میں نظر آرہا تھا۔ ہمارے بے حد اصرار پر درخشاں نے اس پر لیٹنا منظور کیا ورنہ وہ بضد تھی کہ ہماری طرح وہ بھی ننگی چٹان پر بسیرا کرے گی۔

غرضیکہ وہ رات بے حد خوشگوار تھی۔ جھیل کے دوسری سمت سمندر واقع تھا جس کی سرکش موجیں ساحل سے ٹکرا ٹکرا کر بار بار عجیب سا شور پیدا کر رہی تھیں۔ ہمارے درمیان کچھ دیر اِدھر اُدھر کی گفتگو ہوتی رہی پھر جیکب نے درخشاں کو بے حد سنجیدگی سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا مجبور کرنے والی پراسرار طاقتوں سے ہماری واپسی ممکن ہو سکتی ہے؟“

”یہ سوال آپ مجھ سے کیوں کر رہے ہیں؟“ درخشاں معصومیت سے بولی۔ ”یہاں سے واپسی کے لیے بھلا میں کیا کر سکتی ہوں؟“

”کیوں نہیں کر سکتیں؟ مقدس اوریگا نے ہمیں بتایا تھا کہ اس نے تمام قوتیں آپ کو سونپ دی ہیں اور.....“

”اور کیا؟“ درخشاں نے تعجب سے پوچھا۔

”اور یہ کہ اوریگا کی طرح آپ بھی جسم کے بغیر فضا میں سفر کرنے کی طاقت رکھتی ہیں۔“

”آپ شاید اس وقت مذاق کے موڈ میں ہیں۔“ درخشاں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں اگر جسم کے بغیر فضا میں پرواز کرنے کی طاقت رکھتی تو سب سے پہلے آسمان کی بلندیوں پر جا کر اپنی سہیلی سلویا کو پکڑ لاتی۔“

کیلاش چونکہ جیکب کے برابر لیٹا ہوا تھا اس لیے سب سے پہلے اس نے جیکب کو تنبیہی نظروں سے گھورا۔ اوریگا نے یوں کہا تھا کہ ہم درخشاں کو کوئی بات یاد دلانے کی کوشش نہ کریں لیکن جیکب اپنی ترنگ میں کہنے لگا۔ ”تو کیا اوریگا نے یہ بات غلط کہی تھی کہ اس نے آپ کو دیوتاؤں کا خاص مشروب پلا کر ہمیشہ کے لیے زندۂ جاوید کر دیا ہے اور.....“

”جیکب!“ کیلاش جھلا گیا۔ ”تم نے اس وقت یہ کیا بہکی بہکی باتیں شروع کر دیں؟“

”میں بھی نہیں سمجھ سکی کہ آپ کس اوریگا کی بات کر رہے ہیں؟ میں مسلمان عورت ہوں۔ میرا بھلا دیوتاؤں یا ان کے مشروب وغیرہ سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟“ درخشاں نے الجھتے ہوئے کہا۔

اس کے معصوم چہرے پر بے پناہ سادگی تھی البتہ جیکب کی باتوں نے اس کی حسین آنکھوں میں ایک تجسس سا پیدا کر دیا تھا۔ میں نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے۔ اگر گھنے جنگل میں میری نگاہوں نے جو دیکھا وہ خواب نہیں تھا تو پھر درخشاں کے بارے میں اوریگا نے جو کچھ کہا تھا اس میں سے ایک بات کی تصدیق ہو چکی تھی۔ ممبر جادوگروں نے درخشاں کی آواز سن کر سجدے کرنا شروع کر دیے تھے۔ وہ درخشاں سے بے حد خوفزدہ اور سہمے سہمے نظر آ رہے تھے شاید اس لیے کہ درخشاں نے بھی وہی الفاظ دہرائے تھے جو اوریگا نے کہے تھے اور جس کی ترجمانی کے جرم میں سادری دیوتاؤں کے عتاب کا شکار ہو چکی تھی۔

میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ وہ بے حد معصوم نظر آ رہی تھی۔ اوریگا نے یہی کہا تھا کہ اس نے درخشاں کے لاشعور میں آنے والے کل کو محفوظ کر دیا ہے اور اپنی تمام قوتیں سونپ کر اسے ناقابلِ تسخیر بنا دیا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ درخشاں جسمانی طور پر میری ملکیت رہے گی لیکن اس کی روح پر ہمیشہ اوریگا کا تسلط رہے گا۔ ایسے حالات میں درخشاں کے نازک ذہن کو چھیڑنا اس کی زندگی کے لیے خطرناک بھی ہو سکتا تھا۔ شاید اسی لیے اوریگا نے تاکید کی تھی کہ ہم از خود اسے ماضی کے بارے میں کرید نے کی کوشش سے پرہیز کریں۔

کیلاش کے سرزنش کرنے پر جیکب کو بھی اپنی حماقت کا احساس ہو گیا چنانچہ اس نے جلدی سے بات بناتے ہوئے کہا۔ ”تم شاید ٹھیک کہہ رہے ہو۔ چاندنی راتوں میں اکثر میں بہکی بہکی باتیں شروع کر دیتا ہوں۔“

”آپ نے کسی اوریگا کا نام بھی لیا تھا۔“ درخشاں نے بدستور الجھتے ہوئے کہا۔ ”کہیں آپ کا اشارہ اسی طویل القامت معمر اور سفید ریش بزرگ کی جانب تو نہیں جس نے مجھے آپریشن کے وقت اپنے.....“

”آپ بھی کس کی باتوں میں آ رہی ہیں۔“ کیلاش نے درخشاں کی بات کاٹتے ہوئے نہایت شوخی سے کہا۔ ”آپ کو شاید حالات کا علم نہیں۔ سلویا کی موت کے بعد ہمارے نیک دل اور فرشتہ خصلت فادر جیکب بحری سفر کے دوران اسپا کے جزیرے پر ڈوکیلا نامی ایک حسینہ پر بُری طرح فریفتہ ہو گئے تھے لیکن اس کی سرد مہری نے ہمارے دوست کو خفقانی کیفیت سے دوچار کر دیا چنانچہ چاندنی راتوں میں اس قسم کے بے سرو پا دورے.....“

”مقدس باپ تم پر رحم کرے۔“ جیکب نے کیلاش کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”ڈوکیلا پر کون عاشق ہوا تھا۔ میں؟“

”جمال! تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا میں فادر جیکب کے بارے میں کوئی غلط بیانی کر رہا ہوں؟“

”چور کا بھائی گرہ کٹ۔“ جیکب نے تلملا کر کہا۔ ”جھوٹ اور وہ بھی اس قدر سفید کہ اس کی تصدیق بھی ہو رہی ہے۔“

”دوسری شادی کر لینے میں بظاہر کوئی حرج بھی نہیں ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے درخشاں سے پوچھا۔ ”کیا خیال ہے جیکب کے ارادے نیک ہیں؟“

”کوئی ہرج نہیں بشرطیکہ جیکب بھائی بھی کا ٹاکرہ سوتی“ درخشاں نے معصومیت سے جواب دیا تو جیکب ہونٹ

کاٹ کر چپ ہوگیا۔ پہلے بھی اس نے کبھی درخشاں کی کسی بات پر ناراض ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس وقت بھی وہ بات درگزر کرنے کے ارادے سے دوسری طرف کروٹ لینے کو ہی تھا کہ کیلاش نے اس کا بازو تھام لیا۔ نہایت سنجیدگی سے بولا۔ "بڑی بات ہے فادر! درخشاں بھابی نے تم سے کچھ دریافت کیا تھا۔"

"بات میری اور درخشاں بھابی کی ہے۔ تمہارے پیٹ میں اس قدر مروڑ کیوں ہو رہی ہے؟" جیکب نے جھلا کر جواب دیا۔

"سمجھنے کی کوشش کرو میرے دوست! بات میرے پیٹ کے مروڑ کی نہیں، تمہارے مستقبل کی ہے اور جہاں تک میری رائے ہے میں بھگوان کی سوگند کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ ٹوکیلا بری لڑکی نہیں۔" کیلاش نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "ناریل کا پانی پلا کر کسی کا دل ٹھنڈا کرنا کوئی عیب تو نہیں۔"

"یہ ناریل کے پانی کا کیا قصہ ہے؟" درخشاں نے دبی زبان میں پوچھا۔ مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ کیلاش کی باتوں نے اس کی پیشانی پر نمودار ہونے والی سلوٹوں کو ختم کر دیا تھا اور اب وہ جیکب کی جھلاہٹ سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہی تھی۔

"بات دراصل یہ ہے کہ ٹوکیلا سیاحوں کو ناریل کا پانی پلا کر اپنا گزارا کرتی ہے اور اس میں کوئی شرم کی بات نہیں ہے۔"

"شرم کی بات کا تم جیسے بے شرموں سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔" جیکب نے کیلاش کو گھورتے ہوئے قدرے درشت لہجے میں کہا۔ "کیا تم اپنے بھگوان کی قسم کھا کر درخشاں بھابی کو بتاؤ گے کہ ٹوکیلا کو دیکھ کر کس کی رال ٹپکتی تھی؟"

"میری۔" کیلاش نے جھجکے بغیر جواب دیا پھر ایک سرد آہ بھر کر بولا۔ "دوستی ایک مقدس رشتے کا نام ہے میرے دوست! اور اسی جذبے کے تحت میں اس چاندنی رات کو گواہ بنا کر عہد کرتا ہوں کہ ٹوکیلا سے میں تمہارے حق میں دستبردار ہوتا ہوں۔"

"ہم.... میں لعنت بھیجتا ہوں ٹوکیلا پر۔"

"یہ تمہارا فعل ہے۔ میں اپنے قول پر قائم رہوں گا۔" کیلاش نے اس قدر بے ساختگی سے جملہ ادا کیا کہ خود جیکب بھی اپنی مسکراہٹ نہ روک سکا۔

"میں سمجھ گئی۔" درخشاں نے جیکب کی دلجوئی کی خاطر سنجیدگی سے کہا۔ "ٹوکیلا کا چور کیلاش جی کے من میں چھپا بیٹھا ہے اور بلاوجہ جناب جیکب بھائی کو پریشان کیا جا رہا ہے۔"

"ربِ عظیم آپ پر اپنی رحمتوں کا سایہ قائم رکھے۔ اب آپ نے صحیح بات کہی ہے۔"

"چلو ٹوکیلا کے سلسلے میں، میں تسلیم کرتا ہوں کہ وہ لڑکی مجھے بے حد معصوم اور سادہ لوح لگی تھی لیکن تم ٹوپا کے سلسلے میں کیا کہو گے؟"

"وہ مکروہ عورت بھی تم دونوں کے دماغ کا خلل تھی۔" جیکب پھر تیزی سے اکھڑنے لگا۔ میری طرف دیکھ کر بولا۔ "کیا یہ جھوٹ ہے کہ ٹوپا کا تعلق تم دونوں کی ذات سے تھا اور تم لوگوں نے اس نجس عورت کو مجھ سے منتھی کرنے کی کوشش کی تھی؟"

"تم چاہتے تو اشنان کرا کے اس کی نجاست دور کی جا سکتی تھی۔" کیلاش نے برجستہ کہا تو ہم میں سے کوئی بھی اپنی ہنسی پر قابو نہ پا سکا۔ جیکب نے مسکراتے ہوئے جلدی سے دوسری طرف کروٹ لے لی۔ کیلاش بڑی معصومیت سے آسمان پر چٹکی چاندنی دیکھنے لگا۔ میں نے درخشاں کی طرف دیکھا۔ وہ کیلاش کے جملے پر ابھی تک منہ دبائے اپنی ہنسی روکنے کی کوشش میں مصروف تھی۔

نصف رات گئے تک ہم اسی طرح خوش گپیوں میں مصروف رہے پھر ہماری آنکھ لگ گئی، ہم کتنی دیر تک سو سکے مجھے اس کا کوئی اندازہ نہیں البتہ اتنا ضرور یاد ہے کہ دوسری بار جب میری آنکھ کھلی تو میں نے کیلاش کو کراہتے سنا، کسی فوری خطرے کے پیشِ نظر میں ہڑبڑا کر اٹھا لیکن اسی لمحے کوئی سخت سی شے میری پشت پر جما دی گئی اور ایک سرد آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"اگر تم نے کوئی حماقت کرنے کی کوشش کی تو تمہارا جسم بے دریغ گولیوں سے چھلنی کر دیا جائے گا۔"

میں کچی نیند سے بیدار ہوا تھا اس لیے میں نے خطرے کا احساس ہوتے ہی دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے پھر حالات کا جائزہ لینے لگا۔ جیکب اور درخشاں مجھے آس پاس کہیں نظر نہ آئے۔ کیلاش ایک سیاہ فام حبشی کے بازوؤں پر جھولتا نظر آیا۔ غالباً میرے دشمنوں نے اس کو قابو کرنے کے لیے اس کے سر پر کوئی کاری ضرب لگائی تھی اور وہ کراہ کر بے ہوش ہوگیا تھا۔ قبل اس کے کہ میں پوری طرح معاملے کی نوعیت سمجھ پاتا میری پشت پر موجود شخص نے جو لب و لہجے سے کوئی انگریز معلوم ہوتا تھا اپنے سیاہ فام ساتھی کو کرخت لہجے میں مخاطب کیا۔

"اسے بھی لے جا کر موٹر بوٹ میں ڈال دو لیکن آنکھیں کھلی رکھنا، اگر کوئی فرار ہوگیا تو اس کا انجام خطرناک ہوگا تمہیں شاید یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ باس کی ڈکشنری میں معافی کا کوئی لفظ نہیں ہے۔"

سیاہ فام حبشی نے جس کی آنکھیں بے حد چمکیلی تھیں اور جو قد و قامت اور ڈیل ڈول کے اعتبار سے بہت زیادہ طاقتور اور بے رحم نظر آ رہا تھا اثبات میں سر کو جنبش دی۔ کیلاش کے بے ہوش جسم کو ایک جھٹکے سے اٹھا کر اپنے کندھے پر

ڈالا اور پہاڑی کی اس سمت قدم اٹھانے لگا جدھر کھلا سمندر تھا۔

اپنے قارئین کی معلومات کے لیے میں یہاں یہ واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ بھوری پہاڑی کا محل وقوع کچھ اس قسم کا تھا کہ اس کا دو تہائی حصہ اور وہ نیبنا قبیلے کی جانب تھا جس کے درمیان سمندری جھیل واقع تھی اور باقی حصہ کھلے سمندر سے ملا تھا۔ ہمارے دشمن یقینی طور پر کھلے سمندر کی جانب سے آئے تھے جس کا اندازہ مجھے سیاہ فام حبشی کو ملنے والے حلیے کے بعد ہوا۔ وہ کون تھے؟ اچانک بھوری پہاڑیوں تک کس طرح آ گئے؟ اور انہیں ہم سے کیا دشمنی تھی؟ میں ابھی ان باتوں پر غور کر رہا تھا کہ میرے نادیدہ دشمن نے جو میری پشت پر موجود تھا بڑے سفاک لہجے میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم ہمیں اڈگر اور ابو ریاض کا پتا بتانا پسند کرو گے؟“

”تم۔۔۔۔ میں۔۔۔۔“

”ہم سے کسی رحم کی امید فضول ہوگی۔“ وہ کرخت اور سرد آواز میں بولا۔ ”اڈگر اور ابو ریاض کو ہمارے حوالے کر دو۔ ہم تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو آزاد کر دیں گے۔ یہ مارٹن کا وعدہ ہے۔ دوسری صورت میں تمہاری موت بڑی عبرتناک ہوگی۔“

”میرے دوست! تمہیں یقیناً ہمارے بارے میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“ میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”یقین کرو، ہم کسی اڈگر یا ابو ریاض سے واقف نہیں ہیں۔“

”پھر، تم لوگ اس ویران پہاڑی پر کیا کر رہے تھے؟“

”یہ ایک لمبی داستان ہے لیکن شاید۔۔۔۔“

”مارٹن کو فرضی کہانی سنا کر بہلانے کی کوشش فضول ہوگی۔“ اس نے پستول یا ریوالور کی نال میری پسلیوں میں چبھوتے ہوئے تیزی سے کہا۔ ”میں ہمیشہ دو ٹوک فیصلہ کرنے کا عادی رہا ہوں۔ اڈگر اور ابو ریاض یا پھر اذیت ناک موت۔“

”میں بتا چکا ہوں کہ ہم کسی اڈگر۔۔۔۔ آہ۔۔۔۔ یا۔۔۔۔ یا۔۔۔۔“

پیچھے سے میرے سر پر جو ضرب لگائی گئی وہ اتنی شدید تھی کہ میرا جملہ حلق میں گھٹ کر کراہ میں تبدیل ہو گیا۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ اگر ایک مضبوط ہاتھ نے مجھے سہارا نہ دیا ہوتا تو میں کسی کٹے ہوئے تناور درخت کی مانند سنگلاخ چٹان پر گرا ہوتا۔

⊛

میں کسی سخت اور ٹھوس شے پر پڑا تھا۔ ڈوبتے ذہن سے غنودگی کے بادل چھٹنے لگے تو کچھ عجیب سی کیفیت محسوس ہوئی۔ میرے جسم کا زیریں حصہ سرد محسوس ہو رہا تھا لیکن چہرہ اور سینہ جل رہا تھا۔ میں کچھ دگرگوں کیفیت سے دوچار رہا پھر مجھے یاد آیا۔ وہ کوئی سخت اور مضبوط چیز تھی جس کی اچانک اور بھرپور ضرب نے مجھے بیہوش کر دیا تھا۔ وہ کیلاش کو میرے سامنے لے گئے تھے لیکن جیکب اور درخشاں کا کیا بنا؟ پتا نہیں وہ زندہ تھے یا نامعلوم دشمنوں کی بربریت کا نشانہ بن گئے تھے۔ وہ کچھ اجنبی لوگ تھے جو شاید اپنے جتھے سے ٹوٹے کسی اڈگر اور ابو ریاض نامی افراد کو تلاش کر رہے تھے۔ اور ان کے کسی باس کی جانب سے انہیں یہی حکم ملا تھا کہ کسی کے ساتھ نرمی کا برتاؤ نہ کیا جائے لہٰذا میں بھی ان کی دہشت اور درندگی کا شکار ہو گیا۔

میری غنودگی بتدریج دور ہوتی گئی۔ کسی انجن کے چلنے کی آواز اور پانی کے شور نے مجھے باور کرایا کہ میں کسی موٹر بوٹ پر سفر کر رہا ہوں۔ مجھے یاد آیا، مارٹن نامی شخص نے اپنے سیاہ فام حبشی ساتھی کو یہی حکم دیا تھا کہ کیلاش کو اٹھا کر موٹر بوٹ میں ڈال دیا جائے۔ میں نے اپنے ساتھیوں کے احوال جاننے کی خاطر خود کو پوری طرح بیدار کرنا چاہا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر وہ ہمیں اپنے مفرور ساتھیوں کا مددگار سمجھ رہے تھے تو سب کو ایک ساتھ ہی یرغمال بنایا گیا ہوگا۔ خدا جانے جیکب اور درخشاں پر کیا بیتی ہو۔

”میرا خیال ہے کہ اسے اب تک ہوش میں آ جانا چاہیے تھا۔“ مارٹن کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

”ہو سکتا ہے تمہارا ہاتھ زیادہ قوت سے پڑا ہو اور یہ۔۔۔۔“

”حماقت کی باتیں کم کیا کرو۔“ مارٹن نے دوسرے بولنے والے کو سختی سے ڈانٹ دیا۔ ”اگر ایسا ہوتا تو اس کی نبض نہ چل رہی ہوتی۔“

”میں سرجن ہوں۔“ کیلاش کی آواز ابھری۔ ”تم اگر میرے ہاتھ کھول دو تو میں اپنے ساتھی کو ہوش میں لانے کی کوشش کر سکتا ہوں۔“

اور کیلاش کی آواز سننے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میرے ہاتھ بھی کلائی سے جکڑے ہوئے ہیں۔

”تم سرجن ہو؟“ مارٹن نے تیزی سے دریافت کیا۔ ”تمہارا نام؟“

”سرجن کیلاش۔“

”کہاں سے تعلق ہے؟“

”ہندوستان میں چتہ کوٹ کے قریب ایک بڑا قصبہ

کروسی کے نام سے مشہور ہے۔ میں وہاں کے سرکاری اسپتال میں سرجن رہ چکا ہوں اس کے بعد....“

”اس کے بعد ابو ریاض کی چرب زبانی نے تمہیں یقیناً سبز باغ دکھا کر شیشے میں اتار لیا ہوگا۔“ مارٹن کے لہجے میں گہرا طنز اور تلخی شامل تھی۔ ”میں جانتا ہوں کہ تم ہندوستان کے کالے لوگ عربوں کو اپنا دوست اور بھائی سمجھتے ہو۔“

”میں ایک بار پھر تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ابو ریاض کا نام میں پہلی بار تمہاری زبان سے سن رہا ہوں۔ تمہیں ہمارے سلسلے میں....“

”نہیں۔“ مارٹن گرج کر بولا۔ ”ہمیں کچھ یقین دلانے کی کوشش مت کرو۔ ہمارے پاس تفتیش اور چھان بین کے اپنے ذرائع ہوتے ہیں اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ایک رات میں کروڑپتی بننے کا خواب بڑے بڑے پارساؤں کو بھی ڈانواڈول کر دیتا ہے۔ کیوں فادر جیکب! کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”ممکن ہے تمہارا تجربہ اپنی جگہ درست ہو لیکن ربِّ عظیم کی قسم....“

”بکواس مت۔“ مارٹن کے دوسرے ساتھی نے ڈپٹ کر سخت آواز میں کہا۔ ”ہم نے مصنوعی ڈاڑھیوں سے بھی ہیرے جواہرات برآمد ہوتے دیکھے ہیں۔“

”مقدس باپ ہمارے سروں پر اپنا سایہ قائم رکھے۔“ جیکب نے دبی زبان میں کہا۔

میں پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ موٹر بوٹ کے ہچکولے مجھے گراں گزر رہے تھے اس لیے میں نے کراہ کر آنکھیں کھول دیں اور تب میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ کیلاش اور جیکب کے درمیان درخشاں بھی سہمی سمٹی بیٹھی نظر آ گئی پھر میں نے اپنے دشمنوں پر نظر ڈالی۔ وہ تعداد میں پانچ تھے ایک وہی سیاہ فام حبشی جس نے کیلاش کو بےبس کیا تھا، دوسرا مارٹن تھا۔ اکہرے بدن کا مالک ہونے کے باوجود اس کی عقابی نگاہیں اس کی سخت گیر طبیعت کی ترجمانی کر رہی تھیں۔ ریوالور ہاتھ میں لیے وہ درمیانی تختے پر نہایت اطمینان سے بیٹھا ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ سیاہ فام حبشی نے اپنے سیدھے ہاتھ میں اسٹین گن سنبھال رکھی تھی۔ وہ اپنے تیسرے ساتھی کے قریب انجن کے اوپری حصے پر بیٹھا ہوا تھا۔ تیسرا شخص جو موٹر بوٹ چلانے کا کام سرانجام دے رہا تھا پستہ قد اور گٹھے ہوئے جسم کا مالک تھا اور صورت شکل کے اعتبار سے پیشہ ور خلاصی نظر آ رہا تھا۔ اس کا نام ڈیسوزا تھا۔ چوتھی شخصیت روسیو ڈی جون کی تھی جو فرانسیسی باشندہ تھا اور پانچویں شخصیت درمیانے قد اور بھوری رنگت کے مالک پیٹر کی تھی۔ سیاہ فام کو مارٹن نے ایک بار ڈی۔ آر کے نام سے پکارا تھا، ممکن ہے وہ اس کے نام کا مخفف رہا ہو۔

مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر سیاہ فام حبشی لپک کر میرے قریب آیا۔ چند ثانیے مجھے کسی ظالم قصاب کی طرح کینہ توز نگاہوں سے گھورتا رہا پھر اس نے ایک ہاتھ سے گھسیٹ کر مجھے کیلاش کے برابر بٹھا دیا۔ اس کے جسم میں بلا کی قوت تھی۔ میں نے اطراف کا جائزہ لیا۔ ہم کھلے سمندر میں سفر کر رہے تھے جہاں دُور دُور تک کسی دوسری موٹر بوٹ یا جہاز وغیرہ کا کوئی نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔

میں نے سب سے پہلے اُن سے پانی طلب کیا، سورج کی بلندی دیکھ کر میں نے اندازہ لگا لیا کہ میری بےہوشی کی مدت آٹھ نو گھنٹے سے کم نہیں تھی، میرا خیال تھا کہ وہ پیاس کی شدت کو میری کمزوری سمجھ کر فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے لیکن میرا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ مارٹن کے اشارے پر روسیو ڈی جون نے آگے بڑھ کر تھرموس میرے مُنہ سے لگا دیا لیکن مجھے دو تین گھونٹ سے زیادہ نہیں لینے دیے۔ پھر اس نے درخشاں کو گھورتے ہوئے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔ ”سینوریتا! کیا تم پیاس نہیں محسوس کر رہیں؟“

”نہیں۔“ درخشاں نے رکھائی سے کہا۔

”انکار مت کرو۔ ہمارے پاس تمہیں پلانے کے لیے زیادہ فالتو پانی نہیں ہے اور ابھی ہمیں اپنے جہاز تک پہنچنے میں چوبیس گھنٹے اور لگیں گے۔“

”ڈی جون!“ مارٹن نے خشمگیں نظروں سے گھورا۔ ”کیا تمہیں نہیں معلوم کہ ڈیوٹی پر بہکنے کی سزا کیا ہوتی ہے؟“

”ہم اس وقت جہاز پر نہیں ہیں موسیو!“ اس نے مارٹن کی طرف پلٹتے ہوئے بڑے ڈھیٹ انداز میں کہا۔ ”فرانس کے قمار خانے آج بھی اس بات کے گواہ ہیں کہ ڈی جون نے جب چاہا کسی کے مُنہ کا نوالہ بھی جھپٹ لیا اور راستے میں آنے والی رکاوٹوں کو ہمیشہ کے لیے فنش کر دیا۔ اگر یہ میری کمزوری نہ ہوتی تو شاید باس....“

”بکواس نہیں۔“ مارٹن تیزی سے بولا۔ ”میں تمہیں پہلے بھی تنبیہہ کر چکا ہوں کہ اجنبیوں کی موجودگی میں باس کا ذکر مت کیا کرو۔“

”سوری موسیو۔“ ڈی جون نے نہایت فرمانبرداری سے جواب دیا پھر جیکٹ کی اندرونی جیب سے شیشی نکال کر دو گھونٹ حلق کے نیچے اتارے اور بڑے اطمینان سے ایک

گوشے میں بیٹھ کر درخشاں کو گھورنے لگا۔

"جمال!" کیلاش نے مجھے اردو فیتنا کی زبان میں مخاطب کرتے ہوئے سرگوشی کی۔ "یہ لوگ اپنے دو ساتھیوں کی تلاش میں ہیں اور ہم پر شبہ کررہے ہیں کہ ہم نے ان کے ساتھیوں کو چھپا رکھا ہے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے ان کے بارے میں؟"

"بظاہر یہ بدقماش ہی نظر آتے ہیں، ممکن ہے غیر قانونی تجارت کا کوئی چکر ہو۔"

"کیلاش! کیا انہوں نے درخشاں کے ساتھ کوئی بیہودگی تو نہیں کی؟"

"نہیں۔" مارٹن ان معاملات میں ڈیوٹی اور اصول کا پکا نظر آتا ہے لیکن ڈی جون...."

"خبردار!" اچانک مارٹن کا لہجہ بے حد سرد اور سفاک ہوگیا۔ "اگر تم نے کسی دوسری زبان میں بات کرنے کی کوشش کی تو مجھے مجبوراً تمہاری تعداد گھٹانا پڑے گی۔ اس طرح موٹر بوٹ کا بوجھ بھی ہلکا ہوجائے گا۔"

"تمہیں ہمارے بارے میں کیا شبہ ہے؟" میں نے مارٹن سے سوال کیا۔

سیاہ فام حبشی اپنی جگہ بیٹھا عقابی نظروں سے ہمارے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔ ڈیسوزا بدستور موٹر بوٹ چلانے کا فرض انجام دے رہا تھا۔ پیٹر کی نظریں بھی ہماری جانب تھیں، وہ سب مسلح نظر آرہے تھے۔ مارٹن نے میرا سوال نہایت خاموشی سے سنا پھر میرے ساتھیوں پر اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالتے ہوئے بولا۔ "ہمیں اڈگر اور البوریاحق ہر قیمت پر درکار ہیں خواہ اس کے لیے ہمیں ہزاروں خون کیوں نہ کرنے پڑیں۔"

"ہماری زبان پر اعتبار کرو۔ ہم تمہارے ساتھیوں کو نہیں جانتے۔"

"مارٹن 'نہیں' سننے کا عادی نہیں۔ یا تو سیدھی طرح کھل جاؤ ورنہ......"

"نہیں موسیو! نہیں۔" ڈی جون نے شیشی نکال کر مزید دو گھونٹ لیتے ہوئے احتجاج کیا۔ "اس بار تم لڑکی پر گولی نہیں چلاؤ گے۔ مادام جولیا کی موت آج بھی ڈی جون کو راتوں کو ڈرانے پر اکساتی رہتی ہے۔ وہ بے گناہ تھی۔"

مارٹن نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر ڈی جون کو تیز نظروں سے گھورا لیکن ڈی جون نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ اس کی نگاہیں بدستور درخشاں کے وجود پر پھسل رہی تھیں، میں ہونٹ چبا کر رہ گیا۔ اگر میرے ہاتھ کھلے ہوتے تو میں ریبیک منہ میں رکھ کر انہیں ایسا مزہ چکھاتا کہ وہ تمام عمر یاد رکھتے۔

ریبیک کے خیال کے ساتھ ہی میرے ذہن میں مجذوب کی انگشتری کا خیال بھی ابھرا۔ مجھے اوریکا کے وہ الفاظ بھی یاد آئے جو اس نے درخشاں کے بارے میں کہے تھے۔ اس نے یقین دلایا تھا کہ درخشاں لازوال قوتوں کی مالک ہے اور ہم دونوں مل کر ایک ایسی طاقت بن جائیں گے جو ناقابلِ تسخیر ہوگی۔ لیکن ابھی تک ہمیں اس کا کوئی تجربہ نہیں ہوا تھا۔

مجھے رفیقی اور جیکسن کا خیال آیا تو میری بوکھلاہٹ کافور ہوگئی۔ مجذوب کی مقدس انگوٹھی کا کمال میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ سمورا اور اس کے سر پھرے ساتھیوں نے ہمیں سوتے میں بے بس کردیا تھا لیکن بزرگ کی انگشتری نے میری آرزو پوری کردی۔ رسیوں کا جال ٹکڑے ٹکڑے ہوکر میرے قدموں میں بکھر گیا تھا۔ سانگا کی پیشانی سے اُبلنے والا لہو میرے ذہن میں محفوظ تھا۔ وہ طاقت یقیناً میری اپنی نہیں تھی جس نے ایک وزنی پتھر سے سانگا کو نشانہ بنایا تھا۔

وہ جو پُراسرار قوتوں کے مالک تھے انہوں نے بھی مجھے بے پناہ قوتوں کا مالک بنایا تھا۔ اوریکا، جس کی دُھند میں نظریں دُور تک دیکھنے کی طاقت رکھتی تھیں وہ بھی بزرگ کی انگشتری کا بھید نہیں پاسکا تھا۔ میں چاہتا تو رفیقی کو بُلا کر اپنے دشمنوں کی سرکوبی کا حکم دے سکتا تھا۔ جیکسن کے ذریعے معلوم کرسکتا تھا کہ وہ لوگ کون تھے جنہوں نے ہمیں یرغمال بنالیا تھا۔

ایک لمحے کو میرے دل میں یہ خیال اُبھرا کہ رفیقی کو آواز دوں اور اُسے حکم دوں کہ ڈی جون کو ہزاروں فٹ بلندی پر لے جاکر دور گہرے سمندر میں پھینک دے۔ وہ یقیناً مارٹن اور اس کے مجرم ساتھیوں کو میرے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردیتا مگر میں نے جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا۔

مارٹن اور اس کے ساتھیوں کی موت ہمارے لیے مزید دشواریاں پیدا کرسکتی تھی چنانچہ میں نے اس وقت تک کے لیے اپنا ارادہ ملتوی کرنے کا فیصلہ کرلیا جب تک ہم کسی جہاز یا جزیرے کے قریب نہ پہنچ جاتے۔ یہاں میں اپنی کوتاہی اور انسانی فطرت کا اعتراف بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ میرے قارئین کے ذہن میں یقیناً یہ سوال پیدا ہوگا کہ جب رفیقی میرے دشمنوں کی موت کے سلسلے میں میرے احکام کی بجا آوری کرسکتا تھا تو میرے ایما پر وہ ہمیں کسی محفوظ جزیرے تک بھی پہنچا سکتا تھا۔ لیکن اس وقت اچانک حالات نے ہمیں جس انداز میں بے بس کیا تھا اس نے میری عقل بھی کسی حد تک خبط کردی تھی بہرحال

مجذوب کی انگوٹھی اور رفیقی کے خیال نے مجھے بڑی حد تک بے خوف اور دلیر بنا دیا تھا۔ میں نے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی بندشیں توڑنے کی کوشش یوں بھی نہیں کی کہ سیاہ فام حبشی مارٹن اور پیٹر کے ہاتھوں میں دبے ہوئے خطرناک اسلحہ کا رُخ ہماری جانب تھا۔ ٹریگر پر انگلی کا ایک معمولی سا دباؤ بھی ہم میں سے کسی کی دردناک موت کا سبب بن سکتا تھا۔ لیکن ایک بات میں نے طے کرلی تھی کہ ڈی جون کو اس کی گستاخی اور بیہودگی کی سزا ضرور دوں گا۔

جیکب قسمت کی اس ستم ظریفی پر بُری طرح پیچ و تاب کھا رہا تھا جس نے اسے بھوری پہاڑیوں سے نجات دلانے کے بعد ایک نئی آزمائش سے دوچار کر دیا تھا۔ کیلاش بنیادی طور پر سرجن تھا اس لیے موت اور زندگی کا کھیل اس کے لیے کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا لیکن اس وقت ہمیں جو صورتِ حال درپیش تھی اس نے کیلاش کو الجھا دیا تھا اور درخشاں۔ اس کے معصوم چہرے پر خوف و دہشت کے ملے جُلے تاثرات تھے۔ کسی سہمی ہوئی فاختہ کی مانند وہ جیکب اور کیلاش کے درمیان سمٹی بیٹھی تھی۔

مارٹن کچھ دیر تک ڈی جون کی ڈھٹائی اور بے غیرتی پر دانت پیستا رہا پھر مجھے گھورتے ہوئے کچھ توقف کے بعد بولا۔ ”تم نے ابھی تک اپنا تعارف نہیں کرایا؟“

”میں بیرسٹر اور جاگیردار ہوں جمال اصغر۔“ اس بار میں نے بے پروائی سے جواب دیا۔

”تمہارے دوستوں نے بھی یہی بتایا تھا۔“ اس نے باری باری ہمارے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا پھر معنی خیز انداز میں بولا۔ ”اچھی ٹیم ترتیب دی ہے تم لوگوں نے۔“

”کیا مطلب؟“ میں چونکا۔

”ایک سرجن، دوسرا بیرسٹر، تیسرا مذہبی پیشوا اور چوتھی ایک حسین و جمیل عورت۔“

”میں مذہبی پیشوا نہیں صرف پادری ہوں۔ فادر جیکب۔“

”تم پادری ہونے کے ساتھ ساتھ اداکاری بھی خوب کر لیتے ہو۔“ مارٹن نے بدستور معنی خیز لہجے میں کہا۔ ”قانون کی نگاہوں میں دھول جھونکنے کے سلسلے میں تمہاری اور بیرسٹر کی شخصیت خاصی کارآمد ثابت ہوتی ہوگی۔ کیوں؟ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟“

”انجیلِ مقدس کی قسم۔ تمہاری بے سر و پا باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہی ہیں۔“ جیکب نے بیزاری سے جواب دیا تو مارٹن کے تیور یکلخت خطرناک ہوگئے۔ کچھ دیر تک وہ قہر آلود انداز میں ہمیں گھورتا رہا پھر سپاٹ آواز میں بولا۔

”کیا تم شرافت سے ہمیں اڈگر اور ابوریاض کا پتا نہیں بتاؤ گے؟“

”ہم کسی اڈگر یا ابوریاض سے واقف نہیں۔“ میں نے بے پروائی سے جواب دیا۔

”تمہیں شاید حالات کا علم نہیں ہے۔“ مارٹن نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”پندرہ بیس لاکھ کا نقصان باس کی نگاہوں میں کوئی وقعت نہیں رکھتا لیکن غداروں کو معاف کر دینا ہمارے اصول کے خلاف ہے۔ آج نہیں تو کل یا کچھ عرصے بعد وہ دونوں ہمارے رحم و کرم پر ہوں گے۔ ذرا سوچو، اس وقت تمہاری حیثیت کیا ہوگی؟“

”تم ابھی تک غلط فہمی میں مبتلا ہو۔“ کیلاش نے کہا۔ ”ہماری شخصیت سیاحوں کی ہے۔ ایک اتفاقی حادثے سے دوچار ہونے کے بعد ہمارا جہاز....“

”مختصر تقریر کرنے کی عادت ڈالو سرجن کیلاش!“ مارٹن نے سرسراتی آواز میں کہا۔ ”تم ہمیں ان دونوں کا پتا بتا دو، ہم تمہارا نقصان پورا کرنے کا وعدہ کرتے ہیں۔“

”ٹیم میں تمہاری اپنی کیا حیثیت ہے؟“ میں نے اپنے ذہن میں ایک اسکیم مرتب کرتے ہوئے سنجیدگی سے سوال کیا۔

”کیا.... میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا؟“ مارٹن چونکا۔ میرے لب و لہجے کی اچانک تبدیلی نے موٹر بوٹ کے دوسرے لوگوں کو بھی چونکا کر دیا۔

”تم نے کہا تھا کہ تمہارے باس کی لغت میں معافی کی کوئی گنجائش نہیں۔“

”ہاں۔ میں نے یہی کہا تھا لیکن....“

”میرا مطلب بہت واضح اور صاف ہے مسٹر مارٹن!“ میں نے ٹھوس آواز میں جواب دیا۔ ”تم چونکہ اپنی پارٹی کے اہم رکن ہو اس لیے یہ بھی جانتے ہوگے کہ کسی بھی سودے بازی کے آخری فیصلے کا اختیار صرف اور صرف باس کو ہوتا ہے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن نائب ہونے کی حیثیت سے کچھ اختیارات مجھے بھی حاصل ہیں۔“

”ہو سکتا ہے تمہارا بیان درست ہو لیکن میں چھوٹے موٹے سودے کرنے کا عادی نہیں اس لیے معاملے کی گفتگو صرف تمہارے باس سے ہوگی۔“

”گویا، تم جانتے ہو کہ وہ دونوں اس وقت کہاں ہیں؟“

”اس کا جواب بھی ہم تمہارے باس کو دیں گے۔“ میں نے بے پروائی کا مظاہرہ کیا پھر تیزی سے بولا۔ ”مسٹر مارٹن! کیا تم اب میرے ہاتھوں کی بندشیں کھولنے کی زحمت گوارا کرو گے یا

مجھے خود ہی تکلیف کرنا پڑے گی؟"

"نہیں۔" پیٹر نے سرد لہجے میں مجھے للکارا۔ "اگر تم نے کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو میں بے دریغ گولی مار دوں گا۔"

"بہت خوب۔" میں بے پروائی سے مسکرایا پھر کنکھیوں سے مارٹن کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "اب میں کیا سمجھوں؟ اس وقت موٹر بوٹ کی کمان کس کے ہاتھ میں ہے اور اصل نائب کون ہے؟"

"پیٹر!" میرا تیر ضائع نہیں گیا۔ مارٹن نے اپنی سیور ہی رنگت والے ساتھی کو غصیلی نگاہوں سے دیکھا۔ "کیا تم میری اجازت کے بغیر گولی چلانے کی جسارت کر سکتے ہو؟"

"جہاز سے دور رہنے کی حالت میں ہمیں ہر لمحہ آنکھیں کھلی رکھنے کی ہدایت کی گئی ہے۔" پیٹر نے تیزی سے جواب دیا۔

"کیا تم بھول گئے کہ میری حیثیت کیا ہے؟" مارٹن کا لہجہ سرد اور سفاک ہو گیا۔

"تم.... تم باس کے نائب ہو لیکن خطرے کی صورت میں......"

"شٹ اَپ۔" مارٹن چیخ اٹھا پھر اس نے سیاہ فام حبشی کو اشارہ کیا جو بدستور کسی آدم خور چیتے کی مانند اپنی جگہ محتاط، چاق و چوبند نظر آ رہا تھا۔

مارٹن کا اشارہ پا کر سیاہ فام حبشی نے اپنی اسٹین گن ڈیسوزا کے سامنے رکھ دی۔ اس نے انتہائی خاموشی اور سنجیدگی سے ہمارے قریب آ کر ہماری بندشیں کھولنا شروع کر دیں۔ اپنے کام سے فارغ ہو کر وہ دوبارہ اپنی جگہ جا کر بیٹھ گیا۔ اسٹین گن اٹھا کر وہ ایک بار پھر ہماری طرف محتاط نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس کے تیور بتا رہے تھے کہ اگر ہم نے مارٹن کی دی ہوئی رعایت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا خیال بھی کیا تو وہ پلک جھپکتے ہی ہمارے جسموں کو چھلنی کر دے گا۔

پیٹر نے حبشی کے کام میں کوئی مداخلت یا مارٹن کے اشارے پر احتجاج کرنے کی ہمت نہیں کی لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ اسے مارٹن کا وہ طرزِ عمل گراں گزر رہا ہے۔ دوسری طرف جیکب اور کیلاسش میرے طرزِ عمل پر حیران نظر آ رہے تھے البتہ درخشاں کا ردِعمل ان دونوں سے مختلف تھا۔ وہ ہاتھوں کی بندشیں کھل جانے کے بعد مطمئن نظر آ رہی تھی۔

"مجھے خوشی ہے مسٹر مارٹن اگر تم نے مجھ پر اعتماد کیا اور ہماری جانب دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ دوسری صورت میں تمہارے فرشتے بھی اڈگر اور ابو ریاض کے سلسلے میں ہماری زبان نہیں کھلوا سکتے تھے۔"

"دجمال!" جیکب نے اودو فینا کی زبان میں مجھے سرزنش کرنے کی کوشش کی۔ "اتنا بڑا اور سفید جھوٹ۔ خدا کے غضب سے ڈرو۔"

مارٹن چونکا۔ سیاہ فام حبشی کی پیشانی بھی شکن آلود ہو گئی لیکن میں نے موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے تیزی سے پلٹ کر جیکب کو انتہائی کرخت آواز میں تنبیہ کی۔ "نہیں فادر! تم مجھے میرے ارادے سے باز نہیں رکھ سکتے۔ ہمیں اپنا نقصان بہرحال پورا کرنا ہے اور آئندہ کے لیے اپنا فائدہ بھی دیکھنا ہے۔ ایک بات اور، دوبارہ تم مجھے انگریزی کے علاوہ کسی اور زبان میں مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کرو گے ورنہ میں تمہاری زندگی کی ضمانت نہیں دے سکتا۔"

جیکب کے علاوہ کیلاسش بھی مجھے حیرت سے گھورنے لگا لیکن مارٹن اور اس کے ساتھی میرے برتاؤ سے کسی حد تک مطمئن ہو گئے تھے۔ پھر قبل اس کے کہ مارٹن مجھ سے کوئی گفتگو کرتا میں نے ایک لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔

"مائی ڈیئر مسٹر مارٹن! اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں دس پندرہ منٹ آرام کر لوں۔ تم نے جو شدید ضرب میرے سر پر لگائی تھی اس کا اثر ابھی تک برقرار ہے۔"

مارٹن میری حرکات و سکنات کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے سر کی خفیف جنبش سے مجھے اجازت دی تو میں نے پاؤں پھیلا کر اپنا سر ہاتھوں میں ٹکا لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے وہ مہلت جیکسن سے حالات جاننے کے لیے درکار تھی چنانچہ آنکھ بند کرتے ہی میں نے جیکسن کو یاد کیا اور اس سے اڈگر اور ابو ریاض کے علاوہ مارٹن اور اس کے گروہ کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کرنے لگا۔

"تم نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔" میں نے تمام معلومات حاصل کرنے کے بعد جیکسن سے دریافت کیا۔

"آپ کی دعا ہے میرے عزیز! میں خیریت سے ہوں۔"

"تم نے کہا تھا کہ ہماری ملاقات جلد ہو گی لیکن تمہارا کہا پورا نہیں ہوا۔"

"میں نے امکانی بات کا اظہار کیا تھا۔ اس میں رُوحوں کی پیشگوئی کو دخل نہیں تھا۔"

"جیکسن!" اچانک میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "کیا تمہیں ہنگارو کی صلاحیتوں پر مکمل اعتماد ہے؟"

"کوئی اور بات کریں میرے عزیز!" جیکسن نے میرے جملے سے گھبرا کر بڑی عقیدت سے ہڈیوں کے اس پنجر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔ "ہر وہ شے جو انسان کی سمجھ سے باہر ہو اس کے بارے میں شبہات کا اظہار نہیں کرنا چاہیے۔ ہنگارہ

ایک عظیم قوت کا نام ہے۔ کیا جینی نے آپ کو اس کی رُوحانی قوتوں کے بارے میں آگاہ نہیں کیا تھا؟"

"مجھے یاد ہے اور اسی لیے آج میں تمہاری اس عظیم قوت کا امتحان لینا چاہتا ہوں۔"

جیکسن نے جواب نہیں دیا۔ اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ اُبھر آئی۔ شاید وہ میرے جملے کی گہرائی نہیں پا سکا تھا۔ میں اس کی مسکراہٹ پر کبیدہ خاطر نہیں ہوا۔ ٹھوس لہجے میں بولا۔ "پیارے جیکسن! کیا ہنگارو کی عظیم رُوح تمہارے ذریعے مجھے یہ بتا سکتی ہے کہ جے سیکا، مقلوش، آرم با اور با ہوگاما کا کیا مطلب ہوتا ہے؟"

میری نگاہیں جیکسن کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ اور ریگا نے ان پُراسرار الفاظ کے بارے میں غلط نہیں کہا تھا میرا جملہ مکمل ہوتے ہی جیکسن کی ہنسی کافور ہوگئی۔ وہ یکدم پریشان ہوگیا۔ ہنگارو کے ڈھانچے پر اس نے اپنی گرفت اور مضبوط کرلی۔ خاموشی سے آسمان کی جانب پریشان اور خوفزدہ نظروں سے گھورنے لگا۔

"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا پیارے جیکسن!" میں نے اس کا مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا۔

"آپ کا خیال درست ہے میرے عزیز!" یکلخت اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "میں ان لفظوں کے بارے میں کوئی تشریح نہیں کرسکوں گا۔ آپ اسے میری مجبوری سمجھ لیں، البتہ میں اتنا ضرور بتا سکتا ہوں کہ آپ کی قوتوں میں مزید اضافہ ہوگیا ہے۔"

"شاید اسی لیے میں اور میرے ساتھی اس وقت دشمنوں کے نرغے میں گھرے ہوئے ہیں۔" میں نے تلخ لہجہ اختیار کیا۔

"میں اسے قدرت کی ستم ظریفی کہوں گا میرے عزیز!" جیکسن نے ہونٹ کاٹتے ہوئے جواب دیا پھر میری انگوٹھی کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ "ہتھیار پاس ہو لیکن انسان اس کے استعمال سے ناواقف ہو تو اُسے حالات کی ستم ظریفی ہی کہیں گے۔"

"تمہارا اشارہ بزرگ کی انگشتری کی جانب ہے۔ کیوں؟" میں سنجیدہ ہوگیا۔

"میں آپ کے خیال کی تردید نہیں کروں گا۔"

"کیا تم اس کے استعمال سے واقف نہیں؟"

"نہیں میرے عزیز!" جیکسن نے جانے کیوں ایک سرد آہ بھر کر جواب دیا۔ "اور ریگا کی دور رس نگاہیں بھی بزرگ کے اس تحفے کی بلندیوں تک نہیں پہنچ سکی تھیں۔ لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ یہ انگوٹھی آپ کے لیے پارس پتھر اور کسوٹی سے زیادہ موثر ثابت ہوگی۔"

"کسوٹی سے تمہاری مراد کیا ہے؟"

"مقدس بزرگ کے زورِ بازو نے اس انگوٹھی کے گرد نور کا ایک ہالہ بنا دیا ہے اس لیے کوئی بھی گندی یا نجس قوت اس ہالے کے اندر نہیں داخل ہو سکے گی، اگر ایسا نہ ہوتا میرے عزیز! تو شاید......" وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہوگیا تو میرا تجسس بڑھ گیا۔

"تم چُپ کیوں ہوگئے؟"

"میری درخواست ہے میرے عزیز! کہ آپ اس انگوٹھی کی حفاظت اپنی جان سے بھی زیادہ کریں۔ کچھ قوتیں اسے آپ کے پاس برداشت نہیں کرنا چاہتیں۔ جس دن یہ انگوٹھی آپ کے ہاتھ سے نکل گئی وقت کا بھنور آپ کو پوری طرح سمیٹ کر بے بس کردے گا۔ یہ اور بات ہے کہ اس وقت بظاہر آپ کے ہاتھ آج سے زیادہ مضبوط ہوں گے۔"

"میں تمہاری بات کا مقصد نہیں سمجھ سکا۔"

"مجھے افسوس ہے۔ اس سے زیادہ میں آپ کو بتا بھی نہیں سکتا۔"

"بتا نہیں سکتے یا گریز کر رہے ہو؟"

"میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا میرے عزیز! رُوحوں کی ایک حد مقرر ہوتی ہے۔ اس سے آگے وہ بھی پرواز سے قاصر ہوتی ہیں۔"

"آج تم الجھی الجھی باتیں کر رہے ہو معمّوں کے اشاروں جیسی ذو معنی باتیں۔"

"میں مجبور ہوں میرے عزیز!"

"ہماری ملاقات کب ہوگی؟" میں نے موضوع بدل دیا۔

"ہم عنقریب ایک دوسرے سے ملیں گے اور پھر یہ خادم آپ کی نگاہوں کے سامنے ہوگا۔"

میں نے جیکسن کو رخصت کردیا۔ میرا خیال تھا جیکسن ہنگارو کی رُوح کے ذریعے اور ریگا کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کو "ڈی کوڈ" (DE-CODE) کرانے میں کامیاب ہوجائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ انگوٹھی کے بارے میں اس نے بھی اسی خدشے کا اظہار کیا کہ میرے دشمن اس کی برکتوں کے سائے سے مجھے محروم کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آسکی کہ انگوٹھی کے چلے جانے کے بعد میرے ہاتھ کس طرح زیادہ مضبوط ہوجائیں گے؟

میں اپنے خیالوں سے الجھتا رہا پھر میرے ذہن میں رفیقی کا جملہ اُبھر آیا۔ اس نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ کبھی کبھی میں انگشتری کو چوم لیا کروں۔ خدا کے برگزیدہ بزرگ نے رفیقی کو

میری حفاظت اور نگرانی پر مامور کیا تھا۔ معاً میرے دل میں یہ خیال ابھرا کہ رفیقی کو طلب کر کے اس سے حالات کے بارے میں دریافت کیا جائے۔ میں نے اسے یاد کرنے کی کوشش کی لیکن اسی وقت پیٹر کی تلخ آواز میرے کانوں میں گونجی۔ وہ مارٹن سے کہہ رہا تھا۔ "کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ ہمیں بیوقوف بنانے کی کوشش کر رہا ہو۔"

"تم شاید بھول رہے ہو کہ یہ سب ہمارے رحم و کرم پر ہیں۔ اگر انہوں نے ہمیں الّو بنانے کی کوشش کی تو ہم پلک جھپکتے ہی ان کے جسم چھلنی کر دیں گے اور پھر آبی جانور ان کا لذیذ گوشت کھا کر یقیناً ہمیں دعاؤں کا مستحق سمجھیں گے۔"

"میرے ساتھی نے تم سے کچھ دیر سستانے کی مہلت طلب کی تھی لیکن تم۔۔۔" کیلاش نے بولنا چاہا لیکن پیٹر بھڑک اٹھا۔

"تم اپنی زبان بند رکھو۔" اس کے لہجے سے دشمنی اور حقارت کی بو آ رہی تھی۔ "دوبارہ ہمارے معاملے میں مداخلت سے گریز کرنا۔"

"باس کا یہ خیال درست ہے پیٹر! کہ تم ذہین بھی ہو اور گرم مزاج بھی لیکن جب حالات کی کڑیاں الجھی ہوئی ہوں تو انسان کو ٹھنڈے دل سے انہیں سلجھانے کی کوشش کرنا چاہیے۔" مارٹن نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"کیا یہ ممکن نہیں کہ یہ محض وقت برباد کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔" پیٹر کا لہجہ بدستور خشک تھا۔

"اگر یہ ثابت ہو جائے تو پھر تم کیا کرو گے؟"

"دور اندیشی کا تقاضہ یہی ہے کہ یا تو ہم ان کی زبانیں کھلوائیں یا پھر جہاز تک پہنچنے سے پیشتر انہیں ٹھکانے لگا دیں۔" پیٹر نے تیزی سے جواب دیا۔ "کیا یہ مناسب ہوگا کہ ہمارا جہاز ان کی نظروں میں آ جائے اور ہمیں کچھ حاصل بھی نہ ہو؟"

پیٹر نے یقیناً بڑی دور اندیشی کی بات سوچی تھی۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو شاید میں بھی اسی "لائن آف ایکشن (LINE OF ACTION)" پر عمل کرتا جو اس وقت پیٹر کے ذہن میں کلبلا رہا تھا۔ شاید اسی لیے مارٹن نے فوری طور پر اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میرے لیے اب آنکھیں کھول دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا چنانچہ میں نے رفیقی کو طلب کرنے کا ارادہ ترک کر کے آنکھیں کھول دیں اور پیٹر کو نفرت بھری نگاہوں سے گھورنے لگا۔ جیکسن سے گفتگو کے بعد مجھے یقین ہو گیا تھا کہ مارٹن اور اس کے ساتھی میرا اور درخشاں کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں گے۔

"تم مجھے ایسی نظروں سے کیوں گھور رہے ہو؟" پیٹر غصے سے بولا۔ "اپنی نگاہیں نیچی رکھو ورنہ۔۔۔۔"

"تم ابھی طفلِ مکتب ہو پیٹر!" میں نے درشت لہجہ اختیار کیا۔ "مجھے تمہارے بچپنے پر غصہ بھی آ رہا ہے اور ہنسی بھی۔"

"مارٹن!" پیٹر آپے سے باہر ہو کر چلّایا۔ "اس سے کہو اپنی گندی زبان بند کر لے ورنہ مجھے مجبوراً اسے خاموش کرنا پڑے گا۔"

"تمہارے فرشتے بھی ایسا کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔" میں نے جواباً گرج کر کہا۔ "کیا تم ہمیں مار کر اپنا کروڑوں کا نقصان برداشت کر سکو گے؟"

"کیا مطلب؟" مارٹن چونک اٹھا۔

"تم نے صرف پندرہ بیس لاکھ کی بات کی تھی مائی ڈیئر مسٹر مارٹن! لیکن میں جانتا ہوں کہ ان ہیروں اور جواہرات کی قیمت ایک کروڑ سے بھی زیادہ ہے۔" میں نے جیکسن سے حاصل کی ہوئی معلومات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سرد آواز میں کہا۔ "بولو کیا تم میری معلومات پر شبہ کر سکتے ہو؟"

"ہمیں واپس بھوری پہاڑیوں کی سمت چلنا چاہیے۔" پیٹر نے پھر ذہانت کا ثبوت دیا۔ "اڈگر اور ابو ریاض کو پکڑنے کے بعد ہم باس کو زیادہ خوش کر سکتے ہیں۔"

"میں نے کہا تھا پیٹر! کہ تم ابھی طفلِ مکتب ہو۔" میں نے فوری طور پر دوسرا پانسہ پھینکا۔ "اگر اڈگر اور ابو ریاض بھوری پہاڑیوں پر ہوتے تو میں ہیرے جواہرات اور اس کی مالیت کا اظہار کر کے حماقت کا ثبوت نہ دیتا۔ تمہیں یقین نہیں آتا تو بڑے شوق سے موٹر بوٹ کا رُخ موڑ لو۔ ہو سکتا ہے وقت برباد کرنے کے بعد تمہیں اس بات کا احساس ہو جائے کہ بیرسٹر جمال اصغر تمہارے لیے کتنی اہمیت کا حامل ہے۔"

مارٹن اور سیاہ فام حبشی کی آنکھیں میرے چہرے پر جم گئیں۔ پیٹر کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا۔ شاید اسے کروڑوں کی مالیت کے ہیرے جواہرات سے زیادہ اپنی عزت پیاری تھی۔ ڈیسوزا گونگا بنا موٹر بوٹ کا اسٹیئرنگ سنبھالے رہا۔ رومیو ٹی جوان کی گرفت ریوالور کے دستے پر مضبوط ہو گئی لیکن اس کی نگاہیں بدستور درخشاں پر جمی رہیں۔

کیلاش اور جیکب مجھے حیرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

"اگر وہ دونوں بھوری پہاڑیوں پر نہیں تو پھر کہاں ہیں؟" مارٹن نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "تمہیں ان کے فرار ہونے کا علم کس طرح ہوا اور یہ کہ ان کے قبضے میں کروڑوں کی مالیت کے ہیرے جواہرات ہیں؟"

"لاسلکی نظام بہت زیادہ ترقی کر گیا ہے میرے دوست!"

میں نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”ہم اور تم جس کاروبار میں ملوث ہیں اس میں ہر قدم ایک سوچے سمجھے منصوبے اور طے شدہ اسکیم کے تحت اٹھایا جاتا ہے۔ ذرا اپنے ذہن پر زور دینے کی کوشش کرو۔ اڈگر اور ابوریاض نے پہلے کبھی فرار ہونے کی کوشش نہیں کی۔ کیوں؟ اس لیے کہ پہلے ان پر اتنا زیادہ اعتماد نہیں کیا گیا تھا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

مارٹن میرا جواب سن کر ہونٹ چبانے لگا۔ جیکسن نے مجھے جو مختصر معلومات فراہم کی تھیں اس کے مطابق مارٹن اور اس کے گروہ کے افراد غیر قانونی تجارت میں ملوث تھے اور معقول معاوضے پر ہیرے جواہرات، افیون اور غیر ملکی راز ایک دوسرے کے ہاتھ فروخت کرتے تھے۔ ان کا سرغنہ کون تھا یہ بات گروہ کے کسی فرد کو نہیں معلوم تھی۔

اڈگر اور ابوریاض کو اس گروہ میں شامل ہوئے تین سال گزر چکے تھے۔ وہ دونوں بے حد کارآمد اور وفادار تھے لیکن ایک موقع پر ساتھیوں کی موجودگی میں ایک معمولی سی غلطی پر ان کے ساتھ ایسا ناروا سلوک کیا گیا جس نے ان دونوں کو ہم خیال اور باغی بنا دیا۔ انہوں نے طے کر لیا تھا کہ اپنے گمنام باس کو کوئی ایسا شدید نقصان پہنچائیں گے جو اسے تمام زندگی یاد رہے۔ وہ کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھے پھر انہیں وہ موقع مل گیا۔ ایک ملک نے کروڑوں روپے کے ہیرے جواہرات طلب کیے اور یہ ذمے داری ابوریاض اور اڈگر کو سونپ دی گئی۔ جس گروہ کو مال دے کر روانہ کیا گیا وہ چار آدمیوں پر مشتمل تھا، ان کی کمان چونکہ اڈگر کے سپرد تھی اس لیے اس نے نہایت آرام سے اپنے باقی دونوں ساتھیوں کو ہلاک کر دیا اور ابوریاض کے ہمراہ کسی جزیرے کی سمت نکل گیا جس کی اطلاع گروہ کے سرغنہ کو تین روز بعد ملی چنانچہ اس نے مارٹن اور اس کے ساتھیوں کو یہ ذمے داری سونپی کہ دونوں کو ہر قیمت پر تلاش کیا جائے۔ جیکسن نے مجھے یہ بھی بتا دیا تھا کہ ان ہیرے اور جواہرات کی اسمگلنگ کے لیے ایک ایسا طریقہ اختیار کیا گیا تھا کہ اگر وہ قانون کے ہاتھ لگ جاتے تو بھی مال برآمد نہیں ہو سکتا تھا۔ میں ان ہی معلومات کی بنا پر مارٹن اور اس کے ساتھیوں کو حیران کرنے میں مصروف تھا۔

”میرا خیال ہے کہ تم ہمارے گروہ کے بارے بہت کچھ جانتے ہو۔“ پیٹر نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”میں تمہارے اس خیال کی تردید نہیں کروں گا۔“ میں نے بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔

”باس ایسے لوگوں کو برداشت کرنے کی اجازت نہیں دیتا جو ہمارے کاروبار کے سلسلے میں کھوج لگانے کی کوشش کریں۔“

پیٹر نے سفاک انداز میں جواب دیا پھر مارٹن کو گھورتے ہوئے بولا۔ ”اب تمہارا کیا مشورہ ہے؟“

”نہیں۔“ مارٹن نے پیٹر کا اشارہ سمجھتے ہوئے تیزی سے ہاتھ اٹھایا۔ ”تم کسی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کرو گے۔ ڈی، آر! تمہارا کیا مشورہ ہے؟“

آخری جملہ سیاہ فام حبشی کو مخاطب کر کے کہا گیا۔ میں نے اپنی توجہ ڈی آر کی جانب مبذول کر دی جس کی نگاہیں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ میں اس بات کا اعتراف کرنے میں بخل سے کام نہیں لوں گا کہ وہ سیاہ فام حبشی حیرت انگیز قوتِ برداشت کا مالک ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت زیرک اور ہوشیار بھی تھا۔ جس انداز میں مارٹن نے اس سے مشورہ طلب کیا اس سے بھی صاف ظاہر تھا کہ مارٹن کے بعد اس وقت موٹر بوٹ پر اسی کو اہمیت حاصل تھی۔

حبشی نے مارٹن کی بات کا فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا۔ بڑی گہری نگاہوں سے مجھے گھورتا رہا پھر سپاٹ آواز میں بولا۔

”میرا مشورہ ہے کہ ان کا فیصلہ باس پر چھوڑ دینا چاہیے۔“

”میں بھی تائید کرتا ہوں لیکن اتنی بھیڑ کی کیا ضرورت ہے؟“ پیٹر نے مجھے قہر آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہم اپنے ساتھ صرف ایک اہم آدمی بھی لے جا سکتے ہیں۔ باقی لوگوں کا قصہ پاک کر دینا زیادہ مناسب ہوگا۔“

”میرا مشورہ ہے کہ یہ فیصلہ بھی باس پر چھوڑ دینا چاہیے کہ وہ کسے اہم سمجھتا ہے اور......“

”گروہ میں میری بھی کوئی حیثیت ہے۔“ پیٹر سیاہ فام حبشی کی طرف پلٹ پڑا۔ ”تم ہر معاملے میں میری بات کی......“

”نہیں پیٹر! نہیں۔“ حبشی نے بجلی کی طرح تڑپ کر اسٹین گن کا رُخ پیٹر کی جانب کیا پھر نہایت ٹھہرے ہوئے لیکن سفاک لہجے میں بولا۔ ”تم ڈی، آر سے اونچی آواز میں بولنے کی کوشش مت کرو۔ میری حیثیت کیا ہے؟ یہ تم بھی جانتے ہو۔ باس نے مجھے خون کی ہولی کھیلنے کی کھلی اجازت دے رکھی ہے اور میں باس کے سوا کسی اور کو جواب دینے کا پابند نہیں ہوں۔“

پیٹر کو شاید اپنی جلد بازی اور حبشی کی حیثیت کا احساس ہو گیا۔ اس نے اپنی توجہ جلدی سے مارٹن کی جانب مبذول کر لی۔

”میری ذاتی رائے بھی یہی ہے۔“ مارٹن فیصلہ کن آواز میں بولا۔ ”ہم انہیں باس کے سامنے پیش کرنے کے بعد ہی کوئی عمل کریں گے۔“

”تم نے عقلمندی کا فیصلہ کیا ہے مارٹن! اس لیے کہ ابھی تمہیں میرے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہوا کہ میں کون ہوں؟“ ہو

سکتا ہے کہ میں ہی ....." میں نے دیدہ و دانستہ اپنا جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔ "مجھے مایوسی نہیں ہوئی مارٹن کے علاوہ سیاہ فام حبشی بھی چونک اٹھا۔

"بکواس مت کرو۔" پیٹر نے مارٹن اور حبشی کا غصہ مجھ پر اتارنے کی کوشش کی۔ "اب اگر تمہاری زبان سے ایک لفظ بھی نکلا تو.....مم.....آہ.....ہا....."

پیٹر نے اپنا ریوالور بلند کرنے کی کوشش کی۔ ممکن ہے اس کا ارادہ محض مجھے خوفزدہ کرنے کا ہو لیکن میں نے پل بھر میں ایک فیصلہ کرلیا۔ کسی آدم خور چیتے کی سی پھرتی سے میں نے اپنا رُخ تبدیل کرکے جست لگائی پھر میری لات اتنی تیزی سے گھومی کہ پیٹر کو سنبھلنے کا موقع نہ مل سکا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر سمندر میں جا گرا اور خود پیٹر لڑکھڑاتا ہوا ڈیسوزا سے ٹکرا کر دوسری جانب الٹ گیا۔ اس کے ہونٹ پھٹ گئے تھے۔ خون کو اپنے چہرے پر محسوس کرکے وہ دیوانہ ہوگیا۔ تیزی سے قلابازی کھا کر اپنے قدموں پر دوبارہ کھڑا ہوا لیکن قبل اس کے وہ کوئی جوابی کارروائی کرتا مارٹن لپک کر درمیان میں آگیا۔

"ہٹ جاؤ میرے راستے سے۔" پیٹر خونخوار آواز میں چلایا۔ "میں اس کا خون کردوں گا۔"

"ہوش میں آؤ پیٹر! بات سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"نہیں، میں اس کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

پیٹر، مارٹن سے الجھ گیا۔ اس کے سر پر خون سوار تھا لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ڈیسوزا اور روسیوڈی جون کے لیے بھی حیرت انگیز ہی ثابت ہوا۔ سیاہ فام حبشی مارٹن کا اشارہ پاکر کسی تیندوے کی طرح جھپٹا پھر اس نے محض چند لمحوں میں پیٹر کو بےبس کرکے اسے طرح رسیوں میں جکڑ کر نیچے تختے پر ڈھیر کردیا کہ وہ اپنے جسم کو حرکت دینے سے بھی قاصر تھا۔

پیٹر کی زبان سے مارٹن اور سیاہ فام حبشی کی شان میں مغلظات اور انتہائی فحش گالیاں نکل رہی تھیں لیکن مارٹن نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ حبشی نہایت اطمینان سے اپنی جگہ جاکر بیٹھ گیا۔ روسیوڈی جون اس وقت بھی درخشاں کو دیکھنے میں مصروف تھا، شاید اسے دوسری باتوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔

میں نے ایک نگاہ مارٹن پر ڈالی پھر پلٹ کر اپنی نشست پر براجمان ہوگیا۔ مجھے خود بھی اپنے طرزِ عمل پر تعجب ہو رہا تھا۔ میں نے پیٹر پر اچانک حملہ کرنے میں جس پھرتی کا مظاہرہ کیا تو اس میں میرے ارادے کو بھی دخل تھا لیکن اس ارادے کے پیچھے کون سی قوت کارفرما تھی میں اسے کوئی نام نہیں دے سکتا۔ بہرحال جیکسن کی معلومات سے میں نے جس انداز میں فائدہ اٹھایا اس نے میرے دشمنوں کو سوچنے پر مجبور کردیا۔ مارٹن مجھے جن نظروں سے دیکھ رہا تھا ان میں تجسس اور غصے کی ملی جلی کیفیت شامل تھی۔

"جمال!" کیلاش نے سرگوشی کی۔ "میں تمہیں آئندہ محتاط رہنے کا مشورہ دوں گا۔"

"نہیں۔" میں نے بلند آواز میں جواب دیا۔ "اب ہمارے درمیان اس وقت تک کوئی گفتگو نہیں ہوگی جب تک ہم سی ہاک (SEA HAWK) پر نہیں پہنچ جاتے۔ اس کے بعد ہی کوئی فیصلہ ہوسکے گا۔"

سیاہ فام حبشی کی آنکھیں حیرت انگیز انداز میں چمکنے لگیں۔ اس بار مارٹن کے علاوہ ڈی جون بھی چونکا تھا۔ شاید اس لیے کہ میں نے اس جہاز کا نام لے دیا تھا جس پر ڈیسوزا کی اطلاع کے مطابق ہم چوبیس گھنٹے بعد پہنچنے والے تھے۔ میں نے مارٹن کو مزید الجھانے کی خاطر اپنی دستی گھڑی پر نظر ڈالی پھر نہایت اطمینان سے آنکھیں بند کرلیں۔

شام تک ہم کھلے سمندر میں سفر کرتے رہے۔ ہمارے درمیان گفتگو کا سلسلہ بالکل ختم ہوچکا تھا۔ ایک بار جیکب نے پانی مانگا اسے کو پانی دے دیا گیا۔

مارٹن اور اس کے ساتھی شاید مجھے اپنا نادیدہ باس سمجھ کر خاموش تھے لیکن وہ غافل نہیں تھے اپنی اپنی جگہ بےحد محتاط نظر آتے تھے۔ روسیوڈی جون کی بیہودگی کچھ کم ہوگئی مگر کبھی کبھی وہ دزدیدہ نظروں سے درخشاں کی جانب دیکھنے لگتا۔ وہ سب میری شخصیت کو سمجھنے اور بےنقاب کرنے کی ادھیڑبن میں نظر آرہے تھے لیکن سیاہ فام حبشی اس وقت بھی تمام فکروں سے بےنیاز نظر آرہا تھا شاید اسے مرنے اور مارنے کے سوا کسی اور کام سے کوئی غرض نہیں تھی۔

پیٹر کچھ دیر تک گالیاں بکتا رہا پھر تھک ہار کر خود ہی نڈھال ہوگیا۔ شام کو جب مارٹن نے کِٹ بیگ سے چائے کا تھرمس اور بسکٹ کے پیکٹ نکالے تو پیٹر کے ہاتھ پیر کھول دیے گئے۔ میرا خیال تھا کہ آزادی میسّر آتے ہی وہ سب سے پہلے ڈی آر کو ختم کرے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس کے چہرے سے بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا جیسے وہ تمام پُرانی باتیں فراموش کرچکا ہو۔ مارٹن نے اسے کِٹ بیگ ہی سے دوسرا ریوالور نکال کر دے دیا جسے پیٹر نے الٹ پلٹ کر غور سے دیکھا، اس کے راؤنڈ چیک کیے پھر نہایت بےپروائی سے انگلی میں پھنسا کر اسے تیز تیز دائرے کی صورت میں گھمانے لگا۔ میں اس کی حرکت

کا مقصد نہیں سمجھ سکا۔ ممکن تھا وہ اپنی اس حرکت سے ہمیں مرعوب کرنے کا خواہشمند رہا ہو یا پھر اپنے غصے کو تسکین پہنچانے کے خاطر بلا مقصد ایک شغل میں مشغول ہو گیا ہو۔

پھر مس کھولنے کے بعد مارٹن نے بیگ سے پلاسٹک کے بیکر نما ڈونگے نکالے اور سب کو چائے تقسیم کرنے لگا۔ مجھے اس کی وہ مہمان نوازی بھی کچھ عجیب لگی۔ باس کا نائب ہونے کی حیثیت سے وہ چائے کی تقسیم کا کام اپنے کسی ساتھی سے بھی لے سکتا تھا لیکن اس نے خود ہی باری باری ہر ایک کو چائے دینا شروع کر دی۔ پہلا ڈونگا پیٹر کے حصے میں آیا۔ شاید اس طرح مارٹن اسے یقین دلانا چاہتا تھا کہ وہ گزری ہوئی باتوں کو بھول چکا ہے۔ پیٹر ڈونگا لے کر مسکرایا پھر چائے پینے میں مصروف ہو گیا۔ مارٹن کے ساتھیوں کے علاوہ ہم نے بھی خاموشی سے چائے پینا شروع کر دی۔ تقریباً دس گیارہ گھنٹے کے اکتا دینے والے سفر نے ہمارے اعصاب کو بوجھل کر دیا تھا۔ چائے کے پہلے ہی گھونٹ سے مجھے تقویت کا احساس ہوا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کی جانب دیکھا وہ ابھی تک کسی سوچ میں مبتلا تھے۔ ساتھ ساتھ چائے کا گھونٹ بھی لے رہے تھے لیکن درخشاں۔ اس نے ابھی تک ڈونگے کو منہ سے نہیں لگایا تھا۔ ایک عورت ہونے کی وجہ سے شاید گزرے ہوئے پریشان کن لمحات نے اس کے اعصاب پر گہرا اثر کیا تھا۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ اس وقت اسے چائے سے زیادہ کچھ دیر آرام کی شدید ضرورت تھی۔

موٹر بوٹ اتنی بڑی نہیں تھی کہ ہم کھل کر بیٹھ سکتے۔ درخشاں نچلے تختوں پر بھی نہیں لیٹ سکتی تھی۔ میں کچھ دیر تک اس کے چہرے پر تھکن اور تفکرات کے ملے جلے تاثرات دیکھتا رہا پھر آہستہ سے پوچھا۔

”درخشاں! کیا تم تکان محسوس کر رہی ہو؟“

وہ میری بات سن کر اس طرح چونکی جیسے کچی نیند سے بیدار ہوئی ہو یا میری آواز نے اس کے خیالات کا شیرازہ منتشر کر دیا ہو۔ میری جانب اس نے جن نظروں سے دیکھا ان میں بے پناہ شگفتگی اور تازگی تھی۔ تھکن یا اعصابی دباؤ کا دُور دُور تک کوئی سراغ نہیں تھا۔ میرا دل چاہا کہ کیلاش سے اپنی جگہ تبدیل کر لوں۔ مجھے یقین تھا کہ میرے قرب کا احساس اس پر خوشگوار اثر مرتب کرے گا۔ خود مجھے بھی اس کی دوری شاق گزر رہی تھی لیکن میں نے اپنی خواہش کا گلا گھونٹ دیا۔ حالات کے پیشِ نظر ہماری ایک معمولی سی لغزش بھی بنا بنایا کھیل بگاڑ سکتی تھی۔

## انگلش

مرسلہ جمیلہ عندلیب
میرپور آزاد کشمیر

شاہد نے اسکول سے آتے ہی امی جان کو کہا ”ممی! پلیز کم ہیئر“ امی نے خوشی سے کہا ”شاباش“ تمہیں خوب انگلش بولنا آگئی ہے، یہ بتاؤ جب مجھے گھر سے باہر بھیجنے کا ارادہ ہو تو تم کیا کہو گے، شاہد کافی دیر غور کرتا رہا۔ پھر دوڑ کر گیٹ سے باہر نکل گیا۔ بلانے کا اشارہ کرتے ہوئے بلند آواز میں بولا۔ ”ممی! پلیز کم ہیئر۔“

”تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟“ میں نے اپنا سوال دُہرایا۔

”تمہارا اندازہ غلط ہے۔ میں اپنے خیالوں میں گم تھی اس لیے شاید تم نے.....“

درخشاں کے لب و لہجے سے پیار و محبت کی چاشنی ٹپک رہی تھی۔ میں نے اُسے ٹوکتے ہوئے کہا ”تمہاری چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“

”مجھے چائے کی مطلق خواہش نہیں۔“ وہ بے پروائی سے مسکرائی پھر قبل اس کے کہ میں اصرار کرتا درخشاں نے اپنا ہاتھ گھمایا اور چائے کو ڈونگے سمیت سمندر کی لہروں پر اچھال دیا۔

مارٹن کی نگاہوں کے زاویے بدل گئے۔ سیاہ فام حبشی کی خوفناک نگاہوں میں بھی غصے کی شدید کیفیت نمودار ہونے لگی۔ درخشاں کی حرکت نے میرے دشمنوں کے اعصاب میں ایک بار پھر تناؤ پیدا کر دیا تھا۔ ان کے تیور بدل رہے تھے۔

”تم نے یہ کیا حرکت کی؟“ میں نے درخشاں کو موقع کی نزاکت کا احساس دلانے کی خاطر قدرے خشک اور درشت لہجہ اختیار کیا۔

”مجھے افسوس ہے لیکن.....“ درخشاں نے کچھ کہنا چاہا لیکن پیٹر نے اس کی بات کاٹ دی۔

”کوئی فرق نہیں پڑتا مادام درخشاں!“ اس نے مارٹن کو جلانے کی خاطر بڑے پُر اخلاق انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ ”باس، اگر کروڑوں کا نقصان برداشت کر سکتا ہے تو بھلا اس کی نظروں میں پلاسٹک کے ایک حقیر ڈونگے کی کیا حیثیت ہو سکتی ہے۔“ پھر وہ یکدم میری طرف پلٹ کر بولا۔ ”کیوں مسٹر جمال! کیا میں نے کوئی غلط بات تو نہیں کہی؟“

”بات نقصان یا فائدے کی نہیں، اصول بہرحال اصول ہوتا ہے۔“

”پھر آپ مادام درخشاں کے لیے کیا سزا تجویز کرتے

ہیں؟" پیٹر کے لہجے میں خنجر کی کاٹ تھی۔ میں چونکا۔ فوری طور پر میرے ذہن میں یہی خیال ابھرا کہ پیٹر مارٹن پر طنز نہیں کر رہا بلکہ اس پر میری شخصیت بے نقاب کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ شاید وہ اپنے ساتھیوں کو اس بات کا احساس دلانا چاہتا تھا کہ میں وہ نہیں جو وہ لوگ سمجھ رہے تھے۔

پیٹر کے جملے کے اختتام کے ساتھ ہی مارٹن اور اس کے ساتھیوں کی نگاہیں بھی میرے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔ میرے لیے وہ لمحہ بڑی آزمائش کا تھا۔ میں ایک پل کے لیے گھبرا سا گیا لیکن دوسرے ہی لمحے میرے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ ابھر آئی۔ ابھی میری جھولی میں جیکسن کی فراہم کردہ معلومات کا کچھ ذخیرہ باقی تھا چنانچہ میں نے پیٹر کو گھور کر دیکھا پھر سپاٹ آواز میں بولا۔ "میں تمہاری باتوں کا مقصد سمجھ رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تم اپنے ساتھیوں کو کیا باور کرانے کی کوشش کر رہے ہو۔"

"آپ خواہ مخواہ بات کو طول دے رہے ہیں جناب! میں نے تو یوں ہی مذاق میں ایک بات کہہ دی تھی۔" پیٹر شانے اچکاتے ہوئے بولا۔

"گروہ میں تمہاری شمولیت کو بہت زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔" میں نے پیٹر کو چھیڑ دیا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" پیٹر یکلخت سنجیدہ ہو گیا۔ میں چاہتا بھی یہی تھا کہ اس کو غصہ دلا کر دوبارہ اس کے ساتھیوں سے الجھا دوں۔

"مجھے یقین تھا کہ میری بات سن کر تم پھر غیر مہذب ہو جاؤ گے۔"

"کیا تم اپنی زبان بند نہیں کرو گے....." اس کی گرفت ریوالور کے دستے پر مضبوط ہو گئی۔ تیور بتدریج خطرناک ہوتے جا رہے تھے۔

"میں نے بھی یہی مشورہ دیا تھا لیکن پہل تمہاری جانب سے ہوئی ہے۔" میں نے بے پروائی سے جواب دیا۔

"سچ سچ بتاؤ تم کون ہو؟" مارٹن نے سوال کیا۔ اس کا لہجہ اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ وہ ابھی تک میری شخصیت کے بارے میں کوئی آخری اور حتمی فیصلہ نہیں کر سکا البتہ مجھے مرعوب کرنے اور میری زبان کھلوانے کی خاطر اس نے اپنی پیشانی پر کچھ سلوٹیں ضرور پیدا کر لی تھیں۔

"تمہارا کیا خیال ہے؟" میں نے سپاٹ آواز میں پوچھا۔ "کیا تم ابھی تک وہ شل حالتوں اور ذہنی طور پر متضاد کیفیتوں کا شکار نہیں ہو؟"

"اپنی زبان قابو میں رکھو مسٹر!" مارٹن کے تیور بدل گئے۔ "تمہاری چرب زبانی نے مجھے الجھا ضرور دیا تھا لیکن....." وہ خاموش ہو کر بڑے غصے کی حالت میں اپنا نچلا ہونٹ کاٹنے لگا۔

"لیکن کیا؟ تم چپ کیوں ہو گئے؟"

"تمہارا کوڈ کیا ہے؟" مارٹن نے اس بار میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سرد لہجہ اختیار کیا۔

میرے پاس مارٹن کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس نے کمال ہوشیاری سے بساط پلٹ دی تھی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ اس کے اور گروہ کے باس کے درمیان کوئی ایسا تعارفی کوڈ یا اشارہ ضرور طے ہوگا جو غیر یقینی حالات میں ایک دوسرے کی شناخت کرا سکے۔ مجھے پہلے اس بات کا خیال ہوتا تو جیکسن سے اس ضمن میں بھی ضرور دریافت کر لیتا۔

"کس سوچ میں گم ہو؟" مارٹن گرج کر بولا۔ "اگر تم ہمارے اپنے ہو تو اپنا کوڈ بتاؤ ورنہ ہمیں مجبوراً تمہارے ساتھ سختی کا برتاؤ کرنا پڑے گا۔"

"سوری۔" میں نے سنبھالا لینے کی کوشش کی۔ "میں دوسروں کی موجودگی میں اپنا کوڈ نہیں بتا سکتا۔"

"کوئی خاص وجہ؟"

"ہاں۔" میں نے جلدی سے اپنے سوچے ہوئے منصوبے پر عمل کر ڈالا۔ "وہ کوڈ جو ہمارے درمیان طے ہے وہ کسی تیسرے کے علم میں نہیں آنا چاہیے ورنہ ہمیں اپنا سٹ اپ نئے سرے سے ترتیب دینا ہوگا۔"

مارٹن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میری بات نے اسے ایک بار پھر الجھا دیا۔ کچھ دیر تک وہ اپنی جگہ خاموش بیٹھا میرے چہرے کے تاثرات پڑھتا رہا پھر ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور سرسراتی آواز میں بولا۔ "ٹھیک ہے۔ میں تمہارے قریب آتا ہوں۔ تم وہ کوڈ میرے کان میں کہہ دو۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" میں نے بظاہر بے پروائی کا مظاہرہ کیا لیکن جب مارٹن نے اپنے قدم آگے بڑھائے تو میری حالت دگرگوں ہونے لگی۔ آنے والا لمحہ ہمارے حق میں کیا فیصلہ کرنے والا تھا اس کا مجھے مطلق کوئی علم نہیں تھا۔

مارٹن دو قدم اور آگے بڑھ کر میرے بالکل قریب آگیا۔ اس کی انگلیاں جونک کی طرح آٹومیٹک ریوالور کے دستے اور ٹریگر پر جمی ہوئی تھیں۔ میری ایک معمولی سی غلطی میرے ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اتارنے میں بہت کافی ثابت ہوتی لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری۔ ابھی میرے جسم پر مجذوب کی انگشتری اور جینی کا دیا ہوا ربیک کا تحفہ باقی تھا۔ میں نے فوری طور پر خود کو حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے تیار کیا پھر مارٹن کو گھورتا ہوا اٹھا۔

”میرا خیال تھا کہ میں نے جو اشارے تمہیں دیے ہیں وہی تمہارے لیے کافی ہوں گے۔“

”نہیں۔“ مارٹن سنجیدگی سے بولا۔ ”تم نے جو باتیں کی ہیں وہ ہمارے جیسے کاروبار میں ملوث کوئی آدمی بھی کر سکتا ہے۔“

”یہ بات تم پہلے بھی سوچ سکتے تھے۔“ میں نے اسے حقارت سے گھورا۔

”اب بھی کچھ زیادہ وقت نہیں گزرا۔“

”اگر میں کوڈ دہرانے سے انکار کر دوں تو؟“

”تو پھر تمہارا فیصلہ میرے ساتھیوں کی مرضی سے ہوگا۔“

”تم نے کہا تھا کہ تمہیں گروہ میں نائب کی حیثیت حاصل ہے۔“

”میں نے غلط نہیں کہا تھا لیکن تم نے اپنی باتوں سے ہمارے درمیان پھوٹ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے تمہاری زندگی اور موت کا انحصار اب میرے دوستوں کے مشورے پر ہوگا۔ یہ مارٹن کا آخری فیصلہ ہے۔“

”سوچ لو۔ ہماری موت کے بعد تم اڈگر اور البدریاض کی گرد کو بھی نہ پا سکو گے اور شاید تمہارا باس اتنا بڑا نقصان نہ برداشت کر سکے۔“

”یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے تم فکر مت کرو۔“

”ایک بار پھر غور کر لو مارٹن!“ میں نے بدستور سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”تم نے آج تک اپنے باس کی شکل نہیں دیکھی، تمہیں جو احکامات موصول ہوتے ہیں وہ برقی اور لاسلکی نظام کے ذریعے موصول ہوتے ہیں۔“

”تم وقت ضائع کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔“ مارٹن ہونٹ چباتے ہوئے سفاک لہجے میں بولا۔ ”کوڈ یا موت۔ دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لو۔“

”کوڈ۔“ میں نے الفاظ چباتے ہوئے کہا۔

”کان قریب لاؤ لیکن اتنا یاد رکھنا کہ تمہیں بعد میں پچھتانا پڑے گا۔“

مارٹن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مشکوک نظروں سے گھورتا ہوا اپنا چہرہ میرے قریب لے آیا۔ ایسا کرتے ہوئے اسے اپنی نگاہوں کے زاویے بھی بدلنا پڑے۔ مجھے اسی ایک لمحے کی تلاش تھی۔ موت کو سر پر منڈلاتا دیکھ کر میں نے زندگی کا جوا کھیلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔ مارٹن کی نظر چوکتے ہی میں نے گھٹنے کی ایک شدید ضرب اس کے پیٹ میں لگائی۔ وہ کراہ کر جھکا اور میں نے پلک جھپکتے میں اس کا ریوالور اپنے قبضے میں کر لیا۔ میں نے مارٹن کو ڈھال بنا کر اس کے ساتھیوں کو اپنے حکم پر چلانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ میرے اُلٹے ہاتھ کا حلقہ برق رفتاری سے اس کی گردن پر تنگ ہونے لگا لیکن سیاہ فام حبشی جو موقع کی نزاکت بھانپ چکا تھا مجھ سے زیادہ پھرتیلا ثابت ہوا۔ مارٹن کے حلق سے نکلنے والی کراہ جیسے اس کے لیے خطرے کا سگنل تھی۔ اس نے تیزی سے خود کو نیچے گرایا پھر قلابازی کھاتے ہوئے فائر جھونک مارا۔ مجھے اپنی داہنی ران میں ایسی شدید جلن محسوس ہوئی جیسے کسی نے اس میں گہرا شگاف لگا کر سُرخ مرچیں بھر دی ہوں۔

حبشی کا نشانہ غضب کا تھا۔ پہلی گولی لگنے کے بعد

## سائنسیات

طارق سلطان اعوان
حیدر آباد

سائنس کی اہمیت و افادیت سے کسی کو انکار نہیں۔ کل کے مقابلے میں سائنس نے آج بہت ترقی کر لی ہے۔ انسانی اعضا کی پیوند کاری اور دل کی تبدیلی کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ دل کے علاوہ آئندہ جب جسم کے دوسرے اعضا بھی مختلف دھاتوں کے استعمال میں آنے لگیں گے تو موٹروں کے کارخانے کی طرح انسانوں کی مرمت کے کارخانے بھی کھل جائیں گے اور پھر یہ ہُوا کرے گا۔

**کاروباری اشتہار**

اپنے آپ کو مکمل طور پر اوورہال کرانے کے لیے ہمارے کارخانے کی خدمات حاصل کریں۔

**تلاش گمشدہ**

میرا پرس کہیں گر گیا ہے جس میں میری ایک آنکھ اور ایک گردہ تھا۔ اگر کسی صاحب کو ملے تو وہ اُسے اس پتے پر پہنچا دیں۔

**بات چیت**

”میں نے اپنی آنکھوں کے دونوں ساکٹ بلب بدلوا لیے ہیں۔“

”ابّا نے کہا ہے کہ اگر آپ کھانا چکے ہیں تو اپنا معدہ آج رات کے لیے دے دیجیے۔ انھیں ایک دعوت میں جانا ہے۔“

”میری ایک آنکھ کا فیوز اُڑ گیا تھا۔ وہ ایک بجلی والے سے لگوانے گیا تھا۔“

میں سنبھل بھی نہ سکا تھا کہ اس نے پینترا بدل کر دوسرا فائر کیا اور اس بار میرا بایاں شانہ اُدھڑ کر رہ گیا۔ وقت کی بساط میرے حق میں منحوس ثابت ہوئی۔ میں نے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن اسی لمحے مارٹن نے اپنا ریوالور میرے ہاتھ سے جھپٹ لیا پھر اس نے سیدھا ہاتھ بلند کر کے کہنی کا اتنا بھرپور وار میری گردن پر کیا کہ میری ہمت جواب دے گئی۔

پل بھر میں بازی پلٹ گئی۔ میں تیورا کر موٹر بوٹ کے تختوں پہ گرا۔ میرے کانوں میں حبشی کا خونخوار جملہ گونجا۔ اس نے شاید میرے ساتھیوں کو کور کرنے کے بعد تنبیہہ کی تھی۔

”خبردار، اگر کسی نے ذرا بھی جنبش کی تو اس کا جسم چھلنی کر دوں گا۔“

مجھے اتنا یاد ہے کہ گرتے وقت میں نے درخشاں کی جانب دیکھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ پیش آنے والے حالات سے خوفزدہ اور نروس ہوگی لیکن ایسا نہیں تھا۔ ممکن ہے وہ میرا وہم ہو، مگر جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے درخشاں کے یاقوتی ہونٹوں پر اس وقت بھی ایک معنی خیز تبسم موجود تھا۔ میں نے اس مسکراہٹ کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کی لیکن وقت نے میرا ساتھ نہیں دیا اور میرا ذہن گھپ اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا۔

❁

وہ ایک نہایت پرسکون اور آرام دہ بستر تھا۔ کمرے کا ماحول خوابناک تھا، وہاں کی ہر چیز میں ایک حسن ایک سادگی موجود تھی۔ میں نے تیزی سے پلکیں جھپکانا شروع کر دیں۔ میں شاید کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنے بوجھل ذہن کو کریدنا شروع کیا۔ مجھ پہ غنودگی کی حالت طاری تھی لیکن سب مجھے یاد آگیا۔ وہ مارٹن کی شدید ضرب تھی جس نے مجھے موٹر بوٹ پہ اوندھے منہ گرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میری نگاہوں کے سامنے سیاہ فام حبشی کا چہرہ اُبھر آیا۔ اس نے فائر کر کے میری داہنی ران اور بائیں شانے کو زخمی کر دیا تھا۔

میں نے نظر گھما کر بائیں شانے کی سمت دیکھا جہاں نہایت سلیقے سے پٹی بندھی ہوئی تھی۔ ہاتھ کو جنبش دینے کی کوشش کی تو درد سے تڑپ اٹھا۔ میری داہنی ران بھی پھوڑے کی طرح دکھ رہی تھی۔ میں شاید دشمنوں کی قید میں تھا۔ وہ میرے زخموں کی مرہم پٹی کر کے میری زندگی بچانا چاہتے تھے اس لیے کہ انہیں مجھ سے اڈگر اور البوریاضی کا کھوج نکالنا تھا لیکن میرے ساتھی؟ میرے ذہن کو جھٹکا لگا۔ کہیں ان درندوں نے کیلاش اور جیکب کو مار تو نہیں ڈالا اور میری زندگی.... میری رُوح..... میری درخشاں کا کیا بنا؟ میرے دماغ میں پریشان کن سوالات ابھرنے لگے۔

”مسٹر جمال! کیا آپ خود کو پہلے سے بہتر محسوس کر رہے ہیں؟“ ایک مہذب نسوانی آواز میری قوتِ سماعت سے ٹکرائی۔ میں نے فوراً گردن گھما کر دوسری سمت دیکھا۔ وہ ایک پیشہ ور نرس نظر آ رہی تھی، اس کے چہرے پہ مریم کا تقدس تھا، نگاہوں میں ہمدردی تھی۔ سفید لباس میں وہ بے حد حسین معلوم ہو رہی تھی۔ میں ایک ثانیے تک اسے سراپا دیکھتا رہا۔ وہ مجھ سے میری خیریت دریافت کر رہی تھی۔ بحیثیت نرس وہ اپنے پیشے کے فرائض انجام دے رہی تھی لیکن شاید وہ بھی میرے دشمنوں کے جتھے کی ایک فرد تھی، ایک خوبصورت اور حسین ناگن۔ میرے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے۔ میں نے قدرے تلخ لہجے میں دریافت کیا۔

”کون ہو تم اور میں اس وقت....“

”پلیز مسٹر جمال!“ نرس نے تیزی سے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”ڈاکٹر نے آپ کو فی الحال صرف آرام کا مشورہ دیا ہے۔“

”ڈاکٹر!“ میں چونکا۔ ”ڈاکٹر کیلاش کہاں ہے اور....“

”پریشان مت ہوں۔“ وہ جلدی سے مسکراتے ہوئے بولی۔ ”آپ کے ساتھی خیریت سے ہیں۔ ڈاکٹر کیلاش اور فادر جیکب بس آتے ہی ہوں گے ملاقاتیوں کی آمد کا وقت ہو چکا ہے۔“

”کیا؟“ میں نے اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔ ”میں.... اس وقت کہاں ہوں؟“

”اسپتال میں۔“

”اسپتال۔“ میں نے دل ہی دل میں کہا پھر بولا۔ ”نرس، کیا یہ اسپتال....“

میں اپنا جملہ مکمل نہ کر سکا۔ کیلاش اور جیکب کے آجانے سے میری توجہ ان کی طرف مبذول ہو گئی۔ کیلاش مجھے ہوش میں دیکھ کر تیزی سے میرے قریب آیا پھر نرس سے مخاطب ہو گیا۔ ”سسٹر! کیا اب میرے دوست کو دوبارہ....“

”حالات پر منحصر ہے۔“ نرس نے مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھا پھر زیرِ لب مسکراتی واپس چلی گئی۔

"ربِّ عظیم کا احسان ہے کہ اس وقت تم پوری طرح ہوش و حواس میں ہو۔" جیکب نے خوشی کا اظہار کیا۔
"ہم اس وقت کہاں ہیں؟" میں نے کیلاش سے پوچھا۔
"امریکہ کے ایک اسپتال میں۔"
"امریکہ!" میں نے حیرت کا اظہار کیا۔ "ہم یہاں کیسے پہنچے؟"
"میں تم سے درخواست کروں گا میرے دوست! کہ اپنے ذہن پر زیادہ بوجھ مت ڈالو۔" کیلاش نہایت اپنائیت سے بولا۔ "دو چار روز کے مکمل آرام کے بعد تمہاری کیفیت اور زیادہ بہتر ہوجائے گی۔"
"وہ.... میری درخشاں کہاں ہے؟" میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے سوال کیا۔
"وہ بھی خیریت سے ہے۔" کیلاش نے جلدی سے کہا پھر بات کا رُخ بدلتے ہوئے بولا۔ "اب تم ذاتی طور پر خود کو کیسا محسوس کر رہے ہو؟"
"ہم موٹر بوٹ میں تھے کیلاش!" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "مارٹن میرے قبضے میں آجاتا تو اس کے ساتھی ہمارے رحم و کرم پر ہوتے لیکن، وہ سیاہ فام حبشی زیادہ چالاک ثابت ہوا۔ مجھے یاد ہے اسی کی گولیوں نے مجھے شدید زخمی کر دیا تھا۔ مجھ پر نقاہت طاری ہوگئی تھی پھر...."
"بھگوان کی کرپا ہے کہ گولی نے تمہارے صرف گوشت کی خیریت دریافت کی۔ ہڈی کا کوئی حصّہ یا جوڑ متاثر نہیں ہوا ورنہ...."
"کیا تم مجھے بتاؤ گے کہ مارٹن کے ساتھیوں نے ہمیں آزاد کیوں کر دیا؟"
"جمال! تمہیں فی الحال...."
"نہیں۔" میں تیزی سے بولا۔ "میری ذہنی حالت پوری طرح بحال ہے۔ تم مجھے تفصیل سے بتاؤ میرے بیہوش ہونے کے بعد کیا ہوا تھا؟"
"مارٹن اور اس کے ساتھی ہمیں اپنے جہاز پر لے گئے لیکن وہاں پہنچنے کے بعد اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ ہمیں دھوکے سے پکڑ لیا گیا ہے۔ دراصل انہیں کچھ دوسرے لوگوں کی تلاش تھی۔ پھر بھی انہوں نے ہمیں تین چار روز تک مزید اطمینان کے لیے جہاز پر ہی قید کیے رکھا۔ جب گروہ کے سرغنہ کی طرف سے ہمارے بے گناہ ہونے کی تصدیق ہوگئی تب ان کا سلوک ہمارے ساتھ قدرے بہتر ہوگیا۔ پھر انہوں نے ہمیں زبان بند رکھنے کی سختی سے تاکید کی اور...." کیلاش نے اپنا بیان مختصر کرنے کی خاطر ایک لمحے کی خاموشی کے بعد کہا۔ "میں تمہارے بہتر علاج کے لیے تمہیں امریکہ لے آیا۔ بھگوان کا شکر ہے کہ آج تم...."
"کیا تمہارے بیان سے میں یہ سمجھوں کہ آج میں بہت دنوں بعد ہوش میں آیا ہوں۔" میں نے کیلاش کو حیرت سے تکتے ہوئے پوچھا۔
"ہاں۔ تمہارے زخموں کی حالت خراب تھی اس لیے ڈاکٹروں کے مشورے سے تمہیں زیادہ تر بیہوش ہی رکھا گیا۔"
"اور میں تمہیں مقدس مسیح کے نام پر یہی مشورہ دوں گا کہ پرانی باتوں کو خواب سمجھ کر بھولنے کی کوشش کرو۔" جیکب نے سرد آہ بھر کر کہا۔ "یہ سمجھ لو کہ ہم نے کھلی آنکھوں سے جو کچھ دیکھا وہ سب فریبِ نظر تھا۔ سراب تھا اور حقیقت صرف اتنی ہے کہ ربِّ عظیم نے ہمیں دوبارہ مہذب دنیا میں واپس پہنچا دیا۔ مارٹن کے گروہ کے لوگ ہمارے لیے آزادی کا وسیلہ ثابت ہوئے۔"
"درخشاں کہاں ہے؟" میں نے جیکب کے چہرے کے تاثرات سے الجھتے ہوئے کیلاش سے دریافت کیا۔ "تم اسے ساتھ کیوں نہیں لائے؟"
"وہ.... دراصل.... مجھے یقین نہیں تھا کہ تم اتنی جلدی...."
"کیلاش!" میں اسے گھورتے ہوئے بولا۔ "تم مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہو۔ مجھے بتاؤ، میری زندگی کہاں ہے؟"
"تم کو آرام کی ضرورت ہے میرے دوست!"
"نہیں۔" میں تلملا اٹھا۔ "مجھے صرف درخشاں کی ضرورت ہے۔"
"خداوند تم پر اپنی رحمتیں نازل کرے۔" جیکب نے آہستہ سے کہا۔ "درخشاں بھابی کے سلسلے میں بھی تمہیں اپنے دل کو سمجھانا ہوگا۔ وہ...."
"وہ کہاں ہے؟" میں نے جیکب کا جملہ مکمل نہیں ہونے دیا۔ اس کے لہجے میں مایوسی کا جو انداز تھا اس سے میری وحشتیں دوچند ہونے لگیں۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو کیلاش نے میرے بازو تھام لیے۔ وہ مجھے سمجھاتے ہوئے بولا۔
"ہوش میں آؤ جمال! یہ کیا دیوانگی ہے۔ ابھی تم اس قابل نہیں ہو کہ اپنے پیروں پر...."
"کیلاش! میں تمہیں تمہارے بھگوان کی قسم دیتا

ہوں، اپنی دوستی اور محبت کا واسطہ دیتا ہوں مجھے بتا دو کہ میری درخشاں کہاں ہے؟ اس کے بغیر میں ایک لمحے بھی زندہ نہ رہ سکوں گا۔"

کیلاش نے کوئی جواب نہ دیا۔ آنکھوں سے جیکب کو اشارہ کیا تو وہ مجھے دیکھتا ہوا تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔ مجھے کیلاش کی حرکتیں اور باتیں عجیب لگ رہی تھیں۔ میں اسے دیوانوں کی طرح گھورتا رہا۔ جیکب کے کمرے سے چلے جانے کے بعد اس نے آہستہ سے کہا۔ "درخشاں ہمارے ساتھ نہیں ہے لیکن وہ بہت جلد....."

"تم۔" میرے ذہن میں چنگاریاں سلگنے لگیں، میرے لہو کی گردش تیز ہو گئی۔ "تم اب بھی جھوٹ بول رہے ہو۔"

"میری بات کا یقین کرو جمال! مارٹن اور اس کے ساتھیوں نے درخشاں بھابی کو بطور یرغمال اپنے پاس جہاز پر روک لیا ہے۔" کیلاش نے سپاٹ آواز میں کہا۔ "انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ اگر ہم نے اپنی زبان بند رکھی تو وہ بہت جلد تمہاری امانت تمہیں واپس کر دیں گے۔"

"گویا تم میری درخشاں کو دشمنوں کے نرغے میں چھوڑ کر چلے آئے۔ شاید اس لیے کہ تمہیں اپنی زندگی میری درخشاں سے زیادہ پیاری تھی لیکن میں..... میں درخشاں کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا..... میں..... میں اسے واپس لاؤں گا خواہ اس کے لیے....."

میں نے پاگلوں کے انداز میں اٹھنے کی کوشش کی تو کیلاش پوری شدت سے مجھ سے لپٹ گیا۔ وہ مجھے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ میری حالت ابھی خطرے سے باہر نہیں لیکن میں اس کی گرفت سے آزاد ہونے کے لیے پوری جدوجہد کر رہا تھا۔ میں نے کیلاش کا منہ بھی نوچا اس کے بالوں کو جکڑ کر اکھاڑنے کی بھی کوشش کی، چیخا چلایا بھی مگر اس کی گرفت سے آزاد نہ ہو سکا پھر جیکب دوبارہ کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ایک امریکی ڈاکٹر اور اسپتال کا دوسرا عملہ بھی موجود تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ کیلاش نے جیکب کو باہر جانے کا اشارہ کیوں کیا تھا۔ میں نے خود کو آزاد کرانے کی ایک آخری کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ عملے کے لوگوں نے مجھے جکڑ کے بے بس کر دیا پھر مجھے زبردستی کوئی انجکشن دیا گیا جس کے بعد میری قوتِ مدافعت لمحوں میں ختم ہو گئی۔ رگوں میں دوڑتا ہوا کوئی زود اثر محلول تیزی سے میرے دماغ سے ٹکرایا اور دوسرے ہی لمحے میرا ذہن ایک بار پھر تاریکیوں میں غوطے کھانے لگا۔

❁

رفیقی کا چہرہ میری نگاہوں کے سامنے فضا میں لہراتا بل کھاتا ابھرا تو میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ خدا کے نیک اور برگزیدہ بندے نے اسے میری نگہداشت پر مامور کیا تھا۔ رفیقی نے مجھے یہی بتایا تھا کہ وہ مجذوب کے اشارے پر میرے کام آ رہا ہے اور ایک حد تک میری رہنمائی کرتا رہے گا۔ اس وقت اسے نگاہوں کے سامنے دیکھ کر میرے بے قرار دل کو قرار آ گیا۔ کیلاش نے درخشاں کے بارے میں جو کچھ کہا تھا وہ میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ مجھے جکڑ کر بیہوشی کا انجکشن لگانے کا عمل ممکن ہے ڈاکٹروں کے فیصلے کے عین مطابق رہا ہو لیکن کیلاش کی اس حرکت نے مجھے متنفر کر دیا تھا چنانچہ میں نے رفیقی کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے یقین تھا کہ تم اس آڑے وقت میں ضرور میرے کام آؤ گے۔ تمہیں یقیناً حالات کی ستم ظریفی کا علم ہوگا اور یہ بھی کہ میرے سنگ دل دشمنوں نے درخشاں کو بطور یرغمال اپنے قبضے میں رکھا ہے اور....."

"میں اور بھی بہت کچھ جانتا ہوں سیّدی لیکن....."

"لیکن کیا؟" میں نے تلملا کر کہا۔ "کیا تم درخشاں کے حصول میں میری مدد نہیں کرو گے؟"

"یاد کرنے کی کوشش کرو میرے عزیز! میں نے ڈھکے چھپے لفظوں میں پہلے بھی تمہیں یہی یاد دلانے کی کوشش کی تھی کہ تم ایک پرچھائیں کے تعاقب میں اپنا وقت برباد کر رہے ہو، جسے تم درخشاں سمجھ رہے ہو وہ گندی قوتوں کا ایک حسین فریب تھا جسے وقت نے تمہارے راستے سے ہٹا دیا۔ سیّدی! تمہیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ ایک بزرگ کی سفارش نے تمہیں بربادی کے راستوں پر بہت دور نکل جانے سے پہلے ہی بچا لیا۔ ذہن کو کریدنے کی کوشش کرو، عقل سے سوچو کیا اوریگا نے تم سے یہ درخواست نہیں کی تھی کہ تم ایک خاص وقت تک طلسم کدے کے تہہ خانے میں سوئی ہوئی روح سے بات نہیں کرو گے؟ اس فریبی بوڑھے نے جو شیطانی قوتوں کا مالک تھا مجذوب کی انگشتری کو اندھے کی لاٹھی کہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وقت کے حسین گردوپیش نے تمہاری آنکھوں میں جو چکا چوند پیدا کر دی ہے وہ تمہیں بزرگ کے لازوال تحفے کی جانب سے غافل۔

کر دے گی، تم زندگی کے پُرپیچ راستوں پر بھٹکتے رہو گے۔"
رفیقی کے لہجے میں جانے کیسا سحر تھا کہ میں چاہنے کے باوجود اسے بولنے سے نہ روک سکا۔ گم صم اس کی باتیں سنتا رہا۔ اس نے باور کرایا کہ درخشاں کی محبت اور اس کی جدائی نے وقتی طور پر ایمانی قوتوں کو کمزور کر دیا تھا جس کے سبب گندی اور سیاہ قوتوں نے مجھے شکار کرنے کا منصوبہ بنایا۔ مجھے اپنے جال میں پھانسنے کی خاطر اس طرح حسین اور پُرفریب وادیوں کے سحر انگیز ماحول میں بھٹکا دیا کہ میں ہر فریب کو حقیقت سمجھنے لگا۔ رفیقی نے کہا۔

"کیا تمہیں یاد نہیں کہ بھوری پہاڑیوں پر معمر جادوگروں نے درخشاں کو دیکھ کر اسے سجدے شروع کر دیئے تھے ۔ غور کرو سیّدی! تم ایک کلمہ گو مسلمان ہو، کیا خدا کے سوا کسی اور کو سجدہ جائز ہے؟ نہیں۔ تم نے ایک فریب کو اپنی زندگی، اپنی رُوح سمجھ کر وقت کے ہاتھوں سیکڑوں دھوکے کھائے ہیں۔ سوچو میرے عزیز! کیا اس فریبی عورت نے جو تمہارے سامنے درخشاں کا رُوپ اختیار کیے ہوئے تھی ایک موقع پر خود اقرار نہیں کیا تھا کہ وہ تمہارے دوستوں کو اپنے وجود کا یقین دلانے کی خاطر بے ہوشی کا ناٹک کھیل رہی تھی۔ اگر وہ تمہاری درخشاں ہوتی تو اسے تمہارے دوستوں کے ساتھ مکر و فریب کی کیا ضرورت تھی؟ کوئی جواب ہے تمہارے پاس؟"

"اگر وہ فریب ہے تو اسے میرے دشمنوں نے یرغمال بنانے کی حماقت کیوں کی؟" میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

"اس لیے کہ قدرت کو اب ان بدکاروں کی سرکوبی منظور ہے۔" رفیقی نے یقین سے کہا۔ "تم مجذوب کی مہربانیوں سے بچ گئے لیکن وہ جو درخشاں کو اپنے لیے مالِ غنیمت سمجھ رہے ہیں، قدرت کے ہاتھوں اذیت ناک تباہیوں اور بربادیوں کا شکار ہوں گے۔ ان کا انجام عبرت ناک ہوگا۔"

"رفیقی! تم.... تم کہیں میرے ساتھ کوئی مذاق تو نہیں کر رہے ہو؟" میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے ٹوٹتے لہجے میں پوچھا۔

"اب بھی وقت ہے سیّدی!" اس کی آواز میں میرے لیے ہمدردیاں کوٹ کوٹ کر بھری تھیں۔ "ہوش میں آنے کی کوشش کرو۔ تمہاری درخشاں مر چکی ہے، خداوندِ کریم کو یہی منظور تھا اور یاد رکھو، وہ جو مر جاتے ہیں دوبارہ لوٹ کر نہیں آتے۔ یہی ایک مسلمان کا عقیدہ ہے۔"

"ہاں، میں جانتا ہوں لیکن وہ .... وہ اگر فریب بھی تھی تو بھی میری درخشاں کی ہو بہو اور جیتی جاگتی تصویر تھی۔ سوچو رفیقی! اگر میری جگہ تم ہوتے تو تم پر کیا گزرتی؟"

"شاید میری حالت بھی تم سے مختلف نہ ہوتی۔" رفیقی نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ "کچھ روپ ایسے ہوتے ہیں جو اصل سے زیادہ پرکشش اور جاندار نظر آتے ہیں اور انسان کو راہِ راست سے گمراہ کرنے کے لیے گندی اور کالی قوتوں کی پیداوار ہوتے ہیں۔ یہی قدرت کا امتحان ہے میرے عزیز! جو ثابت قدم رہا اس نے منزل کو پالیا اور جس کے قدم ڈگمگا گئے وہ تاریکیوں میں بھٹکتا رہتا ہے۔ کیا تم نہیں جانتے سیّدی! وہ اپنے نیک بندوں کو وقت اور حالات کی کسوٹی پر پرکھتا ہے۔ امتحان لیتا رہتا ہے اور...."

"ممکن ہے تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ تمہاری باتیں دل کو لگتی ہیں لیکن میں کیا کروں؟ اسے کیسے فراموش کر دوں جو دل و دماغ میں خوشبو بن کر بس گئی ہے۔"

"سچے دل سے خدا کے حضور سجدہ ریز ہو جاؤ۔ وہی تمہاری مدد کرے گا، وہی تمہارے قلب کو سکون اور ایمان کی دولت سے مالا مال کرے گا۔"

"رفیقی!" میں نے دبی زبان میں درخواست کی۔ "کیا تم میری خاطر اسے دشمنوں کی قید سے رہائی دلا سکتے ہو؟"

"تم پھر بھٹک رہے ہو، سنبھلو سیّدی سنبھلو۔"

"میں جانتا ہوں کہ وہ میری نظروں کا فریب ہے، وقت اور حالات کی پیداوار ہے لیکن ہے تو میری درخشاں کی جیتی جاگتی تصویر۔"

رفیقی نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا ہیولا فضا میں تیرتا رہا۔ میرا آخری جملہ سن کر اس کے تیور بدل گئے پھر وہ یکلخت فضا میں تحلیل ہو کر میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ میرا اضطراب بڑھ گیا۔ رفیقی کی باتیں میرے ذہن میں گونج رہی تھیں۔ صدائے بازگشت بن کر میرے دل و دماغ پر آہنی ضربیں لگا رہی تھیں۔

تب مجھے جیکسن یاد آیا۔ میں نے اسے دل ہی دل میں آواز دی لیکن جیکسن کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ میرے جنون اور دیوانگی کی کیفیتوں میں اضافہ ہو رہا تھا۔ گزری ہوئی باتیں ایک ایک کر کے مجھے یاد آرہی تھیں پھر مجھے مجذوب کی یاد آئی جس کی انگشتری اس بات کی

دلیل تھی کہ میں نے کوئی خواب نہیں دیکھا تھا۔

انگشتری کا خیال آتے ہی میری نگاہیں لکڑی کی اس انگوٹھی پر جم گئیں جو میں نے مجذوب کے ہاتھ سے اتاری تھی۔ میں نے محسوس کیا جیسے خدا کے اس نیک بندے کی بخشی ہوئی انگوٹھی سے بھینی بھینی مہک اٹھ کر میرے دل و دماغ کو معطر کر رہی ہے، مجھے سکون پہنچا رہی ہے۔ اور پھر میں یکلخت چونک اٹھا۔ قہقہے کی وہ آواز اچانک ابھری تو میری توجہ انگشتری کی جانب سے ہٹ گئی۔ میں نے نظریں گھما کر دیکھا۔ مجذوب میرے قریب کھڑا دیوانہ وار قہقہے لگا رہا تھا۔ میں اسے آنکھیں پھاڑے دیکھتا رہا۔

"کیا دیکھ رہا ہے؟ آں.... کیا میں تیری محبوبہ ہوں؟" مجذوب نے یکلخت سنجیدگی اختیار کر کے سرسراتی آواز میں مجھے مخاطب کیا۔

"بابا! وقت نے میرے ساتھ دغا کی ہے۔ فریب کیا ہے۔"

"میری بات مانے گا؟" مجذوب نے دیدے نچاتے ہوئے بڑی رازداری سے کہا پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر آہستہ سے بولا۔ "تو بھی دنیا کی پشت پر ایک ٹھوکر مار کر اپنے تھان کی طرف سرپٹ دوڑ لگا دے۔ آئی سمجھ میں؟"

"تم آسمان کی بلندیوں تک پہنچ گئے ہو بابا! کچھ میری رہنمائی بھی کر دو۔" میں نے التجا کی۔

"اونچی اونچی چھلانگیں مار اگر۔ تو بھی اڑنا سیکھ لے گا لیکن تیری دُم.... کیا ہوئی تیری دُم؟" وہ عجیب نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔

"میری دُم کٹ گئی ہے بابا! وقت نے اسے مجھ سے چھین لیا۔"

"مٹی میں لوٹ لگا کے کپڑے جھاڑ لے۔ سارے دلدّر دور ہو جائیں گے۔"

"بابا! میری درخشاں کی حقیقت...."

"دُم کٹ گئی تو اسے ہلانا بند کر دے۔" مجذوب نے میری بات کاٹتے ہوئے بڑے جلالی انداز میں کہا۔ "ٹکٹکی باندھ کر اوپر والے نیلے گنبد کی طرف دیکھ۔ وہاں تجھے ہر چیز درخشاں نظر آئے گی۔"

"مجھے تمہاری رہنمائی کی ضرورت ہے۔" میں گڑگڑانے لگا۔ "مجھے مایوس نہ کرو بابا!"

"دُم کٹ جانے کا ملال نہ کر پگلے! تو غنی بھی ہے اور قسمت کا دھنی بھی.... جا.... واپس لوٹ جا۔"

"بابا! تم مجھے سہارا دے سکتے ہو۔"

"خبردار پلٹ کر مت دیکھنا.... جا.... دفع ہو جا.... تھان پر جا کر اوندھا ہو جا.... سر زمین پر مارنا سیکھ لے.... بیڑہ پار ہو جائے گا.... حق اللہ.... یاہُو.... یاہُو.... یاہُو...."

میں نے مجذوب کو روکنے کی بہتیری کوشش کی لیکن وہ "حق اللہ" اور "یاہُو" کے نعرے بلند کرتا ہوا میری نظروں سے غائب ہو گیا۔ اور پھر میں ہڑبڑا کر جاگ اٹھا۔

اسپتال میں بستر کے قریب کیلاش اور جیکب کے علاوہ عملے کے دوسرے لوگ بھی موجود تھے۔ میں انہیں خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا۔ ان کی نگاہوں میں میرے لیے تشویش کے تاثرات تھے۔

"جمال!" کیلاش نے مجھے نرم لہجے میں مخاطب کیا۔ "اب تم کیا محسوس کر رہے ہو؟ ڈاکٹروں نے مجھے یقین دلایا ہے کہ تم بہت جلد روبصحت ہو جاؤ گے۔"

"اب اس کی ضرورت نہیں ہو گی۔ میں ہوش میں آگیا ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا پھر جیکب کی طرف دیکھ کر بولا۔ "تم آج ہی میری جاگیر کی طرف واپس لوٹ جاؤ۔ دیوان جی سے کہنا کہ وہ سارا حساب کتاب تمہیں سمجھا دیں۔ کیلاش کچھ دنوں بعد تمہارا ہاتھ بٹانے کے لیے پہنچ جائے گا۔"

"ربِ عظیم تم پر اپنا سایہ برقرار رکھے۔" جیکب پُرمسرت لہجے میں بولا۔ "مجھے یقین تھا تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

"تمہارا کیا پروگرام ہے؟" کیلاش نے میرے چہرے کے تاثرات دیکھتے ہوئے دبی زبان میں سوال کیا۔

"مجھے اپنے آپ کو پانے کے لیے ابھی ایک سفر اور کرنا پڑے گا۔" میں نے اشکِ ندامت بہاتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ سفر میری زندگی کا آخری سفر ہو گا۔"

"کیا مطلب؟" کیلاش چونکا۔ "تم کس سفر کی بات کر رہے ہو؟ ابھی تو تمہاری حالت...."

"میں جس سفر کی بات کر رہا ہوں اس میں جسم کی نہیں رُوح کی قوت درکار ہوتی ہے۔"

"میں سمجھا نہیں؟"

"تم نہیں سمجھ سکو گے کیلاش!" میں نے مسکرا کر جواب دیا پھر ایک طویل سانس لے کر آنکھیں موند لیں۔

میری نگاہوں کے سامنے مجذوب کا چہرہ ابھر آیا جو پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ میں نے اس کے تعاقب میں قدم آگے بڑھا دیے۔

ضیاء تسنیم بلگرامی

وہی صفات، وہی خصوصیات اور ویسی ہی کرامات جیسی ان کے جدِ اعلیٰ حضرت غوث الاعظمؒ میں پائی جاتی تھیں۔ استغنا کے پیکر، بادشاہ ان کی نظر میں معمولی انسان تھا، بادشاہ ان سے ڈرتا تھا اور یہ خدا سے ڈرتے تھے۔ آپ کی ابتدا مایوس کن تھی۔ باپ کو شکایت۔ اللہ والے دوستوں کو شکایت تھی کہ بیٹے عبدالقادر کو آخر ہو کیا گیا ہے کہ ہر وقت لہو ولعب میں پڑے رہتے ہیں۔ آخر غیب سے اشارہ ملا، اور بیٹے اتنے بلند پایہ بزرگ قرار پائے کہ ان کے ہمعصروں میں ایک بھی ایسا نہیں نظر آتا جو تصوف میں آپ کا مدِ مقابل قرار پائے۔ آپ جب تک جیے یکتا رہے۔ وفات پائی تب بھی یکتا ہی قرار پائے۔

ایک مردِ حق آگاہ کے سیرت و سوانح۔

## سسپنس ڈائجسٹ ستمبر 1984ء

مشہور صوفی ابواسحاق نے اپنے بھانجے سید صفی الدین کو ایک عرصہ تک تعلیم و تربیت دی اور ظاہری و باطنی علوم سے نواز دیا۔ بھانجے نے اپنے ماموں سے پوچھا۔ ”اب مجھے کیا کرنا ہے اور میرے لیے کیا حکم ہے؟“

ابواسحاق نے جواب دیا۔ ”میں نے تمھیں اس لیے تیار کیا ہے کہ تمھارے ذریعے ایک خیر کی بستی تعمیر کرانا ہے۔ تم سے ایک بڑا کام لینا ہے عظیم الشان کام۔“

صفی الدین نے سرِ اطاعت خم کر دیا اور پوچھا۔ ”ارشاد، یہ میری خوش قسمتی ہوگی کہ میں کوئی بڑا کام انجام دوں۔“

یہ بات یہیں پر ختم ہو گئی اور صفی الدین اس دن کا انتظار کرنے لگے جب ان سے کوئی عظیم الشان کام لیا جائے۔

ایک دن ابواسحاق دوڑتے ہوئے آئے اور اپنے بھانجے کو حکم دیا۔ ”صفی الدین! ابھی ابھی مجھے بتایا گیا ہے کہ اس عظیم الشان کام کا وقت آ گیا ہے اور اب ہمیں اس پر عمل درآمد شروع کر دینا چاہیے۔“

صفی الدین کو کیا انکار ہو سکتا تھا۔ یہ تعمیلِ ارشاد کے لیے بالکل تیار تھے۔ ماموں نے اپنے بھانجے کو سمجھانا شروع کر دیا۔ ”بھانجے! سنتِ نبویؐ پر عمل کرنے کا ایک بہترین موقع، ایک اچھا وقت آ گیا ہے۔ اللہ کا حکم ہے کہ ایک نیا شہر آباد کیا جائے۔ ایک خیر و برکت کا شہر، کیونکہ اس شہر میں تواتر اور تناسل سے اللہ کے نیک بندے پیدا ہوں گے۔ اللہ کے پیارے بندوں سے اس شہر کو آباد کیا جائے گا۔“

صفی الدین بے حد خوش تھے۔ وہ اپنے ماموں کے پاس بیٹھ گئے اور نیازمندانہ باتیں کرنے لگے۔

کچھ دیر بعد ماموں ابواسحاق نے انھیں زادِ راہ دیا اور ایک اونٹ کی طرف لے جاتے ہوئے کہا۔ ”صفی الدین! تم اپنے زادِ راہ کے ساتھ اس اونٹ پر بیٹھ جاؤ، اس کی مہار ڈھیلی چھوڑ دو اور اونٹ کو اس کی مرضی پر چلنے دو۔ دیکھو یہ تمھیں کہاں لے جاتا ہے۔ پھر یہ جہاں بیٹھ جائے وہیں تم اتر جانا اور ایک نئے شہر کی بنیاد ڈال دینا۔“

صفی الدین نے پوچھا۔ ”اگر یہ چلتا ہی رہے تو؟“

ابواسحاق نے جواب دیا۔ ”چلنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ آخر کار کہیں نہ کہیں یہ بیٹھے گا ضرور۔“

صفی الدین نے زادِ راہ کی پوٹلی اپنی کمر سے باندھی اور اونٹ پر بیٹھ کر اس کی مہار ڈھیلی چھوڑ دی۔ اونٹ چلتا رہا۔ چھوٹی چھوٹی بستیوں اور گھنے جنگلوں کو عبور کرتا ہوا وہ بہت دور نکل گیا۔

صفی الدین حیران تھے کہ اونٹ اس طرح چل رہا تھا گویا اس کی کوئی راہبری کر رہا ہے۔ پھر وہ ایک جنگل کے کنارے اچانک بیٹھ گیا۔ آپ نے کوشش کی کہ وہ دوبارہ کھڑا ہو کے چلنے لگے مگر وہ نہیں کھڑا ہوا۔ آپ اللہ کا نام لے کر اونٹ سے اتر پڑے اور اس کی گردن پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ "کیا بات ہے، کیا یہی وہ جگہ ہے جس کی ماموں ابواسحاق بڑی تعریف کر رہے تھے؟"

اونٹ نے کوئی جواب تو نہیں دیا لیکن اس کے مستقلاً بیٹھ جانے کا انداز بتا رہا تھا کہ ابواسحاق کی مذکورہ جگہ یہی ہے۔

آپ اونٹ سے اتر کے ادھر ادھر گئے لیکن وہاں قرب و جوار میں کوئی بھی بستی نہیں تھی۔ آپ نے یہاں پر ایک چھوٹی سی جھونپڑی ڈال لی اور رہنے لگے۔ جب لوگ ادھر سے گزرتے اور اس ویرانے میں ایک شخص کو جھونپڑی میں مقیم دیکھتے تو انھیں بڑی حیرت ہوتی۔ لوگ یہاں آنے لگے اور جب انھیں صفی الدین کی بزرگی کا علم ہوا تو انھوں نے یہاں گھر بنانے شروع کر دیے۔ مکانات کی تعمیر شروع ہو گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ جگہ ایک شاندار بستی میں تبدیل ہو گئی اور اس کا نام اُچھ قرار پایا۔

صفی الدین مدتوں انسانوں کی خدمت کرتے رہے اور اللہ کی مخلوق نے آپ سے بڑا فیض اٹھایا۔ اس خاندان کے ایک بزرگ شیخ ابوالفتح کی پوتی کی شادی شیخ محمد حسنی جیلانی سے ہو گئی۔ شیخ محمد حسنی حضرت پیر دستگیر شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ کے خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ اور یہ شیخ محمد حسنی جیلانی کا ہی سب سے بڑا تعارف تھا۔ شیخ صاحب بادشاہ کے دربار سے وابستہ تھے۔ اللہ نے انھیں کئی اولاد نرینہ دیں اور یہ سب بادشاہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ اپنی اولاد میں سے ایک کا نام اپنے جدِ اعلیٰ حضرت پیر دستگیر شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے نام پر شیخ عبدالقادر رکھا گیا تھا۔ یہ بچہ جب سنِ بلوغ کو پہنچا تو بادشاہ نے اس کو بھی ملازمانِ شاہی میں شامل کر لیا۔

مال و زر کی کوئی کمی نہ تھی، دولت کی ریل پیل تھی، آپ نے بادشاہ کے دربار میں ساز و آواز کا طوفان برپا ہوتے دیکھا تھا۔ خوش آواز مغنی جب مزامیر کی سنگت میں اپنے فنِ کمال کا مظاہرہ کرتے تو پورے ماحول میں ایک آگ سی لگ جاتی۔ دلوں میں ہلچل مچ جاتی اور کانوں میں رس گھلنے لگتا۔

بادشاہ کی خاص محفلوں میں یہ بھی شریک ہوتے اور جب تک یہ محفل ساز و آواز جمی رہتی یہ وہیں موجود رہتے۔ بعد میں سب کے ساتھ انھیں بھی اٹھنا پڑ جاتا۔ یہ گھر آتے تو ان کے دل و دماغ پر اسی ساز و آواز کا قبضہ رہتا۔ ایسا لگتا جیسے مزامیر ان کے وجود میں اتر گئے ہیں اور وہ نشتر بن کے پورے وجود کو سرشار کر گئے ہیں۔ گانے والوں کی خوش الحانیاں ان کی رگ رگ نس نس میں سرایت کیے ہوئے ہیں۔

ان کا ایک حلقۂ احباب تھا، مخصوص حلقۂ احباب، وہ بھی ان مخصوص محفلوں سے متاثر رہتا تھا لیکن ان سے کم۔ ایک دن یہ لوگ شاہی محفل سے اٹھ کر آئے تو عبدالقادر نے دوستوں سے کہا۔ "افسوس کہ میرا دل تو نہیں چاہتا تھا کہ یہ خوش الحانی کی محفل برخاست ہو لیکن کیا کرتا بادشاہ کی مرضی۔ محفل برخاست ہوئی اور مجھے مجبوراً وہاں سے آنا پڑ گیا۔"

دوستوں نے پوچھا۔ "لیکن وہ تو بہت دیر بعد برخاست ہوئی تھی۔ کیا اتنی دیر تک لطف اندوز ہونے کے بعد بھی آپ مزید کے خواہش مند تھے؟"

انھوں نے جواب دیا۔ "ہاں۔ معلوم نہیں کیا بات ہے کہ میری سیری نہیں ہوتی۔ یہی جی چاہتا ہے کہ ساز بجتے رہیں، خوش الحانیاں ہوتی رہیں اور میں بیٹھا لطف اندوز ہوتا رہوں۔"

دوستوں نے کہا۔ "تو اس کا بھی انتظام ہو سکتا ہے اگر آپ چاہیں تو۔"

انھوں نے پوچھا۔ "وہ کس طرح؟"

ایک دوست نے جواب دیا۔ "وہ اس طرح کہ آپ اس مد میں کچھ صرف فرمائیں۔ یہ مزامیر یہ خوش الحان لوگ انھیں مال و زر کے بل پر جمع کیا جاتا ہے۔ آپ بادشاہ تو نہیں ہیں لیکن دولت والے ضرور ہیں۔ آپ کو جو گویے اور جو مزامیر پسند ہوں انھیں ملازم رکھ لیں اور مزامیر بازار سے خرید لائیں۔"

شیخ عبدالقادر کی سمجھ میں یہ باتیں آ گئیں اور وہ دوسرے دن بازار گئے اور انھیں جو جو ساز پسند آئے خرید لیے۔ پھر اپنے پسندیدہ گویوں سے باتیں کیں اور انھیں معقول مشاہرے پر ملازم رکھ لیا۔

مغرور منش باپ اپنے بیٹے کی یہ ساری باتیں برداشت کر رہے تھے لیکن زبان سے کچھ نہ کہتے تھے۔ انھیں اپنے بیٹے کی یہ باتیں پسند نہیں تھیں۔

کچھ دنوں بعد شیخ عبدالقادر کو کسی کام سے باہر جانا پڑا تو انھوں نے سفر کی تیاری کے سلسلے میں جو سامان ضروری سمجھا اس کو بندھوالیا۔ کئی اونٹ دروازے پر کھڑے تھے اور ان پر شیخ کے مزامیر لادے جا رہے تھے ان کے لیے بھی اونٹوں کا انتظام کیا گیا تھا۔

ان کے والد کو جب یہ ساری خبریں پہنچائی گئیں تو وہ بے چین ہو گئے اور انھوں نے اپنے بیٹے کو اپنے پاس بلا کے پوچھا "بیٹے عبدالقادر! یہ میں کیا سن رہا ہوں ؟"

شیخ نے پوچھا "کیا سن رہے ہیں آپ ؟"

والد نے کہا "میں نے سنا ہے کہ تم کہیں باہر جا رہے ہو اور سامانِ سفر میں اونٹوں پر مزامیر بار کرائے ہیں اور گویّوں کو اونٹوں پر سوار کر رہے ہو کیا یہ صحیح خبر ہے ؟"

شیخ نے جواب دیا "ہاں یہ خبر درست ہے مگر اس پر آپ کو کیوں اعتراض ہے ؟"

باپ نے کہا "مجھے اعتراض تو کوئی نہیں۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ تم ان خرافات میں کہاں پڑ گئے ؟ بیٹے! یہ اچھی چیزیں نہیں ہیں۔"

شیخ نے پھر وہی جواب دیا "میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کو اس پر کیوں اعتراض ہے ؟"

باپ نے کہا "بیٹے! ہمارا جس خانوادے سے تعلق ہے اس میں یہ چیزیں معیوب بلکہ شرمناک سمجھی جاتی ہیں۔"

شیخ نے جواب دیا "لیکن خود مجھ کو یہ چیزیں نہ تو معیوب لگتی ہیں اور نہ شرمناک۔"

باپ نے مایوسی سے کہا "تب پھر تم جاؤ بات ہی ختم ہو گئی۔ اب کیا بات کروں تم سے۔"

شیخ اونٹوں پر مزامیر لدوا کے اور گویّوں کو بٹھا کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ وہ جہاں بھی ٹھہرے وہ جگہ ساز و آواز سے گونجنے لگی۔ وہ خود بھی محظوظ ہوئے اور جن لوگوں نے سنا وہ بھی خوش ہوئے۔

*

مزامیر اور گویّے بھی ان کا دل نہ بہلا سکے۔ اداسی اور کسی نامعلوم شے کی کمی کے احساس نے انھیں خاصا پریشان کر رکھا تھا۔ دوستوں سے پوچھا "دوستو! کیا بات ہے کہ اب مزامیر اور گویّے بھی زیادہ اچھے نہیں لگ رہے اور ہر وقت کسی شے کی کمی کا احساس پریشان کرتا رہتا ہے ؟"

کسی دوست نے جواب دیا "یکسانیت انسان کو پریشان کر دیتی ہے چنانچہ مزامیر اور گویّوں کی ہر وقت کی موجودگی نے یکسانیت پیدا کر دی ہے اسی لیے آپ وقتی طور پران چیزوں سے لطف اندوز ہو لیتے ہیں لیکن اب وہ وقتی اور عارضی تاثر بھی گیا۔"

آپ نے پوچھا "پھر اب کیا ہونا چاہیے ؟"

دوست نے جواب دیا "ساز و آواز کے علاوہ بھی ایک چیز ہے جو آپ کا دل بہلا سکتی ہے آپ کو خوش رکھ سکتی ہے۔"

آپ نے پوچھا "وہ کیا چیز ہے ؟"

دوست نے جواب دیا "شکار! سارے ہی اُمرا اور حکمراں شکار کھیل کر جی بہلاتے ہیں آپ بھی شکار کھیلا کریں۔"

انھیں سکون اور مزے کی تلاش تھی۔ انھوں نے سوچا اگر شکار سے جی بہل سکتا ہے تو شکار کھیلنا چاہیے۔ دوستوں سے کہا "اب ہم شکار کھیلیں گے۔ اب ہم شکاری کہلائیں گے۔ اب شکار کا سامان تیار کیا جائے۔"

شکار کے لیے جن چیزوں کی ضرورت پیش آتی ہے اس میں شکاری کتے بہت اہم ہوتے ہیں۔ جب دوستوں نے انھیں بتایا کہ شکار کے لیے کتے ضروری ہوتے ہیں تو آپ ذرا پریشان ہو گئے اور پوچھا "کیا شکاری کتے بہت ضروری ہیں ؟"

دوستوں نے جواب دیا "بہت ضروری۔ ان کے بغیر شکار کا نہ تو مزہ آئے گا اور نہ بھرپور شکار کھیلا جا سکے گا۔"

آپ نے کہا "تب پھر شکاری کتوں کا انتظام کیا جائے۔"

دوستوں اور خدمت گاروں کو شکاری کتوں کا انتظام کرنا پڑا گو کہ اس مد میں خرچہ بہت آیا۔ جب شکاری کتے آ گئے تو ان کے رہنے کی جگہ کا انتظام کیا گیا۔ ان کے کھانے پینے کا بندوبست کیا گیا۔

شیخ کے باپ ان کارروائیوں پر نظریں رکھے ہوئے تھے۔ وہ شکاری کتوں کی آمد سے خوش نہیں تھے۔ انھوں نے ایک بار پھر اپنے بیٹے کو سمجھانے کی کوشش کی "بیٹے عبدالقادر! کیا بات ہے ؟ اب تو کتوں میں دلچسپی لینے لگا ہے۔ آخر کیوں ؟"

شیخ قادر نے جواب دیا۔ "پدرِ بزرگوار! میں اپنی ذات میں کسی کمی کو محسوس کر رہا ہوں۔ کمی کا یہ احساس مجھ کو ہر وقت پریشان رکھتا ہے، چنانچہ جب میرے دوستوں نے مجھ کو یہ بتایا کہ اس بے لطفی اور کسی شے کی کمی کا احساس شکار سے دور کیا جا سکتا ہے اور شکار کے لیے شکاری کتے ناگزیر ہیں تو میں نے شکاری کتوں کا انتظام کیا۔ آپ کو معلوم نہیں اس پر کیوں اعتراض ہے؟"

متقی باپ نے جواب دیا۔ "مجھے اس پر اعتراض نہیں ہے بلکہ مسلمان کتے نہیں پالتے۔ کتے پالنے کو اسلام نے ممنوع قرار دیا ہے اور مجھ کو اسلام دنیا کی ہر چیز سے زیادہ اچھا لگتا ہے۔"

بیٹے نے کہا۔ "آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر لیکن بتائیے میں کیا کروں؟ میں اپنا دل کس طرح بہلاؤں؟"

باپ نے سختی نہیں کی، بیٹے سے زیادہ بحث بھی نہیں کی کیونکہ انھیں خوب معلوم تھا کہ زیادہ سختی بیٹے پر بُرا اثر ڈالے گی۔

شیخ زادے نے وہاں سے ہٹ کر دوستوں سے کہا۔ "شکار کی تیاری کی جائے۔"

شکار کی تیاری کر لی گئی اور کتوں کو ساتھ لے کر شکارگاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ سارا دن شکار کے پیچھے دوڑ بھاگ کرنے میں انھیں بڑا مزا آیا۔ شیخ عبدالقادر نے اقرار کیا کہ سارنگ و آواز کے بعد پہلی بار وہ لطف اندوز ہوئے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ "کسی شے کی کمی کا احساس اب بھی باقی ہے۔"

شکار کا سلسلہ جاری رہا اور اس میں اتنا وقت ضائع کیا کہ اس کا مزا بھی جاتا رہا۔

انھی دنوں ان کے والد کے پاس مخمل کا ایک تھان آیا۔ یہ تھان ان کے کسی عقیدت مند نے بھیجا تھا۔ انھوں نے یہ تھان اپنے بیٹے عبدالقادر کے حوالے کر دیا اور کہا۔ "بیٹے! یہ نہایت قیمتی کپڑا ہے اس سے اپنا لباس بنوا لو۔"

عبدالقادر نے مخمل کا تھان لے لیا۔ انھیں یہ بہت پسند آیا۔ اور درزی کو بلوا کے اسے حکم دیا کہ "یہ مخملی لباس میرے شکاری کتوں پر بہت اچھا لگے گا، اس لیے اس سے میرے کتوں کی جھولیں تیار کر دی جائیں۔"

چنانچہ کتوں کی جھولیں تیار ہو گئیں۔ والد کے ارادت مندوں میں سے کسی نے ان جھولوں کو دیکھا تو بہت افسوس کیا اور کہا۔ "ایسا مخمل تو بہت سے انسانوں کو بھی میسر نہیں اور آپ نے ان سے اپنے شکاری کتوں کی جھولیں بنوا دیں۔ کیا مصرف ہوا ہے مخملی تھان کا، واہ واہ سبحان اللہ۔"

عبدالقادر کو یہ طنز اچھا نہیں لگا، انھوں نے اس شخص کو ڈانٹ کے بھگا دیا۔

کچھ دیر بعد یہ خبر ان کے والد کے کانوں تک پہنچ گئی۔ انھیں بہت دکھ ہوا اور عبدالقادر کو بلوا کے جواب طلب کیا۔ پوچھا۔ "بیٹے! یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ میں نے تمھیں مخملی تھان لباس بنوانے کے لیے دیا تھا مگر تم نے اس سے کتوں کی جھولیں تیار کروا لیں۔"

عبدالقادر نے جواب دیا۔ "کتے بھی اسی کی مخلوق ہیں جس کی مخلوق ہم ہیں۔ میں نے جو کچھ کیا اس میں مجھ کو تو کوئی بُرائی نظر آتی نہیں۔"

والد ایک دم گرم ہو گئے اور ان کو ڈانٹنے لگے۔ دیر تک ڈانٹتے رہے۔ عبدالقادر افسردہ دل ہو کر وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔

عبدالقادر کے چلے جانے کے بعد ان کے والد نے اپنے دوسرے بیٹوں سے پوچھا۔ "میں سوچتا ہوں اس کا بنے گا کیا۔ میں کچھ اور سوچ رہا تھا اور یہ کچھ اور سوچ رہا ہے۔ میرا دماغ کام نہیں کر رہا۔"

اس تشویش اور اس سوال کا جواب کسی کے پاس بھی نہ تھا چنانچہ وہ خاموش رہے۔

اس رات ان کے والد نے خواب میں دیکھا کہ ان کے جدِ اعلیٰ حضرت محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ تشریف لائے ہیں اور کچھ کبیدہ خاطر سے ہیں۔ انھیں اس کبیدہ خاطری نے پریشان کر دیا۔ پوچھا۔ "جدِ بزرگوار! کیا آپ ہم سے ناراض ہیں؟"

انھیں جواب ملا۔ "ہاں ہم کبیدہ خاطر ہو رہے ہیں۔ ہم تم سے پوچھتے ہیں کہ تم نے ہمارے ہم نام اپنے فرزند کو سخت سُست کیوں کہا؟"

انھوں نے جواب دیا۔ "پیرِ مرشد! ہمارے جدِ اعلیٰ تو آپ ہیں۔ ہم نے انھیں جو کچھ بھی کہا سنا ہے اپنی اولاد ہونے کی وجہ سے، دوسرے یہ کہ کیا ہمیں اتنی سی بھی تعلیم و تربیت اور تہذیب و ترتیب دینے کا حق حاصل نہیں؟"

حضرت غوث الاعظمؒ نے جواب دیا۔ "ہاں تمھیں اتنا سا حق بھی حاصل نہیں۔ عبدالقادر میرا بیٹا ہے۔ اس کی تعلیم و تربیت مجھ پر واجب کی گئی ہے۔ اس کو میں تیار کروں گا۔ تم اپنے دوسرے بچوں پر توجہ دو۔"

بیداری کے بعد وہ کافی پریشان ہوئے۔ رات مشکل سے گزری۔ صبح فجر کی نماز کے بعد انھوں نے اپنے بیٹے عبدالقادر کو طلب کیا اور اس سے کہا۔ "عبدالقادر! میں نے تم سے کل جو کچھ کہا تھا اس پر شرمسار ہوں۔ آئندہ میں تمھیں بالکل نہیں ٹوکوں گا۔ مجھے معاف کر دو۔"

عبدالقادر نے شرمندگی سے جواب دیا۔ "یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ خدا کے لیے مجھے اور زیادہ شرمندہ نہ کریں۔"

باپ خاموش ہو گئے۔

عبدالقادر کی روش میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہی شکار اور شکاری کتے۔ وہی شکار کی تلاش میں جنگلوں کی خاک چھاننا۔ وہی مزامیر اور وہی گویّے لیکن ان جملہ مشغلوں کے باوجود عبدالقادر کو یہی محسوس ہوتا کہ ان کے اندر کسی چیز کی کمی ہے۔ انھوں نے کچھ کھو دیا ہے یا پھر وہ شے باقی ہی نہیں۔

انھی الجھنوں اور فکروں میں وہ شکار کھیلنے میں مشغول تھے۔ کسی جھاڑی سے کوئی تیتر بولنے لگا۔ اس کی آواز میں درد تھا، سوز تھا۔ اس درد اور سوز کو سبھی نے محسوس کیا۔

یہ سب آرام کی خاطر درختوں کے سائے میں بیٹھ گئے۔ عبدالقادر تکان کے باوجود گھر جانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ والد کے مریدوں میں سے کسی نے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی اور کہا: "حضرت! کبھی آپ نے اس پر بھی سوچا کہ آپ خاندانی نسب نامے کی رو سے کتنے بڑے انسان ہیں؟"

انھوں نے جواب دیا: "سوچنا کیا، میں خوب جانتا ہوں کہ میں اپنے نسب نامے کی رو سے کتنا بڑا انسان ہوں۔"

کسی جھاڑی سے تیتر ایک بار پھر نہایت سوگوار آواز میں بولا۔ سامنے سے ایک خستہ حال بزرگ گزر رہے تھے۔ انھوں نے یہاں بہت سے آدمیوں کو بیٹھے دیکھا تو رک گئے۔ پھر عبدالقادر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "صاحبزادے! خوب، تو تم یہاں موجود ہو۔ واہ، تیتر کی آواز سن رہے ہو۔"

عبدالقادر نے جواب دیا: "ہاں آواز تو سن رہا ہوں۔ پھر؟"

درویش نے عبدالقادر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دوسروں سے کہا: "تم سب دیکھ لینا، وہ دن زیادہ دور نہیں کہ یہ نوجوان بھی اس تیتر کی طرح آہ و بکا کرے گا۔ تم سب دیکھ لینا۔ میں بھی دیکھوں گا۔"

درویش کی آواز اور باتوں میں کیسا سحر تھا، کیا اثر تھا کہ عبدالقادر کے اندر ایک آگ سی لگ گئی۔ کچھ دیر تو یہ اس آگ پر قابو پانے کی کوشش کرتے رہے مگر جب اس آگ نے انھیں اندر ہی اندر جلانا شروع کر دیا تو انھوں نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا: "واپس چلو۔ اب شکار نہیں کھیلا جائے گا۔"

اس حکم، اس آواز نے سب کو حیرت زدہ کر دیا۔ وہ سب آپ کی صورت دیکھنے لگے۔

انھوں نے ایک بار پھر وہی حکم دیا: "تم لوگ میری شکل کیا دیکھ رہے ہو۔ اب میں شکار نہیں کھیلوں گا۔ گھر واپس چلو۔"

لوگوں نے سامان سمیٹا، شکاری کتوں کو قابو میں کیا اور واپس چل دیے۔

آپ کئی دن تک خاموش اور تنہا رہے۔ سبھی کو حیرت تھی کہ یہ کیا ہو گیا۔ ان کے والد بھی اس تبدیلی پر سوچ رہے تھے۔

کئی دن بعد دوستوں نے ان سے پوچھا: "حضرت! آپ کے گویّے بہت پریشان ہیں۔ آپ نے تو ان سے کچھ سنا بھی نہیں۔"

آپ نے گویّوں کو اپنے پاس بلوایا اور ان سے کہا: "افسوس کہ اب ہمیں تمھاری ضرورت نہیں رہی۔ اب تم لوگ جا سکتے ہو۔"

گویّوں کو اپنے کانوں پر اعتبار نہیں آیا، پوچھا: "جی کیا فرمایا آپ نے؟ ہم جا سکتے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا: "ہاں اب تم لوگ جا سکتے ہو۔ ہمیں تمھاری ضرورت نہیں رہی۔"

گویّوں نے پوچھا: "کیا ہمارے گانے میں کسی قسم کا فرق آ گیا ہے؟"

آپ نے جواب دیا: "تمھارے گانے میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ہمارے مزاج میں فرق آ گیا ہے۔"

گویّے روتے ہوئے چلے گئے۔

اس کے بعد آپ نے اپنے ملازمین سے مزامیر منگوائے اور دوستوں کو حکم دیا: "انھیں توڑ دو۔"

دوستوں کو تامل ہوا، کہا: "حضرت! ان پر کافی مال و زر خرچ ہوا ہے۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

آپ نے فرمایا: "صرف مال و زر ہی نہیں، خاصا قیمتی وقت بھی اور مجھے اس وقت اگر کوئی افسوس ہے تو اسی وقت کے زیاں کا، عمر عزیز کے زیاں کا۔ اور اب مزید بربادی کا میں متحمل نہیں ہو سکوں گا۔"

آپ نے ان مزامیر کو خود اپنے ہاتھوں سے توڑ پھوڑ کے پھینک دیا اور دوستوں سے کہا: "دوستو! اب میں اپنے آپ میں جذب و کیف، وجد و حال کی کیفیت محسوس کر رہا ہوں اور اس لائق نہیں ہوں کہ دوستی نبھا سکوں۔ اس لیے آپ بھی کوئی دوسرا دوست ڈھونڈ لیں۔"

دوستوں کو بھی بڑا دکھ ہو رہا تھا انھوں نے پوچھا "شکاری کتوں کا کیا ہوگا؟"

آپ نے جواب دیا "میری طرف سے اجازت ہے کہ انھیں آزاد کر دیا جائے یا آپ لوگ انھیں لے جائیں۔"

بعد میں آپ کے حکم سے شکاری کتوں کو جنگل میں چھوڑ دیا گیا۔

اب آپ کی حالت ہی کچھ اور تھی۔ سر کے بال صاف کرا دیے اور ذکر و فکر میں مشغول ہو گئے۔

ان کے والدان سے راضی ہو گئے اور حضرت غوث الاعظمؒ نے خواب میں جو کچھ فرمایا تھا اس کی صداقت ان کے سامنے آ گئی۔

آپ نے شاہی ملازمت بھی چھوڑ دی۔ بادشاہ کو یہ بات گراں گزری۔ اس نے آپ کو پیغام بھیجا "کسی جواز کے بغیر ترک ملازمت مزاج شاہی پر گراں گزر رہی ہے اس لیے آپ کی بہتری اسی میں ہے کہ کارِ منصبی دوبارہ سنبھال لیں۔"

آپ نے بادشاہ کو صاف صاف لکھ دیا کہ اب میں بادشاہ کی ملازمت نہیں کر سکوں گا اس لیے مجھے معذور سمجھا جائے۔

بادشاہ خود کو بے بس محسوس کرنے لگا اور آپ کے خلاف کوئی عملی قدم نہیں اٹھا سکا۔

اب آپ عشقِ الٰہی میں ڈوب چکے تھے۔ نماز اور استغراق، نماز اور مراقبہ، بس اسی میں شب و روز گزرنے لگے۔ خود ہی اذان دیتے، خود ہی امامت فرماتے اور خود ہی اقامت فرماتے۔ پھر ایسا بھی دیکھنے میں آیا کہ آپ فجر کی نماز سے پہلے گھر گھر جاتے، لوگوں کو بیدار کرتے اور انھیں بتاتے کہ نماز نیند سے بہتر ہے۔

آپ کے والد بیمار رہنے لگے تھے۔ انھوں نے اپنی بیماری ہی میں انھیں اپنا جانشین قرار دے دیا۔ ان کے والد کا بڑا سوگ منایا گیا۔ بادشاہ نے بھی رنج و غم کا اظہار کیا اور باپ کو دربار سے جو وظائف ملتے تھے ان میں کسی قدر اضافہ کر کے آپ کی خدمت میں بھیج دیا اور کہلوایا کہ "ہمیں آپ کے والد کی موت کا دکھ ہے اور چونکہ آپ ان کے جانشین قرار پائے ہیں اس لیے وظائف کی رقم آپ کو روانہ کی جا رہی ہے۔ یہ آپ کو مستقلاً ملتی رہے گی۔ اگر آپ یہ سمجھیں کہ مذکورہ مراسلہ رقم کم ہے تو ہمیں اطلاع دیں، اس میں اضافہ کر دیا جائے گا۔"

جو شخص وظائف کی یہ رقم لے کر آیا تھا آپ نے اس سے پوچھا "بھائی! ایک بات تو بتاؤ، تمھارا نام کیا ہے؟"

اس شخص نے جواب دیا "اسلم، مگر آپ میرا نام کیوں معلوم کر رہے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا "اس لیے کہ مجھے یہ یاد رہے کہ میرے پاس بادشاہ سے وظائف کی رقم لے کر کون آیا تھا۔ تم اس رقم کو واپس لے جاؤ اور میری طرف سے بادشاہ کو بتا دو کہ مجھے یہ رقم نہیں چاہیے۔ میرے باپ کے لیے جو وظیفہ یا وظائف جاری تھے انھیں منسوخ کیا جائے اب مجھے ان سے کوئی سروکار نہیں۔"

بادشاہ کو آپ کی یہ باتیں بالکل پسند نہیں آ رہی تھیں۔ اس نے کہلوایا کہ "مال و زر ایسی چیزیں نہیں ہیں کہ انھیں ٹھکرا دیا جائے۔ آپ یہ وظائف قبول فرمالیں اور اگر آپ انھیں اپنے خرچ میں نہیں لانا چاہتے تو کوئی بات نہیں۔ اور بہت سے حاجت مند اور غرض مند ہیں، ان پہ خرچ کر دیجیے گا۔ میں خوش ہوں گا کہ کسی درویش کے کام آ سکا۔"

آپ نے جواب میں لکھ دیا "حاجت مندوں اور غرض مندوں کی تو کوئی کمی نہیں۔ دربار میں بھی پہنچ جاتے ہوں گے اس لیے میرے خیال میں بادشاہ سلامت یہ رقم خود ہی حاجت مندوں اور غرض مندوں میں تقسیم فرما دیں۔"

بادشاہ نے اس کا یہ مطلب لیا کہ شاید عبدالقادرؒ اپنی انا کی تسکین کے لیے یہ سب کر رہے ہیں۔ بادشاہ نے انھیں دھمکی دی "عبدالقادر! ہمیں معلوم ہے۔ جو کچھ آپ کر رہے ہیں، یہ انا کا دلچسپ مگر افسوسناک کھیل ہے۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ بادشاہ کی ناراضی کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ اگر نہیں معلوم تو اب معلوم ہو جائے گا۔"

اس کے بعد بادشاہ نے ہر شخص پر یہ تاثر دیا کہ بادشاہ عبدالقادرؒ سے ناراض ہے اور اس شخص سے بھی ناراض ہو جائے گا جو ان کا ساتھ دے گا۔

اس تاثر نے عبدالقادرؒ کی زندگی اجیرن کر دی۔ ملاقات کا سلسلہ بند ہو گیا، ہر طرف سے کھنچاؤ اور گریز نظر آنے لگا۔

جب بادشاہ کو اس کے مخبروں نے یہ بتایا کہ عبدالقادرؒ کی مالی حالت بہت خراب ہے اور ہر طرف سے مایوسی کا سامنا ہے تو اس نے ان حالات میں ایک بار پھر ان کی مدد کرنا چاہی۔

بادشاہ نے ان کے نام ایک فرمان جاری کیا جس میں اس نے یہ کہا تھا کہ "عبدالقادر! آپ ہمارے دربار سے وابستہ تھے پھر اچانک آپ نے یہ وابستگی ختم کر دی اور ہمیں اس سے مطلع نہیں کیا۔ پھر ہم نے آپ کے باپ کے وظائف آپ کے نام جاری کیے تو آپ نے انھیں بھی قبول

نہیں کیا اور ہمارے وظائف واپس فرما دیے۔ یہ ساری تقصیرات ہیں آپ کی، میں ان کو بھی معاف کرسکتا ہوں ان سے صرفِ نظر کرنے کو تیار ہوں مگر اس شرط پر کہ آپ ہمارے دربار سے دوبارہ وابستہ ہوجائیں گے۔"
آپ نے اس کا منظوم جواب دیا۔

بہیچ باب ازیں باب رُخ نگشتنی نیست | ہر آنچہ بر سرِ ما می رود مبارک باد

(ہم اس دروازے کو چھوڑ کر کسی اور دروازے پر نہیں جاسکتے۔ اس کے سلسلے میں ہمیں جو کچھ برداشت کرنا پڑے گا اسے خندہ پیشانی سے برداشت کریں گے)

کسے کہ خلعت سلطانِ عشق پوشیداست | بحلہائے بہشتی کجا شود دل شاد

(جس نے عشق کی بادشاہی کا لباس پہن لیا اس کا ان بہشتی لباسوں سے دل مسرور نہیں ہوتا)

آپ کے اس جواب نے بادشاہ کو لاجواب اور خاموش کردیا۔

❋

آپ کے ہاتھوں میں اتنی تاثیر تھی کہ جس مریض پر رکھ دیتے صحت یاب ہوجاتا۔ بیمار آپ کے پاس آتے اور انھیں یاد دلاتے کہ آپ کے جدِاعلیٰ حضرت غوث الاعظمؒ کے دستِ مبارک میں یہ تاثیر تھی کہ بیماروں کو اچھا اور نابینا کو بینا فرما دیتے تھے اور یہ وہ نعمت تھی جو دوسری قوموں کے نبیوں میں ہوا کرتی تھی اور رسولِ مقبولؐ کے ولیوں میں پائی جاتی ہے۔

آپ نے دریافت فرمایا" تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

جواب ملا" شفا، اسی طرح بیماریوں سے شفا، جس طرح حضرت غوث الاعظمؒ عطا کرتے تھے۔"

آپ نے جواب دیا" لوگو! میں انھی کا فرزند ہوں اور مجھے بھی وہی چیزیں بخشی گئی ہیں۔"

اس کے بعد آپ نے بیماروں کو اپنے ہاتھوں سے شفا بخشنا شروع کردیا۔ مریضوں کی قطاریں بیٹھ جاتیں آپ اندر سے نمودار ہوتے اور مرض کے حصّوں پر ہاتھ پھیر کے اس کا مرض دفع کردیتے۔ نابینا حضرات اپنی بینائی واپس لے کر جاتے۔

ایک دن آپ نے انتہائی جوش میں فرمایا" اللہ نے میرے ہاتھوں میں وہ تاثیر رکھی ہے کہ میں جس بیمار پر ہاتھ پھیر دوں گا خدا اس کو شفا دے گا۔" یہ چرچے تو عام تھے ہی اور ان کی تصدیق بھی ہوتی جارہی تھی کہ شہر ایک مصیبت میں مبتلا ہوگیا۔

اسی شہر میں ایک اور متقی اور پرہیزگار شخص بھی مقیم تھے۔ ان کا نام تھا" غیاث الدّین لنگاہ۔ یہاں بھی عقیدت مندوں کا ہجوم رہتا تھا۔ ان کے مریدوں کو اپنے پیر مرشد کے بارے میں یہ خوش فہمی تھی کہ غیاث الدّین لنگاہ کا مرتبہ عبدالقادر جیلانی سے بڑا ہے۔ ان کی مجلس میں اس قسم کے تذکرے ہوتے رہتے تھے۔ غیاث الدّین لنگاہ انھیں منع کرتے تھے کہ ایسی باتیں مت کیا کرو کیونکہ کہاں میں اور کہاں مخدوم عبدالقادر۔

اُن کے ایک مرید نے کہا" حضور! یہ تو آپ عاجزی اور انکساری سے کام لے رہے ہیں ورنہ ہمیں معلوم ہے کہ وہ کیا ہیں اور آپ کیا ہیں۔" غیاث الدّین لنگاہ نے کہا" دیکھو میں اپنے آپ سے بھی اچھی طرح واقف ہوں اور اُن سے بھی۔ اُن کا تعلق حضرت غوث الاعظمؒ کے خاندان سے ہے۔ وہ درحقیقت مخدوم ہیں، مخدوم عبدالقادر ثانی ہیں۔ میں ان کی بے حد عزت کرتا ہوں۔"

مریدوں نے بظاہر تو آپ کی بات مان لی مگر دل سے منکر رہے۔ انھی مریدوں میں سے ایک کی رات کے پچھلے پہر طبیعت خراب ہوگئی۔ اس کی پسلیوں میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا۔ گھر والوں کو شبہ ہوا کہ شاید ہوا لگ گئی ہے۔ انھوں نے مالش کا تیل استعمال کیا، تھوڑے تھوڑے وقفے سے پسلیوں کی مالش ہوتی رہی لیکن درد میں کوئی افاقہ نہ ہوا۔ صبح ہوتے ہی یہ شخص ایک طبیب کے پاس پہنچا اور اپنی کیفیت بیان کرکے کہنے لگا" جناب! میں رات بھر کا جاگا ہوا ہوں براہِ کرم کوئی ایسی دوا دے دیجیے کہ میں کچھ دیر آرام کرسکوں، آنکھ کی نیند لے سکوں۔"

طبیب نے اُس کا اچھی طرح معائنہ کیا لیکن کوئی بات سمجھ میں نہ آئی۔ یہ درد ساری پسلیوں میں تھا اور ہوا کا قطعی تھا۔ طبیب نے کچھ پینے کی دوا دی اور کچھ مالش کی، وہ شخص دوا لے کر سیدھا گھر چلا گیا اور گھر میں جیسے ہی دوا

استعمال کی مرض میں شدت پیدا ہوگئی۔ آناً فاناً اس درد میں اتنی شدت پیدا ہوگئی کہ اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگئی۔ گھر والوں نے جب یہ دیکھا کہ مرض کسی طرح قابو میں نہیں آرہا تو وہ مریض کو اس کے پیر کے پاس لے گئے۔ غیاث الدّین لنگاہ نے مریض کی پسلیوں پر ہاتھ پھیرا، اور کوئی دُعا پڑھ کے پھونک ماری لیکن مرض میں ذرّہ برابر فرق نہ آیا۔ اب وہ شخص تڑپنے لگا تھا، چارپائی پر دو دو ہاتھ اُچھلتا اور گر جاتا۔ چلاتے ہوئے کہتا "مار دیا، خدایا میں کہاں جاؤں، کس کے پاس جاؤں؟ مجھے کون اچھا کرے گا، اے اللہ! تو ہی رحم کر مجھ پر۔"

مگر اس کی دُعا قبول نہیں ہوئی کیونکہ اب مریض کو لمحہ بھر کا قرار حاصل نہیں تھا۔

آخر اسی مرض میں تیسرے دن اس کا انتقال ہوگیا۔ سب پر اس موت کا بڑا اثر ہوا، مریدوں میں کہرام برپا ہوگیا۔ ہر شخص دوسرے سے یہی پوچھتا تھا کہ آخر یہ کیا درد اور کیسا مرض تھا کہ کسی کی دوا سے قابو ہی میں نہیں آیا۔ انھوں نے اپنے مرشد سے پوچھا۔ "حضرت! آپ تو کشف سے معلوم کر سکتے ہیں کہ یہ کیا مرض تھا جو جان لے کر ہی گیا۔"

حضرت لنگاہ نے جواب دیا۔ "یہ مرض نہیں مشیتِ ایزدی تھی جو پوری ہوگئی۔ اور مشیتِ ایزدی پر کوئی دَوا یا کوئی دُعا کارگر نہیں ہوتی۔"

مریدوں نے لاجواب ہو کر سکوت اختیار کیا۔ لیکن انھیں اپنے ساتھی کی موت کا گہرا دُکھ، گہرا رنج تھا۔

کئی دن بعد یہی درد دوسرے مریض کی پسلیوں میں شروع ہوا، اس مریض کی تو جان ہی نکل گئی۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ بھاگا بھاگا طبیب کے پاس پہنچا اور کہا۔ "آپ اس پر خصوصی توجہ دیجیے اور اس کا علاج کیجیے ورنہ میں تو دہشت ہی سے مر جاؤں گا۔"

طبیب نے جواب دیا۔ "سچی بات تو یہ ہے کہ یہ مرض اپنی سمجھ میں نہیں آیا، اور جب مرض ہی سمجھ میں نہ آیا ہو تو اس کا علاج کس طرح کیا جائے گا؟"

مریض رونے لگا۔ "پھر میں کہاں جاؤں؟ کس کے پاس جاؤں؟ بتائیے میں کیا کروں؟"

وہ یہاں سے اپنے پیر مرشد کے پاس پہنچا اور رو رو کر اُن سے دعا کی درخواست کرنے لگا۔ "حضرت! میری زندگی بچا لیجیے مجھے بچا لیجیے، ورنہ میں مر جاؤں گا۔"

پیر مرشد غیاث الدّین لنگاہ کے لیے مشکل یہ تھی کہ وہ مشیتِ ایزدی کے پابند تھے اور اس معاملے میں خود کو بے دست و پا محسوس کرتے تھے، مریض مرید کو جواب دیا۔ "میں تیرے حق میں دعا کروں گا مگر پتا نہیں کہ وہ قبول بھی ہوگی یا نہیں، مجھے کچھ پتا نہیں۔ بہرحال تمھاری خواہش ہے کہ میں دُعا کروں تو میں تمھاری خواہش پوری کر دوں گا آگے اللہ جانے اور اس کا کام۔"

آپ اپنے حجرے میں چلے گئے اور پھر سجدے میں گر کے گڑگڑا گڑگڑا کے دعا مانگنے لگے۔ "اے میرے مولیٰ! اے اللہ! میرے مرید مجھ سے کچھ توقع رکھتے ہیں اور بار بار مجھ سے استمداد کی درخواست کرتے ہیں لیکن میں انھیں ٹال دیتا ہوں اور یہی کہتا ہوں کہ میں صاحبِ کرامت نہیں ہوں، میں بھی تمھاری ہی طرح ایک انسان ہوں۔"

اس واقعہ کے کئی دن بعد یہ مرض عام ہوگیا۔ جس کو دیکھیے پسلی پکڑے چلا آرہا ہے۔ پسلیوں میں درد، پھر اس میں شدت اور آخر میں موت۔ اب تو پوری آبادی سراسیمہ اور خوفزدہ نظر آنے لگی۔

جب یہ مرض مخدوم عبدالقادر ثانی کے مریدوں میں بھی پھیل گیا تو اُن سے بھی استدعا کی گئی کہ وہ دعا کریں کہ خدا اس وبا سے شہریوں کو نجات دے۔ کسی مرید نے آپ کو بتایا۔ "یہ مرض غیاث الدّین لنگاہ کے مریدوں سے پھیلا ہے اور سننے میں آیا ہے کہ اس سلسلے میں وہ بھی دعا کر چکے ہیں لیکن شاید اُن کی دعا قبول نہیں ہوئی۔"

آپ نے اس مرید کو گھور کر دیکھا اور پوچھا۔ "تو کیا کہنا چاہتا ہے؟"

مرید نے جواب دیا۔ "میں کہنا چاہتا ہوں کہ جب لنگاہ میں کچھ ہے ہی نہیں تو وہ پیری کا ڈھونگ کیوں رچائے ہوئے ہیں؟"

آپ اپنے مرید پر خفا ہونے لگے۔ بولے۔ "یہ تو کیا کہہ رہا ہے؟ تو یہ کس طرح کہہ سکتا ہے کہ اُن کے پاس کچھ ہے ہی نہیں، اُن کے پاس بہت کچھ ہے وہ بلاشبہ اللہ والے ہیں اور اللہ کے برگزیدہ بندوں میں شامل ہیں، اُن کی دعا کیوں قبول نہیں ہوئی، یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہوگا لیکن میں تم کو یہ بتائے دیتا ہوں کہ تم آئندہ لنگاہ کی بزرگی پر شک نہ کرنا۔"

مرید خاموش ہوگیا، رات کو عشاء کے بعد آپ سجدے میں گر گئے اور دعا مانگنے لگے۔ "اے میرے اللہ! اے جہانوں کے

پالن ہار! یہاں ایک وبا نے انسانی مخلوق کو پریشان کر کے دکھ دیا ہے مجھے میرے ایک مرید نے بتایا کہ یہاں کے بزرگ غیاث الدّین لنگاہ نے اس وبا سے تیری بارگاہ میں نجات کی درخواست کی تھی جو نامنظور ہوگئی، کیوں نامنظور ہوگئی؟ مجھے نہیں معلوم لیکن جب لوگوں نے مجھے اپنا وسیلہ بنالیا تو میرا یہ فرض ہوگیا کہ میں تجھ سے مدد چاہوں، اگر تو نے مجھے بھی مایوس کردیا تو میں کہاں جاؤں گا، میں کس کا سہارا لوں گا۔"

یہ کافی دیر تک رو رو کر دعائیں مانگتے رہے۔ رات کو بھی یہی خیال دامن گیر رہا، وہ جب تک جاگتے رہے دعا مانگتے رہے۔ رات کے پچھلے پہر اُن کی آنکھ لگ گئی، خواب میں رسول مقبول ﷺ کو دیکھا، آپ ﷺ نے فرمایا۔ "بیٹے عبدالقادر! غیاث الدّین لنگاہ کے پاس جاؤ، ہم نے اس کو ہاتھ بھر بانس کا ایک ٹکڑا دے دیا ہے اس ٹکڑے کو لے لو اور اس پر دس بار سورۂ اخلاص پڑھ کے دم کرو اور اس کے بعد یہ بانس کا ٹکڑا جس مریض کو لگا دو گے صحت یاب ہوجائے گا۔"

آپ نے پوچھا۔ "یارسول اللہ ﷺ! کسی قسم کا سوال کچھ مناسب نہیں لگتا لیکن پھر بھی میں سوچتا ہوں کہ آپ ﷺ یہ بانس کا ٹکڑا براہِ راست اس ناچیز کو بھی مرحمت فرما سکتے تھے پھر غیاث الدّین لنگاہ کے ذریعے مرحمت فرمانا؟"

جواب ملا۔ "لنگاہ کے بعض مریدوں کو اس کے مرتبہ و مقام میں شبہ تھا، اس طرح اُن کو یہ بتانا مقصود ہے کہ لنگاہ بھی ایک مردِ بزرگ ہے۔"

بیداری کے بعد آپ لنگاہ کے پاس پہنچے اور فرمایا۔ "بانس کا ٹکڑا کہاں ہے؟"

لنگاہ نے اپنے ارادت مندوں کی موجودگی میں جواب دیا۔ "ابھی کچھ دیر پہلے میں نے خواب میں دیکھا کہ رسول مقبول ﷺ تشریف لائے ہیں۔ آپ کے ہاتھ میں بانس کا ایک ٹکڑا تھا۔ آپ ﷺ نے یہ ٹکڑا مجھے دے دیا اور فرمایا۔ لنگاہ! یہ بانس کا ٹکڑا میرے فرزند عبدالقادر کو پہنچا دو اور اس سے کہہ دو کہ اس پر دس بار سورۂ اخلاص پڑھ کے اس کو جس سے بھی مس کردو گے وہ صحت مند ہوجائے گا۔"

لنگاہ کے مریدوں نے یہ منظر دیکھا اور اپنے پیر و مرشد کی بزرگی کے قائل ہوگئے۔

مخدوم عبدالقادر نے بانس کے اس ٹکڑے کو سورۂ اخلاص دم کر کے مریضوں کو چھوانا شروع کردیا اور اس سے مریض تیزی سے صحت یاب ہونے لگے۔ اُچھ اور ملتان میں ان واقعات نے بڑا شہرہ حاصل کیا اور جس کی زبان پر دیکھو بانس کے اس ٹکڑے کا ذکر ہے۔ بانس کے اس ٹکڑے نے پسلیوں کے درد کی وبا کو ختم کردیا۔ غیاث الدّین لنگاہ حضرت مخدوم عبدالقادر کے پاس چلے آئے اور زندگی بھر اُن کی خدمت کرتے رہے۔

❁

کہیں دُور سے گھومتا ہوا ایک قوال آپ کی خدمت میں پہنچا اور ادب سے ایک طرف بیٹھ گیا، اس کی خواہش تھی کہ آپ اُسے قوالی کے لیے کہیں تو وہ شروع کرے لیکن آپ بھی خاموش بیٹھے رہے۔ اس طرح کافی دیر گزر گئی۔ ایک مرید نے آپ کے پاس جاکر کہا۔ "مخدوم محترم! وہ شخص......"

آپ نے بات کاٹ دی، فرمایا۔ "ہاں ہمیں معلوم ہے کہ وہ شخص کیا چاہتا ہے لیکن ہمیں اس کا شوق نہیں ہے۔"

مرید خاموش ہوگیا۔

قوال انتظار کرتے کرتے تھک گیا تو آپ کے پاس پہنچا اور ادب سے عرض کیا۔ "حضرت! ہم پر بھی توجہ ہوجائے تو کرم ہو۔"

آپ نے جواب دیا۔ "ہمیں قوالی کا بالکل شوق نہیں اس لیے خاموش بیٹھے رہے۔ اب تم جاسکتے ہو۔"

قوال نے اصرار کیا۔ "حضرت! ایک بار سنیں تو سہی، اگر پسند نہ آئے تو...."

آپ نے فرمایا۔ "اگر پسند نہ آئے تو.... آگے کہہ، چپ کیوں ہوگیا؟"

قوال نے جواب دیا۔ "آگے میں کیا عرض کروں، میری کیا مجال۔"

مخدوم عبدالقادر نے فرمایا۔ "اگر تو فلاح چاہتا ہے تو جیسا میں کہوں ویسا کر۔"

قوال نے پوچھا۔ "یعنی، ارشاد؟"

آپ نے جواب دیا۔ "ساز و آواز فریب ہیں، دھوکا ہیں، اس میں اپنی عمرِ عزیز مت ضائع کر۔ ان سے تجھ کو کچھ نہیں ملے گا۔"

قوال بہت مایوس ہوا، اس نے اپنے دل میں سوچا "یہ کیسے پیر ہیں کہ انھیں قوالی پسند نہیں۔ میں اتنی دُور چل کے خواہ مخواہ آیا۔

آپ نے کشف سے اس کی سوچ کا پتا لگا لیا، فرمایا "لیکن تُو خود آیا ہے یہاں، ہم نے تجھ کو نہیں بلایا تھا۔"

قوال بہت گھبرایا، اس نے سوچا کہ یہاں تو سوچ کا بھی پتا چلا لیا جاتا ہے۔ خوب۔ پوچھا "پیر مرشد! پھر اس ناچیز کے لیے کیا حکم ہے؟"

آپ نے جواب دیا "کوئی حکم نہیں، بس ایک مشورہ دوں گا تجھ کو، چند نصیحتیں کروں گا اور کچھ نہیں۔"

قوال نے کہا "اس دربار سے مجھ کو جو کچھ ملے گا میں نعمتِ غیر مترقبہ سمجھ کر لے جاؤں گا۔ آپ ارشاد فرمائیں۔"

آپ نے جواب دیا "اے قوال! توبہ کر۔ تُو اب تک جو کچھ بھی کر چکا ہے اس سے توبہ کر لے۔"

قوال نے تھوڑے سکوت کے بعد عرض کیا "حضرت! میں نے توبہ کر لی، آگے اب مجھے کیا کرنا ہے؟ فرمائیے؟"

آپ نے جواب دیا "ہم نے تیرے دل میں اُتر کے دیکھا، وہاں بہت کھوٹ ہے۔"

اس دربار میں ایک نومسلم لنگایت کا رئیس بیٹھا ہوا تھا۔ اس نومسلم کے خاندان والوں نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا اور اب وہ دین ہی کے لیے جی رہے تھے اور دین ہی کے لیے جان دینے کو تیار تھے۔ اس خاندان کا ایک رئیس اس محفل میں موجود تھا اور وہ بھی آپ کی باتیں بہت توجہ سے سن رہا تھا۔ اس رئیس نے قوال سے کہا "دیکھ پیر مرشد نے تجھ سے جو کچھ کہا ہے تُو اس پر عمل کر اور اگر اس عمل سے تجھ کو کچھ حاصل نہ ہو، تو یہاں دوبارہ چلا آ، اور زیادہ توجہ دی جائے گی۔"

قوال نے آپ سے ایک بار پھر پوچھا "ہاں تو آپ نے وہ کیا تجویز بتائی تھی میرے لیے، مجھے اپنی کامیابیوں کے سلسلے میں کیا کچھ کرنا چاہیے؟"

آپ نے فرمایا "تُو کس کامیابی کی بات کر رہا ہے؟ دنیاوی یا دینی؟"

قوال نے جواب دیا "حضرت! ہم دنیادار گنہگار لوگ — دین کے بارے میں کہاں سوچتے ہیں، ہمیں تو دنیاداری کے بارے میں دعائیں دیجیے اور اپنی قوالی سے بھی میں دنیا ہی حاصل کرنے آیا تھا۔"

آپ نے اپنی باتیں جاری رکھیں، فرمایا "ہم جو بتائیں اس کو توجہ سے سُن۔"

قوال خاموش ہو گیا۔ آپ فرمانے لگے۔ "دیکھ ہم تجھ سے کہتے ہیں کہ توبہ کر لے۔ اپنے ساز توڑ کے پھینک دے، سر کو منڈوا اور درویشوں میں شامل ہو جا، یہ بہترین ساعتیں ہیں، ہم جو کہہ رہے ہیں تُو اس پر عمل کر کے قابلِ قدر درویش بن جائے گا۔"

لنگایت کے رئیس نے پوچھا "مخدوم محترم! کیا یہ گناہگار بھی۔۔۔۔"

آپ نے فرمایا "ہاں تو بھی۔"

وہ رئیس اسی وقت گھر گیا اور اپنی آسائش کی چیزیں تقسیم کر دیں اور اپنے گناہوں سے توبہ کر کے زار و قطار روتا رہا۔ اس کے بعد سر کے بال کٹوائے اور آپ کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ قوال کو جس حال میں بیٹھا چھوڑا تھا، وہ اسی طرح اب بھی بیٹھا ہوا تھا۔

رئیس کے آنسو رُکنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ اس کو اپنے اندر تبدیلیاں ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اب رئیس کو اتنا بھی ہوش نہ تھا کہ وہ قوال سے پوچھتا کہ تُو اب یہاں بیٹھا کیا کر رہا ہے، جا اپنے گھر کی راہ لے۔

قوال نے رئیس کی حالت جو دیکھی تو سمجھا شاید یہ دیوانہ ہو گیا ہے۔ کہنے لگا "حضرت! میں نے تو پہلے ہی یہ عرض کر دیا تھا کہ میں دنیادار آدمی ہوں میں اگر اپنے ساز توڑ دوں گا تو کماؤں کھاؤں گا کس سے۔ میرے حق میں تو دنیا کی دعا کیجیے۔"

آپ نے جواب دیا "جس کو جو ملنا تھا مل چکا، اب تُو جا سکتا ہے۔"

رئیس نے اچانک زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ مجلس کے لوگ رئیس کو دیکھنے لگے۔

آپ نے پوچھا "تُو نے کیا دیکھ لیا؟ کیا نظر آ گیا تجھ کو؟"

رئیس نے جواب دیا "حضرت مخدوم محترم! میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں، اس وقت گجرات میرے سامنے ہے۔ یہاں میرے بھائی کا کنبہ رہتا ہے، میں دیکھ رہا ہوں میرے بھائی کی میّت کو نہلایا جا رہا ہے۔۔۔۔"

مجلس میں سناٹا طاری تھا، رئیس خاموش ہوگیا مگر اس کی سسکیوں کی آواز صاف سنی جارہی تھی۔
قوال نے حیرت سے پوچھا "تم کو تجرات اور بھائی کی میت دکھائی دے رہی ہے؟ بھائی تم تو کمال کے آدمی ہو۔"
رئیس نے کہا "اب میرے بھائی کو کفنایا جارہا ہے۔ دیکھو کتنے سارے لوگ جمع ہیں اور سبھی سوگوار ہیں۔"
قوال کو اس پر یقین نہیں آرہا تھا۔
کچھ دیر بعد رئیس نے کہا "وہ دیکھو، وہ لوگ میرے بھائی کا جنازہ قبرستان لے جارہے ہیں۔"
قوال نے کہا "بھائی رئیس! یہ تو کمال ہوگیا۔ تم تو اچھے خاصے ولی بن گئے۔ بتاتا تو سہی کہ اب کیا ہو رہا ہے؟"
رئیس نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن کچھ دیر بعد اعلان کیا "افسوس کہ میں دیکھ تو رہا ہوں لیکن ان آخری رسوم میں شریک نہیں ہوسکتا۔ وہ دیکھو میرے بھائی کا جنازہ کھلی ہوئی قبر کے پاس رکھ دیا گیا اور لوگ آخری دیدار کر رہے ہیں۔ ذرا رکو تو سہی میں بھی تو اس کا آخری دیدار کرلوں۔ وہ کتنا پیارا چہرہ ہے ایسے لگتا ہے جیسے وہ ابھی ابھی سویا ہے جلد ہی جاگ جائے گا۔"
اب قوال دہشت زدہ ہوچکا تھا، خاموش ہوگیا۔
حاضرین مجلس کو افسوس تھا کہ ان بخشش و فیض کی ساعتوں میں انھوں نے یہ سب کچھ کیوں نہیں حاصل کیا۔
رئیس اچانک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اب وہ کہہ رہا تھا "یار لوگ اس کو دفن کررہے ہیں، میرے بھائی کو۔ ہائے اب تو اس پر تختے رکھ دیے گئے۔ ادھر ہاں، یہ کیا، اچھا تو یہ مٹی دی جارہی ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن بے شک ہم سب کو بھی ایک نہ ایک دن اس کے پاس جانا ہے، جلد یا بہ دیر۔ اے اللہ تو ہر مسلمان کو توبہ کی توفیق دے۔"
اس مجلس میں جو بھی تھا، متاسف تھا کہ یہ دولت اس نے کیوں نہیں حاصل کی۔ قوال تو وہاں سے کچھ اس طرح فرار ہوا کہ نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم، یہاں سے اٹھ کے کہیں قوالی گانے کے لائق بھی نہ رہا، اس کی آواز کا رس، سوز اور لہریں کچھ بھی تو نہ رہا تھا اس میں۔ چشتیہ سلسلے کے بزرگوں نے بھی اس سے قوالی نہیں سنی اور ان صدمات نے اسے نیم دیوانہ کر دیا۔ وہ جس طرف بھی جاتا یہی کہتا، "میں قوالی سنانا چاہتا ہوں، سنو گے؟"
اور لوگ اس کو پاگل اور خبطی سمجھ کر اس کا مذاق اڑاتے۔

*

یہ سکندر لودھی کے عہد کی باتیں ہیں، سکندر لودھی شریف الطبع بادشاہ تھا لیکن دربار میں یہاں بھی چغلیاں کھانے والے موجود تھے اور مخدوم عبدالقادر کے ایک بھائی اب بھی اس دربار سے وابستہ تھے۔ لوگ بھائی کو بھی ورغلاتے اور کہتے "باپ کی خلافت پر آپ کا حق تھا لیکن لے اڑے آپ کے بھائی عبدالقادر، کیا یہ زیادتی نہیں ہوئی ہے آپ پر؟"
لیکن یہ چغل خور ادھر سے مایوس ہوکے بادشاہ کے پاس پہنچے اور اس کو ورغلانے بہکانے لگے۔ انھوں نے بادشاہ سے کہا "حضور والا! آپ تو ماشاء اللہ ظل اللہ (اللہ کا سایہ) ہیں اور عبدالقادر محض درویش۔ اُن کو کبھی کبھی آپ کے پاس تو آنا ہی چاہیے۔"
بادشاہ نے جواب دیا "میں اُن کو خود بھی تکلیف نہیں دینا چاہتا۔"
ایک چغل خور نے کہا "حضور والا! یہ درویش لوگ بھی پکے دنیادار ہوتے ہیں، ان کے پاس دربار کے لوگ پہنچتے رہتے ہیں اور وہ سب اُن سے دُعاؤں کی درخواست کرتے رہتے ہیں، ابھی پچھلے دنوں کی بات ہے کہ دربار کے کسی امیر نے اُن سے کہا کہ حضرت! میرے حق میں دُعا کیجیے کہ اس ملک کی بادشاہت مجھے مل جائے۔"
بادشاہ نے پوچھا "پھر انھوں نے اس کے لیے دُعا کی؟"
چغل خور نے جواب دیا "ضرور کی ہوگی دُعا بلکہ میں نے تو یہ سنا ہے کہ دربار کے وزیر اور امرا اکثر لوگ اکثر و بیشتر وہاں پہنچتے رہتے ہیں اور اُن سے دعائیں کراتے رہتے ہیں۔"
بادشاہ نے کہا "اگر وہ لوگوں کے لیے دعائیں کرتے رہتے ہیں تو میں کیا کروں؟ وہ درویش ہیں، ان کی دُعا اور بد دُعا پر میرا کیا اختیار، میں اُن سے نہیں الجھنا چاہتا۔"

کسی دوسرے چغل خور نے عرض کیا "حضور! اُن سے کچھ کیوں کہیں، اگر حضور پسند فرمائیں تو اس ناچیز کے پاس ایک ایسی تجویز موجود ہے جس سے درباری اُمراء کا وہاں جانا موقوف ہوجائے گا اور عبدالقادر کا زور بھی ٹوٹ جائے گا۔"

بادشاہ نے پوچھا "وہ کیا تجویز ہے؟ ذرا ہم بھی تو سُنیں۔"

اس نے جواب دیا "حضور والا! اگر آپ عبدالقادر کی جگہ اُن کے بھائی کو خلیفہ و جانشین بنا دیں تو درباری اُمرا کٹ جائیں گے۔"

بادشاہ کو یہ تجویز بہت پسند آئی، اُس نے اس کا اقرار کیا "بیشک تجویز تو بہت اچھی ہے اور اس سے اس شر کا سدِّباب بھی ہو جائے گا جس کا اندیشہ پایا جاتا ہے۔"

اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کا لائحۂ عمل تیار کیا جانے لگا۔

ابھی بادشاہ کی طرف سے کوئی کارروائی نہیں ہوئی تھی کہ حضرت مخدوم کا ایک آدمی کاغذات کا پلندہ اور بادشاہ کے نام ایک خط لیے ہوئے دارالحکومت میں داخل ہوا۔

بادشاہ نے اس خط کو پڑھوایا اور کاغذات کا پلندہ ایک طرف رکھ دیا۔ اس خط میں انتہائی اختصار سے کام لیا گیا تھا۔

"ہم کو نہ تو بادشاہی جاگیر کی ضرورت ہے اور نہ سجادہ نشینی کی۔ فرامین جاگیر متعلقہ خانقاہ واپس ارسال ہیں، آپ جس کو چاہیں سجادہ نشین بنا دیں۔"

بادشاہ خوفزدہ ہوگیا اور اپنے ارادے سے باز آگیا، جُملہ فرامین حضرت مخدوم کو واپس کر دیے اور جواب میں لکھ دیا۔

"ہمارا ایسا کوئی ارادہ نہیں، گو کہ کسی اوسنے تجویز پیش کی تھی، فرامین متعلقہ بہ جاگیر واپس ہیں، ہماری خواہش ہے کہ کم از کم ایک بار ضرور قدم رنجہ فرمائیں۔"

لیکن آپ وہاں نہیں گئے۔

٭

شہر میں طاعون کی وبا پھیلی ہوئی تھی، ہر طرف جنازے اُٹھ رہے تھے اور لوگ شہر چھوڑ چھوڑ کے بھاگ بھی رہے تھے، بخار چڑھتا، گلٹی نکلتی اور مریض کا کام تمام ہو جاتا۔

آپ جہاں وضو فرماتے تھے وہاں سبزہ اُگ آیا تھا، معلوم نہیں کسی عاشق اور ارادت مند نے بحالتِ بیماری اس گھاس کو دوا کے طور پر استعمال کیا اور اچھا ہوگیا۔ یہ بات مشہور ہوگئی، بس پھر کیا تھا مریض اس سبزے پر ٹوٹ پڑے اور چند دنوں ہی میں اس کا صفایا ہوگیا۔ جب سبزہ ختم ہوگیا تو وہاں کی مٹی استعمال کی جانے لگی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ طاعون کے مریض سبزہ اور مٹی سے صحت یاب بھی ہوگئے اب تو ہر طرف انہی کا ذکر تھا اور لوگوں نے آپ کو متفقہ طور پر مخدوم عبدالقادر ثانی کہنا شروع کر دیا۔

جب تک آپ زندہ رہے اسلام اور انسانوں کی خدمت کرتے رہے اور کتنے ہی غیر مسلموں نے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔

۸۶۲ھ میں پیدا ہونے والی یہ حیرت انگیز شخصیت ۱۸ ربیع الاوّل ۹۴۰ھ میں وفات پاگئی۔ لوگ غربت سے امارت کی طرف جاتے ہیں لیکن آپ امارت سے غربت کی طرف مراجعت کر گئے اور درویشی میں وہ نام پیدا کیا کہ بادشاہ بھی ان کی ہمسری نہ کر سکے۔
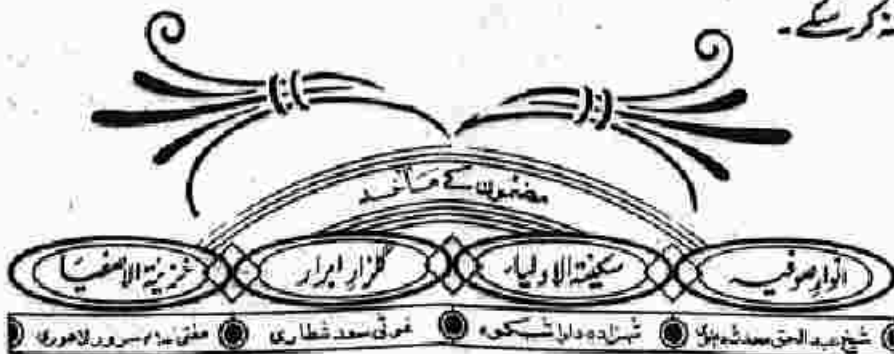
احمد اقبال

اس ماہ احمد اقبال آپ کے لیے ایک اور نیم مزاحیہ کہانی لائے ہیں۔ ہمارے معاشرے کی ایک زندہ حقیقت جسے ہم سب مذاق میں اڑانے کے عادی ہو چکے ہیں۔

"تھانیدار صاحب! آپ مار مار کے مجھے پاپڑ بنا دیں یا عدالت سے مجھے سات سال کی پھانسی ہو جائے۔ حقیقت یہی رہے گی جناب والا! کہ مجھے اللہ رکھی سے اتنی ہی محبت تھی جتنی کنجوس کو پیسے سے ہوتی ہے یا (دروغ برگردن راوی) مجنوں کو لیلے سے تھی۔ اس کے باوجود میں نے اللہ رکھی کو قتل کر دیا۔ قتل بڑا سخت لفظ ہے اور میں دل کا بہت نرم ہوں۔ اتنا کہ بعض اوقات منکوحۂ مرحومہ مجھے بزدل ہونے کا طعنہ دیتی تھی۔ ایسے متعدد مواقع آئے جب میں قتل کر سکتا تھا۔ مثلاً اس دن جب میں باغِ جناح میں سیر کر رہا تھا۔ صبح کی سیر کے بارے میں آپ نے سنا ہوگا انگریز کیا کہتے ہیں۔ کہ آدمی کو صحت مند، عقلمند اور دولت مند بناتی ہے اور میں سمجھتا تھا کہ وہ غلط کہتے ہیں۔ ایسا ہوتا تو ساری دنیا الارم لگا کر منہ اندھیرے گھروں سے نکل آتی اور پھر سب مسائل حل ہو جاتے۔ ہر گھر ایک بنک ہوتا اور ہر خاندان کا ہر فرد افلاطون یا رستمِ زماں ہوتا۔ میں تو بس ہاضمہ درست کرنے نکلا تھا اور وہاں ایک شخص اپنی صحت

درست کر رہا تھا۔ جسمانی صحت میں اللہ رکھی کے تصور میں گم تھا۔ جوان دنوں میری زندگی میں یوں داخل ہو چکی تھی جیسے روڈ رولر سڑک کوٹتے کوٹتے آپ کے گھر میں آ گھسے۔ چنانچہ جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے والی کیفیت تھی کہ میں نے اس نوجوان کو نہیں دیکھا جو صرف اپنی قوتِ بازو کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے مٹھی بند کر کے دونوں بازو پھیلانے سمیٹنے کا سلسلہ جاری رکھا اور میں نے ناک کی سیدھ میں سفر جاری رکھا۔ نتیجہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ جب اللہ رکھی کے گھر والے بُر دکھوے کے لیے آئے تھے تو اس کے ایک کریلے جیسے ماموں نے کہا تھا کہ لڑکے کی ناک ٹیڑھی ہے۔ اگر میں اس کریلے کو قتل کر دیتا تو کیا غلط کرتا۔ اللہ رکھی کا عقد مجھ سے ہونا تھا کہ میری ناک سے دوسرا موقع عقد کے دو سال بعد آیا تھا جب اللہ رکھی گلی میں لنچ کے لیے سبزی خرید رہی تھی۔ غالباً اس نے ایک کریلے کی ظاہری صورت میں ماموں کا جلوہ دیکھ کر صرف اتنا ہی کہا تھا کہ یہ کریلا ہے یا چوہا ہے۔ اس سے ماموں یا کریلے کی توہین تو ہو سکتی تھی مگر سبزی فروش کے لیے مشتعل ہونے کی کوئی بات نہ تھی مگر اس نے کہہ دیا کہ یہ جو تیری گود میں ہے یہ کیا ہے؟ اور اللہ رکھی نے دُہائی دی کہ ارے مرزا چھویا سنتے ہو۔ یہ موا کدو ہمارے ملّو کو چوہا کہتا ہے۔ مجھ پر واجب تھا کہ اس کدو کو قتل کر دوں جس نے میرے گودی کے پھول جیسے ولی عہد کو چوہا کہا لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا "میں بہت رحم دل اور درگزر کرنے والا آدمی ہوں۔ یہ دو مثالیں میں نے اس لیے دی ہیں کہ میری فطرت اور اللہ رکھی سے میری محبت ثابت ہو جائے ورنہ قتل کرنے کے مواقع تو سے ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔ اب اسی صورتِ حال کو دیکھ لیں۔ اصولاً تو مجھے آپ کو قتل کر دینا چاہیے تھا تیمار صاحب!

میرے دماغ کے سارے پُرزے بالکل ٹھاٹھے ہیں اور بالکل صحیح جگہ پر لگے ہوئے ہیں۔ خود آپ نے تجربے کے بعد دیکھ لیا ہوگا کہ میرا سر کوالٹی اور مضبوطی میں بے مثل ہے۔ آپ کو اپنی توند کی قسم جسے آپ نے برسوں کی حرام خوری سے پروان چڑھایا ہے۔ اگر اتنے ہی جوش و خروش سے آپ کے سر پر بھی جوتے سے طبلہ بجایا جاتا تو اس وقت آپ زمانہ قبل از تاریخ کے انسان کی طرح سڑکوں پر گھوم رہے ہوتے یا کسی برگد کے نیچے مجذوب کی طرح بیٹھے کچھ ہانک رہے ہوتے۔ جتنے حملے آپ نے میرے کاسۂ سر پر مولا بخش کے ساتھ کیے ہیں اتنے تو محمود غزنوی نے ہندوستان پر بھی نہیں کیے تھے مگر میں اب بھی اپنے بیان پر قائم ہوں کہ اللہ رکھی سے مجھے واقعی بہت محبت تھی اور میں نے اسے قتل کیا ہے تو کسی فائدے کی خاطر نہیں۔ نہ مجھے اس کی جائداد ملنے کی توقع ہے۔ اس کی جائداد صرف اس کے کپڑے ہیں جو میں پہن نہیں سکتا۔ نہ اس کی زندگی کا کوئی بیمہ تھا۔ یہ خیال تو اکثر مجھے آتا تھا کہ جس شخص کی بیوی اللہ رکھی جیسی ہو اُسے اپنی زندگی کا بیمہ ضرور کرا لینا چاہیے۔ آپ نے وہ لطیفہ تو سنا ہوگا کہ زندگی کی گاڑی میں میاں بیوی دو پہیوں کی طرح ہیں۔ میری بیوی اللہ رکھی ٹرک ٹریکٹر کا پہیہ تھی تو میں اسکوٹر کا — لیکن محبت کا جسامت سے کیا تعلق ہے؟ یہ بات بھی بعید از قیاس ہے کہ میں دوسری شادی کے چکر میں تھا۔ ایک شادی نے مجھے آم سے امچور بنا دیا اور اللہ رکھی کو رائی سے پہاڑ۔ میں دوسری بار اس کا متحمل ہو سکتا تھا؟ حقیقت یہی ہے کہ میں نے اپنی اکلوتی بیوی کو بلاوجہ قتل کر دیا۔ آلاتِ قتل آپ برآمد کر چکے ہیں۔ وہ بیلن جس سے میری سابقہ منکوحہ روٹی بیل رہی تھی۔

جی نہیں، مجھ پر پاگل پن کے دورے نہیں پڑتے۔ چوٹ تو سر پر بسا اکثر کھائی۔ دل کی طرح۔ مگر نقصان کبھی نہیں ہوا۔ ریکارڈ تو والد مرحوم کا ہے جنہوں نے پاپوشِ مبارک سے اس سر کو برسوں نوازا اور اس پر ایک جگ، چائے کے دو کپ، تین گلاس، چار کوارٹر پلیٹیں اور پانچ پیالیاں توڑیں (مرحوم ایک ہوٹل میں ہیڈ ویٹر تھے چنانچہ گھر میں یہ اشیا بکثرت اور بلا معاوضہ آتی تھیں) جوانی سے پہلے فنونِ لطیفہ مثلاً پتنگ بازی، کبوتر بازی وغیرہ میں دو بار چھت چھوٹی پڑ جانے کے باعث گلی میں پیراشوٹ کے بغیر اترنا پڑا۔ پہلی بار پیارے ماموں کی دو پسلیاں ٹوٹ گئیں کیونکہ اپنی غلطی سے وہ عین اسی جگہ آ کھڑے ہوئے تھے جہاں مجھے ٹپکنا تھا۔ دوسری مرتبہ نیچے کوئی نہ تھا۔ سوائے گلی کے فرش کے جو میرے سر سے زیادہ سخت تھا۔ چنانچہ سر ہی ٹوٹا اور کوئی ایک لیٹر خون بھی بہا مگر اور کچھ نہیں ہوا۔ جوانی میں دو پہیوں والا ایک شیطانی چرخا میسر آ گیا جسے لوگ تفریحاً موٹر سائیکل کہتے ہیں۔ اس میں متعدد لوازمات از قسم بریک نہ ہونے کے باعث اپنا یا دوسروں کا سر پھوڑنے کے مواقع بہت ملے مثلاً ایک بار میری راہ میں کھمبا آ گیا جسے سڑک کے کنارے نصب کرنا کارپوریشن والوں کی غلطی تھی۔ اگر وہ بیچ میں ہوتا تو میں صاف دیکھ لیتا۔ اس سے ٹکرا کے موٹر سائیکل تو رک گئی لیکن میں نیوٹن کے قوانینِ حرکت کے مطابق اُڑتا ہوا گیا اور سیدھا دودھ کے ایک تالاب نما کڑھاؤ میں جا اترا۔ مقامِ شکر ہے کہ تازہ دودھ کا غسل فرحت بخش ثابت ہوا۔ شام کا وقت ہوتا تو درجۂ حرارت مختلف ہوتا اور

شاید میری کھیر بھی بن جاتی۔ یا مجھے یوں نکالا جاتا جیسے حلوائی دس ملائی نکالتے ہیں۔ مقصد یہ بتانا تھا کہ سر کسی چوٹ سے متاثر نہیں ہوا۔ آپ کہیں گے میں بہت بولتا ہوں۔ لیکن یہی تو میرا مسئلہ ہے تھا نیدار صاحب! اگر کسی نے اب تک میری سنی نہیں اور میں جو آج یہاں اس مقام تک آپہنچا ہوں تو اس کا سبب بھی اور کچھ نہیں۔ آج صبح آنکھ کھلنے پر مجھے ایسی کوئی بات محسوس نہیں ہوئی تھی کہ میں اس دن کو منحوس سمجھتا۔ ویسے بھی میں توہم پرست نہیں ہوں۔ میں نے سب سے پہلے اپنا ہی چہرہ دیکھا تھا جواب تو خیر کسی دلہن جیسا بھی نہیں رہا مگر اللہ رکھی اسی پر مرتی تھی۔ گھر سے نکلتے ہوئے میرا راستہ کسی کالی بلی نے نہیں کاٹا تھا لیکن اس کے بعد حالات نے میرے خلاف سازش کر لی۔ بس میں سوار ہوتے ہی مجھے احساس ہوا کہ میری جیب میں صرف دس کا ایک نوٹ ہے۔ بس کنڈیکٹر حلیے اور لب و لہجے سے چنگیز خان کا سالا ثابت ہوا۔ اس نے نہایت غضبناک لہجے میں کہا۔ ”نوٹ بے پیسے کھلے نکالو۔ ورنہ اتر جاؤ۔“

”اترنے کا کیا سوال۔“ میں نے کہا۔ ”میرے پاس کھلا نہیں ہے اتفاق سے...“

”اتفاق کا بچہ!“ وہ دھڑ سے بس کے دروازے پر ہاتھ مار کے بولا۔ ”کیا لکھا ہے ادھر۔ ایک روپے سے زیادہ ریزگاری نہیں ملے گی۔ روک کے استاد۔“

”یہ تو تب سے لکھا ہے جب کرایہ دس پیسے تھا۔“ میں نے احتجاج کیا مگر اس وقت تک مذکورہ کنڈیکٹر اسی طرح مجھے ’آؤٹ‘ قرار دے چکا تھا، جیسے ہمارے دشمن امپائر ہمارے ہر سپر اسٹار بیٹسمین کو ایل بی ڈبلیو دیتے آئے ہیں۔ ابھی بس رکی بھی نہ تھی کہ میں بھد سے باہر گرا۔ کپڑے جھاڑ کر اٹھنے کے بعد میں نے عالم اشتعال میں بس کے پیچھے دوڑنے اور اسے کنڈیکٹر سمیت تباہ کرنے کی کوشش بھی کی لیکن دوبارہ گرا کیونکہ میرے پاؤں میں موچ آگئی تھی۔ اگلے بس اسٹاپ تک کا فاصلہ میں نے اس موٹر سائیکل کی طرح طے کیا جس کا ایک ٹائر پنکچر ہو۔ لیکن اس کے بعد بھی یہ ہوا کہ جو بس آئی اس میں اندر باہر لوگ اس طرح بھرے ہوئے تھے جیسے شہد کے چھتے میں مکھیاں اور کوئی بھی بس رکے بغیر گزر گئی۔ مجھے دفتر میں دیر ہونے کا اندیشہ لاحق ہو گیا تھا چنانچہ میں نے مواصلات کے دیگر ذرائع اختیار کرنے کی کوشش کی اور ایک رحمت کا فرشتہ میرے اشارے کو سمجھ کے اپنی موٹر سائیکل میرے قریب روکنے میں کامیاب

ایک خاتون نے اپنے شوہر سے کہا۔
”اگر میں مر گئی تو تمہارا کیا ہو گا؟“
میاں نے برجستہ جواب دیا ”میں سوچ رہا ہوں کہ اگر تم نہ مریں تو میرا کیا ہو گا؟“

فلم ایکٹریس: ”پچھلی پکچر میں جب میرے شوہر نے میری موت کا منظر دیکھا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ پروڈیوسر: ”اس کو رونا ہی چاہیے تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ تمہاری موت حقیقی نہیں ہے۔“

مرسلہ: ریاض احمد سالک، کھوکھر منڈی
ضلع گوجرانوالہ

ہو گیا۔ دس گز چلنے کے بعد موٹر سائیکل کے انجن نے غرارے شروع کیے۔ پھر چند ہچکیاں لیں اور فوت ہو گیا یعنی انگریزی میں ’ڈیڈ‘ ہو گیا۔ سو گز تک میں نے اس سواری کو معہ فرشتۂ رحمت کے دھکا لگایا اور اس نے بھی مردے کو زندہ کرنے کا ہر جتن آزمایا لیکن خدا کے حکم کے بغیر پتا نہیں ہلتا تو انجن کیسے ہلتا۔ اس ہنڈرڈ میٹر کی ریس کا اختتام کیلے کے ایک چھلکے پر ہوا۔ یکلخت مجھے یوں لگا جیسے موٹر سائیکل میرے ہاتھوں میں سے کبوتر کی طرح اڑ گئی ہے اور آسمان میری ٹانگوں میں سے گزر گیا ہے۔ جب میں نے غور کیا تو دیکھا کہ سڑک پر ٹریفک کے درمیان اتنے سکون سے لیٹا ہوں کہ شاید مردے اپنی قبروں میں نہ لیٹتے ہوں گے اور لوگ میرے گرد حلقہ بنائے یوں خندہ زن تھے جیسے میں رنگیلا ہوں اور گر کے مرنے کی مزاحیہ اداکاری کر رہا ہوں۔ موٹر سائیکل اسٹارٹ ہو گئی تھی لیکن فرشتۂ رحمت مجھے لٹا کے غائب ہو گیا تھا۔ اٹھنے کے بعد مجھ پر انکشاف ہوا کہ میرے دوسرے پاؤں میں بھی موچ آچکی ہے۔ مجھے متحرک رکھنے والے دونوں پائے ناکارہ ہو چکے تھے مگر مجھے اپنے پالیوں سے زیادہ دفتر پہنچنے کی فکر تھی چنانچہ میں نے ایک رکشے والے کی منت سماجت کی۔ دوسرے پر رعب جمایا۔ تیسرے کو آخرت کے ثواب کا لالچ دیا۔ اور چوتھے کو دو روپے زائد از میٹر دینے کا۔ چنانچہ چوتھا مجھے دفتر لے گیا مگر اس وقت تک جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔ میں افتاں و خیزاں۔ چھٹی پتلون کے سوراخ پر ہاتھ رکھے۔ تقریباً ڈیڑھ آنکھ سے دیکھا اور

لگڑ بگڑ کی طرح چلتا اپنے افسر کے کمرے میں پہنچا تو مجھے آدھے گھنٹے کی دیر ہو گئی تھی، حسبِ معمول گھڑی میں ساڑھے نو بجے تھے۔

"آ گئے ہو مرزا بھوپا؟" افسر نے طنز آمیز تلخی سے کہا۔ "ایم ڈی صاحب تم سے پہلے آ کے جا چکے ہیں۔"

"وہ... سر... دراصل۔" میں نے اپنی دکھ بھری داستان شروع کی جس میں بس کا اور کیلے کے چھلکے کا رقت انگیز ذکر تھا۔

"بکواس بند کرو۔" اس نے میز پر مکا مارا اور ہاتھ سہلایا کیونکہ نشانہ غلط ہونے سے اس نے ایش ٹرے کے دو ٹکڑے کر دیے تھے۔ "میں تمھارے بہانے سنتے سنتے تنگ آ گیا ہوں۔ ڈسمس۔ برطرف۔ اسی وقت۔" اس نے دو مکے اور مارے لیکن احتیاط سے فائلوں کے ڈھیر پر۔ "یہ ایم ڈی صاحب کا حکم ہے۔"

میں نے پہلے یہ سمجھا کہ وہ مذاق کر رہا ہے۔ پھر یہ سمجھا کہ میرے کانوں نے غلط سنا ہے چنانچہ میں مسکراتا رہا۔

"سنا نہیں تم نے؟ جاؤ اسی وقت چارج دو۔ تمھاری جگہ دوسرا آدمی آ گیا ہے۔" باس نے چلّا کر کہا۔

"لیکن جناب!" میں نے بے ہوش ہونے سے اجتناب کیا۔ "یہ تو بڑا ظلم ہے۔ میں تیرہ سال سے کمپنی میں ملازم ہوں۔ مجھ سے پہلے میرا باپ..."

"ہاں۔" وہ چلّا کے بولا۔ "تم سے پہلے اس نے اپنے بہانوں سے میرا جینا حرام کر رکھا تھا۔ تم بہانہ سازی میں اسی کے تربیت یافتہ ہو نا۔ کل تمھارے چاچا کی چاچی مر گئی تھی۔ پرسوں وہی چاچا بھیڑ کے پیچھے دوڑتے ہوئے ایمبولینس سے ٹکرا کے مر چکا تھا۔ اس سے ایک دن پہلے تم پہلی بار باپ بنے تھے حالانکہ صرف چوبیس گھنٹے قبل تمھارا اکلوتا بچہ فوت ہو گیا تھا۔ مگر راتوں رات۔ خیر اب یہ نہیں چلے گا۔ گیٹ آؤٹ۔ جا کے چارج دو۔ ہم نے نیا آدمی رکھ لیا ہے۔" اس نے گھنٹی بجائی جس کا مطلب یہ تھا کہ اب میں نہ نکلا تو نکالا جاؤں گا۔

میری سیٹ پر جو شخص غاصبانہ طور پر قابض تھا اسے آدمی سمجھنا مشکل تھا۔ اس کی شکل گوریلے جیسی، ناک طوطے کی چونچ جیسی، بازو ریچھ جیسے اور آنکھیں سانپ کی طرح گول تھیں۔ اس نے حقّے کی طرح گڑگڑا کے مجھ سے کچھ کہا جو میرے لیے عبرانی سے کم ناقابلِ فہم نہیں تھا۔ اب آپ اپنے ایمان سے کہیں تھانیدار صاحب کیا اس وقت مجھے قتل نہیں کر دینا چاہیے تھا اس مجموعۂ حیوانات کو؟ لیکن جیسا کہ میں نے کہا کہ میں بہت رحم دل ہوں۔ میں نے اس شخص کو بھی معاف کر دیا جو کسی طرح بھی میری کرسی پر بیٹھنے کا اہل نہیں تھا۔ اس نے میٹرک تھرڈ ڈویژن میں اور تین قسطوں میں کیا تھا۔ میں پہلی بار ہی نکل گیا تھا۔ اس نے پہلے کبھی دفتر کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ ٹائپ رائٹر میں اور قیمہ کرنے کی مشین میں اس کے لیے کوئی فرق نہ تھا کیونکہ وہ دونوں کے استعمال سے ناواقف تھا۔ اس کی کُند ذہنی کا یہ عالم تھا کہ میری ڈیسک کی گیارہ فائلوں کو اس نے بارہ دفعہ شمار کیا اور کبھی نو تو کبھی گیارہ سمجھتا رہا۔ جو انگریزی وہ بولتا تھا اس میں صوبے کی ہر زبان کی نمائندگی برابر ہوتی تھی لیکن یہ ملغوبہ اس کے حلق سے مرحلہ لہجے میں برآمد ہوتا تھا تو آواز بالکل حقّے کی طرح آتی تھی۔ لیکن حقّے کو کمپنی کے مالک کی تائید و سفارش حاصل تھی۔ کیونکہ وہ جمرو کا بھائی تھا اور ساری خدائی ایک طرف ہوتی تب بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ ویسے بھی اس میں مزید بگڑنے کی گنجائش نہ تھی۔ نہ ظاہری طور پر۔ نہ باطنی اعتبار سے۔

اپنے لقایاجات لے کر اور چارج دے کر میں دفتر سے یوں نکلا جیسے طلاق پا کر اللہ رکھی میرے گھر سے نکلتی بشرطیکہ یہ ممکن ہوتا۔ صرف ایک گھنٹے بعد میں پھر سڑک پر تھا۔ اس سڑک پر جو مصروف، تگ و دو کرتے، دوڑتے بھاگتے، برسرِ روزگار انسانوں سے آباد تھی۔ جس پر کچھ دیر پہلے خود میں روزگار کی خاطر دفتر پہنچنے کی دلیرانہ وار جدوجہد میں تماشا بنا تھا۔ جدوجہد رائیگاں گئی تھی اور میں بے روزگار ہو چکا تھا۔ افسوس مجھے ملازمت جانے کا نہیں تھا کیونکہ ہفتہ دس دن مہینہ یا دو مہینے میں ایسی ہی کسی چھوٹی موٹی نوکری کا مل جانا ضروری تھا۔ دکھ مجھے اس بات کا تھا کہ دنیا سے شرافت اور وضعداری، مروّت اور لحاظ ختم ہو گئے۔ کسی نے تیرہ برس کی فرض شناسی اور وفاداری کو، میری صلاحیت اور کارکردگی کو اور اتنے پرانے تعلق کو اہم نہیں سمجھا۔ ٹھیک ہے میں کبھی کبھی دیر سے پہنچتا تھا لیکن میرا کام اس سے متاثر نہیں ہوتا تھا۔ اور میرے دیر سے پہنچنے یا جھوٹ بول کے جواز پیش کرنے کا سبب بھی یہ تھا کہ افسروں کی طرح میرے پاس کار نہیں تھی۔ میں موٹر سائیکل خریدنے کی سوچتا تھا تو اللہ رکھی کی بیوگی کے خیال سے رک جاتا تھا۔ صبح کے وقت بسوں میں جگہ نہیں ملتی تھی۔ رکشا ٹیکسی میری بساط سے باہر تھے اور میں پرندہ بھی نہیں تھا۔

بس ایک لفظ 'ڈسمس' اور سب خلاص۔ میں نے لنگڑا کے سڑک پر چلتے ہوئے سوچا۔ آدمی باصلاحیت، ایماندار اور محنتی ہو نہ ہو، کسی وی آئی پی کا سالا ضرور ہو۔ پھر چاہے وہ دنیا کو ایک آنکھ سے دیکھتا ہو۔ رات کے اندھیرے میں دکھائی نہ دیتا ہو۔ حقّے کی طرح گڑگڑاتا ہو اور گدھے کی

طرح چلتا ہو۔ وہی حسین ہے زمانے کی آنکھ کا تارا۔ نہ تیرہ سال کی محنت کا کوئی انعام، نہ کوئی حرفِ ستائش، نہ تعلق کی سند، نہ داد نہ فریاد۔ کسے وکیل کریں کس سے منصفی چاہیں۔ میرا دل چاہتا تھا کہ اس ناانصافی پر راہ چلتے لوگوں کو چلا چلا کے متوجہ کروں اور مجمع کے سامنے ایسی دردناک تقریر کروں کہ ایک زمانہ میرا ہمنوا ہو کے ایم ڈی۔ اس کے سالے دفتر سب کو تباہ کر دے۔ علامہ اقبال نے بھی تو فرمایا ہے کہ جس کھیت سے دہقان کو میسر نہ ہو روزی، اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو۔ مگر یہ سب فقط آرزو کی بات تھی۔ میں میکلوڈ روڈ پر تھا۔ ہائیڈ پارک میں نہیں جہاں جس کا دل چاہے کنستر پہ کھڑا ہو کے کسی بھی موضوع پر کسی کے خلاف شعلہ فشانی کر کے دل کا غبار نکال لے۔ اثر کرے نہ کرے سُن تو لے مری فریاد۔ اور تفریح کے لیے جمع ہونے والے قائل ہو کے داد دیں یا خبطی سمجھ کے گندے انڈے ماریں، آدمی دنیا کو دل کی بات تو سنا سکے۔ یہاں کوئی بھی نہ رکتا سوائے پولیس مین کے۔ وہ کسی ثبوت یا تفتیش کے بغیر مجھے گڑ بڑ کے بندر کے پاگل خانے ارسال کر دیتا اور بڑے بڑے ائیر کنڈیشنڈ کلینک کھول کر بیٹھنے والے ماہرینِ نفسیات کو یہ کبھی معلوم نہیں ہوتا کہ آخر میں غریب خانے سے پاگل خانے کیسے جا پہنچا۔

میرا وجود اندر سے کسی آتش فشاں کی طرح کھول رہا تھا۔ ہر طرف بلند و بالا عمارات تھیں۔ ہر فلور پر مختلف دفاتر میں اپنی اپنی سیٹ پر وہی لوگ کام کر رہے تھے جن کے ایم ڈی کا کوئی سالا نہیں تھا یا ابھی تک ان کی جگہ لینے نہیں پہنچا تھا یا وہ ایم ڈی ایسے تھے کہ اپنے سالے کو لات مار کے نکال دینا بہتر سمجھتے تھے۔ کسی تیرہ سال کے تجربے کار، ایماندار اور... فرض شناس ملازم کو نہیں۔ صرف میری سیٹ پر ایک حقہ بیٹھا گڑگڑا رہا تھا جسے شاید میں چلم بھرنے کے لیے بھی ملازم نہ رکھتا۔ ڈسمس۔ گیٹ آؤٹ۔ یہ الفاظ میرے سر پر ہتھوڑے برسا رہے تھے اور میں افسردگی کے بجائے انتقامی ردِ عمل کا شکار ہو رہا تھا۔ میں تسلیم کرتا ہوں تھانیدار صاحب کہ اس وقت میرے ذہن میں انتہائی خطرناک منصوبے تھے۔ مثلاً گولی مار کے حقے کو ختم کر دینا۔ بم پھینک کے ایم ڈی کو اس کی گاڑی سمیت تباہ کر دینا جس میں وہ مجھ سے پہلے دفتر آ پہنچا تھا۔ ایٹم بم گرا کے اس کے سارے دفتر اور کاروبار کو نیست و نابود کر دینا۔ ہائیڈروجن بم سے اس شہر کو مٹا دینا یا نیوٹران بموں سے ساری دنیا کو فنا کر دینا۔ لیکن یہ سب منصوبے ناقابلِ عمل تھے۔ اللہ رکھی کے لیے بھی مجھے صرف وہی بیلن دستیاب ہوا جو اس کے ہاتھ میں تھا۔

اس کے علاوہ میں بہت رحم دل بھی تو ہوں۔

چلتے چلتے تھک کر میں ایک بینچ پر جا بیٹھا اور سوچنے لگا کہ کل کیا ہو گا؟ پھر مجھے خیال آیا کہ آج کیا ہو گا؟ ابھی تو صرف ساڑھے دس بجے ہیں۔ چار بجے تک میں کیا کروں گا۔ جب میں چھٹی کرتا تھا تو میرے پاس کوئی ضروری یا غیر ضروری کام ہوتا تھا یا خود اللہ رکھی دیکھتی تھی کہ آئے موسم رنگیلے سہانے تو گھر کے چھٹی کے لیے فرمائش کر بیٹھتی تھی۔ یہ صورتِ حال مختلف تھی۔ اب مجھے اللہ رکھی کو جا کے بتانا تھا کہ مجھے نوکری سے نکال دیا گیا ہے۔ بے شک ابھی ہم دو چار ماہ اپنے اندوختے پر گزار سکتے ہیں اور میں کل سے ہی نوکری کی تلاش شروع کر سکتا ہوں مگر آج تو یہ خبر اس کے لیے اتنی ہی المناک ہو گی جتنی قوم کے لیے عمران خان کی ٹانگ ٹوٹنے کی خبر۔ کون سمجھائے گا عورت ذات کو یہ کہ قصور میرا نہیں تھا۔ نہ میرے دیر سے پہنچنے کا تھا۔ قصور ایم ڈی کی بیوی کا تھا جس نے اپنے میاں سے کہہ دیا ہو گا کہ میں نہیں جانتی جسے چاہو نکالو مگر میرے بھائی کو رکھو۔ ورنہ میں چلی میکے اور میاں ہو گا میری طرح۔

”دنیا میں انصاف کہاں ہے؟“ میں نے سرد آہ بھر کے کہا۔ یہ بات میں نے اپنے آپ سے کہی تھی کیونکہ میرا خیال تھا کہ میرے ساتھ کوئی بھی بیٹھا ہوا نہیں ہے۔ لیکن میرے ساتھ کوئی اور بھی بدبخت سوختہ جاں آ گیا تھا۔

”سچ ہے بھائی صاحب!“ وہ رقت انگیز لہجے میں بولا۔ زور سے ناک صاف کی اور رومال کو برآمدات سمیت رکھ لیا۔ ایک دردآشنا سے مل کے مجھے تھوڑا سا سکون ملا۔ ”دیکھیے نا بھائی جان! تیرہ سال تک...“

”تیرہ سال!“ وہ چلایا۔ ”یہی تو میں بھی کہتا ہوں۔ شادی کو تیرہ سال ہو گئے۔ ابھی تک وہ مجھے گدھا سمجھتی ہے۔ بلکہ گدھے کو افضل سمجھتی ہے۔ حالانکہ میرا نام افضل ہے۔ آخر میں انسان ہوں۔ کب تک اس کے ہاتھ کے پکے ہوئے ٹنڈے کریلے بینگن کھاؤں؟ گوشت میں ٹنڈے قیمے میں کریلے، دال میں بینگن، صبح دوپہر شام ہر روز وہی ٹنڈے یا کریلے یا بینگن۔ اس سے تو اچھا جیل میں قیدی کھاتے ہوں گے۔ کبھی تو انھیں بھی صرف دال بھی ملتی ہو گی یا صرف گوشت بھی مل جاتا ہو گا۔ لیکن میرے لیے تو عید، بقر عید، شب برات سب وہی ہیں۔ ٹنڈے کریلے اور بینگن۔ شب برات پہ ٹنڈوں کا حلوہ۔ عید پہ کریلے بینگن۔ کہتی ہے ابا میاں کو بہت مرغوب تھے۔ ان کو قبر میں ڈھانچہ بنے کئی سال ہو گئے... ابھی تک ان کی پسند کی سزا مجھے مل رہی ہے۔“

”مجھے بڑی ہمدردی ہے آپ سے۔“ میں نے کہا۔

"لیکن میرا مسئلہ بہت سنگین ہے۔"

"خاک سنگین ہے جی!" وہ تقریباً روتے ہوئے بولا۔ "ٹھڈے کھا کھا کے میری ٹنڈ ہو گئی۔ ایک بال نہیں رہا سر پہ۔" اس نے ٹوپی اتار کے سر کو برائے ملاحظہ پیش کیا اور ٹوپی پھر ڈھکن کی طرح رکھ لی۔ "گریڈے کھاتے کھاتے میرے مزاج میں تلخی آگئی، زبان کڑوی ہو گئی۔ کنٹرول تک مجھے کاٹتے ہیں تو سمجھتے ہیں کونین پی لی۔ میں آدمی نہیں تھالی کا بینگن ہو گیا ہوں۔ میرا دل نیم پہ چڑھنے کو چاہتا ہے۔ میرا سر ایک ٹنڈا بن گیا ہے۔"

میرا دل چاہا کہ اس کے ایک جھانپڑ رسید کر دوں۔ کہاں فکرِ معاش اور میرے ساتھ ہونے والی صریح ناانصافی اور کہاں اس کا احمقانہ مسئلہ۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو یوں رونے کے بجائے کب کا ایسی بیوی کو اپنے ابا میاں کے ساتھ ڈھاتچہ بنا کے لٹکا چکا ہوتا۔ لیکن بات وہی ہے کہ میں ذرا نرم دل ہوں۔ میں اس تھالی کے بینگن کے پاس سے اٹھ گیا اور اسے معلوم بھی نہ ہوا۔ اگر وہ میری سن لیتا تو میرے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جاتا لیکن اس کی بات سن کے مجھے مزید جھنجلاہٹ اور کوفت میں مبتلا کر دیا۔ میں نے گھڑی دیکھی تو ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ اس وقت کمپنی میں لوگ چائے پی رہے ہوں گے اور وہ کپ جو میرا تھا اس ایم ڈی کے سالے کو ملا ہو گا جسے اصولاً حقے کا پانی ملنا چاہیے پینے کو۔ مگر اصول دنیا میں کہاں چلتا ہے۔

میں ایک ریسٹورنٹ میں جا بیٹھا۔ وہاں لنچ کے وقفے میں تل دھرنے کی جگہ نہیں ہوتی تھی لیکن اس وقت وہاں الو بھی نہیں بول رہے تھے۔ ایک الو کاؤنٹر کے پیچھے چپ بیٹھا تھا۔ دوسرا الو چائے کی پیالی میں یوں جھانک رہا تھا جیسے اس میں کود کر خودکشی کر لینا چاہتا ہو۔ صورت سے وہ بھی میری طرح مظلوم اور مصیبت زدہ نظر آتا تھا۔ وہ جو کہا ہے نا شاعر نے کہ سے آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں۔ اسی نیک مقصد کے تحت میں بھی اس کے پاس جا بیٹھا تھا۔

"آپ کچھ افسردہ ہیں بھائی صاحب!" میں نے سلسلۂ کلام کا آغاز کیا۔

"میں اس وقت دنیا کا سب سے افسردہ، سب سے بدبخت اور سب سے زیادہ دل شکستہ آدمی ہوں۔" وہ بولا

"ایسی کوئی بات نہیں۔ آخر مجھے بھی تو دیکھیے۔" میں نے کہا۔ "جو میرے ساتھ آج ہوا۔"

"نہیں۔ آپ کے ساتھ کچھ نہیں ہوا۔" وہ میری بات کاٹ کے بولا۔ "میرے ساتھ وہ ہوا ہے جو مجنوں کے ساتھ نہیں ہوا تھا۔ فرہاد کے ساتھ نہیں ہوا تھا۔ کسی فلم میں نہیں ہوا تھا۔ اس کے فراق میں مرغِ بسمل کی طرح تڑپ تڑپ کے میں نے کتنی راتیں گزاریں۔ ایک منٹ۔" اس نے جیب سے نوٹ بک نکالی۔ "مالی سال بیاسی ترا سی میں تین سو چونسٹھ۔ وہ صرف ایک بار مجھے ملی تھی۔ مالی سال ترا سی چورا سی میں ڈیڑھ ملاقات ہوئی۔ ایک مرتبہ بمراہ رقیب ملاقات ہوئی دوسری بار خط کے ذریعے جو نصف ملاقات شمار کیا جا سکتا ہے۔ خط میں اس نے لکھا تھا کہ مجھے بھول جاؤ۔ اور ان ہجر کی راتوں میں معلوم ہے میں نے کیا کیا؟ وہی جو عاشق کی روایات کے مطابق ہے۔ اختر شماری۔ میں نے ایک سو دس روپے کا پاکٹ کیلکولیٹر خریدا۔ اور کل تارے شمار کیے۔" اس نے پھر نوٹ بک سے رجوع کیا۔

"برادر!" میں نے ضبط سے کام لے کر کہا۔ "تم نے اور کچھ بھی کیا۔ کوئی کام کاج؟"

"آہ۔ تم بھی اسی ظالم سماج کے نمائندے ہو۔" وہ چیخ کر بولا۔ "اس کے باپ کی طرح عشق کو ڈگریوں اور سکوں سے تولتے ہو۔ وہ بھی مجھ سے یہی سوالات کرتا تھا، میٹرک کیوں نہیں کیا؟ نوکری کیوں نہیں کرتے؟ اپنے پاس کھانے کو نہیں میری بیٹی کو کہاں سے کھلاؤ گے؟ وہ بھی صنعت کار کی بیٹی نکلی۔ بے وفا۔"

"کوئی بات نہیں دوست! وقت بڑا چارہ گر ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ زخم بھی مندمل کر دے گا لیکن میرا کیا بنے گا جس کو کھڑے کھڑے دودھ کی مکھی کی طرح۔۔۔"

"دغاباز حسینہ۔۔۔ اس نے بھی اپنا جیون ساتھی ایک سی ایس پی کو منتخب کر لیا۔ ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے۔ کسی کو شیریں نے، کسی کو لیلیٰ نے تو کسی کو آج ایک بے وفا نے مارا۔" وہ ٹپ ٹپ اپنے آنسو چائے کے کپ میں گراتا رہا۔ چائے کی حالت اس کی طرح پتلی ہوتی جا رہی تھی کیونکہ وہ ایک چسکی لیتا تھا تو ایک سسکی اور جتنی چائے پیتا تھا اتنے ہی آنسو چائے میں شامل کر دیتا تھا۔ "کاش میں بھی سی ایس پی ہوتا۔ پولیس کا ڈی ایس پی ہوتا یا ای ایس پی ہوتا ٹیلی فون کے محکمے کا۔ مگر میں ایف ایس پی ہوں۔ فتو سن آف پھتو۔"

ایک بار پھر میں نے اپنی کہنے کی کوشش کی۔ مگر فتو ولد پھتو اس گراموفون ریکارڈ کی طرح بجتا رہا جس پر سوئی اٹک گئی ہو۔ ناانصافی اگر اس کے ساتھ ہوئی تھی تو میرے ساتھ بھی ہوئی تھی اور اصولاً اپنی بات کہنے کے بعد اسے میری بھی سننی چاہیے تھی۔ میرے دل میں غبار جمع ہوتا جا رہا تھا اور مجھے اب دنیا پر بھی طیش آنے لگا تھا جسے مجھ سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ یہ خود غرضی اور کمینگی کی انتہا تھی کہ کوئی میری بات

تک نہیں سن رہا تھا۔ میں نے سوچا تھا تھانیدار صاحب! اس پر اس کی اوقات واضح کر دوں کہ میاں قلم اور زندگی میں وہی فرق ہے جو اس جیسے پھکڑ۔ نکمے اور جاہل عاشق میں اور ایک صنف نازک کی پڑھی لکھی اور خوبصورت بیٹی میں ہے اور یہ فرق نہ ہجر کی راتیں شمار کرنے سے کم ہو سکتا ہے اور نہ تارے گننے سے۔ اور میں نے اٹھنے سے پہلے یہ بھی سوچا کہ اس گراموفون ریکارڈ کو ہمیشہ کے لیے بند کر دوں۔ لیکن کیا کروں میں بہت نرم دل آدمی ہوں۔

چائے کی طلب بھی شدید ہو گئی تھی چنانچہ میں دوسرے اعلیٰ قسم کے ریسٹورنٹ میں چلا گیا۔ ابھی میں بیٹھا بھی نہ تھا کہ سامنے والی سیٹ پر دوسرا شخص آ بیٹھا۔ اس کے ہاتھ میں تقریباً دس کلو کی ایک کتاب تھی۔

”آئی ایم سوری!“ میں نے کہا۔ ”مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس ٹیبل پر آپ کی ریزرویشن تھی۔“

”ریزرویشن ہے“ وہ ہنسا۔ ”ابھی حضرت! ریزرویشن ہمارے لیے کہیں نہیں۔ نہ یہاں نہ وہاں۔ نہ کوچے یار میں دو گز زمین پر۔ نہ قصر سلطانی کے گنبد پر۔ نہ پہاڑوں کی چٹانوں پر۔ نہ اسکیم نمبر ۳۳ کے کسی پلاٹ پر۔ نہ فٹ پاتھ پر۔“ اس نے ضخیم کتاب کو میز پر یوں رکھا جیسے ڈر ہو کہ ٹوٹ نہ جائے۔ حالانکہ مجھے اس کے وزن سے میز کے ٹوٹنے کا خیال آیا تھا۔ میں نے اپنے لیے اور اس کے لیے چائے منگوائی اور اپنا تعارف کرایا۔ یہ پڑھا لکھا اور معقول شخص لگتا تھا اور مجھے امید تھی کہ اسے دل کی بات سنانا مشکل نہ ہوگا بشرطیکہ میں اپنی وحشت پر قابو پا کے اطمینان سے سب کچھ کہوں۔

”کیا کرتے ہیں آپ؟“ اس نے میرے سگریٹ کے پیکٹ میں سے ایک سگریٹ لے کر کہا۔

”کیا کرتا ہوں۔“ میں نے ایک آہ سرد بھر کے کہا۔ ”کچھ بھی نہیں۔ ابھی دو گھنٹے قبل...“

”ہا ہا ہا۔“ وہ بولا۔ ”دو گھنٹے۔ دو منٹ، دو سیکنڈ، یا دو صدیاں۔ یہ سب ماضی کی باتیں ہیں۔ اس وقت کی جو گزر گیا۔ مر گیا۔ میں آنے والے وقت کا نقیب ہوں۔“

”جی؟“ میں نے گڑبڑا کے کہا۔ ”کس کے رقیب ہیں آپ؟“

”رقیب، خوب کہی آپ نے؟“ وہ بولا۔ ”رقیب ہوں میں ان سب کا جو انسانیت کے مستقبل کی ہر سنہری کرن کے پرستار ہیں۔ جو کل کے ہر خواب تمنا کی تعبیر چاہتے ہیں۔ عروس صبح فردا کی زلفیں سنوارنے والے۔“

”میں سمجھ گیا۔“ میں نے کہا۔ ”آپ شاعر ہیں۔ کیا نام بتایا تھا آپ نے؟“

”میں نقش فریادی ہوں۔“ وہ بولا۔ ”ظلم اور استحصال کے خلاف جہاد کا قافلہ سالار۔ ناانصافی کے خلاف شمشیر برہنہ۔“

”پھر تو آپ میری مدد کر سکتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”کیونکہ مجھ پر بھی ظلم ہوا ہے۔ میں بھی استحصال کا شکار ہوا ہوں۔ ناانصافی میرے ساتھ بھی ہوئی ہے۔ لیجیے چائے پیجیے۔“ میں نے ایک کپ اس کی طرف بڑھا کے کہا۔ ”تیرہ سال تک میں نے ایک فرم میں ملازمت کی۔ دن رات محنت کی لیکن میرے خلوص کا اور میری لگن کا انجام کیا ہوا۔ ایم ڈی کے سالے نے...“

”فکر مت کرو دوست!“ وہ ہاتھ لہرا کے بولا۔ ”وہ وقت اب دور نہیں ہے جب اس دنیا کے سارے ایم ڈی اور ان کے سالے کسی کا استحصال نہیں کر سکیں گے۔ سنو میری نظم۔ ہلاکو کا نوحہ۔“ اس نے ضخیم کتاب کو درمیان سے کھول کے ترنم سے پڑھنا شروع کیا۔ سات صفحات کے بعد وہ تحت اللفظ پر آ گیا اور میز پر مکے مارنے لگا اور اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔ وہ سب فضول بکواس تھی تھانیدار صاحب! آپ بغیر ڈگری کے پریکٹس کرنے والے ڈاکٹر یا وکیل کو گرفتار کر سکتے ہیں مگر اسے شاعری سے نہیں روک سکتے جسے یہ بھی معلوم نہ ہو کہ ردیف کسے کہتے ہیں اور قافیہ کیا ہوتا ہے۔ جو بحر کو بحر الکاہل یا بحر مردار سمجھتا ہو اور مصرعے کا وزن سیر چھٹانک یا کلو گرام سے کرتا ہو۔ قانون میں ایسی کوئی دفعہ ہی نہیں۔

وہ دم لینے کے لیے رُکا ہی تھا کہ میں نے کہا۔ ”تیرہ سال بعد تو آدمی کتے کو بھی گھر سے نہیں نکال سکتا۔“

”واہ۔ کیا خیال ہے۔ بالکل وہی جو میں نے اپنی نظم ’آدمی اور کتا‘ میں بیان کیا ہے۔“ اس نے کتاب کو ایک اور جگہ سے کھول کے پڑھنا شروع کیا۔ میرا دماغ گھومنے لگا۔ اس کی بکواس کا جو تھا صفحہ جاری تھا کہ میرا حوصلہ جواب دے گیا۔

”میں اپنی ملازمت کی بات کر رہا تھا۔“ میں نے چیخ کر میز پر مکا مارا۔

”بات کرو اس وقت کی جب نہ کوئی آقا ہوگا نہ ملازم۔“ وہ بولا۔ ”جب انسانوں کے درمیان صرف محبت کا رشتہ ہوگا۔“

”آج انھوں نے مجھ سے جینے کا حق چھین لیا ہے۔“ میں نے چلا کر کہا۔ ”ایم ڈی نے اور اس کے سالے نے۔ میں کل کی کیا بات کروں۔“

”لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں۔“ وہ گا کے

بولا ”اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں۔ تم مجھے سو روپے دے دو تاکہ میرا یہ غیر مطبوعہ دیوان شائع ہو جائے۔ جو ہر مظلوم کے دل کی پکار ہے۔“

”سو روپے؟ سو روپے کہاں سے دوں تم کو جب کہ تم نے میری ایک بات بھی نہیں سنی۔“ میں نے چیخ کر کہا۔ ”اور کیوں دوں۔ کیا ملے گا مجھے تمہارے دیوان کی اشاعت سے؟“

”آہ۔ یہ سوال تو ہر شخص کرتا ہے۔ میں خود بھی کرتا ہوں اپنے آپ سے اور پبلشر بھی کرتا ہے مگر آنے والا وقت خود بتائے گا کہ نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا۔“ وہ اپنے بھاری بھرکم دیوان کو اٹھا کے بولا ”اس کی اشاعت سے انسان کی سوچ میں انقلاب آجائے گا۔ تہلکہ مچ جائے گا دنیا میں۔ نوبل پرائز جیسے سارے ایوارڈ اس شاہکار تخلیق کے لیے وقف کر دیے جائیں گے۔ یہ دنیا کی سب سے ضخیم... میرا مطلب ہے عظیم کتاب ہے۔ سنو میری نظم کل کا آدمی...!!“

میں نے وہ دس کلو کی کتاب اس سے چھین کر اس کے سر پر ماری کیونکہ میں آج کے مسائل سے دوچار تھا اور ان میں سب سے بڑا مسئلہ یہ بنتا جارہا تھا کہ اپنے دل کا حال کیسے سناؤں اور کیسے سناؤں۔ میرا دل اس غبارے کی طرح پھولتا جارہا تھا جس میں ضرورت سے زیادہ ہوا بھری گئی ہو اور میں محسوس کررہا تھا کہ دل کا غبار نہ نکلا تو میرا دل پھٹ جائے گا کلیجہ شق ہو جائے گا اور جگر پاش پاش ہو جائے گا اور یہ سب کچھ پوسٹ مارٹم میں بھی ضرور دیکھا جائے گا، لیکن اس وقت بھی کوئی یہ نہ دیکھے گا کہ میرے وجود میں یہ شکست وریخت کیسے ہوئی۔ کیا میں نے کوئی دستی بم نگل لیا تھا؟

نقش فریادی کو بیاض کے غیر مطبوعہ رہنے کا صدمہ تو تھا ہی اس کے سر پر پڑنے کا صدمہ شدید تر ثابت ہوا اور وہ وہیں یوں منجمد ہو گیا جیسے میں نے جادو کے زور سے اسے پتھر کا آدمی بنا دیا ہو۔ اس کی بیہوشی یا وفات کا راز افشا ہونے سے قبل ہی میں اٹھ کھڑا ہوا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا باہر نکل گیا۔ کسی نے مجھے نہیں روکا۔ انہوں نے دیکھا ہوگا کہ میرا ساتھی بدستور میز پر جائے رکھے بیٹھا ہے اور بل ادا کردے گا۔ بعد میں یقیناً نقش فریادی کی بیاض ضبط کرلی گئی ہوگی اور دس کلو ردی سے بل کی قیمت بھی نکل آئی ہوگی۔ لیکن اس نامعقول کل کے آدمی۔ آنے والے وقت کے نقیب اور عروس صبح فردا کے دولہا کا یہی علاج تھا اور میرا خیال ہے تھا نیدار صاحب! میں نے اس کی بیاض ضبط کرا کے بہت سے لوگوں کو اس کی خوفناک شاعری سے بچالیا۔

اس وقت تک لنچ کا وقت ہو گیا تھا۔ بے اختیار میرے قدم اپنے دفتر کی جانب بڑھنے لگے۔ وہاں میرے پرانے ساتھی ملیں گے۔ ان کو یقیناً مجھ سے ہمدردی ہوگی۔ اس ظلم کا احساس ہوگا اور یہ خیال ہوگا کہ کل کو یہی ان کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے وہ سب مل کر وفد کی صورت میں میرے ساتھ ایم ڈی کے پاس جائیں اور احتجاج کریں۔ چشم تصور سے میں نے ایک جلوس کو دیکھا جو ایم ڈی مُردہ باد۔ محنت کش اتحاد زندہ باد کے نعرے لگاتا ایم ڈی کے قصرِ عالیشان کی اینٹ سے اینٹ بجانے کے لیے بڑھ رہا ہے اور ان کے ہاتھ میں بڑے بڑے بینر ہیں ”مرزا پھویا کو بحال کرو۔“ ”ایم ڈی کا سالا نامنظور“ اور میں نے دفتر کو دیکھا تو سنسان پڑا تھا۔ صرف میری کرسی پر حقہ اکیلا رکھا رہ گیا تھا مگر وہ بھی ٹھنڈا۔

میرے سابقہ ساتھی آدھے گھنٹے کے لیے دفتر سے نکل کے ادھر اُدھر پھیل گئے تھے۔ کچھ ریڑھی پر مرغ چھولے اور نان حاصل کرنے کے لیے گھمسان کی جنگ لڑ رہے تھے۔ انھیں کہاں فرصت تھی کہ میری بات سنتے۔ میں نے ایک کیفے کا رُخ کیا جہاں ”شرفا“ کم خرچ پر لنچ تناول فرماتے تھے۔ ایک میز کے گرد چاروں کرسیوں پر چار ایسے افراد تھے جو کبھی میرے دوست نہ تھے اور میرا ڈسمس + گیٹ آؤٹ ہونا ان کی دلی مراد بر آنے کے مترادف تھا۔ مجھے دیکھ کر انھوں نے کچھ کہا، اور نہایت کمینگی سے ایک ساتھ قہقہہ مار کے ہنسے۔ میں نے ان کی طرف سے رُخ پھیر لیا۔ ایک اور میز پر بھی مجھے جگہ نہ ملی حالانکہ وہاں میرے ہمدرد بیٹھے تھے لیکن اچانک میں نے کونے والی میز پر اس شخص کو دیکھا جو میرے ساتھ بیٹھتا تھا اور دفتر میں میرا سب سے قریبی دوست تھا۔

”ارے مرزا پھویا؟“ وہ مجھے دیکھتے ہی بولا ”آؤ بیٹھو۔ کچھ کھاؤ گے؟“ اس نے مرغ کی واحد ٹانگ پر اپنے دانتوں سے یلغار جاری رکھی۔ مشہور تھا کہ کیفے کا مالک خریدتا ایک مرغ ہے تو بیچتا دو ہے اور وہ یوں کہ دوپہر کے وقت جب کلرک برادری کو پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے مشکل سے آدھا گھنٹہ ملتا تھا وہ مرغ کے چار اجزا کو گرم پانی میں ڈال کے بریانی میں شامل کر دیتا تھا اور لوگ مجبوراً چاول کھا کے پچیس فیصد مُرغ کو چھوڑنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ اسے چبانے اور کھانے کے لیے ایک گھنٹہ درکار ہوتا تھا اور عموماً اگلے دن وہ فاتح اعظم رخصت

اتفاقیہ لے کر گھر میں لوٹا یہ پیڈ کرتا تھا جو آدھے گھنٹے میں پوری قیمت وصول کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔ مالک کیفے ہذا شام کو یہی ٹھکرایا ہوا حسرت زدہ اور تقریباً سالم حالت میں موصول ہونے والا مرغ دوبارہ قورمے کی شکل میں پکا کے بیچتا تھا۔

"کھانا کیا ہے یار اب زہر کے سوا؟" میں نے آہ سرد بھر کے وہ ڈائیلاگ بولا کہ پتھر ہوتا تو پانی بن جاتا۔

"ارے زہر کھائیں تمہارے دشمن، اسے بیرا! ایک بریانی اور لاؤ۔" اس نے چٹکی بجا کے نعرہ لگایا۔

"مگر وہ ایم ڈی کا سالا تو اپنے جیجا جی کے ساتھ لنچ کر رہا ہوگا۔" میں نے طنز سے کہا۔

"کون ایم ڈی کا سالا؟" میرے دوست نے نظر اٹھائے بغیر کہا لیکن اس کے جبڑے مسلسل چلتے رہے۔

"تمہیں نہیں معلوم؟ مجھے نکال کر اسے رکھ لیا گیا ہے۔" میں نے بڑے دکھ سے کہا۔ "میرا تو خیال تھا کہ اب تک دفتر میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی ہو گی۔"

"آگ...؟" وہ پل بھر کے لیے نظر اٹھا کے بولا۔ "ہاں۔ بڑی خوفناک آگ تھی۔ میں نے اخبار میں پڑھی تھی خبر۔" چونکہ اس کا منہ بھرا ہوا تھا اس لیے وہ لقوہ زدہ شخص کی طرح بول رہا تھا مگر میں مفہوم سمجھ گیا۔

"میں آگ کی کسی شائع ہونے والی خبر کی بات نہیں کر رہا تھا۔" میں نے چلا کر کہا۔

"اچھا؟" وہ حیران ہو کے بولا۔ "ابھی تو تم نے جنگل کی آگ کا ذکر کیا تھا۔ خیر۔ بریانی کھاؤ۔"

میں نے بادلِ ناخواستہ بریانی کھانا شروع کی اور اس وقت مجھے یوں لگا جیسے یہ وہ بریانی نہیں جو میں عموماً بڑے شوق سے کھاتا تھا۔ مجھے یہ اپنے جہلم کی بریانی لگی کیونکہ میں بے حد اداس اور دل گرفتہ تھا۔ شاید اس پورے مجمع میں تنہا۔ جسے احساس تھا کہ آئندہ کبھی وہ یہاں بریانی کھانے نہیں آئے گا۔ لاحول ولاقوۃ۔ میں نے اپنے آپ سے کہا۔ میں قنوطی ہو رہا ہوں۔ بریانی سب کے لیے ہے اور میں ہر روز یہاں آنا چاہوں تو مجھے کون روک سکتا ہے۔ لیکن یہاں آ کے تماشا بننے سے کیا حاصل۔ دوست روز تو میزبانی کرنے سے رہے۔ دشمن روز مذاق اڑائیں گے کہ وہ رہے واجد علی شاہ کے پڑپوتے کی اولاد در مرزا پھویا۔ ایک گینڈے نے ٹکر مار کے انہیں دفتر سے باہر پھینک دیا کیونکہ وہ ایم ڈی کا سالا تھا۔ میں پھر اداس ہو گیا۔

"کھاؤ نا یار؟" میرے دوست نے جلدی جلدی لقمے نگل کے پانی پیتے ہوئے کہا۔ "اور یہ رونی شکل کیوں بنائی ہے؟"

"گویا اب تک تمہیں بھی نہیں معلوم۔" میں نے مظلوم اور مغموم لہجے میں کہا اور اسے بتانے لگا کہ میرے ساتھ کیا ظلم ہوا ہے۔ "بس اتنی سی بات پر کہ مجھے دیر ہو گئی تھی۔ اور اس کا بھی سبب تھا۔ اگر وہ خبیث کنڈیکٹر مجھے بس سے باہر نہ پھینکتا۔ مگر یہ تو کبھی نہ کبھی ہو ہی جاتا ہے۔ آدمی ہمیشہ تو ٹے پیسے لے کر تو نہیں نکلتا گھر سے۔"

"کون سی بس تھی؟" وہ ڈکار لے کر بولا۔ "نمبر بتاؤ۔ میرا ایک دوست رپورٹر ہے۔"

"مجھے بس کنڈیکٹر سے کوئی شکایت نہیں۔" میں نے جھنا کے کہا۔ پھر میں نے اسے دیر سے پہنچنے کا دوسرا سبب بتایا یعنی فرشتۂ رحمت کا نزول اور کیلے کے چھلکے کا سانحہ۔ وہ ہنستے ہنستے دہرا ہو گیا۔

"تم ہنس رہے ہو؟" میں نے برہمی سے کہا۔ "تمہیں ہمدردی ہو گی مجھ سے کہ مجھے برطرف کر دیا گیا ہے؟"

"برطرف کر دیا ہے تمہیں۔ کس نے؟" وہ یکلخت سنجیدہ ہو کے بولا اور رومال سے ہاتھ صاف کرنے لگا۔

"اس ایم ڈی نے اور اس کے سالے نے۔" میں نے چیخ کر کہا۔

"کون سالا؟" میرے دوست نے خلال کرتے ہوئے کہا اور پھر نعرہ لگایا۔ "ویٹر! دو چائے کڑک جلدی۔"

میرے دماغ کا فیوز اڑ گیا۔ ساری رات قصۂ یوسف زلیخا سنا اور یہ نہیں معلوم ہوا کہ زلیخا مرد تھی یا عورت۔ اتنی دیر سے میں ایسے ہی بھونک رہا تھا۔ "وہ سالا جو میری سیٹ پر بیٹھا تھا۔ تم نے نہیں دیکھا؟ تم سب کمینے ہو خود غرض ہو۔ سب ایم ڈی کے سالے ہو۔" میں نے لات مار کے میز الٹ دی۔

اس کے بعد خاصی ہڑبونگ مچی۔ میرا واحد ہمدرد اور دوست بل ادا کیے بغیر بھاگ گیا۔ منیجر نے کاؤنٹر پر سے چیخ کر ہیڈ ویٹر کو انسداد دہشت گردی کا حکم دیا — وہ ڈیل ڈول سے ایسی ہی صورتِ حال پر قابو پانے کا ماہر اور بلڈاگ لگتا تھا۔ اس نے تین ویٹروں کی ایک 'ٹاسک فورس' کی قیادت کی۔ دائیں جانب سے حملہ آور ہونے والا پہلوان قسم کا ملباری تھا۔ اپنے سر پہ پہلی پلیٹ ٹوٹنے سے پہلے ہی وہ لیٹ گیا۔ غالباً یہ سوچ کر کہ اس نے مقابلہ جاری رکھا تو ممکن ہے اگلی پلیٹ نہ ٹوٹے اس کا سر ٹوٹ جائے۔ بائیں جانب سے آنے والا اقوام متحدہ کی امن فوج کا نمائندہ تھا جو سیز فائر کی کوشش کرتا رہا چنانچہ دونوں طرف سے پٹا۔ تیسرا سامنے سے حملہ کرنے والا یقیناً پہلے اکھاڑے کا استاد ہو گا۔ میرا مطلب ہے اس وقت سے پہلے جب ایک

جاپانی پہلوان انوکی نے اس ملک کا عبرتناک دورہ نہیں کیا تھا اور کشتی کے فن کا مستقبل اتنا ہی تاریک نہیں کیا تھا جتنا میرا مستقبل تھا اور تاریک تو ہیڈ ویٹر کا کفگیر سر پر پڑنے کے بعد یہ دنیا بھی ہو گئی - یہ اسلحہ اسے باورچی نے فراہم کیا تھا -

جب بالآخر میں باہر نکلا - یا نکالا گیا تو اپنے کل اثاثہ یا جات سے بھی محروم ہو چکا تھا - اور نصف آنکھ سے بھی جو سوج کر تقریباً بند ہو رہی تھی - چار پلیٹیں دو کپ ، دو گلاس ، ایک کرسی اور ایک میز توڑنے کی پاداش میں میری جیب سے تمام رقم نکال لی گئی تھی یہاں تک کہ میری کلائی کی گھڑی بھی اتار لی گئی تھی - اندر سے ایک ویٹر مجھے ناقابلِ اشاعت خطابات دے رہا تھا کیونکہ میں نے گلاس مار کے اس کی اچھی خاصی آرین ناک کو منگول ناک میں تبدیل کر دیا تھا اور باہر بے کار بے تمیز لوگ میری حالت اور اس مزاحیہ سین پر ہنس رہے تھے جو سوائے جیری لوئیس کی فلموں کے کہیں دیکھنے میں نہیں آتا - بخدا تھانیدار صاحب! میرے ہاتھ میں ہوتی کوئی شمشیرِ آبدار تو قتلِ عام کر دیتا اور کشتوں کے پشتے لگ جاتے - لیکن مسئلہ یہی ہے کہ میں ذرا نرم دل واقع ہوا ہوں -

اس وقت میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اس بے رحم - خود غرض اور کمینی دنیا سے اپنے گوشۂ عافیت میں لوٹ جاؤں - جہاں صرف اللہ رکھی ہو گی - وہ اپنی دلجوئی سے میرے درد کا درماں بن جائے گی - اپنی حوصلہ افزا پیار بھری باتوں سے میرے شکستہ دل کو پھر سے جینے کی اُمنگ عطا کر دے گی اور اپنی تیمار داری سے میرے سراپا فتنہ بدن کو سکون فراہم کر دے گی - میں نے کئی رکشے روکنے کی کوشش کی اور ہر خالی ٹیکسی کے سامنے ہاتھ لہرایا مگر ان میں سے بیشتر رکے نہیں یا رکے تو مجھے کہیں اور لے جانے پر کمربستہ نظر آئے - جہاں وہ جا رہے تھے - ایک نے جاتے جاتے کہا "کیا زمانہ ہے - سالا فقیر لوگ بھی سواری مانگتا ہے" اور دوسرے نے کہا "تابا یا - یہ تھانے کا کیس ہے" اور میری بات سنے بغیر ہوا ہو گیا - میرا سارا المیہ یہی ہے . . . .

تھانیدار صاحب! میری بات کسی نے نہیں سنی - صرف بات سن لینے میں کسی کا کیا جاتا ہے - لیکن لوگوں کے دل تنگ ہو گئے ہیں اور زبانیں لمبی - مایوسی کے اس گھپ اندھیرے میں اللہ رکھی ہی روشنی کی واحد کرن تھی - میں جانتا تھا صرف وہی میرا حالِ دل زار سن سکتی ہے -

بالآخر ایک رکشا والے کو مجھ پر ترس آ گیا اور اس نے میٹر سے صرف پانچ روپے زیادہ پر مجھے تشریف رکھنے کو کہا - لیکن اس کے بعد رکشا والے نے تجسس سے مجبور ہو کے جو گفتگو کی وہ مزید اشتعال انگیز ثابت ہوئی - پہلے اس نے مجھ سے کہا "کیا جورو نے مار کے گھر سے نکال دیا ہے ؟" اور میں نے غرا کے "نہیں" کہنے پر اکتفا کی پھر اس نے پوچھا "کیا سود خور پٹھان کو وقت پر ادائیگی نہیں کی تھی ؟ خدا بچائے ان سے - آدمی کے ....."

"بکواس کرنے کے بجائے ذرا ڈرائیونگ کرو" میں نے ہوا میں مکا لہرا کے کہا "ورنہ سر کو ناریل کی طرح توڑ دوں گا - جو کچھ میرے ساتھ ہوا ہے"

"ارے صاحب! آپ خواہ مخواہ ناراض ہوتے ہیں ہم نے تو ہمدردی سے پوچھا تھا" وہ بولا -

"اچھا" میرا سارا غصہ سمندر کے جھاگ کی طرح ختم ہو گیا - "دراصل آج مجھے ....."

"ہمت ترے کی" رکشا والا اچانک بولا کیونکہ رکشا جھٹکے لینے لگا تھا "پھر آ گیا پلگ میں کاربن - ابھی صبح صاف کر کے لگایا تھا" اس نے رکشا ایک طرف روکا "یہی تو مصیبت ہے اس میں مگر صاحب! میں بھی ہر وقت دو فالتو پلگ رکھتا ہوں ساتھ - احتیاط اچھی چیز ہے" اس نے سیٹ کو اوپر اٹھایا -

میری قوتِ برداشت پہلے ہی جواب دے چکی تھی - اگر میں نرم دل نہ ہوتا تھانیدار صاحب! تو اسے وہیں قتل کر دیتا - لیکن میں چھلانگ لگا کے اترا اور بھاگ کھڑا ہوا - رکشا والا میرے پیچھے دوڑا لیکن میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا - جان ہتھیلی پر رکھے میں ٹریفک کے بیچ میں سے گزر گیا - نہ جانے کتنے ڈرائیوروں نے مجھے گالیاں دیں اور کتنی گاڑیاں اچانک بریک لگانے سے ٹکرائیں مگر میں پاگل ہو چکا تھا - میں چاہتا تھا کہ جو بوجھ میرے سینے پر ہے اسے اتار پھینکوں - کسی سے وہ سب کہہ دوں جو میں ہزار خرابی کے باوجود نہ کہہ پایا تھا - اب میرے لیے سانس لینا بھی دوبھر ہو رہا تھا -

اللہ رکھی پیڑے بیل رہی تھی کہ میں اندر داخل ہوا "اللہ رکھی! معلوم ہے آج کیا ہوا ؟"

"ارے معلوم نہیں تو ہو جائے گا" وہ بولی اور بدستور پیڑے بیلتی رہی "پہلے ماموں کی تو سن لو - وہ کب سے آئے بیٹھے ہیں . . . سخت ناراض ہیں کہ تم ہر جگہ ان کو ماموں کر لیا کرتے ہو"

بس جناب اس کے بعد میں یہ بھی بھول گیا کہ میں کتنا نرم دل ہوں - اللہ رکھی - میری اپنی بیوی "جس کا میں مجازی خدا تھا - وہ بھی میری سننے پر تیار نہ تھی" "ایسی کی تیسی تمہارے کرم جلے ماموں کی" میں نے کہا اور بیلن چھین کر اللہ رکھی کے سر پر دے مارا - تھانیدار صاحب! آپ سو گئے ہیں ؟ آپ نے بھی نہیں سنی میری بات "

# جنونی

ملک صفدر حیات (ریٹائرڈ ڈی ایس پی)

سچی کہانیوں کے سلسلے میں آپ ریٹائرڈ ڈی ایس پی ملک صفدر حیات کی پیشہ ورانہ زندگی کے ایسے واقعات پڑھتے ہیں جن میں نصیحت اور عبرت کا سامان ہوتا ہے۔ ملک صفدر حیات نے یہ واقعات اپنی ڈائری میں سیدھے سادے انداز میں تحریر کیے ہیں۔ چونکہ وہ تحریر اور ادب کے تقاضوں سے واقف نہیں ہیں چنانچہ ان واقعات کو کہانی کے انداز میں تحریر کرنے کا کام عبدالقیوم شاد انجام دیتے ہیں۔ اس ماہ عبدالقیوم شاد نے ملک صاحب کی ڈائری سے ایک عبرت انگیز واقعہ نقل کیا ہے۔

**ان** صفحات میں میری یادداشتیں پڑھنے کے بعد ایک رسالے کے نمائندے میرا انٹرویو لینے پہنچ گئے۔ رسمی گفتگو کے بعد بولے۔ "آپ اندر کے آدمی ہیں۔ ایک بات بتائیں۔ پولیس کے محکمے سے رشوت کیسے ختم ہو سکتی ہے؟"

میں نے ہنس کر کہا۔ "بہت آسان طریقہ ہے۔ آپ رشوت دینا بند کر دیں۔ حکومت کے ہر محکمے سے رشوت ختم ہو جائے گی۔"

کہنے لگے۔ "مجھے معلوم تھا کہ آپ ٹال جائیں گے۔"

میں نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی، مگر وہ میری بات ماننے پر تیار نہیں ہوئے۔

دراصل یہ مسئلہ دو طرفہ ہے۔ صرف پولیس کے محکمے کی

طرف منہ کر کے شور مچانے سے کچھ حاصل نہیں ہوسکتا۔ رشوت دو وجوہ کی بنا پر دی جاتی ہے۔ تکلیف سے بچنے کے لیے یا کوئی سہولت حاصل کرنے کے لیے۔ میں نے دیکھا ہے کہ اچھے سمجھدار اور نیک پرہیزگار لوگ بھی رشوت دینے سے نہیں چوکتے۔ کوئی لائسنس بنوانے گئے اور رشوت دے کر جلدی بنوالیا۔ ٹریفک کی بے قاعدگی میں چالان ہوگیا، رشوت دے کر عدالت جانے سے بچ گئے۔ کسٹم یا انکم ٹیکس میں گھپلا کیا اور رشوت دے کر بات دبا دی۔ ایسی بے شمار چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں جن کا ذکر کیا جائے تو بات لمبی ہو جائے گی۔ آپ غور کریں کہ سرکاری اہلکاروں کو رشوت پیش کرنے والوں میں مجرموں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے زیادہ تر عام شہری ہوتے ہیں اور یہ لوگ جب اپنے دوستوں میں بیٹھتے ہیں تو بڑے فخر سے بتاتے ہیں کہ کس طرح انھوں نے رشوت دے کر چٹکیوں میں کام کرالیا۔ اس لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ تھوڑی تکلیف برداشت کرلیں، کام میں تاخیر گوارہ کرلیں لیکن رشوت نہ دیں۔ رشوت پر توکل نہ کریں۔ اللہ پر توکل کریں۔

پولیس والوں کے متعلق ایک یہ عام خیال پایا جاتا ہے کہ یہ لوگ بہت سنگدل ہوتے ہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔ لیکن ایک بات ضرور کہوں گا کہ نرم دل آدمی پولیس کے محکمے میں نہیں چل سکتا۔ بعض اوقات پولیس والوں کو ایسے لوگوں کو بھی گرفتار کرنا پڑتا ہے جنھیں گرفتار کرتے ہوئے انھیں افسوس ہوتا ہے لیکن فرض کے سامنے جذبات کو دبانا پڑتا ہے۔

آج میں آپ کو ایک ایسا ہی واقعہ سنانا چاہتا ہوں جس میں مجھے مجرم کو گرفتار کرتے ہوئے واقعی دکھ ہوا تھا۔

وہ سردیوں کے دن تھے۔ رات کے تقریباً دس بجے مجھے ایک قتل کی اطلاع ملی۔ میں ایک اے ایس آئی اور چند سپاہیوں کو ساتھ لے کر موقع پر پہنچ گیا۔ قتل محکمۂ انہار کے ایک ایس ڈی او کے گھر میں ہوا تھا۔ ہم اس کا نام مشتاق حسین فرض کرلیتے ہیں۔ وہ ایک خوش گفتار اور صحت مند آدمی تھا، عمر پینتیس چالیس سال کے لگ بھگ تھی اور قد تقریباً پانچ فٹ سات انچ تھا۔ اس کے قد کو ذہن میں رکھیں۔ آگے پھر اس کا ذکر آئے گا۔

مشتاق حسین کے دو بچے تھے۔ ایک لڑکی تھی اور ایک لڑکا۔ دونوں دس سال سے کم عمر کے تھے۔ لڑکی غالباً بڑی تھی اس کی عمر آٹھ یا نو سال کے قریب ہوگی۔ یہ تیس بتیس سال پرانا واقعہ ہے۔ اس حساب سے اس کی لڑکی کی عمر اب چالیس سال کے لگ بھگ ہو چکی ہوگی۔ دونوں بچے بہت پیارے اور تمیزدار تھے۔ مشتاق حسین کی بیوی حمیدہ بانو اس سے چار پانچ سال چھوٹی لگتی تھی۔ اس کے نقوش تیکھے تھے اور وہ ایک خوب صورت اور ہوشیار خاتون نظر آتی تھی۔ اس کا قد اپنے شوہر کے برابر ہی تھا ممکن ہے ایک آدھ انچ کم ہو۔

لاش بیٹھک میں پڑی تھی۔ وہ ایک مرد کی لاش تھی۔ اس نے کورے لٹھے کی شلوار اور میلی سی قمیص پہن رکھی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس کی عمر پینتیس چھتیس برس کے قریب تھی، شیو بڑھا ہوا۔ بال گرد آلود اور الجھے ہوئے اور مونچھیں چھوٹی چھوٹی تھیں۔ اس کا قد چھ فٹ سے کچھ نکلتا ہوا اور جسم دبلا تھا۔ اس کی موت سر پر لگنے والی چوٹ سے واقع ہوئی تھی۔ اس کی کھوپڑی چٹخی ہوئی تھی اور خون اس صوفے میں جذب ہوگیا تھا جس پر وہ بے ڈھنگے انداز میں پڑا تھا۔ اس کا دایاں بازو اور دائیں ٹانگ نیچے لٹک رہی تھی اور دھڑ صوفے پر تھا۔ قریب ہی چارپائی کی وہ پٹی پڑی تھی جس سے اس کے سر پر چوٹ لگائی گئی تھی۔

مشتاق حسین نے بتایا کہ وہ شخص چوری کی نیت سے گھر میں داخل ہوا تھا اور قیمتی سامان کی تلاش میں تھا۔ کھٹکے کی آواز سن کر حمیدہ بانو کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے اپنے شوہر کو جگایا اور شوہر نے بیٹھک میں جانے سے پہلے بیوی کے کہنے پر احتیاطاً چارپائی کی پٹی ہاتھ میں لے لی اور دبے قدموں بیٹھک میں پہنچ گیا۔ چور نے اس پر حملہ کرنے کی کوشش کی اور اس نے اپنے دفاع میں چور پر پٹی سے وار کردیا۔

مکان میں کل پانچ کمرے تھے۔ اردگرد چار دیواری بنی ہوئی تھی۔ سامنے برآمدہ تھا اور بیٹھک داہنی طرف تھی۔ بیٹھک کا ایک دروازہ برآمدے میں کھلتا تھا اور دوسرا اندرونی کمرے میں۔ اس کا سائز تقریباً پندرہ ضرب بارہ فٹ تھا۔ فرش پر دری بچھی ہوئی تھی اور سامنے والی دیوار کے ساتھ ایک شوکیس رکھا تھا جس میں چینی کے برتن اور بچوں کے کھلونے سجے ہوئے تھے۔ مکان نیا تھا۔ دیواروں پر پلستر کیا ہوا تھا لیکن ابھی سفیدی نہیں ہوئی تھی۔ شوکیس کے عین اوپر ایک دیواری کلاک لگا ہوا تھا۔

جب میں موقع پر پہنچا تو مشتاق حسین اور اس کی بیوی ساتھ والے کمرے میں میرا انتظار کر رہے تھے۔ اگرچہ کمرے میں انگیٹھی جل رہی تھی لیکن حمیدہ بانو نمایاں طور پر کانپ رہی تھی۔ مشتاق حسین بھی گھبرایا ہوا تھا لیکن بدحواس نہیں تھا۔ رپورٹ تیار کرنے سے پہلے میں نے آس پاس رہنے والے چند معتبر افراد کو گواہی کے لیے بلالیا۔

ضابطے کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد میں نے مشتاق حسین سے پوچھا۔ ”تم لوگ عام طور پر کتنے بجے سو جاتے ہو؟“

”زیادہ سے زیادہ نو بجے تک۔“ اس نے جواب دیا۔

”سونے سے پہلے کمروں کے دروازے کون بند کرتا ہے؟“

"کبھی میں کر دیتا ہوں اور کبھی میری بیوی۔"

"تمھارے خیال میں چور کس طرح اندر داخل ہوا تھا؟"

"جی یہ تو مجھے پتا نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی دروازہ کھلا رہ گیا ہو۔"

جب ہم باتیں کر رہے تھے تو مشتاق حسین کے دونوں بچے دروازے میں آکر کھڑے ہو گئے۔ وہ بہت سہمے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ "امی! ہمیں ڈر لگ رہا ہے۔" اُن کے حلیے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ نیند سے بیدار ہوئے تھے۔ حمیدہ بانو اٹھی اور انھیں لے کر اندر چلی گئی۔

"ذرا سوچ کر بتاؤ کہ جب تم بیدار ہونے کے بعد بیٹھک میں گئے تو کیا صورتِ حال پیش آئی تھی۔ چور اندر کیا کر رہا تھا۔ تم نے اسے للکارا تھا یا خاموشی سے اسے جا لیا تھا؟"

"میں نے اسے للکارا نہیں تھا۔" مشتاق حسین نے جواب دیا۔ "میں دبے پاؤں اندر داخل ہوا لیکن چور نے شاید میرے قدموں کی آواز سُن لی۔ اس نے مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اندھیرے میں اس پر وار کر دیا۔ میں اسے قتل نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن جب میں نے بتی جلائی تو وہ مر چکا تھا۔"

مشتاق حسین کے بیان کا یہ حصہ مجھے مشکوک معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کوئی چور گھر والوں سے الجھنا پسند نہیں کرتا۔ اگر اسے پتا چل جائے کہ گھر والے جاگ گئے ہیں تو وہ فوراً بھاگنے کی کوشش کرتا ہے خصوصاً جب وہ اکیلا اور غیر مسلح ہو۔ چور کا طریقہ کار بلی کی طرح ہوتا ہے جس طرح رات کو بلی باورچی خانے میں گھس جائے تو ایک آہٹ کی آواز سن کر بھاگ جاتی ہے اسی طرح چور بھی بھاگ جاتا ہے۔ بلی ہی کی طرح چور بھی اس وقت حملہ کرتا ہے جب وہ گھر جاتا ہے اور اسے فرار کی کوئی راہ نظر نہیں آتی۔ میں یہ بات ماننے پر تیار نہیں تھا کہ مقتول نے مشتاق حسین پر حملہ کیا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ شاید وہ اس بات سے خائف تھا کہ اس پر قتل کا مقدمہ نہ بن جائے۔ عادی چوروں کے بارے میں ایک بات اور یاد رکھنا چاہیے کہ یہ لوگ کبھی رات کے پہلے حصے میں واردات نہیں کرتے۔ یہ عموماً صبح کے دو بجے سے چار بجے کے درمیان کارروائی کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسا وقت ہے جب ہر بندہ بستر گہری نیند سو رہا ہوتا ہے۔

"کیا تم اس شخص کو جانتے ہو؟" میں نے مشتاق حسین سے پوچھا۔

"میں؟" وہ چونک کر بولا۔ "نہیں، میں اسے نہیں جانتا تھا۔"

میں نے سوچا ممکن ہے وہ اس کے پاس کام کر چکا ہو یا اس کے کسی ملازم کا جاننے والا ہو۔

"تم نے اسے کبھی دیکھا بھی نہیں؟"

"نہیں، کبھی نہیں دیکھا۔" اس نے زور دے کر کہا۔

میں نے ایک اور پہلو پر قیاس آرائی کرتے ہوئے کہا۔ "تم محکمۂ انہار میں سب ڈویژنل آفیسر ہو۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے کبھی تمھاری ماتحتی میں کام کیا ہو۔ کوئی مزدوری وغیرہ کی ہو اور کسی بات پر تم سے ناراض ہو۔ تم نے اس کی مزدوری روک لی ہو یا ڈانٹ ڈپٹ کی ہو اور آج یہ انتقام لینے تمھارے گھر میں داخل ہوا ہو۔"

"ہم لوگ ٹھیکیداروں کے ذریعے کام کرواتے ہیں۔ اس لیے ڈانٹ ڈپٹ یا مزدوری روکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جو لوگ ہمارے محکمے کے باقاعدہ ملازم ہیں ان سب کو میں بڑی اچھی طرح سے جانتا ہوں۔"

اتنے میں اے ایس آئی میر باش کمرے میں آیا اور سیلوٹ مارنے کے بعد بولا۔ "جناب! مقتول کی جیب سے یہ سامان برآمد ہوا ہے۔" اس نے میلے کچیلے رومال میں کچھ نقدی وغیرہ میرے سامنے کی۔

"اس کو ابھی وہیں پر رکھو۔" میں نے کہا۔

"جناب! اس کو ذرا ملاحظہ کر لیں۔" اس نے اصرار کیا۔

"دیکھتے نہیں میں پوچھ گچھ کر رہا ہوں۔" میں نے غصے سے کہا۔ "اس کوڑے کو لے جاؤ میرے سامنے سے۔"

لیکن میر باش اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہیں ہلا۔ بولا۔ "جناب! اس میں دو دس روپے والے نوٹ، ایک پانچ روپے والا نوٹ، تین دو روپے والے نوٹ (اس زمانے میں دو روپے والے نوٹ بھی چلتے تھے) ایک اٹھنی، ایک دونی، ایک رومال، ایک پاسنگ شو کا پیکٹ، ایک ماچس، دو چابیاں اور ایک کسی مشتاق حسین نامی شخص کا پتا....!"

یہ سنتے ہی مشتاق حسین کا رنگ سفید پڑ گیا۔ "میرا پتا؟"

وہ پتا قینچی سگریٹ کے پیکٹ کی پشت پر لکھا ہوا تھا اور مشتاق حسین کا پتا ہی تھا۔ میں نے پوچھا۔ "کیا تم بتا سکتے ہو کہ اس شخص کی جیب میں تمھارا پتا کیسے آیا؟"

"میں کیا بتا سکتا ہوں جی، کوئی بھی شخص میرا پتا اپنی جیب میں ڈال سکتا ہے۔" پھر وہ سوچتے ہوئے بولا۔ "ہو سکتا ہے کہ یہ شخص ملازمت کے سلسلے میں مجھ سے ملنا چاہتا ہو۔"

"رات کے دس بجے؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

اس چیز نے میرے دل میں مزید شکوک پیدا کر دیے۔ میں نے ایک بار پھر مقتول کا معائنہ کیا۔ چوٹ کی نوعیت کا باریکی سے جائزہ لینے پر ایک عجیب بات سامنے آئی۔ ضرب داہنی طرف سے لگائی گئی تھی۔ اس کا نشان داہنی کن پٹی سے ہوتا ہوا سر کے وسط

ٹک گیا تھا۔ اس میں عجیب بات یہ تھی کہ ایک شخص جس کا قد پانچ فٹ سات انچ ہو کسی ایسے شخص کے سر کے وسط میں چوٹ نہیں لگا سکتا جس کا قد اس سے چھ انچ بڑا ہو۔ صوفے پر مقتول کی حالت یہ ظاہر کرتی تھی کہ اس پر اس وقت چوٹ لگائی گئی تھی جب وہ بیٹھا ہوا تھا۔ چوٹ کی نوعیت بھی اس مفروضے کی تصدیق کرتی تھی کہ کسی نے داہنی طرف سے اچانک اندر آ کر اس پر ضرب لگائی تھی۔ صوفے کے داہنی طرف ایک دروازہ تھا جو اندر کی طرف کھلتا تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ مقتول وہاں بیٹھا کیا کر رہا تھا؟

میں نے مشتاق حسین سے کہا کہ میں اس کی بیوی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ وہ اندر گیا اور فوراً ہی گھبرایا ہوا واپس آ گیا۔ اس کی بیوی بے ہوش ہو گئی تھی۔ اندر سے دلاں بچوں کے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے مشتاق حسین سے کہا کہ وہ اندر جا کر بچوں کو تسلی دے اور میں لاش کو ڈاکٹر کے پاس بھیج دیا۔

مشتاق حسین کی پوزیشن خاصی مشکوک تھی اور اس کی گرفتاری کا جواز موجود تھا لیکن میں نے اس کی بیوی اور بچوں کی حالت کے پیشِ نظر اسے گرفتار نہیں کیا۔ تاہم میں نے اسے تاکید کر دی کہ وہ شہر چھوڑ کر نہ جائے۔

سب سے پہلا مرحلہ مقتول کی شناخت کا تھا۔ میں نے اس کی چند تصویریں بنوالیں اور اپنے آدمیوں سے کہا کہ اس کے بارے میں پتا کریں۔ لیکن دو روز تک کوئی بھی لاش لینے نہیں آیا۔ لہٰذا لاش کو تجہیز و تکفین کے لیے ایک مذہبی ادارے کے سپرد کر دیا۔ تیسرے روز میں مشتاق حسین کی بیوی کا بیان لینے گیا تو پتا چلا کہ وہ بچوں کو ساتھ لے کر میکے چلی گئی ہے۔ اس کا میکہ لاہور میں تھا جو وہاں سے تقریباً تو سے میل کے فاصلے پر تھا۔

میں نے اور میرے آدمیوں نے سیکڑوں افراد کو مقتول کی تصویر دکھائی لیکن کوئی بھی اسے پہچان نہ سکا۔ جس سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ شخص کوئی اجنبی تھا اور کسی اور علاقے سے آیا تھا۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد ہم نے ہوٹلوں، سگریٹ کی دکانوں اور ٹی اسٹالوں سے معلوم کرنا شروع کیا۔

ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک کھوکھے والے نے اس کی تصویر پہچان لی اس کے کھوکھے پر چائے اور بیکری کے علاوہ سگریٹ بھی مل جاتے تھے۔ اس نے بتایا کہ مقتول اس کے کھوکھے سے سگریٹ خریدتا تھا اور کبھی کبھار چائے بھی پیتا تھا۔ میرے سوالوں کے جواب دیتے ہوئے اس نے کہا کہ مقتول نے تقریباً دو ہفتے سے اس کے کھوکھے پر آنا جانا شروع کیا تھا۔ وہ اس کا نام اور ٹھکانہ نہیں جانتا تھا۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی پردیسی تھا اور کسی ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کس مقصد کے لیے وہاں آیا تھا۔

چند روز کے اندر ہم نے اس چھوٹے سے شہر کے تمام ہوٹلوں کو کھنگال ڈالا لیکن اس پردیسی مقتول کا کچھ پتا نہیں مل سکا۔ ایک بات میں بتانا بھول گیا کہ مشتاق حسین نے اگلے روز ضمانت قبل از گرفتاری منظور کروالی تھی۔ اس لیے ہم اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکے۔ اگر مقتول واقعی چوری کی نیت سے اس کے گھر میں داخل ہوا تھا تو اس کے خلاف کوئی کیس نہیں بن سکتا تھا لیکن اس کے بیان اور ضرب کی نوعیت نے مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا۔ تاہم یہ بات مشتاق حسین کو ملزم قرار دینے کے لیے کافی نہیں تھی۔

تقریباً تین ہفتے بعد میں ریلوے اسٹیشن والی سڑک پر سے گزر رہا تھا تو مجھے ایک دیوار کے ساتھ چند چارپائیاں کھڑی دکھائی دیں۔ وہ ایک سرائے نما ہوٹل تھا۔ وہاں روپے آٹھ آنے میں سونے کے لیے چارپائی مل جاتی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ شاید مقتول اس سرائے میں ٹھہرا ہو۔ یہ سوچ کر میں ہوٹل کے اندر چلا گیا۔ ہوٹل کیا تھا ایک نیم پختہ بیرک سی تھی جس کے اوپر سرکنڈے کی چھت پڑی ہوئی تھی۔ ہوٹل کا مالک ایک قوی الجثہ اور سرخ و سفید چہرے والا کابلی تھا۔ اس کا نام ثواب گل یا صواب گل تھا۔ عمر تقریباً پچاس برس کے لگ بھگ ہو گی۔ چہرے پر چھوٹی سی داڑھی بھی تھی۔

"بسم اللہ، بسم اللہ!" صواب گل نے مجھے دیکھتے ہی کہا اور اٹھ کر سلام کرنے کے لیے آگے بڑھا۔ اس نے جلدی سے ایک چارپائی پر ڈھلی ہوئی چادر میرے بیٹھنے کے لیے بچھا دی۔ "کیا پئیں گے جناب! کوئی ٹھنڈا منگوایا چائے مارے گا؟"

"کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں ادھر سے گزر رہا تھا۔ سوچا ایک بات پوچھتا چلوں۔"

"سو باتیں پوچھو جی، ہم نوکر کس کا ہے۔ جا او الکا! ملک صاحب کے لیے گرم گرم چائے کر آؤ۔ اسپیشل والا۔ برتن مرتن اچھی طرح صاف کر لینا۔"

میں نے جیب سے تصویر نکال کر صواب گل کو دکھائی اور کہا۔ "میں نے سنا ہے کہ یہ آدمی تمہارے ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا؟"

تصویر دیکھ کر اس کے چہرے پر ہلکا سا تردد نمودار ہوا جو فوراً ہی غائب ہو گیا۔ بولا۔ "اس کو کیا ہو گیا ہے کیا یہ بیمار ہے؟"

"یہ مر چکا ہے۔" میں نے کہا۔ "کسی نے اسے قتل کر دیا ہے۔"

صواب گل نے دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔ شاید مرنے والے کے لیے دعائے مغفرت کر رہا تھا۔

"کیا تم اسے پہچانتے ہو؟"

"ہم نے اس کو کبھی نہیں دیکھا۔ امارا ہوٹل مسافر خانہ ہے

روزانہ دس آدمی آتا ہے، بیس جاتا ہے۔ بیس آتا ہے، دس جاتا ہے۔ ہمارے کو کسی کا شکل یاد نہیں رہتا۔"

"تمہارے مسافر خانے میں رہائش کا کیا حساب ہے؟"

"خدا تمہارا بھلا کرے، ہم نے مسافروں کے آرام کے لیے چارپائی، ماربائی ڈال دیا ہے۔ گرمی کے موسم میں ہم ایک رات کا آٹھ آنہ لیتا ہے۔ سردی کے موسم میں سوا روپیہ لیتا ہے کیونکہ سردی کے موسم میں چارپائی کے ساتھ لحاف بھی دیتا ہے۔ ہمارے کو کچھ فائدہ نہیں ہے۔ سب غریب مسافروں کے آرام کے لیے ہے۔"

صواب گل سے کوئی کام کی بات معلوم نہیں ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد میں اٹھ کر باہر نکل گیا۔ کچھ دور جانے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ ایک لڑکا میرے پیچھے آرہا ہے۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو یوں لگا کہ جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہو لیکن مجھے اپنی طرف متوجہ پاکر وہ کچھ گھبرا گیا اور واپس مڑنے لگا۔ میں نے اسے آواز دے کر روک لیا۔ اس لڑکے کو میں نے صواب گل کے ہوٹل میں دیکھا تھا۔

میرے پوچھنے پر اس نے پہلے تو کچھ تامل کیا۔ پھر بولا۔ "میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ فرید احمد صواب گل کے ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔"

"کون فرید احمد؟" میں نے پوچھا۔

"جس کی آپ نے تصویر دکھائی تھی۔"

میں لڑکے کو ایک طرف لے گیا اور دوبارہ تصویر نکال کر دکھائی۔

"ہاں جی، یہ اسی آدمی کی تصویر ہے اس کا بکسا (صندوق) ابھی تک ہوٹل میں ہی پڑا ہے۔"

"تم کیا کام کرتے ہو؟"

"میں ہوٹل میں ملازم ہوں جی، جناب! میرا نام نہ آئے ورنہ صواب گل مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔" میں نے اسے تسلی دی اور تھانے پہنچ کر میر باش سے کہا۔ "ریلوے اسٹیشن کے قریب صواب گل نامی شخص کا ایک ہوٹل ہے۔ دو سپاہی ساتھ لے جاؤ اور صواب گل کو پکڑ کر تھانے لے آؤ۔"

"بہت بہتر جناب! اور کوئی حکم؟"

"جو شخص مشتاق حسین کے گھر میں ہلاک ہوا تھا اس کا نام فرید احمد ہے اور وہ صواب گل کے ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ غالباً اس کا صندوق بھی وہاں پر ہوگا وہ بھی اٹھوا کر لے آنا۔"

میر باش دو سپاہیوں کو ساتھ لے کر رخصت ہو گیا۔ میں سوچنے لگا کہ صواب گل نے فرید احمد کے بارے میں جھوٹ کیوں بولا تھا۔ شاید وہ قتل کے کیس میں کسی قسم کی گواہی دینے سے گھبرا گیا تھا یا اس کے سامان پر قبضہ کرنا چاہتا تھا؟

تقریباً ایک گھنٹے بعد میر باش واپس آ گیا۔ صواب گل آتے ہی منت سماجت کرنے لگا لیکن میں نے اسے ڈانٹ کر چپ کرا دیا اور حوالات میں بند کر دیا۔ مقتول فرید احمد کی جیب سے جو دو چابیاں برآمد ہوئی تھیں ان میں سے ایک چابی سے صندوق کا تالا کھل گیا۔ اندر کچھ کپڑے، چند کاغذات اور دو تین رسالے رکھے ہوئے تھے۔ کاغذات میں کچھ اسناد بھی تھیں۔ ایک میٹرک کی سند تھی۔ اس کے مطابق فرید احمد ولد مصطفیٰ احمد نے ۱۹۳۰ء میں پنجاب یونیورسٹی سے فرسٹ ڈویژن میں میٹرک پاس کیا تھا۔ ایک سند ایف ایس سی کی تھی۔ کچھ کاغذات قانونی اور عدالتی قسم کے تھے۔ ان کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ عقدہ کھلا کہ فرید احمد قتل اور ڈکیتی کے ایک کیس میں ملوث تھا۔ کاغذات کے مطابق وہ ۱۹۳۳ء کی بات تھی۔

دفعتاً کاغذات میں سے ایک ایسی چیز برآمد ہوئی جسے دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ وہ ایک تصویر تھی۔ ایک لڑکی کی تصویر۔ اس کی پشت پر لکھا تھا۔ "فرید کے لیے، جو میری زندگی اور میری روح ہے۔" اور وہ تصویر حمیدہ بانو کی تھی۔

اس کے بعد باقی باتوں کا قیاس کرنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ فرید اور حمیدہ بانو کسی زمانے میں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ فرید احمد کو قتل کے مقدمے میں سزا ہو گئی اور حمیدہ بانو نے کسی افسانوی ہیروئن کی طرح اس کا انتظار کرنے کے بجائے شادی کر لی۔ فرید احمد جیل سے رہا ہونے کے بعد اپنی محبوبہ سے ملنے آیا اور محبوبہ کے شوہر نے جوشِ رقابت میں اسے قتل کر دیا۔ تاہم اس قیاس کی تصدیق ضروری تھی۔

سب سے پہلے تو میں نے صواب گل کو الگ کمرے میں بلایا اور کہا۔ "صواب گل! ہمیں سب کچھ معلوم ہو گیا ہے۔ اب بولو تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟"

"ملک صاحب! ہم شریف آدمی ہے۔ پانچ وقت کا نماز پڑھتا ہے۔ ہم بالکل جھوٹ نہیں بولے گا۔ ہم کو شیطان نے بہکا دیا تھا۔ یہ دولت بہت خراب چیز ہے۔ پاک پروردگار کا قسم ہم دو گھنٹے سے حوالات میں توبہ استغفار کر رہا تھا۔ اپنا آدمی ہمارے ساتھ بھیجو ہم فرید خان کا امانت اس کے حوالے کر دے گا۔"

امانت اور دولت کا ذکر سن کر میں سمجھ گیا کہ فرید احمد نے اس کے پاس کچھ نقدی امانت رکھوائی ہوگی۔ اس بات سے اس کے جھوٹ کا مسئلہ بھی حل ہو گیا تھا۔ فرید کی موت کا ذکر سن کر اس نے سوچا ہوگا کہ اس کی امانت پر قبضہ کر لینا چاہیے۔ جب محاسبے کا ڈر نہ ہو تو کبھی کبھی اچھے خاصے شریف آدمی کی نیت بھی خراب ہو جاتی ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اس قادرِ مطلق کے محاسبے سے ڈرتے ہیں جس کے احاطۂ اختیار سے کوئی

چیز باہر نہیں۔ بہرحال چونکہ صواب گل نے کوئی جرم نہیں کیا تھا، اس لیے میں نے اسے چھوڑ دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک پوٹلی دے گیا جس میں ڈھائی ہزار کے لگ بھگ رقم تھی۔ یہ رقم میں نے فرید کے صندوق میں رکھ کر اسے تالا لگا دیا۔

اگلے روز میں نے مشتاق حسین کی ضمانت منسوخ کرواکے عدالت سے اس کے وارنٹ گرفتاری حاصل کر لیے۔ لیکن جب میں اپنے آدمیوں کے ساتھ اسے گرفتار کرنے اس کے گھر پہنچا تو وہ موجود نہیں تھا۔ گھر میں ایک باریش معمر شخص تھا۔ اس نے ہمارے پوچھنے پر بتایا کہ مشتاق حسین اپنے بیوی بچوں کو لینے لاہور گیا ہوا ہے۔ میں نے اس کے دفتر سے معلوم کروایا تو پتا چلا کہ اس کا تبادلہ ہو گیا ہے لیکن کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ کہاں تبادلہ ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ فرار ہو گیا تھا۔

میں نے اس کے دوستوں اور جاننے والوں سے اس کی سسرال کا پتا معلوم کر کے ڈائری میں نوٹ کر لیا۔ اس دوران میں میں نے ایک بار پھر فرید احمد کے کاغذات کا مطالعہ کیا۔ اس میں سے مجھے لاہور کے دو پتے ملے۔ ایک بادامی باغ کے علاقے کا تھا اور دوسرا نسبت روڈ کا تھا۔ میں نے یہ دونوں پتے بھی نوٹ کر لیے اور دوسرے روز دو سپاہیوں کو ہمراہ لے کر لاہور پہنچ گیا۔

مشتاق حسین کی سسرال کا جو پتا میں نے حاصل کیا تھا وہ رتن چند روڈ کا تھا۔ نسبت روڈ اور رتن چند روڈ بالکل قریب قریب ہیں۔ لاہور کے رہنے والے یقیناً جانتے ہوں گے کہ یہ دونوں سڑکیں میو اسپتال کے گیٹ کے قریب سے شروع ہوتی ہیں۔

پہلے میں نے مشتاق حسین کی سسرال کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک ادھیڑ عمر کی عورت نے دروازہ کھولا اور مجھے دیکھ کر جلدی سے اوٹ میں ہو گئی۔ میں نے مشتاق حسین کے بارے میں پوچھا۔ اس نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے پوچھا۔ ”آپ کون ہیں؟“

میں نے جواب دیا کہ میں ان کا دوست ہوں۔ اس پر اس نے کہا کہ وہ دفتر گئے ہوئے ہیں۔ شام کو واپس آئیں گے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ کوئی دوسری عورت بھی دروازے کی اوٹ میں موجود تھی۔ دونوں آپس میں کچھ کھسر پھسر کرنے لگیں۔ میں نے دفتر کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا کہ اسے دفتر کا علم نہیں۔ میں جانے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ ایک بچہ دروازے میں نمودار ہوا۔ میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ وہ مشتاق حسین کا بیٹا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس نے مجھے نہیں پہچانا۔ کیونکہ اس وقت میں سادہ لباس میں تھا۔ میں نے ایک سپاہی کو مکان کی نگرانی کے لیے گلی میں متعین کر دیا اور خود رتن چند روڈ پر فرید احمد کے پتے پر پہنچ گیا۔ ایک تیرہ چودہ سالہ لڑکی نے دروازہ کھولا۔ میں نے پوچھا۔ ”بیٹی! یہاں کوئی فرید احمد رہتے تھے؟“

”جی، وہ کہیں گئے ہوئے ہیں۔“ پھر وہ مجھے ٹھہرنے کا کہہ کر اندر چلی گئی۔ اندر سے کسی مرد کی آواز سنائی دی۔ لڑکی نے مرد سے کہا۔ ”ابو! کوئی صاحب ماموں کا پوچھ رہے ہیں۔“

گویا اس گھر میں فرید احمد کی بہن رہتی تھی۔

لمحہ بھر کے بعد ایک بھاری بھرکم شخص دروازے پر آیا اور بغیر کسی تمہید کے بولا۔ ”فرید احمد کا اس گھر سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی وہ یہاں رہتا ہے۔“

اس کے بولنے کے انداز سے مجھے کچھ اندازہ ہو گیا کہ وہ کس محکمے میں ملازم ہے۔ لیکن میں نے فوراً ہی اس کا اظہار نہیں کیا اور پوچھا۔ ”کیا تم فرید احمد کے بہنوئی ہو؟“

”او میاں! تم میری بات نہیں سمجھے۔ کہہ تو دیا کہ ہمارا فرید احمد سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

مجھے ہنسی آ گئی۔ کیونکہ میں اپنی ہی برادری کے ایک شخص سے بات کر رہا تھا۔ میں نے نرمی سے کہا۔ ”اچھا، تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے فرید احمد سے۔ کیا تمہاری بیوی بھی یہی سمجھتی ہے۔ بہن بھائی کا رشتہ تو اتنا کچا نہیں ہوتا۔ جاؤ اس کی بہن کو دروازے پر بھیج دو۔“

تب اس نے غور سے میری طرف دیکھا۔ پھر بولا۔ ”معافی چاہتا ہوں جناب! آپ...؟“

میں نے اس کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا۔ ”میں اپنے علاقے کا ایس ایچ او ہوں۔ میرا نام ملک صفدر حیات ہے ــــ میں ایک قتل کی تفتیش کر رہا ہوں۔“

اس نے ایک دم اٹینشن ہو کر مجھے سیلوٹ مارا اور معذرت کر کے مجھے اندر لے گیا۔ اس نے اپنا نام غلام علی بتایا۔ وہ ایک قریبی تھانے میں ہیڈ کلرک تھا۔

”کیا فرید سے نے کوئی اور قتل کر دیا ہے؟“ اس نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھانے کے بعد پوچھا۔

اس کی بیوی جو ساتھ والے کمرے میں کھڑی تھی دوپٹہ ٹھیک کرتے ہوئے اندر آ گئی اور مجھے سلام کرنے کے بعد ایک طرف بیٹھ گئی۔ اس نے ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہن رکھے تھے جو کسی قدر میلے تھے۔ وہ ایک سیدھی سادی گھریلو عورت لگتی تھی۔ بعد میں اس کا نام جمیلہ معلوم ہوا۔

”میرے ویر کو کیا ہوا ہے جی؟“ اس نے پوچھا۔

”تیرا ویر کوئی اور کارنامہ کر آیا ہے۔“ غلام علی نے کہا۔ ”مجھے معلوم تھا کہ وہ ضرور کوئی مصیبت کھڑی کرے گا۔ چودہ سال بعد جیل سے چھوٹا تھا۔ اگر بندے دا پتر ہوتا تو سدھر جاتا۔“

"آپ نے تو اسے گھر میں گھسنے ہی نہیں دیا۔ دھکے دے کر نکال دیا۔ کیا خاک سُدھرتا تھا اس نے؟"

"بیٹھی رہ، قاتلوں کے لیے اس گھر میں کوئی جگہ نہیں ہے۔" غلام علی نے کہا پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "اس دفعہ کیا کیا ہے جی اس نے؟"

"تم لوگ بات ختم کر لو، پھر میں کچھ بولوں گا۔"

"ہماری بات تو کبھی ختم نہیں ہو سکتی جی! یہ کٹ کٹ تو صبح شام ہوتی رہتی ہے۔"

"بی بی! میں تمھارے بھائی کے متعلق کوئی اچھی خبر نہیں لایا۔" میں نے کہا۔

وہ گھبرا کر بولی۔ "اللہ خیر کرے، میرا ایک ہی بھائی ہے جی! ماں باپ پہلے ہی مر چکے ہیں۔"

"سب کو ایک دن مرنا ہے۔" میں چاہتا تھا کہ وہ ذہنی طور پر بھائی کی موت کی خبر سننے کے لیے تیار ہو جائے۔ "کوئی جوانی میں مر جاتا ہے، کوئی اپنی عمر پوری کر کے مرتا ہے۔ کوئی بھی ہمیشہ زندہ نہیں رہتا۔"

"جلدی بتائیں جی! کیا ہوا ہے؟"

"فرید احمد کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔"

یہ سنتے ہی اس نے رونا پیٹنا شروع کر دیا۔ اس کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا بھی کمرے میں آ گیا۔ لڑکیاں بھی رونے لگیں۔

"اب خوش ہو جاؤ غلام علی!" جمیلہ نے کہا۔ "اب ٹھنڈ پڑ گئی تیرے کلیجے کو، اب لکھوا لے مکان اپنے نام۔ مر گیا مکان کا دعویدار۔ مجھے پتا تھا تم میرے ویر کو کھا جاؤ گے۔"

غلام علی کچھ نہیں بولا۔ اسے بھی فرید احمد کی موت کا سن کر صدمہ ہوا تھا لیکن زیادہ نہیں جمیلہ کافی دیر تک روتی رہی۔ جب اس کی طبیعت سنبھلی تو اس نے پوچھا۔ "کس ظالم نے میرے ویر کی جان لی ہے؟"

"تم لوگ مشتاق حسین نامی شخص کو جانتے ہو؟" میں نے پوچھا۔ "محلہ انہار میں الیس ڈی او ہے۔ اس کی سسرال نسبت روڈ پر ہے۔"

"بڑی اچھی طرح جانتے ہیں۔" غلام نے کہا۔ "اس کی بیوی تو۔"

جمیلہ اس کی بات کاٹ کے بولی۔ "مشتاق حسین کو کیا ہوا ہے؟"

"فرید احمد اسی کے ہاتھوں قتل ہوا ہے۔" میں نے کہا اور ساری تفصیل بتا دی۔

"یہ سب کچھ اس کی بیوی کی وجہ سے ہوا ہے۔ اس ڈائن نے ہمارا پورا گھر تباہ کر دیا۔ خدا اسے غارت کرے۔"

"میں نے سنا ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے؟"

"لعنت ہو جی ایسی محبت پر جس کی خاطر انسان اپنے باپ کو قتل کرنے سے دریغ نہ کرے۔"

میرے استفسار پر انھوں نے جو تفصیل بتائی اس کا خلاصہ یہ ہے۔

اس المناک کہانی کی ابتدا قیامِ پاکستان سے بارہ تیرہ سال قبل ہوئی تھی۔ فرید اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا اور اس سے انھوں نے بڑی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں۔ حمیدہ بانو اور وہ ایک ہی کالج میں پڑھتے تھے۔ حمیدہ اس سے دو سال پیچھے تھی اور بقول جمیلہ ایک آوارہ لڑکی تھی۔ اس نے اس کے بھائی پر ڈورے ڈالنا شروع کر دیے اور بالآخر فرید کو اپنے جال میں پھنسا لیا۔

یہ ایک عورت کے ایک دوسری عورت کے بارے میں تاثرات ہیں۔ میں اس بات سے متفق نہیں ہوں۔ چونکہ دونوں عاقل و بالغ تھے، اس لیے برابر کے ذمے دار تھے۔ محبت میں بہت کشش ہوتی ہے۔ اس معاملے میں مخالفت جتنی سخت ہو محبت میں اتنی ہی شدت پیدا ہو جاتی ہے۔

بہرحال قصہ مختصر یہ کہ دونوں میں جنون کی حد تک محبت ہو گئی۔ گھر والوں کی شدید مخالفت کے باوجود ان کی محبت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں پڑھائی سے غافل رہنے لگے۔ گھر سے کالج جانے کے لیے نکلتے اور پہنچ جاتے منٹو پارک اور شملہ پہاڑی پر۔ پھر ایک دن وہ بھی آیا کہ دونوں گھر سے بھاگ گئے۔ ماں باپ کو چونکہ ساری بات کا علم تھا، اس لیے انھوں نے بدنامی کے ڈر سے کوئی رپورٹ درج نہیں کرائی۔

"تقریباً پندرہ بیس روز کے بعد فرید واپس آ گیا۔"

جمیلہ نے کہا۔ "اگر وہ اکیلا واپس آتا تو شاید امی ابا اسے معاف کر دیتے لیکن وہ حمیدہ کو بھی ساتھ لے کر آیا تھا۔ وہ شام کا وقت تھا اور ابا ابھی دکان سے واپس نہیں آئے تھے۔ گھر میں میرے اور امی کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ میں فرید سے تین سال چھوٹی ہوں۔ فرید امی سے بات کرنے کی بہت کوشش کرتا رہا۔ لیکن وہ اس کی کوئی بات سننے پر تیار نہیں تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ پہلے حمیدہ کو گھر چھوڑ کر آؤ پھر وہ کوئی بات سنیں گی۔ فرید حمیدہ کو لے کر کمرے میں گھس گیا اور دروازہ بند کر لیا۔ یہ دیکھ کر امی غصے سے بھڑک گئیں۔ انھوں نے چیخ کر کہا، جب تک یہ آوارہ لڑکی یہاں رہے گی میں اس گھر میں قدم نہیں رکھوں گی، پھر انھوں نے برقع پہنا، مجھے ساتھ لیا اور ماموں کے گھر پہنچ گئیں۔ وہاں سے انھوں نے کسی کو دکان پر بھیج کر ابا کو گھر بلا لیا اور انھیں ساری بات سنائی۔ میرے ابا یوں تو بہت ٹھنڈے مزاج کے آدمی تھے لیکن جب انھیں غصہ آتا تھا تو پھر وہ کسی کے قابو میں نہیں آتے تھے۔ امی کی بات سن کر وہ

سخت طیش میں آگئے۔ انھوں نے کہا۔ اس کمینے نے اپنے آپ کو کیا سمجھ رکھا ہے۔ میں دونوں کو قتل کر دوں گا۔ ان کے یہ الفاظ آج تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ میں نے امّی سے کہا بھی کہ انھیں اکیلے نہیں جانا چاہیے، کسی کو ان کے ساتھ بھیج دیں لیکن انھوں نے میری بات پر توجہ نہیں دی۔ آدھے گھنٹے کے بعد ہمیں اطلاع ملی کہ آبا فرید کے ہاتھوں قتل ہو گئے ہیں۔ مجھے آج تک اس بات پر یقین نہیں آیا۔" اس نے آنسو پونچھتے ہوئے بات جاری رکھی۔ "تھوڑی دیر بعد پولیس ہمارے گھر پہنچ گئی اور فرید کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں۔"

"اور حمیدہ بانو؟"

"اس کا اس معاملے میں کوئی ذکر نہیں آیا۔" غلام علی نے کہا۔ "فرید نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ وہ ابا کے آنے سے پہلے ہی وہاں سے چلی گئی تھی۔"

"لیکن کسی نے اس کی بات پر یقین نہیں کیا۔"

"غالباً فرید احمد نہیں چاہتا ہوگا کہ وہ پولیس اور کچہری کے چکر میں پڑے۔" میں نے کہا۔ "فرید احمد نے عدالت میں کیا بیان دیا تھا؟"

"اس نے کہا تھا کہ ابا نے اس پر پستول تان لیا تھا۔" غلام علی نے کہا۔ "وہ بہت غصے میں تھے اور بار بار یہ کہہ رہے تھے وہ اسے جان سے مار ڈالیں گے۔ فرید نے ان سے پستول چھیننے کی کوشش کی۔ اسی کش مکش کے دوران اتفاقاً گولی چل گئی۔ لیکن طبی رپورٹ سے اس کے بیان کی تصدیق نہیں ہوتی تھی۔ گولی بائیں پہلو میں لگی تھی اور دل میں گھس گئی تھی۔ جب کوئی شخص پستول چھیننے کی کوشش کرتا ہے تو وہ عام طور پر اس کا رُخ اوپر کی طرف کرتا ہے۔ بہرحال ڈھائی تین سال مقدمہ چلا اور فرید کو عمر قید ہو گئی۔ اب وہ چند ماہ قبل ملتان جیل سے رہا ہو کر آیا تھا لیکن اس کی قسمت میں آزادی نہیں تھی۔"

"کیا آپ نے مشتاق حسین کو گرفتار کر لیا ہے؟" جمیلہ نے پوچھا۔

"وارنٹ گرفتاری میری جیب میں ہے۔" میں نے کہا۔ "امید ہے کہ آج ہم اسے گرفتار کر لیں گے۔"

جمیلہ نے اپنے بھائی کی تجہیز و تکفین اور قبر کے بارے میں چند سوالات کیے۔ جانے سے پہلے میں نے فرید کے پرانے دوستوں کے بارے میں پوچھا اور دو تین کے پتے نوٹ کر لیے۔ لیکن ان میں سے صرف ایک شخص سے ملاقات ہو سکی۔ اس کی میکلوڈ روڈ پر فوٹو گرافی کی دکان تھی۔ اس کا نام منظور احمد تھا اور وہ پینتیس برس کا ایک سلجھا ہوا شخص تھا۔ اس کے بارے میں جمیلہ نے بتایا تھا کہ وہ فرید کا لنگوٹیا یار تھا اور دونوں ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں چھپاتے تھے۔ فرید احمد کی موت کی خبر سن کر اسے بہت دکھ ہوا۔ اس نے میری باتوں کے بہت مختصر جواب دیے۔ رہا ہونے کے بعد فرید احمد سیدھا اس کے پاس آیا تھا۔ اور بعد میں بھی ملتا رہا تھا۔ وہ اپنے بہنوئی غلام علی کی وجہ سے بہت پریشان تھا۔

"کیا اس نے حمیدہ کا ذکر بھی کیا تھا؟"

"حمیدہ نے اس کے ساتھ بہت ظلم کیا تھا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ فرید کو...." وہ کچھ کہتے کہتے رُک گیا اور بات بدل کر بولا۔ "مرنے والا مر گیا، اب پرانی باتیں چھیڑنے سے کیا فائدہ۔" قدرے توقف کے بعد اس نے ایک عجیب سا سوال کیا۔ "کیا آپ کو یقین ہے کہ فرید کو مشتاق حسین نے ہی قتل کیا ہے؟"

"اس نے خود اعتراف کیا ہے۔" میں نے کہا۔

"اعتراف تو...." وہ دوبارہ کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔

میں نے زیادہ اصرار نہیں کیا کیونکہ پرانی باتوں سے مجھے بھی دلچسپی نہیں تھی۔ تاہم جانے سے پہلے میں نے اسے اپنا پتا دے دیا اور کہا کہ اگر وہ کوئی بات بتانا مناسب سمجھے تو میرے پاس آ جائے۔

جس سپاہی کو میں نے حمیدہ بانو کے گھر کی نگرانی پر مامور کیا تھا اس نے بتایا کہ مشتاق حسین گھر کے اندر ہی چھپا ہوا ہے۔ میں نے علاقے کے تھانے دار سے رابطہ قائم کیا اور اس کی مدد سے چھاپہ مار کر مشتاق حسین کو گرفتار کر لیا۔ اگلے روز ہم اسے ساتھ لے کر واپس پہنچ گئے اور دفعہ تین سو دو کے تحت مقدمہ درج کر لیا۔ مشتاق حسین کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ ہمیں فرید احمد اور حمیدہ بانو کی پرانی کہانی معلوم ہو چکی ہے۔

ضابطے کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد میں نے اسے علیحدہ کمرے میں بلا لیا اور کہا۔ "فرید احمد کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟"

میرا سوال سن کر وہ ایک دم چونک گیا پھر سنبھل کر بولا۔ "کون فرید احمد؟"

میں نے اس کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا اور کہا۔ "سوال مت کرو۔ صرف جواب دو۔"

وہ کانپنے لگا بولا۔ "میں نے اسے قتل نہیں کیا۔"

میں نے ایک اور تھپڑ مارا۔ "فرید احمد کے بارے میں بتاؤ۔ قتل کی بات بعد میں ہوگی۔"

"جی بتاتا ہوں، بتاتا ہوں۔ فرید احمد لاہور کا رہنے والا تھا، میری بیوی کا اور وہ ایک ہی کالج میں پڑھتے تھے۔ میں اس کو بالکل نہیں جانتا۔ میں نے سنا تھا کہ اسے اپنے باپ کے قتل کے جرم میں عمر قید ہو گئی تھی۔"

"کیا تمھاری بیوی اس سے محبت کرتی تھی؟"

"حمیدہ نے ایک دفعہ کہا تھا کہ وہ اس کی جوانی کی لغزش تھی۔ وہ... وہ اس موضوع پر بات کرنا پسند نہیں کرتی تھی۔ جوانی میں ایسی غلطیاں...."

"فلسفہ نہیں جھاڑو۔ صرف سوال کا جواب دو۔ کیا اس نے تمھیں یہ بھی بتایا تھا کہ وہ جوانی میں فرید احمد کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی تھی اور دونوں کئی دن تک اکٹھے باہر رہے تھے؟"

"ہم... میں نے یہ افواہ سنی تھی اور حمیدہ سے پوچھا بھی تھا لیکن اس نے اس بات کی تردید کی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ لوگوں نے اسے بدنام کرنے کے لیے یہ بات اڑائی تھی۔"

"کیا حمیدہ بانو تمھاری رشتے دار ہے؟"

"جی نہیں، ہمارے ایک عزیز کے حمیدہ کے گھر والوں سے مراسم تھے۔ ان کی وساطت سے ہی ہماری شادی ہوئی تھی۔ شادی سے پہلے میں ان لوگوں کو بالکل نہیں جانتا تھا۔ حمیدہ کو بھی صرف ایک مرتبہ دیکھا تھا۔"

"فرید احمد تمھارے پاس کیوں آیا تھا؟"

"وہ چاہتا تھا کہ میں اپنی بیوی کو طلاق دے دوں۔"

"اور تم نے اسے کیا جواب دیا؟"

میں نے کہا کہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں اپنی بیوی کو طلاق نہیں دے سکتا۔ ہمارے دو بچے ہیں اور ہمارے درمیان کوئی جھگڑا فساد نہیں ہے۔ میں کیوں اپنی بیوی کو طلاق دوں۔"

"کیا اس نے کبھی تم سے جھگڑا وغیرہ بھی کیا تھا؟"

"نہیں، اس نے کبھی جھگڑا نہیں کیا۔ وہ بہت عجیب آدمی تھا۔ بہت ٹھہر ٹھہر کر اور سکون کے ساتھ دھیمی آواز میں بات کرتا تھا۔ شروع میں میں نے اسے دو تین مرتبہ ڈانٹا تو وہ کچھ نہیں بولا۔ آنکھیں نیچی کر کے میری ڈانٹ سنتا رہا پھر کہنے لگا۔ آج آپ کا موڈ ٹھیک نہیں ہے۔ میں پھر کبھی آؤں گا۔ شام کے وقت میری آمد سے تھوڑی دیر پہلے ہمارے گھر کے کونے پر آکر بیٹھ جاتا تھا۔ اگر میں اس کی بات نہ سنتا تو زیادہ اصرار نہیں کرتا تھا۔ بس سر جھکا کر واپس چلا جاتا تھا۔ بالکل مجنوں لگتا تھا۔"

"کیا اس نے تمھاری بیوی سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی؟"

"حمیدہ اسے دیکھ کر دروازہ نہیں کھولتی تھی۔ اس نے شروع میں دو تین مرتبہ میری عدم موجودگی میں حمیدہ سے بات کرنے کی کوشش کی تھی لیکن جب میں نے اسے ڈانٹا تو اس نے دروازہ کھٹکھٹانا بند کر دیا تھا۔"

یہاں تک پوچھنے کے بعد ایک ہنگامی کیس کی وجہ سے مجھے سوالات کا سلسلہ ملتوی کرنا پڑا۔ اس کے بعد تین چار روز تک اس کیس سے فرصت نہیں ملی۔ ایک روز دوپہر کے بعد منظور احمد فوٹو گرافر مجھ سے ملنے کے لیے آیا۔ وہ سیدھا لاہور سے آیا تھا۔ اس کے چہرے اور لباس پر گرد جمی ہوئی تھی۔ میں نے اس کی خیریت پوچھی اور بیٹھنے کے لیے کرسی پیش کی۔

چند رسمی باتوں کے بعد اس نے کہا۔ "ملک صاحب! لاہور سے صرف آپ سے ملنے کے لیے آیا ہوں۔ اگر آپ کے پاس فرصت ہو تو چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔"

میں مصروف تو بہت تھا لیکن وہ نوے میل کا سفر کر کے آیا تھا اور یقیناً کوئی اہم بات بتانا چاہتا تھا۔ لہٰذا میں نے کہا۔ "بڑی خوشی ہوئی کہ آپ اتنی دور سے مجھ سے ملنے آئے ہیں۔ میں ہمہ تن گوش ہوں۔"

"ملک صاحب! آپ سے ملاقات کے بعد میں فرید احمد کے متعلق بہت سوچتا رہا ہوں اور دو دفعہ میں نے فرید کو خواب میں دیکھا ہے۔ وہ مجھے مخاطب کر کے کہتا ہے۔ منظور اب حمیدہ کی باری ہے۔ ملک صاحب! میں اپنے ذہن پر بڑا بوجھ محسوس کر رہا ہوں اور آج وہ بوجھ ہلکا کرنے آیا ہوں۔ سب سے پہلی بات تو میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ فرید نے اپنے باپ کو قتل نہیں کیا تھا۔ اس نے اپنی محبوبہ کو بچانے کے لیے اپنی زندگی کے چودہ سال جیل کی نذر کر دیے تھے۔"

"تمھارا مطلب ہے کہ فرید کے باپ کو حمیدہ نے قتل کیا تھا؟"

"جی ہاں، فرید نے یہ بات مجھے جیل سے رہا ہونے کے بعد بتائی تھی۔ جیل سے رہا ہونے کے بعد جب وہ پہلی بار مجھے ملا تو کہنے لگا۔ "منظور! آج میں بہت خوش ہوں۔ میں نے کہا جیل سے رہا ہونے کے بعد ہر شخص خوش ہوتا ہے۔ میں بھی تمھاری رہائی پر خوش ہوں۔ وہ کہنے لگا یہ بات نہیں ہے مجھے جیل سے رہا ہونے کی اتنی خوشی نہیں ہے۔ اصل خوشی اس بات کی ہے کہ میں نے اپنی محبوبہ کے بدلے جیل کاٹی ہے۔ میں اس کی بات سن کر حیران ہوا اور وضاحت چاہی۔ تب اس نے بتایا کہ اس کے والد پر حمیدہ نے گولی چلائی تھی۔"

"اس کے پاس پستول کہاں سے آیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"پستول فرید کے والد ہی لے کر گئے تھے۔ اگر فرید ان سے پستول نہ چھین لیتا تو شاید وہ دونوں کو قتل کر دیتے۔ فرید نے ان سے پستول چھین کر حمیدہ کو دے دیا اور کہا کہ اسے باہر لے جائے لیکن اس نے باہر جانے کے بجائے اس کے والد پر گولی چلا دی۔ پھر فرید نے حمیدہ کو گھر بھیج دیا اور سارا الزام اپنے سر لے لیا۔"

"واقعی اس شخص نے بہت بڑی قربانی دی تھی۔" میں نے کہا۔ "حمیدہ بانو نے اس کی قدر نہیں کی۔"

"ایک بات اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز... بلکہ افسوس ناک ہے۔" منظور احمد نے کہا۔ "حمیدہ بانو فرید احمد کی بیوی تھی۔"

"بیوی!" میں نے حیرانی سے کہا۔

"جی ہاں، دونوں نے گھر جانے سے دو روز پہلے شادی کر لی تھی۔ گھر سے بھاگ جانے کا مشورہ حمیدہ بانو ہی نے دیا تھا۔ فرید اس پر تیار نہیں تھا لیکن حمیدہ کے اصرار پر اسے ماننا ہی پڑا۔ کیونکہ حمیدہ کے گھر والے اس کی شادی کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ فرید نے مجھ سے مشورہ کیا تو میں نے بھی اسے اس حرکت سے منع کیا لیکن ایک دن وہ اچانک حمیدہ کے ساتھ ہمارے گھر پہنچ گیا۔ دونوں بمبئی جانے کا پروگرام بنا کر گھر سے نکلے تھے۔ میں نے سوچا اگر یہ بمبئی چلے گئے تو دونوں تباہ ہو جائیں گے۔ حمیدہ کا خیال تھا کہ وہ اداکاری بہت اچھی کر لیتی ہے۔ اس لیے اسے فلموں میں کام مل جائے گا۔ میں نے اپنی والدہ کو اعتماد میں لیا اور دونوں کو اپنے گھر میں رکھ لیا۔

پہلے تو میں یہ کوشش کرتا رہا کہ وہ کسی طرح گھر واپس جانے پر تیار ہو جائیں۔ جب اس میں کامیابی نہیں ہوئی تو میں نے ان سے کہا کہ وہ پہلے شادی کر لیں اس کے بعد جہاں دل چاہے چلے جائیں۔ بہرحال انھوں نے یہ بات مان لی۔ اس کے دو یا تین روز بعد وہ حمیدہ کو لے کر اپنے گھر چلا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ گھر والے اس کی حماقت کو چند ہفتوں کے اندر بھول جائیں گے اور اس کی بیوی کو قبول کر لیں گے لیکن وہاں اسے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ شادی کے وقت میں بھی موجود تھا۔ یہ ان کا نکاح نامہ ہے۔ اس شادی کا میرے سوا آج تک کسی کو علم نہیں ہو سکا۔"

اس نے سولہ سترہ سال پرانا نکاح نامہ نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔

میں نے نکاح نامے کا جائزہ لینے کے بعد کہا۔ "کیا حمیدہ نے بعد میں فرید سے طلاق حاصل کر لی تھی؟"

"اس نے کسی کو بتایا ہی نہیں لہٰذا طلاق اور خلع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب تک فرید کوٹ لکھپت جیل میں رہا میں وقتاً فوقتاً اس سے ملنے جاتا رہتا تھا۔ شروع میں دو چار مرتبہ حمیدہ بھی اس سے ملنے گئی تھی۔ فرید نے اس سے کہا تھا کہ اگر وہ دوسری شادی کرنا چاہے تو وہ طلاق نامہ لکھ دے گا لیکن حمیدہ نے سختی سے انکار کر دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ ساری عمر اس کا انتظار کرے گی۔ لیکن پانچ چھ سال بعد وہ سب کچھ بھول گئی اور اس نے گھر والوں کے کہنے پر شادی کر لی۔"

"فرید احمد نے یہ بات معلوم ہونے کے بعد کیا ردِعمل ظاہر کیا تھا؟"

"فرید بہت مست الست قسم کا آدمی تھا۔ جیل سے رہا ہونے کے بعد اس کی طبیعت میں عجیب سی گہرائی پیدا ہو گئی تھی۔ جب میں نے حمیدہ کی شادی کے بارے میں بتایا تو چُپ سا ہو گیا۔ دیر تک سر جھکائے بیٹھا رہا۔ پھر بولا۔ "اس نے اچھا نہیں کیا لیکن بُرا بھی نہیں کیا۔ اتنے لمبے عرصے تک محبوب کا پیاسا رہنا آسان کام نہیں ہے۔" میں نے پوچھا "تمھارا اب کیا ارادہ ہے؟" تو بولا "محبوب کے در پر جاؤں گا۔ رحم کی اپیل کروں گا۔ اگر اپیل منظور نہ ہوئی تو اس کے در کی خاک بن جاؤں گا" اور پھر وہ واقعی محبوب کے در کی خاک بن گیا۔ ملک صاحب! فرید بہت مظلوم انسان تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس کے لیے کچھ نہیں کر سکا۔ یہاں سے میں سیدھا اس کی قبر پر فاتحہ پڑھنے جاؤں گا۔"

کچھ دیر اور باتیں کرنے کے بعد اس نے سلام کیا اور اٹھ کر رخصت ہو گیا۔

میں کچھ ضروری کاموں سے فارغ ہو کر مشتاق حسین کے گھر پہنچ گیا۔ اس کی بیوی مشتاق حسین کی گرفتاری کے دوسرے روز وہاں آگئی تھی۔ اس وقت وہ گھر میں اکیلی تھی۔ بچے غالباً اسکول گئے ہوئے تھے۔ اس نے مجھے بیٹھک میں بٹھایا اور میرے منع کرنے کے باوجود چائے بنا کر لے آئی۔ میں نے اس سے کہا کہ چونکہ وہ اکیلی ہے اس لیے بے شک کسی پڑوسن کو بلا لے۔ اس پر وہ مسکرا کر بولی۔ "آپ اتنے ڈراؤنے بھی نہیں ہیں۔" لیکن میں اس کی مسکراہٹ میں شامل نہیں ہوا۔

"حمیدہ بی بی! میں تم سے کچھ سوالات کرنے آیا ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "اور مجھے امید ہے کہ تم میرا اور اپنا وقت ضائع نہیں کرو گی۔"

"بہت اچھا جی، پوچھیں۔" وہ میرے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر محبوب کی موت اور شوہر کی گرفتاری کا کوئی ملال نظر نہیں آتا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے معلوم ہوتی تھی جنہیں اپنے سوا دنیا کی کسی چیز کی کبھی پروا نہیں ہوتی۔

"تم فرید احمد کو کب سے جانتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

اس کے چہرے پر ہلکی سی گھبراہٹ نمودار ہوئی۔ بولی۔ "کک...... کون فرید احمد؟"

"جو اس بیٹھک میں قتل ہوا تھا۔"

"آپ اس چور کی بات کر رہے ہیں؟"

میرا جی چاہا کہ اس کے بال پکڑ کر دو چار تھپڑ اس کے منہ پر لگا دوں۔ لیکن میں نے اپنے غصّے کو قابو میں رکھا۔ "میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ میرا وقت ضائع نہیں کرنا۔" میں نے کہا۔ "ہمیں سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔"

"اگر آپ کو معلوم ہو چکا ہے تو مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟" اس نے ڈھٹائی سے کہا۔ "ہمیں کیا معلوم تھا کہ وہ چوری کی

کی نیت سے داخل ہوا ہے یا کسی اور مقصد کے لیے۔"

"کیا تم یہ بات پسند کرو گی کہ تمہیں تھانے میں لے جا کر پوچھ گچھ کی جائے؟"

"میں نے کیا قصور کیا ہے جو آپ مجھے تھانے لے جائیں گے؟"

"تمہارے جرائم کی فہرست بہت لمبی ہے۔" میں نے کہا۔ "اور تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ قانون سے تعاون نہ کرنا اور کسی جرم کی معلومات کو چھپانا بھی جرم ہے۔ میں پھر اپنا سوال دہراتا ہوں۔ تم فرید احمد کو کب سے جانتی ہو؟"

وہ کچھ بے بس سی ہو کر بولی۔ "بہت عرصہ ہو گیا ہے۔ ہم ایک ہی کالج میں پڑھتے تھے۔"

"کیا تم فرید سے محبت کرتی تھیں؟"

"یہ...... یہ بالکل ذاتی قسم کی بات ہے۔"

"کیا تم فرید کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی تھیں؟"

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا پھر بولی۔ "فرید مجھے سبز باغ دکھا کر اپنے ساتھ لے گیا تھا لیکن میں دوسرے ہی دن واپس آ گئی تھی۔"

"فرید کو سزائے قید کس جرم میں ہوئی تھی؟"

"اس نے اپنے باپ کو قتل کر دیا تھا۔"

"کیا تمہیں یقین ہے کہ فرید نے ہی اپنے باپ کو قتل کر دیا تھا؟"

"میں نے خود......" وہ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔

میں نے اسے آنکھیں دکھاتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "قتل تم نے کیا تھا یا فرید نے؟"

وہ اس اچانک سوال سے گھبرا گئی۔ بولی۔ "یہ...... یہ آپ سے کس...... کس نے کہہ دیا؟"

میں اٹھ کر اس کے سر پر کھڑا ہو گیا۔ "یہ مجھے فرید احمد نے بتایا تھا۔ وہ اپنا تحریری بیان چھوڑ گیا ہے۔ منظور احمد فوٹو گرافر اس کے بیان کا گواہ ہے۔"

"اوہ میرے خدا!" اس کا پورا جسم کانپنے لگا۔ "مم..... مجھے فرید سے یہ امید نہیں تھی۔"

"اگر تم سب کچھ سچ سچ بتا دو گی تو میں بات کو یہیں پر دبا دوں گا ورنہ تم پر قتل کا کیس بن جائے گا۔"

میرے یقین دلانے پر اس نے اقبالِ جرم کر لیا۔ بولی۔ "وہ سب کچھ اچانک ہو گیا تھا۔ فرید کے ابا پر جنون سوار تھا۔ جب فرید نے ان سے پستول چھین کر مجھے پکڑا دیا تو انہوں نے اس کا گلا دبانا شروع کر دیا۔ فرید کی آنکھیں باہر کو نکل پڑی تھیں۔ جب میں نے گولی چلائی تو میں بالکل ہوش میں نہیں تھی۔ اس وقت دونوں

---

## ایک

تباہ حال شخص کو مکان کی نیو کھودتے ہوئے خزانہ ہاتھ آ گیا۔ اس نے چپ چاپ اسے قبضے میں کیا اور پھر بتدریج شان و شوکت سے رہنے لگا۔ کل تک جو لوگ اُسے نظر انداز کر دیا کرتے تھے، اب اس کی باتوں میں عقل و فکر کی بُو محسوس کرنے لگے۔ کسی خوشامدی دوست نے اس کے دورِ افلاس کو اپنے حافظے میں لا کر سوال کیا۔ "جناب آپ کی باتیں تو ایسی ہوتی ہیں کہ آدمی انھیں سُنتا ہے اور ان سے علم و دانش حاصل کرتا ہے۔"

نو دولتیے نے جواب دیا۔ "بے شک اس میں کیا شک ہے؟"

دوست نے کہا۔ "حضرت! ایک معمولی سا سوال مجھے بہت پریشان کرتا رہتا ہے کیا اس کا جواب عنایت فرمائیں گے؟"

نو دولتیے نے شانِ خود رائی و بے نیازی سے جواب دیا۔

"پوچھیے ضرور جواب دُوں گا!"

دوست نے سوال کیا۔ "امیری اور غریبی کا فرق واضح کیجیے بڑا کرم ہو گا۔"

نو دولتیے نے جواب دیا۔ "جنابِ والا! جب میں غریب تھا اور کسی محفل میں بیٹھ کر علم و دانش کی بات کرتا تھا تو لوگ کمال بیزاری سے کہا کرتے تھے کہ اپنی بکواس بند کرو لیکن اب جبکہ میں دولت مند ہوں اور بیشتر فضول باتیں کرتا رہتا ہوں تو لوگ کہتے ہیں ماشاء اللہ کیا بات ہے۔ آپ کا ایک ایک لفظ موتیوں میں تولنے کے لائق ہے اور آپ کی آواز تو ایسی ہے جیسے پھول جھڑ رہے ہوں۔"

---

میں سے ایک ضرور مر جاتا۔ اگر میں گولی نہ چلاتی تو پھر فرید اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا۔"

"کیا تم نے فرید سے شادی کر لی تھی؟"

"نج..... جی!"

میں نے نکاح نامہ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور دونوں ہاتھ منہ پر رکھ لیے۔ میں دوبارہ صوفے پر بیٹھ گیا۔

"ملک صاحب! عورت کبھی کبھی بہت بے بس ہو جاتی ہے، وہ اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتی۔ اس کے سرپرست اسے جدھر چاہیں ہانک کر لے جائیں۔"

"میں تمہاری یہ بات ماننے کو تیار نہیں ہوں۔ کیا تمہارے سرپرستوں نے تم سے یہ کہا تھا کہ فرید احمد سے محبت کرو؟ کیا انھوں نے تمہیں گھر سے بھاگنے پر مجبور کیا تھا؟"

"لیکن اس کے بعد تو جو کچھ کیا انھوں نے ہی کیا۔ میں عجیب مصیبت میں پھنس گئی تھی۔ فرید کو عمر قید ہو گئی تھی۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں زندگی بھر اس کے انتظار میں بیٹھی رہتی۔ میں نہ تو فرید سے طلاق مانگ سکتی تھی اور نہ ہی گھر والوں کو شادی کے بارے میں بتا سکتی تھی۔ جب میری شادی طے کی گئی تھی تو میں بہت روئی تھی۔ کئی دن تک روتی رہی تھی۔"

"فرید تم سے ملا تھا؟"

"ہاں، میں اسے دیکھ کر دنگ رہ گئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ کبھی بھی جیل سے رہا نہیں ہو گا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ جو ہو چکا سو ہو چکا۔ وہ پچھلی غلطیوں کو بھول جائے گا۔ خدا بھی معاف کر دیتا ہے، انسان کو بھی چاہیے کہ معاف کر دے۔ وہ چاہتا تھا کہ میں مشتاق کو چھوڑ کر اس کے ساتھ چلی جاؤں لیکن آپ خود سوچیں کہ میں بنا بنایا گھر اور بچے کیسے چھوڑ سکتی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ میری زندگی سے دور چلا جائے۔ مجھے بھول جائے، لیکن وہ نہیں مانا۔"

"تم اس کی بیوی تھیں۔ وہ تمھاری خاطر چودہ سال جیل میں رہا۔ کیا تم اس کی خاطر چھوٹی سی قربانی نہیں دے سکتی تھیں؟ بلکہ دیکھا جائے تو مشتاق حسین کے ساتھ تمھاری شادی ناجائز تھی۔ وہ تمھارا شوہر نہیں تھا۔ تمھارا اصل شوہر فرید احمد تھا۔ وہ تمھیں گناہ آلود زندگی سے بچانے آیا تھا۔ تمھیں چاہیے تھا کہ اخلاقی جرأت سے کام لے کر مشتاق حسین کو سب کچھ بتا دیتیں اور فرید کے ساتھ چلی جاتیں۔"

"بس جی اپنا اور بچوں کا مستقبل بھی دیکھنا پڑتا ہے۔ میرے بچے کبھی بھی میرا ساتھ دینے پر تیار نہ ہوتے۔ وہ یہی سمجھتے کہ میں ایک سزا یافتہ قاتل کے ساتھ بھاگ گئی ہوں۔"

مجھے اس کی باتیں سن کر افسوس ہوا۔ اس کے دلائل گو وزنی نظر آتے تھے لیکن ان کی بنیاد خود غرضی اور مصلحت پر قائم تھی۔ درحقیقت وہ فرید احمد اور اس کے گھرانے کی تباہی کی ذمے دار تھی۔

"واقعہ والے روز کیا ہوا تھا؟" میں نے پوچھا۔ "مجھے چور والا قصہ نہیں سنانا۔ میں اصل واقعہ جاننا چاہتا ہوں۔"

وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر بولی۔ "فرید روزانہ ہمارے گھر کے سامنے آ کر بیٹھ جاتا تھا۔ اس روز مشتاق اسے بھگانے کے لیے اندر لے آیا۔ میں سامنے نہیں گئی۔ دونوں میں کسی بات پر تلخ کلامی ہو گئی۔ پھر شاید ہاتھا پائی شروع ہو گئی۔ مشتاق نے پٹی اٹھا کر اس کے سر پر دے ماری، لیکن میں نے کچھ نہیں دیکھا۔ میں دوسرے کمرے میں تھی۔"

"چور والا قصہ کس نے گھڑا تھا؟"

"میرا خیال ہے کہ یہ مشورہ مشتاق نے ہی دیا تھا۔"

جھگڑے اور ہاتھا پائی والی بات قابل ہضم نہیں تھی۔ میں نے فرید احمد کے بارے میں یہ رائے قائم کی تھی کہ وہ ایک ٹھنڈے مزاج کا شخص تھا اور اس کے ساتھ ہاتھا پائی کی نوبت نہیں آ سکتی تھی۔ غالباً حمیدہ نے فرید سے ملنا جلنا شروع کر دیا تھا اور مشتاق حسین کو اس کا علم ہو گیا ہو گا۔ یہ بات زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی تھی، کیونکہ جب فرید احمد کے سر پر چوٹ ماری گئی تھی اس وقت وہ یقیناً بیٹھا ہوا تھا جبھی چوٹ کا زیادہ دباؤ سر کے وسط میں تھا نیز طبی رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ مقتول کی غفلت میں چوٹ لگائی گئی تھی۔ اس کے جسم پر یا لباس پر ہاتھا پائی کا کوئی نشان نہیں پایا گیا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ مشتاق حسین کو یہ بات معلوم ہو گئی ہو کہ حمیدہ، فرید احمد کی منکوحہ ہے اور اس نے اپنے حریف سے چھٹکارا پانے کے لیے اسے قتل کر دیا ہو۔

میں نے مشتاق حسین سے سچ اگلوانے کے لیے تھوڑے سے جھوٹ کا سہارا لیا۔ میں نے اسے اپنے کمرے میں بلایا اور کہا۔ "دیکھو مشتاق حسین! تمھاری بیوی نے جو بیان دیا ہے اس سے تمھارے خلاف قتل عمد کا کیس بنتا ہے۔ اس کے بیان کی موجودگی میں تمھیں پھانسی کی سزا ہو جائے گی۔"

اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ جیسے وہ برسوں کا بیمار ہو۔ "میری بیوی نے کیا کہا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"اس نے بالکل سچی کہانی سنائی ہے۔ بقول اس کے تمھارے سونے کے بعد اس نے فرید احمد کو بیٹھک میں بلایا اور اس سے باتیں کرنے لگی اور تم نے دبے پاؤں پیچھے سے آ کر فرید احمد پر وار کر دیا۔"

"نہیں، نہیں وہ ایسا بیان نہیں دے سکتی۔"

"اس نے ایسا ہی بیان دیا ہے۔" میں نے کہا۔ "اور اس کے علاوہ میں تمھیں ایک حیرت انگیز بات بتانا چاہتا ہوں۔"

اچانک وہ اپنا سینہ ملتے ہوئے بولا۔ "میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔" اس نے دیوار کا سہارا لیا اور فرش پر بیٹھ گیا۔ میں نے ایک سپاہی کو بھیج کر ڈاکٹر کو بلایا جس نے اس کے ایک انجکشن لگایا اور کھانے کی دوا بھی دی۔ تھوڑی دیر بعد اس کی طبیعت سنبھل گئی لیکن وہ اس طرح پھٹی پھٹی نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا جیسے اس نے پہلی بار یہ دنیا دیکھی ہو۔ میں نے اسے کرسی پر بٹھا کر فرید احمد اور حمیدہ بانو کا نکاح نامہ دکھایا۔

"یہ کیا چیز ہے؟" اس نے پوچھا۔

"یہ نکاح نامہ ہے۔" میں نے کہا۔ "حمیدہ بانو فرید احمد

کی بیوی تھی۔ دونوں نے سترہ سال پہلے شادی کی تھی۔"

"اوہ، میرے خدا! یعنی میرے ساتھ دھوکا کیا گیا تھا۔"

"دھوکا حمیدہ نے کیا تھا۔ اس کے گھر والوں کو اس شادی کا علم نہیں تھا۔ اور اب ذرا سنبھل کر بیٹھ جاؤ، میں ایک اور انکشاف کرنا چاہتا ہوں۔ تمہاری بیوی قاتلہ بھی ہے۔ اس نے فرید احمد کے والد کو قتل کیا تھا لیکن فرید احمد نے یہ الزام اپنے سر لے لیا تھا۔"

مشتاق حسین واقعی سنبھل کر بیٹھ گیا۔ بولا۔ "کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں؟"

"ہاں، تمہاری بیوی اس قتل کا اعتراف کرچکی ہے۔"

"میں دوبارہ بیان لکھوانا چاہتا ہوں۔" مشتاق حسین نے کہا۔ میں نے دیکھا، اس کے چہرے کی سُرخی واپس آتی جا رہی تھی۔ "میرا پہلا بیان بالکل بے بنیاد اور جھوٹا تھا۔ میں نے فرید احمد کو قتل نہیں کیا۔ مجھے تو اس پر ترس آنے لگا تھا۔"

"تو پھر کس نے اسے قتل کیا؟" میں نے پوچھا۔

"میری بیوی نے۔" اس نے جواب دیا۔

اس نے جس یقین اور اعتماد سے یہ بات کہی تھی اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا ہے۔ میں نے اسے تفصیل بتانے کے لیے کہا۔

"وقوعہ والے روز میں نے فرید احمد کو سمجھانے کے لیے اندر بلا لیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ نفسیاتی مریض ہے اور شاید سمجھانے سے واپس چلا جائے گا لیکن جب میں نے اس سے باتیں کیں تو اندازہ ہوا کہ وہ جنونی ضرور تھا لیکن نفسیاتی مریض نہیں تھا۔ وہ بڑے صبر اور سکون سے میری باتیں سنتا رہا۔ جب میں رُکتا تو وہ ایک ہی بات کہتا۔ 'مشتاق حسین! حمیدہ کو چھوڑ دو۔ اس میں تمہارا بھی بھلا ہے اور اس کا بھی۔' میں اس کی یہ بات سُن سُن کر تنگ آگیا۔ میں نے غصے سے کہا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ گھر اجاڑنے سے کسی کا کیسے بھلا ہوسکتا ہے۔ کیا تم پاگل ہوگئے ہو یا مجھے پاگل سمجھتے ہو؟' اس پر اس نے کہا۔ 'میرا خیال ہے کہ میں ہی پاگل ہوں۔ مجھے پہلے ہی دن حقیقت بیان کردینا چاہیے تھی۔ خیر اب بھی کچھ نہیں گیا۔ ذرا اطمینان سے میری بات سننا جوش میں نہیں آنا۔ میں نے اور حمیدہ نے آج سے سترہ سال قبل......'"

لیکن اس سے آگے وہ کچھ نہیں کہہ سکا۔ میری بیوی ایک دم کمرے میں نمودار ہوئی۔ اس نے آتے ہی چارپائی کی پٹی سے اس کے سر پر وار کردیا۔ اس بے چارے کو پتا بھی نہیں چل سکا کہ اس کے سر پر کیا قیامت ٹوٹی تھی۔ میں آج تک حیران تھا کہ فرید احمد کون سی ایسی بات بتانا چاہتا تھا جس کی وجہ سے حمیدہ نے اسے زندگی سے محروم کردیا۔ اگرچہ میں اتنا سچا اور پکا مسلمان نہیں ہوں لیکن اگر مجھے پتا چل جاتا کہ حمیدہ، فرید کے ساتھ شادی کرچکی ہے تو بہ خدا میں اسے ایک دن بھی گھر میں نہ رکھتا۔" قدرے توقف کے بعد اس نے پوچھا۔ "کیا آپ حمیدہ کو گرفتار کرلیں گے؟"

"ہاں، یہ ہمارا فرض ہے۔" میں نے کہا۔ "معاف کرنا اور سزا دینا عدالت کا کام ہے۔ البتہ تمہیں کل ضمانت پر رہا کردیا جائے گا۔"

"ایک مہربانی کریں۔ اسے بچوں کے سامنے گرفتار نہ کریں۔"

"ٹھیک ہے۔ گیارہ بارہ بجے تک تمہاری ضمانت ہوجائے گی۔ تم بچوں کو لے کر کہیں ادھر اُدھر چلے جانا۔ ہم ایک بجے اسے گرفتار کرنے آئیں گے۔"

اگلے روز میں نے ایک سپاہی کی بیوی کو ساتھ لے لیا اور تانگے میں حمیدہ کے گھر پہنچ گیا۔ سپاہی کی بیوی کو تانگے میں انتظار کرنے کے لیے کہا اور خود جاکر دروازہ کھٹکھٹایا۔ حمیدہ نے پہلے کھڑکی سے باہر دیکھا پھر دروازہ کھول دیا اور مجھے اندر بلا کر بیٹھنے کے لیے کہا۔

"تمہیں میرے ساتھ تھانے تک جانا پڑے گا۔" میں نے کہا۔

اس کا رنگ پیلا پڑگیا۔ بولی۔ "کیوں؟"

"وجہ وہیں چل کر بتائیں گے، اگر کوئی چادر وغیرہ لینا ہو تو لے لو۔"

وہ سمجھ گئی کہ اس کا راز فاش ہوچکا ہے۔ اس نے مجھے ایک منٹ انتظار کرنے کے لیے کہا اور اندر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد واپس آئی تو اس کے ہاتھوں میں زیورات کے چند ڈبے اور کچھ نقدی تھی۔ یہ سب چیزیں اس نے میرے قدموں میں رکھ دیں اور ہاتھ جوڑ کر میرے سامنے کھڑی ہوگئی۔ منہ سے ایک لفظ بھی نہیں بولی۔ مجھے اس کی حالت دیکھ کر رحم آگیا لیکن میں اپنا فرض ادا کرنے کے لیے مجبور تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "بی بی! یہ سامان اندر رکھ دو اور میرے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوجاؤ۔"

"مجھ پر رحم کریں۔" اس نے روتے ہوئے کہا۔ "میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ میں ان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس وقت میرے پاس یہی کچھ ہے۔ اس کے علاوہ آپ جو کچھ کہیں گے میں اس کا انتظام کردوں گی۔ خدا کے لیے مجھے تھانے لے کر نہ جائیں۔ میں مرجاؤں گی۔"

میں نے زیورات اور نقدی اٹھا کر الماری میں رکھ دی اور کھڑکی سے اشارہ کرکے سپاہی کی بیوی کو اندر بلالیا۔ اگرچہ حمیدہ کے ہاتھوں دو آدمی قتل ہوچکے تھے اور وہ کسی نرمی کی مستحق نہیں تھی لیکن اسے گرفتار کرتے ہوئے مجھے واقعی دکھ ہوا تھا۔

مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بننے کے دوران بنگالیوں، بہاریوں اور مشرقی پاکستان میں مقیم مغربی پاکستانیوں نے جو الم ناک صعوبتیں برداشت کیں اور انسانی تاریخ کے جس خونچکاں اور غیر انسانی دور سے وہ گزرے، ماضی کی حکومت نے اس دور کے اذیت ناک واقعات پر پردہ ڈالنے کی پوری کوشش کی تھی لیکن اب صحافیوں، ادیبوں اور مبصروں کو اظہار حقیقت کی مکمل آزادی ہے اور میجر جنرل (ریٹائرڈ) ایم راؤ خان (ستارۂ پاکستان) اور بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) عبدالرحمٰن صدیقی نے المیۂ مشرقی پاکستان کا بھرپور عسکری تجزیہ کیا ہے۔ زیرِ نظر کہانی بھی ایک ایسا ہی آئینہ ہے جس میں ہم اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کا عکس دیکھ سکتے ہیں۔

محی الدین نواب

تیسری قسط

**اچانک** بارش ہونے لگی۔ مسلسل ٹرانے والے مینڈک تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئے۔ جھینگروں کی آواز بھی نہیں آرہی تھی۔ اس ویرانے میں چاروں طرف گہری تاریکی اور خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ دو لوگیوں کے مختلف کمپارٹمنٹ میں بیٹھے ہوئے مسافر مرد، عورتیں، بوڑھے، بچے سب سہمے ہوئے تھے جیسے انھیں برسوں سے، صدیوں سے بولنا نہ آتا ہو۔
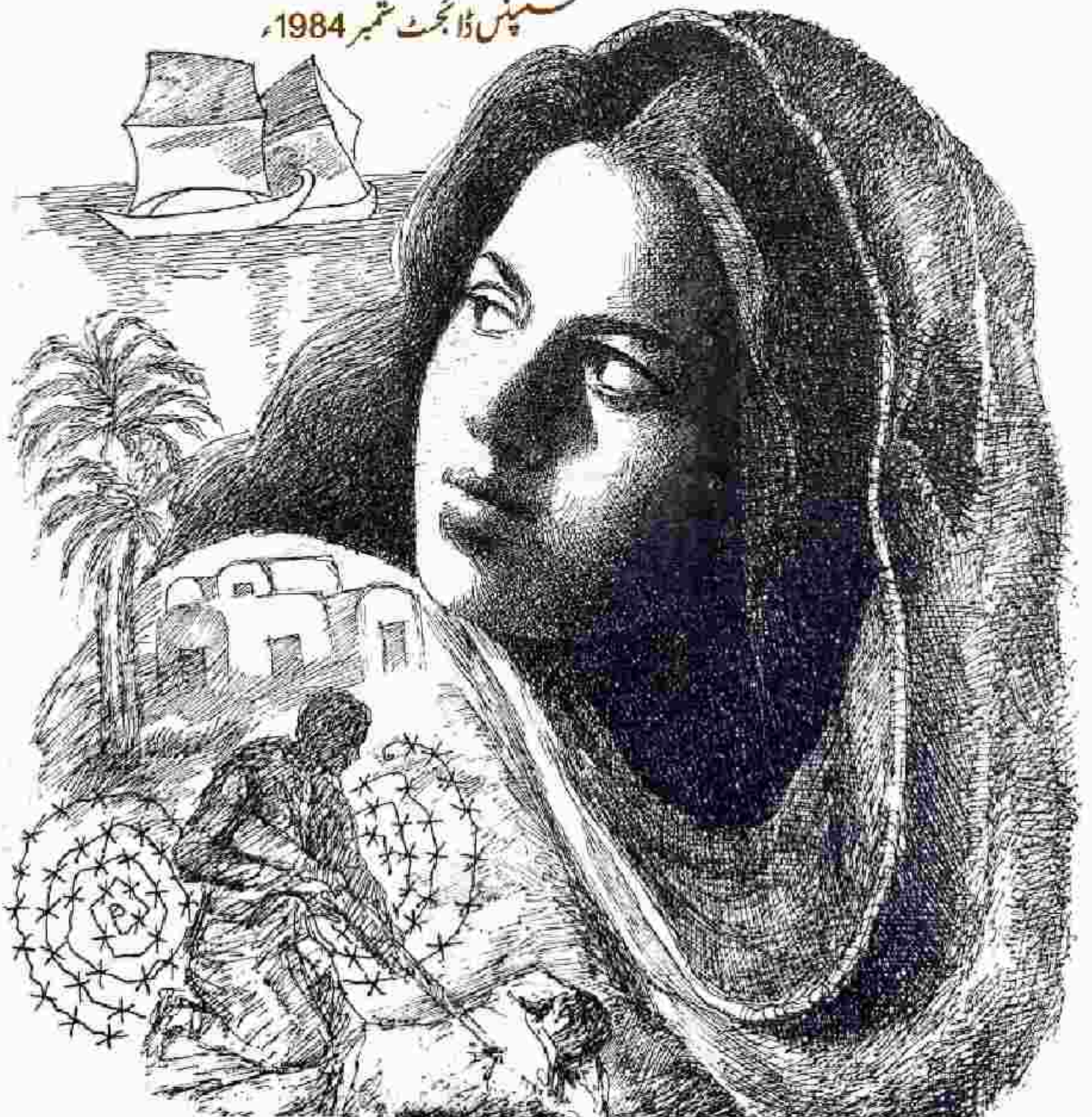
منشو دادا نے ٹارچ روشن کرتے ہوئے پھر ایک بار سکندر حیات کو دیکھا۔ اس کا خیال تھا، لاش پھر حرکت کر سکتی ہے۔ لیکن اب وہ ہمیشہ کے لیے ساکت ہو گیا تھا۔ پھر اس نے ٹارچ کی روشنی کو دوسری طرف پھینکا۔ اِدھر اُدھر کئی لاشیں پڑی ہوئی تھیں اور وہ لاشیں منشو دادا کے ساتھیوں کی تھیں۔ سکندر حیات نے ایک ہی برسٹ میں کتنوں کو مار گرایا تھا۔

اس نے پھر نفرت سے سکندر حیات کو گالی دی۔ اسے خیال آیا۔ اس کے دو ساتھی گاڑی کے دوسری طرف گئے تھے۔ تاکہ خسرو کے کمپارٹمنٹ کے دوسرے دروازے کو کھول سکیں۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو آواز دی "جاوید! تم کو تھائے ؟"

اسے جواب نہیں ملا۔ اس نے دوسرے ساتھی کو آواز دی "وکرم! تم جواب دو۔"

یہ کہہ کر وہ چپ ہوا۔ کان لگا کر سننے لگا۔ اسے اپنے ساتھیوں میں نہ تو جاوید کی آواز سنائی دی۔ نہ ہی وکرم نے جواب دیا۔ وہ پریشان ہو گیا۔ چاروں طرف گھوم کر ٹارچ روشن کرتے ہوئے دیکھنے لگا۔ دوستوں میں سے کوئی نہیں رہا تھا۔ ویسے دشمن بھی کوئی نہیں تھا۔ وہ پھر فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ کے سامنے آگیا۔ زور سے چیخ کر بولا "خسرو! تم کو لاسٹ وارننگ دیتے تھی۔ وار جا کھلے داؤ (خسرو تمھیں آخری وارننگ دے رہا ہوں دروازہ کھول دو)۔"

فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ کی کھڑکی کے شگاف میں ایک رائفل پھنسی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے اس کے ایک ساتھی نے رائفل سے ضربیں لگا لگا کر کھڑکی میں اس حد تک سوراخ کر دیا تھا کہ اس کے اندر رائفل کی نالی ڈال کر فائر کر سکے اور اس کے ساتھی نے فائر کیا تھا لیکن اچانک باہر سے مخالفانہ فائرنگ کی زد میں آکر گر پڑا تھا۔ رائفل وہیں اٹکی رہ گئی تھی۔ منٹو دادا نے ذرا دیر اپنی بات کے جواب کا انتظار کیا۔ پھر تڑا تڑ فائرنگ شروع کر دی۔ اسٹین گن سے نکلی ہوئی گولیاں کمپارٹمنٹ کی دیواروں سے ٹکرا رہی تھیں۔

پھر فائرنگ بند ہو گئی۔ وہ گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ غصے سے ہانپنے لگا۔ ذرا دیر بعد اس نے کان لگا کر سنا کسی عورت کے رونے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ پہلے یہ سمجھ میں آیا کہ کمپارٹمنٹ کے اندر خسرو کے ساتھ والی وہ حسین لڑکی رو رہی ہے شاید اسے گولی لگی ہو۔ پھر وہ چونک گیا۔ رونے کی آواز کمپارٹمنٹ کے اندر سے نہیں بلکہ کھلی فضا سے آرہی تھی۔ اسی سنگِ میل کی طرف سے جہاں وہ لاش پڑی ہوئی تھی۔ منٹو دادا نے فوراً ہی ٹارچ روشن کر کے دیکھا۔ وہاں سنگِ میل کے پاس ایک عورت بیٹھی ہوئی دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ اس نے سکندر کے سر کو اپنے سینے پر رکھ لیا کبھی ممتا بھرے انداز میں اسے سہلا رہی تھی اور کبھی یوں چوم رہی تھی جیسے بیٹے کی لاش کو آخری بوسہ دے رہی ہو۔ پھر وہ آسمان کی طرف منہ اٹھا کر زور زور سے کہنے لگی "آمیاں اے کیا ہورہا ہے۔ محوبت کرنے والڑے ترا ڑ یا کرنے والڑے مزا کیوں پاڑتے ہیں (اللہ میاں یہ کیا ہو رہا ہے محبت کرنے والے، توبہ کرنے والے سزا کیوں پاتے ہیں ؟)"

منٹو دادا ایک ہاتھ میں اسٹین گن اور دوسرے میں ٹارچ پکڑے ہوئے شدید حیرانی سے اس عورت کی بولی سن رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار ایسی بھاشا سننے میں آئی تھی۔ وہ سوچنے لگا آخر یہ کون سی زبان بول رہی ہے ؟ بارش کا زور کم ہو گیا تھا۔ وہ ماتم کرنے والی بھیگ رہی تھی اور رو رہی تھی۔ اس نے ذرا آگے بڑھ کر ڈانٹتے ہوئے پوچھا "اے تم کی بولتے چھو؟ (اے تم کیا بول رہی ہو ؟) یہ کس دیش کی بھاشا ہے ؟"

اس کی بات ختم ہوتے ہی پیچھے سے آواز سنائی دی۔ "بالٹ۔ ذرا بھی حرکت کی تو ابھی زمین پر تڑپتے ہوئے نظر آؤ گے۔"

منٹو دادا جیسا تھا، ویسا ہی ساکت رہ گیا پھر حکم دیا گیا۔ "اپنی اسٹین گن ایک طرف پھینک دو۔"

وہ ہچکچانے لگا۔ سختی سے کہا گیا "اب تم نے حکم کی تعمیل نہ کی تو گولی چل جائے گی۔"

اس نے فوراً ہی اسٹین گن کو پھینکتے ہوئے کہا "تم بنگالی بھاشا بول رہے ہو۔ اپنے ہی آدمی ہو پھر یہ دشمنی کیسی ؟"

"تم نے ٹھیک سمجھا۔ میں بنگالی ہوں۔ میرا نام کلیم الدین بھوئیاں ہے۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو گھر کے ہوتے ہیں نہ گھاٹ کے۔ میں ان بہت سے بنگالیوں میں سے ایک ہوں جنھوں نے حکومتِ پاکستان سے وفاداری کی۔ میرے والد علیم الدین بھوئیاں ایک معزز جج تھے۔ حکومتِ پاکستان کے قوانین کا احترام کرتے تھے۔ حکمران چلے گئے۔ ہم حرام موت مرنے کے لیے رہ گئے ہیں۔"

منٹو دادا نے مسکرا کر کہا "پھر تو تم قابلِ رحم ہو۔ میں تمھیں اپنا دوست، اپنا بھائی کہتا ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے وہ ٹارچ کی روشنی کے ساتھ پلٹنا چاہتا تھا۔ کلیم الدین بھوئیاں نے ڈانٹ کر کہا "خبردار! اپنی جگہ سے حرکت نہ کرنا۔ ٹارچ کی روشنی زمین کی طرف رکھو اور میری طرف گھوم جاؤ۔ یاد رہے روشنی جیسے ہی میرے منہ پر آئے گی میں فائر کر دوں گا۔"

اس نے چپ چاپ حکم کی تعمیل کی۔ ٹارچ کی روشنی کو زمین پر رکھا۔ اس کی طرف گھوم کر دیکھا۔ کلیم الدین بھوئیاں ریل کی پٹڑی پر بیٹھا ہوا تھا۔ بوگی کے ایک آہنی پہیے سے ٹیک لگائے ہوئے تھا۔ اس کے ہاتھوں میں اسٹین گن تھی اور اس کا رخ ٹارچ والے کی طرف تھا۔ اس نے کہا "ابھی تم اس عورت سے پوچھ رہے تھے کہ وہ کس دیش کی بھاشا بول رہی ہے ؟ کیا تم اس کی ٹوٹی ہوئی زبان نہیں سمجھ سکتے ؟ اگر ہم ذہن سے
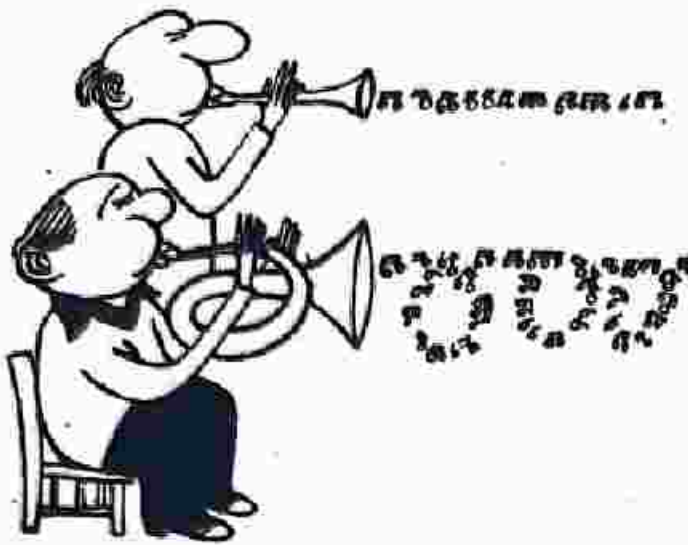
کوئی نہیں سمجھ سکتا تو پھر یہ زبان اس کے منہ میں کس نے رکھی ہے؟ یہ زبان جانوروں کی سمجھ میں بھی نہیں آسکتی۔ کچھ میں نہیں آتا ہم انسان کیا ہیں؟ ہم طوطے مینا کو بولنا سکھاتے ہیں اور کبھی بولنے والی مینا کی زبان کاٹ کر پھینک دیتے ہیں۔ ہم آخر کیا ہیں؟"

"ہاں۔ یہ بات بڑی افسوسناک ہے لیکن دوست! ہم نے تو اس کی زبان نہیں کاٹی ہے۔"

بھٹویاں نے چیخ کر کہا۔ "ہم نے کاٹی ہے۔ ہم سب نے کاٹی ہے جس کے پاس ہتھیار ہے، اس نے کاٹی ہے۔ میں کہتا ہوں، تمام لوگوں سے ہتھیار چھین لو۔ کسی کے پاس ایک چاقو تک نہ رہے تو آدمی کتنا لڑے گا؟ — لڑے گا تو کتے کی طرح بھونکے گا یا بلی کی طرح پنجے مارے گا پھر صبر کر کے رہ جائے گا۔ یہ ظلم، یہ غیرانسانی سلوک تو کسی کے ساتھ نہیں ہو سکے گا۔"

"تم درست کہتے ہو۔ کیا میں اپنی گن اٹھا لوں؟"

"ویسے ہی کھڑے رہو۔ تم نے یہ نہیں پوچھا کہ وہ عورت جس کے لیے رو رہی ہے۔ وہ اس کا کون ہے؟"

"جانے بھی دو۔ وقت ضائع ہو رہا ہے۔ یہاں اگلے یا پچھلے اسٹیشن سے لوگ آجائیں گے۔"

"آنے دو پہلے سن لو۔ جس کو تم نے گولی ماری ہے۔ وہ میرا چند لمحوں کا ساتھی رہا ہے لیکن جیسے صدیوں سے ہمارا ساتھ رہا تھا۔ میں چلتی ہوئی مال گاڑی سے گرنے والا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر ویگن کے اندر کھینچ لیا۔ میری جان بچائی۔ اس کا قرض مجھ پر ہے۔ تم بتاؤ کیا مجھے وہ قرض نہیں اتارنا چاہیے؟"

منشو دادا نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ "ہاں اگر مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ تمہارا محسن رہ چکا ہے۔"

"اگر معلوم ہوتا تو میرے محسن کے ہاتھوں راضی خوشی گولی کھا کر یہاں اپنے ساتھیوں کے ساتھ لیٹ جاتے؟ بکواس مت کرو۔ میں جو کہہ رہا ہوں سنو۔ یہ جو عورت ہمارے سامنے رو رہی ہے، اس سے ہمارا خون کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ مجھے اور سکندر کو یہ اچانک ایسے مل گئی جیسے راستے میں روپے سے بھری تھیلی مل جائے۔ ہم نے اسے بٹوارے کا مال سمجھ لیا۔ میں اسے بنگالی کہہ کر اپنانا چاہتا تھا اور سکندر اسے بہاری سمجھ کر اپنی ملکیت بنانا چاہتا تھا لیکن یہ دونوں سے راضی تھی۔ عورت ایک سے راضی ہو تو محبوبہ۔ دو چار سے راضی ہو تو بہن اور سبھی سے راضی ہو تو ماں کہلاتی ہے۔ وہ دیکھو جو عورت ہمارے تنازعہ کا باعث تھی، وہ ہم میں سے ایک پر ماں کی طرح آنسو بہا رہی ہے!"

خسرو نے اپنے کمپارٹمنٹ کے دروازے کو آہستگی سے ذرا کھول دیا تھا۔ اسے اطمینان ہو گیا تھا کہ سارے دشمن مارے گئے ہیں۔ صرف منشو دادا کی آواز آ رہی تھی لیکن اب اس کی آواز میں رعب اور دبدبہ نہیں تھا۔ وہ بھٹویاں کے سامنے مجبور اور بے بس ہو گیا تھا۔ خسرو کے جی میں آیا کہ بھٹویاں کو دوستانہ انداز میں مخاطب کرے۔ وہ اسے آواز دینا چاہتا تھا۔ پھر رک گیا۔ کیونکہ کمپارٹمنٹ کے نیچے ریلوے لائن کے پاس ایک ہلکی سی آواز سنائی دی تھی جیسے کوئی چیز حرکت کر رہی ہو۔

اس نے تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر پوری توجہ سے دیکھا۔ کوئی سایہ سا — ٹرین کے نیچے سے نکل رہا تھا۔ پہلے وہ رینگ کر باہر آیا پھر آہستگی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا — اس کے ہاتھ میں ہتھیار تھا۔ اس نے ادھر ایک قدم بڑھایا جدھر سے کلیم الدین بھٹویاں کی آواز آ رہی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ منشو دادا کا آدمی تھا اور بھٹویاں پر پیچھے سے حملہ کرنا چاہتا تھا لیکن ایک قدم بڑھنے کے بعد پھر سوچ میں پڑ گیا تھا۔

سوچنا کیا تھا۔ اس کے منشو دادا کی جان خطرے میں تھی کچھ تو کرنا ہی تھا۔ اس لیے اس نے دوسرا قدم بڑھایا۔ اسی لمحے خسرو نے یکبارگی اس پر چھلانگ لگا دی۔ اس طرح کہ اس کے دونوں بازو اس کی گرفت میں رہیں تاکہ وہ ہتھیار کو استعمال نہ کر سکے۔ صحیح پلاننگ کے ساتھ صحیح وقت پر عمل کیا جائے تو ناکامی نہیں ہوتی۔ خسرو اس سے لپٹ کر ایک طرف گرتا ہوا ڈھلان سے لڑھکتا ہوا پانی میں چلا گیا۔

کلیم الدین بھٹویاں نے لڑنے جھگڑنے کی آواز سن کر فوراً ہی اسٹین گن کا رخ ادھر کیا۔ بھٹویاں کے پینترا بدلتے ہی منشو دادا نے اپنی اسٹین گن کی طرف چھلانگ لگائی۔ پینترا بدلنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔ تڑ تڑ تڑ تڑ کی مسلسل فائرنگ ہونے لگی۔

اس کے ساتھ ہی منتو دادا کی چیخیں گونجنے لگیں۔ وہ گولیوں کی زد میں آکر ذرا دور لڑھکتا ہوا گیا پھر زمین پر گر کر ساکت ہو گیا
دوسری طرف سے خسرو نے لڑتے ہوئے چیخ کر کہا۔
"بھٹویاں ادھر فائر نہ کرنا۔ میں دشمن سے نمٹ لوں گا۔"
کلیم الدین بھٹویاں نے ٹارچ زمین پر سے اٹھالی۔ اسے لے کر ٹرین کے نیچے آیا۔ پھر ایک آہنی پہیے کے پیچھے چھپ کر ٹارچ کی روشنی اُدھر پھینکی۔ اس روشنی میں دو قد آور نوجوان لڑتے ہوئے دکھائی دیے۔ ان میں سے خسرو کون تھا' یہ کلیم الدین بھٹویاں نہیں جانتا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا۔
خسرو سے لڑنے والا کسی طرح کم نہیں تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں میں آخری آدمی تھا جو اپنی زندگی کے لیے لڑ رہا تھا۔ اس لیے مر جانا چاہتا تھا یا مار ڈالنا چاہتا تھا۔ جس وقت خسرو نے اس پر چھلانگ لگائی تھی' اسی وقت اس کے ہاتھ سے ہتھیار نکل گیا تھا۔ ورنہ اتنی دیر تک ہاتھا پائی نہ ہوتی۔
خسرو کو بھی نین تارا کے ساتھ ایک نئی زندگی ملی تھی۔ اتنے سارے دشمنوں میں گھر جانے کے بعد بچنے کی امید نہیں تھی۔ اب امید ہو چلی تھی۔ وہ بھی اپنی جان کی بازی لگا رہا تھا۔ دونوں میں کبھی مکّے بازی ہو رہی تھی۔ کبھی کشتی کا داؤ آزمایا جا رہا تھا۔ کیچڑ اور پانی میں لت پت ہو رہے تھے۔ کبھی اٹھ رہے تھے کبھی گر رہے تھے۔ پھر کلیم الدین بھٹویاں نے للکار کر کہا "رک جاؤ۔ ورنہ میں گولی چلاؤں گا۔"
خسرو رک گیا لیکن دوسرے نے دھمکی سنتے ہی کھیتوں کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ ٹارچ کی روشنی جہاں تک جا رہی تھی وہاں تک وہ گرتا پڑتا بھاگتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ پھر وہ روشنی کی حد سے آگے نکل گیا۔ تاریکی میں گم ہو گیا۔ اس نے ٹارچ روشن رکھی تاکہ بھاگنے والا دہشت میں مبتلا رہے اور روشنی کی طرف واپس نہ آئے۔
کمپارٹمنٹ کے کھلے ہوئے دروازے پر نین تارا کھڑی ہوئی تھی اور روشنی میں خسرو کو اپنی طرف آتے دیکھ رہی تھی۔ وہ بارش میں بھیگ رہا تھا اور اپنے کپڑوں سے کیچڑ کو صاف کرتا آ رہا تھا۔ بارش میں غسل بھی ہو رہا تھا۔ پھر ٹارچ کی روشنی اُدھر سے سرک گئی تیزی سے سِمٹتے ہوئے گونگی تک پہنچ گئی۔ نین تارا بہت دیر سے گونگی کے متعلق بھٹویاں کی زبان سے سنتی رہی تھی۔ اسے ٹارچ کی روشنی میں دیکھتے ہی کمپارٹمنٹ سے باہر آگئی۔ سیڑھی سے اتر کر اُدھر بھاگی۔ کلیم الدین بھٹویاں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر ایک لڑکی کو دیکھ کر مطمئن ہو گیا۔
اس نے ٹارچ کی روشنی میں اسے گونگی تک پہنچا دیا۔
نین تارا اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ گونگی کے آنسو تھم گئے تھے۔ وہ سکندر کی لاش کے سرہانے سوگوار بیٹھی ہوئی تھی۔ نین تارا نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا "بہن! میں تمہارے دُکھ کو سمجھتی ہوں۔ اس لیے کہ میں بھی دُکھ ہی دُکھ اٹھاتی آ رہی ہوں۔ آؤ میرے ساتھ چلو۔ تم بہت دیر سے بھیگ رہی ہو۔"
کچھ مسافر اپنے اپنے کمپارٹمنٹ سے باہر آگئے تھے۔ جو کچھ ہو رہا تھا' اس پر تبصرے کر رہے تھے۔ کلیم الدین بھٹویاں اور خسرو کی تعریفیں کر رہے تھے۔ جس محافظ سپاہی نے ہتھیار پھینکا تھا' وہ اپنی صفائی میں بیان دے رہا تھا۔ خسرو نے کہا "کوئی بات نہیں حالات بڑے بڑوں کو مجبور کر دیتے ہیں۔ جب ملکوں کی فوجیں ہتھیار ڈال دیتی ہیں تو تم ویسے بھی ایک تنہا سپاہی تھے۔ بھلا کیا کر سکتے تھے؟"
نین تارا گونگی کو اپنے کمپارٹمنٹ میں لے آئی۔ وہاں اور زیادہ تاریکی تھی لیکن جانتی تھی کہ کون سی چیز کہاں ہے۔ اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر برتھ پر بٹھاتے ہوئے کہا "یہاں بیٹھو اور مجھے کسی طرح بتاؤ کہ تم کون ہو؟ کہاں جانا چاہتی ہو؟ یہاں ان لوگوں کے ساتھ کہاں سے آ رہی تھیں؟"
اس نے جواب میں وہی "ڑ" والی بولی شروع کی' مجبور تھی۔ کٹی ہوئی زبان سے ڑ کا حرف زیادہ ادا ہوتا تھا۔ سنتے وقت یوں لگتا تھا جیسے خالی ہانڈی میں چھوٹے چھوٹے پتھر ڈال کر اسے ہلایا جا رہا ہے اور گڑبڑ گڑبڑ سی آواز سنائی دے رہی ہے۔
نین تارا نے گہری ہمدردی سے اس کے ہاتھ کو تھام لیا۔ پھر اس ہاتھ کو اپنے سینے سے لگا کر بولی "آہ! کس ظالم نے تمہاری زبان چھین لی ہے تم ایسی بدنصیب ہو کر اپنا دکھڑا بھی نہیں رو سکتیں۔ کیا تم لکھنا پڑھنا جانتی ہو؟"
گونگی نے انکار میں سر ہلایا لیکن تاریکی میں اس کا انکار دکھائی نہیں دیا۔ باہر اچانک لوگوں میں ہلچل پیدا ہو گئی۔ دور سے روشنی نظر آ رہی تھی۔ ٹرین کا جو اگلا حصہ کٹ کر اگلے اسٹیشن تک پہنچ گیا تھا۔ وہ واپس آ رہا تھا۔ کتنے ہی کمپارٹمنٹ کے کھلے ہوئے دروازے اور کھڑکیوں سے ٹارچ کی روشنیاں پھینکی جا رہی تھیں۔ ان روشنیوں میں مسلح فوجی نظر آ رہے تھے۔ ذرا قریب پہنچنے پر للکار کر کہا گیا "خبردار! اگر یہاں مجرمانہ کارروائی جاری ہے تو حکم دیا جاتا ہے' ہتھیار پھینک دیے جائیں۔"
وہ گاڑی قریب آکر رک گئی۔ لوگوں نے ہاتھ ہلا ہلا کر

یقین دلایا کہ اب یہاں کوئی غنڈہ بدمعاش نہیں رہا ہے۔
فوجی گاڑی سے اتر کر ان کی طرف آئے پھر ان کے بیانات سننے لگے۔ اس دوران گاڑی کو کٹے ہوئے حصے سے جوڑا جا رہا تھا۔ تھوڑی سی دیر میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک تمام کمپارٹمنٹ روشن ہوگئے۔

نین تارا نے پہلے اسے ٹارچ کی روشنی میں سرسری طور پر دیکھا تھا۔ کمپارٹمنٹ روشن ہوتے ہی اسے تفصیل سے دیکھا پھر بولی "معلوم ہوتا ہے کئی دنوں سے تمہیں غسل کرنے کا موقع نہیں ملا۔ دیکھو تو کیسی حالت ہوگئی ہے۔ کپڑے بھی پہننے کے قابل نہیں رہے۔ میرے پاس ساڑھی، بلیٹی کوٹ اور بلاؤز ہے۔ تمہارا بدن مجھ سے بھاری ہے مگر کام چل جائے گا۔"

اس نے اپنی اٹیچی کھولی پھر اس میں سے ساڑھی، بلیٹی کوٹ اور بلاؤز نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "اسے لے کر غسل خانے میں چلی جاؤ۔ خوب اچھی طرح رگڑ رگڑ کر بدن صاف کرو۔ اگلے اسٹیشن پر تمہیں گرما گرم چائے پلاؤں گی۔ کیا تم نے کچھ کھایا ہے؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا پھر کپڑے لے کر وہاں سے اٹھ گئی۔ ٹوائلٹ کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ اسی وقت باہر کچھ شور سنائی دیا۔ لوگ اونچی آوازوں میں کچھ بول رہے تھے۔ نین تارا نے کھڑکی کے پاس آکر دیکھا۔ معلوم ہوا، وہ لوگ کسی کو تلاش کر رہے ہیں۔ کوئی کہہ رہا تھا۔

"ابھی تو وہ یہاں تھا۔"

دوسرے نے کہا "ہاں، جب یہ گاڑی آکر ہماری بوگی سے لگی، اس وقت میں نے بھی دیکھا تھا۔ اس کے بعد وہ دکھائی نہیں دیا۔"

خسرو نے کہا "تعجب ہے۔ وہ ہمارا محسن تھا، مجرم نہیں تھا۔ پھر کہاں چھپ گیا؟"

کچھ لوگ مسلح فوجیوں کے ساتھ ٹرین کے آس پاس آگے پیچھے، ذرا دور تک جا کر اسے تلاش کر رہے تھے لیکن وہ کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔

کلیم الدین بھٹویاں دوڑتے دوڑتے تھک گیا، نڈھال سا ہو کر ذرا آہستہ چلنے لگا۔ کہیں کیچڑ، کہیں گھٹنے تک پانی اور کہیں گہرے گڑھے تھے۔ وہ گرتا تھا۔ سنبھلتا تھا۔ اٹھتا تھا پھر بھاگنے لگتا تھا۔ وہ کبھی بھاگتے ہوئے، کبھی چلتے ہوئے ٹرین سے بہت دور چلا آیا۔ اندھیرے میں نہ اسے ٹرین نظر آرہی تھی اور نہ وہاں کے مسافر اسے دیکھ سکتے تھے۔ البتہ کمپارٹمنٹ کی روشنیاں جگنو کی طرح ننھی ننھی سی نظر آرہی تھیں۔ وہ تھک ہار کر ایک جگہ بیٹھ گیا۔

اس کی تقدیر میں بھاگتے رہنا، چھپتے رہنا لکھا ہوا تھا۔ جب اس ٹرین کا اگلا حصہ اپنے پچھلے کٹے ہوئے حصے سے لگنے کے لیے واپس آرہا تھا۔ تبھی وہ سمجھ گیا تھا کہ بی ڈی آر کے مسلح سپاہی بھی آرہے ہوں گے۔ دیناج پور سے لے کر یہاں تک جتنے بھی بی ڈی آر اور مکتی باہنی کے جوان تھے، ان سے ڈر لگا رہتا تھا کہ کہیں وہ پہچان نہ لیا جائے۔ کلیم الدین بھٹویاں جیسے جج کے فیملی ممبران کو بہت سے لوگ جانتے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ وہ پوری فیملی حکومت پاکستان کی وفادار رہی تھی۔ انھوں نے بنگالیوں کی "سادھینتا سنگرام" (آزادی کی تحریک) کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ اس لیے غدار ٹھہرائے گئے تھے اور اب بھٹویاں کو اس کی سزا مل رہی تھی۔ جب تک وہ بنگلہ دیش کے اس شمالی حصے سے نکل کر ڈھاکا یا چٹاگانگ کی طرف نہ چلا جاتا، اس وقت تک پہچان لیے جانے کا دھڑکا لگا رہتا۔

اگر زندگی خالی، ویران اور بے کیف ہو تو مرنے سے ڈر نہیں لگتا اور اسی زندگی میں ذرا سی رنگینی پیدا ہو جائے، کہیں سے محبت کا ایک پھول کھلنے لگے تو مر مر کے بھی زندہ رہنے کو جی چاہتا ہے۔ اس وقت وہ بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ لیکن تاریکی میں اس کے سامنے گونگی کا چہرہ روشن تھا۔ کیسی پرکشش تھی۔ معلوم ہوتا تھا، زندگی ایک گونگے حسن کے روپ میں اسے للچانے اور حسنِ حیات کے لیے لڑتے رہنے کا حوصلہ دینے آئی تھی۔

ہاں، آئی تھی لیکن وہ اس سے بچھڑ کر دور چلا آیا تھا اور نہ جانے کتنی دور جا رہا تھا۔ اس کے دل سے ایک آہ نکلی۔ اس نے زیرِ لب کہا "شاید کل ایسا ہی کوئی وقت تھا، جب وہ ملی تھی صرف چوبیس گھنٹے کا ساتھ رہا۔ میری جا ہمسفر! تم کون تھیں؟ کیا تھیں؟ کہاں سے آئی تھیں؟ اور اب آ کر میرے دل سے کیوں نہیں جا رہی ہو؟"

اس نے سر اٹھا کر سوچا۔ اس کا نام کیا تھا۔ ہاں اس نے بتایا تھا "اورمعا" پتا نہیں یہ کیا نام ہے۔ سمجھ میں تو نہیں آیا مگر یہ نام بھی دل میں دھڑکتا ہے۔ نام کوئی سا ہو۔ سمجھ میں آتا ہو یا نہ آتا ہو۔ اگر وہ نام محبت کی زبان سے ادا ہوتا ہے تو زبان کاٹنے کے بعد بھی خوشبو کی طرح حواس پر چھا جاتا ہے۔ پھول کی پتی پتی کاٹی جا سکتی ہے۔ لیکن آج تک خوشبو کو کوئی نہ کاٹ سکا۔

وہ تھکن سے چور ہو کر وہاں بیٹھا تھا پھر محبت سے

چکتا چور ہوکر وہاں سے اٹھ گیا۔ اس نے حسرت بھری نظروں سے دور ٹرین کی طرف دیکھا۔ اس کے بعد سر جھکا کر دوسری طرف گھوم گیا۔ بوجھل قدموں سے جانے لگا۔ اس کے چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔ اس کے باوجود وہ اندھیرے کا مسافر نہیں تھا۔ اس کے سامنے وہ گونگا چہرہ روشن تھا اور دور تک راستہ دکھائی دے رہا تھا۔

ٹرین چل پڑی۔ خسرو ایک بی ڈی آر کے آفیسر کے ساتھ کمپارٹمنٹ کے اندر آگیا۔ پھر اس نے نین تارا کو تنہا دیکھ کر پوچھا "وہ عورت کہاں ہے؟"

"غسل خانے میں ہے۔"

"یہ آفیسر اس کا بیان لینا چاہتے ہیں۔ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ وہ کہاں سے آئی ہے اور اس کے ساتھ کون لوگ تھے؟"

نین تارا نے کہا "لیکن وہ تو..."

خسرو نے بات کاٹ کر کہا "میں آفیسر سے کہہ چکا ہوں اس کی بولی کسی کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ وہ گونگی ہے۔"

"اسے گونگی نہ کہو، وہ زبان والی تھی۔ کسی نے اس کی زبان کاٹ دی۔"

آفیسر نے کہا "ہمارے دیش میں لوگ جانور بن گئے ہیں۔ پتا نہیں ہم لوگ کس طرف جارہے ہیں؟ ہماری منزل کہاں ہے؟"

آفیسر نے برتھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نین تارا سے کہا "آپ بیٹھیں۔"

وہ برتھ کے ایک سرے پر بیٹھ گئی۔ گاڑی تیز رفتاری سے چل رہی تھی۔ خسرو اور آفیسر کلیم الدین بھوتیاں کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔ اس کے اچانک غائب ہونے پر طرح طرح کی قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔ خسرو نے کہا "ہم کسی طرح معلوم نہیں کرسکتے کہ یہ عورت ان دو جوانوں کے ساتھ کہاں سے آرہی تھی کیونکہ ایک مارا گیا ہے اور دوسرا فرار ہوگیا۔ تیسری جو ہمارے پاس ہے۔ وہ بے زبان ہے۔"

آفیسر نے پوچھا "کیا وہ عورت بہاری ہے؟"

خسرو نے انکار میں سر ہلا کر کہا "میں نہیں جانتا۔"

نین تارا نے کہا "وہ کچھ بول نہیں سکتی ہے اور میں کسی طرح پوچھ نہ سکی۔"

گاڑی اگلے اسٹیشن پر پہنچ کر رک گئی۔ نین تارا نے حیرانی سے ٹوائلٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ایک گھنٹے سے زیادہ ہوگیا ہے۔ یہ غسل کرنے گئی ہے اور ابھی تک نہیں نکل رہی ہے۔"

آفیسر نے کہا "اسے اب تک باہر آجانا چاہیے۔ دروازے پر ناک کرو۔"

خسرو نے آگے بڑھ کر دستک دی مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے آفیسر کو اور نین تارا کو دیکھا۔ نین تارا فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے پر آئی۔ زور زور سے دستک دینے لگی۔ اسے آوازیں دینے لگی "سنو! کیا تم سن رہی ہو؟ وہاں کیا کر رہی ہو؟ بہت دیر ہوچکی ہے۔ باہر آؤ یا ہمیں اپنی آواز سناؤ۔"

تقریباً دو منٹ کی چیخ و پکار کے بعد اندر سے اس کی اوں آں سنائی دی۔ نین تارا نے دروازے سے کان لگا کر سنا۔ وہ کچھ گڑبڑ گڑبڑ بول رہی تھی۔ اس نے خسرو سے کہا "تم اُدھر چلے جاؤ۔ میں دروازہ کھلواتی ہوں۔"

وہ چلا گیا۔ نین تارا نے پھر دستک دے کر کہا "دروازہ کھولو۔ میں اندر آنا چاہتی ہوں۔"

دروازہ ذرا سا کھل گیا۔ نین تارا نے اندر جھانک کر دیکھا۔ وہ ابھی تک اپنے کیچڑ آلود لباس میں تھی۔ جو لباس اسے دیا گیا تھا۔ وہ واش بیسن پر رکھا ہوا تھا۔ گونگی کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے ابھی وہ نیند سے بیدار ہوئی ہو۔ نین تارا ٹوائلٹ کے اندر آگئی پھر اس نے پوچھا "تم اتنی دیر تک کیا کر رہی تھیں؟ تم نے غسل بھی نہیں کیا ہے؟"

وہ ٹوائلٹ کے فرش پر بیٹھ گئی۔ اپنی اداؤں سے اور اشاروں کی زبان سے بتانے لگی۔ ایک دیوار سے ٹیک لگا کر تھکن کے انداز میں کبھی اپنی کمر کو اور کبھی اپنے پاؤں کو ہولے سے دابنے لگی۔ اس کے بعد ایک طرف سر ڈھلکا کر آنکھیں بند کرلیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنی گڑبڑ زبان میں کچھ بولتی جا رہی تھی۔ نین تارا اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا "میں سمجھ گئی۔ شاید اس سے پہلے تمہیں کہیں سونے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس لیے تھکن کے مارے سو گئی تھیں۔ تم جلدی سے غسل کرلو۔ کپڑے بدل لو۔ پھر اوپری برتھ پر جا کر آرام سے سو جانا۔ کوئی تمہیں ڈسٹرب نہیں کرے گا۔"

وہ دونوں ہاتھ روم کے فرش پر سے اٹھ گئیں۔ نین تارا اسے سمجھانے کے بعد جانا چاہتی تھی۔ دروازہ کھول کر باہر نکلتے نکلتے رک گئی۔

ٹرین ابھی تک کسی اسٹیشن پر رکی ہوئی تھی۔ خسرو چاہتا

تھا۔ آفیسر اس کمپارٹمنٹ سے چلا جائے۔ نین تارا کا حسن ڈرا رہا تھا۔ وہ کھلنا سے لے کر یہاں تک یہی دیکھتا آرہا تھا کہ کمپارٹمنٹ کا دروازہ یا کھڑکی کھلتی تھی تو بی ڈی آر کے آفیسر یا دوسرے جوان بظاہر اس سے باتیں کرتے تھے لیکن چور نظروں سے نین تارا کو دیکھتے جاتے تھے۔ نکھیوں کو زیادہ سے زیادہ ہنکایا جا سکتا ہے لیکن مٹھاس کے آس پاس اڑنے سے روکا نہیں جا سکتا۔ وہ فوجی انھیں نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے۔ اگر نیت میں خرابی ہو تو ضروری نہیں ہے کہ عمل بھی خراب ہو جائے۔ کیونکہ تہذیب ہم انسانوں پر شرافت کا ڈی ڈی ٹی چھڑکتی رہتی ہے۔ ویسے ہم آج تک وہ جراثیم کش دوا ایجاد نہ کر سکے جو نیت کے جراثیم کو ہلاک کرتی ہو۔"

خسرو نے آفیسر سے کہا۔ "ہم سب کچھ سمجھ سکتے ہیں لیکن آدمی کی نیت کو سمجھ نہیں پاتے۔"

آفیسر نے پوچھا۔ "اس کا مطلب کیا ہوا؟"

خسرو کے سامنے تلسی رام اگروال کا چہرہ آگیا۔ وہ اسے جیجا جی کہتا تھا۔ اس کی بڑو دیدی کا وہ دھرم پتی تھا لیکن وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ نین تارا کے بارے میں اس کی نیت خراب ہوگی۔ اس نے کہا۔ "میرا مطلب یہ ہے کہ کھلنا میں میرے ایک بزرگ تھے۔ ہمارے لیے بڑے محترم تھے۔ ہم ان کی عزت کرتے تھے۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ میری بیوی پر بُری نیت رکھتے ہیں۔"

آفیسر نے اپنا ایک کان پکڑ کر کہا۔ "اللہ معاف کرے۔ یہ کتنی بُری بات ہے۔"

"بُری بات اس وقت ہوتی ہے جب نیت بُری ہوتی ہے۔ میں نے کہا نا ہم آدمی کی نیت کو سمجھ نہیں سکتے۔ میں جب سے اپنی بیوی کے ساتھ بھٹک رہا ہوں، بس یہی دھڑکا لگا رہتا ہے۔ سوچتا ہوں کس کی نیت جانے کیسی ہو؟"

آفیسر بے اختیار ٹوائلٹ کے بند دروازے کو دیکھنے لگا جس کے پیچھے دو عورتیں تھیں۔ ایک کے حسن کو وہ دیکھ چکا تھا۔ دوسری کو اس نے ابھی دیکھا نہیں تھا۔ اسے دیکھنے سے پہلے ہی وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ پھر کہنے لگا۔ "وہ بے چاری زبان کٹی ہے۔ میں بھلا اس سے کیا پوچھ سکوں گا اور وہ کیا جواب دے گی۔ خواہ مخواہ وقت ضائع ہوگا۔"

یہ کہتے ہی وہ پلٹ کر دروازے پر گیا۔ ہینڈل پر دباؤ ڈال کر اسے کھولتے ہوئے باہر جانے لگا۔ خسرو نے کہا۔ "آپ اچانک اٹھ کر جا رہے ہیں؟"

وہ پلیٹ فارم پر پہنچ گیا تھا۔ اس نے پلٹ کر کہا۔ "مجھے اچانک اپنی بیوی یاد آگئی۔ میں بھی جب اس کے ساتھ کہیں نکلتا ہوں تو لوگوں کی نگاہوں سے بہت گھبراتا ہوں اور یہ ہماری بڑی حماقت ہے۔ ہم میں جو برائی نظر آتی ہے ہم اسے ختم کر دیتے ہیں یا روک دیتے ہیں لیکن کسی کی نیت ظاہر نہیں ہوتی۔ اس لیے نہ ہم اسے سمجھ سکتے ہیں، نہ اپنی نیت سمجھا سکتے ہیں۔ لہٰذا ایسے وقت دانشمندی یہی ہوتی ہے کہ اس راستے سے کترا کر دوسری طرف نکل جائیں۔"

اس نے یہ کہا۔ پھر گھوم کر فوجی انداز میں چلتا ہوا دور ایک کمپارٹمنٹ میں چلا گیا۔ گاڑی آہستہ آہستہ رینگنے لگی۔ اس نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ اسی وقت نین تارا ٹوائلٹ کا دروازہ کھول کر باہر آئی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ لباس کہیں کہیں سے بھیگا ہوا تھا۔ وہ چہرے پر سے بکھری زلفوں کو ہٹاتے ہوئے برتھ پر بیٹھ گئی۔ پھر ہمدردی سے بولی۔ "بے چاری۔"

خسرو نے برتھ کے دوسرے سرے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا اس کے متعلق کچھ معلوم ہوا؟"

نین تارا نے انکار میں سر ہلایا پھر کہا۔ "یہ ضروری نہیں ہے کہ زبان سے کوئی دکھڑا سنائے تو اس کا دکھ معلوم ہو۔"

"ہم سب کے دکھ ایک جیسے ہیں۔ کسی کے کم ہیں، کسی کے زیادہ ہیں۔ میں اس کا دکھ نہیں، اس کی ہسٹری پوچھ رہا ہوں۔"

نین تارا نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ شاید حیا کا تقاضا پھر بھی پورا نہ ہوا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو چھپالیا۔ پھر آہستگی سے بولی۔ "خسرو! اس دورِ ابتلا میں سب کچھ پوچھنا کسی شریف زادی کی ہسٹری نہ پوچھنا۔"

خسرو کو چپ لگ گئی۔ تیز رفتاری سے دوڑتی ہوئی گاڑی کی کھٹ کھٹا کھٹ دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے گاڑی پٹڑی سے ہٹ کر سینے پر سے گزر رہی ہے۔ ان کے درمیان تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر خسرو نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہارے کپڑے تقریباً بھیگ گئے ہیں۔ دیکھو تو کیا حالت ہو رہی ہے۔ تم بھی غسل کر کے لباس تبدیل کر لو۔ ہم جلد ہی سید پور پہنچ جائیں گے۔"

وہ کھڑکی کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئی تھی۔ اس نے کہا۔ "وہ باہر آئے گی تو میں جا کر لباس بدل لوں گی۔"

خسرو کچھ کہنا چاہتا تھا۔ پھر رک گیا۔ اسی وقت ٹوائلٹ کا دروازہ کھل گیا تھا۔ وہ نگاہوں کے سامنے سرو قد کھڑی ہوئی تھی۔ پھول دار ساڑھی اس کے بدن پر لہروں سج رہی تھی جیسے

بیچ بیچ کہیں پھول کھل رہے ہوں اور کہیں کلیاں چٹکنے کو رہ گئی ہوں۔ ہری ہری بیلیں اوپر سے نیچے تک لہرا رہی تھیں۔ کہیں چھپ رہی تھیں، کہیں نکل رہی تھیں، کہیں ڈوب رہی تھیں، کہیں ابھر رہی تھیں۔ ساری باغ تھی، گونگی بہار تھی۔ دونوں مل کر باغ و بہار ہو گئی تھیں۔

نین تارا نے چونک کر خسرو کو دیکھا۔ ایسے وقت دنیا کی ہر عورت چوکنی ہو کر اپنے مرد کو دیکھتی ہے۔ خسرو اسے دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا تھا۔ ایک طرف ہٹ گیا تھا۔ تاکہ وہ برتھ پر آ کر بیٹھ جائے۔ نین تارا آگے بڑھ کر گونگی کے پاس پہنچی۔ اس کے لانبے بھیگے بال ساری کو بھگو رہے تھے اور جہاں جہاں ساری بھیگ رہی تھی، وہاں وہاں بدن سے چپک رہی تھی۔ وہ اس کے بالوں کو سمیٹ کر پانی نچوڑنے لگی۔ اس کے اُجلے چہرے پر بھی پانی کے قطرے شبنم کی طرح لرز رہے تھے۔ وہ ہرنی جیسی وحشت زدہ آنکھوں سے خسرو کو دیکھ رہی تھی، کبھی اس سے نظریں چرا رہی تھی پھر اس نے نین تارا کا ہاتھ تھام کر خسرو کی طرف آنکھ سے اشارہ کیا۔ نین تارا نے خسرو کی طرف دیکھا۔ پھر مسکرا کر بولی "یہ پوچھ رہی ہے، تم کون ہو؟"

اس نے کہا "میرا نام خسرو ہے۔ نعیم الدین خسرو اور یہ نین تارا ہے۔ میری شریکِ حیات۔"

نین تارا نے شرماتے، مسکراتے ہوئے اپنے سر کو جھکا لیا پھر خسرو نے گونگی سے پوچھا "تمہارا نام کیا ہے؟"

اس نے پہلے خسرو کو دیکھا۔ پھر نین تارا کو دیکھتے ہوئے بولی "اوڑما۔۔۔"

وہ دونوں سوالیہ نظروں سے اُوڑما کو دیکھنے لگے پھر نین تارا نے پوچھا "کیا تم اپنا نام بتا رہی ہو؟"

اس نے اثبات میں سر ہلا کر اپنے سینے پر انگلی رکھتے ہوئے کہا "اوڑما۔۔۔"

"بھلا یہ کیا نام ہوا؟"

"ہمیں سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ جہاں اس کی زبان تالو سے لگتی ہے وہاں کا حرف ادا نہیں ہوتا۔ 'ڑ' کی آواز نکلتی ہے۔ اس حساب سے سوچنا ہوگا کتنے نام ایسے ہیں جن کے آخر میں 'ما' آتا ہے۔"

وہ دونوں سوچنے لگے، آہستہ آہستہ کئی نام ذہن میں لا کر بڑبڑانے لگے پھر خسرو نے چونک کر کہا "عظمیٰ؟"

گونگی نے خوش ہو کر ہاں، ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ نین تارا نے کہا "اچھا تو تمہارا نام عظمیٰ ہے۔ چلو اوپر برتھ پر جا کر لیٹ جاؤ۔ تمہاری آنکھوں میں نیند بھری ہے۔ ہم منزل پر پہنچ کر تمہیں جگا لیں گے۔"

وہ نین تارا کے ساتھ برتھ کے پاس آئی۔ پھر اشارے سے سمجھایا کہ وہ اوپر سو نہیں سکے گی۔ لہٰذا نیچے والی برتھ پر سونا چاہتی ہے۔ نین تارا نے خسرو کی طرف دیکھ کر سوچا "اگر یہ نیچے سوئے گی تو خسرو کو اٹھنے بیٹھنے کی تکلیف ہوگی۔ ایک خیال آیا کہ کمپارٹمنٹ کے فرش پر چادر بچھا کر عظمیٰ کو سُلا دے لیکن عظمیٰ شاید خسرو کے سامنے آرام سے نہ لیٹ سکے" خسرو نے کہا "یہ جہاں کہتی ہے اسے سونے دو۔ ہم گزارا کر لیں گے۔"

وہ نیچے والی برتھ پر جا کر بیٹھ گئی۔ لیٹنے سے پہلے خسرو کی طرف دیکھا۔ ذرا شرماتے ہوئے، ذرا مسکراتے ہوئے نظریں جھکا لیں، اس کے بعد منہ پھیر کر لیٹ گئی۔ اب اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ویسے چہرہ نظر نہ آنے سے کیا ہوتا ہے۔ وہ سر سے پاؤں تک تو نظر آ ہی رہی تھی۔

نین تارا نے اس پر چادر ڈال دی۔ کیا بدلیاں پہاڑ کو چھپا سکتی ہیں؟ دیکھنے والوں کو بدلیوں میں چاند نظر آ جاتا ہے۔ خسرو نے کہا "میں اوپر جا کر سو جاتا ہوں۔ تم غسل کر کے لباس بدل لو۔"

نین تارا نے لوائلٹ کی طرف دیکھا، پھر خسرو کو دیکھا، پھر عظمیٰ پر نظر ڈالی۔ اس کے بعد عظمیٰ کے پائنتی برتھ پر بیٹھ گئی۔ آہستگی سے بولی "میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔"

❁

۱۹۴۷ء میں سید پور ایک بہت ہی چھوٹا سا قصبہ تھا۔ اس کی اہمیت محض ریلوے ورکشاپ کی وجہ سے تھی تقسیمِ ہند سے پہلے اس ورکشاپ کی بھی کوئی اہمیت نہ تھی۔ بہار اور مغربی بنگال میں ریلوے کے اتنے بڑے بڑے ورکشاپ تھے کہ ان کے سامنے سید پور اور پہاڑتلی کے ورکشاپ محض آٹو رکشہ ورکشاپ کی سی حیثیت رکھتے تھے۔

پاکستان وجود میں آیا تو بہاریوں کے وہ قافلے سید پور پہنچے جن میں ریلوے کے پینٹرز، کارپینٹرز، لوہار، ڈیزائنرز، انجینئر اور ہر شعبے کے ماہرین موجود تھے۔ انھوں نے بہار اور بنگال ریلوے حکام کی یہ خوش فہمی ختم کر دی کہ مشرقی پاکستان ریلوے کسی معاملے میں ان کی محتاج ہو سکتی ہے۔ یہ بہاری خاصی تعداد میں ہنرمند تھے اور خاصی تعداد میں ایسے لوگ بھی سید پور آئے تھے جو نوسرباز تھے۔ سڑک کے کنارے تین پتے کھلا کر راہگیروں کی جیب خالی کر دیتے تھے۔ دیوالی کی رات کو کروڑپتی اور ارب پتی ہندو لاکھوں روپے کا جوا کھیلتے ہیں۔ ان کے

عقیدے کے مطابق لکشمی دیوی ان کے گھر آتی ہے اور لکشمی دیوی کے ساتھ دولت گھر آتی ہے۔ سیدپور میں چند لکھ پتی مارواڑی تھے۔ انھوں نے ۱۹۴۸ء میں پاکستان کی سرزمین پر پہلی دیوالی منائی۔ دیوالی کی اس رات مسلمان جواری بھی کھیل میں شامل ہوئے۔ دوسری صبح چند مارواڑیوں نے حساب کیا تو پتا چلا، اس پہلی دیوالی میں بہاریوں نے ان کا دیوالیہ نکال دیا ہے۔ وہ ایک رات میں لاکھوں روپے ہار چکے تھے۔

ہندو بنیے سمجھ گئے تھے، یہ ہجرت کرکے آنے والے ہنرمند بھی ہیں اور چالاک بھی۔ جو بہاری سرمایہ لے کر ہندوستان سے آئے تھے، وہ ڈھاکہ، چاٹگام، کھلنا، بوگرہ اور پبنا جیسے شہروں میں اپنی اپنی کاروباری ذہانت کا سکہ بٹھانے لگے۔ اس کے باوجود ہندو بنیے صدیوں سے بنگال کی زمین میں اپنی جڑیں مضبوط کر چکے تھے۔ ہندو بنگالی ہوں یا مسلمان بنگالی، سبھی ان مارواڑیوں سے متاثر تھے۔ اُن کو اپنا اَن داتا سمجھتے تھے۔

بہاری بزنس مین اور ہندو بنیوں میں ایک بہت ہی واضح فرق تھا۔ ہندو صرف کاروبار ہی نہیں، سیاست بھی کرتے تھے۔ جبکہ بہاری سیاستداں کبھی نہیں رہے۔ قیام پاکستان سے لے کر آج تک کسی بہاری نے سیاسی لیڈر کی حیثیت سے کوئی نمایاں مقام حاصل نہیں کیا۔ البتہ محدود پیمانے پر مشرقی پاکستان کے بہاریوں کی راہنمائی کی اور جتنے بھی بہاری رہنما رہے، ان سب کا ایک ہی سیاسی اصول رہا اور وہ یہ کہ پاکستان میں سیاسی حکومت ہو یا فوجی حکومت، بہاریوں کو ہر حال میں پاکستان کا وفادار رہنا ہے۔ ان کا یہ اصول زندہ لہو ہے، جو آج بھی بنگلہ دیش کے محصور بہاریوں کی رگوں میں دوڑ رہا ہے۔

ہندو تاجروں نے سیاسی چالیں چلنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ قائداعظم محمد علی جناحؒ نے ڈھاکہ میں اپنی پہلی اور آخری تقریر کے دوران کہا تھا "پاکستان کی قومی زبان اردو اور صرف اردو ہوگی۔" اس تاریخی فیصلے پر بنگالی عوام نے کھل کر اعتراض نہیں کیا۔ اندر ہی اندر لاوا پکتا رہا اور اسے ہندوستانی تاجر اور سیاستداں پکاتے رہے۔ اس سلسلے میں کمیونسٹ پارٹی نے بھی اہم رول ادا کیا۔ ان دنوں روسی لٹریچر کا سیلاب آگیا تھا۔ ہر شہر ہر گاؤں کے بازار ہاٹ میں لسانی مسئلے پر کتابچے دستیاب ہو جاتے تھے۔ ان کتابچوں کے ذریعے سمجھایا گیا تھا کہ پاکستان میں اکثریت کی جو زبان ہے، اسی کو قومی زبان ہونا چاہیے۔ لیکن یہ ملک جب تک ناعاقبت اندیش سیاستدانوں اور مٹھی بھر سرمایہ داروں کی مٹھی میں رہے گا، تب تک عوام کی بھاری اکثریت سے ناانصافی ہوتی رہے گی۔

بعد میں ناعاقبت اندیش سیاستدانوں نے ایسے کتابچوں کی پیشگوئی درست ثابت کر دی جو بیس برس پہلے زبان کے معاملے میں بنگالی اکثریت کو نظرانداز کیا گیا تو ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں چھ نکات کی بنیاد پر بھاری اکثریت سے جیت کر انھوں نے پچھلی ساری ناانصافیوں کا بدلہ لے لیا۔

انسانی تاریخ دراصل ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ ہے۔ مورخین اپنے اپنے مشاہدات، مطالعے اور نظریات کا گوشت اس ڈھانچے میں بھرتے جاتے ہیں۔ اس پر تہذیب و ثقافت کی کھال منڈھتے ہیں۔ جب یہ ڈھانچہ مکمل جسم کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے تو اس کے منہ میں اپنی اپنی مادری زبان رکھ کر بولتے ہیں۔ اس کی رگوں میں بدلتی ہوئی حکومتوں کی بدلتی ہوئی پالیسیوں کا لہو دوڑاتے ہیں۔ جب پالیسیاں بدلتی ہیں تو تاریخ کے سیاق و سباق زیادہ نہیں تو تھوڑے بدلتے ہیں۔ اگرچہ تاریخ گزرے ہوئے واقعات کی سچی ترتیب کا نام ہے۔ تاہم ترتیب کی یہ سچائی مورخین کے ذریعے بدلتی ہے۔ پہلے چوبیس برس تک پاکستان اور بنگلہ دیش کی تاریخ ایک تھی۔ تاریخ نگار کے قلم ایک تھے۔ آج اسی بنگلہ دیش اور اسی پاکستان کے مورخین اپنے اپنے طور پر تاریخ کے ڈھانچے میں اپنے مشاہدات، مطالعے اور نظریات کا گوشت بھر رہے ہیں۔ اپنی تہذیب اور ثقافت کی کھال منڈھ رہے ہیں اور اب تاریخ کے منہ میں اپنی اپنی زبان رکھ کر بول رہے ہیں۔

۱۹۴۷ء میں سیدپور کی آبادی تقریباً پچیس ہزار تھی۔ ۱۹۷۰ء کے اوائل میں خاندانی منصوبہ بندی کے باوجود اس کی آبادی اسّی ہزار ہوگئی تھی پھر مارچ ۱۹۷۱ء کے بعد صرف ایک سال کے اندر اس کی آبادی پانچ لاکھ سے تجاوز کر گئی۔ آبادی کے اس حیرت انگیز اضافے کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ سیدپور میں فوجی چھاؤنی تھی۔ دوسرے یہ کہ وہاں بہاریوں کی آبادی تھی۔ ایک ایسا مضبوط قلعہ تھا جس میں پناہ لینے کے لیے آس پاس کے تمام شہروں کے بہاری بھاگے چلے آئے تھے۔

وہ ریل گاڑی سیدپور پہنچنے لگی۔ خسرو نے کہا "عظمٰی کو جگا دو۔ ہمارا سفر ختم ہو رہا ہے۔"

نین تارا نے اسے آواز دی۔ پھر ذرا وقفے سے دوسری بار اسے پکارا۔ اس کے بعد بولی "بے چاری کتنے دنوں سے بھٹک رہی تھی۔ جانے کب سے سونا نصیب نہیں ہوا۔ کتنی گہری نیند میں ہے۔"

یقیناً عظمٰی گہری نیند میں تھی لیکن وہ ایسے حالات سے

گزرتی آئی تھی کہ گہری نیند میں بھی ہلکی سی آہٹ چونکا دیتی تھی۔ وہ نین تارا کی پہلی آواز پر ہی نیند کے حصار سے نکل آئی تھی لیکن آنکھیں بند کیے سوچ رہی تھی، انسانوں کے جہنم میں ہے یا جنّت میں؟ نین تارا کی دوسری آواز نے اسے اطمینان دلایا کہ وہ محبت کرنے والوں کی پناہ میں ہے۔ اس وقت نین تارا خسرو سے پوچھ رہی تھی "کہیں بڑودیدی ہم دونوں کو بوجھ تو نہیں سمجھیں گی؟"

"کیسی باتیں کر رہی ہو۔ بڑودیدی عورت کے روپ میں دیوی ہیں۔ وہ تم دونوں کو دل سے خوش آمدید کہیں گی پھر تمھاری بات تو کچھ اور ہی ہے۔"

وہ اسے گہری نظروں سے دیکھ کر مسکرانے لگا۔ نین تارا نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ "بڑودیدی تم پر اتنا بھروسا کرتی ہیں۔ تم انھیں دیوی کہتے ہو۔ کیا اپنی دیوی سے جھوٹ بولو گے کہ ہماری شادی ہو چکی ہے؟"

"سچ بولنا بہت آسان ہے لیکن عورت خواہ بیوی ہو یا بڑودیدی، اس کے پیٹ میں بات نہیں پچتی۔ وہ اگر کسی کو نہ سنائے تو دیوار کو سنا دیتی ہے اور دیوار کے پیچھے کھڑے ہوئے لوگ سن لیتے ہیں۔"

وہ سمجھ رہے تھے کہ ان کے اور عظمیٰ کے درمیان نیند کی ایک دیوار حائل ہے لیکن وہ بات اس دیوار کے پار چلی گئی تھی۔ عظمیٰ فوراً ہی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دونوں کو ایسے دیکھنے لگی جیسے پہلی بار دیکھ رہی ہو۔ کیونکہ اس سے پہلے اس کمپارٹمنٹ میں میاں بیوی کو دیکھا تھا۔ نین تارا نے مسکرا کر کہا۔ "تم تو جاگ رہی ہو۔"

خسرو نے کہا۔ "عظمیٰ جاگ بھی رہی تھی اور ہماری باتیں بھی سن رہی تھی۔"

وہ خسرو کو دیکھتے ہوئے برتھ پر سے اٹھ گئی۔ پھر اشارے سے نین تارا کو سمجھایا کہ وہ ٹوائلٹ سے منہ ہاتھ دھو کر آرہی ہے پھر وہ ٹوائلٹ میں چلی گئی۔ "اس کے سن لینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ ایک تو بے چاری گونگی ہے، دوسرے مظلوم ہے۔ اس کے چہرے سے پتا چلتا ہے کہ بڑی محبت کرنے والی عورت ہے۔ ہمارے خلاف کسی سے کچھ نہیں کہے گی۔"

خسرو ٹوائلٹ کے بند دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ نین تارا نے کہا۔ "کبھی محبت بھی بوجھ بن جاتی ہے۔ آخر یہ ہمارے ساتھ کب تک رہے گی؟"

خسرو نے جواب دیا۔ "حالات سیاسی ہوں یا غیر سیاسی۔ تقدیر اچھی ہو یا بُری۔ ہر حالت میں عورت کو مناسب پناہ اسی وقت ملتی ہے جب کوئی اس سے نکاح پڑھا کر اس کا سہارا بن جاتا ہے۔ جب تک عظمیٰ کو کہیں سے اخلاقی سہارا نہیں ملے گا، ہم اس کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔"

نین تارا نے ایک گہری سانس لے کر پوچھا۔ "ہماری پہلی ملاقات یاد ہے؟"

"ہاں، یاد ہے۔ میں نے تمھیں دیکھا تھا تو دیکھتا ہی رہ گیا تھا پھر میں نے تمھارے چمکتے دمکتے حسن پر قوسِ قزح کا ٹک ٹک دی تھی۔"

"دوسرے لفظوں میں تم دشمنوں کی نظروں سے مجھے چھپانا چاہتے تھے۔ بے شک اب تک مجھے چھپاتے اور پناہ دیتے آرہے ہو لیکن عظمیٰ بھی مجھ سے کچھ کم نہیں ہے۔ آخر تم دو دو عورتوں کی حفاظت کس طرح کر سکو گے؟"

"اب تو ہم بڑودیدی کے پاس پہنچ رہے ہیں۔ جب تک ان کے پاس رہیں گے، کوئی تم دونوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔ انشاء اللہ ہم جلد ہی پاکستان جانے کا راستہ نکال لیں گے۔"

گاڑی پلیٹ فارم پر رُک گئی۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ یہ ایسا وقت ہوتا ہے کہ لوگ اپنے گھروں میں گہری نیند سوتے ہیں۔ لیکن کسی ٹرک یا ریل گاڑی کی آواز سن کر جیسے ساری بستی جاگ جاتی تھی۔ آبادی حیرت انگیز طور پر بڑھ گئی تھی۔ ریلوے لائن کے آس پاس شہر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لوگ جھگیوں میں رہنے لگے تھے۔ درختوں کے سائے میں راتیں گزارتے تھے۔ ریل گاڑی کی آواز سنتے ہی ہڑبڑا کر اٹھ جاتے تھے۔ آنکھیں ٹک ٹک کر دیکھتے تھے کہ مال گاڑی میں ان کے لیے کہیں سے اناج آیا ہے یا نہیں؟

تلسی رام کے آدمیوں نے دروازے پر دستک دی۔ خسرو نے ان کی آوازیں سن کر دروازہ کھول دیا۔ ان کے ساتھ کچھ مسلح سپاہی تھے۔ ایک نے کہا۔ "آپ آرام سے اپنی عورتوں کے ساتھ ویٹنگ روم میں چلے جائیں۔ آپ لوگوں کو تلسی رام جی کے مکان میں پہنچا دیا جائے گا۔"

نین تارا نے اپنی اٹیچی اٹھالی۔ پھر عظمیٰ کے ساتھ خسرو کے پیچھے پلیٹ فارم پر آگئی۔ دور بجلی کی روشنی میں بہت سے لوگ نظر آرہے تھے۔ پولیس والے انھیں لاٹھیوں سے ہانکتے ہوئے اناج کے ویگن سے دور بھگا رہے تھے۔ رائفل بردار سپاہی فائرنگ کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ وہ تینوں ویٹنگ روم میں آگئے۔ نین تارا نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے میز پر کہنی ٹیکتے

ہوئے پھر ایک ہاتھ سے سر کو تھامتے ہوئے کہا۔ ”مجھ سے یہ منظر دیکھا نہیں جاتا۔ میرے بس میں ہوتا تو میں اس ویگن کا تمام اناج ان لوگوں میں تقسیم کر دیتی۔“

”یوں تقسیم کرنے کو خیرات کہتے ہیں اور خیرات دو کو دی جا سکتی ہے، دو ہزار کو دی جا سکتی ہے۔ خیرات سے ایک وقت کی یا دو دن کی بھوک مٹائی جا سکتی ہے۔ نین تارا! تم ذخیرہ اندوز نہیں ہو۔ اس لیے انسانی ہمدردی سے سوچ رہی ہو۔ ورنہ یقین کرو، ان ذخیرہ اندوزوں کے بس میں ہوا اور پانی نہیں ہے۔ ورنہ یہ نیکی کمانے کے لیے دوسروں کو ایک ایک قطرہ پانی پلاتے اور زندگی کی ایک ایک سانس خیرات کے طور پر دیتے رہتے۔ دراصل خیرات اس معاشرے میں دی جاتی ہے اور لی جاتی ہے جہاں ایک کے بس میں سب کچھ ہوتا ہے اور دوسرے کے بس میں کچھ نہیں ہوتا۔“

تلسی رام کا ایک آدمی ایک مارواڑی جوان کے ساتھ ویٹنگ روم کے اندر آیا۔ پھر اس نے کہا۔ ”خسرو میاں! یہ تلسی رام جی کے سالے، آپ کی بڑو دیدی کے بھائی ہری رام ہیں۔“

ہری رام نے دونوں ہاتھ جوڑ کر نمستے کرتے ہوئے کہا ”خسرو بھائی! آپ مجھے ہری رام نہیں صرف ہریا کہہ سکتے ہیں۔ پورے سید پور میں ہریا سیٹھ کے نام سے مشہور ہوں۔ بڑو دیدی تو آپ کے نام کی مالا جپتی رہتی ہیں۔ آپ سے ملنے کی بڑی اچھا تھی۔ دیدی نے کہا ہے، آپ کو اور لیوڈی (بہو) کو فوراً ان کے پاس پہنچاؤں۔ پرنتو ایک سمسیا (مسئلہ) ہے۔“

خسرو نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”بیٹھیے اور بتائیے۔ مسئلہ کیا ہے؟“

اس نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”ایک لاش کو دیکھ کر مردار کھانے والوں کی بھیڑ لگ جاتی ہے۔ ابھی ہمارا اناج کا ویگن آیا ہے اور سید پور کی جنتا کا یہ حال ہے۔ ویسے تو ہمارے آدمیوں اور سپاہیوں نے بھوکے ننگوں کو لاٹھیوں سے ہانک دیا ہے لیکن اور طرح کے بھی بھوکے ننگے ویٹنگ روم سے باہر کھڑے ہوئے ہیں۔ ان میں سے کچھ ریلوے کے افسر ہیں، کچھ مکتی باہنی والے ہیں، کچھ یہاں کے بنیے ہیں۔“

خسرو نے کہا۔ ”میں سمجھ گیا، یہ لوگ اناج کے ویگن میں سے اپنا اپنا حصہ مانگ رہے ہوں گے۔“

”جی ہاں، مگر ہم نے کیا حرام کا اناج منگایا ہے۔ ہماری محنت لگی ہے، ہمارا دھن لگا ہے۔ ویسے میں پہلے ہی ریلوے افسروں کی جیبیں گرم کر چکا ہوں۔ یہ محض دکھاوے کے لیے رعب جمانے آئے ہیں۔ ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر باتیں کرنے سے یہ اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے چلے جائیں گے۔ بی ڈی آر والے ہمارا ساتھ دے رہے ہیں۔ مکتی باہنی والوں سے میں نمٹ لوں گا۔“

خسرو نے پوچھا۔ ”پھر کیا مسئلہ رہ گیا ہے؟“

”وہ کیا ہے کہ ہندو بنیے ہمارا پورا ویگن یہیں خرید لینا چاہتے ہیں۔ کہتے ہیں جو بھی ہماری رقم لگی ہے۔ یہ اس سے دوگنی رقم دیں گے۔ ہم ویگن ان کے حوالے کر دیں۔“

خسرو نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ”میں کاروباری باتیں نہیں جانتا، مجھے کیا معلوم کہ یہ اناج کس طرح فروخت کرنا چاہیے۔“

”سیدھی سی بات ہے خسرو بھائی! اناج ہم ویگن سے گودام میں لے جائیں گے۔ گودام سے بازار میں لائیں گے۔ بڑی جھنجھٹ ہے پھر قدم قدم پر پولیس والوں کو بھتہ دو، غنڈوں، بدمعاشوں کو خوش رکھو۔ ورنہ وہ لوٹ مار شروع کر دیتے ہیں۔ اس سے اچھا ہے کہ دوگنی قیمت لگ رہی ہے۔ مال یہیں بیچ دیا جائے۔“

”آپ بہتر سمجھتے ہیں تو یہی کریں۔“

”میرے کرنے سے ہوتا تو میں کر چکا ہوتا۔ جیجا جی (تلسی رام) مجھ پر بھروسہ نہیں کرتے ہیں۔ سختی سے کہلا بھیجا ہے کہ آپ جو کہیں گے میں وہی کروں گا۔ یہ کاغذ لے کر آیا ہوں۔ آپ اس میں لکھ کر مجھے آگیا (حکم) دیں تو میں اپنے طور پر یہ مال یہیں بیچ دوں۔“

اس نے ایک کاغذ خسرو کی طرف بڑھا دیا۔ ایک قلم بھی اس کے سامنے رکھ دیا۔ خسرو نے تھوڑی دیر تک کاغذ اور قلم کو دیکھا۔ پھر کہا۔ ”ہری رام جی!“

ہریا نے ٹوکتے ہوئے کہا۔ ”ہری رام نہیں صرف ہریا۔ میں آپ سے چھوٹا ہوں۔ آپ کا سیوک ہوں۔“

”اچھی بات ہے ہریا! میں دستخط کرنے سے پہلے بڑو دیدی سے مشورہ کروں گا۔“

”یہ کیا خسرو میاں! کاروبار کے معاملے میں بھلا عورت کیا مشورہ دے سکتی ہے؟“

”یہ میں نہیں جانتا۔ اتنا سمجھتا ہوں کہ اس کاغذ پر اگر دیدی کے بھی دستخط ہو جائیں تو میری ذمے داری بہت حد تک کم ہو جائے گی۔ دوسری بات یہ کہ دیدی سے ملنے، مشورہ کرنے، دستخط کرنے تک مجھے بہت کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع مل جائے گا۔“

”وہ کیا ہے کہ آپ یہاں گھنٹوں بیٹھ کر سوچ سکتے ہیں،

سمجھ سکتے ہیں۔ میں آپ کو ان خریداروں سے ملواتا ہوں۔ وہ آپ کو کاروبار کی اونچ نیچ سمجھائیں گے۔ آئیے نا، باہر چلیے۔"

وہ کرسی سے اٹھنے لگا۔ پھر اس نے مین تارا اور شیلی کی طرف دیکھتے ہوئے فوراً ہی ہاتھ جوڑ دیے۔ پھر کہا۔ "کیا ہے کہ میرا دماغ سودا پٹانے میں الجھا ہوا ہے۔ میں نے ابھی تک پوچھا ہی نہیں کہ آپ دونوں میں سے ہماری بودی کون ہیں؟"

خسرو نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے مین تارا کی طرف اشارہ کیا۔ مین تارا نے اپنے سر پر آنچل رکھ لیا۔ اپنا ہاتھ پیشانی تک لے جا کر سلام کیا۔ ہیرا لال نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "آداب، آداب، آپ تو ہمارے خیال سے بھی زیادہ سُندر ہیں۔ کیا ہے کہ ابھی میں کاروبار میں الجھا ہوا ہوں۔ پھر چل کے بہت سی باتیں ہوں گی۔ آئیے خسرو بھائی!"

خسرو نے دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہیں بیٹھی رہو۔ گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ چاروں طرف پہرا ہے میں ابھی آتا ہوں۔"

مین تارا نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "ویٹنگ روم کے دروازے سے زیادہ دور نہ جانا۔"

"نہیں جاؤں گا۔ یہیں رہوں گا۔"

وہ ہیرا لال کے ساتھ باہر آیا۔ ریل گاڑی پلیٹ فارم پر کھڑی ہوئی تھی۔ ان دنوں گاڑیاں جس اسٹیشن پر کھڑی ہوتی تھیں، کھڑی ہی رہ جاتی تھیں۔ آگے جانے کے لیے بڑی مشکل سے لائن کلیئر ملتی تھی۔ اناج کے ویگن کو اس گاڑی سے الگ کر کے گودام والی لائن پر پہنچا دیا گیا تھا۔ گاڑی کے مسافر دروازے کھڑکیاں بند کیے گہری نیند میں تھے۔ پلیٹ فارم پر ایک بھی مسافر نظر نہیں آ رہا تھا۔ البتہ کچھ اور لوگ تھے۔ ان میں سے ایک ادھیڑ عمر کا آدمی دھوتی پر ریشمی کُرتا پہنے ہوئے تھا۔ ماتھے پر بڑا سا تلک لگا ہوا تھا۔ سر پر نہرو کیپ تھی۔ گلے میں سونے کی چین تھی۔ چین سے ایک لاکٹ منسلک تھا اور اس لاکٹ میں کرشن بھگوان کی تصویر تھی۔ اس نے خوشامدانہ انداز میں دونوں ہاتھ جوڑ کر آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "جے رام جی کی۔"

خسرو اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ہیرا لال نے کہا۔ "یہ دھرم چند جی ہیں۔ یہاں کے بہت بڑے بیوپاری ہیں۔ ہمارا مال یہیں کھڑے کھڑے خرید لینا چاہتے ہیں اور دھرم چند جی! یہ خسرو میاں ہیں۔ ان کے بارے میں تو میں آپ کو بہت کچھ بتا چکا ہوں۔ ہمارے تیجا جی ان پر آنکھ بند کر کے بھروسہ کرتے ہیں تبھی تو ان کے آنے سے پہلے ہی کہلا بھیجا تھا کہ مال ان کے ہاتھ سے فروخت ہوگا۔"

دھرم چند نے کہا۔ "تلسی رام جی کو میں خوب جانتا ہوں وہ اپنے سائے پر بھی بھروسہ نہیں کرتے۔ انھوں نے خسرو میاں کے اندر بہت سے گن دیکھے ہوں گے۔ اب خسرو میاں! آپ کو ثابت کرنا ہے کہ آپ سچ مچ گنی ہیں۔ کھڑے کھڑے پورا مال فروخت ہو جائے اور وہ بھی دوگنے منافع پر۔ تو تلسی رام جی کی نظروں میں آپ کا مان اور بڑھ جائے گا۔"

خسرو اس کی باتیں سن رہا تھا اور پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے ان دس آدمیوں کو دیکھ رہا تھا جن کے حُلیے چور بدمعاشوں کی طرح تھے۔ کوئی لنگی اور بنیان پہنے ہوئے تھا۔ کسی کے ہاتھ میں لوہے کی لمبی سی سلاخ تھی۔ کوئی پتلون پہنے ہوئے تھا مگر اوپری جسم ننگا تھا۔ کسی کے بال بڑھے ہوئے تھے۔ کسی کی مونچھیں لانبی اور گھنی تھیں۔ پلیٹ فارم کی روشنی میں ان کی آنکھیں سرخ انگارہ جیسی لگ رہی تھیں۔ وہ سب نشہ میں چور تھے۔ وقت آنے پر کچھ بھی کر سکتے تھے۔

دھرم چند نے خسرو کی نظروں کو تاڑتے ہوئے کہا۔ "یہ سب میرے آدمی ہیں۔" پھر ذرا قریب ہو کر کہا۔ "چھٹے ہوئے بدمعاش ہیں۔ سب کے سب بہاری ہیں۔ پاکستان کے وقت ان لوگوں نے ہندوؤں اور بنگالیوں کو بڑی بے دردی سے قتل کیا تھا۔ اب یہی لوگ میرے پیچھے دُم ہلاتے ہیں۔ میرے ایک اشارے پر کسی بھی بہاری کے پیٹ میں چھرا گھونپ کر انتڑیاں باہر نکال سکتے ہیں۔"

دھرم چند نے اپنی کنپٹی کو ایک انگلی سے ٹھونکتے ہوئے کہا۔ "یہ دماغ کی بات ہوتی ہے۔ اپنے ہی قاتلوں کو اپنے بس میں کر کے ان کے آدمیوں کو قتل کرانا دماغ کی بات ہوتی ہے۔ ابھی پچھلے دنوں ایک سیٹھ کا مال ٹرک میں آیا تھا۔ وہ مجھ سے سودا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ان بدمعاشوں نے اس مال کو بازار میں پہنچنے ہی نہیں دیا۔ راستے ہی میں لوٹ لیا۔ ہی ہی ہی ہی، مگر تم تو اپنے آدمی ہو۔ دیکھو نا، وہ جو اس بدمعاش کے ہاتھ میں لوہے کا سریا ہے نا، اس سریے سے وہ ویگن کے تالوں کو آسانی سے توڑ دیتا ہے۔ جانے ان بدمعاشوں کو کیسے معلوم ہو گیا کہ آج رات اناج کا ویگن پہنچنے والا ہے بس یہ دھاوا بولنا چاہتے تھے۔ میں نے ڈانٹ کر کہا۔ "خبردار! اپنے تلسی رام جی کا مال ہے اور اپنے خسرو میاں یہاں آ رہے ہیں۔ کوئی دھاندلی نہیں ہوگی۔ ہی ہی ہی ہی۔ آپ تو اپنے ہی آدمی ہیں۔"

خسرو نے ان دس غنڈوں پر ایک سرسری سی نظر ڈالی۔ پھر پلٹ کر ویٹنگ روم کے بند دروازے کو دیکھا جس کے پیچھے

نمین تارا اور عظمٰی انتظار کر رہی تھیں۔ اب اُس کے ساتھ ساتھ ان دونوں کی زندگیاں بھی خطرے میں پڑ گئی تھیں۔ اس نے مسکرا کر کہا: "سیٹھ دھرم چند! آپ نے کچھ بھی نہ کہا اور کہہ بھی گئے۔ آپ بڑے سیانے ہیں اور ہاں ہریا! وہ میرے آدمی کہاں ہیں جو کھلنا سے میرے ساتھ آئے تھے۔ مال کی بلٹی ان کے پاس ہے۔ انھیں میرے پاس بھیج دیجیے۔ میں ابھی معاملات طے کرتا ہوں۔"

دھرم چند خوش ہوگیا۔ خسرو نے کہا: "آپ باہر انتظار کریں۔ میں ویٹنگ روم میں ذرا اپنے آدمیوں سے باتیں کرلوں۔"

وہ ویٹنگ روم میں آگیا۔ عظمٰی اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ بے چاری زبان سے کچھ پوچھ نہیں سکتی تھی۔ نمین تارا نے پوچھا: "باہر کون لوگ ہیں؟ کیا چاہتے ہیں؟"

اس نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا: "دوست نما دشمن ہیں۔ ان کے اشاروں پر چلوں تو دوست، نہیں تو دشمن۔" پھر اس نے ہنستے ہوئے کہا: "سچ پوچھو تو کوئی کسی کا دوست نہیں ہے۔ ہمارے جیجا جی مارواڑی ہیں اور یہ دھرم چند جو سودا کرنے آیا ہے یہ بھی مارواڑی ہے لیکن کاروباری معاملات میں جہاں منافع حاصل ہوتا ہے وہاں اپنے مارواڑی کا دشمن ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ سارا منافع جیجا جی کے کھاتے میں جائے اور یہ بھی نہیں چاہتا کہ جیجا جی سے دشمنی ظاہر ہو جائے۔ اسی لیے سودا کرنے آیا ہے۔ دگنا منافع دینے کو تیار ہے۔ اگر سودا نہ ہوا تو یہ مال بازار تک نہیں پہنچ سکے گا۔ اُدھر جیجا جی کو یہ خبر پہنچے گی کہ اناج سے بھرے ویگن کو غنڈوں، بدمعاشوں نے لوٹ لیا ہے۔ جیجا جی نے خوب سوچ سمجھ کر یہ سارا اناج میرے حوالے کیا ہے۔ وہ اپنے سالے پر بھروسا نہیں کرتے ہیں اور ٹھیک کرتے ہیں۔ یہ ہریا اس دھرم چند سے ملا ہوا ہے۔"

نمین تارا نے کہا: "ہاں اس کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا۔ تم سے کاغذ پر دستخط کروا رہا تھا تاکہ مال کو اونے پونے بیچنے کی ذمے داری تم پر ہو۔"

"اناج سے بھرا ہوا ویگن ہم لے کر آرہے ہیں، یہ بات صرف ہریا کو اور بڑو دیدی کو معلوم تھی لیکن مال پہنچتے ہی دھرم چند اور اس کے بدمعاش ہمارے سروں پر آ پہنچے۔ یقیناً ہریا نے انھیں خبر دی ہوگی۔ یہ سوچی سمجھی اسکیم ہے۔ پلیٹ فارم پر بی ڈی آر کا کوئی سپاہی نظر نہیں آرہا ہے اور تو اور جیجا جی کے وہ آدمی بھی نہیں ہیں جو ہمارے ساتھ کھلنا سے۔۔۔"

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ ویٹنگ روم کا دروازہ کھلا اور وہ دو آدمی داخل ہوئے۔ جو کھلنا سے ان کے ساتھ آئے تھے۔ ان کے پاس مال کی بلٹی تھی۔ ان کے ساتھ ہریا بھی تھا۔ خسرو نے ان آدمیوں سے پوچھا: "تم لوگ کہاں چلے گئے تھے؟"

ایک نے جواب دیا: "ہمارا ویگن مال گودام کی آخری لائن پر لگایا جا رہا تھا۔ ہمارے دو آدمی ابھی مسلح سپاہیوں کے ساتھ وہاں موجود ہیں۔ ہم ویگن کو ریلوے واچ اینڈ وارڈ کے بھروسے پر چھوڑ نہیں سکتے۔ بڑی گڑبڑ ہو جاتی ہے۔"

"وہ بی ڈی آر کے جوان کہاں ہیں۔ جو یہاں تک ہمارے ساتھ آئے تھے؟"

"کچھ ویگن کے پاس ہیں اور کچھ اسٹیشن کے پیچھے ایک ہوٹل کو کھلوا کر چائے پی رہے ہیں۔"

"ان سے جا کر کہو، پلیٹ فارم پر دھرم چند کے غنڈوں کو چاروں طرف سے گھیر لیں۔ انھیں بھاگنے کا موقع نہ دیں۔"

ہریا نے کہا: "خسرو بھائی! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ اگر آپ سودا نہیں کرنا چاہتے تو نہ سہی، میں دھرم چند جی کو کہہ دیتا ہوں۔ وہ واپس چلے جائیں گے۔"

وہ جانا چاہتا تھا۔ خسرو نے سخت لہجے میں کہا: "ہریا! تم اس ویٹنگ روم سے باہر قدم نہیں نکالو گے۔ یہاں میرے پاس بیٹھو۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا: "کیا ہے کہ دھرم چند جی نے اور ان کے آدمیوں نے آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا ہے۔ پھر آپ انھیں۔۔۔"

خسرو نے اس کی بات کاٹ کر کہا: "میں نے کہا نا تم یہاں بیٹھ جاؤ۔ نہیں بیٹھو گے تو بڑو دیدی کو تمھارا کچا چٹھا سنا دوں گا۔"

وہ دھپ سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس وقت تک تلسی رام کا ایک آدمی باہر جا چکا تھا۔ دوسرا آدمی وہیں کھڑا ہوا تھا۔ اس نے کہا: "خسرو صاحب! باہر جو مارواڑی کھڑا ہوا ہے۔ وہ بی ڈی آر کے جوانوں سے کھسر پھسر کر رہا تھا۔ اس نے اسٹیشن کے پیچھے چائے کی ہوٹل کھلوائی ہے۔ تاکہ تمام سپاہی وہاں کھاتے پیتے رہیں۔"

خسرو ہریا کو گھور کر دیکھنے لگا۔ ہریا نے کہا: "خسرو بھائی! میں جیجا جی کے فائدے کی بات کر رہا تھا۔ یہاں سید پور میں بڑی گڑبڑ ہوتی رہتی ہے۔ پھر ہماری کوئی دکان نہیں ہے کہ ہم صبح سے شام تک راشن بیچنے کے لیے بیٹھے رہیں۔ کہیں نہ کہیں تھوک کے حساب سے کسی نہ کسی سیٹھ کو دینا ہی ہوگا۔ اس لیے میں دھرم چند سے بات کر چکا تھا۔"

ایک بی ڈی آر کا جوان اسٹین گن شانے سے لٹکائے

ہوئے ویٹنگ روم میں داخل ہوا۔ خسرو نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا: "میں آپ لوگوں کا بہت شکر گزار ہوں کہ یہاں تک ہمارا ساتھ دیا لیکن دشمن ابھی تک پیچھے لگے ہوئے ہیں۔"

اس نے کہا: "مجھے ابھی آپ کے آدمی نے بتایا ہے۔ ہمارے مسلح جوانوں نے باہر دھرم چند اور ان کے آدمیوں کو گھیر رکھا ہے۔ کوئی وہاں سے جا نہیں سکے گا۔ دراصل یہ دھرم چند پہلے میرے پاس آیا تھا کہہ رہا تھا' اگر میں اس کا ساتھ دوں تو ویگن کے مال سے مجھے اتنا منافع ملے گا جتنا میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں نے جواب دیا' میں ایسا کام کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے فائدہ بھی حاصل ہو اور میری ڈیوٹی پر کوئی بات نہ آئے۔ اگر خسرو صاحب کو' ان کی عورتوں کو اور اناج کے ویگن کو نقصان پہنچے گا تو ہم سے جواب طلبی ہوگی۔ اس لیے پہلے خسرو صاحب سے معاملات طے کریں۔"

خسرو نے کہا: "شاباش' آپ نے اچھا جواب دیا۔ آپ پر اب کوئی بات نہیں آئے گی اور رہ گئی آپ کے تھوڑے بہت منافع کی بات تو وہ مجھ سے ملے گا۔ آئیے باہر چلیں۔"

خسرو نے اشارے سے ہریا کو اٹھنے کے لیے کہا۔ وہ شکست خوردہ حالت میں اس کے ساتھ چلتا ہوا باہر آیا۔ باہر پلیٹ فارم پر پانچ مسلح نوجوان نظر آرہے تھے جو دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان وہ دس بدمعاش سر جھکائے کھڑے تھے۔ دھرم چند نے خسرو کو دیکھتے ہی کہا: "یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ میں نے تو آپ سے کوئی دشمنی نہیں کی۔ میں تو آپ کو اپنا چھوٹا بھائی سمجھتا ہوں۔"

خسرو نے کہا: "بڑے بھائی! میں کب دشمنی کر رہا ہوں۔ آپ نے زبان سے دھمکی دی کہ آپ کے آدمی پیٹ میں چھرا گھونپ کر انتڑیاں باہر نکال لیتے ہیں۔ اناج کا ویگن لوٹ لیتے ہیں۔ میں بھی آپ کو بڑی خاموش دھمکی دے رہا ہوں۔ میرے پاس یہ مسلح جوان موجود ہیں جو میرے ایک اشارے پر آپ کے تمام بدمعاشوں کو بھون کر رکھ سکتے ہیں۔"

پھر وہ ان بدمعاشوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے بولا: "تم سب بہاری کہلاتے ہو۔ میں تمھیں بتاؤں کہ بہار کے معنی کیا ہیں۔ بہار دراصل ہندی کا لفظ بیوہار ہے جو کثرتِ استعمال سے بہار بن گیا۔ بیوہار کے معنی ہیں حسنِ سلوک۔ اگر تم لوگوں میں حسنِ سلوک نہیں ہے تو بہاریوں کے نام کو بدنام نہ کرو۔ اس ویگن میں ہمارا جو اناج ہے' اس کی مالیت زیادہ سے زیادہ پچاس ہزار روپے ہے۔ سیٹھ دھرم چند اس کے ایک لاکھ روپے دینا چاہتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے' یہ مال بازار میں جا کر تقریباً دو لاکھ اور چار لاکھ کا منافع دے گا۔ سید پور میں اناج کتنا مہنگا ہے یہ میں سن چکا ہوں۔ غریب والدین اپنے بچوں کو بیچ کر بھی ایک وقت کا چاول خرید نہیں سکتے۔ کیونکہ بچوں کو کوئی خریدنے والا ہی نہیں ہے۔ سب پر اپنی اپنی جان بھاری ہے۔ کچھ دیر پہلے میری شریکِ حیات نے کہا تھا' اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ یہ سارا اناج غریبوں میں تقسیم کر دیتی۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ یہ میرے جیجا جی کا مال ہے۔ میں انھیں پچاس ہزار کے مال پر زیادہ سے زیادہ دس ہزار کا منافع دوں گا۔ لیکن کل سید پور کے بازار میں اناج سستا فروخت ہوگا۔ اگر چاول پندرہ روپے سیر بک رہا ہے تو میں پانچ روپے سیر فروخت کروں گا۔"

دھرم چند نے ہنستے ہوئے کہا: "آپ اپنے مال کے اور اپنی مرضی کے مالک ہیں۔ ویسے میں نے آج تک کسی بھی منڈی میں یہ نہیں دیکھا کہ سارے بیوپاری ایک بھاؤ میں نہ بیچیں اور کوئی ایک بیوپاری ان کے مقابلے میں سستا بیچ کر چلا جائے۔ آپ نے بیچ لیا تو میں آپ کا غلام بن جاؤں گا۔ اچھا جی' نمستے۔"

وہ وہاں سے چلا گیا۔ خسرو نے تمام غنڈوں پر سرسری سی نظر ڈالی۔ ایک غنڈہ نسبتاً کم عمر تھا اور اچھی صورت شکل کا مالک تھا۔ معلوم ہوتا تھا' حالات نے اسے بگاڑ دیا ہے۔ اس نے بی ڈی آر کے ایک جوان سے کہا: "ان سب کو جانے دو۔ صرف اس جوان کو گرفتار کر لو۔"

وہ جوان گھبرا کر اپنے ساتھیوں کو دیکھنے لگا۔ ساتھی اپنی اپنی جان چھڑانے کی فکر میں تھے۔ اس لیے وہاں سے چلے گئے۔ بی ڈی آر کے ایک جوان نے خسرو کے قریب آکر آہستگی سے کہا: "آپ اسے گرفتار کر کے کیا کریں گے۔ ہم زیادہ سے زیادہ اسے حوالات پہنچا دیں گے لیکن یہ ہندو بنیے دور تک اپنا اثر رکھتے ہیں۔ اسے چھڑا کر لے آئیں گے۔"

"میں اسے جیل بھجوانا نہیں چاہتا۔ اس سے دو باتیں کر لوں۔ پھر میں آپ لوگوں سے بات کروں گا۔"

یہ کہہ کر خسرو اس جوان کے پاس آیا۔ پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر ٹہلنے کے انداز میں پلیٹ فارم پر ذرا دور نکل گیا۔ اس نے پوچھا: "دھرم چند تمھیں کیا دیتا ہے؟"

"وہ ہم سب کو روزانہ دو سیر چاول' آدھا سیر چنا اور ایک پاؤ ستو دیتا ہے۔ اس کے علاوہ ٹھرّے کی ایک بوتل ہمیں ملتی ہے۔ کبھی ضرورت پڑنے پر نقد روپے بھی مل جاتے ہیں۔"

"یہاں غنڈوں کی کتنی پارٹیاں ہیں؟"
"بس ہماری ایک پارٹی ہے۔"
"بکواس مت کرو۔ گھنا جیسے شہر میں غنڈوں کی دو پارٹیاں تھیں۔ سید پور تو بہت بڑا شہر ہوگیا ہے۔ جب شہر بڑھتا اور پھیلتا ہے تو غنڈوں کی تعداد بھی بڑھتی رہتی ہے۔"
اس جوان نے کہا "یہاں جتنے بھی غنڈے ہیں، وہ کسی نہ کسی سیٹھ کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ ان کی مدد سے یہ غنڈے شراب اور جوئے کا اڈہ چلاتے ہیں۔"
"یہاں ایسا کون شخص ہے جو اچھے اثر ورسوخ کا مالک ہو؟"
وہ ذرا سوچنے کے بعد بولا "میں بڑے بڑے لوگوں کو نہیں جانتا۔ البتہ ایک جوان ہے جو دیکھنے میں کچھ بھی نظر نہیں آتا لیکن ملتی بامبی والے اس سے گھبراتے ہیں۔ غنڈے بھی اس کے منہ نہیں لگتے۔"
"ابھی اس آدمی کو بلا کر لے آؤ۔ تم نے یہ کام کیا تو تمھیں رہا کر دیا جائے گا۔"
"جناب! وہ میرے کہنے پر یہاں نہیں آئے گا۔"
"تمھارے ساتھ ایک سپاہی جائے گا۔ تم ابھی جاؤ۔"
خسرو نے ایک سپاہی سے کہا "ابھی اس کے ساتھ رکشہ میں جاؤ اور یہ جس آدمی کو کہتا ہے اسے اپنے ساتھ لے آؤ۔"
وہ جانے لگے۔ خسرو نے کہا "اور سنو! راستے میں اس کے غنڈے ساتھیوں نے یا دھرم چند نے اس سے کچھ پوچھنا چاہا تو کسی کو اس سے بات کرنے کی اجازت نہ دینا۔"
وہ چلے گئے۔ خسرو نے ہرپا کے پاس آ کر کہا "میں ان عورتوں کو جلد سے جلد بڑو دیدی کے پاس پہنچانا چاہتا تھا لیکن تم نے کاروباری معاملے کو الجھا دیا ہے۔ میں ابھی یہاں سے نہیں جا سکوں گا۔ تم جاؤ اور بڑو دیدی کو بلا کر لے آؤ۔"
"بھائی جی! کیا آپ دیدی سے میری شکایت کریں گے؟"
"شکایت کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ کیا دیدی تمھاری ہیرا پھیری کو نہیں سمجھتی ہیں؟" وہ چپ ہوگیا۔ خسرو نے کہا۔ "کھڑے کیوں ہو۔ جلدی جاؤ۔ میں ان عورتوں کو زیادہ دیر یہاں بٹھانا نہیں چاہتا۔"
وہ چلا گیا۔ بی ڈی آر کے جوان نے آ کر کہا "یہاں سے ہماری ڈیوٹی ختم ہو جائے گی۔ کل دوپہر کو ہم چلے جائیں گے۔ کیا آپ نے سوچا ہے کہ ہمارے جانے کے بعد آپ کا کیا بنے گا؟"
خسرو نے ایک گہری سانس لی۔ پھر سانس چھوڑتے ہوئے بولا "جہاں قانون ساتھ چھوڑ دیتا ہے یا بے بس ہو جاتا ہے، وہاں سے غنڈوں کی حکمرانی شروع ہوتی ہے۔ دھرم چند نے غنڈوں کو یہاں لا کر میرے حق میں بہت اچھا کیا۔ مجھے ایک سبق سکھا دیا کہ لوہا لوہے کو کاٹتا ہے۔ اس لیے اب میرے غنڈے ان کے غنڈوں کی کاٹ کریں گے۔"
وہ ویٹنگ روم میں آگیا۔ نین تارا نے پوچھا "کیا ہوا؟"
"کچھ نہیں، سب چلے گئے۔ فی الحال دشمنوں کی طرف سے خطرہ نہیں ہے لیکن یہاں مجھے کچھ معاملات طے کرنے ہیں۔ اس لیے تم لوگوں کے ساتھ بڑو دیدی کے پاس نہیں جا سکوں گا۔ میں نے دیدی کو یہاں بلایا ہے۔ وہ آنے والی ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ میز پر کہنیاں ٹیک کر دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ وہ پریشان نظر آ رہا تھا۔ نین تارا اندر سے تڑپ گئی۔ اس کا جی چاہتا تھا "ابھی اٹھ کر جائے اور اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرے۔ اس کی پریشانی کچھ تو کم ہو سکتی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی۔ اسی دوران عظمٰی اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے خسرو کے پاس پہنچ گئی۔ پھر وہ اس کے سر پر محبت سے اور ہمدردی سے ہاتھ پھیرنے لگی۔ نین تارا گم صم بیٹھی اسے دیکھتی جا رہی تھی۔ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ یہ خسرو سے کیوں اتنی ہمدردی کر رہی ہے؟

خسرو آنکھیں بند کیے سوچ رہا تھا۔ بند آنکھوں کے باوجود عورت کے ہاتھ کا لمس سمجھ میں آ جاتا ہے۔ اس کے دل میں آیا۔ فوراً آنکھ کھول کر دیکھے۔ پھر دماغ نے سمجھایا۔ دیکھے گا تو وہ شرما کر دور ہو جائے گی۔ اس سے پہلے کھلنا سے آتے وقت وہ اوپری برتھ پر سو رہا تھا۔ نین تارا اسے نیند کی حالت میں سمجھ کر قریب آگئی تھی۔ ہولے ہولے اس کے پاؤں دابنے لگی تھی۔ اس وقت بھی اس نے چاہا تھا کہ سر اٹھا کر دیکھے لیکن ضبط سے کام لیا تھا۔ اس وقت بھی دماغ نے سمجھایا تھا۔ سر اٹھا کر دیکھے گا تو وہ دور ہو جائے گی۔
نین تارا نادان نہیں تھی۔ اتنا سمجھتی تھی کہ عظمٰی کے دل میں کھوٹ نہیں ہے۔ کیوں کہ وہ اس کی آنکھوں کے سامنے خسرو سے ہمدردی اور محبت سے پیش آ رہی تھی۔ عورت کے پیار میں تقدس بھی تو ہوتا ہے۔
نین تارا کو حیرانی اس بات کی تھی کہ خسرو کیوں چپ ہے؟ کیوں آنکھیں کھول کر نہیں دیکھ رہا ہے؟ کیا سارے مرد ایک جیسے ہوتے ہیں؟ ہر درخت کی چھاؤں میں سستانے لگتے ہیں؟
اسی وقت عظمٰی نے ہاتھ کے اشارے سے نین تارا کو

خسرو کے پاس آنے کے لیے کہا۔ نین تارا نے بھی اشارے سے پوچھا "کیا بات ہے؟ وہ کیوں بلا رہی ہے؟"

عظمیٰ نے گونگے اشارے میں سمجھایا "میرے پاس آؤ۔ میری جگہ کھڑی ہو جاؤ اور اس طرح سر سہلاؤ۔"

وہ بول نہیں سکتی تھی۔ بول سکتی تب بھی خسرو کے سامنے نہ بولتی۔ اشاروں سے ہی سمجھاتی "اپنے مرد کی پریشانی کے وقت یہ تاثر دینا چاہیے کہ عورت اس کی پریشانیوں کو سمجھ رہی ہے۔ اس کے کسی مسئلے کو اگر حل نہیں کر سکتی ہے تو کم از کم اس کے پاس سایہ بن کر رہ سکتی ہے۔ اس کے لیے ایسی زمین بن سکتی ہے جو کبھی معاذ اللہ بھی پاؤں تلے سے نہیں نکلتی۔

نین تارا گونگی نصیحتوں کو سمجھ رہی تھی لیکن خسرو کے قریب جاتے ہوئے جھجک رہی تھی۔ اس نے کئی بار سوچا۔ اپنے آدمی کے پاس کسی اور کو نہیں ہونا چاہیے، خواہ کسی کا دل کتنا ہی صاف کیوں نہ ہو۔ خود آگے بڑھ کر اپنی فرائض داریوں کو سنبھالنا چاہیے لیکن وہ سوچتی ہی رہ گئی۔ اسے خسرو کی بڑبڑاہٹ سنائی دی۔ وہ اسی طرح سر جھکائے، آنکھیں بند کیے بیٹھا ہوا تھا اور کہہ رہا تھا "نین تارا! میں جانتا ہوں، تم بے حد شرمیلی ہو مگر کبھی کبھی شرماتے ہوئے بھی اپنا فرض ادا کرنا چاہیے۔ تم نے ابھی میرے پاس آ کر میرے ذہن کا بوجھ اُتار دیا ہے۔ یوں لگ رہا ہے جیسے مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے۔"

گونگی ایک ہاتھ سے منہ دبائے ہنس رہی تھی۔ نین تارا بھی دور بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ آخر گونگی سے ضبط نہ ہو سکا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ خسرو نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ عظمیٰ کو اپنے قریب دیکھ کر بوکھلا گیا۔ پھر اس نے سر گھما کر نین تارا کو دیکھا۔ وہ منہ چھپا کر ہنس رہی تھی۔ اسے ہنستے دیکھ کر خسرو خوشی سے کھل گیا۔ جب سے وہ اس کی ہم سفر بنی تھی، پہلی بار اسے کھل کر ہنستے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا "اچھا تو مجھے تم دونوں مل کر بیوقوف بنا رہی تھیں۔"

نین تارا نے کہا "میں نے کچھ نہیں کیا۔ اسی عظمیٰ کو تمھاری باتوں پر ہنسی آ گئی تھی۔"

عظمیٰ، نین تارا کے قریب کرسی پر آ کر بیٹھ گئی پھر سنبھل سنبھل کر بولنے لگی "ہم کو کبھی کبھی ہڑنا بوڑنا ڑاہیے۔"

نین تارا اور خسرو اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے۔ جہاں اس کی زبان تالو سے نہیں لگتی تھی، وہاں کے الفاظ اس نے صاف ادا کیے تھے باقی الفاظ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ عظمیٰ نے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "ہڑنا یعنی ہی ہی ہی۔۔۔"

خسرو نے کہا "میں سمجھ گیا۔ ہڑنا کے معنی ہنسنا۔ تو پھر بوڑنا کے معنی بولنا ہوئے۔"

نین تارا نے کہا "تو پھر عظمیٰ کی بات یہ ہی کہ ہم کو کبھی کبھی ہنسنا بولنا ڑاہیے۔ ڑاہیے کا مطلب ہوا چاہیے۔ ہم کو کبھی کبھی ہنسنا بولنا چاہیے۔"

عظمیٰ خوش ہو کر ہاں، ہاں کے انداز میں سر ہلانے لگی پھر کہنے لگی "ہم کو کبھی کبھی ہڑنا بوڑنا ڑاہیے۔ ڈُک ہڑکے ہو جاڑتے ہیں۔"

وہ دونوں پھر اس کی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگے کہ کون کون سے لفظ کٹی ہوئی زبان سے زخمی ہو جاتے ہیں اور اپنی صحیح صورت میں ادا نہیں ہوتے۔ بات رفتہ رفتہ سمجھ میں آ گئی۔ عظمیٰ کہہ رہی تھی "ہم کو کبھی کبھی ہنستے بولتے رہنا چاہیے۔ دُکھ ہلکے ہو جاتے ہیں۔"

نین تارا نے محبت سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا "تم ہمارے ساتھ رہو گی تو یقیناً ہمارے دکھ ہلکے ہوتے رہیں گے۔ تم بہت اچھی ہو۔"

خسرو نے بند دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تھوڑی دیر میں صبح ہو جائے گی۔ دیدی اب آنے ہی والی ہوں گی۔"

نین تارا نے کہا "ہم یہاں تک میاں بیوی بن کر آئے۔ ہم نے دنیا والوں سے جھوٹ کہا۔ کیا بڑو دیدی سے بھی جھوٹ بولیں گے؟"

خسرو نے کہا "دنیا والوں سے صرف جھوٹ کہا ہے۔ بڑو دیدی سے سفید جھوٹ کہتے رہنا ہوگا۔ ورنہ جانتی ہو، کیا ہوگا؟"

"کیا ہوگا؟"

"جب انھیں معلوم ہوگا کہ میں نے شادی نہیں کی ہے تو پھر وہ مجھے اپنے پاس سے جانے نہیں دیں گی ــــ وہ کبھی گوارا نہیں کریں گی کہ میں کہیں جا کر بھٹک جاؤں اور دشمن مجھے مار ڈالیں۔"

"میری وابستگی سے کیا فرق پڑے گا؟"

"بہت فرق پڑے گا۔ میں ان سے کہوں گا، تمھارے رشتے دار پاکستان میں ہیں۔ اس لیے ہمارا یہاں سے پاکستان جانا ضروری ہے۔ وہ تمھیں تمھارے رشتے داروں کے پاس جانے سے نہیں روکیں گی۔ اس طرح میں تمھارے ساتھ یہاں سے نکل چلوں گا۔"

اس کی باتوں کے دوران عظمیٰ اشارے سے نین تارا کو

بتا رہی تھی کہ خسرو کا گریبان کھلا ہوا ہے۔ جا کر اس کے بٹن لگا دو۔

نین تارا اس کے اشاروں کو سمجھ رہی تھی لیکن خسرو کے قریب جانے کے خیال سے ہی پاؤں من من بھر کے ہو جاتے تھے۔ اسی وقت وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ کہنے لگا "میں ذرا باہر جا کر دیکھتا ہوں۔ دیدی آتی ہی ہوں گی۔"

عظمیٰ نے نین تارا کے بازو میں ہلکی سی چٹکی لی، پھر آنکھ کے اشارے سے نصیحت کی "جاؤ بٹن لگا دو۔ مرد کو اس طرح باہر نہیں جانا چاہیے۔ کیونکہ کھلے ہوئے گریبان کے باعث وہ پریشان حال نظر آتا ہے۔"

خسرو نے دونوں کو ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ پھر پوچھا "یہ کیا اشارے ہو رہے ہیں؟"

نین تارا نے کہا "کچھ نہیں، کچھ بھی تو نہیں۔"

وہ جانے لگا۔ عظمیٰ نے نین تارا کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ اس نے ہاتھ چھڑا لیا۔ اسی وقت وہ اٹھ کر بولی "آں... ؟"

خسرو دروازے کے قریب پہنچ گیا تھا۔ عظمیٰ کی آواز سن کر رک گیا۔ پلٹ کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ تیزی سے چلتے ہوئے اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ دونوں کی نظریں ملیں، پھر وہ ہاتھ بڑھا کر کھلے ہوئے گریبان کو بند کرنے لگی۔ بٹن کو کاج سے منسلک کرنے لگی۔

ایسے ہی وقت ڈرائنگ روم کا دروازہ کھل گیا۔ وہاں ایک بڑی عمر کی من موہنی صورت والی بڑی باوقار عورت کھڑی ہوئی تھی — اس کے لباس سے پتا چلتا تھا کہ وہ مارواڑی ہے اور وہاں آنے والی مارواڑی عورت صرف بڑو دیدی ہو سکتی تھی۔

خسرو نے اسے دیکھتے ہی خوشی سے نعرہ لگایا "اوہ میری ماں سمان دیدی آ گئیں۔" پھر اس نے دیدی کے سامنے ذرا جھک کر کہا "بڑو دیدی پالاگن۔"

دیدی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا "بھگوان تمھاری رکھشا کرے۔ خدا تمھیں سلامت رکھے۔ اب سامنے سے ہٹو۔ پہلے میں اپنی بھاوج کو جی بھر کر دیکھوں گی۔"

وہ خسرو سے کترا کر عظمیٰ کے پاس آئیں۔ پھر اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر بولیں "ہائے، میری بھابی کتنی سندر ہے۔"

عظمیٰ ہنسی ضبط کر رہی تھی۔ دیدی نے کہا "کیسی چنچل آنکھیں ہیں۔ لگتا ہے اب تب میں ہنسنے ہی والی ہوں۔"

عظمیٰ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ خسرو نے جلدی سے آگے بڑھ کر کہا "بڑو دیدی! پٹری بدل دیجیے۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔"

عظمیٰ، دیدی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے نین تارا کے سامنے لے آئی۔ وہ سر پر آنچل رکھے سر جھکائے شرما رہی تھی۔ زیرِ لب مسکرا رہی تھی۔ دیدی کے سامنے آتے ہی اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا "آداب۔"

خسرو نے آگے بڑھ کر کہا "یہ میری دلھن ہے۔"

دیدی، نین تارا کے سحر طاری کرنے والے حسن کو تک رہی تھیں۔ خسرو کی آواز پر چونک گئیں۔ انھوں نے پہلے عظمیٰ کو دیکھا۔ پھر خسرو کے گریبان کو دیکھا۔ وہ پتی سیوا کو اپنا دھرم سمجھتی تھیں۔ اس وقت یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بیوی کی موجودگی میں دوسری عورت اس کے بھائی کے گریبان کا بٹن کیوں لگا رہی تھی۔ اس کی بھابی سے پتی سیوا کا حق کیوں چھین رہی تھی اور یہ حق خسرو کیوں اسے دے رہا تھا؟

انھوں نے خسرو سے عظمیٰ کے متعلق پوچھا "یہ کون ہے؟"

عظمیٰ نے ذرا آگے بڑھ کر کہا "اور ما- میرا نام اور ما ہے۔"

دیدی شدید حیرانی سے پیچھے ہٹ گئیں۔ "یہ، یہ کیا بول رہی ہے؟ یہ کون سی بھاشا ہے؟"

"دیدی! ظالموں نے اس کی زبان کاٹ دی ہے۔ یہ ٹھیک طرح بول نہیں سکتی ہے۔ بے چاری بہت معصوم ہے اس کی عمر زیادہ ہے لیکن عقل کم ہے۔"

دیدی نے نین تارا کی طرف گھوم کر کہا "اور تمھاری عمر بھی کم ہے اور عقل بھی کم۔ کیا نام ہے تمھارا؟"

"نین تارا۔"

"نین تارا! تم مجھ سے چھوٹی ہو۔ مجھے خسرو کی طرح عزیز ہو۔ تمھیں ہر اچھی بات سمجھانا میرا فرض ہے۔ اگر سمجھنا چاہو تو میری بات سمجھ لو۔ میں ایک ہندو عورت ہوں۔ میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں لیکن یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتی کہ میرے ماتھے کی بندیا کسی اور کے ماتھے پر چمکے۔"

دیدی نے اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر ذرا اپنے قریب جھکایا۔ پھر اس کے ماتھے کو محبت سے چوم لیا۔

❁

وہ لانچ برہم پترا کی لہروں کو چیرتی ہوئی تیزی سے دوسرے کنارے کی طرف جا رہی تھی۔ دوسرا کنارا ابھی میلوں دور تھا۔ لانچ کی ریلنگ کے اوپر ایک لوہے کی راڈ چھت سے لگی ہوئی تھی۔ اس راڈ پر دو عدد رسیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ایک رسی کے آخری سرے پر ایک بچے کا دایاں ہاتھ بندھا ہوا تھا۔ دوسری رسی

کے آخری سرے پر اسی بچے کا بایاں ہاتھ بندھا ہوا تھا۔ وہ ان سے بندھا ہوا جھول رہا تھا۔ اگر رسی ٹوٹ جاتی تو وہ سیدھا برہم پترا کے گہرے پانی میں ہمیشہ کے لیے کھو جاتا۔

وہ بچہ تقریباً سات برس کا ہوگا۔ نیچے گہرے پانی کو دیکھ کر دہشت سے کبھی چیخ رہا تھا اور کبھی رو رو کر اپنے والدین کو آوازیں دے رہا تھا۔ لانچ کے نچلے حصے میں تیسرے درجے کے مسافروں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ مرد، عورتیں، بوڑھے، بچے سبھی اس بچے کو یوں دیکھ رہے تھے، جیسے وہ تماشا دیکھنا نہ چاہتے ہوں مگر دیکھنے پر مجبور ہوں۔

بچے کے آس پاس مکتی باہنی کے جوان اسٹین گن لیے ریلنگ سے لگے کھڑے تھے۔ مسافروں کی بھیڑ میں سے کچھ رحمدل بنگالیوں نے اعتراض کیا۔ کسی نے کہا۔ "بچے کو چھوڑ دو۔" کسی نے کہا۔ "دشمنی بڑوں سے ہوتی ہے بچوں سے نہیں ہوتی۔"

مکتی باہنی کے ایک جوان نے چیخ کر کہا۔ "ہم نے چوبیس برسوں میں یہ سیکھا ہے کہ ایک طرف سے سانپ آئے۔ دوسری طرف سے بہاری آئے تو پہلے بہاری کا سر کچلنا چاہیے کیونکہ سانپ کا کاٹا بچ سکتا ہے۔ بہاریوں کا مارا بچ نہیں سکتا۔"

مکتی باہنی کے دوسرے جوان نے اسی طرح چیخ کر کہا۔ "یہ بچہ ماوڑوں کی بھاشا بولتا ہے۔ یہ ضرور کسی سانپ کا بچہ ہے۔"

ایک عورت بھیڑ کو چیرتے ہوئے، چیختے ہوئے اس بچے کی طرف جانے لگی۔ "ایٹی امار چھیلے۔ امار کے دیئے داؤ۔ ایٹی امار چھیلے (یہ میرا بچہ ہے۔ مجھے دے دو۔ یہ میرا بچہ ہے)"

ایک مسلح جوان نے اسے پرے ہٹاتے ہوئے کہا۔ "نہیں بوکا (بیوقوف) نہ سمجھو۔ تم بنگالی ہو۔ یہ بہاری ہے۔"

اس عورت نے کہا۔ "میں بہاریوں کے محلے میں رہتی تھی۔ میرا بچہ ان کے بچوں کے ساتھ ہنستا، بولتا، کھیلتا تھا۔ اس لیے ان کی بولی بولتا ہے۔ اسے مجھے دے دو۔ یہ میرا ہے۔ تمہیں خدا کا واسطہ، ایک ماں کی بددعا نہ لو۔"

ایک مسلح جوان نے بچے کے پھول جیسے چہرے کو اپنے سخت کھردرے ہاتھ کی گرفت میں لیتے ہوئے پوچھا۔ "کیا یہ تمہاری ماں ہے؟"

بچہ نادان تھا۔ وہ صرف اپنی ماں کو ماں کہہ سکتا تھا۔ اس نے روتے ہوئے کہا۔ "نہیں، نہیں، میری امی کو بلاؤ۔ میرے ابو کو بلاؤ۔ امی! میں پانی میں گر جاؤں گا۔ ابو مجھے بچاؤ۔"

جانے وہ کس کا بچہ تھا۔ اس کے ماں باپ کہاں تھے؟ یقیناً اسی لانچ میں ہوں گے۔ ورنہ وہ بچہ وہاں کیسے پہنچ جاتا۔

ان دنوں بہاری اپنی اپنی پناہ گاہوں میں دبکے ہوئے تھے۔ کوئی اتنے لمبے سفر پر نہیں نکلتا تھا۔ اس لانچ میں تمام مسافر بنگالی تھے یا پھر وہ بہاری ہو سکتے تھے جو روانی سے بنگالی زبان بولتے تھے اور اپنی اصلیت کو چھپا سکتے تھے۔ بچے نادان ہوتے ہیں۔ وہ روپ بہروپ کو نہیں سمجھتے۔ اس لیے بے اختیار مادری زبان میں بولنے لگتے ہیں۔

ایک بنگالی مسافر نفھے سے بچے کو سینے سے لگائے ہوئے تھا۔ اس نے بلند آواز سے کہا۔ "ایسا ظلم نہ کرو۔ سب بچے معصوم ہوتے ہیں۔"

مکتی باہنی کے ایک جوان نے غصے سے جھنجلا کر کہا۔ "تم لوگ کیسے بے حس ہو؟ اتنی جلدی بھول گئے کہ ان بہاریوں نے تمہارے معصوم بچوں کو چھری تلے ذبح کیا تھا۔ انھیں ان معصوموں پر رحم نہیں آیا تھا۔ ان میں سے کسی نے نہیں کہا کہ سب بچے معصوم ہوتے ہیں۔"

ایک اور بنگالی نے اٹھ کر کہا۔ "شاید کسی بہاری نے بھی یہی بات کہی ہوگی۔ کیونکہ ہر قوم میں صرف ظالم نہیں ہوتے۔ مظلوموں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ شریف زیادہ اور بدمعاش کم ہوتے ہیں اور جو کم ہوتے ہیں۔ جن کے ہاتھوں میں ہتھیار ہوتے ہیں۔ وہی ظالم اور بدمعاش ہوتے ہیں۔"

مسلح جوان نے آگے بڑھ کر اسٹین گن کے دستے سے اس کے چہرے پر ضرب لگائی۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے گرا اور تکلیف سے کراہنے لگا۔ اس نے گالیاں دیتے ہوئے کہا۔ "ہم نے اس دیش کو آزاد کرایا ہے۔ ہم مکتی باہنی والے نہ ہوتے تو آج بھی تم لوگ پاکستانی حکمرانوں کے غلام بنے رہتے۔"

سب کو چپ لگ گئی۔ کچھ بنگالی ایسے تھے جو کسی بھی بہاری سے انتقام لینا نہیں چاہتے تھے۔ ان کا مشورہ تھا کہ جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب اپنے دیش کو بنانے کی فکر کرنا چاہیے۔ کچھ بنگالی انتقام کی آگ میں جل رہے تھے لیکن اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو دوسروں کے معاملات میں پڑنا نہیں چاہتے تھے۔ اپنے دال بھات اور بال بچوں کی فکر میں مبتلا رہتے تھے۔ اس کے باوجود وہاں جتنے بچوں والے تھے۔ وہ سب دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہے تھے کہ وہ معصوم زندہ رہ جائے اور اس کے ماں باپ کہیں سے آجائیں۔

پچھلے دنوں خوب بارش ہوئی تھی۔ دریا لبالب بھرا ہوا تھا۔ لانچ تیز رفتاری سے منہ زور لہروں کو کاٹتے ہوئے گزرتی جا رہی تھی اور لہریں یوں بپھر رہی تھیں، یوں اچھل رہی تھیں جیسے بچے کو اپنی آغوش میں لے کر ہی دم لیں گی۔ لانچ کے

عرشے پر فرسٹ کلاس اور سیکنڈ کلاس مسافروں کے لیے کیبن بنے ہوئے تھے لیکن ان دنوں کوئی کسی کو اپنے مقابلے میں فرسٹ کلاس اور سیکنڈ کلاس تسلیم نہیں کرتا تھا۔ آزادی کے جوش میں رہنے والے جوان تیسرے درجے کا ٹکٹ لے کر پہلے درجے میں بے روک ٹوک گھس آتے تھے۔ کوئی ان کے منہ لگنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ مکتی باہنی کے دو مسلح جوان عرشے پر آکر اعلان کر رہے تھے۔ "یہ بچہ کس کا ہے؟ جس کا بھی ہے سامنے آجائے پھر ہم اس بچے کو نہیں ماریں گے۔ نہیں تو یہ پانی میں بہہ جائے گا۔"

سبھی اس تجسس میں مبتلا تھے، آخر وہ بچہ کس کا ہے؟ اس کے والدین یا سرپرست سامنے کیوں نہیں آرہے ہیں؟ اس کا ایک ہی جواب سمجھ میں آتا تھا کہ اس بچے کے پیچھے بہاریوں کا پورا ایک خاندان ہے جو بنگالی مسافروں میں گڈمڈ ہوگیا ہے اور ان کی شناخت نہیں ہو رہی ہے۔

عورتیں سوچ رہی تھیں، ایک ماں ممتا کے بے اختیاری جذبے سے پہچانی جاتی ہے۔ وہ بچے کی ایک چیخ پر ضبط کے سارے بندھن توڑ کر چلی آتی ہے۔ آخر اس بچے کی ماں کیسی ہے؟ کیا اپنی جان بچانے کے لیے بچے کی جان کو داؤ پر لگا رہی ہے؟

کیوں نہ لگائے؟ جب یہ بات یقینی ہے کہ بچے کے سامنے جانے کی تو بچہ زندہ نہیں رہے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ بھی ماری جائے گی۔ شاید اس کے ساتھ اس کے خاندان کے دوسرے لوگ بھی مارے جائیں۔ ایک بچے کی خاطر وہ پورے خاندان کو قاتلوں کے سامنے بے نقاب نہیں کر سکتی تھی۔

فرسٹ کلاس کے ایک مسافر نے پولیس انسپکٹر سے کہا۔ "جناب! آپ آرام فرما رہے ہیں اور وہاں غیر قانونی حرکتیں ہو رہی ہیں۔ یہاں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو اپنے سینے میں انسان کا دل رکھتے ہیں اور انسان کا دل رکھنے والے کسی معصوم بچے کو اس طرح مرتے نہیں دیکھ سکتے۔"

انسپکٹر نے فرسٹ کلاس کی سیٹ پر آرام سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ "میں کیا کرسکتا ہوں۔ ہم بظاہر قانون کے محافظ ہیں۔ لیکن دیکھو لوگو میرے پاس ایک ریوالور ہے جس میں صرف چار گولیاں ہیں۔ باقی رہے میرے چار سپاہی ان کے پاس لاٹھیاں ہیں۔ اس کے برعکس مکتی باہنی کے جوان اسٹین گن لیے پھرتے ہیں۔ وہ میری بات نہیں مانیں گے۔ وہ ایک ہی قانون جانتے ہیں کہ بہاریوں کو بالکل ختم کر ڈالو یا بنگلہ دیش سے باہر نکال دو۔"

ایک اور مسافر نے کہا۔ "ہم تمام بہاریوں کی بات نہیں کر رہے ہیں۔ صرف ایک معصوم بچے کی جان بچانے کے لیے کہہ رہے ہیں۔ تم اپنے سپاہیوں کے ساتھ جاکر انہیں سمجھانے کی کوشش تو کرو۔"

"میں اب سے پہلے ستتا بار کے مکتی باہنی والوں کو سمجھا چکا ہوں اور اس کے نتیجے میں گالیاں سن چکا ہوں۔ خیریت ہوئی کہ انھوں نے مجھے جان سے نہیں مارا۔ ہم میں سے اگر کوئی بنگالی بہاریوں کی حمایت میں کچھ کہتا ہے تو وہ غدار کہلاتا ہے۔ ہمارا نام ان بنگالیوں کی فہرست میں شامل ہو جاتا ہے۔ جنھوں نے حکومتِ پاکستان کا ساتھ دیا تھا۔"

ایک عورت نے غصے سے کہا۔ "آپ انسپکٹر کی وردی پہن کر صرف باتیں بنانا جانتے ہیں۔ اس پھول جیسے بچے کی ننھی کلائیاں رسیوں سے بندھی ہوئی ہیں۔ وہ اسی طرح لٹکا رہے گا تو کلائیاں کٹ جائیں گی۔ وہ پانی میں ڈوب جائے گا۔"

انسپکٹر نے کہا۔ "آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔ اگر وہ بچے کو مارنا چاہتے تو بہت پہلے مار چکے ہوتے۔ یہ ڈرامہ نہ کرتے۔ یہ محض اس کے والدین کو بے نقاب کرنے کے لیے کیا جا رہا ہے۔ قصور مکتی باہنی والوں کا نہیں، بچے کے والدین کا ہے۔ وہ سامنے کیوں نہیں آتے؟ کیوں ہم مسافروں کو پریشان کر رہے ہیں؟"

اس بنگالی خاتون نے کہا۔ "تو پھر آپ مکتی باہنی کے جوانوں کو یہی سمجھائیں کہ بچے کو رسی سے آزاد کردیں۔ اسے لے کر لانچ کے نچلے حصے سے اوپری حصے تک گھومتے پھریں اور ایک ایک مسافر عورت اور مرد کی صورت دکھاتے رہیں۔ بچہ ان میں یقیناً اپنے والدین کو پہچان لے گا۔"

مشورہ معقول تھا۔ انسپکٹر اپنی جگہ سے اٹھ کر فرسٹ کلاس کیبن سے باہر آیا۔ اس کا ایک سپاہی لانچ کے اوپری حصے میں تھا۔ باقی تین سپاہی نچلے حصے میں تھے۔ جو لوگ بغیر ٹکٹ سفر کر رہے تھے، ان سے وہ روپے، دو روپے یا چار روپے وصول کر رہے تھے۔ یہی ان کی اوپری آمدنی تھی۔ انسپکٹر فرسٹ کلاس کے کیبن میں بیٹھا اوپری آمدنی کا حساب کرنے والا تھا۔ اعلیٰ درجے کے تعلیم یافتہ مسافروں کے اصرار پر وہ کیبن سے باہر نکلنے پر مجبور ہوگیا۔ اس نے اپنے چاروں سپاہیوں کو بلایا پھر ان کے ساتھ مکتی باہنی کے جوانوں کے پاس آکر کہا۔ "یہ مناسب طریقہ نہیں ہے۔ بچہ آخر بچہ ہے۔ اس کی رسیاں کھول دو۔"

ایک جوان نے کہا۔ "انسپکٹر! ہم تمھارے معاملات میں دخل نہیں دے رہے ہیں۔ ورنہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ تم اسے

سپاہی یہاں تینیں گرم کرتے پھر رہے ہیں۔"

انسپکٹر نے جھینپ کر کہا۔" وہ تو ٹھیک ہے۔ رشوت خوری یا تھوڑی سی ہیرا پھیری اور بات ہے لیکن عوام کے سامنے دہشت پھیلانا بہت بڑا جرم بھی ہے اور غیر انسانی سلوک بھی ہے۔"

" انسپکٹر! ان کے لیے یہ غیر انسانی سلوک نہیں ہے۔ جنھوں نے اس بچے کو پیدا کیا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اب تک ہمارے سامنے آچکے ہوتے۔"

" اس قدر تشدد کا مظاہرہ کرنے سے وہ سامنے نہیں آئیں گے۔ شاید بچے کی موت پر بھی خود کو بے نقاب نہ کریں۔ اس کی ایک دوسری صورت ہے۔"

" وہ کیا ہے؟"

" اس بچے کی رسیاں کھول دو پھر اسے ہمارے ساتھ لے کر لانچ کے نچلے حصے سے اوپری حصے تک گھومتے پھرو۔ بچہ ایک ایک مسافر کا چہرہ دیکھے گا اور اپنے والدین کو پہچان لے گا۔"

ایک جوان نے غصے سے کہا۔" ہم کسی کے باپ کے نوکر نہیں ہیں۔ ہم کیوں اس بچے کو لے کر اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر گھومتے رہیں جسے غرض ہوگی وہ اِدھر آئے گا۔"

" آنا ہوتا تو اب تک آچکا ہوتا۔"

" نہیں آئے گا تو ابھی ہم اور انتظار کریں گے۔ آدھے گھنٹے کے بعد اس بچے کے ایک ہاتھ کی رسی کاٹ دی جائے گی۔ پھر یہ ایک ہاتھ سے لٹکتا رہے گا۔ پھر آدھے گھنٹے کے بعد دوسرے ہاتھ کی رسی بھی کاٹ دی جائے گی۔"

ایک مسلح جوان نے کہا۔" نہیں، ہم ایسی حماقت نہیں کریں گے۔ رسی کو کاٹیں گے تو کٹ جائے گی۔ پھر وہ رسی کسی کام نہیں آئے گی۔ البتہ بچے کے ہاتھ کاٹ دیے جائیں گے وہ پانی میں چلا جائے گا۔ رسیاں ہمارے کام آنے کے لیے رہ جائیں گی۔"

انسپکٹر تھوڑی دیر تک ان مسلح جوانوں سے بحث کرتا رہا انھیں سمجھانے کی کوششیں کرتا رہا۔ پھر مایوس ہو کر عرشے پر آگیا فرسٹ کلاس کے ایک مسافر نے پوچھا۔" کیا ہوا ہے؟"

" وہی جو ہوتا آرہا ہے۔ وہ کسی کی نہیں سنتے اور بھلا کیوں سنیں گے۔ جب یہ ملک پاکستان کہلاتا تھا تب ان مکتی باہنی کے جوانوں کو یہاں سے بھاگنا پڑا۔ سرحد پار جا کر انھوں نے بھارت میں پناہ لی۔ وہاں انھوں نے کیسی کیسی مصیبت اٹھائی۔ کس طرح ہتھیار حاصل کیے۔ گوریلا جنگ کی تربیت حاصل کی۔ بنگلہ دیش کے لیے ان لوگوں نے دن رات بھوکے رہ کر، ایک آنکھ سے سو کر، ایک آنکھ سے جاگ کر ہمیں آزادی دلائی ہے۔ ہم ان کے خلاف کچھ بول نہیں سکتے اور ہمیں بولنا نہیں چاہیے۔"

" ہاں نہیں بولنا چاہیے، لیکن آزادی دلانے والے ناقابلِ برداشت ظلم و ستم کے ذریعے آزادی کو بدنام کرنے لگیں تو چپ نہیں رہنا چاہیے۔"

سب نے اس بولنے والے کی طرف دیکھا۔ وہ ایک قدآور شخص تھا۔ اس نے پتلون اور نصف آستین کی بشرٹ پہنی ہوئی تھی۔ اس کی داڑھی مونچھیں اور سر کے بال اس قدر بڑھے ہوئے تھے کہ چہرے کا بہت کم حصہ نظر آتا تھا۔ اس کا لباس اور جوتے کیچڑ آلود تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ پانی میں ڈوبے ہوئے کھیتوں سے اور دلدلوں سے گزرتا آیا ہو۔ اب اس کے جسم اور لباس پر کیچڑ سوکھ گئی تھی۔ اس کی بغل میں کوئی چیز دبی ہوئی تھی اور وہ چیز کپڑوں میں لپٹی ہوئی تھی۔ جیسا اس نے چھوٹا سا بستر باندھ کر بغل میں داب رکھا ہو۔ انسپکٹر نے پوچھا۔" تومی کے (تم کون ہو)؟"

اس قدآور نے جواب دیا۔" میں کون ہوں۔ میرا نام کیا ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بعض اوقات بہت سے نام سمجھ میں نہیں آتے۔ اگر آتے ہیں تو مجھے بتایا جائے کہ اوڑما کا مطلب کیا ہے؟"

سب لوگ اسے تعجب سے دیکھنے لگے۔ اس نے کہا۔" اوڑما ایک حسین عورت کا نام ہے۔ وہ عورت اس وقت بھی میری نگاہوں کے سامنے ہے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں مجھے محبت سے پکار رہی ہیں۔ مجھے اپنا نام بتا رہی ہیں۔" اوڑما!"

ایک سپاہی نے ہنستے ہوئے کہا۔" یہ کسی کا دیوانہ معلوم ہوتا ہے۔ بھلا اوڑما کوئی نام ہوتا ہے۔"

اس نے کہا۔" ہاں، اگر کسی کی زبان کٹی ہو اور وہ اپنی کٹی ہوئی زبان سے اپنا نام ادا کرے تو یہی ادا ہوتا ہے۔ میں نے ذہن پر بہت زور دیا۔ جس نام کے آخر میں ما آتا ہے وہی اس کا نام ہو سکتا تھا۔ نجمہ، سلمیٰ۔ اگر وہ پنجابی عورت ہے تو ریشماں۔ ہندو عورت ہے تو رما، سوما۔ جانے کتنے نام ہوتے ہیں۔ مگر سچ پوچھو تو مجھے اوڑما سے خوبصورت کوئی نام نہیں لگتا۔ کیونکہ یہ محبت کی کٹی ہوئی زبان سے ادا ہوا۔ یہ کٹا ہوا نام زخمی محبت کی طرح میرے سینے میں دھڑک رہا ہے۔"

ایک عورت نے ناگواری سے کہا۔" یہاں ایک بچے کی جان جانے والی ہے اور تم اپنی محبت کا قصیدہ پڑھ رہے ہو۔"

" بچے کو عورت پیدا کرتی ہے اور عورت کی محبت مرد کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کی حفاظت کرے۔ میں بہت دیر سے اس بچے کو دیکھ رہا تھا جو رسیوں سے بندھا ہوا ہے۔

کسی وقت بھی رسیاں کاٹی جا سکتی ہیں اور اسے پانی میں ڈبویا جا سکتا ہے۔ میں سچ کہتا ہوں، اس بچے کو دیکھتے ہی ابھی ابھی اوڈما دلھن بن کر میرے پاس آگئی تھی۔ میں اپنے ایمان سے اور روح کی گہرائیوں سے محبت کرتا ہوں۔ محبت بنگالیوں اور بہاریوں کی جاگیر نہیں ہے۔ محبت کسی سے بھی کی جا سکتی ہے میں نے دیکھا، اوڈما ایک بچے کی ماں بن گئی ہے۔ وہ بچہ سات یا آٹھ برس کا ہو گیا ہے اور اسے دشمنوں نے رسیوں سے باندھ کر لٹکا دیا ہے۔ میرے سر کے اندر اوڈما چیخ رہی ہے۔ میرے بچے کی جان بچاؤ۔ میں موجود نہیں ہوں تو کیا تم میرے بچے کو مرنے کے لیے چھوڑ دو گے ہ ماں جنم دیتی ہے۔ باپ بچے پہ سایہ بن کر رہتا ہے۔ ماں بچے کو دودھ پلاتی ہے۔ باپ خون اور پسینہ ایک کرتا ہے۔ میں اپنا بچہ تم سے لوں گی، میں اپنا بچہ تم سے لوں گی۔ یہ آواز میرے سر کے اندر گونج رہی ہے۔"

وہ سب چپ چاپ اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ ایسا کہنے کے دوران اپنی بغل میں دبے ہوئے بستر کو کھول رہا تھا۔ لپٹے ہوئے کپڑوں کو نکال کر نیچے قدموں کے پاس گراتا جا رہا تھا۔ پھر اس کے اندر سے جو چیز برآمد ہوئی اسے دیکھتے ہی سب سہم کر پیچھے ہٹ گئے۔ اس کے ہاتھ میں اسٹین گن تھی۔

انسپکٹر نے پوچھا "تم کون ہو؟"

"ہمارا نام کولیمو دین بھوتیاں (میرا نام کلیم الدین بھوتیاں ہے) یہ اسٹین گن میں نے اپنی اور اوڈما کی حفاظت کے لیے حاصل کی تھی۔ اب اسے اس بچے کی حفاظت کے لیے استعمال کروں گا۔"

انسپکٹر نے انکار کے انداز میں ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا "نہیں، تم ایسا نہیں کرو گے۔ وہ تمھارا بچہ نہیں ہے۔ تم جذباتی بن رہے ہو۔ وہ تمھاری اوڈما کا بچہ نہیں ہے۔"

وہ غصے سے گرج کر بولا "میری اوڈما نے اس بچے کو جنم دیا ہے۔ اسے اپنی گود میں کھلایا ہے۔ اسے اپنا دودھ پلایا ہے۔ اب میرا کام شروع ہو گا۔"

"دیکھو مسٹر بھوتیاں! اگر تم نے اسٹین گن کو استعمال کیا تو یہاں آگ اور خون کی ہولی شروع ہو جائے گی۔ بہت سے بے گناہ مسافر مرد، عورتیں، بچے بوڑھے فائرنگ کی زد میں آکر مارے جائیں گے۔"

"تو پھر سیدھی سی بات ہے انسپکٹر! تم قانون کے محافظ ہو ان لوگوں کو قانون ہاتھ میں لینے سے روکو۔ اپنے اختیارات استعمال کرو۔ اگر تمھیں اس بات کی شکایت ہے کہ وہ ہتھیاروں کے اعتبار سے برتر ہیں اور تمھاری بات نہیں مانیں گے۔ تو میں تمھارے پیچھے اسٹین گن لیے کھڑا رہوں گا۔ ہتھیاروں کے اعتبار سے دونوں طرف برابر کی ٹکر ہو گی۔"

"مگر وہ تعداد میں چار ہیں۔ ان کے پاس چار اسٹین گنیں ہیں۔ تم ایک ہو۔ تمھارے پاس ایک..."

اس نے بات کاٹ کر سخت لہجے میں کہا "انسپکٹر! ایو آر آن ڈیوٹی، ڈیوٹی دینے والا سپاہی دشمنوں کی تعداد نہیں دیکھتا۔ وہ اپنے حوصلوں کو آزماتا ہے اور اپنے فرائض انجام دیتا ہے۔ تم بھی یہی کرو گے ورنہ..."

انسپکٹر نے اسٹین گن کی طرف دیکھتے ہوئے پریشان ہو کر پوچھا۔ "ورنہ؟"

"تم ابھی ان سب لوگوں کے سامنے قانون کی وردی اتار کر دریا میں بہا دو گے۔ جب یہاں قانون نہیں ہو گا تو پھر لاقانونیت ہو گی۔"

اس نے ایک ہاتھ سے اسٹین گن سنبھالتے ہوئے دوسرے ہاتھ کی دو انگلیاں دکھاتے ہوئے کہا "پھر دو میں سے ایک بات ہو گی۔ وہ بچہ زندہ سلامت میری گود میں آئے گا یا پھر اس لانچ کا ایک مسافر بھی دوسرا کنارہ نہیں دیکھ سکے گا۔ اس بچے کے ساتھ یہ لانچ بھی دریا میں غرق ہو جائے گی۔ میرا نام کلیم الدین بھوتیاں ہے۔ میں جو کہتا ہوں۔ وہ کر دکھاتا ہوں۔"

وہ عمارت آسیب زدہ تھی۔

آسیب زدہ عمارت کا تصور کسی ویرانے میں کیا جاتا ہے یا ایسی جگہ جو آبادی کے آخری سرے پر ہو، جہاں دن کے وقت بھی جانے والوں کے گھٹنے کانپنے لگتے ہوں لیکن وہ عمارت ویرانے میں نہیں تھی۔ اس کے دروازے پر مٹی کے دو شیر بنے ہوئے تھے اس لیے وہ عمارت شیر بلڈنگ کے نام سے مشہور ہو گئی تھی۔ اس کے آس پاس تنگ گلیاں تھیں۔ وہاں ایک دوسرے کے قریب مکانات بنے ہوئے تھے۔ لوگ دن رات اُدھر سے گزرتے رہتے تھے اس کے باوجود وہاں دن ہو یا رات، کبھی کسی عورت کی چیخ سنائی دیتی تھی اور وہ اس عمارت سے نکل کر بھاگ آتی تھی، کبھی کوئی بوڑھا مرد یا کوئی بچہ چیختے چیختے بے ہوش ہو جاتا تھا۔

خسرو مین روڈ کو چھوڑ کر اسی گلی میں مڑ گیا جو شیر بلڈنگ کے سامنے سے گزرتی تھی۔ مین روڈ پر چلتا تو اسے ذرا گھوم کر جانا پڑتا۔ اس گلی سے ہو کر وہ جلد ہی برڈو دیدی کی حویلی تک پہنچ سکتا تھا۔ اس وقت رات کے آٹھ بجے تھے کہیں کہیں بجلی کی روشنی تھی اور جہاں روشنی نہیں تھی، وہاں دور تک نیم تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے شیر بلڈنگ کے متعلق سن رکھا تھا لیکن کوئی اسے یہ نہ بتا سکا تھا کہ اس بلڈنگ میں کوئی آسیب ہے۔

یا کوئی بلا ہے' یا کیا ہے؟

اس نے عمارت کے سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھا' باہر تاریکی تھی۔ دو شیر منہ کھولے اپنے دانتوں کی نمائش کر رہے تھے۔ شیر بلڈنگ کے اندر تاریکی نہیں تھی۔ ایک کھلی ہوئی کھڑکی سے لالٹین کی زرد روشنی جھلک رہی تھی۔ وہاں بظاہر دہشت زدہ کرنے والی کوئی بات نہیں تھی۔ آدھی رات کے بعد بھی لوگ اس عمارت کے سامنے سے گنگناتے ہوئے یا سیٹی بجاتے ہوئے گزر جاتے تھے۔

خسرو کے دل میں ایک ذرا سا خوف نہ تھا۔ وہ بڑے مزے سے ٹہلنے کے انداز میں عمارت کے سامنے سے گزر گیا لیکن چند قدم آگے جاتے ہی ایک دم سے اچھل پڑا۔ ایک فلک شگاف چیخ سنائی دی تھی۔ وہ چیخ اسی عمارت کے اندر سے گونجتی ہوئی باہر آئی تھی۔

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اس ماحول میں کوئی ہلچل پیدا نہیں ہوئی تھی۔ آس پاس کے مکانات اسی طرح خاموش تھے۔ البتہ ایک آدھ کھڑکی' دروازے کھل گئے تھے۔ عورتیں وہاں سے جھانک کر شیر بلڈنگ کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ دو چار مرد اپنے مکان کے سامنے آکر کھڑے ہوگئے تھے چیخنے کی آوازیں کچھ وقفے سے آتی جا رہی تھیں۔ خسرو نے آگے بڑھ کر ایک شخص سے پوچھا "بھائی صاحب! کیا بات ہے۔ یہاں کون چیخ رہا ہے؟"

اس نے بیزاری سے کہا "یہاں تو آئے دن کوئی نہ کوئی چیختا ہی رہتا ہے۔"

"لیکن بات کیا ہے؟"

اس نے کہا "بھئی کیوں میرا سر کھاتے ہو۔ جا کر دیکھ لو۔ اس عمارت کے اندر جانے پر کوئی پابندی تو ہے نہیں۔"

اس نے حیرانی سے پوچھا "لیکن آپ اتنی بیزاری سے جواب کیوں دے رہے ہیں؟"

"کیوں نہ دوں۔ آپ تو ابھی یہاں سے گزر جائیں گے ہم یہاں دن رات رہتے ہیں۔ آدھی رات کے بعد بھی کوئی چیخنا شروع کرے گا اور ہماری نیند اڑ جائے گی۔ یہ باہر سے آنے والے ہمارے لیے مصیبت بن گئے ہیں۔"

وہ شخص ان لوگوں کو باہر سے آنے والے کہہ رہا تھا جو بنگال' دیناج پور اور پاربتی پور وغیرہ سے جان بچا کر سید پور آئے تھے۔ خسرو نے کہا "بھائی صاحب! یہ تمام آنے والے آپ کی طرح اردو بولتے ہیں۔ آپ کی طرح بہاری اور پنجابی ہیں۔ قیام پاکستان کے وقت جس طرح آپ لوگ باہر سے یہاں آئے تھے۔ اسی طرح اب یہ لوگ پناہ لینے کے لیے آئے ہیں۔"

اس نے ناگواری سے کہا "یہ کیا ضروری ہے کہ سبھی لوگ مرنے کے لیے سید پور پہنچ جائیں۔ ان کے آنے سے مہنگائی آسمان تک پہنچ گئی ہے۔ ہم یہاں دانے دانے کے لیے ترستے ہیں۔ راشن اتنا مہنگا ہے کہ روز اپنے گھر کی کوئی چیز بیچنے کے بعد بھی پیٹ نہیں بھرتا۔"

"آپ کے خیال میں بہاری پناہ گزیں بے موت مرنے کے لیے یہاں سے چلے جائیں۔ تاکہ آپ کے زندہ رہنے کے لیے راشن سستا ہو جائے۔"

اس نے گھور کر خسرو کو دیکھا۔ اسی وقت پھر چیخ سنائی دی۔ خسرو تیزی سے چلتا ہوا شیر بلڈنگ کے دروازے پر آیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر ایک بہت ہی وسیع و عریض ہال تھا۔ اس ہال میں جگہ جگہ پھٹی پرانی چادریں تان کر دیواریں کھڑی کر دی گئی تھیں۔ ان چادروں کی دیواروں کے درمیان چھوٹے چھوٹے کمرے سے بن گئے تھے۔ ہر چادر کی چار دیواری میں بہاریوں کا ایک ایک خاندان آباد تھا۔ وہ عمارت بالکل بوسیدہ سی تھی۔ دیواروں پر جگہ جگہ سے پلاسٹر ادھڑے ہوئے تھے۔ چھت سے پانی رستا رہتا تھا۔ اس لیے چھت اور دیواروں پر کہیں کہیں کائی سی جم گئی تھی۔ ہال کے وسط میں کچھ لوگوں نے ایک پندرہ برس کے لڑکے کو پکڑ رکھا تھا۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ اس کی حالت سے پتا چل رہا تھا کہ وہ بہت ہی دہشت زدہ ہے۔ ایک بوڑھی عورت اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھی کچھ لوگ اسے سمجھا رہے تھے۔ ایک مولوی صاحب کچھ پڑھ کر اس پر پھونک رہے تھے۔ ایک صاحب پانی دم کرکے اسے پلا رہے تھے۔ خسرو تھوڑی دیر تک کھڑا انھیں دیکھتا رہا پھر اس نے پوچھا "اسے کیا ہوگیا ہے؟"

ایک نے جواب دیا "کچھ نہیں۔ بے چارہ دہشت زدہ ہے۔ یہاں اس نے کچھ دیکھا ہے۔"

"کیا دیکھا ہے؟"

"یہ تو ہم نہیں جانتے۔"

"کیا تم یہیں رہتے ہو؟"

"پچھلے چار ماہ سے اس ہال میں رہتا ہوں لیکن مجھے آج تک کچھ نظر نہیں آیا۔ کسی چیز نے مجھے دہشت زدہ نہیں کیا۔"

خسرو نے اس خوفزدہ لڑکے کے پاس آکر اس کے شانے کو تھپکتے ہوئے پوچھا "جوان! کیا بات ہے۔ تم تو دیکھنے میں بڑے صحت مند اور دلیر نظر آتے ہو۔ کس بات سے ڈر رہے ہو؟"

اس نوعمر لڑکے نے دیدے گھما کر خسرو کو دیکھا لیکن جواب نہ دے سکا۔ بعض اوقات دہشت کے مارے زبان نہیں کھلتی۔ ایک شخص نے کہا "بات یہی سمجھ میں آتی ہے کہ ہم سب آفت زدہ ہیں۔ ہم میں سے کسی کی آنکھوں کے سامنے جوان بیٹوں کو ہلاک کیا گیا'

کسی کے سامنے اس کی بیوی، بہن اور بیٹی کی عزت کو کھلونا بنایا گیا۔ ایسے ایسے ظلم ڈھائے گئے، جن کی یاد آنے سے بے اختیار چیخیں نکل جاتی ہیں۔ یہ عمارت آسیب زدہ نہیں ہے۔ ہم آفت زدہ ہیں۔"

ایک شخص نے جواباً کہا۔ "ویسے تو ہم سب آفت زدہ ہیں لیکن ہم جنون میں مبتلا نہیں ہوتے۔ یہاں کچھ لوگوں کی طرح بے اختیار نہیں چیختے۔"

ایک بوڑھے نے کہا۔ "بیٹے! کچھ لوگ جنونی ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ آسیب زدہ ہوتے ہیں۔ یہی دیکھو کہ اب تک کتنے ہی مرد عورتیں اور بچے جنون میں مبتلا ہو کر یہاں سے چلے گئے۔ سید پور میں جگہ جگہ پناہ لیتے رہے۔ ہزاروں خاندان ریلوے لائن کے دونوں کناروں پر جھگیاں ڈالے آباد ہیں۔ ہزاروں لوگ مختلف کرائے کے مکانوں میں رہتے ہیں۔ ایسے لاکھوں افراد ہیں جو ظلم اور بربریت کا ناٹک اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آئے ہیں لیکن کسی جگہ رہ کر وہ جنون میں مبتلا نہیں ہوتے۔ کبھی بے اختیار چیخیں نہیں مارتے۔ صرف یہ عمارت ایسی ہے جہاں آ کر جنون میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ آخر کیوں؟"

وہ بوڑھا درست کہہ رہا تھا۔ خسرو وہاں ایک ہفتے سے یہی سنتا آ رہا تھا کہ شیر بلڈنگ آسیب زدہ ہے لیکن اب تک یہ نہیں سنا تھا کہ باہر سے آنے والے پناہ گزین کسی پناہ گاہ میں اس طرح چیختے چلاتے اور جنون میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ایک شخص نے کہا۔ "بڑے میاں ٹھیک کہتے ہیں۔ یہاں اب تک جتنے لوگ آسیب میں مبتلا تھے، وہ باہر دوسری جگہ جا کر ٹھیک ہو گئے۔ ان پر جنون طاری نہیں ہوتا ہے۔ یہاں ضرور کچھ ہے جو ہمیں تو نظر نہیں آتا لیکن چند لوگوں کو نظر آتا ہے اور وہ یہاں سے گھبرا کر چلے جاتے ہیں۔"

خسرو نے کہا۔ "انہیں روکنا چاہیے، ان سے پوچھنا چاہیے کہ آخر وہ کیا دیکھتے ہیں؟ کیوں چیختے ہیں؟"

ایک اور بوڑھے نے کہا۔ "ہم کسی کو یہاں روک کر اس کی جان کے دشمن بننا نہیں چاہتے۔ یہاں کوئی نادیدہ بلا ہے۔ پہلے وہ ایک جوان لڑکی پر آئی تھی۔ وہ یہاں سے بھاگنا چاہتی تھی۔ ہم اسے روکتے رہے، اس سے پوچھتے رہے پھر وہ مر گئی۔ اس کے بعد ایک بوڑھی عورت جان سے گئی۔ اس کے بعد ایک بچہ اور پھر ایک جوان مر گیا۔ یہ بات ہماری سمجھ میں آ گئی کہ یہاں آنے کے بعد جو بھی دہشت زدہ ہوتا ہے اسے روکنا نہیں چاہیے بلکہ جلد سے جلد یہاں سے بھگا دینا چاہیے۔"

خسرو نے پوچھا۔ "کیا اس نادیدہ بلا سے آپ لوگوں کو ڈر نہیں لگتا ہے؟"

"ہم ڈر کر کیا کریں گے۔ یہ جگہ چھوڑ کر جائیں گے تو کہیں مفت رہنے کو جگہ نہیں ملے گی۔ کرایہ ادا کرنا پڑے گا یا ریلوے لائن کے کنارے جھگی ڈال کر رہیں گے۔ وہاں کبھی پولیس والے اور کبھی غنڈے آ کر تاک جھانک کرتے ہیں۔ کچھ پیسے وصول کرتے ہیں، مار پیٹ کرتے ہیں، ہماری بہو بیٹیوں پر بری نظر ڈالتے ہیں۔ یہاں عزت بھی محفوظ ہے اور کرایہ بھی ادا نہیں کرنا پڑتا ہے۔ اگر کوئی بلا آئے گی تو زیادہ سے زیادہ جان لے گی۔ لیکن عزت نہیں لے گی۔ نہ غنڈہ ٹیکس وصول کرے گی۔"

خسرو نے وہاں سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "انسان انسانوں سے اس قدر سہما ہوا ہے کہ اب نادیدہ بلاؤں کی دہشت کوئی معنی نہیں رکھتی۔"

وہ پلٹ کر دروازے کی طرف جانا چاہتا تھا۔ چادروں کی ایک چار دیواری میں ایک جوان شخص نظر آیا۔ وہ تاڑ کی چٹائی پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے گلے پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اسے دیکھ کر تعجب ہوا کہ وہ سانس کس طرح لیتا ہوگا۔ اس نے قریب جا کر پوچھا۔ "تمہیں کیا ہوا تھا؟ یہ پٹیاں اس طرح کیوں بندھی ہوئی ہیں؟"

اس نے خسرو کو ایسے دیکھا جیسے کسی احمق کو دیکھ رہا ہو۔ اس کے ہونٹ کھلے لیکن آواز نہیں نکل سکی۔ دو چار آدمی اس کے آس پاس آ کر بیٹھ گئے۔ ایک نے کہا۔ "بھائی صاحب! یہ بولے گا کیسے؟ اس کے گلے پر پٹیاں بندھی ہوئی ہیں۔ ہم بڑی مشکلوں سے ستو یا بھات کا پانی اس کے حلق تک پہنچاتے ہیں اور یہ آہستہ آہستہ اسے نگلتا ہے۔"

خسرو نے پوچھا۔ "کیا دشمنوں نے اس کی گردن پر وار کیا تھا؟"

"ہاں، یہ سنتاہار کا رہنے والا ہے۔ آپ شاید جانتے ہوں گے، سنتاہار میں ایک بھی بہاری زندہ نہ رہ سکا۔ سبھی کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ ان قتل ہونے والوں میں یہ شخص بھی ہے۔ اس کا نام شہباز ہے۔ سنتاہار ریلوے لائن کے پاس سیکڑوں بہاریوں کو تہ تیغ کیا گیا۔ کسی کو گولی ماری گئی۔ کسی کی گردن پر چھری پھیری گئی۔ اس کی گردن بھی خنجر سے کاٹی گئی تھی۔ یہ ان لاشوں کے درمیان پڑا رہا۔ مارنے والوں نے سمجھا کہ یہ مر چکا ہے۔ یہ تمام دن وہاں پڑا بارش میں بھیگتا رہا۔"

شہباز کچھ کہہ نہیں سکتا تھا لیکن کہنے والوں کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے کہنے والے کے بازو کو تھام لیا۔ وہ کہتے کہتے رک گیا۔ شہباز نے اپنے ہاتھ کی دو انگلیاں دکھائیں۔ تب ایک شخص نے کہا۔ "یہ کہہ رہا ہے۔ وہاں بارش میں ریلوے لائن پر

ایک دن نہیں بلکہ دو دنوں تک پڑا رہا۔“

خسرو نے پوچھا۔ ”جب یہ بول نہیں سکتا ہے تو آپ لوگوں کو اس کی روداد کیسے معلوم ہوئی ؟“

”یہ بول نہیں سکتا ہے، لکھ تو سکتا ہے۔ یہاں پہنچنے کے بعد اس نے اپنی داستان تفصیل سے لکھی تھی ۔“

”کیا سنتا بار میں اسے طبی امداد نہیں ملی ؟“

”کیا بات پوچھ رہے ہو بھائی ! جہاں ہمارا وجود برداشت نہیں کیا جاتا“ وہاں ہمارے زخموں پر مرہم کون لگاتا ؟ اگر کوئی دیکھ لیتا کہ یہ قتل کیے جانے کے باوجود زندہ ہے تو وہ اسے یہاں تک پہنچنے کا موقع ہی نہ دیتا۔“

”لیکن یہ بڑی حیرانی کی بات ہے کہ گلا نرخرے تک کاٹ دیا گیا اور یہ زندہ یہاں تک پہنچ گیا۔ کیسے پہنچا ؟“

” یہ ٹرین کے ذریعے نہیں آسکتا تھا۔ کوئی بہاری اپنی پناہ گاہ سے نکل کر ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر نہیں کر سکتا۔ یہ سنتا بار سے پیدل آیا ہے ۔“

خسرو نے شدید حیرانی سے تقریباً چیختے ہوئے پوچھا۔ ”کیا سنتا بار سے ؟ یہ ناقابلِ یقین بات ہے۔ سنتا بار یہاں سے تقریباً اسّی میل کے فاصلے پر ہے۔ یہ وہاں سے پیدل کیسے آسکتا ہے ؟“

” دیکھ لو کہ آگیا ہے۔ یہ اپنی کٹی ہوئی گردن کے ساتھ اپنی زندگی کی دعائیں مانگتے ہوئے بیس دن تک چلتا رہا۔ کبھی چھپتا رہا، کبھی کسی گاؤں میں جاکر اپنی زندگی کی بھیک مانگتا رہا۔ گاؤں والے جو خود دو دو، تین تین وقت کے فاقے کرتے ہیں وہ کسی کے جانی دشمن نہیں ہوتے۔ کچھ لوگ اسے دیکھ کر سہم جاتے تھے۔ دور بھاگ جاتے تھے کیونکہ اس کی گردن پر خون جما ہوا تھا۔ خون جمنے کے باعث کٹا ہوا نرخرہ عارضی طور پر جڑ گیا تھا جس کے باعث یہ سانس لے سکتا تھا۔ یہ اپنے حوصلے اور قوتِ ارادی سے یہاں تک پہنچ گیا۔ اسپتال میں اس کا باقاعدہ علاج کیا گیا ہے چونکہ وہاں مریضوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ اس لیے ہم اسے یہاں لے آئے ہیں ۔“

خسرو اپنی آنکھوں سے یہ حقیقت دیکھنے کے باوجود بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ آج بھی کچھ واقعات ایسے رونما ہوتے ہیں جو معجزات سے کم نہیں ہوتے۔ جنھیں عقل تسلیم نہیں کرتی لیکن دل ایمان لے آتا ہے۔ ایک بزرگ نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”جب ہم خدا کو بھول جاتے ہیں تو وہ ہمیں یاد دلاتا ہے۔ وہ ہمارے سامنے ناقابلِ یقین واقعات پیش کرتا ہے کہ سوچو، غور کرو اور سمجھو۔ کیا ان حالات میں کوئی انسان زندہ رہ سکتا ہے ؟ میں نے اپنی آنکھوں سے دیناج پور میں ایک ستر برس کی بڑھیا کو دیکھا۔ وہ بکریوں کے ایک باڑے میں نیم مردہ حالت میں پڑی ہوئی تھی۔ دشمنوں نے شاید لوہے کی کسی راڈ سے یا کسی ہتھیار سے اس کے سر پر ضرب لگائی تھی۔ اس کے سر کا پچھلا حصہ پھٹ گیا تھا۔ وہ بکرا کر گری تھی۔ دشمنوں نے اسے مُردہ سمجھا۔ اگر وہ نیم مُردہ بھی سمجھی جاتی“ تو وہ اسے اس کے حال پر چھوڑ کر چلے جاتے۔ اس خیال سے کہ ستر برس کی بڑھیا سسک سسک کر، تڑپ تڑپ کر مر جائے گی ۔“

اس بوڑھے نے اپنی آنکھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ان آنکھوں نے عجیب منظر دیکھا ہے۔ شاید تین دن یا چار دن کے بعد میں اس باڑے میں پہنچا تو میں نے اسے دیکھا۔ وہ آہستہ آہستہ سانس لے رہی تھی۔ اس کی آنکھیں کبھی آہستگی سے کھلتی تھیں، کبھی بند ہو جاتی تھیں۔ میں نے دیکھا‘ اس کے سر کا پچھلا حصہ خون آلود تھا۔ جدھر سے پھٹ گیا تھا‘ ادھر اس کا مغز نظر آرہا تھا اور اس مغز میں کیڑے پڑ گئے تھے۔ چھوٹے چھوٹے کیڑے رینگ رہے تھے۔ میں نے دیکھا تو ایک دم سے آنکھیں بند کرلیں۔ دیکھا نہ گیا۔ کیڑے لاش کو کھاتے ہیں لیکن وہ قبر میں نہیں تھی۔ زمین کے اوپر تھی۔ وہ مردہ نہیں تھی، نیم مردہ تھی‘ ابھی زندہ تھی اور کیڑے زندہ لاش کا ذائقہ چکھ رہے تھے۔

مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں سے بلا کا کرب جھانکنے لگا۔ وہ منہ سے بول نہیں سکتی تھی۔ میں نے اسے اٹھایا پھر وہاں سے کمرے میں لے آیا۔ اسے ایک چٹائی پر لٹا دیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا کروں ؟ ان کیڑوں کی طرف دیکھا نہیں جاتا تھا۔ لیکن ایک انسان خواہ وہ قبر تک کیوں نہ پہنچ چکا ہو۔ اگر اس میں زندگی کے ذرا سے بھی آثار ہوں تو اسے زندہ رکھنے کی کوشش کرنا ہمارا فرض ہے۔

میں نے ایک قینچی لے کر اس کے سر کے تمام بال کاٹ دیے۔ اس کا پھٹا ہوا سر اور مغز اور واضح طور پر نظر آنے لگے۔ کیڑے اور صاف طور سے کلبلاتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ میں اس کے سرہانے زمین پر بیٹھ گیا پھر ایک ایک کیڑے کو اپنی چٹکیوں سے پکڑ پکڑ کر وہاں سے نکال نکال کر ایک طرف پھینکنے لگا۔ جیسے سر سے جوئیں ٹٹول ٹٹول کر نکالی جاتی ہیں اسی طرح میں انھیں چن چن کر نکال رہا تھا۔ اس بات کا خاص طور پر خیال تھا کہ میرا ہاتھ اس کے سر سے زیادہ نہ ٹکرائے۔ وہ بہت کمزور تھی۔ میرے ہاتھ کی ہلکی سی چوٹ اسے ختم کر سکتی تھی۔ ایک

گھنٹے بعد میں بازار جاکر اس کے لیے دودھ لے آیا۔ دودھ پینے کے بعد اس میں ذرا جان آئی۔ اس نے نقاہت سے پوچھا۔ "میرا پوتا کہاں ہے؟"

میں نے پوچھا "تمھارا پوتا کون ہے؟ کہاں گیا ہے؟"

"وہ امن کمیٹی والے آئے تھے۔ میرے پوتے کو یہ کہہ کر لے گئے کہ میٹنگ ہے۔ بنگالی بہاری اتحاد کے لیے سب کو اس میٹنگ میں شریک ہونا چاہیے۔"

میں نے کہا "ماں جی! یہ تو آپ پانچ ماہ پہلے کی بات کہہ رہی ہیں۔ یہاں امن کمیٹی قائم ہوئی تھی مگر..."

مگر میں آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ میں جانتا تھا' امن کمیٹی میں جو بہاری شامل تھے' انھیں تالاب کے پاس لے جاکر گولی مار دی گئی تھی۔ میں اس بوڑھی کے سامنے کچھ نہ کہہ سکا۔ اس نے کہا "تم کہتے ہو' پانچ ماہ پہلے کی بات ہے۔ تو کیا ہوا؟ پانچ ماہ سے میں انتظار کر رہی ہوں۔ میں اس کے لیے زندہ ہوں۔ وہ بھی میرے لیے زندہ ہوگا۔ جب تک وہ نہیں آئے گا میں نہیں مروں گی۔"

"بیشک وہ اپنی قوتِ ارادی سے اور اپنے پوتے کی محبت کے شدید جذبے سے زندہ تھی۔ موت سے لڑ رہی تھی۔ کیڑے اسے کھا رہے تھے مگر پھر بھی وہ موت کو ٹال رہی تھی۔ لیکن ایسا کب تک ہو سکتا تھا۔ ایک گھنٹے کے بعد وہ مر گئی۔"

اس بوڑھی کی داستان سنانے والا سر جھکا کر خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک اس ماحول میں گہری ماتمی خاموشی چھائی رہی پھر خسرو وہاں سے اٹھ کر باہر آگیا۔ اس عمارت کے اندر رہتا' تو سیکڑوں آفت زدہ اپنی اپنی داستانیں سنانے لگتے۔ جو لوگ اپنے بچھڑنے والوں کو تلاش نہیں کر سکتے تھے اور جو لوگ اپنے مرنے والوں پر روتے روتے تھک چکے تھے۔ وہ ان کی خوبیوں اور اپنی مجبوریوں کی داستانیں سنا سنا کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتے تھے۔

خسرو کو ان سب سے ہمدردی تھی لیکن اتنی فرصت نہیں تھی کہ وہ داستانیں سننے کے لیے بیٹھا رہ جاتا۔ آج آدھی رات کے بعد پھر اناج کا ویگن سید پور پہنچنے والا تھا۔ بلٹی اس کے نام تھی اور اسی کو وہ مال بازار میں فروخت کرنا تھا۔

پہلے ویگن کا اناج اس نے دوگنے منافع پر فروخت کیا تھا۔ اس کے باوجود وہ اناج وہاں کے عوام کے لیے سستا تھا کیونکہ دوسرے مہاجن اندھی کمائی کر رہے تھے کبھی پندرہ روپے سیر کے حساب سے چاول دے رہے تھے اور کبھی وہی چاول بیس روپے اور پچیس روپے فی سیر کے حساب سے فروخت کرتے تھے جبکہ خسرو نے چھ روپے سیر کے حساب سے چاول فروخت کیا تھا۔ سارے شہر میں اس کی دھوم مچ گئی تھی۔ غریب عوام اسے دعائیں دیتے تھے۔ ایک ہی ہفتے میں وہاں کے بچے' بوڑھے' جوان اس کے نام سے اور اس کے چہرے سے واقف ہو گئے تھے۔ لیکن بازار میں تمام بیوپاری اس کے دشمن بن چکے تھے۔

وہ سوچتا ہوا ایک گلی سے دوسری گلی میں جا رہا تھا۔ اچانک ہریا سے سامنا ہو گیا۔ اس نے دیکھتے ہی کہا "خسرو بھائی! آپ یہاں ہیں۔ میں آپ کو تمام شہر میں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔"

"ڈھونڈنے کی ضرورت کیوں پیش آگئی جبکہ میں نے کہا تھا' بارہ بجے تک اسٹیشن پہنچ جاؤں گا۔ اس سے پہلے ہمارا مال نہیں آئے گا۔"

ہریا نے قریب آکر کہا "بات مال کی نہیں ہے۔ بات بہت ہی بری ہے۔ وہ کیا ہے کہ..."

وہ کہتے کہتے رک گیا "تم بولتے کیوں نہیں کیا بات ہے؟"

"وہ ہماری ششی لاپتا ہے۔"

خسرو نے حیرانی سے پوچھا "ششی لاپتا ہے۔ یہ کیا بک رہے ہو۔"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ وہ شام کو پوجا کے لیے مندر گئی تھی۔ اس کے بعد واپس نہیں آئی۔"

ششی' تلسی رام کی بہن تھی۔ پچیس برس کی عمر میں بیوہ ہو گئی تھی۔ پانچ برس سے بیوگی کی زندگی گزار رہی تھی۔ خوش شکل تھی۔ کوئی بدمعاش بھی اسے دیکھ کر بدمعاشی پر آمادہ ہو سکتا تھا۔ خسرو نے پریشانی سے پوچھا "کیا آس پاس کے گھروں میں پوچھا گیا ہے؟"

"صرف آس پاس کے گھروں میں نہیں بلکہ جتنی ہندو فیملی ہیں' سب کے گھروں میں جاکر دیکھ لیا۔ وہ کہیں نہیں ہے۔"

"تمھارا کیا خیال ہے۔ وہ کہاں جا سکتی ہے؟"

"وہ خود گئی نہیں ہے بلکہ کوئی اسے اٹھا کر لے گیا ہے۔"

"بھلا مندر سے کون لے جا سکتا ہے۔ مندر ہمارے گھر سے صرف دو سو گز کے فاصلے پر ہے۔ بیچ میں گھنی آبادی ہے لوگ چلتے پھرتے رہتے ہیں۔ کوئی اسے چھیڑنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا۔"

"خسرو بھائی! یہ سب ٹھیک ہے لیکن مندر کا ایک پچھلا دروازہ بھی ہے۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ غنڈے' بدمعاشوں

نے اسے وہیں سے غائب کر دیا ہے۔"

"غنڈے، بدمعاش؟" خسرو نے پوچھا۔ "تمھیں کس غنڈے پر شبہ ہے؟"

"اور کس پر شبہ ہوگا۔ یہاں کوئی بنگالی غنڈہ تو ہے نہیں کبھی کبھی مکتی باہنی والے آتے ہیں لیکن وہ کسی ہندو عورت پر کبھی ہاتھ نہیں ڈالیں گے۔ یہ بہاریوں کا کام ہے۔"

خسرو تیزی سے چلتا ہوا حویلی کی طرف جا رہا تھا۔ ہریا نے پوچھا۔ "کیا آپ بڑو دیدی کے پاس جا رہے ہیں؟"

"ہاں، میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ آخر یہ معاملہ کیا ہے؟"

"دیدی پہلے ہی رو رو کر ہلکان ہو رہی ہیں۔ آپ ان کے آنسو پونچھنا چاہتے ہیں تو پہلے ششی کو تلاش کریں۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہاں تلاش کیا جائے۔ کیا تھانے میں رپورٹ لکھائی ہے؟"

"میں نے سب انسپکٹر کو سب کچھ بتا دیا ہے لیکن تاکید کی ہے کہ رپورٹ درج نہ کرے۔ ہماری بدنامی ہوگی۔ چپ چاپ ششی کو تلاش کیا جائے۔ انسپکٹر نے مجھ سے وعدہ کیا ہے۔ سبھی اپنے اپنے طور پر اسے تلاش کر رہے ہیں۔"

خسرو چلتے چلتے رک گیا۔ پریشان ہو کر بولا۔ "اسے کہاں تلاش کیا جا سکتا ہے؟"

"میں اسے کئی جگہ دیکھ چکا ہوں۔ اب ایک ہی جگہ رہ گئی ہے۔ اگر یہ کسی غنڈے بدمعاش کا کام ہے تو ششی ہمیں مائی پاڑہ میں مل سکتی ہے۔"

خسرو فوراً ہی اُدھر جانے لگا۔ ہریا اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "دیکھو ہریا! تم کہتے ہو مکتی باہنی والے یہاں کی کسی ہندو عورت پر ہاتھ نہیں ڈالیں گے۔ وہ ہندوؤں سے ڈرتے ہیں لیکن بہاری تو ہندوؤں سے بھی ڈرتے ہیں۔ اور مکتی باہنی والوں سے بھی ڈرتے ہیں حتیٰ کہ عام بنگالیوں کے منہ بھی نہیں لگتے۔ پھر وہ ایک ہندو عورت کو اغوا کرنے کی جرأت کیسے کر سکتے ہیں؟"

"یہ تو میں نہیں جانتا۔ جب ششی ملے گی تو یہی بات سامنے آجائے گی۔"

وہ دس منٹ میں مائی پاڑہ پہنچ گئے۔ رات کے دس بجنے والے تھے۔ ایسے وقت وہاں بڑی رونق رہا کرتی تھی۔ تماش بینوں کا ہجوم ہوا کرتا تھا لیکن اب شاید ہی کوئی بھولا بھٹکا آجاتا تھا۔ گنہگاروں کو اب اس علاقے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ جب تک پانی ایک ہی تالاب میں رہتا ہے، پینے والے اسی طرف دوڑے آتے ہیں۔ اب سید پور کی آبادی تقریباً پانچ لاکھ تھی جن میں ڈیڑھ لاکھ عورتیں ضرور ہوں گی۔ کچھ بوڑھی ہوں گی، کچھ جوان ہوں گی اور کچھ نوجوان ہوں گی۔ وہ سب شریف گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ کوئی ان پر انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا لیکن حالات بڑے پاپی تھے۔ جہاں کہیں اناج کی قیمت انسان کی قوتِ خرید سے بہت اوپر ہو جاتی ہے، وہاں پیٹ کے سامنے مجبور ہونا پڑتا ہے۔ چونکہ اناج خریدنے کے لیے گھر کا فرنیچر یا پورا گھر صرف ایک بار بیچا جا سکتا ہے اور پیٹ کا جہنم روز بھرا جاتا ہے، تب ہی گناہ کا بازار چمک اٹھتا ہے۔ عورت ہاتھ کے میل کی طرح بار بار گھر سے نکلتی ہے پھر اناج لے کر تقدیر کی لکیر کی طرح واپس آ جاتی ہے۔ بہرحال سب ایسے نہ تھے۔ پاپی حالات نے کچھ لوگوں کے لیے پاپ کے راستے کھول دیے تھے۔ سید پور میں اب ایک تالاب نہیں رہا تھا۔ کئی جگہ کنویں اور تالاب دریافت کر لیے گئے تھے۔ اس لیے مائی پاڑہ ویران پڑا ہوا تھا۔

ہریا نے کہا۔ "خسرو بھائی! میں اُدھر والی گلی میں جا کر دیکھتا ہوں۔ آپ اس گلی میں دیکھیں۔ میں اودھر سے گھوم کر آؤں گا اور آپ سے اسی گلی میں ملوں گا۔"

خسرو نے کہا۔ "میں ایسے بدنام محلے میں کبھی نہیں آیا۔ اور تم مجھے تنہا اس گلی میں جانے کے لیے کہہ رہے ہو۔ کوئی ضروری نہیں ہے کہ تم اُدھر جاؤ اور میں اِدھر۔"

"کیا ہے کہ میں ششی کو جلدی سے تلاش کرنے کے لیے ایسا کہہ رہا ہوں۔ آپ کو پسند نہیں ہے تو چلیے آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔"

وہ دونوں آگے بڑھ گئے۔ آس پاس کے مکانات ویران سے تھے۔ کسی مکان کے دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ کسی کا دروازہ کھلا ہوا تھا مگر اندر تاریکی تھی۔ ایک جگہ روشنی دیکھ کر ہریا نے کہا۔ "چلو اُدھر چل کر پوچھتے ہیں۔"

خسرو نے اس کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا ہمارے پوچھنے سے مجرم اپنے جرم کا اقرار کر لیں گے؟"

"کیا ہے کہ ہم نہیں پوچھیں گے، سیدھے اس گھر میں گھس جائیں گے۔ کوئی اعتراض کر نہیں سکتا۔ یہ محلہ ہی ایسا ہے۔ بلکہ ہمیں خوش آمدید کہا جائے گا۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی ایک تاریک مکان کے دروازے پر بھاری بھرکم بوٹوں کی آواز سنائی دی۔ پھر دو سائے وہاں سے چھلانگ لگا کر خسرو اور ہریا کے آس پاس پہنچ گئے۔ وہ مسلح تھے۔ ان کا حلیہ بتا رہا تھا کہ وہ مکتی باہنی کے جوان ہیں۔ ایک نے کہا۔ "اس مکان میں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ اِدھر ہمارے ساتھ آؤ۔ ہم تمھاری ضرورت کی چیز مہیا کر دیں گے۔"

ایک نے بندوق کی نال سے خسرو کے سینے پر ٹھوکا دیا اور اشارے سے اس تاریک مکان میں چلنے کے لیے کہا۔ خسرو نے التجا کی۔ "دیکھیے ہم اپنے گھر کی ایک عورت کو تلاش کرتے نکلے ہیں۔ اگر آپ کو ہم سے کوئی فائدہ پہنچ رہا ہو تو ہمیں بتا دیں اور اگر آپ میری اس گمشدہ بہن کو ڈھونڈ نکالیں تو میں آپ کو منہ مانگا انعام دوں گا۔"

بندوق کی نال سے ٹھوکا دینے والے نے کہا۔ "اس مکان میں چلو۔ وہیں ساری باتیں طے ہو جائیں گی۔"

خسرو نادان نہیں تھا۔ ایسی چالبازیوں کو سمجھتا تھا۔ اس کے دل نے کہا۔ "یقیناً ان لوگوں نے شششی کو چھپا رکھا ہے اور اس کے لیے سودا کرنا چاہتے ہیں۔ بہرحال مجبوری تھی۔ ان کی بات مان کر ہی شششی کو حاصل کیا جا سکتا تھا۔ بعد میں قانونی کارروائیوں کے متعلق سوچا جا سکتا تھا۔"

وہ ہریا کے ساتھ اس مکان میں داخل ہوا۔ مسلح جوانوں میں سے ایک آگے، ایک ان کے پیچھے تھا۔ اس وقت تک اس تاریک مکان میں لالٹین جلا دی گئی تھی۔ ان دونوں کو ایک بڑے سے کمرے میں لایا گیا۔ وہاں ایک چھوٹی سی میز تھی اور اس کے آس پاس دو کرسیاں تھیں۔ میز کے اوپر شراب کی دو بوتلیں اور دو گلاس رکھے ہوئے تھے۔ ایک نے خسرو سے کہا۔ "کرسی پر بیٹھ جاؤ۔" دوسرے نے ہریا سے کہا۔ "اے! تم بھی وہاں بیٹھو۔"

وہ دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے پھر ان سے کہا گیا۔ "بوتل کھولو اور پینا شروع کر دو۔"

خسرو نے کہا۔ "میں نے اس لعنت کو آج تک ہاتھ نہیں لگایا ہے۔ مجھ سے کام کی باتیں کرو اور مجھے جانے دو۔"

"کام کی باتیں اس وقت تک نہیں ہو سکتیں، جب تک ہم سب موڈ میں نہ ہوں۔ ہم تو پیے ہوئے ہیں تمہیں بھی پلانا چاہتے ہیں۔"

ہریا نے کہا۔ "کیا ہے کہ میں پیتا ضرور ہوں مگر یہ کوئی پلانے کا طریقہ نہیں ہے۔ ہم پریشان ہیں۔ اپنے گھر کی عورت کو ڈھونڈ رہے ہیں اور تم یہ مذاق کر رہے ہو۔"

خسرو چور نظروں سے ان کی بندوقوں کو دیکھتا جا رہا تھا۔ ہریا سے توقع نہیں تھی کہ وہ لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جائے گا۔ اگر وہ ساتھ دیتا تو ان دونوں پر قابو پانا کچھ زیادہ مشکل نہ ہوتا۔ پھر وہ شششی کو اس مکان میں تلاش کر سکتے تھے۔

ایک نے کہا۔ "اگر تم دونوں باتوں میں وقت ضائع کرنا چاہتے ہو تو کوئی بات نہیں۔ ہم تمام رات تمہاری باتیں سنتے رہیں گے لیکن ضرورت مند تم لوگ ہو۔ تم کسی کو یہاں سے لے جانا چاہتے ہو۔ اس کی پہلی شرط یہی ہے کہ پینا شروع کر دو۔ بھاگنے کے متعلق نہ سوچنا اور سوچنا ہے تو پہلے کھڑکی اور دروازے کی طرف دیکھ لینا۔"

خسرو اور ہریا نے دیکھا۔ "دروازے اور کھڑکی کے پاس دو، دو رائفل بردار نظر آ رہے تھے۔ ان لوگوں نے منہ پر کپڑا لپیٹ رکھا تھا۔ شاید خسرو یا ہریا کے جاننے والوں میں سے ہوں گے۔ اسی لیے اپنے اپنے چہرے کو چھپا رہے تھے۔

ہریا نے بوتل کھول کر گلاس میں شراب انڈیلتے ہوئے کہا۔ "میں تم لوگوں کی بات مان کر پینا شروع کر رہا ہوں۔ اتنا بتا دو کیا شششی تمہارے پاس ہے؟"

"ہاں ہمارے پاس ہے۔"

"میں خسرو کو بھی پینے پر آمادہ کر لوں گا لیکن ہمیں اس کی آواز سنائی جائے یا اس سے ہم کو ملایا جائے۔"

خسرو نے تائید کی۔ "ہاں پہلے ہم شششی کو دیکھنا چاہتے ہیں۔"

ان میں سے ایک نے ہریا کے کالر کو پیچھے سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔ "تم ہمارے ساتھ چلو اور شششی کو دیکھ کر آؤ، ہم دونوں کو نہیں جانے دیں گے۔"

خسرو نے کہا۔ "ٹھیک ہے ہریا! تم اطمینان کر کے آ جاؤ۔"

ایک مسلح جوان ہریا کو دھکا دیتے ہوئے کمرے سے باہر لے گیا۔ خسرو نے دوسرے مسلح جوان سے کہا۔ "میں نے جو گناہ کبھی نہیں کیا، وہ مجھ سے کیوں کراتے ہو۔ پینا کیا ضروری ہے؟ شششی یہاں موجود ہے تو اپنا مطالبہ پیش کرو۔ ہم پورا کریں گے اور اسے لے جائیں گے۔"

"ہمارا پہلا مطالبہ یہی ہے کہ بوتل کھولو اور پینا شروع کرو۔ نہیں پیو گے تو ہم زبردستی پلائیں گے۔ مار مار کر پلائیں گے۔"

خسرو نے شراب کی بوتل کو دیکھا۔ پھر اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم لوگ کسی ہندو عورت کو کبھی نہیں چھیڑتے پھر ایسی حرکت کیوں کر رہے ہو؟"

"ہمیں کسی ہندو عورت سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ ہم تمہیں پلانا چاہتے ہیں۔ شرط یہی ہے کہ یہ بوتل ختم کر دو اور شششی کو ساتھ لے جاؤ۔"

ہریا اس مسلح جوان کے ساتھ واپس آ گیا۔ اس نے کہا۔ "میں نے شششی کو دیکھا ہے۔ وہ اُدھر سامنے والے مکان کے کمرے میں چارپائی سے بندھی ہوئی ہے۔ ان لوگوں نے مجھے کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا۔ میرے منہ کو دبا دیا اور یہاں گھسیٹ

کر لے آئے۔"

خسرو نے کہا۔ "ہم کشتی کو ہر قیمت پر لے جائیں گے لیکن یہ لوگ کوئی قیمت نہیں لگا رہے ہیں اور میں کبھی پیتا نہیں ہوں۔ خدا کے لیے سمجھوتے کی کوئی راہ نکالو۔"

بات ختم ہوتے ہی اس کے منہ پر ایک الٹا ہاتھ پڑا۔ وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے پیچھے کی طرف الٹ گیا۔ فرش پر گرتے ہی وہاں سے اٹھنا چاہتا تھا، اسی وقت ایک نے رائفل کے کندے سے اس کی پیٹھ پر ضرب لگائی۔ وہ اٹھتے اٹھتے پھر فرش پر اوندھے منہ گر پڑا۔ دوسرے نے اپنے بھاری بھرکم بوٹ سے اس کی کمر پر ٹھوکر ماری۔ وہ کروٹ لیتا ہوا چاروں شانے چت ہو گیا۔ ایک نے اس کے سینے پر اپنے وزنی بوٹ سے دباؤ ڈالا۔ رائفل کی نال کو اس کے حلق پر رکھا۔ دوسرے نے بوتل کھولی اور کہا۔ "اپنا منہ کھولو۔"

خسرو نے سختی سے اپنے ہونٹوں کو بھینچ لیا تھا۔ رائفل والے نے اپنی انگلی ٹریگر پر رکھی۔ اس کے حلق پر رائفل کی نال کا دباؤ ڈالا اور کہا۔ "میں فائر کروں گا۔"

حلقوم پر اس طرح دباؤ پڑ رہا تھا کہ خسرو کا منہ آپ ہی آپ کھل گیا۔ اس کے ساتھ ہی دوسرے نے بوتل کے منہ کو اس کے منہ کے اندر ٹھونس دیا۔ شراب اس کے حلق تک پہنچی۔ کچھ باہر نکلنے لگی کچھ سانس رکنے کی وجہ سے حلق کے اندر بھی پہنچنے لگی۔ سینے میں ایسی جلن ہوئی جیسے انگارے دہک رہے ہوں۔ وہ دیسی شراب تھی۔ پانی ملائے بغیر پلائی جا رہی تھی اور وہ بھی ایک اناڑی پی رہا تھا۔ اس کا جو حال ہو رہا تھا، وہی جانتا تھا۔ اس نے سر کو ادھر اُدھر جھٹک کر بوتل کو منہ سے نکال دیا لیکن کافی شراب حلق سے اتر چکی تھی۔ بوتل والے نے اس کے سر کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر فرش پر بٹھا دیا۔ رائفل والے نے کہا۔ "ہم تو اسے عزت کے ساتھ کرسی پر بیٹھ کر پلانا چاہتے تھے مگر یہ عزت کے قابل نہیں ہے چلو فرش پر ہی سہی، پھر پلاؤ۔"

خسرو فوراً ہی اٹھ کر کھڑا ہونا چاہتا تھا مگر اس کا سر چکرا رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے دیواریں اِدھر سے اُدھر ڈولتی ہوئی نظر آ رہی تھیں پھر بھی اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو ایک نے اسے ٹھوکر مار کر بٹھا دیا۔ دوسرے نے کہا۔ "ذرا سوچ سمجھ کر پٹائی کرنا۔ چہرے پر یا جسم پر زخم کے نشان نہیں آنے چاہئیں۔ تاکہ یہاں سے جانے کے بعد یہ خود کو مظلوم ثابت کرے تو کوئی یقین نہ کرے۔"

وہ بوتل پھر اس کے منہ سے لگائی گئی۔ وہ اپنا منہ پھیرنے لگا۔ رائفل والے نے اس کے گھٹنے پر رائفل کے کندے سے ضرب لگائی۔ وہ چیخ پڑا۔ تکلیف سے کراہنے لگا۔ چیخنے کے دوران منہ کھلتا ہے۔ بوتل والے نے کھلے ہوئے منہ میں پھر تھوڑی سی شراب انڈیل دی تھی۔ اس نے بوتل کو ہاتھ سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ "مجھ پر یہ ظلم نہ کرو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا، آخر مجھے شراب پلا کر تمھیں کیا فائدہ پہنچے گا۔"

ایسا کہنے کے دوران اس نے محسوس کیا کہ اس کی زبان لڑکھڑا رہی ہے۔ الفاظ صاف طور سے ادا نہیں ہو رہے ہیں لیکن دماغ ابھی کام کر رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا آخر ایسا کیوں کیا جا رہا ہے۔ کیا اس لیے کہ آج اناج کا ویگن یہاں پہنچ رہا ہے اور وہ ویگن کے پاس نہیں ہوگا۔ اس کے آدمی نہیں رہیں گے۔ پہرا بھی نہیں رہے گا تو ویگن کو لوٹ لیا جائے گا؟

وہ آگے نہ سوچ سکا۔ بوتل پھر اس کے منہ سے آکر لگ گئی تھی۔ اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ لیا گیا تھا۔ جتنی وہ پی چکا تھا، اتنی ہی اپنا اثر دکھا رہی تھی۔ سر گھوم رہا تھا، ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ رہے تھے۔ اس کے باوجود اتنا حوصلہ تھا کہ وہ پینے سے اب بھی انکار کر رہا تھا اور وہ لوگ طرح طرح سے اذیتیں پہنچا رہے تھے۔ زبردستی اس کے منہ میں زہر ڈال رہے تھے اور اسے نگلنے پر مجبور کر رہے تھے۔

اناڑی آدمی ایک گھونٹ پینے کے بعد ہی چکرانے لگتا ہے جبکہ اسے ایک پوا پلا دیا گیا تھا۔ اب وہ اپنے آپ میں نہیں تھا۔ اِدھر سے اُدھر جھوم رہا تھا۔ بیٹھے بیٹھے ایک طرف لڑھک جانا چاہتا تھا۔ اسے دونوں طرف سے پکڑ کر اٹھایا گیا پھر کرسی پر لا کر بٹھا دیا گیا۔ وہ دونوں ہاتھ میز پر رکھ کر بڑبڑانے لگا۔ "میں مار ڈالوں گا۔ تم لوگوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ کشتی کو یہاں سے لے جا کر رہوں گا۔"

نشے کی زیادتی سے اس کی زبان بری طرح لڑکھڑا رہی تھی۔ اس کی بات اچھی طرح سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ آدھی بات منہ سے نکلتی تھی، آدھی بات منہ میں ہی رہ جاتی تھی۔ ایک رائفل بردار نے کہا۔ "اب یہ ہمارے کام کا ہو گیا ہے۔ اسے لے چلو۔"

دو آدمیوں نے اسے دو طرف سے سہارا دے کر اٹھایا۔ پھر اسے چلاتے ہوئے کمرے سے باہر لے گئے۔ وہ خود چل سکتا تھا لیکن اپنا توازن قائم نہیں رکھ سکتا تھا۔ لڑکھڑا جاتا تھا۔ لہٰذا ان کے سہارے چل رہا تھا۔ وہ مکان سے باہر آ گئے۔ باہر تاریکی تھی۔ دور مکانوں کی روشنیاں اتنی مدھم تھیں کہ وہ تاریکی کو دور نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ اسے سہارا دے کر چلاتے ہوئے

سامنے والے مکان میں لے گئے۔ وہاں بھی گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ خسرو نشے میں بھی سمجھ رہا تھا کہ وہ دو مردوں کا سہارا لے کر چل رہا ہے، کسی دروازے سے گزر کر مکان میں داخل ہو رہا ہے پھر کسی نے کان کے قریب سرگوشی میں کہا۔

"اب تم اس دیوار کا سہارا لے کر آہستہ آہستہ آگے بڑھتے جاؤ۔ سامنے ایک دروازہ ہے۔ اس دروازے کے پیچھے ششی موجود ہے۔"

اسے ایک دیوار کے سہارے چھوڑ دیا گیا۔ سب دور ہٹ گئے۔ تاریکی میں پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ دور سے تماشا دیکھ رہے ہیں یا چلے گئے ہیں۔ وہ دیوار کے سہارے آگے بڑھنے لگا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اندھا ہو گیا ہو اور ٹٹول ٹٹول کر راستہ تلاش کر رہا ہو۔ پھر وہ ایک دروازے کے قریب پہنچ گیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ کسی نے اس کے منہ پر ٹارچ کی روشنی پھینکتے ہوئے کہا۔ "خسرو صاحب! آپ نے پہنچنے میں اتنی دیر لگا دی۔ بے چاری ششی دیوی کب سے آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔ جائیے دروازہ کھلا ہوا ہے۔"

پھر ٹارچ کی روشنی کمرے کے اندر پھینکی گئی۔ وہاں ایک چارپائی پر ششی بندھی ہوئی تھی۔ وہ سر اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ٹارچ کی روشنی میں اس نے خسرو کو دیکھ لیا تھا۔ اب نفرت سے کہہ رہی تھی۔ "بھیا تلسی رام نے تم پر بھروسہ کیا۔ میں تمھیں اپنا بھائی کہتی رہی لیکن آج تم نے ثابت کر دیا کہ بھاری بھروسے کے قابل نہیں ہوتے۔ تمھیں بھائی کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ میں تم پر تھوکتی ہوں۔"

خسرو نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہا۔ "ششی! میں تو تمھیں...."

یہ کہتے ہوئے اس نے دروازے کے اندر قدم رکھنا چاہا۔

وہ کمرے میں جانا چاہتا تھا۔ اسی وقت ٹارچ بجھ گئی۔ کسی نے اسے پکڑ کر باہر کھینچ لیا۔ اندھیرے میں دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس سے پہلے ہی کسی نے سختی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ کمرے کے اندر سے ششی کی نفرت بھری آواز سنائی دے رہی تھی۔ "چھوڑ دو مجھے چھوڑ دو، خبردار مجھے ہاتھ نہ لگانا۔ خسرو! میں تمھیں آخری بار سمجھاتی ہوں۔ اگر میں بچ گئی تو تمھارے ساتھ تمھاری ان دونوں عورتوں کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گی۔"

خسرو دو آدمیوں کی گرفت میں تھا۔ کسی نے اب تک اس کے منہ پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ اپنے آپ کو چھڑا سکتا۔ وہ لوگ اسے گھسیٹ کر وہاں سے لے جا رہے تھے۔ اب اس کا سر بہت بری طرح چکرا رہا تھا۔ نشہ برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ نیند آ جائے یا پھر وہ مر جائے۔

ایک خون آشام چمگادڑ نے ہسپتال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دوسری خون آشام چمگادڑ سے کہا۔ "آؤ، ایک ایک جام ہو جائے۔ یہاں بھنے تازہ خون ملتا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد اس نے محسوس کیا کہ وہ ننگے فرش پر چاروں شانے چت پڑا ہوا ہے۔ اس کے آس پاس کچھ لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ ان کی باتیں اچھی طرح سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ اس کے باوجود ان کی آوازیں اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ ایک کہہ رہا تھا۔ "ایسی ہی چال کو کہتے ہیں سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ اب اس مسلمان بچے کا گزر تلسی رام کے ہاں نہیں ہوگا بڑی بے عزتی سے نکالا جائے گا۔"

"تم بے عزتی سے نکلنے کی بات کرتے ہو۔ ارے تو ہمارے جوان زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ یہ ہمارے دھرم کی کسی عورت پر ہاتھ ڈالے اور یہاں سے زندہ چلا جائے۔ یہ ممکن نہیں ہے۔"

دھرم چند کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "یہ سالا ہریا بڑا پاپی ہے۔ جب دیکھو! میرے سامنے ششی کا ذکر کرتے وقت ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگتا تھا۔ میں نے سمجھایا۔ بھلے مانس! ایسا کرو کہ وہ بھی ہاتھ لگے اور ونگین کا اناج بھی اپنا ہو۔ میرا نام بھی دھرم چند ہے۔ پہلے میں دھرم سے انگلی سیدھی کر کے گھی نکالنے کی کوشش کرتا ہوں۔ نہیں نکلتا تو انگلی ٹیڑھی کرتا ہوں۔ اب دیکھ لو۔ ایک ذرا انگلی ٹیڑھی کی تو ادھر ہریا کا کام بن گیا۔ کل صبح خسرو اپنی دونوں عورتوں کے ساتھ حرام موت مارا جائے گا۔ اس کے بعد ونگین کا مال ہریا بیچے گا اور ہمارے ہی ہاتھ بیچے گا۔"

وہ تمام باتیں خسرو کے کانوں میں گونج رہی تھیں لیکن اس کے کانوں پر، آنکھوں پر اور دماغ پر نشے کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ وہ سن رہا تھا مگر سمجھنے کے قابل نہیں تھا۔ پھر وہ رفتہ رفتہ مدہوشی کی نیند میں ڈوبتا چلا گیا۔

لانچ اپنی مخصوص رفتار سے دوسرے کنارے کی طرف چلی جا رہی تھی۔ دوسرا کنارا ابھی بہت دور تھا۔ نظر نہیں آ رہا تھا اور اس کنارے تک پہنچنے سے پہلے کلیم الدین بھوتیاں اپنی دھمکی پر عمل کرنے کے لیے بالکل تیار کھڑا ہوا تھا۔

اس کے آس پاس دور دور تک فرسٹ کلاس اور سیکنڈ کلاس کے مسافر کھڑے ہوئے تھے۔ عرشے پر بھیڑ لگی تھی۔ مکتی باہنی کے جوان لانچ کے نچلے حصّے میں تھے۔ انھیں خبر نہیں تھی کہ اوپر کیا ہو رہا ہے۔ انسپکٹر نے کہا "میں یہ قانون کی وردی اتار کر تمھارے کہنے کے مطابق دریا میں بہا سکتا ہوں مگر یاد رکھو" میں بزدل نہیں ہوں۔ تمھارے ساتھ مل کر مکتی باہنی والوں سے مقابلہ اس لیے نہیں کرنا چاہتا کہ فائرنگ کے دوران بے گناہ مسافر مارے جائیں گے۔ میں خود کو اس کا قصوروار نہیں ٹھہرانا چاہتا۔"

کلیم الدین بھوتیاں نے غصّے سے پوچھا "آپ ایک پولیس آفیسر ہو کر یہ برداشت کر رہے ہیں کہ ایک معصوم بچہ دریا میں ڈبو دیا جائے گا؟"

"بعض حالات میں یہ سوچنا پڑتا ہے کہ ایک کی جان جائے یا سب کی جان جائے؟ اگر سب کی جان بچانے کے لیے ایک کی قربانی لازمی ہو جائے تو مجبوراً خاموش تماشائی بن کر رہنا پڑتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے تمھارے قانون کی کتاب میں کہیں ایسی کوئی بات لکھی ہو لیکن انسانیت کا تقاضا ہے' اگر ایک بچہ بھی موت کے منہ میں جا رہا ہو تو اسے بچانا ہمارا تمھارا سب سے پہلا فرض ہوتا ہے۔"

ایک عورت نے بھوتیاں سے کہا "ابھی تم نے چیلنج کیا تھا کہ بچے کو ڈبویا گیا تو تم اس کے ساتھ اس لانچ کو بھی ڈبو دو گے۔ کیا یہ انسانیت کا تقاضا ہے؟"

"اگر تمام مسافروں نے انسان ہونے کا ثبوت دیا تو یہ لانچ ڈبوئی نہیں جائے گی۔ تعجب ہے' میری اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر ہم سارے مسافر ایک ہو کر ان چار مکتی باہنی کے خلاف فیصلہ سنا دیں اور اس بچے کی جان بچانے کے لیے متحد ہو جائیں تو کیا وہ چاروں اپنی من مانی کر سکیں گے؟"

وہ سب ایک دوسرے کا منہ تکتے رہے۔ پھر ایک نے کہا "ہاں ہم سب ایک ہو کر اس بچے کی جان بچا سکتے ہیں۔"

دوسری سمت سے کسی نے تائید کی "وہ چار مسلح جوان اکثریت کے سامنے جھک جائیں گے۔ جبکہ ہم جائز بات کہیں گے۔ ایک معصوم کی جان بچانے کے لیے ایک نیک قدم اٹھائیں گے۔"

اس کے بعد سب ہی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔ کچھ لوگ آپس میں مشورے کرنے لگے۔ نوجوان لڑکے فرسٹ کلاس اور سیکنڈ کلاس کے کیبنوں میں جا کر مسافروں کو وہاں سے بلا کر لانے لگے تاکہ سب متحد ہو کر لانچ کے نچلے حصّے میں جائیں اور ان مکتی باہنی کے مسلح جوانوں پر دباؤ ڈالیں۔

ایک نوجوان نچلے حصّے سے دوڑتا ہوا عرشے پر آیا۔ اس نے کہا "ان لوگوں نے بچے کی رسیاں کھول دی ہیں۔ اسے ساتھ لے کر ایک ایک مسافر کے سامنے جا رہے ہیں۔"

انسپکٹر نے کہا "آخر انھوں نے میری بات مان ہی لی۔"

بھوتیاں نے کہا "قانون پر عمل کرانے کے لیے کچھ سیدھے کچھ ٹیڑھے راستے ہوتے ہیں۔ اگر آپ وہاں مسلسل موجود رہتے تو وہ بہت پہلے ہی آپ کی بات مان لیتے۔"

ایک عورت نے کہا "چلو! اب اس بچے کو ڈبویا نہیں جائے گا۔ اتنا تو اطمینان ہو گیا ہے۔ وہ بچہ ہم مسافر عورتوں میں سے اپنی ماں کو ڈھونڈ نکالے گا۔"

آنے والے نوجوان نے کہا "وہ لوگ اوپر بھی آئیں گے اور بچے کے ماں باپ کو تلاش کریں گے۔"

کلیم الدین بھوتیاں نے اسٹین گن کپڑوں میں لپیٹتے ہوئے کہا "میں آپ تمام لوگوں سے التجا کرتا ہوں کہ ان مکتی باہنی کے جوانوں کو میرے متعلق کچھ نہ بتایا جائے۔ ورنہ وہ میرے متعلق طرح طرح کے سوالات کریں گے۔ میں انھیں یہ بتانا نہیں چاہتا کہ یہ اسٹین گن میرے پاس کہاں سے آئی ہے؟ اس پر بات بڑھ جائے گی۔ پھر ہمارے درمیان فائرنگ کا تبادلہ شروع ہو جائے گا۔"

کئی لوگوں نے ہم آواز ہو کر کہا کہ وہ اس کے متعلق کسی سے کچھ نہیں کہیں گے۔ وہ کپڑوں میں اسٹین گن کو اچھی طرح چھپاتے ہوئے سوچ رہا تھا "بے شک یہ کچھ نہیں کہیں گے لیکن کسی پر کس حد تک بھروسہ کیا جا سکتا ہے؟ سیکڑوں مسافر ہیں۔ کسی نہ کسی کے منہ سے بات ضرور نکلے گی یا کوئی چغلی کھائے گا یا مکتی باہنی کے جوانوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کہہ دے گا کہ یہاں لانچ میں ایک آدمی کے پاس اسٹین گن ہے!"

وہ وہاں سے عرشے کے آخری سرے پر چلا آیا۔ اُدھر ایک چھوٹی سی حفاظتی کشتی رکھی ہوئی تھی۔ کشتی کے قریب ہی ریلنگ سے ایک لائف بوٹ منسلک تھی ___ تاکہ ڈوبنے والے کو اس لائف بوٹ کے ذریعے بچایا جا سکے۔ اس نے اسٹین گن کو فرش پر رکھ دیا پھر وہیں ریلنگ سے ٹیک لگا کر کشتی کے قریب اسٹین گن کے اوپر بیٹھ گیا۔

وہ حفاظتی کشتی تقریباً چھ فٹ لمبی تھی۔ اس کشتی کے دوسرے سرے کے پاس ایک عورت فرش پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے سر پر آنچل کو گھونگٹ کی طرح اوڑھ رکھا تھا۔ اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ ریلنگ کی طرف منہ کیے جیسے تمام مسافروں

سے منہ پھیرے ہوئے تھی۔ بجھو یاں نے دیکھا، وہ اپنے آنچل کے ایک سرے کو تھام کر چہرے تک لے گئی تھی۔ شاید منہ صاف کر رہی تھی۔ شاید آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کو پونچھ رہی تھی۔

کلیم الدین بجھو یاں کی توجہ اس پر سے ہٹ گئی۔ زینے پر قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ان چار مسلح مکتی باہنی والوں کے ساتھ ساتھ کتنے ہی مسافر چلے آ رہے تھے۔ ایک مکتی باہنی کے جوان نے بچے کو بازو سے پکڑ رکھا تھا اور اسے کھینچتا ہوا عرشے پر لا رہا تھا۔

حفاظتی کشتی کے پاس بیٹھی ہوئی عورت فوراً ہی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے کھڑے ہونے کے بعد پتا چلا کہ وہ ماں بننے والی ہے ــــ اس نے اپنا آنچل اِدھر اُدھر سے درست کیا اسے چہرے کو چھپانے کی فکر تھی۔ اس نے گھونگھٹ کو اور کھینچ لیا تھا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر ایک مسافر کے سامنے ہاتھ پھیلا دیے۔ وہ بھیک مانگ رہی تھی۔

وہ لوگ بچے کو عرشے پر لے آئے تھے۔ تمام مسافر دور دور تک کھڑے ہوئے تھے اور اس بچے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بچہ اب نہیں رو رہا تھا۔ شاید روتے روتے تھک گیا تھا۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ دہشت مسلسل طاری رہے تو خوف کی شدت کچھ کم ہو جاتی ہے یا پھر بچے کو اطمینان ہو گیا تھا کہ وہ لوگ اسے پانی میں نہیں ڈبوئیں گے۔ تب ہی اسے رسیوں سے آزاد کر کے وہاں لے آئے ہیں۔

ایک مسلح جوان نے بچے کو جھنجوڑتے ہوئے اردو میں کہا۔ ”آگے بڑھو اور اپنے ماں باپ کو پہچانو۔“

وہ کیبن کے پاس بیٹھی ہوئی اور کھڑی ہوئی عورتوں کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے آواز دی۔ ”امّی! امّی!“

وہ بھیک مانگنے والی تیزی سے زینے کے پاس آئی۔ پھر وہ نیچے جانا چاہتی تھی کہ بچے نے اسے دیکھ لیا۔ اگرچہ اس کا چہرہ گھونگھٹ میں چھپا ہوا تھا، تاہم بچہ اپنی ماں کو اس کے لباس سے اور اس کی چال سے بھی پہچان لیتا ہے۔ وہ امّی کہہ کر دوڑتا ہوا آیا پھر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

وہ رو رہی تھی گھونگھٹ میں منہ چھپائے بلک بلک کر رو رہی تھی۔ لیکن منہ سے آواز نہیں نکال رہی تھی۔ بچہ اس کی ٹانگوں سے لپٹ لپٹ کر کہہ رہا تھا۔ ”امّی! یہ لوگ مجھے مار ڈالیں گے مجھے بچاؤ۔ مجھے اپنی گود میں اٹھا لو۔ ابّو کہاں ہیں؟ امّی! ابّو کہاں ہیں؟“

عرشے پر تمام مسافر گم صم کھڑے ماں بیٹے کو دیکھ رہے تھے۔ مکتی باہنی کے ایک جوان نے اس بھکارن کے قریب پہنچ کر کہا۔ ”بچے کی ماں تو مل گئی۔ باپ کہاں ہے؟“

وہ چاروں طرف مرد مسافروں کو دیکھ رہا تھا پھر اس نے بھکارن کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ ”منہ کیوں چھپا رہی ہو۔ بتاؤ اس کا باپ کہاں ہے؟“

اب اس کی صورت نظر آ رہی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ کبھی وہ خوبصورت رہی ہو گی مگر اب کھنڈر بن چکی تھی۔ اس کے چہرے اور گردن پر کہیں کہیں زخموں کے نشانات نظر آ رہے تھے۔ اس نے بنگالی زبان میں کہا۔ ”امار سوامی مورے گے چھے (میرا شوہر مر چکا ہے)۔“

ایک مسلح جوان نے پاؤں پٹخ کر کہا۔ ”تم جھوٹ بولتی ہو۔ یہ بچہ کئی بار اپنے باپ کو پکار چکا ہے۔ یہ سات آٹھ برس کا ہے۔ اتنا تو سمجھتا ہے کہ جو مر جاتے ہیں انہیں مدد کے لیے پکارا نہیں جاتا۔ یہ صرف تمہیں ہی پکارتا رہتا۔“

”یہ نہیں جانتا کہ اس کا باپ مر چکا ہے۔ میں نے ایک بار اس سے مرنے کی بات کہی تھی تو یہ بیمار پڑ گیا تھا۔ تب سے میں اس کا دل دکھانا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے باپ کی تصویریں دکھا کر کہتی تھی کہ یہ دوسرے ملک کام کرنے گئے ہیں۔“

ایک مسلح جوان نے قہقہہ لگا کر کہا۔ ”بہت خوب! تم اس کا دل دکھانا نہیں چاہتی تھیں لیکن اس کو مرنے کے لیے ہمارے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔“

اس نے بچے کو اٹھا لیا۔ پھر گلے سے لگا کر رونے لگی۔ سب اس کا جواب سننے کے منتظر تھے ــــ وہ بچے کو لے کر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ریلنگ کے پاس آئی۔ پھر بچے کو اتار کر فرش پر کھڑا کرتے ہوئے کہا۔ ”کوئی ماں اتنی ظالم نہیں ہوتی کہ بچے کو مرنے کے لیے دشمنوں کے ہاتھوں میں چھوڑ دے۔ میں بہت مجبور ہو گئی تھی۔ مجبور ہو کر سوچا اگر میں اس طرح چھوڑ دوں گی تو یہاں سیکڑوں مسافر ہیں، سیکڑوں مائیں ہیں۔ کسی کے دل میں تو ممتا جاگے گی۔ اگر وہ میرے بچے کو نہیں اپنائے گی۔ تو کم از کم اسے مرنے بھی نہیں دے گی۔“

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ”جب تک میرا بچہ رسیوں سے لٹکتا رہا میری ممتا سولی پر چڑھی رہی۔ میں اپنے آپ کو اندر ہی اندر مارتی رہی، انتظار کرتی رہی کہ اسے بچانے کے لیے سارے مسافر ایک ہو جائیں گے کسی قوم میں سب کے سب بدمعاش نہیں ہوتے۔ سارے بہاری یا سارے بنگالی بدمعاش نہیں ہیں۔ ہزار انتقامی جذبوں کے باوجود انسان کا ضمیر اسے جھنجوڑتا ہے۔ سوچنے سمجھنے ہمدردی اور محبت کرنے پر مجبور کرتا

ہے۔ تم کہتے ہو،" میں نے اپنے بیٹے کو موت کے منہ میں چھوڑ دیا۔ میں کہتی ہوں،" جب تک یہ بچہ موت کے شکنجے میں رہا تب تک میں نے یہاں باضمیر انسانوں کا ایک ہجوم دیکھا۔ وہ سب میرے بچے کے لیے تڑپ رہے تھے۔ سب کے دل میں ممتا اور پدرانہ محبت تھی۔ سب اس بچے کے لیے سوچ رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ اس لانچ کی اوپر سے نیچے تک مسافر عورتوں نے کھانا چھوڑ دیا تھا۔ وہ اس بچے کی باتیں کر رہی تھیں۔ میرا بچہ ایک اجتماعی محبت کا مرکز بن گیا تھا۔ میں نے اپنی ایک ممتا کو ہار کر ساری ماؤں کی محبتیں اپنے بیٹے کے لیے جیت لی تھیں۔"

ایک مسافر نے کہا۔" ہمیں تمہارے بچے سے ہمدردی ہے۔ ہم اسے مرنے نہیں دیں گے لیکن تم نے اپنے بچے کو بے یار و مددگار کیوں چھوڑ دیا ہے؟ کیا ہماری انسانیت کو آزمانے کے لیے؟"

وہ بولی۔" انسانیت کو آزمانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ میں نے ایسے بہاریوں کو دیکھا ہے جو بہاری غنڈوں کے خلاف آواز اٹھاتے رہے۔ ایسے بنگالیوں کو دیکھا ہے جو بنگالی بدمعاشوں کا محاسبہ کرتے رہے ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ میں اپنے بچے کو چھوڑ دوں گی تو کوئی نہ کوئی محبت کرنے والا اسے اپنے ساتھ لے جائے گا اور اگر کوئی نہ بھی لے گیا تو یہ بھیک مانگ کر کسی طرح اپنی زندگی گزار لے گا۔"

ایک عورت نے پوچھا۔" تم اتنی سنگدل کیوں ہو؟ اپنے بچے کو حالات کے رحم و کرم پر کیوں چھوڑنا چاہتی ہو؟"

دوسری عورت نے کہا۔" اور کیا بات ہوسکتی ہے۔ بھیک مانگنے پر بھی پیٹ نہیں بھرتا ہوگا۔ اس لیے اولاد کو چھوڑ رہی ہے۔"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔" نہیں، میں اپنا پیٹ کاٹ کر اپنے بچے کو کھلا سکتی ہوں۔ اسے زندہ سلامت رکھنے اور اپنے کلیجے سے لگائے رکھنے کے لیے میں نے اپنی زندگی میں بہت کچھ ہارا ہے۔ بڑی بڑی قیمتیں ادا کی ہیں لیکن اب میں مجبور ہوگئی ہوں۔"

کسی نے پوچھا۔" کیا مجبوری ہے؟"

وہ بچے سے الگ ہو کر مسافروں کے درمیان سے گزرتے ہوئے بولی۔" میں بھیک مانگتی ہوں۔ کبھی میں بہت ہی خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ مگر ماضی کے گن گانے کا فائدہ بھی کیا ہے۔ بس حالات نے مجھے بھکارن بنا دیا اگر میں تنہا ہوتی تو بہت پہلے ہی خودکشی کر چکی ہوتی لیکن اپنے بچے کی خاطر زندہ ہوں۔ اس کے لیے بھیک مانگتی ہوں۔"

کسی نے کہا۔" یہ بچہ بھی تمہارے ساتھ بھیک مانگتا رہے گا تو تمہاری آمدنی بڑھے گی۔ پھر اسے کیوں چھوڑنا چاہتی ہو؟"

" تم ٹھیک کہتے ہو۔ یہ بھی بھیک مانگتا ہے تو ایسا ہے دو وقت کا کھانا مل جاتا ہے لیکن یہ بنگلہ بولتے بولتے بے اختیار اردو بولنے لگتا ہے۔ بچہ ہے۔ میں اسے سمجھاتی ہوں مگر یہ سمجھتا نہیں ہے۔ اس کی نادانی مجھے ذہنی اذیتوں میں مبتلا کر دیتی ہے۔ میں خیرات مانگتی ہوں تو کوئی مجھے اللہ کے نام پر دیتا ہے، کوئی میری جوانی کے نام پر سخی داتا بن جاتا ہے لیکن جب یہ بچہ اچانک اردو بولنے لگتا ہے تو میرا راز فاش ہو جاتا ہے۔ خیرات دینے والے سمجھ لیتے ہیں کہ میں بہاری ہوں پھر وہ میرے بچے کے سامنے میرے وجود کے دشمن بن جاتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ میرے بارے میں کیا سوچ رہا ہے۔"

کچھ لوگ مسکرا رہے تھے کیونکہ بنگالی عورتوں پر بھی ایسے ہی مظالم ڈھائے گئے تھے۔ کچھ لوگوں کے سر ندامت سے جھکے ہوئے تھے۔ عورتیں اپنے سر پر آنچل رکھنے کے بہانے اپنا منہ چھپا رہی تھیں۔ وہ بچہ دوڑتا ہوا اپنی ماں کے پاس پھر آگیا تھا۔ پھر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا تھا۔ وہ کہنے لگی۔" میں نے سوچا، ڈھاکہ جاؤں گی اور وہاں محمد پور کیمپ میں پناہ لوں گی لیکن یہاں لانچ میں سوار ہونے سے پہلے میرے ساتھ پھر ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ میرے اندر کی ممتا چیخ چیخ کر کہنے لگی کہ ماں اور بیٹے کے درمیان شرم و حیا کی اتنی اونچی دیوار کھڑی کر دو کہ بیٹا کبھی ماں کو نہ دیکھ سکے۔ میں نے اسے لانچ کے مسافروں میں لاکر بٹھا دیا۔ چپ چاپ چھوڑ کر یہاں عرشے پر چلی آئی۔ یہ مجھے تلاش کرتا ہوا عرشے پر آیا تو میں اس سے کترا کر نیچے چلی گئی۔ جب یہ نیچے گیا تو میں پھر اوپر آگئی۔ اسی دوران یہ ان لوگوں کے ہتھے چڑھ گیا۔"

وہ فوراً چپ ہوئی۔ پھر چیخ کر بولی۔" میرا بیٹا مجھ پر بوجھ نہیں ہے۔ یہ تو کمانے والا بیٹا ہے۔ پھر بھی میں نے اسے چھوڑ دیا، ہاں چھوڑ دیا۔ درندوں کے درمیان ماں اور بیٹا ساتھ نہیں رہ سکتے اس لیے ماں نے بیٹے کو چھوڑ دیا۔"

اچانک وہ تکلیف سے کراہنے لگی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی کمر کو تھام لیا۔ پھر وہ لڑکھڑاتے ہوئے ایک عورت کی طرف بڑھی۔ دو عورتوں نے اسے سہارا دے دیا۔ ایک عورت نے پوچھا۔" کیا ہوا؟"

دوسری نے کہا۔" اور کیا ہوگا۔ دیکھتی نہیں ہو۔" پھر اس نے بلند آواز سے کہا۔" ذرا کوئی دیکھے۔ کوئی دائی ماں یہاں مل سکتی ہے؟"

کچھ عورتوں کو ایک بھکارن کے ماں بننے سے گھن آرہی تھی۔ وہ دور ہٹ گئیں۔ کچھ عورتیں ایسے معاملات میں بڑھ

چڑھ کر حقہ لیتی ہیں۔ وہ اسے سہارا دے کر کیبن میں لے آئیں۔ کیبن کے مرد باہر چلے آئے۔ ایک نے ناگواری سے کہا۔ "یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ ہمارے دیش میں ہزاروں بھکاری ہیں۔ کیا ہم ان سب کو اپنے سر پر بٹھالیں؟"

دوسرے جنٹلمین نے کہا۔ "ہم مہنگے ٹکٹ لے کر فرسٹ کلاس میں اس لیے تو سفر نہیں کرتے کہ بھکاری لوگ کو بھی یہاں لے آیا جائے۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی کلیم الدین بھوئیاں کی گرج دار آواز سنائی دی۔ سب ادھر پلٹ کر دیکھنے لگے۔ وہ ریلنگ سے ٹیک لگائے اسٹین گن پر بیٹھا ہوا کہہ رہا تھا۔ "بکواس کرنے سے پہلے اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو۔ ہم گناہ کے لیے ایک تھرڈ کلاس عورت کو فرسٹ کلاس میں لے آتے ہیں لیکن گناہ کا خمیازہ بھگتنے کے لیے اسی عورت کو سماج کے تھرڈ کلاس میں بھی جگہ نہیں دیتے۔"

ایک شخص نے کہا۔ "یہ باتیں ان سے کہو جو اپنا منہ کالا کرتے ہیں۔ ہم شریف لوگ ہیں۔"

"اگر شریف ہو تو باضمیر بھی بنو۔ اپنے ضمیر کی عدالت میں فیصلہ کرو۔ کیا اس بہاری بچّے کو مار ڈالنا چاہیے؟"

ایک شخص نے کہا۔ "نہیں، ہم اسے مارنے کے حق میں نہیں ہیں۔"

دوسرے نے کہا۔ "ہم فیصلہ کرنے والے کون ہوتے ہیں۔ یہاں مکتی باہنی کے جوان موجود ہیں۔ انھوں نے ہمارے دیش کو ظالموں سے مکت کیا ہے۔ یہ ہمارے نجات دہندہ ہیں۔ انھوں نے آزادی کی جنگ لڑی ہے۔ یہ اپنے طور پر فیصلہ کریں گے۔"

ایک مکتی باہنی کے جوان نے کہا۔ "ہمارا فیصلہ ہے، ہمارے دیش کی زمین پر ایک بہاری بھی زندہ نہ رہے۔ ہم ان کے بچّوں کو اگر جان سے نہیں ماریں گے تو کم از کم اپاہج بنا کر چھوڑیں گے۔"

ان کی باتوں کے دوران کلیم الدین بھوئیاں اپنے پیچھے سے کپڑے کو ہٹاتا رہا۔ پھر اچانک ہی اسٹین گن لے کر کھڑا ہو گیا۔ وہ چاروں مسلح جوان کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ایک خستہ حال بنگالی کے پاس اسٹین گن ہو سکتی ہے۔ ایک نے پوچھا۔ "کون ہو تم؟"

"تمھاری طرح ایک پیدائشی بنگالی ہوں۔ جب میرا گھر بار لٹ گیا، میرا اس دنیا میں کچھ نہیں رہا تو میں جنون میں مبتلا ہو گیا۔ میں نے سوچا، بنگالی بنگالی نہیں ہیں، بہاری بہاری نہیں ہیں۔ سب شیطان ہو گئے ہیں۔ کوئی بھی میرے ہتھے چڑھے گا تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا لیکن اللہ نے مجھ سے بڑا ہی خوبصورت مذاق کیا ہے۔ میری زندگی میں ایک عورت آئی۔ میں نہیں جانتا کہ وہ بنگالی تھی یا بہاری۔ وہ چند گھنٹوں

تک ہمارے ساتھ سفر کرتی رہی۔ جب ہمارا ایک بہاری ساتھی مارا گیا تو وہ اس کے لیے بین کرنے لگی۔ اس عورت کی اداؤں نے سمجھایا کہ انسانیت کیا ہوتی ہے۔ میں اس عورت کے نام پر یہ ہتھیار اٹھا رہا ہوں۔ میں نے کچھ دیر پہلے یہاں کے مسافروں کو دھمکی دی تھی کہ اس بچّے کو مارا گیا تو لانچ کا ایک مسافر بھی دوسرے کنارے تک نہیں پہنچ سکے گا۔ یہ لانچ بھی اس بچّے کے ساتھ ڈوب جائے گی۔"

ایک مکتی باہنی کے جوان نے اسٹین گن سنبھالتے ہوئے کہا۔ "تم ایسا نہیں کر سکو گے۔ ہم چار ہیں اور تم ایک ہو۔"

بھوئیاں نے کہا۔ "میرے پاس اٹھائیس کارتوسوں کا ایک راؤنڈ ہے جتنی دیر میں تم مجھ پر گولیاں برساتے رہو گے، میں اتنی دیر میں ایک راؤنڈ تمام مسافروں پر خالی کر دوں گا۔"

مسافر سہمے ہوئے پیچھے ہٹ رہے تھے۔ کلیم الدین بھوئیاں نے کہا۔ "خبردار! کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ کوئی حرکت کرے گا تو فائرنگ شروع ہو جائے گی۔"

سب اپنی اپنی جگہ سہمے ہوئے کھڑے رہے۔ کلیم الدین بھوئیاں نے کہا۔ "ہاں! میں نے دھمکی دی تھی لیکن میں اپنی اس دھمکی پر عمل نہیں کروں گا۔ میں انسان ہوں۔ میں نے کہا نا، اوڑھنا نے مجھے انسانیت کا درس دیا ہے۔ مجھے محبت کرنا سکھایا ہے۔ میں

تم سب سے محبت کرتا ہوں۔ اس لیے یہ گولیاں تم پر خالی نہیں کروں گا۔"

یہ کہتے ہی وہ دوسری طرف پلٹ گیا۔ دوسری طرف دریا تھا، کھلا آسمان تھا۔ وہ اچانک ہی فائرنگ کرنے لگا۔ تڑ تڑا تڑ کی آواز کے ساتھ ہی دائیں سے بائیں گولیاں چلاتا گیا اور کہتا گیا۔ "ہمارے دیش میں گولیاں بہت چل چکیں۔ اب انھیں دریا میں بہا دو۔"

تڑ تڑا تڑ کی آواز دور تک دریا میں گونجتی جارہی تھی۔ لانچ کے مسافروں کے کان بج رہے تھے۔ وہ سب دم بخود تھے۔ کسی کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ اٹھائیس کارتوس فوراً ہی ختم نہیں ہوجاتے۔ تڑ تڑا تڑ کی آواز کے ساتھ وہ گولیاں دہشت کی طرح دماغوں میں چیخ رہی تھیں اور وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ "ہمارے دیش میں رقص ہے، موسیقی ہے، گیت ہے، محبت ہے اور یہ سب کچھ انسانی رابطوں اور رشتوں کے بغیر ممکن نہیں ہے۔"

تڑ تڑا تڑ، تڑ تڑا تڑ اور پھر راؤنڈ ختم ہوگیا۔ اسٹین گن خالی ہوگئی۔ اس نے پلٹ کر تمام مسافروں کی طرف دیکھا۔ اپنے دونوں ہاتھوں پر اسٹین گن رکھ کر اسے یوں آگے بڑھایا جیسے محبت کا تحفہ تھال میں رکھ کر پیش کر رہا ہو۔ پھر اس نے کہا۔ "یہ خالی ہوچکی ہے۔ اس کی ایک ایک گولی تمہارے سینوں میں اتر سکتی تھی۔ میں نے تم سب کو حیاتِ نو دی ہے۔ اب تم اس بچے کو معاف کر دو۔"

یہ کہہ کر اس نے اسٹین گن کو دور لانچ کے باہر پھینک دیا۔ وہ اسٹین گن فضا میں چکراتی ہوئی دریا کی لہروں میں جاکر گم ہوگئی۔ لانچ کے تمام مسافر گم صم کھڑے ہوئے تھے۔ بہت سے لوگ مکتی باہنی کے مسلح جوانوں کو دیکھ رہے تھے۔ اب فیصلہ ان کے ہاتھ میں تھا۔

اتنے سارے مسافروں کے درمیان وہ ننھا سا بچہ سہما ہوا کھڑا تھا۔ چند لمحوں تک گہری خاموشی چھائی رہی۔ پھر وہ مکتی باہنی کے جوان اپنی اپنی اسٹین گنوں کو شانوں سے لٹکا کر آگے بڑھتے ہوئے زینے تک آئے۔ وہاں پہنچ کر رک گئے۔ ایک نے تمام مسافروں پر سرسری سی نظر ڈالی۔ پھر کہا۔ "بھوتاں! ہم انسان ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ پلٹ گیا۔ اس کے ساتھ اس کے ساتھی بھی زینے سے اترتے ہوئے نیچے چلے گئے۔ کتنے ہی مردوں نے اطمینان کی سانس لی۔ کتنی ہی عورتوں کی آنکھیں ممتا سے چمک رہی تھیں۔ کلیم الدین بھوتیاں تھکے ہوئے انداز میں ریلنگ کا سہارا لے کر آہستہ آہستہ بیٹھ گیا۔

عرشے کے آخری سرے پر مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ ٹھیک اسی وقت کہیں سے ایک نوزائیدہ بچے کے رونے کی آواز آنے لگی۔

❀

نین تارا، عظمیٰ اور بڑو دیدی جاگ رہی تھیں۔ رات کے تین بجنے والے تھے۔ نین تارا بے چینی سے کبھی اٹھتی تھی، کبھی بیٹھتی تھی، کبھی دروازے تک جاتی تھی اور مایوس ہوکر لوٹ آتی تھی۔ خسرو نے کہا تھا "وہ نو بجے آئے گا۔ رات کا کھانا کھا کر گیارہ بجے تک ریلوے اسٹیشن چلا جائے گا پھر شاید صبح واپسی ہوگی۔ کیونکہ اس کے نام اناج کا دوسرا ویگن پہنچنے والا تھا۔

بڑو دیدی رو رہی تھیں۔ ان کی نند شکشی شام سے مندر گئی تھی، پھر لوٹ کر نہیں آئی تھی۔ ہر جگہ تلاش جاری تھی۔ ہریا نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ایک آدھ گھنٹے میں ہی اسے ڈھونڈ نکالے گا لیکن رات گزرنے والی تھی۔ چینتا اس بات کی تھی کہ شکشی اس کے پتی کی بہن تھی۔ تلسی رام نے اپنی بہن کو اس کی پناہ میں رکھا تھا۔ اب وہ آکر سختی سے پوچھ گچھ کر سکتا تھا کہ جب حالات اتنے خراب تھے تو بڑو دیدی نے شکشی کو تنہا مندر کیوں جانے دیا تھا؟

عظمیٰ چپ چاپ ان دونوں کو دیکھتی رہتی تھی۔ زبان سے کچھ کہہ نہیں سکتی تھی۔ اسے اچھی طرح تسلیاں دینا بھی نہیں آتا تھا۔ وہ کبھی اپنا ہاتھ نین تارا کی پشت پر رکھتی تھی۔ محبت سے سہلاتی تھی، کبھی بڑو دیدی کا ہاتھ تھام کر تھپکنے لگتی تھی۔ ان تینوں نے دوپہر کے بعد سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ بھوک مر گئی، نیند اڑ گئی تھی۔ بڑو دیدی نے نین تارا سے کہا۔ "میں نے تمہارے جیجا جی سے کہہ دیا تھا، شکشی کو لے کر سید پور میں نہیں رہوں گی۔ یہاں غنڈے بدمعاش زیادہ ہیں۔ مگر انھوں نے میری نہیں سنی۔"

نین تارا نے کہا۔ "غنڈے بدمعاش کہاں نہیں ہیں۔ جہاں جہاں سے ہم گزرتے آئے ہیں، اپنی جان ہتھیلی پر رہی ہے۔ انھوں نے کہا تھا، رات کا کھانا میرے ساتھ کھائیں گے لیکن اب تک نہیں آئے۔ دیدی! میرا جی چاہتا ہے، بھاگ کر باہر چلی جاؤں۔ چیخ چیخ کر انھیں آوازیں دینے لگوں۔ جب سے وہ سید پور پہنچے ہیں، ان کے ہزاروں دشمن ہوگئے ہیں۔"

وہ پھر تڑپ کر اٹھ گئی۔ تیزی سے چلتے ہوئے دروازے کی طرف جانے لگی۔ وہ تینوں سامنے والی بیٹھک میں تھیں۔ وہاں سے اٹھ کر باہر برآمدے میں آ گئی تھیں۔ برآمدے میں چھت سے

فرش تک لوہے کی جالیاں لگی ہوئی تھیں۔ اس لیے ڈر نہیں لگتا تھا۔ جالی سے باہر والی سڑک دور دور تک نظر آتی تھی۔ آس پاس مارواڑیوں کے دو منزلہ اور تین منزلہ مکانات تھے۔ سڑک ویران تھی۔ مکانات بھی خاموش اندھیروں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ عظمٰی اس کے ساتھ آکر باہر دیکھ رہی تھی۔

باہر سامنے ہی ایک گائے کھڑی ہوئی تھی۔ گائے کے ماتھے پر سیندور لگا ہوا تھا اور اس کی دونوں سینگوں پر گیندے کے پھول نظر آرہے تھے۔ ایسی کتنی ہی گائیں مارواڑی پٹی میں چہل قدمی کرتی رہتی تھیں۔ ہندو انھیں دیکھتے ہی ہاتھ جوڑ کر سر جھکاتے تھے پھر اس سے پہلے کہ گئو ماتا ٹکر مارے، وہ کترا کر گزر جاتے تھے۔ جب یہ علاقہ پاکستان تھا تو ہندوؤں کے محلے میں شاذ و نادر ہی گائے نظر آتی تھی۔ چور اُچکے انھیں قصائیوں کے ہاتھ فروخت کر دیتے تھے۔ بنگلہ دیش بنتے ہی مارواڑی پھر وہاں آکر آباد ہونے لگے۔ ان کے ساتھ اب گائیں بھی ماتھے پر تلک لگائے نظر آیا کرتی تھیں۔ اب کسی کی مجال نہیں تھی کہ ان جانوروں کو ہاتھ لگاتا۔ اگرچہ بنگلہ دیش بھی مسلمانوں کا تھا لیکن وہاں ہندوؤں کو سینگ مارنا آتا تھا۔

نین تارا لوہے کی جالیوں کو دونوں ہاتھوں سے تھامے دیر تک دیکھتی رہی۔ کبھی کوئی بھولا بھٹکا گزرتا ہوا نظر آتا تو اس پر خسرو کا گمان ہوتا۔ دوسرے لمحے وہ مایوس ہوجاتی۔ انتظار کرنے والا کیا جانے کہ آنے والے پر کیا گزر رہی ہے۔ وہ مایوس ہوکر بڑو دیدی کے پاس آگئی۔ عظمٰی وہیں جالی کے پاس کھڑی رہی۔ بڑو دیدی نے پوچھا۔ ”وہ کہاں ہے؟“

نین تارا نے تھکے ہوئے انداز میں مونڈھے پر بیٹھ کر کہا۔ ”وہیں برآمدے میں ہے۔“

دیدی نے ناگواری سے پوچھا۔ ”آخر وہ اتنی بے چین کیوں ہے؟ کیا خسرو سے جتنی محبت تم کرتی ہو اتنی ہی وہ بھی کرتی ہے؟ میں دیکھتی آرہی ہوں، وہ خسرو کے معاملے میں تمھاری برابری کرتی رہتی ہے۔“

نین تارا نے سوچ کر کہا۔ ”دیدی! میں عظمٰی کو جہاں تک سمجھ پائی ہوں، وہ محبت کی بھوکی ہے اور دل کی بُری نہیں۔“

”کیا تم اس کے دل میں بیٹھی ہو؟“

”دل کی بات خدا جانتا ہے۔ میں اتنا جانتی ہوں کہ عورت کیسی ہی ہو، اپنا آدمی ٹھیک ہے تو سب ٹھیک ہے۔“

”میں جب بیاہ کر آئی تھی تو ایسا ہی سوچتی تھی کہ اپنے آدمی کو ٹھیک رہنا چاہیے۔ میں تمھارے جیجا جی پر بہت بھروسہ کرتی تھی۔ ان کے ایک دور کے رشتے کی بیوہ عورت ہمارے ہاں آگئی۔ اچھی خوبصورت تھی۔ میں سمجھی تمھارے جیجا جی اس سے ہمدردی کر رہے ہیں۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ میرے سینے پر مونگ دلنے آئی تھی۔ پھر بڑے جھگڑے ہوئے۔ کیا بتاؤں اس عورت کو گھر سے نکالنے میں کتنی دشواریاں پیش آئیں۔ یہ مرد کسی کے پیچھے پڑ جاتے ہیں تو اسے چھوڑنا نہیں چاہتے۔ میں بھی کچھ کم نہیں ہوں۔ آخر چھڑا کر ہی رہی۔ تب سے کان پکڑ لیے کہ پھر کسی عورت کو اپنے گھر میں قدم رکھنے نہیں دوں گی۔ تمھاری بات اور ہے تم میری بھابی ہو لیکن اس گونگی کو دیکھ کر تمھارے جیجا جی کی حرکت یاد آجاتی ہے۔ میں بار بار تمھیں سمجھا چکی ہوں، میرا کچھ نہیں جائے گا، تمھی نقصان اٹھاؤ گی۔ میں نے خسرو کو بھی دبی زبان سے کہا ہے کہ وہ اس گونگی کا کہیں ٹھکانہ کرے لیکن وہ توجہ ہی نہیں دیتا۔ ایک بات پوچھوں؟“

”کیا بات ہے، دیدی؟“

”تم خسرو کی دھرم پتنی ہو لیکن میں دیکھتی رہتی ہوں، اس کے پاس جانے سے ہچکچاتی ہو۔ میں اس کے پاس بیٹھنے کے لیے کہتی ہوں تو تم بیٹھتی ہو ورنہ کھنچی کھنچی سی رہتی ہو۔ اس کے برعکس وہ گونگی سیدھی اس کے پاس چلی جاتی ہے۔ بُرا نہ ماننا کوئی دیکھنے والا یہی کہے گا کہ تم ہاتھی کے دانت ہو، صرف دکھانے کے لیے۔ کھانے والا دانت کوئی اور ہے۔“

عظمٰی دروازے کے پاس کھڑی ہوئی سن رہی تھی۔ وہ بے زبان تھی۔ بے حس نہیں تھی۔ اس کے دل پر چوٹیں لگ رہی تھیں مگر وہ کیا کہہ سکتی تھی، مجبور تھی۔ بڑو دیدی کے تیور کو سمجھتی تھی، وہ اسے اپنے ہاں رکھنا نہیں چاہتی تھیں۔۔۔ وہ خود سوچتی تھی کہ خسرو اور نین تارا سے کیوں لگی ہوئی ہے، کب تک ان پر بوجھ بنی رہے گی؟ وہ ایسا سوچتی تھی لیکن انھیں چھوڑ کر کہاں جاسکتی تھی؟ کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ باہر نکلتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔

وہ بیٹھک میں آئی۔ بڑو دیدی اسے دیکھتے ہی چپ ہوگئیں۔ نین تارا سے اس کی نظریں ملیں۔ اس نے کہا۔ ”اڑڑ باڑ یہ ہے (اصل بات یہ ہے) کہ تم خسرو کی منکوحہ ہوتے ہوئے بھی اس کی بیوی نہیں ہو۔ اسی لیے تم اس کے قریب جانے سے ہچکچاتی ہو۔ میرے اور خسرو کے درمیان کوئی جھجک والا رشتہ نہیں ہے۔ خسرو کی جو خدمت تمھیں کرنا چاہیے، وہ میں کرتی ہوں۔ میرے من میں کوئی کھوٹ نہیں ہے اور اس کھوٹ کو بڑو دیدی نہیں سمجھ سکتیں۔“

یہ کہہ کر وہ پلٹ گئی اور دوسرے کمرے کی طرف جانے لگی۔ اس کے جانے کے بعد بڑو دیدی نے حیرانی سے پوچھا۔ ”یہ

کیا کہہ رہی تھی۔ کیا تم اس کی گڑ بڑ گڑ بڑ بولی کو سمجھ لیتی ہو؟"

نین تارا اور خسرو اس کی بولی کو بڑی حد تک سمجھنے لگے تھے۔ نین تارا نے سمجھ کر بھی انکار کیا "نہیں، میں سمجھ نہیں سکتی لیکن اتنا جانتی ہوں، جب یہ کچھ بولنا چاہتی ہے اور بولے بغیر نہیں رہ سکتی تو اپنی زبان ہلانے لگتی ہے خواہ کوئی سمجھے یا نہ سمجھے۔"

بڑو دیدی نے کہا "مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے یہ ہمیں باتیں سنا کر گئی ہے۔"

وہ جواب میں کچھ کہنا چاہتی تھی، اسی وقت ہریا کی آواز سنائی دی۔ وہ باہر سے بڑو دیدی کو پکار رہا تھا۔ وہ دونوں فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھیں اور تیزی سے چلتے ہوئے برآمدے میں آگئیں۔ ان کے پیچھے عظمیٰ بھی چلی آئی تھی۔ بڑو دیدی نے بے چینی سے پوچھا "جلدی بتاؤ ہریا! کیا ششی مل گئی ہے؟"

ہریا نے نین تارا اور عظمیٰ کو گھورتے ہوئے کہا "ہاں مل گئی مگر میں ان دونوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

بڑو دیدی نے نین تارا اور عظمیٰ کو دیکھا۔ پھر حیرانی اور غصے سے پوچھا "کیا بکواس کر رہے ہو؟ پہلے ششی کے متعلق بتاؤ۔ ان دونوں کو آنکھیں کیوں دکھا رہے ہو؟"

"دروازہ کھولو۔ بات ایسی ہے کہ سنو گی تو انھیں گولی مار دو گی۔"

"بات کیا ہے؟"

یہ پوچھتے ہوئے بڑو دیدی نے دروازے کو کھول دیا۔ ہریا نے اندر آتے ہوئے کہا "تم جسے بھائی کہتی ہو، جس کے گن گاتی ہو، جس کی شرافت کی قسمیں کھاتی ہو، وہی غنڈہ ششی کو لے گیا تھا۔"

بڑو دیدی نے غصے سے کہا "ہریا! میں تھپڑ مار دوں گی۔ خسرو کے بارے میں ایسا مت کہو۔"

"تم مجھے بولنے سے روک سکتی ہو۔ دنیا والوں کو نہیں روک سکتیں۔ ابھی کتنے ہی لوگ خسرو اور ششی کو پکڑ کر یہاں لا رہے ہیں۔"

"کیا؟" بڑو دیدی حیرانی اور بے یقینی سے اپنے بھائی کا منہ تکنے لگیں۔ ہریا نے کہا "وہ ششی کو ماگی پاڑہ کے ایک مکان میں لے گیا تھا۔ اب میں کیا بتاؤں۔ کچھ بولتے ہوئے شرم آتی ہے۔ اب تو جو کہنا ہے، وہ دنیا والے ہی کہیں گے اور تم سنو گی۔ تم کیا، جیجا جی بھی سنیں گے اور کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ میں پہلے ہی کہتا تھا۔ یہ مسلمان بھلا کسی کے ہوئے ہیں، جس تھالی میں کھاتے ہیں، اسی میں چھید کرتے ہیں۔"

نین تارا نے بڑو دیدی کے بازو کو تھام کر کہا "نہیں دیدی! نہیں۔ وہ ایسے نہیں ہیں۔ یہ ان پر بہتان ہے۔"

دیدی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پہلی بار سرد مہری کا اظہار کیا۔ ابھی وہ نین تارا وغیرہ سے ناراض نہیں تھیں۔ نہ ہی خوش تھیں۔ جو کچھ ہریا کہہ رہا تھا، اسے آنکھوں سے دیکھ کر یقین کرنا چاہتی تھیں۔ کچھ دیر بعد ہی لوگوں کی بھیڑ دکھائی دی۔ ان کے درمیان ایک سائیکل رکشہ تھا جس پر ایک عورت گھونگھٹ نکالے بیٹھی ہوئی تھی۔ رکشہ کے آگے آگے خسرو تھا اور وہ تمام لوگ باری باری اسے مار رہے تھے اور دھکا دیتے ہوئے اسی طرف لا رہے تھے۔

بڑو دیدی، نین تارا اور عظمیٰ گم صم کھڑی دیکھ رہی تھیں۔ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بھی انھیں یقین نہیں آرہا تھا۔ اتنا سمجھ میں آگیا کہ رکشہ میں بیٹھی ہوئی عورت ششی ہے۔ وہ بھیڑ بڑو دیدی کے برآمدے کے سامنے آکر رک گئی۔ تقریباً سو ڈیڑھ سو آدمیوں کا مجمع ہوگا۔ اس وقت چار بجنے والے تھے۔ ایسے وقت لوگ گہری نیند سوتے ہیں لیکن آئے دن کے ہنگاموں کے لوگ عادی ہو گئے تھے۔ ذرا سی بات ہو تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتے تھے۔ اسی لیے اتنی بھیڑ لگ گئی تھی۔ اس بھیڑ میں دھرم چند اور اس کے غنڈے بھی موجود تھے۔

دھرم چند کو دیکھتے ہی بڑو دیدی نے گھونگھٹ نکال لیا۔ اس نے آگے بڑھ کر کہا "بھابی! تلسی رام جی یہاں موجود نہیں ہیں لیکن میں نے آنکھیں کھلی رکھتا ہوں۔ جس دن سے یہ بہاری مسلمان آپ کے گھر میں آیا ہے، میں ہمیشہ اس کی ٹوہ میں لگا رہتا تھا۔ آج شام کو جب معلوم ہوا کہ ششی غائب ہو گئی ہے تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے اپنے تمام آدمیوں کو سید پور کے چپے چپے پر پھیلا دیا۔ ششی کو تلاش کرتا رہا۔ آخر ہم نے ماگی پاڑہ میں ان دونوں کو ڈھونڈ نکالا۔"

ہریا رکشہ کے پاس پہنچ گیا تھا اور ششی کو سہارا دے کر اتار رہا تھا۔ خسرو کو اتنی مار پڑی تھی کہ اس کا چہرہ پہچانا نہیں جا رہا تھا۔ وہ زخموں سے چور تھا۔ اس میں کھڑے رہنے کی بھی سکت نہیں تھی۔ ادھر سے ادھر ڈگمگا رہا تھا۔ اس کے باوجود اس نے چیخ کر کہا "یہ سب جھوٹ ہے۔ دیدی! اوپر میرا خدا ہے۔ نیچے آپ ہیں۔۔۔"

وہ لڑکھڑاتا ہوا آگے آیا۔ پھر لوہے کی جالی کو پکڑ کر کہنے لگا "آپ مجھ پر بھروسہ کرتی ہیں۔ آپ اچھی طرح جانتی

ہیں، میں ششی کو اپنی بہن کی طرح چاہتا ہوں۔"

پیچھے سے کسی نے اسے لات ماری۔ پھر اسے گالیاں دیتے ہوئے کہا۔ "شرم نہیں آتی، اسے بہن کہتے ہو۔ ہم تمہارا منہ توڑ دیں گے۔"

بھیڑ میں سے کسی نے کہا۔ "اور نہیں تو کیا تمہیں زندہ چھوڑیں گے۔"

کسی اور نے کہا۔ "ہم نے اپنی آنکھوں سے تمہارے کرتوت دیکھے ہیں۔ ہم تو تمہاری بوٹی بوٹی کرکے چیل کوؤں کو کھلا دیں گے۔"

دھرم چند نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "خاموش رہو۔ سانچ کو آنچ کیا ہے۔ ابھی ششی کے بیان سے اس کا کچا چٹھا سامنے آجائے گا۔"

اسی وقت تھانے کا داروغہ چھ سپاہیوں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ بڑو دیدی نے کہا۔ "ہریا! انسپکٹر صاحب سے کہو اندر آجائیں اور کوئی نہ آنے پائے۔ ان کے سپاہی خسرو کا خیال رکھیں کوئی اسے ہاتھ نہ لگائے۔"

تھوڑی دیر بعد بیٹھک میں بڑو دیدی ششی کو لے کر لکڑی کے تخت پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ داروغہ ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ نین تارا اور عظمیٰ تخت سے لگی کھڑی ہوئی تھیں۔ ہریا بیٹھک میں نہیں آیا۔ اس کے اندر کا چور کہہ رہا تھا کہ پکڑا جا سکتا ہے لیکن پکڑے جانے کے لیے کوئی ثبوت نہیں تھا۔ پھر بھی وہ بیٹھک کے باہر کھڑا کھڑکی سے جھانک کر دیکھ رہا تھا۔

بڑو دیدی نے ششی کا گھونگھٹ اٹھا کر کہا۔ "ششی! تم پر جو قیامت گزری ہے، اسے میں دل سے محسوس کر رہی ہوں۔ میری بہن! جو کچھ بھی ہوا، دل پر پتھر رکھ لو۔ یہاں داروغہ صاحب بیٹھے ہوئے ہیں۔ سچ سچ بتا دو۔ تم پر کس نے ظلم کیا ہے؟"

سب اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ گم صم بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے دیدے پھیلے ہوئے تھے۔ وہ پلک نہیں جھپک رہی تھی۔ بڑو دیدی کو ڈر سا لگا۔ وہ زندہ لاش لگ رہی تھی۔ اس نے جھنجوڑ کر پوچھا۔ "ششی! تم ایسے خاموش کیوں ہو؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن بڑو دیدی کو اطمینان ہوگیا۔ اس کی سانس چل رہی تھی۔ وہ زندہ تھی۔ داروغہ نے اپنی کرسی پر ذرا سیدھی طرح بیٹھتے ہوئے کہا۔ "دلوی جی! آپ خاموش نہ رہیں۔ اگر کسی نے دھمکی دی ہے، زبان بند رکھنے کے لیے کہا ہے تو ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کا نام بتائیں میں ابھی آپ کے سامنے اس کی پٹائی کروں گا۔ اسے حوالات میں بند کر دوں گا۔"

"مرنے کے بعد اگر تمہیں دوبارہ دنیا میں بھیجا جائے؟" پادری نے پوچھا۔ "تو کیا تم دوبارہ انہیں غلطیوں کو دہراؤ گے جو پہلے جنم میں تم سے سرزد ہوتی رہی تھیں؟"

"یقیناً" جواب ملا "لیکن پادری صاحب دوسری مرتبہ ہچکچاہٹ سے کام نہیں لوں گا۔ غلطیوں کی ابتدا ابتدا ہی سے کر دوں گا۔"
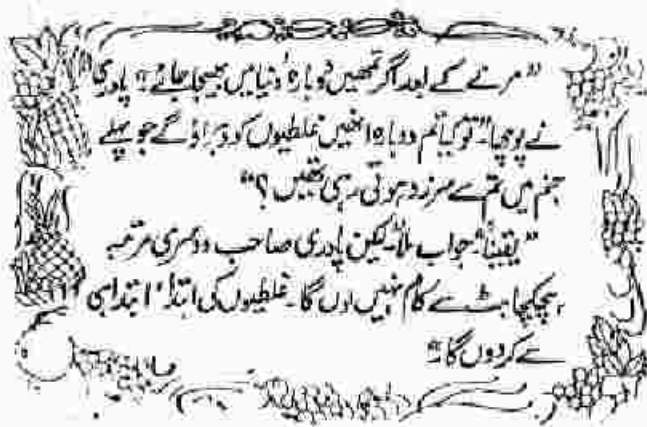
وہ کچھ نہیں بول رہی تھی۔ گم صم بیٹھی ہوئی تھی۔ نین تارا اس کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی پھر دو زانو ہوگئی۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر کہنے لگی۔ "میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑ کر التجا کرتی ہوں۔ خدا کے لیے زبان کھولو۔ نہیں تو ان پر الزام آئے گا ہم کہیں کے نہیں رہیں گے۔ لوگ انہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

عظمیٰ بھی ششی کے سامنے آکر بیٹھ گئی۔ وہ زبان سے کچھ کہہ نہیں سکتی تھی لیکن اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ بڑو دیدی نے بار بار پوچھا۔ پھر داروغہ نے کہا۔ "دلوی جی! آپ خاموش رہیں گی تو ہمارے لیے مشکل ہو جائے گی۔ آپ اپنی بھابی کے کان میں صرف مجرم کا نام بتا دیجیے۔"

بڑو دیدی آگے کھسک کر ششی کے قریب آگئیں، آہستگی سے بولیں۔ "میرے کان میں بتا دو۔"

بڑی دیر بعد ششی کے جسم میں حرکت سی پیدا ہوئی۔ وہ آگے پیچھے ڈول رہی تھی جیسے جنون طاری ہو رہا ہو پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا جیسے سر چکرا رہا ہو۔ بڑو دیدی نے پوچھا۔ "کیا ہوا، ششی! بولو، کیا ہوا؟"

اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ پھر اس نے اپنے جسم کا سارا بوجھ اپنی بھابی پر ڈال دیا۔ بڑو دیدی، نین تارا اور عظمیٰ نے اسے سنبھالا۔ پھر لکڑی کے تخت پر لٹا دیا۔ اسے پنکھا جھلنے لگیں۔ عظمیٰ نے اس کی نبض ٹٹولی، نین تارا نے اس کے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ دھڑکنیں جاری تھیں۔ وہ زندہ تھی لیکن بے ہوش ہوگئی تھی۔۔۔

باہر خسرو چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ "ہریا! تم خاموش کیوں ہو، تم لوگوں کو کیوں نہیں بتاتے کہ میں تمہارے ساتھ تھا۔ بدمعاشوں نے ہم دونوں کو پکڑ لیا تھا۔ زبردستی ہم دونوں کو شراب پلائی تھی۔"

داروغہ اس کی باتیں سن کر بیٹھک کی کھڑکی کے پاس آگیا۔ وہیں ہریا کھڑا ہوا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "ہریا! یہ کیا کہہ رہا ہے؟"

ہربالا نے کہا: "آپ خود دیکھ لیں۔ کیا میرے منہ سے شراب کی بُو آرہی ہے یا . . ."

اس نے انسپکٹر کے قریب منہ کھول کر سانس چھوڑی، پھر کہا: "یہ بکواس کرتا ہے۔ میں نے شام سے اسے دیکھا تک نہیں اور کہتا ہے، میں اس کے ساتھ تھا۔ بدمعاشوں نے ہمیں پکڑ لیا تھا۔ داروغہ صاحب! یہ مار کھا کھا کر آدھا پاگل ہوگیا ہے۔ میرے ہی گھر کی عورت کو لے گیا اور مجھے ہی اپنی حمایت میں گواہ بنا رہا ہے۔ پاگل کا بچہ۔"

داروغہ نے گھور کر خسرو کو دیکھتے ہوئے کہا: "اے ماوڑا! اپنا منہ بند رکھو۔ جب پوچھا جائے تو جواب دینا۔ اس سے پہلے کچھ بولو گے تو میرے سپاہی تمھاری پٹائی کریں گے۔"

پھر اس نے ایک سپاہی سے کہا: "تم فوراً اس رکشہ میں جاؤ اور کسی ڈاکٹر کو لے آؤ۔ شمشی دیوی بے ہوش ہوگئی ہیں۔"

سپاہی رکشہ میں بیٹھ کر چلا گیا۔ خسرو چپ چاپ کھڑا ہوا تھا۔ اب وہ بولنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ اتنی مار کھا چکا تھا کہ سپاہیوں کی مار کھانا اس کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔ ایک ہاتھ بھی پڑتا تو وہ بے ہوش ہو کر گر پڑتا۔

دھرم چند نے اونچی آواز میں بڑی دیدی کو آواز دی۔ "شانتا بھابی! ہمارے گھر کی کچھ عورتیں آنا چاہتی ہیں۔ دروازہ کھول دیجیے۔"

بڑی دیدی نے کہا: "داروغہ صاحب! آپ اپنی طرف سے منع کر دیں۔ ان سے کہہ دیں، جب تک قانونی کارروائی مکمل نہیں ہوگی شمشی کا بیان نہیں لیا جائے گا۔ اس وقت تک کسی کو اندر آنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔"

داروغہ نے یہی بات دھرم چند سے کہہ دی۔ تھوڑی دیر میں ڈاکٹر آیا۔ اس کے لیے دروازہ کھول کر پھر بند کر دیا گیا۔ اس وقت تک شمشی کو دوسرے کمرے میں پہنچایا گیا تھا۔ وہاں ڈاکٹر نے اچھی طرح معائنہ کیا پھر اس کے لیے نسخہ لکھا۔ اسے ایک انجکشن لگایا۔ پھر کہا: "میں یہاں آتے وقت سپاہی کی زبان سے بہت کچھ سن چکا ہوں۔ دیوی جی کے دماغ کو سخت صدمہ پہنچا ہے۔ اسی صدمے سے یہ بے ہوش ہوگئی ہیں — جلد ہی یہ ہوش میں آجائیں گی۔ جب ہوش میں آئیں تو یہ دوا انھیں پلا دیجیے گا۔"

ڈاکٹر چلا گیا۔ صبح کی ہلکی ہلکی سی روشنی پھیل رہی تھی۔ داروغہ نے کہا: "میں اس بدمعاش کو لے جا کر حوالات میں بند کر دیتا ہوں۔ جب دیوی جی بیان دیں گی تو . . ."

بڑی دیدی نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا: "آپ کس بدمعاش کی بات کر رہے ہیں؟"

"وہی جو باہر کھڑا ہے۔ لوگوں نے جسے پکڑ رکھا ہے۔"

"لیکن داروغہ صاحب! شمشی نے ابھی کسی کا نام نہیں لیا ہے۔ میں خسرو کو دس برس سے جانتی ہوں۔ یہ لڑکا میرے سامنے جوان ہوا ہے۔ بہت ہی شریف لڑکا ہے لیکن آدمی کب جانور بن جاتا ہے، یہ کہا نہیں جاسکتا۔ پھر یہ کہ اس کے خلاف سیکڑوں گواہ ہیں۔ جب تک اس کی بے گناہی ثابت نہیں ہوگی۔ میں اسے اور اس کی ان دو عورتوں کو اپنے گھر میں برداشت نہیں کروں گی لیکن یہ بھی نہیں چاہوں گی کہ یہ دربدر ہوجائیں — کیا آپ شمشی کا بیان لینے تک ان تینوں کو دشمنوں سے کہیں بچا کر نہیں رکھ سکتے؟"

داروغہ نے ذرا سوچ کر کہا: "میں ان عورتوں کو یہاں قریب ہی شیر بلڈنگ میں پہنچا دوں گا اور خسرو کو حوالات میں بند کر دوں گا۔"

نین تارا نے دونوں ہاتھ جوڑ کر نہیں نہیں کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے اور روتے ہوئے کہا: "نہیں دیدی! نہیں، مجھے بھی ان کے ساتھ حوالات میں بھیج دیجیے۔ میں ان سے دور نہیں رہوں گی۔"

عظمیٰ نے بھی دونوں ہاتھ جوڑ دیے تھے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ بڑی دیدی نے ان دونوں کو دیکھا۔ کچھ سوچا پھر وہ دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ واپس آئیں تو اس کے ہاتھ میں سو روپے کا ایک نوٹ تھا۔ اس نے وہ نوٹ انسپکٹر کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا: "میں چاہتی ہوں، آپ خسرو کو بھی ان عورتوں کے ساتھ اسی شیر بلڈنگ میں حفاظت سے پہنچا دیں۔ ہوسکے تو اپنے ایک سپاہی کو وہاں چھوڑ دیں۔"

داروغہ نے نوٹ کو تہہ کر کے جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ "آپ چنتا نہ کریں۔ میں ان تینوں کو حفاظت سے وہاں پہنچا دوں گا۔ کوئی انھیں ہاتھ تک نہیں لگائے گا اور جب تک شمشی کا بیان ہم نہیں سنیں گے، تب تک کسی نتیجہ پر نہیں پہنچیں گے۔ اس وقت تک ان تینوں کی حفاظت کی ذمے داری مجھ پر ہوگی۔"

بڑی دیدی نے نین تارا اور عظمیٰ کو دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا: "اب جاؤ یہاں سے۔"

نین تارا دوسرے کمرے میں گئی۔ وہاں سے اپنی اٹیچی لے آئی۔ پھر اس اٹیچی کو بڑی دیدی کے قدموں میں رکھتے ہوئے کہا: "آپ تلاشی لے لیں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ جاؤ یہاں سے۔"

اس نے اٹیچی اٹھالی۔ پھر عظمیٰ کا ہاتھ تھام کر داروغہ

کے پیچھے چلتے ہوئے بیٹھک سے باہر نکل آئی۔

وہ عمارت آسیب زدہ تھی۔ جب وہ تینوں عمارت کے دروازے پر پہنچے تو دن کا اُجالا پھیل چکا تھا۔ شیر بلڈنگ کے بڑے ہال میں پناہ لینے والے مرد، عورتیں، بوڑھے، بچے پولیس والوں کو دیکھ کر پریشان ہوگئے تھے۔ داروغہ نے کہا۔ ”یہ تینوں یہاں رہیں گے۔ ایک سپاہی کی ڈیوٹی یہاں رہے گی مگر تم لوگوں کو بھی تاکید کی جاتی ہے، اس شخص کو اچھی طرح پہچان لو۔ اس کا نام خسرو ہے۔ یہ اس بلڈنگ سے باہر نہ جانے پائے۔ اگر جانا چاہے تو پولیس کو خبر کر دینا۔“

داروغہ اپنی افسری دکھا کر چلا گیا جس پولیس والے کی ڈیوٹی تھی، وہ بھی باہر چلا گیا۔ وہ تینوں اس بڑے ہال کی ایک دیوار سے لگ کر بیٹھ گئے۔ ان کے آس پاس چادریں تنی ہوئی تھیں۔ سب لوگ چادروں کی چار دیواری میں اپنے اپنے خاندان کے ساتھ وہاں زندگی گزار رہے تھے۔ کچھ لوگ آکر خسرو کے متعلق پوچھنے لگے۔ اسے کیا ہوگیا ہے؟ کیسے زخمی ہوگیا ہے؟

خسرو فرش پر لیٹ گیا تھا۔ نین تارا نے کہا۔ ”میرے بھائیو! میری بہنو! اگر ہمدردی کرنا ہے تو ان کے لیے کوئی دوا لاؤ۔ کچھ مرہم پٹی کرو۔ آپ یہ پوچھ کر کیا کریں گے کہ ہمارے ساتھ کیا ہوا ہے۔ وہی ہوا ہے جو آپ تمام لوگوں کے ساتھ ہو چکا ہے۔“

بھیڑ چھٹنے لگی۔ ایک بوڑھے نے آکر اس کے زخموں کو صاف کرنا شروع کیا۔ پھر ان پر حکیمی دوا کا لیپ چڑھانے لگا۔ وہ مار کھا کھا کر ادھ موا ہو چکا تھا۔ ذرا آرام ملا تو آنکھ لگ گئی۔ اگرچہ ابھی اس کی زندگی اور موت کا فیصلہ ہونا تھا۔ شستی کے بیان دینے کے بعد اس کے ساتھ نین تارا اور عظمیٰ بھی ماری جاتیں لیکن موت کا یقین ہونے کے باوجود، وہ اذیتیں برداشت کرنے کے باوجود تھکن کے مارے بیدار نہ رہ سکا۔ جب نیند آتی ہے تو سولی پر بھی آجاتی ہے۔ اس لیے وہ سو گیا۔

نین تارا نے عظمیٰ سے پوچھا۔ ”کیا تم خسرو کو گنہگار سمجھتی ہو؟“

عظمیٰ نے انکار میں سر ہلایا۔ پھر نین تارا کے سر کو اپنے سینے پر رکھ لیا۔ اسے تھپکنے لگی۔ ایک ہاتھ اس کی آنکھوں پر رکھ دیا۔ اشارے سے کہہ رہی تھی۔ ”سو جاؤ، زیادہ نہ سوچو، جو ہونا ہے وہ تو ہو کر ہی رہے گا۔“

بے شک ہونی ہو کر رہتی ہے۔ اس کے باوجود فکر کرنے والے مرنے سے پہلے مرتے رہتے ہیں۔ سوچتے ہیں کہ ہونے والی بات کے متعلق نہیں سوچیں گے پھر بھی دماغ سوچتا چلا جاتا ہے۔ ویسے نین تارا کو اب اتنی زیادہ پریشانی نہیں تھی۔ خسرو واپس آگیا تھا۔ یہ بہت بڑی بات تھی۔ وہ پچھلی تمام رات اسی کی واپسی کے لیے دعائیں مانگتی رہی تھی۔ دعا قبول ہوگئی تھی۔ اب اس کے ساتھ موت بھی آئے تو پروا نہیں تھی۔

> مشہور فلم ایکٹرس صوفیہ لارین کا کہنا ہے کہ عام طور پر کوئی لڑکی اس بات کی فکر نہیں کرتی کہ ایک شخص اس سے محبت کرے اور اسے چھوڑ جائے بشرطیکہ بہت کچھ چھوڑ کر جائے۔

وہ بھی خسرو کی قربت سے مطمئن ہو کر رفتہ رفتہ سو گئی۔ وقت گزرنے لگا۔ عظمیٰ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی ہوئی تھی۔ نین تارا اس کے زانو پر سر رکھے سو رہی تھی۔ وہ کتنے مان سے تلسی رام کے ہاں گئے تھے۔ بڑو دیدی نے ان کی بڑی عزت کی تھی اور بڑی بے عزتی سے نکالا تھا۔ عظمیٰ آنکھیں بند کیے ہوئے تھی لیکن وہ یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ سو رہی ہے یا جاگ رہی ہے۔ بعض حالات میں انسان نیند کے دوران بھی جاگتا رہتا ہے۔

اسے چاروں طرف سے فکر اور اندیشوں نے گھیر رکھا تھا۔ فکر اس بات کی تھی کہ اس کا گزارا کہاں ہوگا؟ کیسے ہوگا؟ آخر وہ زندگی کا باقی حصہ کیسے گزارے گی؟ اس کی موجودگی سے خسرو اور نین تارا کی ازدواجی زندگی میں بے اعتمادی پیدا ہونے کے امکانات پیدا ہوگئے تھے۔ ایک بڑو دیدی کی بات ہی نہیں تھی۔ دنیا والے بھی اس کی موجودگی سے طرح طرح کی باتیں بنا سکتے تھے۔ پہلے بھی ایسا ہو چکا تھا۔ بہت پہلے جب وہ اپنی بڑی بہن اور بہنوئی کے ساتھ رہتی تھی تو بہن اسے گھورتی ہوئی نظروں سے دیکھتی تھی۔ اپنے شوہر سے لڑتی تھی کہ عظمیٰ سے ہنسی مذاق نہ کیا کرو۔ شوہر کہتا تھا ”یہ میری سالی ہے۔ ایک نہیں ہزار بار مذاق کروں گا۔“

اس کی خوبصورتی اس کے لیے مصیبت بن گئی تھی۔ ماں باپ کے مرنے کے بعد کوئی رشتے دار اسے مستقل اپنے ہاں رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ جس گھر میں رہتی تھی، اس گھر کی عورتیں سوچتی تھیں، یہ بلا کسی دوسرے رشتے دار کے ہاں چلی جائے۔

عظمیٰ کو وہ گزرے ہوئے تمام واقعات خواب کی طرح لگ رہے تھے۔ وہ آنکھیں بند کیے سوچ رہی تھی لیکن لگ رہا تھا، نیند میں ہے۔ اس آسیب زدہ عمارت میں لوگوں کے چلنے پھرنے اور باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ جیسے سائے چل رہے

ہوں، سامنے بول رہے ہوں کسی کی صورت پہچانی نہیں جاتی تھی۔

ایسے ہی وقت اس کی آنکھ ذرا سی کھلی۔ کچھ نیند کا خمار تھا، کچھ نیم بیداری تھی۔ اسے عمارت کا ماحول خواب خواب سا لگا۔ نگاہوں کے سامنے دھندلکا سا تھا۔ اس دھندلکے میں اس نے سامنے والی دیوار کو دیکھا۔ تب اسے وہ آسیب نظر آیا جو کسی کسی کو نظر آتا تھا اور انھیں جنون میں مبتلا کر دیتا تھا۔

اس کی نیند میں ڈوبی ہوئی ادھ کھلی آنکھوں کے سامنے دیوار پر بڑے بڑے دانت نظر آئے۔ دانت بہت نوکیلے اور تیز تھے۔ دانت والے کی شکل نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ منہ پھاڑے ہوئے تھا۔ اوپر دانتوں کی ایک قطار تھی نیچے دانتوں کی دوسری قطار تھی پھر ایک گاجر اس کے منہ میں آئی۔ اس نے کچکچا کر گاجر کو کاٹا۔ کچ کی آواز کے ساتھ گاجر کا تھوڑا حصہ کٹ کر دانتوں کے اندر منہ میں رہ گیا۔ باقی حصہ باہر تھا۔

یہ منظر دیکھتے ہی عظمٰی کے حلق سے ایک چیخ نکلی۔ وہ ہڑبڑا کر آنکھیں کھول کر وحشیانہ انداز میں چاروں طرف دیکھنے لگی۔ اس ہال میں جتنے پناہ گزیں تھے سب دوڑتے ہوئے چلے آئے۔ عورتیں کہہ رہی تھیں "دیکھو اب اس پر دورہ پڑا ہے اس پر پھر وہی آسیب سوار ہے۔"

نین تارا اور خسرو بھی گھبرا کر اٹھ بیٹھے تھے۔ وہ دونوں عظمٰی کو دونوں طرف سے جھنجوڑ کر پوچھ رہے تھے "کیا ہو گیا؟ کیا ہوا تمھیں؟"

عظمٰی نے دوسری بار ایک چیخ ماری۔ پھر ساکت ہو کر سامنے والی دیوار کو دیکھنے لگی۔ دراصل وہ عمارت بہت ہی بوسیدہ تھی۔ اس کی دیواریں کہیں کہیں سے تڑخ گئی تھیں، کہیں ان پر کائیاں سی جم گئی تھیں۔ اس کے علاوہ پلاستر ادھڑا ہوا تھا۔ جب دیواروں کے پلاستر جگہ جگہ سے ادھڑ جاتے ہیں تو وہاں عجیب و غریب نقشے سے بن جاتے ہیں۔ انھیں غور سے دیکھا جائے تو کہیں گھوڑے کی شکل نظر آتی ہے، کہیں کوئی بے ڈھنگا سا آدمی تلوار یا نیزہ لیے حملہ کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ جو لوگ کسی بھی چیز کو سرسری طور پر دیکھ کر گزر جاتے ہیں، ان کی بات الگ ہے لیکن وہ لوگ جو ہر چیز کو توجہ سے دیکھتے ہیں، ان کا دماغ ان چیزوں میں اپنی زندگی کے بگڑے ہوئے حالات کی تصویریں دیکھنے لگتا ہے اور وہ تصویریں پھر زندہ ہو کر انھیں ڈرانے لگتی ہیں۔

اس عمارت میں آ کر پناہ لینے والوں میں جو بہت زیادہ حساس تھے، ان میں سے کسی نے دیوار کے ادھڑے ہوئے پلاستر میں اپنے پیارے کا سر تن سے جدا ہوتے دیکھا تھا اور دہشت و جنون میں مبتلا ہو گیا تھا۔ کہیں دیوار کا پلاستر یوں ادھڑا ہوا تھا جیسے کسی کا لخت جگر نیزے کی انی پر پھڑپھڑا رہا ہو۔ اسے دیکھ کر کتنی ہی حساس مائیں چیخنے چلانے لگتی تھیں۔ نوشتۂ دیوار آنے والے وقت کا آئینہ ہوتا ہے لیکن بوسیدہ، شکستہ دیواریں گزرے ہوئے وقت کا افسانہ سناتی ہیں۔ اس عمارت کی دیواروں پر ادھڑے ہوئے پلاستر پاکستان سے بنگلہ دیش بننے تک کی تاریخ مرتب کر چکے تھے۔ انھیں صرف پڑھنے والے پڑھ سکتے تھے جو نہیں پڑھ سکتے تھے، وہ اسے آثار قدیمہ سمجھ کر گزر جاتے تھے۔

لیکن عظمٰی نے اس دیوار پر کیا دیکھا؟ اور جو دیکھا تھا اس کی زندگی سے اس کا کیا تعلق تھا؟ بول عظمٰی! بول تو بے زبان سہی، دیوار کے ادھڑے ہوئے پلاستر بھی بے زبان ہوتے ہیں مگر بولتے ہیں۔ تو بھی زبانِ بے زبانی سے بول...

دوسرے ہی لمحے وہ بولنے والی مینا بن گئی۔ وہ خوب بولتی تھی، اگرچہ پڑھنا لکھنا نہیں جانتی تھی۔ ماں باپ بچپن میں ہی مر گئے تھے۔ رشتے داروں نے اسے لکھنا پڑھنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ سب کی متفقہ رائے یہ تھی کہ یہ چڑیل اپنے حسن و شباب کے بل بوتے پر کسی کے ہاں جا بسے گی۔

اکثر پیشگوئی درست ہوتی ہے۔ جن لوگوں نے اس کے متعلق پیشگوئی کی تھی، وہ ایک ایک کر کے مکتی باہنی والوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ ان کے کمانڈر نے پہلے عظمٰی کی بہن سے پوچھا۔ "کیا تم بنگالی بھاشا بول سکتی ہو؟"

اس کی بہن نے جواب دیا "اے گے ہاں، آمی بولتے پاری (جی ہاں، میں بول سکتی ہوں)"

پھر اس کمانڈر نے عظمٰی کے بہنوئی سے یہی سوال کیا۔ اس کے بہنوئی نے بھی بنگالی زبان میں جواب دیا اور کہا "ہمارا پورا خاندان کلکتے سے آیا ہے۔ ہم بڑی روانی سے بنگالی بول سکتے ہیں۔"

کمانڈر نے حقارت سے کہا "تم لوگ تھالی کے بینگن ہو۔ جب تک پاکستان رہا، اردو زبان کی حمایت کرتے رہے۔ دن رات اردو بولتے رہے۔ تمھارے گھروں میں کوئی ہماری بھاشا بولنے والا نہیں تھا۔ اب اپنی موت کو سامنے دیکھ کر ہمارے سامنے ہماری بھاشا سُنا رہے ہو۔"

اس نے فائر کا حکم دیا۔ پھر دوسرے ہی لمحے تڑاتڑ فائرنگ کی آواز کے ساتھ ہی اس کی بہن اور بہنوئی کی چیخیں سنائی دیں۔ وہ دوسرے کمرے میں چھپی ہوئی تھی۔ ان کی موت کا تماشا نہ دیکھ سکی۔ پھر دو سرے جوان اسے پکڑ کر آنگن میں لے آئے۔ مکتی باہنی کے کمانڈر نے اسے دیکھا تو چند لمحوں تک دیکھتا ہی

رہ گیا۔ پھر اس نے سخت اور کھردرے لہجے میں کہا "آمی منعم باللہ۔ تومی کے؟" (میں منعم باللہ ہوں۔ تم کون ہو؟)"

عظمیٰ کے سامنے بہن اور بہنوئی کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ خوف سے تھر تھر کانپتے ہوئے بولی "عظمیٰ۔"

اس نے پوچھا "تمھار بھاشا؟ (تمھاری زبان کیا ہے؟)"

عظمیٰ نے ڈرتے ڈرتے بنگالی زبان میں کہا "مجھ سے پہلے میری بہن اور بہنوئی نے بنگلہ زبان میں باتیں کیں۔ انھیں مار ڈالا گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا میں کون سی زبان بولوں۔"

"تم دنیا کی کوئی سی زبان بولوگی تو زندہ رہوگی۔ بنگلہ بھاشا بولوگی تو تمھیں پیار سے اٹھا کر لے جاؤں گا لیکن بہاریوں کی زبان بولوگی تو تمھارے حسن سے آنکھیں چرا کر تمھاری موت کا حکم دے دوں گا۔"

عظمیٰ بنگالی زبان میں اپنی زندگی کی بھیک مانگنے لگی۔ منعم باللہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہوا اس کے سامنے پہنچا، پھر اس نے اپنا ایک ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ عظمیٰ نے ڈرتے ڈرتے اپنا ایک ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس نے ایک جھٹکے سے اسے اپنی طرف کھینچا۔ پھر اپنے کاندھے پر لاد لیا۔ اس کے رشتے دار کبھی اسے کوستے رہتے تھے۔ طنز یہ پوچھتے رہتے تھے "تم اتنی حسین ہو۔ کوئی تمھیں اٹھا کر کیوں نہیں لے جاتا؟" آج اسے اٹھا کر لے جانے والا آگیا تھا۔

وہ عظمیٰ کو دیناج پور کے ریلوے کوارٹر میں لے آیا۔ عظمیٰ کو اپنے رشتے داروں کی موت کا صدمہ تھا لیکن کچھ زیادہ نہیں تھا۔ کسی نے اس کے ساتھ کبھی ایک رشتے دار جیسا سلوک نہیں کیا تھا۔ ہمیشہ ایک نوکرانی سمجھا تھا۔ اپنا جھوٹا کھانے کے لیے دیتے تھے۔ کسی نے اسے ایک لفظ پڑھانے اور اس کے لیے کبھی پیسے خرچ کرنے کے متعلق سوچا تک نہیں تھا۔ اس لیے وہ ان کے متعلق نہیں سوچتی تھی۔ اسے منعم باللہ کی محبت مل گئی تھی اور وہ اس سے متاثر ہوتی جا رہی تھی۔

دوسری طرف منعم باللہ بھی اس سے متاثر تھا۔ وہ کہتا تھا "میں جو کچھ لوٹ کر لاؤں گا تمھارے قدموں میں رکھ دوں گا۔ تم جو کھاؤ گی، کھلاؤں گا۔ جو پہنوگی، پہناؤں گا لیکن یاد رکھنا اپنی زبان سے اردو کا ایک لفظ بھی ادا نہ کرنا۔ میرے کان گالی سن سکتے ہیں مگر یہ زبان نہیں سن سکتے۔"

وہ بھول کر بھی اس کے سامنے اردو نہیں بولتی تھی۔ عورت اپنے مرد کے لیے دنیا چھوڑ دیتی ہے۔ ایک زبان چھوڑنے میں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ اردو نہیں بولتی تھی مگر کب تک نہ بولتی۔ یہ زبان اس کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اس نے

دن رات، سوتے جاگتے اس زبان کے آہنگ کو اپنے دل و دماغ میں اور روح کی گہرائیوں میں جذب کیا تھا۔۔۔ وہ شعوری طور پر نہ بولے۔ غیر شعوری طور پر ایک بے چینی سی رہتی تھی۔ پہلے پہل اس نے اس بے چینی کو محسوس نہیں کیا۔ منعم باللہ نے اسے جیسے ڈھالا، وہ ڈھل گئی۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ گھٹن سی ہوتی ہے جب وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ریوالور اور اسٹین گن لے کر چلا جاتا تھا اور وہ کوارٹر میں تنہا رہ جاتی تھی تو آہستگی سے اردو کا کوئی فقرہ ادا کرتی تھی پھر گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھتی تھی۔ دروازہ اندر سے بند ہوتا تھا۔ وہ کھڑکیوں کو بھی بند کر دیتی تھی۔ پھر منعم باللہ کی تصویر کے پاس جاتی تھی۔ اسے سینے سے لگاتی تھی۔ پھر تصویر کے کان کے پاس اپنا منہ لے جا کر سرگوشی میں کہتی تھی "دیکھو، میں اپنی مادری زبان بول رہی ہوں۔ بڑے آئے اپنی بات منوانے والے۔ دیکھ لو میں تمھارے کان میں اپنی زبان کا رس گھول رہی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگتی تھی۔ ایک رات اس نے بڑی محبت سے پوچھا "تم اس زبان سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہو؟"

وہ بنگالی زبان میں گفتگو کر رہی تھی۔ اردو زبان میں اس سے باتیں کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ عظمیٰ اس کے اس اضطراب کو سمجھ رہی تھی۔ اس نے کہا "جب یہ فیصلہ کیا گیا کہ صرف اردو زبان قومی زبان ہوگی، ان دنوں میں چار برس کا تھا۔ میری ماں ڈھاکہ یونیورسٹی کی طالبہ تھی۔ میری نانی میری پرورش کرتی تھی اور میری ماں اپنا زیادہ سے زیادہ وقت پڑھنے لکھنے میں صرف کرتی تھی۔ وہ بہت ذہین طالبہ تھی۔ بنگلہ بھاشا کو قومی زبان بنانے کی تحریک میں پیش پیش رہی تھی۔ جب یہ تحریک زور پکڑنے

لگی تو بنگلہ زبان کا حق مانگنے والوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔ میری ماں نے بھی اپنے سینے پر گولی کھائی۔ ڈھاکہ کے شہید مینار پر آج بھی میری ماں کا نام لکھا ہوا ہے۔ جب بھی میں اس کا تصوّر کرتا ہوں تو میری رگوں میں خون کے بجائے آگ سی پگھلنے لگتی ہے۔ میرے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگتی ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے "جو سامنے آئے اسے کچا چبا جاؤں۔ جب میں پانچ برس کا تھا تو میری ماں شہید ہوئی تھی۔ آج میں اٹھائیس برس کا ہوں۔ میری ماں کا عزم تھا کہ پاکستان میں بنگالیوں کی اکثریت ہے۔ لہٰذا قومی زبان بنگلہ بھاشا ہوگی آج ہم نے بنگلہ دیش بنا لیا لیکن میری ماں کی قاتل زبان ابھی اس دھرتی پر موجود ہے۔ میں اپنے دیش کی اس دھرتی سے اس زبان کو مٹا کر ہی دَم لوں گا۔ جب تک زندہ رہوں گا کسی اردو بولنے والے کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

وہ کہتے کہتے رک گیا۔ کان لگا کر کچھ سننے لگا۔ عظمیٰ نے پوچھا "کیا بات ہے؟"

اس نے غصّے سے دانت پیستے ہوئے کہا "کوئی اردو بول رہا ہے۔"

وہ حیرانی سے بولی "کون بول رہا ہے۔ مجھے تو کسی کی آواز سنائی نہیں دے رہی ہے۔ رات کے دو بجے ہیں۔ بھلا یہاں کون اردو بولنے اور تمہارے ہاتھوں مرنے کے لیے آئے گا۔"

وہ غصّے سے چیخ کر بولا "بول رہا ہے، وہ کمینہ بول رہا ہے۔"

ایسا کہتے ہوئے وہ بستر سے اچھل کر فرش پر کھڑا ہو گیا۔ وہاں سے چلتا ہوا الماری کے پاس پہنچا۔ پھر الماری سے ایک ریوالور نکال کر اس کے چیمبر کو چیک کرنے لگا۔ عظمیٰ ڈرتے ہوئے اس کے پاس آئی۔ پھر بولی "تمہیں کیا ہو گیا۔ باہر کوئی نہیں ہے۔ کوئی نہیں بول رہا ہے۔"

اس نے ایک ہاتھ سے اس کی کلائی کو تھام لیا۔ پھر اسے کھینچتا ہوا کوارٹر سے باہر لے جاتے ہوئے کہنے لگا "تم بہری ہو گئی ہو آؤ میں تمہیں اس کی آواز سناتا ہوں کہ وہ کیسے بول رہا ہے اور میں تمہیں دکھاتا ہوں کہ کس طرح میں بولنے والوں کا منہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیتا ہوں۔"

باہر دور تک ویرانی تھی۔ بھلا اتنی رات کو کون اپنے گھر سے نکلتا جبکہ حالات سازگار نہیں تھے۔ کوارٹر کے سامنے ہی اسٹریٹ لیمپ کی روشنی میں ایک کتا بھونکتا ہوا نظر آیا۔

عظمیٰ اور منعم باللہ کی آہٹ سنتے ہی وہ ان کی طرف پلٹ کر بھونکنے لگا۔ منعم باللہ نے کہا "دیکھا! میں نہ کہتا تھا کہ بول رہا ہے کوئی اپنی خبیث زبان بول رہا ہے۔"

یہ کہتے ہی اس نے ہٹائیس سے گولی مار دی۔ عظمیٰ نے اپنے ہاتھ دونوں کانوں پر رکھ لیے۔ آنکھیں بند کر لیں۔ جب اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو وہ کتا تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ اس نے عظمیٰ کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ "طوطا پالنے والے اپنی اپنی زبان اسے سکھاتے ہیں۔ تم میری مینا ہو، میں تمہیں اپنی زبان سکھا رہا ہوں۔ جس دن تم کتوں کی زبان میں بولوگی، وہ تمہاری زندگی کا آخری دن ہوگا۔"

وہ اس کی گرفت میں سہمی رہی۔ اگرچہ اس نے محبت سے گرفت میں لیا تھا۔ اس رات وہ سو نہ سکی۔ اس کی اور اپنی محبت کا تجزیہ کرتی رہی۔ پتا چلا کہ اس نے منعم باللہ کو قبول کیا تھا۔ لیکن یہ قبولیت ایسی ہی تھی، جیسے حالات نے اسے قتل کرنے سے پہلے اس کی آخری خواہش پوچھی ہو۔ بتاؤ، تم تلوار سے مرنا چاہتی ہو یا نفرت سے؟ اس نے سوچا، تلوار کے ایک وار سے زندگی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی، نفرت سے کبھی کبھی مرے گی مگر طبعی عمر تک زندہ تو رہے گی۔

اور وہ زندہ تھی۔ اکثر مشرقی عورتیں اپنے نفرت کرنے والے شوہروں کے ساتھ زندگی گزارتی ہی ہیں۔ ان کی گالیاں سنتی ہیں۔ ان کی لاتیں جوتے کھاتی ہیں لیکن ان کے ساتھ ہیں زندہ تو رہتی ہیں۔ منعم باللہ کبھی اسے گالی نہیں دیتا تھا کبھی اسے مارتا نہیں تھا۔ وہ اس کا دیوانہ تھا۔ بس ایک زبان کی نفرت تھی جسے وہ برداشت کر لیتی تھی لیکن کبھی کبھی یہ نفرت کانٹے کی طرح چبھتی تھی۔ وہ کبھی کبھی اس کی محبتوں سے سرشار ہو کر سوچتی تھی کہ اپنے جذبوں کا کھل کر اظہار کرے۔ بنگلہ زبان میں اظہار کرتی تھی مگر پھر بھی تشنگی محسوس ہوتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے لفظوں کو بنا بنا کر سنبھل سنبھل کر بول رہی ہے۔ محبت بناوٹ نہیں چاہتی۔ محبت کا اظہار تو خود بخود بڑی روانی اور بڑی بے ساختگی سے ہوتا ہے۔ اس کے لیے لفظ تلاش کرنے نہیں پڑتے۔ مادری زبان خود ہی منہ سے نکلتی چلی جاتی ہے۔ لیکن وہ اس روانی اور بے ساختگی کو روکتی تھی۔ اپنی مادری زبان کے آگے بنگلہ بھاشا کا بند باندھتی رہتی تھی۔

لیکن کوئی کب تک بند سے کسی سیلاب کا راستہ روک سکتا ہے۔ راستہ روک بھی لے تو پانی اپنے گزرنے کے لیے دوسرا راستہ بنا لیتا ہے۔ کوئی بات ہو تو بچہ بے اختیار اپنی مادری

زبان میں اپنی ماں کو پکارتا ہے۔ آدمی خواب کی حالت میں یا نیم بے ہوشی کی حالت میں اپنی ہی زبان میں بڑبڑاتا ہے۔ یہ بنگالیوں اور بہاریوں کی دو مختلف نفسیاتی اور لسانی حقیقتیں ہیں۔ بنگالی کسی حیرت کے مقام پر یا کسی دہشت کے زیر اثر ماں کو پکارتے ہیں "او ماگو" اور بہاری باپ کو آواز دیتے ہیں۔ ایسے کسی موقع پر بے اختیار ان کی زبان سے نکلتا ہے "باپ رے!"

یہ اپنی اپنی مادری زبان کی ایسی اٹل سچائیاں ہیں جنہیں بے اختیار زبان پر آنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ ایک رات منعم باللہ کوارٹر میں نہیں آیا۔ دوسرے دن دوپہر کے قریب آیا۔ کہنے لگا "اپنی اٹیچی اٹھاؤ اور میرے ساتھ چلو۔ ہم رنگ پور جا رہے ہیں۔"

عظمیٰ نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ اس کے ساتھ جانے سے انکار نہیں کر سکتی تھی۔ وہ بھلا انکار کب سننے والا تھا اگر اسے چھوڑ بھی دیتا تو وہ کس کے رحم و کرم پر رہتی۔ اس نے اٹیچی میں زیورات، نقد روپے اور اپنے کپڑے رکھ لیے۔ وہ لوٹ کا مال اس کے ہاتھوں میں لا کر یوں رکھتا تھا جیسے شوہر اپنی بیوی کے ہاتھوں میں اپنی کمائی لا کر دیتا ہے۔

وہ شام کو پاربتی پور پہنچ گئے۔ ادھر مکتی باہنی کے جوانوں نے بتایا کہ ایک ریلوے ٹرالی کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ اس ٹرالی میں وہ رنگ پور جائیں گے۔ اس سے پہلے وہ پاربتی پور کی ایک مالدار آسامی کو لوٹنے کے لیے گئے۔ اس نے عظمیٰ کو ریلوے کے ایک خالی بنگلے میں چھوڑ دیا۔ اسے تاکید کی، دروازے اور کھڑکیاں باہر سے بند رکھے جب تک وہ آواز نہ دے دروازہ نہ کھولے۔

ایک گھنٹے بعد ہی وہ واپس آ گیا۔ اس کے ساتھی لوٹ کا بہت سا مال اٹھا کر لائے تھے۔ اس نے کہا "میرا حصہ دروازے پر رکھ دو اور تم لوگ چلے جاؤ۔"

ایک نے کہا "منعم دادا! جب تک ٹرالی نہیں آئے گی ہم سب اسی بنگلے میں جشن منائیں گے۔"

اس نے سختی سے کہا "نہیں، میں اپنی گھر والی کے ساتھ ہوں۔ یہاں کوئی شراب نہیں پیے گا۔ کوئی شور نہیں مچائے گا۔ تم لوگ دوسرے بنگلے میں چلے جاؤ۔"

وہ بند دروازے کے پیچھے سے اس کی باتیں سن رہی تھی اور خوش ہو رہی تھی کہ اس نے اپنے ساتھیوں کے سامنے اسے اپنی گھر والی کہا ہے۔ ان کے جانے کے بعد اس نے دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر آیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں چرمی بیگ تھا دوسرے میں بھری ہوئی بوتل تھی۔ اس نے بیگ اس کے حوالے

کرتے ہوئے کہا "اسے کھول کر دیکھو۔ کچھ زیورات اور نقد روپے ہیں۔"

اس نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ پہلے اس کے لیے ایک جگ پانی اور گلاس لے آئی۔ وہ جانتی تھی کہ اب وہ بیٹھ کر شراب پیے گا اور خوب ہنستا بولتا رہے گا۔ جب نشہ بڑھے گا تو اس کی محبت کی قسمیں کھاتا رہے گا جب اور زیادہ مدہوش ہو جائے گا تو اس کے قدموں میں سر رکھ کر اسے اپنی جان اور ایمان کہتا رہے گا۔

وہ پینے کے لیے بیٹھ گیا۔ عظمیٰ نے چرمی بیگ کو کھول کر دیکھا پھر بے دلی سے زیورات اٹھا کر اٹیچی میں رکھ دیے۔ اب اسے اتنے زیورات پہننے کو ملتے تھے کہ پہننے کا وقت ہی نہیں ملتا تھا۔ منعم باللہ نے اسے اپنے پاس بلا لیا پھر پاس بٹھا کر پینے لگا۔ خوب ہنسنے بولنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد جب نشہ ہونے لگا تو اس نے کہا "چلو اٹھو جو بہترین ساڑی اور زیورات ہیں انہیں پہن کر میرے سامنے آؤ۔ میں تمہیں سندر اینک سندر دیکھنا چاہتا ہوں۔"

وہ اس کے پاس سے اٹھ کر اٹیچی کے پاس گئی پھر لباس بدلنے لگی۔ اس نے زیورات پہنے، کنگھی چوٹی کی۔ آنکھوں میں کاجل لگایا۔ خوب بن سنور کر جب اس کے سامنے آئی تو وہ نشے میں جھوم رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہونے لگا۔ مگر ڈگمگا گیا۔ میز اور کرسی کو تھام کر سنبھل گیا۔ پھر وہ آگے بڑھا تو عظمیٰ نے اسے سہارا دیا۔ وہ اسے تھام کر رقص کرنے لگا اپنی بے سری آواز میں گنگنانے لگا۔ عظمیٰ ہنس رہی تھی۔ اتنے دنوں میں اس کے مزاج کو خوب سمجھ لیا تھا۔ ایسے وقت وہ اس کی مرضی کے مطابق اسے خوش کرنے کی کوشش کرتی تھی۔

رقص ہو، نغمہ ہو، مترنم ہنسی کانوں میں چاندی کی گھنٹیوں کی طرح بجتی ہو تو نشہ تیز سے تیز تر ہوتا جاتا ہے۔ وہ پیتا

جا رہا تھا اور اس کے ساتھ مستی میں جھومتا جا رہا تھا حتیٰ کہ وہ مدہوش ہو کر بستر پر گر پڑا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ مسرّتوں کے یا جذبوں کے ہجوم میں عظمٰی کی زبان سے اپنی مادری زبان کے الفاظ ادا ہونا چاہتے تھے۔ لیکن وہ ضبط کر لیتی تھی۔ اپنے اندر سے اٹھنے والے طوفان کو روکنے کی مشق ہوتی جا رہی تھی۔

جب وہ مدہوش ہو کر گر پڑا تو اس نے آواز دی "منعم! کیا باہر نہیں جاؤ گے؟ کچھ کھانے کے لیے نہیں لاؤ گے؟"

وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ چپ چاپ پڑا رہا۔ عظمٰی نے اسے جھنجوڑا تو اس کے حلق سے آواز نکلی۔ وہ نشے کی حالت میں ذرا سا غرّایا۔ پھر چاروں شانے چت ہو گیا۔ اس کی باچھوں سے ملی جلی سی رال اور شراب بہہ رہی تھی۔ عظمٰی نے اطمینان کی سانس لی — اور اپنے زیورات ایک ایک کر کے اتار کر انھیں بستر پر پھینکتی گئی۔ جب زیورات کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔

سویا ہوا آدمی نصف مُردہ ہوتا ہے۔ اگر وہ مدہوش ہو تو نصف سے زیادہ مُردہ ہوتا ہے۔ اس کا وجود ہونے کے باوجود نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ جب وہ موجود نہیں رہتا تھا تو وہ اس کی تصویر کے پاس جاتی تھی — کانوں میں آہستہ سے اردو میں کہتی تھی "مجھے تم سے محبت ہے۔"

اس وقت وہ اس کے سرھانے بیٹھی اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگی "بنگلہ بھاشا میں بڑی وسعت ہے۔ ہر جذبے کے اظہار کے لیے موزوں الفاظ موجود ہیں لیکن مجھے بنگلہ زبان پر عبور حاصل نہیں ہے۔ اس لیے کبھی کبھی بے چین ہو جاتی ہوں۔ جو کہنا چاہتی ہوں۔ وہ کہہ نہیں پاتی۔ خدا کا شکر ہے، اس وقت تم مدہوش ہو، تم سن نہیں سکتے لیکن میں بول کر اپنے جذبوں کی تسکین تو کر سکتی ہوں اور میں بول رہی ہوں۔ تمھارے کانوں میں میری آواز اتر رہی ہے تم سمجھو یا نہ سمجھو۔ میرے محبوب!"

وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی لیکن کہہ نہ سکی۔ اسی وقت منعم باللہ کی غرّاہٹ سنائی دی۔ غرّر، غرّر کی آواز کے ساتھ وہ ذرا سا کسمسایا پھر اس نے آہستگی سے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ عظمٰی نے سر اٹھایا تو وہ اسے گھورنے لگا۔

تصویر کے سامنے کچھ کہہ کر گزر جانا اور بات ہے مگر وہ تصویر نہیں تھا، موجود تھا۔ مدہوش تھا مگر اس کے دماغ میں اٹھائیس برس سے جو انگارے سُلگ رہے تھے۔ وہ اس کا نشہ اتار سکتے تھے۔ اس نے ایک جھٹکے سے اٹھتے ہوئے عظمٰی کو ایک طرف پھینک دیا۔ وہ بستر پر چاروں شانے چت ہو گئی۔ اس کے تیور دیکھ کر پہلے تو سہم گئی۔ پھر وہ ہنسنے لگا۔ اس کے ساتھ وہ بھی جبراً ہنسنے لگی۔ اس نے کہا "تم نے کتنی میٹھی زبان میں کچھ کہا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ بھلا کبھی بھونکنے والوں کی بات سمجھ میں آتی ہے؟"

وہ دہشت زدہ ہو کر اسے دیکھتی رہی۔ منعم باللہ نے محبت سے اس کے سر کو سہلا کر کہا "ڈرنے کی کوئی بات نہیں تمھاری زبان میں بڑی مٹھاس ہے۔ تومی رشو گلا موتن مشٹی۔ تم رس گلے کی طرح میٹھی ہو ———— ذرا اپنی زبان دکھاؤ۔"

جیسے مریض ڈاکٹر کو اپنی زبان نکال کر دکھاتا ہے۔ اسی طرح اس نے دکھائی۔ وہ اس پر جھک گیا۔

دوسرے ہی لمحے اس کے حلق سے چیخ نکلی۔ اس آسیب زدہ عمارت کی دیوار پر بڑے بڑے دانت نظر آئے۔ دانتوں کی ایک قطار اوپر تھی دوسری قطار نیچے۔ پھر ایک گاجر ان دانتوں کے درمیان آئی۔ ان دانتوں نے کچکچا کر اسے کاٹ لیا۔ کچ کی آواز کے ساتھ گاجر کے ٹکڑے ہوئے۔ اس کا ایک ننھا سا ٹکڑا منہ میں رہا ہوگا۔ باقی گاجر باہر رہ گئی۔

عظمٰی کے حلق سے پھر ایک چیخ نکلی۔ گڑبڑ، گڑبڑ، وہ جو کچھ کہہ رہی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ہائے اللہ میں مر گئی (ہائے اللہ میں مر گئی)"

انقلاب کے دنوں میں تہذیب ہر لمحہ مرتی ہے مگر بے شرم کی طرح زندہ رہتی ہے۔ گڑبڑ، گڑبڑ، انسانی زبان، انسانی ثقافت گڑبڑ، گڑبڑ۔

تہذیب کی کھولتی ہانڈی میں نفرت کے کنکر ڈال کر لایا جائے تو ہانڈی سے ایسی ہی آواز نکلتی ہے۔ گڑبڑ، گڑبڑ، گڑبڑ، گڑبڑ۔

منعم باللہ نے نشے میں مدہوش ہونے کے باوجود محسوس کیا کہ اس کے منہ کے اندر کوئی ننھی سی چیز تڑپ رہی ہے۔ اس نے تھوک کے اسے تھوک دیا۔ ننھی سی کٹی ہوئی زبان فرش پر آ کر گری اور وہاں تڑپنے لگی، پھدکنے لگی۔ جیسے زندہ جسم کا کوئی حصہ کٹنے کے باوجود تھوڑی دیر کے لیے مردہ نہیں ہوتا، زندگی کی طرح تڑپتا رہتا ہے۔ اسی طرح وہ زبان تڑپ رہی تھی۔ اپنے باقی حصے کو تلاش کر رہی تھی۔ جیسے پوچھ رہی تھی۔ کہاں جائے؟

ہاں، کہاں جائے؟ کیا ہندوستان؟ گڑبڑ، گڑبڑ

کیا بنگلہ دیش میں رہے؟ گڑبڑ، گڑبڑ

کیا پاکستان میں جگہ ملے گی؟ گڑبڑ، گڑبڑ

( باقی آئندہ )

Come for the style.
You'll stay for the taste.